اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

ترجمہ

حضرت مولانا السید صفدر حسین نجفی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.



سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

Presented by: Rana Jabir Abbas





۷۸۶

۱۱۰-۹۲

یا صاحب الزماں ادرکنی



لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری۔

www.ziaraat.com

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

آثرِ نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر
اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۱۰

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مِصباحُ القرآن ٹرسٹ



نام کتاب	تفسیر نمونہ
جلد	9
زیر نظر	آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم	حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ
ناشر	مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور
مطبع	اعظم پریس
سال اشاعت	جنوری 2013ء
ہدیہ	-/500روپے

اس کتاب کی اشاعت کے لیے ایک مرد مومن نے بطور قرض حسنہ تعاون فرمایا ہے خدا تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائیں اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائیں۔ (ادارہ)

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

0321-4481214/042-37314311

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلامِ حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشرواشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغازِ کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیرِ قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآنِ پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ، کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہلِ علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۰ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۱۸ مکمل اور جلد ۱۹ میں سے صفحہ ۲۵ تا ۲۹۰ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ سبا، سورہ فاطر، سورہ یٰسٓ، سورہ صافات اور سورہ صٓ کی تفسیر پر محیط ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مرد مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم



یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبدالرسول حسنی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللّٰہی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱	تفسیر مجمع البیان	تالیف	مشہور مفسر طبرسی
۲	تفسیر تبیان	تالیف	عظیم و فقیہ عالم شیخ طوسی
۳	تفسیر المیزان	تالیف	علامہ طباطبائی
۴	تفسیر صافی	تالیف	ملا محسن فیض کاشانی
۵	تفسیر نور الثقلین	تالیف	عبد علی بن جمعہ حویزی
۶	تفسیر برہان	تالیف	سید ہاشم بحرانی
۷	تفسیر روح المعانی	تالیف	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸	تفسیر المنار	تالیف	محمد رشید رضا تقریرات حامل تفسیر شیخ محمد عبدہ
۹	تفسیر فی ظلال القرآن	تالیف	سید قطب
۱۰	تفسیر قرطبی	تالیف	محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱	اسباب النزول	تالیف	ابوالحسن علی بن احمد واحدی نیشاپوری
۱۲	تفسیر مراغی	تالیف	احمد مصطفی مراغی

گذارش

تفسیرِ نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِنظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے۔ اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریات زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہو گا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابل ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ (اس کام کے لیے) توفیق شامل حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی ۱۸ جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی انیسویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا میں از حد شکرگزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہو گی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہو گی[1]۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[2] کے مقام پر، حتٰی کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوندا!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔

خداوندا!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امت اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بارالٰہا!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم۔ ایران

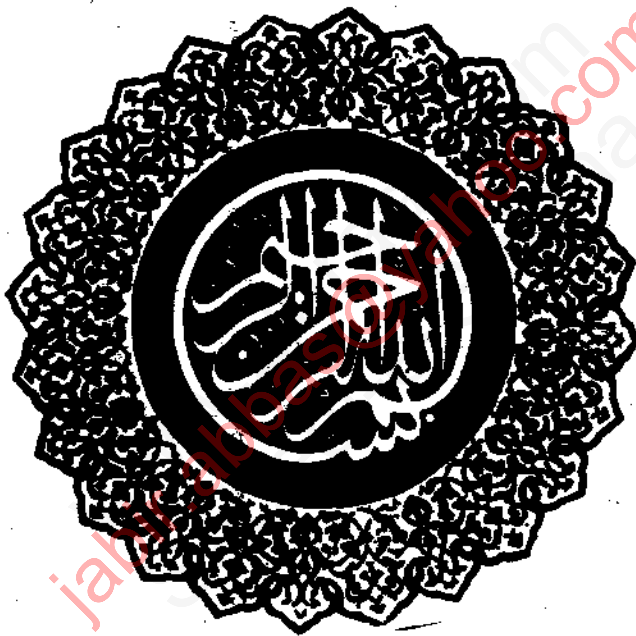
تفسیر نمونہ جلد ۱۰

فہرست

سورہ سباء

سورۂ صافات

سورہ ص


بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد ۱۰

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورہ سباء ۲۔ سورہ فاطر ۳۔ سورہ یٰسین
۴۔ سورہ صافات ۵۔ سورہ صٓ

سورۂ سباء، مکی سورت ہے اور اس کی ۵۴ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۲

سورۂ فاطر، مکی سورت ہے اور اس کی ۴۵ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۲

سورۂ یٰسٓ، مکی سورت ہے اور اس کی ۸۳ آیات ہیں۔

پارہ ۲۲ ــــ ۱ تا ۲۱ پارہ ۲۳ ــــ ۲۲ تا ۸۳

سورۂ صافات، مکی سورت ہے اور اس کی ۱۸۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۳

سورۂ صٓ، مکی سورت ہے اور اس کی ۸۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۳

سورۂ سبــــاء

سورۂ سبأ مکہ میں
نازل ہوئی
اور
اس کی ۵۴ آیات ہیں



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۂ سبا کے مطالب و مضامین

یہ سورہ جو قوم "سبا" کی سرگزشت کی مناسبت سے "سبا" کے نام سے موسوم ہوتی ہے "مکی" سورتوں میں سے ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ مکی سورتوں کے مطالب و مضامین عام طور پر معارف اسلامی اور اصول ہائے اعتقادی خصوصاً "مبدأ" و "معاد" اور "نبوت" ہوتے ہیں۔

اور اس سورہ کی زیادہ تر بحث بھی انہی امور کے گرد گھومتی ہے، کیونکہ مکہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی عقائد کے لحاظ سے تعمیر کی جا رہی تھی اور فروع پر عمل کرنے اور حکومت اسلامی کے قیام اور تمام اسلامی پروگراموں کو عملی شکل دینے کے لیے انہیں آمادہ اور تیار کیا جا رہا تھا۔

کلی طور پر یہ کہنا چاہیئے کہ اس سورہ میں پانچ مطالب کو مدنظر رکھا گیا ہے:

۱۔ "مسئلہ توحید" اور عالم ہستی میں خدا کی چند نشانیاں اور اس کی پاک صفات، منجملہ ان کے "توحید" "ربوبیت" اور "الوہیت"۔

۲۔ "مسئلہ معاد" جو اس سورہ میں دوسرے مسائل کی نسبت زیادہ بیان ہوا ہے۔ اس پر مختلف طریقوں سے طرح طرح کی بحثیں عنوان کی گئی ہیں۔

۳۔ "گزشتہ انبیاء اور خصوصاً پیغمبر اسلام کی نبوت کا مسئلہ" اور اس کے بارے میں دشمنوں کی بہانہ سازیوں کا جواب اور گزشتہ انبیاء کے کچھ معجزات کا بیان۔

۴۔ حضرت سلیمان اور قوم سبا کی زندگی کے ایک گوشہ کے بیان کے ضمن میں خدا کی عظیم نعمتوں کے ایک حصہ اور شکر گزاروں اور کفران نعمت کرنے والوں کے انجام کا ذکر۔

۵۔ "غور و فکر کی دعوت"، ایمان و عمل صالح کی ترغیب اور ان عوامل کی نوع بشر کی سعادت و نیک بختی میں تاثیر، اور مجموعی طور پر حق کی جستجو کرنے والوں کی تربیت کے لیے ایک جامع پروگرام۔

اس سورہ کی فضیلت

اسلامی روایات میں اس سورہ کی اہمیت اور اس کی تلاوت کے سلسلے میں عمدہ اور جاذب نظر قسم کی تعبیریں نظر آتی ہیں۔

منجملہ اُن کے پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث میں اس طرح منقول ہوا ہے کہ:

من قرأ سورة سبا لم يبق نبي ولا رسول الا كان له يوم القيامة رفيقا ومصافحاً۔

جو شخص سورہ سبا کو پڑھے گا، قیامت میں تمام انبیاء مرسلین اس کے رفیق و ہمنشین ہوں گے اور سب کے سب اس سے مصافحہ کریں گے۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ:

من قرأ الحمدين جميعًا، سبا و فاطر، في ليلة لم يزل ليلته في حفظ الله تعالى و كلائه، فان قرأهما في نهاره لم يصبه في نهاره مكروه واعطى من خير الدنيا وخير الأخرة مالم يخطر على قلبه ولم يبلغ مناه۔

جو شخص ان دو سورتوں کو کہ جن کی الحمد کے ساتھ ابتداء ہوتی ہے (سورہ سبا اور فاطر) کو کسی رات میں پڑھے گا تو وہ ساری رات خدا کی حفاظت و نگرانی میں رہے گا اور اگر ان دونوں کو دن میں پڑھے گا تو (اس دن) کوئی مکروہ اور ناپسندیدہ بات اسے پیش نہیں آئے گی، اور اسے اس قدر خیر دنیا و آخرت عطا کیا جائے گا کہ اس کے دل میں کبھی اس کا گمان بھی نہ گزرا ہوگا اور نہ اس نے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہوگا اور نہ آرزو کی ہوگی۔[2]

جیساکہ ہم نے ہر سورہ کے آغاز میں اس بات کی یاد دہانی کرائی ہے کہ مسلّمہ طور پر یہ عظیم ثواب ان لوگوں کو نہیں ملے گا کہ جو صرف ان کو زبان سے پڑھنے ہی کو کافی سمجھیں گے، بلکہ یہ پڑھنا غور و فکر کرنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہونا چاہیئے کہ جو انسان کو عمل کرنے پر آمادہ و تیار کرے۔

مثلاً جو شخص اس سورہ کو پڑھتا ہے وہ اس نکتہ سے باخبر ہو جاتا ہے کہ خدا کی بے حساب نعمتوں کا کفران کرنے کے نتیجہ میں، قوم سبا کی زندگی ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ وہ سب کے لیے عبرت بن گئے اور ان کا انجام دنیا والوں کے لیے ایک ضرب المثل بن گیا، اس قسم کے انسان نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ایسا شکر کہ جو عملی پہلو لیے ہوئے ہو۔ مشغول ہو جاتے ہیں، اور خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے اس کی حفظ و امان میں رہیں گے۔

اس سلسلے میں ہم سورہ نور کی ابتداء میں زیادہ تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

---

[1] و [2] "مجمع البیان" سورہ "سبا" کا آغاز جلد ۸ ص ۳۷۵۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِى الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ○

(۲) يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِى الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ○

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

(۱) حمد و (ستائش) اس خدا کے لیے مخصوص ہے کہ جو اُن تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور آخرت میں بھی وہی حمد کے لائق ہے اور وہ حکیم اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

(۲) جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے وہ اُسے بھی جانتا، اور جو کچھ اس سے باہر نکلتا ہے (اس کا علم بھی رکھتا ہے)، اور (اسی طرح) جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں اوپر جاتا ہے (سب سے باخبر ہے) اور وہ مہربان اور بخشنے والا ہے۔

تفسیر

وہی ہر چیز کا مالک اور ہر چیز کا عالم ہے

قرآن مجید کی پانچ سورتیں پروردگار کی حمد سے شروع ہوتی ہیں، جن میں سے تین سورتوں میں

خدا کی حمد و تعریف آسمان و زمین اور دوسرے موجودات کی خلقت کی بناء پر ہے (سورہ سبا، سورہ فاطر اور سورہ انعام) اور ایک سورہ (سورۂ کہف) میں یہ حمد و ثنا پیغمبر کے قلب پاک پر قرآن کے نزول کی بنا پر ہے۔

جبکہ سورۂ حمد میں ایک جامع تعبیر ہے کہ جو ان تمام امور کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے:
(الحمد للہ رب العالمین)

بہر حال سورۂ سبا کے ابتداء میں خدا کی حمد و ثنا کے ساتھ گفتگو دنیا و آخرت میں اس کی مالکیت و حاکمیت کی بنا پر ہے، فرماتا ہے:

"حمد مخصوص ہے اس خدا کے لیے کہ جو آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کا مالک ہے" (الحمد للہ الذی لہ ما فی السماوات وما فی الارض)۔

"اور آخرت میں بھی حمد اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے" (ولہ الحمد فی الاٰخرۃ)۔

اسی طرح سے دونوں جہانوں کی حاکمیت و مالکیت اسی کے لیے ہے۔ ہر نعمت، ہر موہبت، ہر فائدہ و برکت اور ہر موزوں و عجیب و غریب خلقت اسی کی ذات پاک کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، اور اسی بنا پر "حمد" کہ جس کی حقیقت "اچھے اور اختیاری کاموں" پر تعریف و ستائش ہے، سب کی سب اسی کی طرف لوٹتی ہیں۔

اور اگر مخلوقات میں بھی کوئی لائق حمد و ستائش ہے تو وہ بھی اسی کے وجود کا پرتو اور اس کے افعال و صفات کی ایک شعاع ہے۔

اس بنا پر اس دنیا میں جو بھی کسی چیز کی حمد و ستائش کرتا ہے تو یہ حمد و ستائش آخرکار اسی کی پاک ذات کی طرف لوٹ جاتی ہے اور بقول شاعر:

بہ جہاں خرم از آنم کہ جہاں خرم از اوست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست

"مَیں اس جہان سے اس وجہ سے خوش ہوں کیونکہ یہ جہان اسی کی وجہ سے خوش ہے،
مَیں سارے عالم پر اس وجہ سے عاشق ہوں کیونکہ سارا عالم اس کی طرف سے ہے۔"

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "وہ حکیم اور خبیر ہے" (وھو الحکیم الخبیر)۔

اس کی حکمت بالغہ کی بنیاد پر ہی یہ عجیب و غریب نظام جہان پر حکومت کر رہا ہے اور اس کے علم و آگاہی کی بنیاد پر ہی ہر چیز اپنی جگہ پر برقرار ہے اور ہر موجود کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ اس کے اختیار میں ہے۔

اس بارے میں کہ خدا کی آخرت کے بارے میں حمد سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس پر

بہت بحث کی ہے۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اگرچہ دارِ آخرت دارِ تکلیف نہیں ہے، لیکن خدا کے بندے وہاں پر اس کی عاشقانہ انداز میں حمد و ستائش کریں گے اور اس کی حمد و ستائش سے لذت حاصل کریں گے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ بہشتی تو اس کے فضل و کرم کی وجہ سے اس کی حمد کریں گے اور دوزخی اس کے عدل و انصاف کی وجہ سے۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے، کہ وہ انسان کہ جو اس دنیا میں نہیں وہ اپنے قلب و فکر پر پڑے ہوئے حجابوں کی وجہ سے غالباً اس کی خالص حمد و ثنا نہیں کرتے لیکن قیامت میں تمام حجاب ہٹ جائیں گے اور: "الملك یومئذ لله" کے مصداق تمام عالم ہستی پر خدا کی مالکیت سب پر واضح و آشکار ہو جائے گی، اور سب کے سب کامل خلوص نیت کے ساتھ اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں اس جہان میں تو یہ بات ممکن ہے کہ انسان غافل ہو جائیں اور کچھ موجودات کو ذاتِ خدا سے مستقل خیال کرلیں اور ان کی تعریف و توصیف کرنے لگیں، لیکن وہاں تو سب کا اس کی پاک ذات کے ساتھ تعلق اس طرح سے واضح و آشکار ہو جائے گا جس طرح اس دنیا میں سورج کی شعاعوں کا سورج کے ساتھ رابطہ واضح و آشکار ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر قرآن مجید میں بھی بارہا آیا ہے کہ جنتی وہاں خدا کی حمد کریں گے،

"و اٰخر دعواهم ان الحمد لله رب العالمین" (یونس، آیہ ۱۰)

جنتیوں کی آخری بات یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ حمد و تعریف اس خدا کے لیے ہے کہ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

دوسری جگہ ہم یہ پڑھتے ہیں کہ جس وقت مومنین بہشت جاودانی میں وارد ہوں گے تو وہ یہ کہیں گے: "حمد و شکر ہے اس خدا کے لیے کہ جس نے ہم سے غم و اندوہ کو برطرف کیا"۔

(و قالوا الحمد لله الذی اذهب عنا الحزن) (فاطر، ۳۴)

یہ حمد و ثنا صرف انسانوں اور فرشتوں کی زبان سے ہی نہیں، بلکہ عالم ہستی کے تمام ذرات سے بھی اس کی حمد و تسبیح کا زمزمہ باہوش کان میں پہنچ رہا ہے، کوئی موجود بھی ایسا نہیں ہے کہ جو اس کی حمد و تسبیح نہ کرتا ہو۔

⁂ ⁂ ⁂

بعد والی آیت، گزشتہ آیت میں خدا کی "حکیم" و "خبیر" کے ساتھ توصیف کی مناسبت سے پروردگار کے بے پایاں علم کے ایک گوشہ کی تشریح کر رہی ہے اور اس طرح کہتی ہے: "جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس سے باہر نکلتا ہے وہ اس سے بھی آگاہ ہے" (یعلم ما

یلج فی الارض وما یخرج منھا)۔

ہاں! وہ جانتا ہے بارش کے تمام قطرات اور سیلاب کی موجوں کو جو زمین کی گہرائیوں میں داخل ہوتی ہیں اور نفوذ ناپذیر طبقہ تک پہنچتی ہیں اور وہاں مجتمع ہو جاتی ہیں، اور انسانوں کے لیے ذخیرہ بن جاتی ہیں۔

وہ باخبر ہے گیاہ اور سبزہ زاروں کے دانوں سے کہ جو ہَوا یا حشرات الارض کی مدد سے وسیع و عریض زمین میں بکھر جاتے ہیں اور زمین کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ایک دن سرسبز درخت یا ہرے بھرے گیاہ اور سبزے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

وہ باخبر ہے درختوں کی جڑوں سے، کہ جس وقت وہ پانی اور غذا کی تلاش میں زمین کی گہرائیوں میں چلتی ہیں۔

برقی لہروں سے، مختلف گیسوں اور ہَوا کے ذرات سے، کہ جو زمین کے اندر نفوذ کرتے ہیں، ان جانداروں سے کہ جو زمین کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اسے زندگی بخشتے ہیں، نیز خزانوں، دفینوں اور مُردہ چیزوں کے بدنوں سے، خواہ وہ انسان ہوں یا غیر انسان، کہ جو اس زمین میں دفن ہیں، ہاں! وہ ان سب سے باخبر ہے۔

اسی طرح ان گیاہوں اور سبزوں سے کہ جو زمین سے نکلتے ہیں، ان انسانوں سے کہ جو اس سے اٹھے (پیدا ہوتے) ہیں، ان چشموں سے جو اس سے ابلتے ہیں، ان گیسوں سے جو اس سے اٹھتی ہیں، ان آتش فشاں پہاڑوں سے کہ جو اس سے بھڑکتے ہیں اور ان حشرات سے کہ جو زمین کے اندر بل رکھتے ہیں اور اس سے سر باہر نکالتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ان تمام موجودات سے، کہ جو زمین کی گہرائیوں سے باہر نکلتے ہیں، خواہ ہم ان میں سے کسی کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، وہ ان تمام پر مطلع اور سب سے آگاہ ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ ان تمام چیزوں سے کہ جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں یا آسمان کی طرف اوپر جاتی ہیں، باخبر ہے" (وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا)۔

بارش کے قطروں سے، سورج کی حیات بخش شعاعوں سے، وحی اور آسمانی شریعتوں کی طاقتور موجوں سے، ان فرشتوں سے جو تبلیغ رسالت یا دوسرے کاموں کی انجام دہی کے لیے زمین پر نازل ہوتے ہیں، ان کبریائی شعاعوں سے کہ جو فضا کے باہر سے زمین پر نازل ہوتی ہیں، ان شہابوں اور فضا میں گھومنے والے سنگریزوں سے کہ جو زمین کی طرف (آتے ہوئے فضا میں) جذب ہو جاتے ہیں، وہ ان سب سے آگاہ ہے۔

نیز بندوں کے اعمال سے کہ جو آسمان کی طرف عروج کرتے ہیں، ان فرشتوں سے کہ جو اپنی رسالت کی ادائیگی کے بعد آسمانوں کی طرف لوٹتے ہیں، ان شیاطین سے کہ جو (استراق سمع) باتیں چرانے کے لیے آسمانوں کی طرف جاتے ہیں، اونچے اونچے درختوں کی شاخوں سے جو آسمان کی طرف سر اٹھائے بڑھی چلی جا

رہی ہیں، اُن بخارات سے کہ جو سمندروں سے اٹھتے ہیں اور آسمان کی بلندی پر جاکر بادل بناتے ہیں، اُس آہ و فریاد سے کہ جو کبھی مظلوم کے دل سے اٹھتی ہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے، ہاں! وہ ان تمام چیزوں سے آگاہ ہے۔

کیا اُس کے سوا اور بھی کوئی ان امور سے آگاہ ہے؟ کیا نوع بشر کے تمام دانشمند اور علماء کا علم ان معلومات کے کسی ایک گوشہ پر احاطہ رکھتا ہے؟

آخر میں مزید کہتا ہے: "وہ رحیم ہے اور غفور، مہربان اور بخشنے والا" (وھو الرحیم الغفور)۔

اس مقام پر خدا کی ان دو صفات کے ساتھ توصیف، یا تو اس بناء پر ہے کہ ان امور میں سے کہ جو آسمان کی طرف اوپر چڑھتے ہیں، وہ بندوں کے اعمال اور ان کی ارواح ہیں، تو وہی ان کے اوپر اپنی رحمت و مغفرت کا سایہ ڈالنے والا ہے۔

یا اس بنا پر ہے کہ آسمانی برکات و مواہب کا نزول اس کی رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ اعمالِ صالح کہ جو بندوں کی طرف سے "والعمل الصالح یرفعہ" کے مطابق اوپر جاتے ہیں، اُس کی مغفرت کو پا لیتے ہیں۔

یا یہ کہ وہ لوگ کہ جو ان نعمتوں کا شکرادا کرتے ہیں، تو رحمت ان کے شاملِ حال ہوتی ہے اور وہ لوگ کہ جو قصوروار اور گنہگار ہیں، اگر حد سے نہ بڑھ جائیں تو مغفرت ان کے شاملِ حال ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اوپر والی آیت اپنے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ایک وسیع و عریض معنی رکھتی ہے اور اس کو ایک ہی جہت میں محدود نہیں کرنا چاہیئے۔

۳ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ۝

۴ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

۵ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۳ کافروں نے کہا: قیامت ہرگز ہمارے پاس نہیں آئے گی، تم کہہ دو، ہاں! مجھے اپنے پروردگار کی قسم وہ ضرور ضرور تمہارے پاس آئے گی، وہ خدا کہ جو غیب سے آگاہ ہے، آسمانوں اور زمین میں نہ تو ایک ذرہ کے وزن کے برابر کوئی چیز اس سے مخفی رہے گی، نہ اس سے کچھ چھوٹی نہ اس سے زیادہ بڑی، مگر یہ کہ وہ کتابِ مبین میں ثبت ہے۔

۴ اس سے اصل مقصد یہ ہے، تاکہ وہ اُن لوگوں کو کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل انجام دیئے، جزا و ثواب دے، ان کے لیے بخشش اور باعزت روزی ہے۔

۵ وہ لوگ کہ جو ہماری آیات (کی تکذیب) کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں، اور انہوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ ہماری قدرت کے احاطہ سے باہر نکل جائیں گے اُن کے لیے بُرا اور دردناک عذاب ہوگا۔

تفسیر

پروردگار کی قسم قیامت آکے رہے گی

گزشتہ آیات اس حالت کے باوجود، کہ وہ توحید اور خدا کی صفات کا بیان کرتی تھیں، وہ مسئلہ معاد کے لیے بھی زمین کو ہموار کر رہی تھیں، کیونکہ ـــ جیسا کہ ہم دیکھیں گے ـــ معاد کی بحث کی مشکلات خدا کے لیے بے پایاں علم کے طریق کے سوا حل نہیں ہوتیں۔

اس لیے زیر بحث آیت میں پہلے کہتا ہے: "کافروں نے کہا: یہ جھوٹ ہے کہ کوئی قیامت ہمیں پیش آنے والی ہے، ہرگز قیامت ہمارے پاس نہیں آئے گی" (و قال الذین کفروا لا تأتینا الساعة)۔

نہ صرف ہمارے، بلکہ انسانوں میں سے کسی کے لیے بھی قیامت نہیں ہے!

وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ آزادی کے ساتھ جو کام ان کا دل چاہے کرتے رہیں، اور اس امید پر کہ حساب و کتاب اور عدل و انصاف تو کچھ ہوگا ہی نہیں، لہٰذا جو کام بھی ان سے ہو سکے کر لیں۔

لیکن چونکہ قیامت کے دلائل واضح و روشن ہیں، لہٰذا قرآن ایک قاطع اور دوٹوک جملہ کے ساتھ یہاں نتیجہ کی صورت میں پیغمبر سے کہتا ہے کہ: "کہہ دو کہ ہاں! میرے پروردگار کی قسم کہ قیامت تم سب کے پاس ضرور آئے گی" (قل بلٰی و ربی لتأتینکم)۔

لفظ "رب" پر انحصار اس سبب سے ہے، کیونکہ قیامت ربوبیت کے افعال میں سے ایک فعل اور ایک شان ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا انسان کا مالک و مربی تو ہو، اور انہیں ارتقائی منازل میں آگے بھی بڑھائے لیکن انہیں بیچ میں ادھورا چھوڑ دے، اور ان کے مرتے ہی تمام چیزیں ختم ہو جائیں اور اس کی زندگی بے مقصد اور اس کی پیدائش بیہودہ اور فضول ہو کر رہ جائے۔

سورہ تغابن کی آیہ ۷ میں بھی اسی صفت کا سہارا لیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے: "زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ" (کافروں نے یہ گمان کر لیا ہے، کہ وہ ہرگز (زندہ کر کے) اٹھائے نہیں جائیں گے، تم کہہ دو: ہاں! میرے پروردگار کی قسم تم سب کے سب قیامت میں ضرور بالضرور (زندہ کر کے) اٹھائے جاؤ گے، پھر تم سب اپنے اعمال اور ان

کے نتائج سے آگاہ ہو گئے)۔

چونکہ معاد کی مخالفت کرنے والوں کے اعتراضات میں سے ایک یہ تھا کہ جب انسان کا بدن مٹی ہو جائے گا اور اس کے اجزائے بدن اطراف زمین میں بکھر جائیں گے، تو کون انہیں پہچان سکے گا اور کون انہیں اکٹھا کر سکے گا، اور نئی زندگی کیطرف پلٹا سکے گا؟ دوسری طرف کون ایسا ہے کہ جو بندوں کے تمام پنہاں و آشکار اور اندرونی و بیرونی اعمال کو محفوظ رکھ سکے اور ہر موقع ان کا حساب کر سکے؟
لہٰذا اس آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے کہ: وہ تمام پوشیدہ امور سے باخبر ہے، اور نہ تو تمام آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں، ایک ذرہ کی مقدار کے برابر بھی، اس کے بے پایاں علم کے سامنے چھپا ہوا نہیں رہے گا" (عالم الغیب لا یعزب عنه مثقال ذرة فی السماوات ولا فی الارض)[1]
"اور نہ تو کوئی چیز ذرہ سے چھوٹی، اور نہ ہی اس سے بڑی ایسی ہے، کہ جو سب کی سب کتاب مبین میں ثبت و ضبط نہ ہو" (ولا اصغر من ذٰلک ولا اکبر الا فی کتاب مبین)۔ اس طرح سے نہ تو انسان کے بدن کے ذرّوں کا زمین میں بکھر جانا اور نہ ہی ان کا دوسرے موجودات میں مل جانا یہاں تک کہ ان اجزاء کا تمام انسانوں کے بدن میں غذائی مادوں کی صورت میں داخل ہو جانا بھی، ان کو واپس اپنے اپنے بدن میں لوٹانے کے لیے کسی قسم کی کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا۔

ان کے اعمال بھی اس جہان میں باقی رہتے ہیں چاہے وہ اپنی شکل کو کتنا ہی بدل لے، وہ ان تمام سے اچھی طرح آگاہ ہے۔

اس تعبیر کی نظیر سورہ "ق" کی آیہ ۳، ۴ میں بھی آئی ہے ارشاد ہوتا ہے کہ: (ءاذا متنا و کنا ترابا ذٰلک رجع بعید قد علمنا ما تنقص الارض منهم وعندنا کتاب حفیظ)
"کیا ہم مر جائیں گے اور (خاک میں مل کر) خاک ہو جائیں گے، تو کیا ہم دوبارہ پلٹ کر آئیں گے؟ یہ بات تو بہت بعید (ناممکن) ہے لیکن انہیں جان لینا چاہیئے کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ زمین ان کے اجزاء کو کس طرح سے کم کر رہی ہے اور اپنے اندر ملاتی جا رہی ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے کہ جس میں یہ تمام امور محفوظ ہیں"

اس بارے میں کہ "کتاب مبین" سے کیا مراد ہے، بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے: کہ اس سے مراد وہی "لوح محفوظ" ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "لوح محفوظ" کیا ہے؟

---

[1] "یعزب" "عزب" کے مادہ سے اصل میں چراگاہ حاصل کرنے کے لیے گھر والوں سے دور ہونے کے معنی میں ہے، اس کے بعد ہر قسم کے غائب ہونے اور پنہاں ہونے کے معنی میں اطلاق ہوا اور اسی مناسبت سے ان مردوں یا عورتوں کو جو اپنی بیوی یا شوہر سے دور رہ گئے ہوں "عزب" یا "عزبہ" کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، کہ "لوح محفوظ" کی نزدیک ترین تفسیر جو بیان کی جا سکتی ہے وہی "پروردگار کے علم بے پایاں" کی لوح ہے۔ ہاں! اس لوح میں ہر چیز ثبت و ضبط ہے اور اس میں کسی قسم کے تغیر اور دگرگونی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وسیع و عریض عالم ہستی بھی اسی لوح محفوظ کا انعکاس ہے۔ کیونکہ ہمارے وجود کے تمام ذرات بھی، اور ہمارے تمام اقوال و اعمال بھی اس میں محفوظ رہتے ہیں، چاہے ظاہری طور پر صورت کتنی ہی بدل جائے، لیکن وہ ختم ہرگز نہیں ہوتے۔

ٹ ٹ ٹ

اس کے بعد دو آیات میں قیامت کے قیام کا مقصد بیان کرتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں منکرین کے لیے موجودہ جہان کے بعد اس قسم کے ایک عالم کے ضروری اور لازمی ہونے کی دلیل کو بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے: "اس سے مقصد یہ ہے کہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل انجام دیئے ہیں، انہیں جزا دے" (لیجزی الذین اٰمنوا وعملوا الصّالحات)۔

ہاں! اُن کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے" (اولٰئک لھم مغفرۃ و رزق کریم)۔

اگر مومنین کو ان کے نیک عمل کی جزا نہ ملے، تو کیا اصل عدالت کہ جو خلقت کا انتہائی بنیادی اصول ہے معطل نہیں ہو جائے گی؟ کیا پروردگار کی عدالت بغیر کسی مفہوم کے برقرار رہ سکتی ہے؟ جبکہ ہم اس جہان میں بہت سے ایسے افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہرگز اپنے نیک اعمال کی جزا اس دنیا میں نہیں پاتے، اس بنا پر کوئی ایسا جہان ضرور ہونا چاہیئے، تاکہ یہ اصل وہاں پر حقیقت بن سکے۔

"مغفرت" کو "رزق کریم" پر مقدم رکھنا ممکن ہے اس وجہ سے ہو تاکہ مومنوں کو زیادہ تر پریشانی ان لغزشوں کی وجہ سے ہوتی ہے جن کے ہونے کا انہیں احتمال ہوتا ہے، لہٰذا سب سے پہلے ان کی بخشش کو بیان کرکے، انہیں دلی سکون بخشتا ہے، علاوہ ازیں جب تک وہ خدا کی مغفرت کے پانی کے ساتھ (ہر قسم کے گناہ کی گندگی سے) پاک صاف نہ ہو جائیں اس وقت تک وہ "رزقِ کریم" اور "مقام کریم" کے لائق نہیں ہوں گے۔

"رزقِ کریم" ہر قدر و قیمت رکھنے والی روزی کے معنی میں ہے، اور اس کے مفہوم کی وسعت اس حد تک ہے، کہ اس میں تمام مواہب و انعاماتِ خداوندی شامل ہیں، یہاں تک کہ وہ نعمتیں بھی کہ جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سُنا اور نہ ہی کسی شخص کے وہم و گمان میں کبھی آئیں، دوسرے لفظوں میں بہشت اپنی تمام مادی و معنوی نعمتوں کے ساتھ اس لفظ میں جمع ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "کریم" کی دو چیزوں ۱۔ خوب ۲۔ بغیر درد سر کے عنوان سے تفسیر کی ہے[1] لیکن نظریہ آتا ہے کہ اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

٭ ٭ ٭

چونکہ عدالت کا دوسرا حصّہ گنہگاروں اور مجرموں کو سزا دینے سے متعلق ہے اس لیے بعدوالی آیت میں مزید کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جو ہماری آیات کی تکذیب اور ان کے ابطال وانکار کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، اور یہ تصور کرتے تھے کہ وہ ہماری قدرت کے احاطہ سے باہر نکل سکتے ہیں تو ان کے لیے بدترین اور دردناک ترین عذاب ہوگا" (والذین سعوا فی اٰیاتنا معاجزین اولٰئك لهم عذاب من رجز الیم)۔

وہاں گفتگو "رزق کریم" کے بارے میں تھی، اور یہاں "رجز الیم" کے بارے میں ہے۔

"رجز" (بروزن کذب) اصل میں "اضطراب" اور "اعتدال کو برقرار رکھنے کی طاقت نہ ہونے کے" معنی میں ہے، لہٰذا جس وقت اونٹ بیمار و ناتوان ہو جاتا ہے، اور وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ چلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے، تاکہ کچھ نہ کچھ اپنے اعتدال کو برقرار رکھ سکے تو عرب اس حالت کو "رجز" کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہر قسم کے گناہ اور پلیدگی پر اطلاق ہونے لگا۔

لفظ "رجز" (بروزن مرض) کا اطلاق مخصوص جنگی اشعار پر بھی اسی بنا پر ہوتا ہے کہ اس کے مقطع مختصر اور ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔

بہرحال یہاں "رجز" سے مراد بدترین قسم کا عذاب ہے، جس کی لفظ "الیم" کے ذکر کے ساتھ بھی تاکید ہوئی ہے، اور وہ دردناک جسمانی و روحانی عذابوں کی تمام اقسام کو شامل ہے۔

بعض نے اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کی ہے، کہ یہاں قرآن نے بہشتیوں کی نعمتوں کو بیان کرتے ہوئے لفظ "من" کو بیان نہیں کیا، تاکہ یہ بات ان کی وسعت کی دلیل ہو لیکن یہ لفظ "من" عذاب کے بارے میں آیا ہے تاکہ نسبتی محدودیت اور رحمت کے بیان کی نشانی ہو۔

"سعوا" "سعی" کے مادہ سے ہر قسم کی سعی و کوشش کے معنی میں آیا ہے اور

---

[1] "آلوسی": "روح البیان" زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

یہاں پر آیات حق کی تکذیب و انکار، اور لوگوں کو پروردگار کے دین و آئین کی طرف جھکاؤ سے روکنے کی کوشش کرنا مراد ہے۔

"معاجزین"، "معاجزہ" کے مادہ سے عاجز کرنے کے معنی میں ہے، اور اس قسم کے مواقع پر ایسے لوگوں پر اطلاق ہوتا ہے کہ جو کسی کے ہاتھ سے اس طرح فرار کر جائیں کہ وہ ان پر تسلط حاصل نہ کر سکے، یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے، کہ مجرمین کی یہ توصیف اس سوچ کی بنا پر ہے کہ جو ان کے عمل سے نمایاں تھی، ان کے اعمال ایسے لوگوں سے مشابہ تھے کہ جو یہ تصور کرتے تھے کہ وہ جس قسم کا جرم کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور پھر وہ خدا کی قدرت کے احاطہ سے فرار کر جائیں گے۔

(۶) وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝

(۷) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝

(۸) أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَم بِهِ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ ۝

(۹) أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ إِن نَّشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝

ترجمہ

(۶) اور وہ لوگ کہ جو علم رکھتے ہیں، وہ تو اس چیز کو، کہ جو تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے، حق سمجھتے ہیں اور۔ یہ کہ۔ وہ عزیز وحمید خدا کے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

(۷) اور کافروں نے یہ کہا کہ: کیا ہم تمہیں ایسا آدمی دکھائیں کہ جو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ جس وقت تم (مر جاؤ گے اور مٹی ہو جاؤ گے اور) بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے (تو دوبارہ) نئے سرے سے پیدا کیے جاؤ گے۔

(۸) کیا اُس نے خدا پر جھوٹ بہتان باندھا ہے؟ یا اُسے کسی قسم کا جنون ہے؟ (ایسا نہیں ہے) بلکہ وہ لوگ کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ عذاب اور بہت بڑی گمراہی میں ہیں (اور ان کی گمراہی کی نشانی یہی ان کا شدید انکار ہے)۔

(۹) کیا انہوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین سے متعلق چیزوں پر نظر نہیں کی، (تاکہ وہ ہر چیز پر خدا کی قدرت سے واقف ہوں) اگر ہم چاہیں تو انہیں (زمین کے ایک زلزلہ کے ساتھ) زمین میں دھنسا دیں، یا آسمان سے (پتھر کا) کوئی ٹکڑا ان پر گرا دیتے، اس میں ہر توبہ کرنے والے بندے کے لیے (خدا کی قدرت کی) واضح نشانی موجود ہے۔

تفسیر

علماٗ تیری دعوت کو حق سمجھتے ہیں

گزشتہ آیات میں ایسے جاہل دل کے اندھوں کے بارے میں گفتگو تھی، کہ جو ان تمام دلائل کے باوجود، قطعی طور پر معاد کا انکار کرتے تھے، اور آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

اسی مناسبت سے زیر بحث آیات میں ان علماء اور صاحبانِ فکر و نظر کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، کہ جو آیاتِ الٰہی کی تصدیق اور دوسروں کو انہیں قبول کرنے کا شوق دلاتے ہیں، فرماتا ہے:

"وہ لوگ کہ جو علم رکھتے ہیں، وہ تو اس کو، کہ جو تیرے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، حق سمجھتے ہیں اور عزیز و حمید پروردگار کے راستہ کی طرف ہدایت کرتے ڈالا جانتے ہیں" (و یری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک ھو الحق و یھدی الی صراط العزیز الحمید)۔

بعض مفسرین نے "الذین اوتوا العلم" کی اس آیت میں علماٗ اہلِ کتاب کے اس گروہ

کے ساتھ تفسیر کی ہے کہ جو قرآن مجید کی حقانیت کے آثار کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اس کے حق ہونے کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اس آیت کے مصادیق میں سے ایک مصداق اہل کتاب بھی ہوں لیکن صرف انہیں کے لیے محدود کر دینے پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ "یری" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے (وہ دیکھتے ہیں) کہ جو فعل مضارع ہے اور "الذین اوتوا العلم" کے مفہوم کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ہر عصر و زمانہ اور ہر مکان کے تمام علماء اور صاحبانِ فکر و نظر، اس میں شامل ہیں۔

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تفسیر علی بن ابراہیم میں یہ تعبیر امیرالمؤمنین علیؑ سے تفسیر ہوئی ہے تو حقیقت میں یہ اس کے اتم و اکمل مصداق کا بیان ہے۔

ہاں! جو بھی غیر متعصب عالم، اس کتاب کے مطالب و مضامین میں غور و فکر کرے گا، تو وہ اس کے پُر مغز معارف، پختہ احکام، حکیمانہ نصیحتوں اور ہلا دینے والے مواعظ سے لے کر اس کے عبرت انگیز تاریخی واقعات اور اعجاز آمیز علمی مباحث تک (دیکھ کر) یہ جان لے گا کہ یہ سب کے سب ان آیات کی حقانیت پر گواہ ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مغربی اور مشرقی علماء اور دانشمندوں کی طرف سے اسلام اور قرآن کے بارے میں مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں کہ جن میں اسلام کی عظمت اور اوپر والی آیت کی صداقت پر بہت ہی بلیغ، واضح اور روشن اعترافات نظر آتے ہیں۔

"ھوالحق" کی تعبیر ایک جامع تعبیر ہے کہ جو قرآن کے تمام مطالب و مشمولات و مضامین پر منطبق ہوتی ہے، چونکہ "حق" واقعیتِ عینی اور اس کے وجودِ خارجی کا نام ہے، یعنی قرآن کے مطالب، عالمِ ہستی اور جہانِ انسانیت کی آفرینش کے قوانین اور واقعیتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

اور چونکہ یہ ایسا ہے لہٰذا راہِ خدا کی طرف ہدایت کرتا ہے، ایسا خدا کہ جو "عزیز" بھی ہے اور "حمید" بھی، یعنی توانائی اور شکست ناپذیر ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی تعریف و ستائش کے لائق ہے، نوعِ بشر کے صاحبانِ اقتدار کی طرح نہیں کہ وہ جس وقت اقتدار اور طاقت کے تخت پر بیٹھتے ہیں تو وہ دھونس، زبردستی، تجاوز، ستم گری اور خود خواہی اور خود غرضی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

اس تعبیر کی نظیر سورۂ ابراہیم آیہ ۱ میں بھی بیان ہوئی ہے جہاں پر وہ کہتا ہے:

"کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۙ۬ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ"، "وہ کتاب ہے کہ جو ہم نے تم پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (گمراہی کی) تاریکیوں سے (علم و ایمان کی) روشنی کی طرف خدائے

عزیز و حمید کے راستہ پر نکال لے جاؤ۔"

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ جو ہستی صاحب قدرت بھی ہے اور لائق حمد و ستائش بھی، عالم و آگاہ بھی ہے اور رحیم و مہربان بھی، صرف اس کا راستہ مطمئن ترین راستہ اور مستقیم ترین طریقہ ہے' اور جو لوگ اس کے راستہ پر چلتے ہیں تو وہ خود کو سرچشمہ قدرت اور ہر قسم کے اوصافِ حمیدہ سے قریب اور نزدیک کر لیتے ہیں۔

* * *

بعد والی آیت میں دوبارہ قیامت اور معاد کے مسئلہ کی طرف پلٹتا ہے اور گزشتہ بحثوں کی ایک دوسری شکل میں تکمیل کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کافروں نے کہا، کیا ہم تمہیں ایسا آدمی دکھائیں کہ جو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ جس وقت تم سب کے سب مٹی ہو جاؤ گے اور تمہارے بدن کے ذرات ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اور ہر ذرہ کسی گوشہ میں ٹھکانا بنا لے گا (یا شاید کسی حیوان یا کسی دوسرے انسان کے بدن کا جزو ہو جائے گا) تو تم دوبارہ ایک نئی خلقت و آفرینش میں پلٹ آؤ گے" (وقال الذین کفروا ھل ندلکم علیٰ رجل ینبئکم اذا مزقتم کل ممزق انکم لفی خلق جدید)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ معاد پر ان کے انکار کے اصرار کی دو باتیں تھیں، پہلی بات یہ تھی کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ معاد کہ جسے پیغمبر اسلام بیان کر رہے ہیں (معاد جسمانی) ایک ایسا مطلب ہے کہ جس کو آسانی کے ساتھ رد کیا جا سکتا ہے اور جس کے بارے میں وہ عامۃ الناس کو بدظن کر سکتے ہیں اور آسانی کے ساتھ اس کی نفی کر سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ معاد کا اعتقاد یا احتمالی طور پر اسے قبول کر لینا بہر حال انسان میں مسئولیت اور ذمہ داری پیدا کرتا ہے اور اسے حق کی سوچ اور جستجو کے لیے آمادہ کرتا ہے اور یہ ایک ایسا مطلب تھا کہ جو کفر کے سرغنوں کے لیے سخت خطرناک شمار ہوتا تھا، لہٰذا انہیں اس بات پر اصرار تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے معاد کی فکر اور اعمال کے بدلے میں جزا یا سزا کا خیال لوگوں کے دماغ سے باہر نکال دیں۔

وہ کہتے تھے کہ کیا یہ بات ممکن ہے کہ یہ بوسیدہ ہڈیاں، یہ بکھری ہوئی مٹی کہ جس کے ذرات کو تیز ہواؤں کے جھکڑ ہر طرف لے جاتے ہیں، ایک دن جمع ہو کر اسے زندگی کا لباس پہنا دیں گے؟

اور یا یہ کہ وہ پیغمبر کو "رجل" کے ساتھ تعبیر کرتے تھے، وہ بھی نکرہ کی صورت میں، تو یہ تحقیر کی بنا پر تھا۔

لیکن انہوں نے اس حقیقت کو بھلا دیا تھا کہ ہم ابتدا میں بھی تو پراگندہ اجزا ہی تھے' ہمارے

بدن میں موجود پانی کا ہر قطرہ کسی سمندر یا چشمہ کے کسی گوشہ میں تھا اور ہمارے جسم کے آبی اور معدنی مادہ کا ہر ذرہ زمین کے کسی کونے میں پڑا ہوا تھا، تو جس طرح ابتدا میں خدا نے انہیں جمع کیا تھا، اسی طرح آخر میں بھی وہ اس امر پر قدرت رکھتا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ اسی بات کو اس کے کہنے والے کی دروغ گوئی یا جنون کی دلیل قرار دیتے تھے اور وہ یہ کہتے تھے: "کیا اس نے خدا پر جھوٹ بہتان باندھا ہے، یا اسے کسی قسم کا جنون ہے" (افترٰی علی اللہ کذبًا ام بہ جنۃ)۔

ورنہ ایک سچے اور عقلمند انسان کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ اس قسم کی بات کرے؟!

لیکن قرآن قطعی اور دو ٹوک طریقہ سے انہیں اس طرح جواب دیتا ہے: "یہ بات نہیں ہے، نہ تو وہ دیوانہ ہے اور نہ ہی جھوٹا، بلکہ وہ لوگ کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ عذاب اور انتہائی گمراہی میں ہیں" (بل الذین لایؤمنون بالاٰخرۃ فی العذاب والضلال البعید)۔

اس سے زیادہ واضح اور آشکار گمراہی اور کیا ہوگی، کہ انسان معاد کا منکر ہو جائے، وہ معاد کہ جس کا نمونہ وہ ہر سال اپنی آنکھوں کے سامنے، عالم طبیعت میں اور مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے میں، دیکھتے ہیں۔

وہ معاد کہ اگر وہ نہ ہو تو اس جہان کی زندگی بغیر کسی مفہوم اور مطلب کے ہے۔

اور بالآخر وہ معاد کہ جس کا انکار کرنا، پروردگار کی قدرت، عدل و حکمت کے انکار کرنے کے برابر ہے۔

لیکن وہ یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ اسی وقت عذاب و گمراہی میں ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں بہت سی مشکلیں اور حادثات پیش آتے ہیں کہ جنہیں انسان آخرت پر ایمان کے بغیر برداشت نہیں کر سکتا۔

واقعاً اگر زندگی دنیا کی عمر کے انہیں چند دنوں میں محدود ہوتی تو موت کا تصور ہی ہر شخص کے لیے ایک وحشتناک عذاب بن جاتا، اسی وجہ سے منکرینِ معاد ہمیشہ ایک قسم کی جانکاہ پریشانی اور دردناک عذاب کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں، جبکہ معاد پر ایمان رکھنے والے موت کو عالم بقا کے لیے ایک دریچہ اور قفسِ دنیا کے ٹوٹنے اور اس قید خانے سے آزاد ہونے کا ایک وسیلہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ہاں! معاد پر ایمان انسان کو آرام و سکون بخشتا ہے، مشکلات کو قابلِ برداشت بناتا ہے اور ایثار و فداکاری اور جانبازی کو انسان کے لیے آسان بنا دیتا ہے۔

اصولی طور پر وہ لوگ کہ جو معاد و قیامت کو دروغ گوئی یا جنون کی دلیل شمار کرتے تھے، وہ اپنے

کفر و جہالت کی وجہ سے تاریک بینی کے عذاب اور دور دراز کی گمراہی میں گرفتار تھے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس عذاب کو عذابِ آخرت کی طرف اشارہ کہا ہے لیکن آیت کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ابھی اسی وقت اسی جہان میں عذاب و گمراہی میں مبتلا ہیں۔

* * *

اس کے بعد معاد کے بارے میں ایک اور دلیل ۔ ایسی دلیل کہ جو ہٹ دھرم غافلوں کو جھنجھوڑنے والی ہے ۔ پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے کہ: "کیا انہوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین سے متعلق چیزوں پر نظر نہیں کی"؟ (افلم یروا الی ما بین ایدیھم وما خلفھم من السماء والارض)۔

یہ با عظمت آسمان، ان تمام عجائبات کے ساتھ، ان تمام ثابت و سیار ستاروں کے ساتھ، اور ان نظاموں کے ساتھ کہ جو اس پر حاکم ہیں، اسی طرح یہ زمین، اپنی تمام عجیب و غریب اور انواع و اقسام کے زندہ موجودات و برکات اور اس کے مواہب کے ساتھ، آفریدگار کی قدرت کی واضح ترین بولتی ہوئی دلیلیں ہیں۔

وہ ہستی کہ جو ان تمام امور پر قدرت رکھتی ہے، کیا وہ انسان کو موت کے بعد دوبارہ عالمِ حیات کی طرف لوٹانے سے عاجز ہے؟!

یہ وہی "برہان قدرت" ہے کہ جس کے ساتھ قرآن کی دوسری آیات میں منکرینِ معاد کے مقابلہ میں استدلال ہوا ہے، منجملہ اُن کے سورہ یٰسین کے آخر آیہ ۸۰ میں اور سورہ اسراء آیہ ۹۹ اور سورہ ق کی آیہ ۶، ، میں بھی استدلال ہوا ہے۔

ضمنی طور پر یہ جملہ، ان متعصب دل کے اندھوں کی تہدید کے لیے، کہ جو اس بات پر مصر ہیں کہ تمام حقائق سے آنکھیں بند کرلیں، ایک مقدمہ اور تمہید ہے، لہٰذا اس کے بعد فرماتا ہے کہ: "اگر ہم چاہیں تو زمین کو یہ حکم دے دیں کہ وہ ان کے جسم کو نگل لے" ایک ایسا زلزلہ آئے کہ جس سے زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں دفن ہوجائیں۔ (ان نشأ نخسف بھم الارض)۔

"اور اگر ہم چاہیں تو یہ حکم دے دیں کہ آسمانی پتھروں کے ٹکڑے ان پر برسنے لگیں" اور خود انہیں بھی اور ان کے گھر بار اور ان کی زندگی کو بھی درہم برہم کر دیں! (او نسقط علیھم کسفا من السماء)۔

ہاں! اس بات میں خدا کی قدرت اور ہر چیز پر اس کی توانائی کی واضح اور روشن نشانی موجود ہے لیکن (یہ نشانی) "ہر اُس بندے کے لیے ہے کہ جو خدا کی طرف رجوع کرے اور اس میں غور و فکر کرے" (ان فی ذالک لآیۃ لکل عبد منیب)۔

ہر شخص نے اپنی زندگی میں زلزلوں، زمین کے پھٹنے اور اُس میں (لوگوں کے) دھنس جانے کو دیکھا

یا سنا ہوگا، علاوہ ازیں فضا سے آسمانی پتھروں (شہابوں) کے گرنے یا بجلیوں کے گرنے یا آتش فشانیوں کے نتیجہ میں پہاڑوں کو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے دیکھا یا سُنا ہے، ہر عقلمند انسان یہ جانتا ہے کہ ان امور کا واقع ہونا ہر لمحہ اور ہر جگہ ممکن ہے، اگر زمین آرام وسکون میں ہے اور آسمان ہمارے لیے امن وامان بنا ہوا ہے تو یہ کسی دوسری ہستی کی قدرت وفرمان کی وجہ سے ہے، ہم جو ہر طرف سے اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، معاد کے سلسلے میں اس کی توانائی وقدرت کا کس طرح انکار کرسکتے ہیں! یا اس کی حکومت کی حدود سے کیسے فرار کرسکتے ہیں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ باوجود اس کے کہ آسمان سر کے اوپر اور زمین پاؤں کے نیچے ہے، اوپر والی آیت میں "ما بین ایدیھم" (جو ان کے آگے ہے) "وماخلفھم" (اور جو ان کے پیچھے ہے) سے تعبیر ہوئی ہے اور قرآن میں صرف یہی ایک ایسا موقع ہے کہ جس میں یہ تعبیر نظر آتی ہے، یہ تعبیر ممکن ہے کہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ آسمان کا منظر سورج، چاند اور ستاروں کے طلوع وغروب کے وقت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور حق تعالیٰ کی قدرت وعظمت اس لمحہ زیادہ واضح ہوتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انسان جب افق کی طرف رخ کیے کھڑا ہوتا ہے تو یہ منظر اس کے سامنے ہوتا ہے اور زمین کہ جو اہمیت میں اس کے بعد قرار پاتی ہے اس کے پیچھے کہلائے گی۔

علاوہ ازیں اگر یہ مغرور غافل اپنے آپ کو اتنی بھی اجازت نہیں دیتے کہ اپنے سر کے اوپر دیکھ لیں تو کم ازکم اپنے سامنے ہی جو کچھ افق کے قریب دکھائی دیتا ہے، اسے کیوں نہیں دیکھتے۔

۲۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کرۂ ارض کے اندر پگھلنے اور جلانے والے مادے موجود ہیں، کہ جو ہر وقت جوش میں ہوتے ہیں، اور درحقیقت تمام انسانوں کی زندگی بالقوہ آتش فشانوں کے ایک مجموعہ پر برقرار ہے، بس! اللہ کا ایک چھوٹا سا فرمان ہی کافی ہے کہ ان آتش فشانوں میں سے کوئی سا ایک آتش فشاں پھٹ پڑے اور ایک عظیم علاقے کو لرزا کے رکھ دے اور پتھر، پگھلا ہوا مواد اور جلانے والے مادے وہاں پھینک دے۔

اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر رات اور دن میں لاکھوں چھوٹے بڑے سرگرداں پتھر زمین کی فضا میں گھوم رہے ہیں اور اسی میں جذب ہو جاتے ہیں، اگر وہ زمین کے گرداگرد پھیلی ہوئی فضا کے قشر سے نہ ٹکراتے، کہ جو اُن کے بھڑک کر جل جانے کا سبب بنتی ہے تو زمین پر رہنے والوں پر ہمیشہ آسمان کی طرف سے پتھروں کی بارش ہوتی رہتی، اب بھی ان کی طاقت اور شدت اس قدر ہے کہ وہ بعض اوقات ان رکاوٹوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے زمین پر آگرتے ہیں، اور یہ خدا کی طرف سے ایک تنبیہ ہے۔

اس بنا پر اگر ہم سارے کے سارے انسان خطرے کے ان دونوں منبعوں کے درمیان خدا کے حکم سے انتہائی آرام وسکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں تو کیا یہی بات اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم اس کی عظیم قدرت کو معلوم کر کے اس کے آستانہ پر سرِ نیاز جھکائیں ؟!

٭ ٭ ٭

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آخری آیت کے آخر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان چیزوں میں خدا کی عظمت وقدرت کی واضح وروشن آیت اور نشانی موجود ہے، لیکن یہ نشانی ہر" اس بندے کے لیے ہے کہ جو اس کی طرف رجوع کرے"

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ وہ باغی اور سرکش لوگ کہ جنہوں نے عبودیت کا طوق اپنی گردن سے نکال دیا ہے اور اسی طرح سے وہ غافل بندے کہ جو اپنے غلط اور گناہ آلود راستے پر مسلسل طور پر چلے جا رہے ہیں اور اپنے کاموں سے توبہ کر کے خدا کی طرف رجوع نہیں کرتے، ان واضح وروشن آیات سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔

کیونکہ صرف آفتاب کا موجود رہنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ (دیکھنے کے لیے) دیکھنے والی آنکھ اور آنکھوں کے سامنے سے پردوں کا ہٹنا بھی ضروری ہے۔

(۱۰) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ يٰجِبَالُ اَوِّبِىْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۙ

(۱۱) اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِى السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

ترجمہ

(۱۰) ہم نے داؤد کو اپنے فضل سے ایک عظیم نعمت بخشی (ہم نے پہاڑوں اور پرندوں سے کہا) اے پہاڑو! اور اے پرندو تم اس کے ساتھ ہم آواز ہو جاؤ (اور اس کے ساتھ خدا کی تسبیح کہو) اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا۔

(۱۱) (اور ہم نے انہیں حکم دیا کہ تم) کامل اور فراخ زرہیں بناؤ، اور حلقوں کو مناسب اندازے سے بناؤ، اور صالح اور نیک عمل بجالاؤ، یقیناً میں تمہارے عمل کو دیکھ رہا ہوں۔

تفسیر

داؤدؑ پر خدا کے عظیم انعامات

چونکہ گزشتہ بحث کی آخری آیت میں گفتگو "عبد منیب" اور توبہ کرنے والے بندے کے بارے میں تھی، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ توصیف بعض آیات میں (سورہ ص آیہ ۲۴) داؤد پیغمبر کے لیے ذکر ہوئی ہے — جس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ بیان ہوگی۔ اس بناء پر بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر اور ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ کے حالات کا ایک گوشہ نمونہ کے طور پر بیان کیا جائے

اور گزشتہ بحث مکمل ہو جاتے ، اور ضمنی طور پر یہ بات اُن تمام افراد کے لیے ایک تنبیہ ہو کہ جو خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دیتے ہیں ، اور جس وقت تختِ اقتدار پر بیٹھتے ہیں تو پھر وہ خدا کے بندے ہی نہیں رہتے ۔

پہلی آیت میں کہتا ہے : " ہم نے داوٗد کو اپنے فضل سے ایک نعمت بخشی تھی " (ولقد اٰتینا داوٗد منا فضلاً) ۔

لفظ " فضل " ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جو اُن تمام مواہب اور نعمتوں کو کہ جو خدا نے داوٗدؑ کو عطا کی تھیں شامل ہے اور " نکرہ " کی صورت میں اس کا ذکر اس کی عظمت کی دلیل ہے ۔

حضرت داوٗدؑ کو پروردگار کی طرف سے بہت سی نعمتیں ۔ چاہے وہ معنوی پہلو رکھتی ہوں یا مادی حاصل تھیں کہ جن کو قرآنی آیات نے بیان کیا ہے ۔

ایک مقام پر کہتا ہے کہ : " ہم نے اُسے اور اس کے بیٹے کو بہت سا علم دیا اور انہوں نے کہا ، خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں اپنے بہت سے بندوں پر فضل و برتری بخشی " " ولقد اٰتینا داوٗد و سلیمان علمًا و قالا الحمد للہ الذی فضلنا علیٰ کثیر من عبادہ المؤمنین " (نمل ۔ ۱۵)

دوسری جگہ خصوصیت کے ساتھ حیوانات سے باتیں کرنے کا علم رکھنے پر انحصار کیا ہے ، اور اسے ایک عظیم نعمت کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے : " یا ایھا الناس علّمنا منطق الطیر و اوتینا من کل شیٔ ان ھٰذا لھو الفضل المبین " (اے لوگو ! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر چیز سے بہرہ مند کیا گیا ہے اور یہ ایک واضح و آشکار فضیلت ہے پروردگار کی طرف سے) ۔ (نمل ۔ ۱۶)

وہ مختلف معجزات ، کہ جن کے متعلق زیرِ بحث آیت کے ذیل میں گفتگو ہو گی ، ان فضائل کا ایک حصّہ ہے ، علاوہ ازیں بہت ہی عمدہ لحن اور آواز ، اور عادلانہ قضاوت پر قدرت کہ جس کی طرف سورہ " ص " میں اشارہ ہوا ہے ، اس فضلِ الٰہی کا ایک دوسرا حصہ شمار ہوتا ہے ، اور سب سے زیادہ اہم فضیلت نبوت و رسالت کی فضیلت ہے جو خدا نے داوٗدؑ کو عطا فرمائی تھی ۔

بہر حال اس اجمالی اشارہ کے بعد اس کی تفصیل شروع ہوتی ہے اور ان کے کچھ معنوی فضائل اور چند مادی فضائل اس طرح بیان کرتا ہے : " ہم نے پہاڑوں سے کہا کہ تم داوٗد کے ساتھ ہم آواز ہو جاؤ ، اور اسی طرح اے پرندو ! تم بھی اس کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملاؤ ، اور جس وقت وہ خدا کا ذکر اور تسبیح کرے تو تم بھی زمزمہ سرائی کرو " (یٰجبال اوبی معہ والطیر) ۔

لفظ " اوبی " اصل میں " تأویب " سے آواز کو گلے میں گھمانے اور پھیرنے کے معنی میں ہے ، یہ مادہ کبھی توبہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ، کیونکہ اس کی حقیقت خدا کی طرف بازگشت ہے ۔

اگرچہ عالم کے تمام ذرات خدا کا ذکر تسبیح اور حمد کرتے ہیں، خواہ کوئی داؤد ان کے ساتھ ہم صدا ہو یا نہ ہو، لیکن داؤدؑ کا امتیاز یہ تھا کہ اُن کے صدا بلند کرنے اور تسبیح کی نغمہ سرائی کے وقت ان موجودات کے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا وہ آشکار و ظاہر ہو جاتا تھا اور اندرونی زمزمہ بیرونی نغمہ کے ساتھ تبدیل ہو جاتا تھا، جیسا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے ہاتھ پر "سنگریزہ" کی تسبیح کے بارے میں بھی روایات آئی ہیں۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ :

"انه خرج یقرأ الزبور وکان اذا قرأ الزبور لا یبقی جبل ولا حجر ولا طائر الّا اجابه !"

"داؤدؑ دشت و بیابان کی طرف نکلے اور جس وقت آپ زبور کی تلاوت کرتے تو کوئی پہاڑ اور پتھر اور پرندہ ایسا نہ تھا کہ جو اُن کے ساتھ ہم آواز نہ ہوتا ہو"۔[1]

اس معنوی فضیلت کا ذکر کرنے کے بعد ایک مادی فضیلت کا بیان شروع کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا" (والنا له الحدید)۔

ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ خدا نے داؤدؑ کو معجزانہ طور پر لوہے کو نرم کرنے کا طریقہ سکھایا تھا، اس طرح سے کہ وہ اس سے زرہ بنانے کے لیے مضبوط و محکم اور پتلی پتلی نازک قسم کی کڑیاں بنا سکیں، یا یہ کہا جائے کہ داؤدؑ سے پہلے بھی جنگوں میں دفاع کے لیے لوہے کی سلیٹوں سے استفادہ ہوتا تھا، کہ جو بھاری بھی ہوتی تھیں، اور اگر انہیں پہنا جاتا تو وہ اتنی خشک اور بے لچک بھی ہوتی تھیں کہ جو جنگجو غازیوں کے لیے انتہائی پریشان کن ہوتی تھیں، کوئی بھی شخص اس زمانہ تک لوہے کی باریک اور مضبوط کڑیوں سے زرہ کی مانند کوئی ایسی چیز نہ بنا سکا تھا کہ جو لباس کی مانند آسانی کے ساتھ بدن پر آسکے اور بدن کی حرکات کے ساتھ نرم اور رواں رہے۔

لیکن آیت کا ظاہر یہ ہے کہ لوہے کا داؤدؑ کے ہاتھ میں نرم ہونا، خدا کے حکم سے اور معجزانہ صورت میں انجام پذیر ہوتا تھا۔ اس بات میں کیا چیز مانع ہے کہ وہی ذات کہ جو بھٹی کو لوہا نرم کرنے کی خاصیت بخشتی ہے، اسی خاصیت کو ایک دوسری شکل میں داؤدؑ کے پنجوں میں قرار دے دے، بعض اسلامی روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔[2]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے داؤدؑ کی طرف وحی بھیجی کہ :

"نعم العبد انت الا انک تأکل من بیت المال فبکی داؤد اربعین

---

[1] کمال الدین صدوق، (المیزان، جلد ۱۶، ص ۳۹۰ کے مطابق)۔

[2] تفسیر برہان، جلد ۳، ص ۳۴۳ و تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۱۵۔

صباحاً فالان الله له الحديد وكان يعمل كل يوم درعاً ــ فاستغنى عن بيت المال "

"تم ایک اچھے آدمی ہو مگر تم بیت المال سے اپنی روزی حاصل کرتے ہو، داؤد چالیس دن تک روتے رہے، (اور خدا سے اس کے حل کی درخواست کی) تو خدا نے لوہے کو ان کے لیے نرم کردیا اور ہر روز ایک زرہ بنا لیتے تھے .... اور اس طرح سے وہ بیت المال سے بے نیاز ہو گئے" [1]

یہ ٹھیک ہے کہ بیت المال ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ جو معاشرے کی بغیر عوض کے خدمت کرتے ہیں اور ایسے اہم بوجھ اٹھاتے ہیں کہ جو پسماندہ ہوں لیکن یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ انسان اس خدمت کو بھی انجام دے اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے ــ توانائی کی صورت میں ــ گذر اوقات کرے اور داؤد یہ چاہتے تھے کہ وہ اسی قسم کے ممتاز بندے بنیں۔

بہرحال داؤد اس توانائی کے ذریعہ ــ کہ جو خدا نے انہیں دی تھی، بہترین طریق یعنی جہاد کا وسیلہ بنانے سے، ایسا وسیلہ جو دشمن سے حفاظت کرے ــ استفادہ کرتے تھے، اور اس سے زندگی کے عام وسائل میں ہرگز فائدہ نہ اٹھایا، اور عجب یہ کہ اس کی آمدنی سے ــ بعض روایات کے مطابق ــ اپنی سادہ زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کچھ حاجت مندوں پر بھی خرچ کیا کرتے تھے [2]

ان تمام باتوں کے علاوہ اس کام کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ ان کا ایک بولتا ہوا معجزہ شمار ہوتا تھا۔

بعض مفسرین نے اس طرح نقل کیا ہے کہ "لقمان" داؤد کے پاس اس وقت پہنچے، جبکہ وہ پہلی زرہ بنا رہے تھے، وہ لوہے کو بٹ بٹ کر کڑیوں اور حلقوں کی صورت میں بنا رہے تھے، اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ آپس میں جوڑ رہے تھے۔ اس عجیب وغریب منظر کو دیکھ کر لقمان حیران رہ گئے اور وہ سوچنے لگے (کہ یہ کیا ہو رہا ہے) اُسے دیکھتے رہے لیکن کوئی سوال نہ کیا، یہاں تک کہ داؤد نے زرہ بنا کر تیار کرلی، اور کھڑے ہو کر اسے پہن لیا، اور کہا کہ جنگ میں دفاع کے لیے یہ کیسا اچھا ذریعہ ہے، لقمان نے جو اس کا اصلی مقصد سمجھ چکے تھے کہا کہ: الصمت حكمة وقليل فاعله!

"خاموشی حکمت ہے مگر بہت کم لوگ اسے انجام دیتے ہیں" [3]

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر ابو الفتوح رازی، جلد ۹ صفحہ ۱۹۲۔

[3] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

بعد والی آیت داؤدؑ کے زرہ بنانے اور اس سلسلے میں پروردگار کے بہت ہی پُر معنی فرمان کی شرح ہے، کہتا ہے: "ہم نے اس سے کہا کہ مکمل زرہیں بناؤ اور اس کے حلقوں کو اندازے کے ساتھ اور مناسب رکھو" (ان اعمل سابغات و قدر فی السرد)۔

"سابغات" "سابغ" کی جمع "کامل اور فراخ زرہ کے معنی میں ہے" اور "اسباغ نعمت" بھی نعمت کی فراخی کے معنی میں ہے۔

"سرد" اصل میں زرہ جیسی سخت چیزوں کو بُننے کے معنی میں ہے، اور "قدر فی السرد" کے جملہ کا مفہوم وہی زرہ کے حلقوں میں مناسب اندازوں کا خیال رکھنا، اور اس کے بُننے کی طرز ہے۔

درحقیقت خدا داؤدؑ کو ایسا حکم دے رہا ہے کہ جو ساری دنیا جہان کے باایمان صنعت کاروں اور کاریگروں کے لیے ایک نمونہ ہو، یہ مصنوعات میں پختہ کاری و مضبوطی اور ان کی کیفیت و کمیت میں انتہائی احتیاط برتنے کا حکم ہے، تاکہ انہیں استعمال کرنے والے اچھی طرح اور راحت و سکون کے ساتھ اس سے استفادہ کرسکیں اور کامل استحکام سے فائدہ اٹھائیں۔

داؤدؑ سے کہتا ہے: زرہ کو کشادہ اور آرام دہ بناؤ، تاکہ جنگ کرنے والے اسے پہنتے وقت قید خانہ میں ہی گرفتار نہ ہو جاتے، نہ تو اس کے حلقوں کو اندازہ سے زیادہ چھوٹا اور باریک بناؤ کہ اُس میں لڑنے کی حالت ہی باقی نہ رہے، اور نہ ہی زیادہ سخت اور کناروں کے بغیر کہ کبھی تلوار و خنجر و نیزہ و تیر کی نوک ہی اس کے اندر چلی جائے، بلکہ اس کی ہر چیز اندازے کے مطابق اور مناسب ہو۔

خلاصہ یہ کہ خدا نے اس کے اصلی "مادہ" کو بھی "النا لہ الحدید" کے مطابق داؤدؑ کے اختیار میں دے دیا، اور اس کی شکل و صورت بنانے کی طرز اور زرہ بنانے کا طریقہ بھی داؤدؑ کو سکھا دیا، تاکہ اس "مادہ" اور "صورت" سے ایک کامل و مکمل نتیجہ برآمد ہو۔

آیت کے آخر میں داؤدؑ اور ان کے خاندان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ: "عمل صالح بجا لاؤ، کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو میں اُسے دیکھ رہا ہوں" (واعملوا صالحاً انی بما تعملون بصیر)۔

آیت کی ابتداء میں صرف داؤدؑ مخاطب ہیں اور آخر میں وہ اور ان کا خاندان یا وہ اور اُن کی قوم (مخاطب) ہیں، کیونکہ یہ تمام مسائل عمل صالح کے لیے ایک مقدمہ

اور تمہید ہیں، زِرہ بنانے کا مقصد آمدنی کا حصول نہیں ہے، اصل مقصد عملِ صالح ہے اور یہ چیزیں اس راہ میں ایک وسیلہ اور ذریعہ ہیں، کہ جن سے داؤدؑ بھی فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کا خاندان بھی۔

اور عملِ صالح کے شئون و حالات میں سے ایک یہ ہے کہ مصنوعات میں ہر طرح سے کافی و وافی احتیاط کو ملحوظ رکھیں، اور ایک مفید اور کامل پیداوار تیار کرکے دکھائیں اور ہر طرح کی برائی اور کمی رکھنے سے پرہیز کریں۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس خطاب کے مخاطب داؤدؑ اور وہ تمام لوگ ہیں کہ جو ان کے ہاتھ سے بنی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھاتے تھے، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دفاعی وسیلہ اور ذریعہ کو عملِ صالح کی راہ میں استعمال کریں، نہ کہ ظلم وجور اور گناہ کی راہ میں۔

(۱۲) وَلِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ غُدُوُّهَا شَهۡرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهۡرٌ ۚ وَ اَسَلۡنَا لَهٗ عَیۡنَ الۡقِطۡرِ ؕ وَ مِنَ الۡجِنِّ مَنۡ یَّعۡمَلُ بَیۡنَ یَدَیۡهِ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنۡ یَّزِغۡ مِنۡهُمۡ عَنۡ اَمۡرِنَا نُذِقۡهُ مِنۡ عَذَابِ السَّعِیۡرِ ○

(۱۳) یَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِیۡبَ وَ تَمَاثِیۡلَ وَ جِفَانٍ کَالۡجَوَابِ وَ قُدُوۡرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ ○

(۱۴) فَلَمَّا قَضَیۡنَا عَلَیۡهِ الۡمَوۡتَ مَا دَلَّهُمۡ عَلٰی مَوۡتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الۡاَرۡضِ تَاۡکُلُ مِنۡسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الۡجِنُّ اَنۡ لَّوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ الۡغَیۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِی الۡعَذَابِ الۡمُهِیۡنِ ○

ترجمہ

(۱۲) اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا کہ وہ صبح کے وقت بھی ایک مہینہ کی راہ طے کیا کرتی، اور شام کے وقت بھی ایک مہینے کی راہ طے کرتی تھی، اور ہم نے ان کے لیے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا تھا، اور خدا کے حکم سے جنوں کا ایک گروہ، ان کی خدمت میں کام سرانجام دیا کرتا تھا، اور ان میں سے جو کوئی ہمارے حکم سے روگردانی کرتا تھا، تو ہم اُسے جلانے والی آگ کا مزہ چکھاتے تھے۔

(۱۳) جو کچھ سلیمان چاہتے تھے وہ ان کے لیے بناتے رہتے تھے، عبادت خانے، تصویریں (یا مورتیاں) کھانے کے لیے بڑے بڑے حوض جیسے برتن اور ایک ہی جگہ جمی ہوئی دیگیں (جو بڑی بڑی ہونے کی وجہ سے نقل وحمل کے قابل نہ تھیں، اور ہم نے ان سے کہا): "اے آلِ داؤد! تم (ان نعمتوں کا) شکر بجا لاؤ، لیکن میرے بندوں میں سے بہت کم لوگ شکر کرنے والے ہیں۔

(۱۴) (سلیمان کی اس شان وشوکت اور جاہ وجلال کے باوجود) جب ہم نے ان کے لیے موت کا حکم جاری کر دیا، تو کسی نے بھی اس کے مرنے کی انہیں خبر نہ دی، سوائے زمین پر چلنے والی (دیمک) کے کہ جو اُس کے عصا کو کھا رہی تھی، (یہاں تک کہ وہ عصا ٹوٹ گیا اور سلیمان کا جسم زمین پر آگرا) جب وہ زمین پر گرے تو اُس وقت جِنّوں نے سمجھا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو وہ اس ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔

تفسیر

سلیمان کا جاہ وجلال اور ان کی عبرت انگیز موت

ان مواہب کی بحث کے بعد کہ جو خدا نے داؤدؑ کو دیئے تھے، ان کے بیٹے سلیمانؑ کا ذکر شروع کیا ہے۔ داؤدؑ کے بارے میں تو دو نعمتوں کا بیان کیا تھا، لیکن ان کے بیٹے سلیمانؑ کے بارے میں تین عظیم نعمتوں کے متعلق بحث کرتا ہے، فرماتا ہے: "ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، جو صبح کے وقت بھی ایک ماہ کی راہ طے کرتی تھی اور عصر کے وقت بھی ایک ماہ کی راہ چلتی تھی" (ولسلیمان الریح غدوھا شھر و

رواحہا شہر)[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ باپ کے لیے تو سخت اور حد سے زیادہ محکم جسم یعنی لوہے کو مسخر کرتا ہے اور بیٹے کے لیے بہت ہی لطیف موجود کو مسخر کیا ہے لیکن دونوں کام اصلاحی اور معجزہ نما ہیں، اور مفید ہیں، سخت جسم کو تو داؤدؑ کے لیے نرم کرتا ہے، اور ہَوا کی لطیف و نرم امواج کو سلیمانؑ کے لیے فعال اور محکم۔

ہَوا کی لطافت ہرگز اس سے مانع نہیں ہے کہ وہ اہم افعال کو انجام دے، یہ ہَوائیں ہی تو ہوتی ہیں کہ جو بڑے بڑے بحری جہازوں کو سمندروں کی سطح پر چلاتی ہیں، اور چکی کے بھاری اور سنگین پتھروں کو چکر دیتی ہیں اور بڑے بڑے پیکروں کو آسمان کی بلندی پر ہوائی جہازوں کی شکل میں چلاتی ہیں۔

ہاں! خدا نے اس لطیف جسم کو اس حیران کن قدرت و طاقت کے ساتھ حضرت سلیمانؑ کے اختیار میں دے دیا تھا۔

یہ بات کہ ہَوا سلیمانؑ کی دستگاہ (اس کے تخت یا فرش کو) کس طرح چلاتی تھی، ہمارے لیے واضح نہیں ہے، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ کوئی چیز خدا کی قدرت کے مقابلہ میں مشکل اور پیچیدہ نہیں ہے جہاں انسان اپنی ناچیز قدرت کے ساتھ غباروں (یعنی ان حفاظتی چیزوں کو کہ جن میں ہلکی گیسیں بھر دیا کرتے تھے اور وہ آسمان کی طرف پرواز کر جاتے تھے اور بعض اوقات کچھ آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے) اور موجودہ زمانے میں دیوہیکل بڑے بڑے ہَوائی جہاز سینکڑوں مسافروں اور زیادہ سے زیادہ وسائل اور ساز و سامان کے ساتھ آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتے ہیں، تو خدا کے لیے سلیمانؑ کی بساط کو ہَوا کے ذریعہ چلانا کیسے مشکل ہو سکتا ہے؟

وہ کون سے عوامل تھے کہ جو سلیمانؑ اور ان کی بساط و مسند کو گرنے، ہَوا کے دباؤ اور آسمانی حرکت سے پیدا ہونے والی دوسری مشکلات سے حفاظت کرتے تھے؟! یہ بات بھی ایسے مسائل میں سے ہے کہ جن کی جزئیات ہمارے لیے واضح نہیں ہیں، لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ انبیاء کی تاریخ میں اس قسم کی خارقِ عادت چیزیں بہت تھیں، اگرچہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کچھ نادان لوگوں یا دانا دشمنوں نے ان میں خرافات کی آمیزش کر دی ہے، جس کے باعث ان مسائل کا اصلی چہرہ دگرگوں اور بدنما ہو گیا ہے، اور ہم اس سلسلہ میں صرف اتنی ہی مقدار پر، کہ جتنا قرآن

---

[1] "لسلیمان" میں جار و مجرور ایک مقدر فعل سے متعلق ہے، یعنی "سخرنا"، کہ جو گزشتہ آیات کے قرینہ سے سمجھا جاتا ہے، اور سورہ ص کی آیہ ۳۶ میں اس کی تصریح ہوئی ہے، جہاں کہتا ہے "فسخرنا لہ الریح"۔ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "لسلیمان" میں "لام" اختصاص کے لیے ہے، جو اس طرف اشارہ ہے کہ یہ معجزہ اس پیغمبر کے ساتھ مخصوص تھا، اور کوئی دوسرا پیغمبران کے ساتھ اس امر میں شریک نہیں تھا۔

نے اشارہ کیا ہے، قناعت کرتے ہیں [1]

"غدو" (بروزن علو) طرفِ صبح کے معنی میں ہے "رواح" کے مقابلہ میں کہ جو غروب کی طرف کو کہتے ہیں، کہ جس وقت جانور آرام کرنے کے لیے اپنی جگہ کی طرف لوٹتے ہیں، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں "غدو" دن کے پہلے آدھے حصّے کے معنی میں ہے اور "رواح" دن کے دوسرے آدھے حصہ کے معنی میں، اور آیہ کا مفہوم یہ ہے کہ سلیمانؑ صبح سے ظہر تک اس راہوار مرکب پر اس زمانہ کے مسافروں کے ایک مہینہ کے سفر کی مقدار کے برابر سفر کرتے تھے اور دن کے دوسرے آدھے حصہ میں بھی اسی مقدار میں راستہ چلتے تھے۔

اس کے بعد سلیمانؑ کے لیے خدا کی دوسری نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "اور ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ جاری کیا" (واسلنا لہ عین القطر)۔

"اسلنا" "سیلان" کے مادہ سے جاری کرنے کے معنی میں ہے، اور "قطر" تانبے کے معنی میں ہے، اور مراد یہ ہے کہ ہم نے اس دھات کو اس کے لیے پگھلا دیا تھا اور وہ پانی کے چشمہ کی طرح بہنے لگا۔

بعض "قطر" کو دھاتوں کی مختلف اقسام کے معنی میں، یا کانسی کے معنی میں سمجھتے ہیں تو اس طرح باپ کے لیے تو لوہا نرم ہوا، اور بیٹے کے لیے دھاتیں پگھلا دی گئیں، (لیکن مشہور وہی پہلا معنی ہی ہے)۔

پگھلے ہوتے تانبہ کا چشمہ یا دوسری دھاتوں کو سلیمانؑ کے اختیار میں کس طرح دیا گیا؟ کیا خدا نے اعجاز و الہام کے ذریعہ اس پیغمبر کو ان دھاتوں کو پگھلانے کا طریقہ انتہائی وسیع اندازوں کے ساتھ سکھایا تھا؟

یا اس بہنے والی دھات کا چشمہ، انہیں چشموں کی مانند کہ جو آتش فشاں پہاڑوں کے فعال ہونے کے موقع پر ان کے دامن سے نیچے کی طرف بہتے ہیں، اعجاز آمیز طریقہ سے ان کے اختیار میں قرار پایا؟ یا کسی اور طریقہ سے؟ یہ بات صحیح طور پر ہمارے لیے واضح نہیں ہے، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس عظیم پیغمبر کے بارے میں خدا کے الطاف میں سے ایک یہ تھا۔

آخر میں سلیمانؑ کے لیے پروردگار کی تیسری موہبت و نعمت جنّوں میں سے ایک بہت بڑے گروہ کے مسخر کیے جانے کو بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "اور خدا کے حکم سے جنّوں کے گروہ اس کے سامنے اس کے لیے کام کیا کرتا تھا" (ومن الجن من یعمل بین یدیہ باذن ربہ)۔

---

[1] اس سلسلے میں ہم نے جلد ۷ ——— (سورہ انبیاء کی آیہ ۸۱ کے ذیل) میں بھی بحث کی ہے۔

"اور جب ان میں سے کوئی ہمارے حکم سے سرتابی کرتا تھا تو ہم اسے جلانے والی آگ کے ساتھ سزا دیتے تھے" (ومن یزغ منھم عن امرنا نذقه من عذاب السعیر)۔

"جن" جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، ایک ایسا وجود ہے کہ حِس سے پوشیدہ اور عقل و قدرت کا حامل ہے، اور جیسا کہ قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے وہ واجبات وفرائض خداوندی کا مکلف بھی ہے۔

"جنوں" کے بارے میں لوگوں نے بہت سے بیہودہ افسانے اور داستانیں گھڑ رکھی ہیں، لیکن اگر ہم ان خرافات کو ترک کر دیں، تو ان کا اصل وجود اور مخصوص صفات، جو قرآن میں جنوں کے لیے بیان ہوئی ہیں' ایک ایسے مطلب کا حامل ہے جو علم وعقل سے قطعاً بعید نہیں ہے' اور ہم انشاء اللہ سورہ جن کی تفسیر میں اس موضوع کو مزید تشریح وتفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

بہر حال اوپر والی آیت کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم طاقت کی تسخیر بھی پروردگار کے فرمان سے ہی تھی' اور جس وقت وہ اپنے وظائف اور ذمہ داریوں سے سرتابی کرتے تھے تو انہیں سزا دی جاتی تھی۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ یہاں " عذاب السعیر" سے مراد قیامت کے دن کی سزا ہے، جبکہ آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخالفت کرنے والوں کے لیے دنیا میں سزا ہے، سورہ ص کی آیات سے بھی یہ بات اچھی طرح ثابت ہے کہ خدا نے شیاطین کا ایک گروہ سلیمانؑ کے قبضہ میں دے رکھا تھا، جو ان کے لیے اہم قسم کے تعمیراتی کام سرانجام دیا کرتے تھے' اور جس وقت وہ خلاف ورزی کرتے تھے تو انہیں زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا تھا! " والشیاطین کل بناء وغواص و اٰخرین مقرنین فی الاصفاد" (ص آیات ۳۷، ۳۸)۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ سلیمانؑ کے ملک اور سلطنت ایسی، ایک وسیع وعریض سلطنت اور ملک کے نظام کو چلانے کے لیے بہت ہی زیادہ عوامل کی ضرورت ہے لیکن سب سے زیادہ اہم وہی تین عوامل ہیں جن کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

پہلا ایک مستقل اور حاوی تیز رفتار نقل وحمل کا وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعہ رئیس حکومت ومملکت اپنے ملک کے تمام اطراف وجوانب سے آگاہ ہو سکے۔

دوسرے خام مال، جو لوگوں کی زندگی کے لیے ضروری آلات واسباب بنانے اور مختلف صنعتوں کے لیے کام آسکے۔

اور آخری کام کرنے کی فعال قوت، کہ جو اس خام مال سے کافی مقدار میں فائدہ اٹھا سکے، اور انہیں حسبِ ضرورت اپنے کام میں لا سکے، اور اس لحاظ سے ملک کی مختلف ضرورتوں

کو پورا کر سکے۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے یہ تینوں باتیں سلیمانؑ کے اختیار میں دے دی تھیں، اور وہ بھی رفاہ عامہ، عام آبادی اور امن و امان کے لیے ان سے احسن طریقے سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

یہ موضوع صرف سلیمانؑ کے زمانہ اور ان کی حکومت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا، آج بھی اور کل بھی، یہاں بھی اور ہر جگہ، تمام ملکوں کا صحیح طور پر انتظام چلانے کے لیے ضروری ہے۔

⁂

بعد والی آیت میں جنّوں کے اہم تولیدی کاموں کے ایک حصہ کی طرف ــ جو وہ سلیمانؑ کے حکم سے انجام دیتے تھے ــ اشارہ کرتے ہوتے کہتا ہے کہ:

سلیمان جو کچھ بھی چاہتے تھے وہ ان کے لیے ــ عبادت خانوں، تمثالوں، حوض کے مانند بڑے بڑے کھانوں کے برتنوں اور زمین پر ثابت (جمی ہوئی یا گڑی ہوئی) دیگوں سے ــ تیار کر کے دیتے تھے" (یعملون له مایشاء من محاریب و تماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیات)۔

ان میں سے ایک حصہ تو معنوی اور عبادت کے مسائل سے مربوط تھا، اور ایک حصہ انسانوں کی جسمانی ضروریات اور ان کے عظیم لشکریوں اور کارکنوں کی جمعیت کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔

"محاریب" جمع ہے "محراب" کی کہ جو لغت میں "عبادت گاہ" یا "محلات" اور "بڑی بڑی عمارتوں" کے معنی میں ہے، کہ جو عبادت کی خاطر بنائی جاتی ہیں۔

بعض اوقات صدر مجلس یا صدر مسجد و معبد کے حصّہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، وہ چیز جس کو آج محراب کہتے ہیں وہ امام جماعت کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے، درحقیقت ایک نئی تعبیر اور ایک نیا معنی ہے جو اصل مادہ سے حاصل کیا گیا ہے۔

بہرحال چونکہ یہ لفظ "حرب" کے مادہ سے، جنگ کے معنی میں ہے، لہٰذا عبادت خانوں کو "محراب" کا نام دینے کا سبب یہ سمجھا ہے، کہ یہ شیطان اور ہوائے نفس کے ساتھ "محاربہ" یعنی جنگ کرنے کی جگہ ہے[1]

یا "حرب" اُس لباس کے معنی میں ہے کہ جو میدانِ جنگ میں دشمن کے بدن سے اتارا جاتا ہے، چونکہ انسان کو چاہیئے کہ وہ عبادت خانوں میں دُنیوی افکار اور دل کی پراگندگی کی پوشاک

---

[1] مفردات راغب مادہ "حرب"۔

کو اپنے اوپر سے اتار دے [1]

بہر حال سلیمانؑ کے یہ فعال اور چابک دست کارندے بڑے بڑے باشکوہ عبادت خانے، کہ جو حکومت الٰہیہ اور اس کی مذہبی سلطنت کے لائق تھے، اس کے لیے بناتے تھے تاکہ لوگ راحت و آرام کے ساتھ اپنے عبادت کے فرائض کو انجام دے سکیں۔

"تماثیل" جمع ہے "تمثال" کی جو بیل بوٹوں اور تصویر کے معنی میں آیا ہے اور مجسمہ کے معنی میں بھی اس بارے میں کہ یہ مجسمے یا نقوش، کون سے موجودات کی صورتیں تھیں اور سلیمانؑ نے ان کی تیاری کا حکم کیوں دیا تھا، مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ زیب و زینت اور سجاوٹ کا پہلو رکھتے ہوں جیسا کہ ہماری اہم قدیمی بلکہ جدید عمارتوں میں بھی نظر آتا ہے۔

یا یہ ان عمارتوں کا رعب اور دبدبہ بڑھانے کے لیے ہو، کیونکہ کچھ حیوانات مثلاً شیر کی تصویر بہت سے لوگوں کے افکار میں رعب و دبدبہ پیدا کرنے والی ہے۔

کیا سلیمانؑ کی شریعت میں ذی روح موجودات کا مجسمہ بنانا جائز تھا، جبکہ یہ اسلام میں ممنوع ہے؟ یا جو مجسمے وہ سلیمانؑ کے لیے بناتے تھے، غیر ذی روح کی جنس سے تھے، مثلاً درختوں، پہاڑوں، سورج چاند اور ستاروں کی تصویریں۔

یا اُن کے لیے صرف دیواروں پر نقش و نگار کیا کرتے تھے جیسا کہ قدیمی تاریخی آثار میں اکثر گلکاریوں کی صورت میں نظر آتی ہیں اور ہم یہ جانتے ہیں کہ نقش و نگار چاہے جیسے بھی ہوں — مجسمہ کے برخلاف — حرام نہیں ہیں۔

یہ سب احتمالات ہیں، چونکہ اسلام میں مجسمہ سازی کو حرام قرار دیا جاتا ہے ممکن ہے کہ بت پرستی کے مسئلہ کے ساتھ شدید مبارزہ کرنے اور اس کی بیخ کنی کی خاطر ہو اور سلیمانؑ کے زمانہ میں اس بات کی اتنی ضرورت نہ ہو اور یہ حکم ان کی شریعت میں نہ ہو۔

لیکن ایک روایت میں جو امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہے یہ بیان کیا گیا ہے:

"واللّٰہ ما ھی تماثیل الرجال والنساء ولکنھا الشجر و شبھہ"

خدا کی قسم سلیمانؑ کے حکم سے بنائی جانے والی تمثال مردوں اور عورتوں کے مجسمے نہ تھے، بلکہ درخت وغیرہ کی تصویریں تھیں [2]

---

[1] مفردات راغب مادہ "حرب"۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۲، ابواب ما یکتسب بہ حدیث ۱۔

"جفان" جمع "جفنہ" (بروزن وزنہ) کھانا کھانے کے برتنوں کے معنی میں ہے اور "جواب" جمع "جابیہ" کی، پانی کے حوض کے معنی میں ہے اور اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلیمانؑ کے لیے بہت بڑے بڑے برتن، کہ جو حوض کی طرح ہوتے تھے، تیار کیا کرتے تھے، تاکہ ایک کثیر گروہ ان کے گرد بیٹھ کر کھانا کھا سکیں، اور اگر ہم نے اس بات کو بھلا نہ دیا ہو تو تھوڑے ہی سے پہلے زمانہ کی بات ہے ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر بڑے بڑے (غذا کے) مجموعوں سے اکٹھے مل کر کھایا کرتے تھے، اور حقیقت میں ان کا دسترخوان، وہی بڑا برتن ہوا کرتا تھا، اور موجودہ زمانہ کی طرح ہر ایک کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ مستقل طور پر برتنوں کا رواج نہیں تھا۔

"قدور" جمع "قدر" (بروزن قشر) اُس برتن کے معنی میں ہے کہ جس میں کھانا پکایا جاتا ہے (دیگ) اور "راسیات" جمع "راسیہ" کی ہے، جو ایک ہی جگہ پر گڑی ہوئی یا ثابت وجمی ہوئی کے معنی میں ہے، اور یہاں وہ دیگیں مراد ہیں کہ جنہیں ان کے بڑے ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جاتا تھا۔

آیت کے آخر میں ان نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد داؤدؑ کی اولاد سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے آلِ داؤد! شکر گزاری کرو" (اعملوا اٰل داؤد شکرًا)۔

"لیکن میرے بندوں میں سے بہت ہی تھوڑے لوگ شکر کرنے والے ہیں" (وقلیل من عبادی الشکور)۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اگر شکر گزاری سے مراد صرف زبان کے ساتھ شکر، شکر، کہنا ہو تو پھر تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، کہ اس پر عمل کرنے والے کم ہوں، بلکہ اس سے مراد "عملی طور پر شکر" ادا کرنا ہے یعنی نعمتوں کو انہیں مقاصد میں استعمال کرنا جن کے لیے وہ پیدا کی گئیں اور عطا کی گئیں ہیں، اور یہ بات مسلّم ہے، کہ وہ لوگ کہ جو خدا کی نعمتوں کو عام طور پر ان کی اپنی جگہ پر استعمال کریں، بہت ہی تھوڑے ہیں۔

بعض بزرگ شکر کے لیے تین مراحل کے قائل ہوئے ہیں:

اوّل: دل کے ساتھ شکر کرنا، یعنی نعمت کا تصور کرنا، اور اس پر راضی ہونا اور خوشی کا اظہار کرنا۔

دوسرے: زبان کے ساتھ شکر کرنا یعنی نعمت دینے والے کی حمد و ثنا بیان کرنا۔

تیسرے: تمام اعضاء و جوارح کے ساتھ شکر کرنا، اور وہ اعمال کو اس نعمت کے ساتھ ہم آہنگ بنانا ہے۔

"شکور" مبالغہ کا صیغہ ہے اور بہت زیادہ شکر ادا کرنے کو ظاہر کرتا ہے، جو کہ دل، زبان اور اعضاء

جوارح کے ساتھ متواتر و مسلسل شکر کو دہراتے رہنا ہے۔

البتہ بعض اوقات یہ صفت خدا کے لیے بھی لائی گئی ہے، جیساکہ سورہ تغابن کی آیہ ۱۷ میں بیان ہوا ہے: "واللّٰہ شکور حلیم" خدا کی شکرگزاری سے مراد یہ ہے کہ بندے جتنا اس کی اطاعت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں، اتنا ہی وہ انہیں اپنے الطاف و انعامات سے نوازتا ہے اور ان کی قدردانی کرتے ہوئے انہیں اپنے فضل و کرم سے اس سے کہیں زیادہ عطا فرماتا ہے کہ جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔

بہرحال یہ تعبیر کہ میرے بندوں میں سے کم لوگ شکرگزار ہیں، ممکن ہے کہ یہ اس گروہ کے مقام کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے ہو کہ جو ایک نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں، یا مراد یہ ہو کہ تم بھی کوشش کرو اور ان کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ تاکہ شکر کرنے والوں کی جماعت میں اضافہ ہو۔

***

آخری زیر بحث آیت، اس حال میں کہ وہ سلیمانؑ کے بارے میں بھی، آخری گفتگو ہے، خدا کے اس عظیم پیغمبر کی عجیب و غریب اور عبرت انگیز موت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور اس حقیقت کو روشن کر رہی ہے، کہ اتنے باعظمت پیغمبر اور اتنی قدرت رعب اور دبدبہ رکھنے والے حکمران نے اپنی جان کس طرح آسانی کے ساتھ جان آفرین کے سپرد کر دی، یہاں تک کہ بستر پر لیٹنے سے پہلے ہی موت کے چنگل نے ان کے گریبان کو پکڑ لیا۔

فرماتا ہے: "جب ہم نے سلیمان کے لیے موت کا حکم نافذ کر دیا تو کسی نے بھی لوگوں کو اس کی موت سے آگاہ نہ کیا مگر زمین پر رینگنے والے نے کہ جس نے اس کے عصا کو کھا لیا یہاں تک کہ اس کا عصا ٹوٹ گیا اور سلیمان کا پیکر نیچے گر پڑا" (فلما قضینا علیہ الموت ما دلّھم علٰی موتہ الّا دابۃ الارض تأکل منسأتہ)[1]

اوپر والی آیت کی تعبیر اور اسی طرح متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سلیمانؑ کی موت کا وقت آن پہنچا تو وہ اس وقت کھڑے ہوئے تھے اور اپنے عصا پر تکیہ کیے ہوئے تھے کہ اچانک موت نے ان کو آپکڑا، اور ان کی روح بدن سے پرواز کر گئی، وہ ایک مدت تک اسی حالت میں کھڑے

---

[1] "منسأتہ" مادہ نساء (بر وزن نیز) اور نسیئی (بر وزن نصیب) سے تاخیر کے معنی میں ہے اور چونکہ عصا سے چیزوں کو پیچھے کی طرف دھکیلتے ہیں اور دور کرتے ہیں لہٰذا لفظ "منسأتہ" اس پر بولا گیا ہے (یعنی پیچھے دھکیلنے کا ذریعہ) بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ لفظ اہل یمن کے الفاظ میں سے تھا اور چونکہ سلیمان اس علاقہ پر حکومت رکھتے تھے لہٰذا قرآن نے ان کے بارے میں اسے استعمال کیا ہے۔ (مفردات راغب، تفسیر قرطبی اور روح البیان کی طرف رجوع کریں)۔

رہے یہاں تک کہ دیمک نے کہ قرآن جسے "دابۃ الارض" (زمین پر رینگنے والی چیز) سے تعبیر کرتا ہے، ان کے عصا کو کھا لیا، جس سے ان کا اعتدال برقرار نہ رہ سکا اور زمین پر گر پڑے تب لوگ ان کی موت سے آگاہ ہوئے۔

لہٰذا اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ: "جب سلیمانؑ گرے تو اس وقت جنات سمجھے کہ اگر وہ غیب سے آگاہ ہوتے تو ذلیل کرنے والے عذاب میں گرفتار نہ رہتے" (فلما خر تبینت الجن ان لو کانوا یعلمون الغیب ما لبثوا فی العذاب المھین)۔

"تبینت" کا جملہ "تبیین" کے مادہ سے عام طور پر آشکار و واضح ہونے کے معنی میں (فعل لازم) ہے، اور بعض اوقات کسی چیز کو جاننے اور اس سے آگاہ ہونے کے معنی میں (فعل متعدی کے طور پر) بھی آتا ہے، اور یہاں دوسرے ہی معنی کے ساتھ مناسب ہے، یعنی اس وقت تک گروہ جن سلیمانؑ کی موت سے آگاہ نہیں تھا، اور انہوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ اگر وہ غیب کے اسرار سے آگاہ ہوتے تو اس مدت میں ایسے سخت کاموں کی زحمت و تکلیف میں باقی نہ رہتے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس جملہ کو پہلے معنی میں لیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ آیت کا مفہوم اس طرح ہے، کہ سلیمانؑ کے گر جانے کے بعد جنوں کی حالت، انسانوں کے لیے واضح و آشکار ہو گئی کہ وہ غیب کے اسرار سے آگاہ نہیں ہیں، اور کچھ لوگ بلا جواز ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔[1]

"عذاب مھین" کی تعبیر ممکن ہے کہ اُن سنگین و سخت کاموں کی طرف اشارہ ہو کہ جو سلیمانؑ جرمانہ اور سزا کے عنوان سے جنوں کے ذمہ ڈالتے تھے، ورنہ خدا کا پیغمبر کسی شخص کو بلا وجہ کسی سختی اور عذاب وہ بھی "ذلیل و خوار کرنے والے عذاب" میں ہرگز نہیں ڈالتا۔

چند نکات

۱۔ سلیمانؑ کی عبرت انگیز زندگی کا منظر

قرآن مجید۔ موجودہ تورات کے برخلاف کہ جو سلیمانؑ کو ایک جبار، بت خانہ ساز اور عورتوں کی ہوس میں مبتلا بادشاہ کے طور پر متعارف کراتی ہے[2]۔ سلیمانؑ کو خدا ایک عظیم پیغمبر شمار کرتا ہے،

---

[1] پہلی صورت میں آیت کی ترتیب اس طرح ہوتی، تبینت فعل جن فاعل (یہاں معنی جمع کا ہے) اور ان لو کانوا.... اس کے مفعول کی جگہ پر ہے، اور دوسری صورت میں تبینت فعل اور امر الجن۔ فاعل پھر مضاف حذف ہو گیا ہے اور مضاف الیہ اس کا قائم مقام بنا ہے، وان لو کانوا .... اس کا بیان و وضاحت ہے۔

[2] تورات کتاب اوّل ملوک و پادشاہان ۔

اور انہیں قدرت اور بے نظیر حکومت کے نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے' اور سلیمانؑ سے مربوط مباحث کے دوران بہت ہی عظیم درس انسانوں کو دیتا ہے' کہ ان داستانوں کے ذکر کرنے کا اصل مقصد وہی ہیں۔

ہم نے اوپر والی آیات میں پڑھا ہے کہ خدا نے اس بزرگ پیغمبر کو بہت ہی عظیم نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔

بہت ہی سریع اور تیز رو سواری کہ جس کے ذریعے وہ مختصر سی مدت میں اپنے سارے ملک کی سیر کر سکتے تھے۔

مختلف صنعتوں کے لیے فراواں معدنی مواد۔

اس معدنی مواد کو استعمال کرنے کے لیے کافی فعال قوت۔

انہوں نے ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے بڑے عبادت خانے بنائے اور لوگوں کو عبادت کی طرف ترغیب دی' علاوہ ازیں حکومت کی فوجوں، کارکنوں اور کمزور لوگوں کے طبقات کی پذیرائی کے لیے وسیع و عریض پروگرام منظم کیا کہ جس کے برتنوں کے نمونہ سے۔ کہ جو اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے۔ باقی چیزوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان تمام نعمتوں کے مقابلہ میں انہیں شکر گزاری کا حکم دیا، اس مطلب پر تاکید کرتے ہوئے کہ خدا کی نعمتوں کے شکر کا حق بہت ہی کم لوگ ادا کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد یہ واضح و روشن کیا کہ ایک شخص اس قدرت و عظمت کے باوجود موت کے مقابلہ میں کتنا کمزور اور ناتواں تھا، کہ وہ ایک ہی لمحہ میں ناگہانی موت کے ذریعہ دنیا سے چل بسا، اس طرح سے کہ اجل نے اسے بیٹھنے یا بستر پر لیٹنے تک کی مہلت بھی نہ دی' تاکہ مغرور و سرکش کرنے والے یہ گمان نہ کرلیں کہ اگر وہ کسی مقام پر پہنچ جائیں اور قدرت و قوت حاصل کرلیں تو واقعی طور پر وہ توانا ہو گئے ہیں، وہ جس کے سامنے جنّ اور انسان، شیطان و پری خدمت میں لگے ہوئے تھے' اور زمین و آسمان جس کی جولانگاہ تھے' اور جس کی حشمت اور شان و شوکت میں جو بھی شک کرے اس کی عقل و فکر پر مرغ و ماہی قہقہہ لگائیں، ایک مختصر سے لمحہ میں سمندر کی موجوں پر ابھرنے والے بلبلے کی طرح محو و نابود ہو گیا۔

اور یہ بھی واضح و روشن کر دے کہ ایک ناچیز عصا اُسے ایک مدت تک کس طرح اٹھائے رہا اور "جن" اُسے کھڑا ہوئے یا بیٹھے ہوئے دیکھتے رہنے کی وجہ سے کیسے سرگرمی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہے؟

اور یہ بھی (دکھا دے) کہ دیمک نے انہیں کس طرح زمین پر گرایا اور ان کے ملک کے تمام

رشتوں کو توڑ کے رکھ دیا۔ ہاں! ایک عصا ہی اُس وسیع و عریض ملک کی فعال قوت کو بروئے کار لائے ہوئے تھا اور ایک چھوٹی سی دیمک نے اس کو حرکت سے روک دیا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس دن سلیمانؑ نے دیکھا کہ ایک خوبصورت اور خوش پوش جوان قصر کے ایک کونہ سے باہر آیا اور ان کی طرف بڑھا، سلیمانؑ نے تعجب کیا، کہا: تُو کون ہے؟ اور کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے؟ مَیں نے تو یہ حکم دیا ہُوا تھا کہ آج کوئی شخص یہاں نہ آنے پائے۔

اس نے جواب دیا: مَیں وہ ہوں کہ نہ بادشاہوں سے ڈرتا ہوں اور نہ کسی سے رشوت لیتا ہوں سلیمانؑ نے بہت ہی تعجب کیا۔ لیکن اُس نے مہلت نہ دی اور کہا مَیں موت کا فرشتہ ہوں، مَیں اس لیے آیا ہوں تاکہ مَیں آپ کی روح قبض کروں! یہ کہتے ہی فوراً ان کی روح قبض کر لی[1]

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بہت سے انبیاء کی داستانوں کی طرح حضرت سلیمانؑ کی داستان میں بھی افسوسناک حد تک گھڑی ہوئی روایات شامل کر دی گئی ہیں، اور ان کے ساتھ بہت سی خرافات منسوب کر دی گئی ہیں کہ جنہوں نے اس عظیم پیغمبر کے چہرے کو بدل دیا ہے، اور ان خرافات کا زیادہ تر حصّہ موجودہ تورات سے لیا گیا ہے اور اگر ہم صرف اسی پر قناعت کریں کہ جو قرآن نے کہا ہے تو پھر کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

۲۔ سلیمانؑ کی موت ایک مدت تک کیوں پوشیدہ رہی؟

یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ کی موت ان کے کارکنانِ حکومت پر کتنی مدت تک مخفی رہی، صحیح طور پر واضح نہیں ہے، ایک سال؟ ایک ماہ؟ یا چند روز۔

مفسرین کا اس سلسلہ میں ایک نظریہ نہیں ہے۔

کیا یہ اخفا اور کتمان ان کے اصحاب اور ارکان سلطنت کی جانب سے صورت پذیر ہُوا تھا؟

کیا انہوں نے جانتے بوجھتے اس غرض سے کہ کہیں امورِ سلطنت کا رشتہ وقتی طور پر بکھر نہ جائے، ان کی موت کو پوشیدہ رکھا؟

یا یہ کہ اصحاب و ارکانِ سلطنت بھی اس امر سے آگاہی نہیں رکھتے تھے۔

یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کہ ایک طولانی مدت تک، یہاں تک کہ ایک دن سے زیادہ ہی سہی، ان کے اطراقیان (گرد و پیش رہنے والے اصحاب و ارکانِ سلطنت) بھی آگاہ نہ ہوں، کیونکہ

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ ص ۳۴۵ علل الشرائع مطابق نقل المیزان جلد ۱۶ ص ۳۹۱۔

یہ بات تو مسلّم ہے کہ کچھ لوگ ان کا کھانا لے جانے پر مامور تھے اور ان تک دوسری ضروریات پہنچاتے تھے، تو وہ تو اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہو جاتے، اس بنا پر بعید نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے۔ کہ وہ اس امر سے آگاہ تھے لیکن اسے کچھ مصلحتوں کی بنا پر مخفی رکھا، اسی لیے بعض روایات میں آیا ہے کہ اس مدت میں "آصف بن برخیا" ان کے وزیر خاص ملک کے امور کی تدبیر کرتے اور نظم و نسق چلاتے رہے۔

کیا سلیمانؑ کھڑے ہوئے عصا کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے یا بیٹھے ہوئے اپنے ہاتھ عصا پر رکھے ہوئے تھے، اور سر کو ہاتھوں پر ٹکائے ہوئے تھے اور اسی حالت میں ان کی روح قبض ہوگئی اور وہ ایک مدت تک اسی طرح رہے؟ اس سلسلے میں مختلف احتمالات ہیں، اگرچہ آخری احتمال زیادہ نزدیک نظر آتا ہے۔

اگر یہ مدت طولانی تھی تو کیا غذا کا نہ کھانا اور پانی کا نہ پینا دیکھنے والوں کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا تھا۔

چونکہ سلیمانؑ کے تمام کام عجیب و غریب تھے لہٰذا وہ شاید اس مسئلہ کو بھی عجیب و غریب شمار کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آہستہ آہستہ ایک گروہ کے درمیان یہ زمزمہ پیدا ہوا کہ سلیمانؑ کی پرستش کرنا چاہیئے، کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک عرصہ سے ایک ہی جگہ پر ثابت و برقرار ہے؟ نہ تو وہ سوتا ہے، نہ کھانا کھاتا ہے اور نہ پانی پیتا ہے۔[1]

لیکن جس وقت عصا ٹوٹا اور سلیمانؑ نیچے گرے تو یہ تمام رشتے ایک دوسرے سے ٹوٹ گئے، اور ان کے خیالات نقش بر آب ہوگئے۔

لیکن بہرحال جو کچھ بھی تھا سلیمانؑ کی موت کے اظہار میں اس تاخیر نے بہت سی چیزوں کو فاش کر دیا:

۱۔ سب پر واضح و روشن ہو گیا کہ اگر انسان قدرت و طاقت کی بلندی تک بھی پہنچ جائے تو پھر بھی حادثات کے مقابلہ میں ایک ضعیف و کمزور وجود ہے، اور ایک پرکاہ کی مانند ہے کہ جو طوفان کے راستہ میں ہر طرف اُڑتا رہتا ہے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

فلو ان احدًا یجد الی البقاء سلمًا او لدفع الموت سبیلًا لکان ذالک سلیمان ابن داؤد (ع)، الذی سخر له ملك الجن والانس مع النبوة وعظیم الزلفة۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۳ ص ۳۴۵۔

اگر کوئی شخص اس جہان میں عالمِ بقا کی طرف کوئی سیڑھی پاتا، یا اپنے آپ سے موت کو دُور کر سکتا، تو وہ سلیمانؑ تھے کہ جن کے لیے نبوت و مقامِ بلند کے ساتھ ساتھ جنوں اور انسانوں پر حکومت بھی فراہم تھی[1]

۲۔ سب لوگوں پر یہ حقیقت واضح و روشن ہوگئی کہ جنوں کو غیب کا علم نہیں ہے اور نادان و بے خبر انسان کہ جو ان کی پرستش کرتے تھے انتہائی خطا اور غلطی پر تھے۔

۳۔ تمام لوگوں کے سامنے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ کس طرح کسی ملک کا نظام اور شیرازہ ایک چھوٹے سے موضوع کے ساتھ وابستگی پیدا کرلے تو اس کے وجود کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے اور اس کے گر جانے سے گر جاتا ہے اور ان امور کے پیچھے پروردگار کی بے انتہا قدرت جلوہ گر ہے۔

۳۔ قرآن اور موجودہ تورات میں سلیمانؑ کی تصویر

اس حال میں کہ قرآن سلیمانؑ کو ایک عظیم پیغمبر کہتا ہے، ایسا پیغمبر کہ جو علم سے سرشار اور بہت زیادہ تقویٰ شعار تھا، ایسا پیغمبر کہ جو عظیم حکومت و سلطنت کا حکمران ہونے کے باوجود ہرگز مقام و مال کا اسیر نہ ہوا اور ان لوگوں سے کہ اسے فریب دینے کے لیے بہت سے گراں بہا ہدایا لائے تھے یہ کہا کہ: "اتمدونن بمال فما اٰتان اللّٰہ خیر مما اٰتاکم" ۔ "کیا تم میری مال کے ذریعہ مدد کرنا چاہتے ہو، حالانکہ جو کچھ خدا نے مجھے دیا ہے وہ اُس سے برتر ہے کہ جو تمہیں دیا ہے" (نمل۔ ۳۶)۔

ایسا پیغمبر کہ جس کی ساری آرزوئیں اور تمنائیں یہ تھیں کہ وہ پروردگار کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکے "قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علیّ وعلی والدیّ" ۔ "اس نے کہا: پروردگارا میری مدد کر اور توفیق عطا فرما کہ مَیں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کر سکوں کہ جو تُو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہیں"۔ (نمل ۔ ۱۹)

ایسا رہبر کہ جو یہ تک بھی اجازت نہ دیتا تھا کہ کوئی شخص جان بوجھ کر ایک چیونٹی پر بھی ظلم کرے اسی لیے وادیٔ نمل میں ایک چیونٹے نے یہ صدا بلند کی تھی کہ: "یا ایھا النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنودہ وھم لا یشعرون" ۔ "اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں بے خبری میں روند نہ ڈالے"۔ (نمل ۔ ۱۸)

وہ ایسا عبادت گزار تھا کہ اگر کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی دنیا میں مشغول ہو کر ذکرِ خدا سے غافل ہو جاتا تو فوراً اُس کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا اور کہتا کہ: "انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی"

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۲۔

"افسوس کہ اچھی چیزوں سے تعلق نے مجھے ایک لمحہ کے لیے خدا کی یاد سے اپنی طرف مشغول رکھا۔" (ص - ۳۲)

وہ ایسا حکیم و دانا تھا کہ جو قدرت رکھنے کے باوجود منطق و دلیل کے سوا بات نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ ایک پرندکے ساتھ بھی ۔ جیسا کہ ہُدہُد کے ساتھ بات کرنے میں ۔ حق و عدالت کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا ۔

وہ ایسا حاکم تھا کہ جس کا معاون و وزیر بھی "علم کتاب" سے اتنا سرشار تھا کہ وہ ایک ہی لمحہ میں بلقیس کے تخت کو حاضر کرسکتا تھا ۔

اور قرآن اس کی "اوّاب" (خدا کی طرف سے زیادہ سے زیادہ بازگشت کرنے والا) ۔ اور "نعم العبد" (بہت ہی اچھا بندہ) جیسے اوصاف کے ساتھ توصیف کرتا ہے ۔

وہ شخص کہ خدا نے "حکومت" اور "علم" جس کے اختیار میں دے دیا تھا اور اسے اپنی ہدایت کے ساتھ نوازا تھا، اور جس نے اپنی ساری عمر میں ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کے ساتھ شرک نہ کیا تھا ۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود آیئے دیکھیں! کہ موجودہ تحریف شدہ تورات اس بزرگ پیغمبر کے پاک دامن کو کس طرح شرک اور دوسری آلائشوں کے ساتھ آلودہ کر رہی ہے ۔

تورات نے بتکدے بنانے، بُت پرستی کو رواج دینے، عورتوں سے بے حساب عشق رکھنے اور ان کے عشق و عاشقی کی بہت ہی بدنام کرنے والی داستانوں میں ملوث کرنے کے سلسلے میں بہت ہی بدترین نسبتیں ان کے لیے بیان کی ہیں، ان کو نقل کرنے سے شرم آتی ہے، ہم ایک حصّہ کو جو نسبتاً ملائم اور نرم نظر آتا ہے اس جگہ بیان کرنے پر قناعت کرتے ہیں ۔

کتاب اوّل ملوک و پادشاہان میں اس طرح لکھا ہے :

اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ "موآبیوں"، "عمونیوں"، "ادومیوں"، "صیدونیوں" اور "حتیوں" میں سے بہت سی بیگانہ، اجنبی اور غیر عورتوں سے محبت کیا کرتا تھا، (یہ عورتیں) ان امتوں سے تعلق رکھتی تھیں کہ جن کے بارے میں خدا کا بنی اسرائیل کو یہ حکم تھا کہ تم ان میں داخل نہ ہونا (اور ان سے شادی بیاہ نہ کرنا) اور وہ تم میں داخل نہ ہوں، کیونکہ وہ تمہارے دلوں کو اپنے خداؤں کی طرف مائل کردیں گی، اور سلیمان ان سے عشق و محبت کرتے ہوئے چمٹ گیا ۔

اور اس کے لیے سات سو بیویاں (عقد دائمی والی) اور تین سو متعہ والی (موقت) تھیں، اور انہوں نے سلیمان کے دل کو پھیر لیا تھا، اور یہ سلیمان کے بڑھاپے کے وقت واقع ہوا، کہ اس کی بیویوں نے ان کا دل اپنے عجیب و غریب خداؤں کی طرف موڑ لیا، اور اس کا دل اس کے باپ داؤد کی طرح اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ تھا، اور سلیمان "صیدونیوں" کے خدا "عشتروں اور عمونیوں" کے

مکروہ "ملکوم" (عمونیوں کے بت) کے پیچھے لگ گیا، اور سلیمان نے خدا کی نگاہ میں بدی کی اور اپنے باپ داؤد کی طرح مکمل طور پر خدا کی راہ پر نہ چلا۔

اس وقت سلیمان نے اس پہاڑ پر کہ جو "یروشلم" کے سامنے تھا، عمون کی مکروہ اولاد "کموش" کے لیے خصوصیت کے ساتھ ایک بلند مقام بنایا، پس خدا سلیمان پر غضبناک ہوا، کیونکہ اس نے اسرائیل کے خدا سے کہ جو اس کو دو مرتبہ دکھائی دیا تھا، اپنا دل پھیر لیا تھا..... اور خدا نے سلیمان سے کہا کہ چونکہ تجھ سے یہ عمل صادر ہو گیا ہے' اور میرے عہد اور ان فرائض کی، جن کے بجا لانے کا میں نے تجھے حکم دیا تھا، تو نے تعمیل نہیں کی، اس لیے میں تیری سلطنت تجھ سے چھین کر تیرے غلام کو دے دوں گا، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ میں تیری زندگی میں ایسا نہ کروں گا، تیرے باپ داؤد کے سبب سے' اور تیرے بیٹے کے ہاتھ سے اُسے لوں گا..... البتہ اس کے ہاتھ (سلیمان) سے تمام سلطنت نہیں لوں گا' بلکہ اپنے بندے داؤد کا لحاظ کرتے ہوئے' کہ جسے میں نے اس لیے برگزیدہ بنایا تھا کہ اس نے میرے اوامر و فرائض کی حفاظت کی تھی، اس کو اس کی زندگی کے تمام دنوں میں بادشاہ رہنے دوں گا [1]

تورات کی اس ساری جھوٹی داستان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ :

۱۔ سلیمانؑ بُت پرست قبیلوں کی عورتوں سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے تھے، اور خدا کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے ان میں سے بہت زیادہ تعداد میں (عورتیں) رکھی ہوئی تھیں، اور وہ آہستہ آہستہ انہی کے مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا، اور باوجود اس کے کہ " وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ جس نے عورت کو نہ دیکھا ہو" بلکہ ۷۰۰ عورتیں عقد دائم والی اور ۳۰۰ عورتیں متعہ والی اس کے پاس تھیں' عورتوں کے ساتھ شدید لگاؤ نے انہیں راہِ خدا سے باہر نکال دیا تھا۔ (نعوذ باللہ)

۲۔ سلیمانؑ نے کھلم کھلا بت خانہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور اس پہاڑ کے اوپر کہ جو اسرائیل کے مقدس مرکز "یروشلم" کے سامنے واقع تھا، ایک بت کدہ۔ قبیلہ "موآبیان" کے معروف بت "کموش" کے لیے اور قبیلہ "بنی عمون" کے خاص بت "مولک" کے لیے ۔ تعمیر کرایا، اور "صیدونیوں" کے بت عشتروت کے ساتھ بھی خاص لگاؤ پیدا کر لیا تھا، اور یہ سب باتیں بڑھاپے کی حالت میں واقع ہوئیں۔

۳۔ خدا نے اس انحراف اور بڑے گناہ کی وجہ سے اس کے لیے ایک سزا تجویز کی، اور وہ سزا یہ تھی کہ اس کا ملک اس سے چھین لے گا، لیکن خود اس کے ہاتھ سے نہیں' بلکہ اس کے بیٹے "رجعام" کے ہاتھ سے (چھینے گا) اور خود اس کو مہلت دے گا' وہ جتنا چاہے، حکومت کرے، اور یہ بات بھی

---

[1] تورات کتاب اول، ملوک و پادشاہان، فصل یازدہم جملہ ۱ تا ۱۳۔

خدا کے خاص بندے داؤد ــ سلیمان کے باپ ــ کی وجہ سے تھی، خدا کا وہی خاص بندہ کہ جو تورات کی تصریح کے مطابق (العیاذ باللہ) قتلِ نفس اور زنائے محصنہ اور اپنے رشید اور خدمت گزار افسر کی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے کا مرتکب ہوا تھا، کیا کوئی بھی شخص اس قسم کی ناروا تہمتیں سلیمان جیسے آدمی کی مقدس ذات پر لگا سکتا ہے۔

اگر ہم سلیمانؑ کو ــ جیسا کہ قرآن کہتا ہے ــ پیغمبر سمجھیں، تو پھر تو بات بالکل صاف اور واضح ہے، اور اگر ہم انہیں بنی اسرائیل کے بادشاہوں کے سلسلے میں سے جانیں، تو پھر بھی اس قسم کی تہمتیں اور نسبتیں ان کے بارے میں صادق نہیں آسکتیں۔

کیونکہ اگر ہم اس کو پیغمبر نہ بھی سمجھیں تو پھر بھی مسلمہ طور پر وہ پیغمبر کے بعد ان کا قائمقام نائب و جانشین تو تھا، کیونکہ عہدِ قدیم کی کتب میں سے دو کتابیں ایک "مواعظ سلیمان" یا "حکمتہائے سلیمانؑ" اور دوسری "سرودِ سلیمان" کے نام سے، اس بزرگ مردِ خدا کے اقوال و فرامین پر مشتمل ہیں۔

واقعاً یہودی اور عیسائی کہ جو موجودہ تورات پر ایمان رکھتے ہیں، ان سوالات کا کیا جواب رکھتے ہیں؟ اور ان رسوائیوں کو کیسے قبول کرتے ہیں۔

۴۔ حقیقی شکر گزار بہت کم ہیں

اس سلسلے میں سب سے پہلے "شکر" کے لغوی بنیادی معنی کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے، "شکر" نعمت کا تصور کرنا اور اس کا اظہار کرنا ہی ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ اصل میں "کشر" بمعنی "کشف" (اور اسی کے وزن پر) تھا، اس کے بعد مقلوب ہو کر شکر ہوگیا، اور اس کا نقطۂ مقابل کفر ہے کہ جو نعمت کو بھول جانا، اور اس پر پردہ ڈالنا ہے۔

اس کے بعد شکر کو تین شعبوں میں تقسیم کیا ہے، ۱: "دل کا شکر" یعنی نعمت کے بارے میں غور و فکر کرنا، ۲: "زبان سے شکر" یعنی منعم کی حمد و ثنا کرنا، ۳: "تمام اعضا کے ساتھ شکر" یعنی نعمت کے لیے قدر دانی کرنا اور اس کا جواب دینا۔

اوپر والی آیات میں "اعملوا آل داؤد شکرًا" کے جملہ کے ساتھ قرآن کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ شکر کا تعلق زیادہ تر "عمل" کے ساتھ ہے اور اس کو انسان کے اعمال کے اندر دکھائی دینا چاہیئے۔ اور شاید اسی بنا پر قرآن نے واقعی اور حقیقی شکر گزاروں کی تعداد تھوڑی شمار کی ہے۔

اوپر والی آیات کے علاوہ سورۂ ملک کی آیہ ۲۳ میں بڑی بڑی نعمتوں مثلاً: کان، آنکھ اور دل کی پیدائش کا ذکر کرنے کے بعد مزید کہتا ہے کہ: "قلیلاً ما تشکرون" (تم اس کا بہت ہی کم

شکر ادا کرتے ہو) اور سورہ نمل کی آیہ ۷۳ میں یہ بیان ہوا ہے " ولکن اکثرھم لا یشکرون" (ان میں سے اکثر شکر گزاری نہیں کرتے)۔ایک طرف تو یہ ہے۔

اور دوسری طرف اس نکتہ پر توجہ کرتے ہوئے۔ کہ خدا کی وہ نعمتیں کہ جنہوں نے انسان کے وجود کو سر سے پاؤں تک گھیر رکھا ہے، اس قدر زیادہ ہیں کہ جنہیں شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها" (ابراہیم - ۳۴)۔ یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ: تمام نعمتوں کے لیے شکر، اس کے واقعی مفہوم میں، اس طور پر کہ تمام نعمتوں کو انہیں کاموں کے لیے کہ جن کے لیے وہ پیدا ہوئی ہیں، بلا استثنار خدا کی بندگی کی راہ میں استعمال کرے۔ کیوں کم پایا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اور بعض بزرگ مفسرین کے قول کے مطابق "شکرِ مطلق" یہ ہے کہ انسان کسی قسم کی فراموشی کے بغیر ہمیشہ خدا کی یاد میں لگا رہے، اور کسی قسم کی معصیت اور نافرمانی کیے بغیر اسی کی راہ میں قدم اٹھائے اور ہر قسم کی روگردانی کے بغیر اس کے فرمان کی اطاعت کرے اور مسلمہ طور پر یہ اوصاف بہت کم لوگوں میں جمع ہو سکتے ہیں اور یہ جو بعض نے اصولی طور پر انہیں محال خیال کیا ہے، بے بنیاد ہے اور ان مفاہیم اور عبودیت کے ان مراحل سے ان کی عدم آشنائی کی دلیل ہے۔[1]

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ: پروردگار کے شکر کا حق ادا کرنا ایک لحاظ سے تو بہت ہی مشکل ہے کیونکہ جونہی انسان مقامِ شکر میں داخل ہوتا ہے اور یہ توفیق اسے نصیب ہوتی ہے، اور شکر گزاری کے وسائل اس کے اختیار میں قرار پاتے ہیں، تو یہ خود ایک نئی نعمت ہے، کہ جو ایک نئے شکر کی محتاج ہے، اور یہ موضوع تسلسل کی صورت اختیار کرلے گا، اور انسان جتنا زیادہ سے زیادہ اس کے شکر کے راستے میں سعی و کوشش کرے گا، تو اور زیادہ نعمتوں کا مشمول ہوتا چلا جائے گا کہ جن کا شکر ادا کرنے کی اس میں قدرت نہیں ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ شکر الٰہی کا حق ادا کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ اس کے شکر کو ادا کرنے سے عجز کا اظہار ہے۔ واضح ہوجاتا ہے کہ خدا کے بہت ہی تھوڑے بندے ۔ جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے ۔ حقیقتاً اس راستہ میں قرار پاتے ہیں۔

مندرجہ ذیل احادیث پر توجہ کرنے سے اس بحث میں کافی روشنی پڑ سکتی ہے:

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے: "کیا پروردگار کے شکر کی کوئی حد

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۶ ص ۳۸۰۔

ہے، کہ اگر انسان اس حد تک پہنچ جائے تو وہ شاکر محسوب ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں!
اس نے سوال کیا: کس طرح؟ آپ نے فرمایا:

یحمد اللّٰہ علیٰ کل نعمۃ علیہ فی اھل ومال، وان کان فیما انعم علیہ فی مالہ حق اداہ۔

"خدا کی تمام نعمتوں پر، چاہے وہ گھر والوں سے متعلق ہوں یا مال سے تعلق رکھتی ہوں، حمد و ثنا کرے، اور اس مال میں کہ جو اسے دیا گیا ہے کوئی حق ہو تو اسے ادا کرے"۔[1]

ایک اور حدیث میں انہی امام سے منقول ہے کہ:

شکر النعمۃ اجتناب المحارم

"نعمت کا شکر گناہ سے پرہیز کرنا ہے"۔[2]

نیز ایک دوسری حدیث میں انہیں حضرت سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

فیما اوحی اللّٰہ عزوجل الیٰ موسیٰ: یا موسیٰ! اشکرنی حق شکری، فقال یارب! وکیف اشکرک حق شکرک ولیس من شکر اشکرك بہ الا وانت انعمت بہ علی؟ قال یا موسیٰ! الان شکرتنی حین علمت ان ذالك منی!

"خداوند تعالیٰ نے موسیٰ کو وحی کی، اے موسیٰ! میرے شکر کا حق ادا کر، موسیٰ نے عرض کیا: میں تیرے شکر کا حق کیسے بجا لاؤں جبکہ حال یہ ہے کہ میں جو شکر بھی تیرا ادا کرتا ہوں، اس کی وجہ سے تو نے ایک اور نئی نعمت عطا کی ہے۔ فرمایا: اے موسیٰ! اب تو نے میرا شکر ادا کر دیا ہے، چونکہ تو نے یہ جان لیا ہے کہ شکر ادا کرنے کی یہ توفیق بھی میری ہی طرف سے ہے"۔[3]

اس نکتہ پر توجہ بھی ضروری ہے کہ اُن لوگوں کا شکر ادا کرنا اور قدردانی کرنا بھی کہ جو انسان کے لیے کسی نعمت کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، شکر خدا کے شعبوں میں سے ایک ہے، جیسا کہ امام سجاد علی بن الحسین علیہما السلام فرماتے ہیں:

"جب قیامت کا دن ہوگا تو خدا اپنے بعض بندوں سے کہے گا، کیا تُو نے فلاں

---

[1] و [2] "اصول کافی" جلد ۲ "باب الشکر" حدیث ۱۲ و حدیث ۱۰۔

[3] "اصول کافی" "باب الشکر" حدیث ۲۷۔

شخص کا شکریہ ادا کیا ہے، تو وہ عرض کرے گا، مَیں تیرا شکر بجا لایا ہوں، خدا فرمائے گا، چونکہ تُو نے اس کا شکریہ ادا نہیں کیا ہے، لہٰذا تُو میرا شکر بھی بجا نہیں لایا،

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ:

"اشکرکم للہ اشکرکم للناس"

"تم میں سے خدا کی بارگاہ میں زیادہ شکرگزار وہ ہے کہ جو لوگوں کے احسانات اور زحمتوں کا زیادہ شکر اور قدردانی کرتا ہے"

"شکر" کی حقیقت کے بارے میں، اور شکر کس طرح نعمت کی زیادتی اور کفرانِ نعمت کس طرح اس کے فنا ہونے کا سبب بنتا ہے، ہم نے چھٹی جلد سورۂ ابراہیم کی آیہ ۷ کے ذیل میں تفصیل بحث کی ہے۔

(۱۵) لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِىۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ‌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنۡ يَّمِيۡنٍ وَّشِمَالٍ ؕ كُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ‌ ؕ بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوۡرٌ ○

(۱۶) فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سَيۡلَ الۡعَرِمِ وَبَدَّلۡنٰهُمۡ بِجَنَّتَيۡهِمۡ جَنَّتَيۡنِ ذَوَاتَىۡ اُكُلٍ خَمۡطٍ وَّاَثۡلٍ وَّشَىۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِيۡلٍ ○

(۱۷) ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِمَا كَفَرُوۡا‌ ؕ وَهَلۡ نُجٰزِىۡۤ اِلَّا الۡكَفُوۡرَ ○

ترجمہ

(۱۵) قومِ سبا کے لیے ان کی سکونت کی جگہ میں (قدرتِ الٰہی کی) ایک نشانی تھی، دو (عظیم اور وسیع) باغ دائیں اور بائیں (فراواں پھلوں کے ساتھ، ہم نے اُن سے کہا) اپنے پروردگار کی روزی میں سے کھاؤ اور اُس کا شکر بجالاؤ، (تمہارے لیے) پاک و پاکیزہ شہر ہے اور بخشنے والا (اور مہربان) پروردگار۔

(۱۶) لیکن وہ (خدا سے) روگرداں ہوگئے، تو ہم نے بھی ویران کرنے والا سیلاب ان کی طرف بھیج دیا، اور ان کے دو (پُربرکت) باغوں کو ایسے دو (گھٹیا قسم کے) باغوں کے ساتھ بدل دیا کہ جن کے پھل کڑوے تھے، کچھ جھاؤ تھے، اور تھوڑے سے بیری کے درخت (باقی رہ گئے تھے)۔

(۱۷) یہ ہم نے اُن کے کفر کی وجہ سے انہیں سزا دی تھی اور کیا کفرانِ نعمت کرنے والوں کے سوا ہم کسی اور کو ایسی سزا دیتے ہیں؟

تفسیر

ایک درخشاں تمدن جو کفرانِ نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا

خدا نے داؤد و سلیمان کو جو اہم نعمتیں عطا کی تھیں، اور ان دونوں پیغمبروں نے جس طرح سے ان کا شکر ادا کیا تھا، ان کا بیان کرنے کے بعد، ایک اور قوم کے بارے میں کہ جو ان کے نقطۂ مقابل میں قرار پائی تھی، گفتگو کر رہا ہے، اور شاید وہ اسی زمانہ میں یا تھوڑا سا ان کے بعد زندگی بسر کرتے تھے، وہ بھی ایک ایسی قوم تھی کہ خدا نے انہیں انواع و اقسام کی نعمتیں عطا فرمائی تھیں، لیکن انہوں نے کفرانِ نعمت کی راہ اختیار کر لی، لہٰذا خدا نے اپنی نعمتیں اُن سے سلب کر لیں، اور وہ اس طرح سے پریشان اور دربدر ہوئے کہ ان کی زندگی کا ماجرا سارے جہان کے لوگوں کے لیے ایک درس عبرت قرار پایا، اور وہ "قوم سبا" تھی۔

قرآن مجید نے ان کی عبرت انگیز سرگزشت پانچ آیتوں کے ضمن میں بیان کی ہے، اور ان کی زندگی کے جزئیات و خصوصیات کے اہم حصہ کی طرف انہیں پانچ مختصر آیات میں اشارہ کیا ہے۔

پہلے کہتا ہے: "قوم سبا کے لیے ان کے محل سکونت میں خدائی قدرت کی ایک نشانی تھی" (لقد کان لسبأ فی مسکنھم اٰیة)۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے، خدا کی اس بزرگ آیت کا سرچشمہ یہ تھا، کہ قوم سبا۔ اس علاقے کے اطراف میں واقع پہاڑوں کے محل وقوع اور ان کے خاص حالات و شرائط، اور اپنی خداداد ذہانت اور ہوشمندی سے استفادہ کرتے ہوئے۔ ان سیلابوں کو کہ جو سوائے ویرانی و تباہی کے کوئی نتیجہ نہ دیتے تھے، ایک قوی اور مستحکم بند کے پیچھے روک دینے پر قادر ہو گئے تھے اور اس کے ذریعہ انہوں نے بہت ہی آباد ملک تعمیر کر لیا تھا۔ یہ حقیقتی عظیم آیت ہے کہ ایک ویران اور برباد کرنے والا عامل، عمران و آبادی کے اہم ترین عوامل میں بدل جاتے۔

اس بارے میں کہ "سبأ" (بروزن سبد) کس کا نام ہے؟ اور یہ کیا چیز ہے؟ مورخین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن مشہور یہ ہے کہ "سبا"، "یمن" کے اعراب کے باپ کا نام ہے اور اس روایت کے مطابق کہ جو پیغمبرِ اسلام سے نقل ہوئی ہے، وہ ایک آدمی تھا اور اس کا نام "سبا" تھا،

اور اس کے دس بیٹے تھے، اور ان میں سے ہر ایک سے وہاں کے قبائل میں سے ایک قبیلہ وجود میں آیا ہے[1]

بعض "سبأ" کو سرزمین یمن یا اس کے کسی علاقے کا نام سمجھتے ہیں، سورہ نمل میں سلیمان و ہُدہُد کے قصہ میں قرآن مجید کا ظاہر بھی یہی نشاندہی کرتا ہے کہ "سبأ" کسی جگہ، علاقے یا مقام کا نام ہے، جہاں پر وہ کہتا ہے کہ (وجئتك من سبأٍ بنبأٍ یقین) "میں سرزمین سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں" (نمل - ۲۲)

جبکہ زیر بحث آیت کا ظاہر یہ ہے کہ سبا ایک قوم تھی کہ جو اس علاقے میں رہتی تھی، کیونکہ ضمیر جمع مذکر (ھم) ان کی طرف لوٹ رہی ہے۔

لیکن ان دونوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ ابتداء میں سبا کسی شخص کا نام ہو، پھر اس کے تمام بیٹے اور قوم اس نام سے موسوم ہوئے ہوں اور اس کے بعد یہ نام اس سرزمین کی طرف بھی منتقل ہو گیا ہو۔

اس کے بعد قرآن اس خدائی آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہ جو قوم سبا کے اختیار میں قرار پائی تھی، اس طرح کہتا ہے: "دو بڑے باغ تھے دائیں اور بائیں طرف" (جنتان عن یمین وشمال)۔

یہ ماجرا اس طرح تھا کہ قوم سبا اس عظیم بند کے ذریعہ — جو انہوں نے اس علاقہ کے اہم پہاڑوں کے درمیان بنایا تھا — اس بات پر قادر ہو گئی تھی کہ ان فراوان سیلابوں کو — جو ویرانی کا سبب بنتے تھے یا کم از کم بیابانوں میں بے کار و فضول طور سے ضائع اور تلف ہو جاتے تھے — اس بند کے پیچھے ذخیرہ کرلیں اور اس کے اندر کھڑکیاں بنا کر پانی کے اس عظیم مخزن سے استفادہ کرنے کے لیے اپنے کنٹرول میں کرلیں اور اس طرح سے وسیع و عریض زمینوں کو زیر کاشت لائیں۔

وہ اشکال جو فخر رازی نے یہاں نقل کیا ہے، کہ دو باغوں کا ہونا کوئی عجیب یا اہم چیز نہیں ہے کہ جنہیں آیت اور نشانی کے طور پر ذکر کیا جائے، اس کے بعد اس اشکال کا جواب دیا ہے، کہ جو ہماری نظر میں اس قابل نہیں ہے کہ اسے بیان کیا جائے، کیونکہ وہ کوئی معمولی اور سادہ قسم کے باغ نہیں تھے بلکہ یہ ایک عظیم نہر کے دونوں طرف باغوں کا مسلسل اور ملا ہوا سلسلہ تھا، جو اس عظیم سد کے ذریعہ سیراب ہوتے تھے اور وہ اتنے برکت والے تھے کہ تاریخوں میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ٹوکری اپنے سر پر رکھ کر پھلوں کی فصل میں درختوں کے نیچے سے عبور کرتا تھا تو اس قدر پھل اس میں

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

گرتے تھے کہ تھوڑی سی دیر میں وہ ٹوکری بھر جاتی تھی ۔

وہی سیلاب کہ جو خرابی و بربادی کا باعث بنیں، وہ اس طرح سے آبادی کا باعث بن جائیں، کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟ کیا یہ خدا کی عظیم آیت اور نشانی شمار نہیں ہوتی ۔

ان تمام باتوں کے علاوہ اُس سرزمین پر حد سے زیادہ امن و امان سایہ فگن تھا کہ وہ خود بھی حق تعالیٰ کی ایک آیت شمار ہوتا تھا کہ جس کی طرف قرآن بعد میں اشارہ کرے گا ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ہم نے اُن سے کہا کہ اپنے پروردگار کی اس فراواں روزی میں سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو" (کلوا من رزق ربکم واشکروا لہ) ۔

"ایک پاک و پاکیزہ شہر ہے اور پروردگار بخشنے والا اور مہربان" (بلدة طیبة و رب غفور) ۔[۱] [۲]

اس چھوٹے سے جملے نے تمام مادی و معنوی نعمتوں کے مجموعہ کو زیبا ترین شکل میں منعکس کر دیا ہے، مادی نعمتوں کے لحاظ سے تو وہ پاک و پاکیزہ زمین رکھتے تھے کہ جو چوروں، ظالموں، آفات و بلیات، خشک سالی و قحط اور بدامنی و وحشت جیسی طرح طرح کے مصائب سے پاک تھی، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین موذی حشرات سے بھی پاک و پاکیزہ تھی، پاک و پاکیزہ ہوائیں چلتی تھیں اور فرحت بخش نسیم رواں دواں تھی، زمین زرخیز تھی اور درخت پُر بار تھے ۔

اور معنوی نعمت کے لحاظ سے خدا کی بخشش و غفران ان کے شاملِ حال تھی، وہ ان کی تقصیر و کوتاہی سے صرف نظر کرتا تھا اور انہیں مشمولِ عذاب اور ان کی سرزمین کو بلا و مصیبت میں گرفتار نہیں کرتا تھا ۔

* * *

لیکن ان ناشکرے لوگوں نے ان تمام نعمتوں کی قدردانی نہیں کی اور آزمائش کی کٹھالی سے صحیح و سالم باہر نہ آسکے ۔ انہوں نے کفرانِ نعمت اور روگردانی کی راہ اختیار کر لی لہٰذا خدا نے بھی ان کی سختی کے ساتھ گوشمالی کی ۔

اسی لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "وہ خدا سے روگرداں ہو گئے" (فاعرضوا) ۔

---

[۱] "بلدة" خبر ہے مبتدائے محذوف کی، اور تقدیر میں اس طرح تھا "ھذہ بلدة طیبة وھذا رب غفور" یہ پاکیزہ شہر ہے اور یہ بخشنے والا خدا ہے ۔

[۲] کیا یہ خدائی پیغام ان پیغمبروں کے ذریعہ جو ان کے درمیان مبعوث ہوئے تھے بھیجا گیا تھا ۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے ۔ یا حالات و شرائط زبانِ حال سے اور ادراکِ عقلی سے اس قسم کا پیغام انہیں دیتے تھے، دونوں چیزیں ممکن ہیں ۔

انہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی، عمران وآبادی اور امن وامان کو عام سی چیز خیال کیا، حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو گئے، نعمت میں مست ہو گئے، مالدار لوگ، فقراء ومساکین اور غرباء کو حقیر خیال کرتے اور خود پر ناز کرتے، اور ان غریبوں کو اپنے لیے رکاوٹ خیال کرتے کہ جس کی تفصیل بعد والی آیات میں آئے گی۔

یہ وہ موقع تھا کہ عذاب کا کوڑا ان کے پیکر پر آکر پڑا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "ہم نے بنیادوں کو اکھاڑ کر پھینک دینے والا وحشتناک سیلاب ان کے پاس بھیجا" اور ان کی آباد سرزمین ایک ویرانے میں بدل گئی (فارسلنا علیھم سیل العرم)۔

"عرم" اصل میں "عرامہ" (بروزن علامہ) ہے، خشونت وسختی، کج خلقی اور سخت گیری کے معنی میں ہے، اور سیلاب کی اس سے توصیف کرنا اس کی شدت وخشونت اور ویران گری کی طرف اشارہ ہے، اور سیل العرم کی تعبیر۔ اصطلاح کے مطابق۔ موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔

بعض نے "عرم" کو جنگلی چوہوں کے معنی میں لیا ہے، کہ جو اس سد میں سوراخ کرنے کی وجہ سے اس کی ویرانی کا سبب بنتے تھے (چوہوں کا سد میں نفوذ کرنے کا مسئلہ اگرچہ قابل قبول ہے، اس طور سے کہ جس کی ہم بعد میں تشریح کریں گے، لیکن آیت کی تعبیر اس معنی سے چنداں مناسبت نہیں رکھتی)۔

"لسان العرب" میں مادہ "عرم" کے مختلف معنی آئے ہیں، منجملہ ان کے، طاقت فرسا سیلاب، وہ رکاوٹیں جو دروں کے درمیان پانی کو روکنے کے لیے بناتے ہیں اسی طرح بڑے صحرائی چوہے [1]

لیکن سب سے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی ہے، اور تفسیر علی بن ابراہیم میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن اس سرزمین کی باقی ماندہ حالت وکیفیت کی اس طرح سے توصیف کرتا ہے: "ہم نے ان کے دو وسیع اور پُر نعمت باغوں کو، دو بے قدر وقیمت کڑوے پھلوں والے، اور جھاؤ کے بے مصرف درختوں اور تھوڑے سے بیری کے درختوں میں بدل دیا" (وبدلناھم بجنتیھم جنتین ذواتی اکل خمط واثل وشیء من سدر قلیل)۔

"اکل" ہر قسم کے غذائی مادہ کے معنی میں ہے۔

"خمط" (بروزن عمد) کڑوی گھاس کے معنی میں ہے۔

"اثل" (بروزن اصل) جھاؤ کے درخت کے معنی میں ہے۔

---

[1] لسان العرب، مادہ عرم۔

اور اس طرح سے ان تمام سرسبز و شاداب درختوں کے بجائے بہت ہی کم قدر و قیمت والے بیابانی اور جنگلی قسم کے چند ایک درخت، کہ شاید ان میں سے سب زیادہ اہم درخت وہی بیری کے درخت تھے، کہ وہ بھی تھوڑی سی ہی مقدار میں تھے، باقی رہ گئے تھے، (اب تم اس کی اس مجمل داستان کو پڑھنے کے بعد خود ہی ان کی مفصل داستان کا اندازہ لگا لو، کہ خود ان کے اوپر اور ان کی آباد سرزمین پر کیا گزری ہے)۔

ممکن ہے کہ ان تین قسم کے درختوں کا بیان کہ جو اس سرزمین میں باقی رہ گئے تھے، (درختوں کے تین مختلف گروہوں کی طرف اشارہ ہو، کہ ان درختوں میں سے ایک حصہ نقصان دہ تھا، بعض بے مصرف تھے، اور بعض بہت ہی کم نفع دینے والے تھے۔

٭ ٭ ٭

بعد میں آنے والی آیت سے نتیجہ نکالتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ: "یہ ہماری طرف سے ان کے کفرانِ نعمت کی سزا تھی"۔ (ذالك جزينا هم بما كفروا)۔

لیکن اس غرض سے کہ کہیں یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ یہ انجام صرف اسی گروہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے کہ جو ان ہی جیسے اعمال کے مرتکب ہوں گے اس کی عمومیت مسلّم ہے۔ اس طرح اضافہ کرتا ہے: "کیا ہم کفرانِ نعمت کرنے والوں کے سوا کسی اور کو اس قسم کی سزا دیتے ہیں"۔ (وهل نجازى الا الكفور)۔ یہ تھا خلاصہ سبا کی سرگزشت کا، کہ جو بعد والی آیات میں زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

۱۸ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ○

۱۹ فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ○

ترجمہ

۱۸ اُن کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان کہ جنہیں ہم نے برکت دے رکھی تھی، ہم نے کچھ ایسی اور آبادیاں بھی رکھی تھیں، جن میں ایسے مناسب اور نزدیک نزدیک فاصلے تھے (کہ ایک سے دوسری دکھائی دیتی تھی،) (اور اُن کے درمیان چلنے پھرنے کو آسان بنا دیا تھا، اور ہم نے ان سے کہا کہ) تم مکمل امن و امان کے ساتھ راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی ان آبادیوں کے درمیان سفر کرو۔

۱۹ لیکن (ان ناشکرے لوگوں نے) کہا، پروردگارا! ہمارے سفروں کے درمیان دُوری ڈال دے' (تاکہ غریب و نادار لوگ مالدار لوگوں کے دوش بدوش سفر نہ کرسکیں! اور اس طرح سے) انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، اور ہم نے انہیں (دوسروں کے لیے) قصہ اور افسانہ بنا دیا، اور ہم نے ان کی جمعیت کو منتشر اور

تتر بتر کر دیا، اس ماجرا میں ہر صابر اور شکر کرنے والے کے لیے عبرت کی کئی اور نشانیاں ہیں۔

تفسیر

ہم نے انہیں اسطرح منتشر کیا کہ وہ دوسروں کیلئے ضرب المثل بن گئے

ان آیات میں قرآن دوبارہ قوم سبا کی داستان کی طرف لوٹتا ہے اور ان کے بارے میں مزید تشریح و تفصیل بیان کرتا ہے اور ان کی سزا اور عذاب کو بھی زیادہ شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتا ہے، اس طرح سے کہ یہ ہر سننے والے کے لیے ایک ایسا درس ہے جو بہت اہم، سبق آموز اور تربیت کنندہ ہے، فرماتا ہے کہ: "ہم نے ان کی سرزمین کو اس حد تک آباد کیا تھا کہ نہ صرف ہم نے شہروں کو غرق نعمت کیا ہوا تھا بلکہ ان کے اور ان کی اُن زمینوں کے درمیان کہ جنہیں ہم نے برکت دے رکھی تھی، ظاہر (ایک سے دوسرے کو دکھائی دینے والے) اور آشکار شہر اور آبادیاں قرار دیا تھا۔ (وجعلنا بینھم و بین القری التی بارکنا فیھا قرًی ظاھرة)۔

درحقیقت ان کے اور ان کی مبارک سرزمین کے درمیان متصل اور زنجیر کی کڑیوں کی طرح آبادیاں تھیں، اور ان آبادیوں کے درمیان اتنا کم فاصلہ تھا کہ وہ ہر ایک میں سے دوسری کو دیکھتے تھے (اور یہ ہے "قری ظاھرة" ۔ واضح و آشکار آبادیوں کا معنی)۔

بعض مفسرین نے "قری ظاھرہ" کی دوسری طرح تفسیر کی ہے، اور کہا ہے کہ یہ ان آبادیوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو ٹھیک راستہ کے درمیان واضح طور پر واقع تھیں اور مسافرین ان میں اچھی طرح توقف کر سکتے تھے، یا یہ کہ یہ آبادیاں بلندی کے اوپر واقع تھیں، اور ہر عبور کرنے والے کو صاف طور پر دکھائی دیتی تھیں۔

باقی رہا یہ کہ مبارک زمینوں سے کونسا علاقہ مراد ہے، اکثر مفسرین نے اسے سرزمین شامات (شام، فلسطین اور اُردن) سے تفسیر کی ہے، کیونکہ یہ تعبیر اسی سرزمین کے لیے سورہ اسراء کی پہلی آیت اور سورہ انبیاء کی آیت ۸۱ میں آئی ہے لیکن بعض مفسرین نے احتمال دیا ہے، کہ اس سے مراد "صنعاء" یا "مآرب" کی آبادیاں ہیں کہ یہ دونوں ہی یمن کے علاقہ میں واقع ہیں، اور یہ تفسیر بعید نہیں ہے، کیونکہ "یمن کا" ۔ جو جزیرہ عرب کا جنوبی ترین نقطہ ہے ۔ "شامات" سے فاصلہ ۔ کہ جو شمالی ترین نقطہ میں واقع ہے ۔ اس قدر زیادہ ہے، اور خشک اور جلے ہوئے بیابانوں سے اٹا ہوا ہے، کہ اس کے ساتھ آیت کی تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے، اور تواریخ میں بھی نقل نہیں ہوا ہے، بعض نے یہ احتمال

بھی دیا ہے کہ سرزمین ہائے مبارک سے مراد "مکہ" کی سرزمین ہے، کہ وہ بھی بعید ہے۔

یہ بات تو آبادی کے لحاظ سے ہے، لیکن چونکہ لوگوں کی آبادی کافی نہیں ہے بلکہ اہم اور بنیادی شرط امن و امان ہوتا ہے، لہٰذا مزید کہتا ہے: "ہم نے ان آبادیوں کے درمیان مناسب اور نزدیک نزدیک فاصلے رکھے" (تاکہ وہ آسانی اور امن و امان کے ساتھ ایک دوسری میں آجاسکیں) (وقدرنا فیھا السیر)۔

اور ہم نے ان سے کہا: "تم ان بستیوں کے درمیان راتوں میں اور دنوں میں پورے امن و امان کے ساتھ سفر کرو اور ان آبادیوں میں چلو پھرو" (سیروا فیھا لیالی و ایاما اٰمنین)۔

اس طرح یہ آبادیاں مناسب اور چھاتُلا فاصلہ رکھتی تھیں اور وحوش اور بیابانی درندوں، یا چوروں اور ڈاکوؤں کے حملہ کے لحاظ سے بھی انتہائی امن و امان میں تھیں، اس طرح سے کہ لوگ زادِ راہ، سفر خرچ اور سواری کے بغیر ہی ـــ اس صورت میں کہ نہ تو اکٹھے قافلوں میں چلنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی مسلح افراد ساتھ لینے کی کوئی احتیاج تھی ـــ راستے کی بے امنی کی جہت سے، یا پانی اور غذا کی کمی کی وجہ سے کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنے سفر کو جاری رکھ سکتے تھے۔

اس بارے میں کہ "سیروا فیھا ...." (ان آبادیوں میں چلو پھرو) کا جملہ کس شخص کے ذریعہ انہیں پہنچایا گیا، دو احتمال موجود ہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہ انہیں ان کے پیغمبروں کے ذریعہ پہنچایا گیا، اور دوسرے یہ کہ اس آباد سرزمین اور امن و امان والی سڑکوں کی زبانِ حال یہی تھی۔

"لیالی" (راتوں) کو "ایام" (دنوں) پر مقدم رکھنا، ممکن ہے اس وجہ سے ہو، کہ راتوں میں امن و امان کا ہونا زیادہ اہم ہے، راستے کے چوروں سے امنیت کے لحاظ سے بھی اور جنگل کے وحشی درندوں کے لحاظ سے بھی، ورنہ دن کے امن و امان کو قائم رکھنا زیادہ آسان ہے۔

لیکن یہ ناشکرے لوگ، خدا کی ان عظیم نعمتوں کے مقابلہ میں کہ جنہوں نے ان کی زندگی کو مکمل طور پر گھیر رکھا تھا، بہت سی دوسری متنعم قوموں کی طرح، غرور و غفلت میں گرفتار ہو گئے، نعمت کی مستی اور کم ظرفی نے انہیں اس بات پر ابھارا، کہ ناشکری کا راستہ اختیار کریں، حق کے راستے سے منحرف ہو جائیں، اور خدا کے احکام کی طرف سے بے پروا ہو جائیں۔

ان کے مجنونانہ تقاضوں میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے خدا سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کے سفروں کے درمیان فاصلہ ڈال دے، "انہوں نے کہا: پروردگارا! ہمارے سفروں کے درمیان فاصلہ ڈال دے" تاکہ بے سہارا فقیر لوگ امراء کے دوش بدوش سفر نہ کر سکیں! (فقالوا ربنا باعد بین اسفارنا)۔

ان کی مراد یہ تھی کہ ان آباد بستیوں کے درمیان فاصلہ ہو جائے، اور کچھ خشک بیابان پیدا ہو

جائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اغنیاء اور ثروت مند لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ تھوڑی آمدنی والے لوگ بھی انہی کی طرح سفر کریں، اور جہاں چاہیں بغیر کسی زادِ راہ اور توشہ و سواری کے چلے جائیں، گویا سفر ان کے لیے ایک اعزاز و افتخار اور ان کی قدرت و ثروت کی نشانی تھا، اور یہ امتیاز و برتری ہمیشہ انہی کے لیے مخصوص رہنی چاہیئے۔

اور یا یہ بات تھی کہ راحت و آرام نے انہیں بے چین کر رکھا تھا، جیسا کہ بنی اسرائیل "منّ" و "سلوی" جیسی دو آسمانی غذاؤں) سے تنگ آگئے تھے اور خدا سے پیاز، لہسن اور مسور کی دال کا تقاضا کرنے لگے تھے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "باعد بین اسفارنا" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر آرام طلب ہو گئے تھے کہ وہ اب چراگاہوں سے استفادہ کرنے، یا تجارت و زراعت کے لیے سفر کرنے پر تیار نہیں تھے، لہٰذا انہوں نے خدا سے یہ مطالبہ اور تقاضا کیا کہ ہمیشہ وہ اپنے وطن میں ہی رہیں، اور ان کے سفروں میں زمانہ کے اعتبار سے بہت زیادہ فاصلہ ہو جائے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ بہتر نظر آتی ہے۔

بہرحال، انہوں نے اپنے اس عمل سے اپنے اوپر ظلم کیا۔ (وظلموا انفسهم)۔

ہاں! اگر وہ سوچ رہے تھے، کہ وہ دوسروں پر ظلم کر رہے تھے تو وہ غلطی پر تھے۔ انہوں نے تو ایک ایسا خنجر اٹھایا ہوا تھا کہ جس سے وہ اپنے ہی سینہ کو زخمی کر رہے تھے اور اس ساری آگ کا دھواں خود انہیں کی آنکھ میں گیا۔

کس قدر عمدہ تعبیر ہے، قرآن اس جملہ کے بعد، کہ جو ان کے دردناک انجام کے بارے میں بیان کیا ہے، کہتا ہے: "ہم نے انہیں ایسی سزا دی اور ان کی زندگی کو لپیٹ کر رکھ دیا، کہ "انہیں ہم نے دوسروں کے لیے داستان اور افسانہ بنا دیا" (فجعلناهم احاديث)۔

ہاں! ان کی تمام تر بارونق زندگی اور درخشاں و وسیع تمدن میں سے زبانی قصوں، دلوں کی یادوں اور تاریخوں کے صفحات پر چند سطروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا: "اور ہم نے انہیں بُری طرح سے حیران و پریشان کر دیا" (ومزقناهم كل ممزق)۔

ان کی سرزمین ایسی ویران ہوئی کہ اُن میں وہاں قیام کرنے کی طاقت نہ رہی، اور زندگی کو باقی رکھنے کے لیے وہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ان میں سے ہر گروہ کسی طرف کا رُخ کرے اور خزاں کے پتوں کی طرح، کہ جو تند و تیز ہواؤں کے اندر اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں ہر ایک کسی گوشہ میں جا گرے، اس طرح سے کہ ان کی پریشانی ضرب المثل بن گئی، کہ جب کبھی لوگ یہ کہنا

چاہتے کہ فلاں جمعیت سخت پراگندہ اور تتر بتر ہوگئی تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ: "تفرقوا ایادی سبا"! (وہ قوم سبا اور ان کی نعمتوں کی طرح پراگندہ ہو گئے ہیں) [1]

بعض مفسرین کے قول کے مطابق قبیلۂ "غسان" شام کی طرف گیا اور "اسد" عمان کی طرف، "خزاعہ" تہامہ کی طرف، اور قبیلۂ "انمار" یثرب کی طرف [2]

اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "یقیناً اس سرگزشت میں صبر اور شکر کرنے والوں کے لیے عبرت کی آیات اور نشانیاں ہیں" (ان فی ذٰلك لاٰیات لکل صبار شکور)۔

"صابرین" اور "شاکرین" ہی ان قصوں سے، کیوں درس عبرت لے سکتے ہیں؟ (خاص طور پر اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ صبار اور شکور دونوں ہی مبالغہ کے صیغے ہیں اور تکرار اور تاکید کو بیان کرتے ہیں)

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے صبر و استقامت کی بناء پر ہوا و ہوس کی سرکش سواری کو لگام دیتے ہیں اور گناہوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہتے ہیں، اور اپنی شکر گزاری کی وجہ سے خدا کی اطاعت کے راستہ میں آمادہ اور بیدار ہوتے ہیں، اور اسی بناء پر اچھی طرح سے عبرت حاصل کرتے ہیں، لیکن وہ لوگ کہ جو ہوا و ہوس کے مرکب پر سوار ہوتے ہیں، اور خدائی مواہب اور نعمتوں سے بے اعتناء ہوتے ہیں، وہ ان ماجروں سے کیسے عبرت حاصل کر سکتے ہیں؟

چند نکات

۱۔ قوم سبا کا عجیب و غریب ماجرا

جس طرح قرآن اور اسلامی روایات اور اسی طرح تواریخ سے معلوم ہوتا ہے، وہ ایک ایسی جمعیت اور قوم تھی کہ جو جزیرہ عرب کے جنوب میں رہتی تھی، اور ایک اعلیٰ حکومت اور درخشاں تمدن کی مالک تھی۔

یمن کا علاقہ وسیع اور زرخیز تھا لیکن زرخیز علاقہ ہونے کے باوجود چونکہ وہاں کوئی اہم دریا نہیں تھا، لہٰذا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا تھا، سیلاب اور بارشیں پہاڑوں پر برستی تھیں

---

[1] یہ ضرب المثل دو صورتوں میں نقل ہوئی ہے: "تفرقوا ایدی سبا" و "ایادی سبا" پہلی صورت میں لشکر اور ان کے افراد کی پراگندگی کی طرف اشارہ ہے، اور دوسری صورت میں ان کے اموال و مکانات و مواہب کی پراگندگی مراد ہے، کیونکہ ایادی عام طور پر نعمتوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

[2] "تفسیر قرطبی" و "تفسیر ابوالفتوح رازی" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اور ان کا پانی بیابانوں میں بے کار اور بے فائدہ ضائع ہو جاتا تھا، اس سرزمین کے سمجھدار لوگ ان پانیوں سے استفادہ کرنے کی فکر میں لگ گئے اور اہم علاقوں میں بہت سے بند باندھے، کہ جن میں سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ پانی کا ذخیرہ رکھنے والا بند "مآرب" تھا۔

"مآرب" (بروزن مغرب) ایک شہر تھا کہ جو ان دروں میں سے ایک کے آخر میں واقع تھا، اور "صراۃ" کے کوہستانوں کے بڑے بڑے سیلاب اس کے قریب سے گزرتے تھے، اس درہ کے دہانہ پر اور "بلق" نامی دو پہاڑوں کے دامن میں انہوں نے ایک مضبوط بند باندھا تھا اور اس میں سے پانی کی کئی نہریں نکالی تھیں، اس بند کے اندر پانی کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ جس سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اس بات پر قادر ہو گئے تھے کہ اس نہر کے دونوں طرف ۔ کہ جو بند تک جاتی تھی ۔ بہت ہی خوبصورت و زیبا باغات لگائیں اور پُر برکت کھیت تیار کریں۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اس سرزمین کی آباد بستیاں ایک دوسری سے متصل تھیں اور درختوں کے وسیع سائے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور اُن کی شاخوں پر اتنے پھل لگا کرتے تھے کہ کہتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اپنے سر پر ایک ٹوکری رکھ کر ان کے نیچے سے گزرتا تھا، تو یکے بعد دیگرے اتنے پھل اس میں آکر گرتے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹوکری پُر ہو جاتی تھی۔

امن و امان کے ساتھ نعمت کے وفور نے پاک و صاف زندگی کے لیے بہت ہی عمدہ اور عرفہ ماحول پیدا کر رکھا تھا، ایک ایسا ماحول جو خدا کی اطاعت اور معنوی پہلوؤں کے ارتقاء و تکامل کے لیے مہیا تھا۔

لیکن انہوں نے ان تمام نعمتوں کی قدر کو نہ پہچانا اور خدا کو بھول گئے اور کفرانِ نعمت میں مشغول ہو گئے، اور فخر و مباہات کرنے لگے، اور طبقاتی اختلافات پیدا کر دیئے۔

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ صحرائی چوہوں نے مغرور و مست لوگوں کی آنکھوں سے دُور، مٹی کے اس بند کی دیوار کا رُخ کیا اور اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا، اچانک ایسی شدید بارشیں برسیں اور ایسا عظیم سیلاب آیا کہ جس سے بند کی وہ دیواریں کہ جو سیلاب کے دباؤ کو برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں، دھڑام سے گر پڑیں اور بہت ہی زیادہ پانی کہ جو بند کے اندر جمع ہو رہا تھا اچانک باہر نکل پڑا اور تمام آبادیوں، باغات، کھیتوں، فصلوں اور چوپایوں کو تباہ کر کے رکھ دیا اور خوبصورت سجے سجائے قصور و محلات اور مکانات کو ویران کر دیا اور اس آباد سرزمین کو خشک اور بے آب و گیاہ صحرا میں بدل دیا اور ان تمام سرسبز و شاداب باغوں اور پھلدار درختوں میں سے صرف چند "اراک" کے کڑوے شجر، کچھ جھاؤ اور کچھ بیری کے درخت باقی رہ گئے، غزل خوانی کرنے والے پرندے

وہاں سے کوچ کر گئے اور اُلوؤں اور کوّوں نے ان کی جگہ لے لی[1]

ہاں! جب خدا اپنی قدرت دکھانا چاہتا ہے تو چند چوہوں کے ذریعہ ایک عظیم تمدن کو برباد کر دیتا ہے، تاکہ بندے اپنے ضعف اور کمزوری سے آگاہ ہو جائیں، اور قدرت اور اقتدار کے وقت مغرور نہ ہوں۔

۲۔ قرآن کا ایک تاریخی معجزہ

قرآن مجید نے اوپر والی آیات میں قوم سبا کی داستان بیان کی ہے، اور مدتیں گزر چکی تھیں کہ دنیا جہان کے مؤرخین اس قسم کی قوم اور اس طرح کے تمدن سے بے خبری کا اظہار کرتے تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مؤرخین جدید انکشافات سے پہلے ملوک سبا کے سلسلہ اور ان کے عظیم تمدن کا نام تک نہیں لیتے تھے اور "سبا" کو صرف ایک فرضی شخص سمجھتے تھے، کہ جو حکومت "حمیر" کے بانی کا باپ تھا، جبکہ قرآن میں ایک پوری سورت اسی قوم کے نام کی ہے، اور ان کے تمدن کے مظاہر میں سے ایک مظہر کی طرف جو مآرب کے تاریخی بند کی تعمیر ہے، اشارہ کر رہی ہے لیکن یمن میں اس قوم کے تاریخی انکشافات کے بعد ماہر دانشمندوں کا عقیدہ دگرگوں ہو گیا ہے۔

اس بات کا سبب، کہ اب تک قوم "سبا" کے تمدن کے آثار معلوم نہ ہوئے، دو باتیں تھیں، ایک تو راستہ کی سختیاں اور آب و ہوا کی شدید گرمی اور دوسرے اس علاقے کے لوگوں کی بیگانوں اور اجنبی لوگوں کے بارے میں بدگمانی، جسے بے خبر اور ناآگاہ یورپ والے کبھی کبھی وحشت سے تعبیر کرتے تھے، یہاں تک کہ چند ماہرین آثار قدیمہ، کہ جو سبا کے اسرار کھولنے کی طرف شدید لگاؤ رکھتے تھے، شہر "مآرب" کے قلب اور اس کے نواح میں وارد ہونے میں کامیاب ہو گئے، اور پتھروں پر ثبت شدہ آثار، خطوط اور نقوش کے نمونے اکٹھا کر لے گئے، اور اس کے بعد انیسویں صدی عیسوی میں کئی گروہ نے یکے بعد دیگرے وہاں تک راہ نکال لی اور وہاں سے گراں بہا آثار اپنے ساتھ یورپ لے گئے اور ان نقوش و خطوط اور دوسرے آثار کے مجموعہ سے کہ جو ایک ہزار نقوش تک پہنچے ہوئے تھے، اس قوم کے تمدن کی جزئیات بلکہ سدِ مآرب کی بنا کی تاریخ اور دوسرے خصوصیات تک معلوم کر لیے، اور اہل مغرب پر ثابت ہو گیا کہ قرآن نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا، وہ کوئی افسانہ نہیں تھا، بلکہ وہ ایک تاریخی واقعیت اور حقیقت ہے، کہ جس سے وہ بے خبر تھے، اس طور پر کہ اب تو انہوں نے اس عظیم سد، اور پانی کے گزرنے کے مقامات اور دائیں بائیں باغوں کی

---

[1] "تفسیر مجمع البیان" و قصص قرآن اور دیگر تفاسیر سے اقتباس۔

درمیانی نہروں اور اس کی دوسری خصوصیات کے بارے میں نقشے بھی تیار کر لیے ہیں[1]

۳۔ ایک مختصر سے واقعہ میں عبرت کے اہم نکات

"سلیمانؑ" کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد، قرآن مجید میں قوم سبا کی داستان کا بیان کرنا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔

۱۔ داؤدؑ و سلیمانؑ بہت ہی عظیم پیغمبر تھے کہ جنہوں نے ایک عظیم حکومت تشکیل دی تھی اور وہ ایک درخشاں تمدن کو وجود میں لائے تھے، لیکن داؤدؑ و سلیمانؑ کی وفات کے ساتھ ہی یہ تمدن ختم ہو گیا۔ قوم سبا نے بھی ایک عظیم تمدن قائم کیا تھا، کہ جو سدِ "مآرب" کے ٹوٹ جانے سے برباد ہو گیا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ۔ روایات کے مطابق۔ سلیمانؑ کے عصا کو تو دیمک نے کھایا تھا، اور "مآرب" کے عظیم بند میں صحرائی چوہوں نے سوراخ کیا تھا تاکہ یہ مغرور انسان سمجھ لے کہ مادی نعمتیں چاہے جتنی بھی عظیم کیوں نہ ہوں، ایک ہَوا کے جھونکے سے ختم ہو جاتی ہیں، ایک کیڑا یا ایک چھوٹا سا جانور انہیں زیر و زبر کر سکتا ہے، تاکہ باخبر لوگوں کے لیے عبرت ہو کہ وہ اس کے ساتھ دل نہ لگائیں اور مومن اس کے اسیر اور قیدی نہ بنیں، اور مغرور لوگ غرور کی مستی سے ہوش میں آجائیں اور تکبّر اور ظلم و ستم کی راہ اختیار نہ کریں۔

۲۔ اس سے قطع نظر یہاں پر باشکوہ تمدن کے دو چہرے نظر آتے ہیں کہ جن میں سے ایک رحمانی ہے اور دوسرا شیطانی، لیکن نہ وہ باقی رہا اور نہ یہ، اور دونوں کے دونوں ہی فنا کی گود میں چلے گئے۔

۳۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قوم سبا کے مغرور لوگ جو عامۃ الناس کو اپنے قریب نہیں دیکھ سکتے تھے، اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ بڑے بڑے لوگوں کی اقلیت اور کم آمدنی والے لوگوں کی اکثریت کے درمیان کوئی بہت بڑا بند اور ایک عظیم سرحد ہونی چاہیئے تاکہ وہ ہرگز آپس میں نہ ملیں جلیں، لہٰذا انہوں نے خدا سے آبادیوں کے دور دور واقع ہونے اور سفروں کے لمبا اور دور دراز ہونے کا تقاضا کیا۔ خدا نے بھی ان کی دعا قبول کر لی، اور وہ اس طرح سے بکھرے اور پراگندہ ہوتے کہ اُن میں سے ہر ایک گروہ کسی ایک طرف چلا گیا اور وہ ایک دوسرے سے اس طرح سے دور ہوتے کہ اگر وہ ایک دوسرے کو دیکھنا اور ملاقات کرنا چاہتے بھی تو اُس کے لیے ایک طویل عمر تک سفر درکار ہوتا۔

۴۔ جس وقت کوئی شخص سیل عرم کے آنے سے پہلے اور اس کے آنے کے بعد کی اس سرزمین کی وضع و کیفیت پر نظر کرتا، تو وہ اس بات کا یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی سرزمین ہے کہ جو ایک دن سرسبز و

---

[1] فرہنگ قصص القرآن۔ مادہ "سبا" (ملخص)۔

شاداب اور میوہ دار درختوں سے پُر تھی، کہ جو آج ایک وحشتناک بیابان کی شکل میں ۔ کہ جس میں کہیں کہیں جھاؤ کے درخت، پیلو اور بیریاں' ایسے مسافروں کی طرح کہ جو راستہ بھول گئے ہوں اور ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہوں ۔ نظر آتا ہے ۔

یہ منظر زبانِ حال سے کہتا ہے کہ : انسان کے وجود کی سرزمین بھی اسی طرح ہے کہ اگر اس کی تعمیری قوتوں کو کنٹرول کیا جائے' اور اس کی صلاحیتوں کا صحیح مصرف ہو، تو علم و عمل اور فضائل اخلاق کے سرسبز و شاداب باغات بار آور ہوں گے، لیکن اگر تقویٰ کا بند ٹوٹ جائے' اور خواہشات ایک ویران کرنے والے سیلاب کی شکل میں انسانی زندگی کی سرزمین کو ڈھانپ لیں ۔

تو بے قدر و قیمت ویرانی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا، اور کبھی بھی ایک ایسا عامل جو ظاہری طور پر چھوٹا سا ہوتا ہے' آہستہ آہستہ بنیاد کو کاٹنا شروع کر دیتا ہے' اور ہر چیز کو درہم برہم کر دیتا ہے' لہٰذا ایسے چھوٹے چھوٹے عوامل تک سے ڈرتے رہنا چاہیئے ۔

۵- آخری بات، کہ جس کی طرف اشارہ کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب ماجرا ایک دفعہ پھر اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ انسان کی موت اس کی زندگی کے اندر ہی چھپی ہوئی ہے' اور وہی چیز کہ جو ایک دن اس کی حیات و آبادی کا باعث ہوتی ہے، دوسرے دن ممکن ہے اس کی موت اور ویرانی کا عامل بن جائے۔

(۲۰) وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ○

(۲۱) وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ ۗ وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ○

ترجمہ

(۲۰) ہاں ! یقیناً ابلیس نے ان کے بارے میں اپنا گمان سچا پایا، کہ سوائے مومنین کے ایک تھوڑے سے گروہ کے سب ہی نے اس کی پیروی کی۔

(۲۱) اس کا ان کے اوپر کوئی قابو تو نہیں تھا (اور نہ ہی اس نے انہیں اپنی پیروی پر مجبور کیا) اور شیطان کو اس کے وسوسوں میں آزاد چھوڑنے کا مقصد یہ تھا کہ آخرت پر ایمان رکھنے والے ان لوگوں سے کہ جو اس کے بارے میں شک میں ہیں الگ پہچانے جائیں ، اور تیرا پروردگار ہر چیز کا حافظ اور نگہبان ہے۔

تفسیر

کوئی شخص شیطانی وسوسوں کی پیروی پر مجبور نہیں ہے

ان آیات میں درحقیقت قوم سبا کی داستان سے کلی نتیجہ نکال کر پیش کیا گیا ہے، جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئی تھی، اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ ہوائے نفس اور شیطانی وسوسوں کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی وجہ سے ان تمام بدبختیوں اور ناکامیوں میں کس طرح گرفتار ہوتے۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے : " یقیناً شیطان نے اپنے گمان کو ان کے بارے میں (اور ہر اس جماعت کے بارے میں جو ابلیس کی پیروی کرتی ہے) درست پایا "(ولقد صدق علیھم ابلیس ظنه)۔

" ان سب نے ہی اس کی پیروی کی، سوائے مومنین کے تھوڑے سے گروہ کے "(فاتبعوہ الا فریقاً من المؤمنین)۔

یا دوسری تعبیر کے مطابق ابلیس کی وہ پیشین گوئی ۔ جو اس نے آدمؑ کے سجدے سے روگردانی کرنے اور بارگاہ خداوندی سے دھتکارے جانے کے بعد کی تھی کہ : " فبعزتك لاغوینھم اجمعین الا عبادك منھم المخلصین " (تیری عزت کی قسم! تیرے مخلص بندوں کے سوائیں ان سب کو گمراہ کروں گا)[1] اس گروہ کے بارے میں ٹھیک نکلی ۔

اگرچہ اس نے یہ بات گمان اور اندازے سے کہی تھی، لیکن وہی گمان اور اندازہ آخرکار حقیقت بن گیا، کیونکہ یہ ارادوں کے کمزور اور ضعیف الایمان لوگ گروہ گروہ اس کے پیچھے چلنے لگے، صرف مومنین کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا کہ جنہوں نے شیطانی وسوسوں کی زنجیروں کو توڑ دیا، اور اس کے دام فریب میں نہ آئے، آزاد رہے اس دنیا میں، آزادی سے زندگی بسر کی، اور آزاد ہی اس دنیا سے گئے۔" اگرچہ وہ تعداد کے لحاظ سے تو کم تھے، لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک پورے ایک جہان کے ہم پلہ تھا۔ "اولئك ھم الاقلون عدداً والاکثرون عند الله قدراً"[2]

بعد والی آیت میں ۔ ابلیس کے وسوسوں، اور ان لوگوں کے بارے میں کہ جو اس کے اثر و نفوذ کا شکار ہو جاتے ہیں اور جو اس کے اثر و نفوذ سے باہر رہتے ہیں ۔ دو مطالب کی طرف اشارہ کرتا ہے، پہلے کہتا ہے : " شیطان کا ان کے اوپر کوئی تسلط اور قابو نہیں تھا، اور وہ کسی کو اپنی پیروی پر مجبور نہیں کرتا "(وما کان له علیھم من سلطان)۔

یہ ہم ہی ہیں، کہ جو اُسے اپنے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں اور مملکت بدن کی سرحدوں کو عبور کرنے کے بعد دل میں داخل ہونے کا پروانہ اس کے لیے جاری کرتے ہیں ۔

یہ وہی چیز ہے کہ جسے قرآن دوسری جگہ پر خود شیطان کی زبانی نقل کر رہا ہے کہ : (وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی)" میرا تم پر کوئی تسلط تو نہیں تھا، سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے بھی میری دعوت کو قبول کر لیا " (ابراہیم ۔ ۲۲)

لیکن یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ، ہوا پرست اور بے ایمان لوگوں کی طرف سے اس کی دعوت قبول ہو جانے کے بعد وہ آرام سے نہیں بیٹھتا بلکہ اپنے غلبہ اور تسلط کی بنیادوں کو ان پر مستحکم کر لیتا ہے ۔

---

[1] سورۂ ص ۔ ۸۲، ۸۳ ۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار ۔

اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے کہ: " ابلیس کو اس کے وسوسوں میں آزاد چھوڑ دینے کا مقصد یہ تھا کہ آخرت پر ایمان لانے والے اور شک میں پڑے ہوئے بے ایمان لوگ الگ الگ پہچانے جائیں" (الّا لنعلم من یؤمن بالاٰخرة ممن ھو منھا فی شک) [1]

یہ بات بدیہی ہے کہ خدا ازل سے ان تمام چیزوں سے کہ جو اس جہان میں ابد تک واقع ہوں گی، آگاہ ہے۔ اس بنا پر (لنعلم) "تاکہ ہم جان لیں" کے جملہ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو ان سے کہ جو شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں نہیں پہچانتے لہٰذا شیطانی وسوسوں کو درمیان میں آنا چاہیئے، تاکہ وہ پہچانے جائیں، بلکہ اس جملہ سے مراد خدا کے علم کا تحقق عینی ہے کیونکہ خدا ہرگز اشخاص کے باطن اور ان کے بالقوہ اعمال کو جاننے اور ان کا علم رکھنے کی بنا پر کسی کو سزا اور عذاب نہیں کرتا، بلکہ ضروری ہے کہ میدانِ امتحان فراہم ہو، شیطانی وسوسے اور خواہشات نفسانی کا آغاز ہو، تاکہ ہر شخص جو کچھ اپنے اندر رکھتا ہے، اپنے ارادہ اور اختیار کی پوری آزادی کے ساتھ اسے باہر نکال دے، اور خدا کا علم تحقق عینی حاصل کرے، کیونکہ جب تک خارج میں کوئی عمل انجام نہ پائے اس وقت تک عذاب و عقاب کا استحقاق حاصل نہیں ہوتا۔

دوسرے لفظوں میں وہ بات جو بالقوہ موجود ہے فعل میں نہ آئے صرف حسنِ باطن یا سوءِ باطن کی بنا پر کسی کو جزا، یا کسی کو سزا نہیں دیتے۔

اور آیت کے آخر میں تمام بندوں کو تنبیہ اور خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: " اور تیرا پروردگار ہر چیز کا محافظ اور نگہبان ہے" (و ربّک علٰی کل شیء حفیظ)۔

تاکہ شیطان کے پیروکار یہ تصور نہ کرلیں کہ ان کے اعمال و گفتار میں سے کوئی چیز اس جہان میں ختم ہو جائے گی، یا خدا اس کو فراموش کر دے گا۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ خدا ہر چیز کی قیامت کے دن کے لیے نگہداری اور حفاظت کرتا ہے۔

---

[1] اس معنی کی بنا پر کہ جو ہم نے آیہ کی تفسیر میں بیان کیے ہیں، استثناء، یہاں پر استثنائے متصل ہے، اس بات کے قرینہ سے کہ جو سورہ حجر کی آیہ ۴۲ میں بیان ہوئی ہے کہ "ان عبادی لیس لک علیھم سلطان الّا من اتبعک من الغاوین" کیونکہ اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ شیطان، غاوین، پر تسلط جماتا ہے، البتہ بعض مفسرین نے استثنا منفصل کا احتمال بھی دیا ہے۔

(۲۲) قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ○

(۲۳) وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ○

(۲۴) قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

(۲۵) قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

(۲۶) قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ○

(۲۷) قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَاۗءَ كَلَّا ۭ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

ترجمہ

(۲۲) کہہ دو، کہ جن کو تم خدا کے سوا (اپنا معبود) خیال کرتے ہو انہیں پکارو! (وہ ہرگز بھی تمہاری کسی مشکل کو حل نہ کریں گے کیونکہ) انہیں آسمانوں اور زمین

میں ذرّہ برابر بھی اختیار نہیں ہے، اور نہ ہی وہ (اُس کی خلقت و مالکیت) میں شریک ہیں، اور نہ ہی وہ (پیدائش کے کام میں) اس کے یار و مددگار تھے۔

(۲۳) اس کے پاس کسی کے لیے بھی کوئی شفاعت فائدہ نہ دے گی، سوائے ان لوگوں کی شفاعت کے جن کی (شفاعت کرنے کی) اجازت دے دی جائے گی (اس دن سب کے سب اضطراب میں ہوں گے) یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے اضطراب زائل ہو جائے گا (اور اس کی طرف سے فرمان "شفاعت" صادر ہو جائے گا، تو اس وقت مجرمین شفاعت کرنے والوں سے) کہیں گے کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم دیا ہے تو وہ کہیں گے کہ حق (کو بیان کیا ہے اور مستحقین کے بارے میں شفاعت کرنے کی اجازت دی ہے) اور وہی ہے بلند مقام اور بزرگ مرتبہ والا۔

(۲۴) کہہ دو: آسمانوں اور زمین سے تمہیں کون روزی دیتا ہے، کہہ دو، اللہ۔ تو ہدایت پر یا کھلی گمراہی میں ہم ہیں یا تم۔

(۲۵) کہہ دو! کہ جو گناہ ہم نے کیے ہیں اس کی تم سے پوچھ گچھ نہ ہو گی اور (اسی طرح) جو عمل تم کرتے ہو اس کی باز پرس ہم سے نہ ہو گی۔

(۲۶) کہہ دو! کہ ہمارا پروردگار ہم سب کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا (اور مجرموں کو نیکوکار لوگوں سے جدا کر دے گا) اور وہی فیصلہ کرنے والا، جُدا کرنے والا اور آگاہ ہے۔

(۲۷) کہہ دو! کہ جنہیں تم نے اس کا شریک بنا کر اس کے ساتھ ملحق کیا ہے مجھے دکھاؤ (تو سہی) ہرگز ایسا نہیں ہے (اس کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہے)

بلکہ وہی عزیز و حکیم خدا ہے۔

تفسیر

مجھے بتاؤ کہ کیوں؟....

ہم نے سورت کے آغاز میں کہا تھا کہ اس سورہ کی آیات کا ایک قابلِ ملاحظہ حصّہ مبدأ و معاد اور اعتقاداتِ حقّہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور ان کے ملانے سے سچے معارف کا ایک مجموعہ حاصل ہو جاتا ہے۔

آیات کے اس حصّہ میں واقعاً مشرکین کو محاکمہ میں کھینچ لے جاتا ہے، اور منطقی سوالات کی کچل دینے والی ضربوں کے ذریعہ ان کو گھٹنوں کے بل گراتا ہے' اور بتوں کی شفاعت کے بارے میں ان کی بوسیدہ منطق کا بے بنیاد ہونا واضح و آشکار کرتا ہے۔

آیات کے اس سلسلے میں پیغمبرؐ کو پانچ مرتبہ مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، اور ان سے کہہ دے ....، اور ہر مرتبہ بتوں اور بت پرستی کے کام کے سلسلہ میں ایک نیا مطلب پیش کرتا ہے' اس طرح سے کہ انسان آخر میں اچھی طرح سے محسوس کر لیتا ہے کہ کوئی مکتب بت پرستوں کے مکتب سے زیادہ کھوکھلا نہیں ہے' بلکہ اس کو تو مکتب و مذہب کہا ہی نہیں جا سکتا۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے: "ان سے کہہ دے کہ جنہیں تم خدا کے علاوہ (اپنا معبود) خیال کرتے ہو، انہیں پکارو، لیکن یہ جان لو کہ وہ ہرگز بھی تمہاری دعا اور پکار کا جواب نہیں دے سکتے اور تمہاری مشکلات کو حل نہیں کر سکتے" (قل ادعوا الذین زعمتم من دون اللّٰہ)۔[۱]

اس کے بعد اس گفتگو کی دلیل پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بناوٹی معبود نہ تو آسمان و زمین میں ایک ذرہ برابر اختیار رکھتے ہیں اور نہ ہی ان میں کی پیدائش اور ملکیت میں کوئی حصّہ اور شرکت رکھتے ہیں اور نہ ہی ان میں سے کوئی تخلیق کے کاموں میں خدا کا یار و مددگار تھا" (لا یملکون مثقال ذرۃ فی السماوات ولا فی الارض وما لھم فیھما من شرک وما لہ منھم من ظھیر)۔

---

[۱] اس جملہ میں درحقیقت دو تقدیریں ہیں، پہلی "زعمتم" کے بعد "انھم اٰلھۃ" کا جملہ مقدر ہے، اور "من دون اللّٰہ" کے بعد "لا یستجیبون دعاکم" کا جملہ مقدر ہے' اور مجموعی طور پر یہ جملہ اس طرح ہو جاتا ہے، "قل ادعوا الذین زعمتم انھم اٰلھۃ من دون اللّٰہ لا یستجیبون لکم"۔

اگر وہ کسی مشکل کے حل پر قادر ہوں، تو اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تین اوصاف میں سے کسی ایک کے تو حامل ہوں، یا تو آسمان وزمین میں کسی چیز کی مستقل ملکیت رکھتے ہوں، یا کم ازکم امرِ خلقت میں خدا کے ساتھ شرکت رکھتے ہوں، یا ان امور میں سے کسی میں پروردگار کے معاون و مددگار ہوں۔

حالانکہ یہ بات صاف طور پر واضح و روشن ہے کہ واجب الوجود ایک ہی ہے اور باقی سب کے سب ممکن الوجود اور اسی کے ساتھ وابستہ ہیں، کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے لطف وکرم کی نظر اُن سے اٹھ جائے تو وہ دیارِ عدم کی طرف چلتے بنیں۔

"اگر نازی کند یکدم، فرو ریزند قالبھا"!

اگر وہ ایک لحہ کے لیے بھی فخر و ناز کریں، تو سارے سانچے گر پڑیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے: "مثقال ذرۃ فی السماوات ولا فی الارض" یعنی ایسی موجودات کہ جو ایک بے قدر وقیمت ذرّہ کے وزن کی مقدار کے برابر بھی اس بے کراں آسمان اور وسیع و عریض زمین میں کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، تمہاری مشکلات تو رہی ایک طرف وہ اپنی ہی کون سی مشکل حل کرنے کے قابل ہیں؟!

* * *

یہاں یہ سوال فوراً ذہن میں آتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے مسئلہ کا کیا بنے گا۔

بعد والی آیت میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: اگر خدا کی بارگاہ میں کچھ شفاعت کرنے والے موجود ہیں تو وہ بھی اس کے اذن و فرمان سے ہے کیونکہ "اس کے یہاں کوئی شفاعت فائدہ نہ دے گی سوائے ان کے جن کے لیے اس نے اذن دیا ہوگا" (ولا تنفع الشفاعۃ عندہ الا لمن اذن لہ)۔

اس بناء پر بت پرستوں کا بتوں کی پرستش کے بارے میں یہ بہانہ کہ جو کہتے تھے: "ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ" ــــ یہ خدا کے یہاں ہماری شفاعت کرنے والے ہیں۔ (یونس۔ ۱۸) اس وسیلہ سے ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ خدا نے ہرگز انہیں شفاعت کی اجازت نہیں دی ہے۔

اس بارے میں کہ: "الا لمن اذن لہ" "سوائے اس کے کہ جس کے لیے وہ اذن دے" کا جملہ شفاعت کرنے والے کی طرف اشارہ ہے یا ان کی طرف کہ جن کی شفاعت کی جائے گی؟ مفسرین نے دونوں احتمال دیئے ہیں، لیکن اس مناسبت سے کہ گزشتہ آیت میں بتوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اور وہ بتوں کو اپنا شفیع خیال کرتے تھے، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ یہ "شفاعت

کرنے والوں" کی طرف اشارہ ہو۔

کیا یہاں "شفاعت" سے مراد دنیا کی شفاعت ہے یا آخرت کی' دونوں ہی احتمال ہو سکتے ہیں' لیکن بعد والے جملے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہاں آخرت کی شفاعت مدِنظر ہے۔

لہٰذا اس جملہ کے بعد اس طرح کہتا ہے: "اس دن دلوں پر اضطراب اور وحشت کا غلبہ ہوگا" (شفاعت کرنے والے بھی اور جن کی شفاعت کی جائے گی وہ بھی اضطراب میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، اور وہ سب کے سب اس انتظار میں ہوں گے کہ دیکھیں خدا کن لوگوں کو شفاعت کی اجازت دیتا ہے؟ اور کن لوگوں کی شفاعت کرنے کے لیے؟ اور یہ اضطراب اور پریشانی کی حالت اسی طرح جاری رہے گی) "یہاں تک کہ فزع و اضطراب ان کے دلوں سے زائل ہو اور خدا کی طرف سے یہ فرمان صادر ہو" (حتّٰی اذا فزّع عن قلوبھم)[1]

بہرحال اُس دن ایک شور و غوغا برپا ہوگا، شفاعت ہونے والوں کی نگاہیں شفاعت کرنے والوں پر لگی ہوئی ہوں گی، اور زبانِ حال سے یا زبانِ قال سے ملتمسانہ ان سے شفاعت کا تقاضا کر رہے ہوں گے۔

لیکن شفاعت کرنے والوں کی نگاہیں بھی فرمانِ خدا پر لگی ہوئی ہوں گی، تاکہ (دیکھیں کہ) کس طرح اور کس کے حق میں شفاعت کی اجازت دیتا ہے، یہ عمومی اور ہر وقت کا وحشت و اضطراب بھی اسی طرح جاری رہے گا، یہاں تک کہ ان لوگوں کے بارے میں کہ جو اس کے لائق ہاں خدائے حکیم کی طرف سے شفاعت کا فرمان صادر ہوگا۔

یہ وہ مقام ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کی طرف رُخ کریں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے (یا مجرم شفاعت کرنے والوں سے پوچھیں گے) اور کہیں گے کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم دیا ہے" (قالوا ماذا قال ربکم)۔

"وہ جواب میں کہیں گے کہ خدا نے حق کو بیان کیا ہے" (قالوا الحق)۔

اور حق تو اس کے سوا کچھ نہیں، کہ شفاعت کی اجازت صرف ان کے لیے ہوگی جنہوں نے خدا سے کلی طور پر اپنا رابطہ منقطع نہیں کیا تھا، نہ کہ ان گنہگاروں اور مجرموں کے لیے کہ جنہوں نے خدا، پیغمبر، اولیاء اللہ سے کلی طور پر بیگانگی اختیار کرلی ہے اور تعلقات کے تمام رشتوں کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔

---

[1] "فزّع" مادہ "فزع" سے ہے جس وقت "عن" کے ذریعہ متعدی ہو تو فزع کے ازالہ اور وحشت و اضطراب کے برطرف ہونے کے معنی میں ہے یہ مادہ اس صورت میں بھی جبکہ یہ "ثلاثی مجرد" کی شکل میں ہو اور "عن" سے متعدی ہو تو پھر بھی یہی معنی دیتا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "وہی ہے بلند مقام اور بزرگ مرتبہ خدا" (وھو العلی الکبیر)۔

یہ جملہ شفاعت کرنے والوں کی گفتگو کا آخری حصّہ اور اس کی تکمیل کرنے والا ہے۔ حقیقت میں وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ خدا علیؔ وکبیر ہے، لہٰذا وہ جو حکم دیتا ہے وہ عین واقعیت ہے اور ہر واقعیت اس کے احکام و دستور پر منطبق ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ایسی نزدیک ترین تفسیر ہے کہ جو آیہ کے جملوں کے ساتھ ہم آہنگ اور منظم ہے، یہاں مفسرین نے دوسری تفسیریں بھی بیان کی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض میں آیت کے متن، اس کے ظاہر و باطن اور اس کے قبل و بعد کے ربط و تعلق کو کسی طرح بھی نظر میں نہیں رکھا گیا۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں ایک اور طریقہ سے مشرکین کے عقائد کو باطل کرنے کے لیے آغاز کیا ہے اور "رازقیت" کے مسئلہ کو مسئلہ "خالقیت" کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا، عنوان کرتا ہے، یہ دلیل بھی سوال وجواب کی صورت میں ہے تاکہ ان کے سوئے ہوئے وجدان کو اس طرح سے بیدار کرے، اور اس جواب سے کہ جو ان کے اندر سے جوش مارتا ہے، اپنی غلطی اور اشتباہ کو سمجھ لیں۔

کہتا ہے: "تم کہہ دو کہ کون ہے وہ کہ تمہیں آسمانوں اور زمین سے روزی دیتا ہے اور ان کی برکات کو تمہارے اختیار میں قرار دے دیتا ہے" (قل من یرزقکم من السماوات والارض)۔

یہ بات صاف طور پر واضح وظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پتھر اور لکڑی کے بُت آسمان سے بارش برساتے ہیں، اور زمین سے گیاہ اور سبزے اگاتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کے منبعوں اور ذخائر کو ہمارے اختیار میں دیتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بغیر اس کے کہ ان کے جواب کا انتظار کرتا، بلا فاصلہ فرماتا ہے: "کہہ دو کہ اللہ" (قل اللہ)۔

کہہ دو کہ وہ خدا ہی ہے کہ جو ان تمام برکات کا منابع ہے، یعنی یہ مطلب اس قدر واضح و روشن ہے کہ طرف مقابل کے جواب کا محتاج ہی نہیں ہے، کیونکہ مشرکین بھی خدا ہی کو خالق اور رزقوں کا عطا کرنے والا جانتے تھے اور بُتوں کے لیے وہ بھی صرف مقام شفاعت ہی کے قائل تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پروردگار کے رزق اور روزیاں جو آسمان کی طرف سے انسانوں تک پہنچتی ہیں وہ بارش میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ "سورج کی روشنی اور حرارت" اور "ہوا" کہ جو زمین کی فضا میں موجود ہے، بارش کے حیات بخش قطرات سے بھی زیادہ اہم ہے۔

جیسا کہ زمین کی برکات بھی گیاہ اور سبزہ زاروں میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ زیر زمین انواع و اقسام کے پانی کے منبع، طرح طرح کی معدنیات کہ جن میں سے بعض تو اُس زمانہ میں بھی دریافت ہو چکے تھے، اور بعض زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں، سب کے سب اسی عنوان میں جمع ہیں۔

آیت کے آخر میں ایک ایسے مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو خود ایک دلیل کی بنیاد بن سکتا ہے، ایک ایسی دلیل کہ جو حقیقت بینی اور انصاف و آداب سے ملی ہوئی ہے، اس طرح سے کہ مخالف ہٹ دھرمی اور غرور کے مرکب سے نیچے اتر آئے اور غور و فکر کرے، کہتا ہے: "یقیناً ہدایت پر یا کھلی ہوئی گمراہی میں ہم ہیں یا تم" (وانّا او ایّاکم لعلیٰ ھدی او فی ضلال مبین)[1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارا اور تمہارا عقیدہ آپس میں واضح تضاد رکھتا ہے، اس بنا پر ممکن نہیں ہے کہ دونوں حق ہوں، کیونکہ نقیضین اور ضدین میں جمع ممکن نہیں ہے، پس ایک گروہ اہلِ ہدایت کا ہے اور دوسرا ضلالت و گمراہی میں گرفتار ہے۔

اب تم خود غور کرو کہ کونسا ہدایت یافتہ ہے اور کونسا گمراہ، دونوں گروہوں میں نشانیاں دیکھو کہ کس گروہ میں ہدایت کی نشانیاں ہیں اور کس میں گمراہی کی نشانیاں۔

اور یہ مناظرہ اور بحث کے طریقوں میں سے ایک بہتر طریقہ ہے کہ مدِّمقابل اور فریقِ مخالف کو خود بخود غور و فکر اور جوش میں آنے کے لیے ابھاریں، اور یہ جو بعض نے اسے تقیہ کی ایک قسم خیال کیا ہے انتہائی غلط اور اشتباہ والی بات ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ہدایت" کو لفظ "علیٰ" کے ساتھ ذکر کیا ہے اور "ضلالت" کو "فی" کے ساتھ کہ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت یافتہ تو گویا ایک تیز رو مرکب پر بیٹھے ہوئے ہیں، جبکہ گمراہ لوگ گمراہی اور جہالت کی ظلمت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ پہلے "ہدایت" کے بارے میں گفتگو کی ہے اور اس کے بعد ضلالت و گمراہی کے متعلق، کیونکہ پہلے جملہ کی ابتداء میں کہتا ہے "ہم" اور پھر کہتا ہے "تم" تاکہ یہ پہلے گروہ کی ہدایت اور دوسرے گروہ کے بے ہدایت ہونے کی طرف ایک لطیف اور ہلکا سا اشارہ ہو۔

اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت نے "مبین" کی صفت کو صرف "ضلال" کے ساتھ مربوط سمجھا ہے، کیونکہ ضلالت و گمراہی کئی اقسام رکھتی ہے اور ضلالت شرک سب سے زیادہ واضح و آشکار ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ توصیف "ہدایت" و "ضلالت" دونوں کے لیے ہو، کیونکہ

---

[1] یہ جملہ تقدیر میں اس ترتیب سے دو جملوں کی طرف لوٹتا ہے: وانا لعلی ھدی او فی ضلال مبین وانکم لعلی ھدی او فی ضلال مبین۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۸، ص ۳۸۰۔

اس قسم کے موقعوں پر فصحاء کے کلمات میں صفت کا تکرار نہیں ہوتا، اس بناء پر ہدایت بھی مبین کے ساتھ توصیف ہوئی ہے اور ضلالت بھی، جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں یہ توصیف دونوں قسموں کے لیے نظر آتی ہے۔[1]

بعد والی آیت میں پھر اسی استدلال کو ایک دوسری شکل میں ۔۔ پھر اسی منصفانہ لب و لہجہ میں کہ جو مخالف کو ہٹ دھرمی اور غرور کے مرکب سے اتار دے ۔ جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: "کہہ دے کہ تم سے ہمارے گناہوں کے بارے میں باز پرس نہیں ہوگی اور نہ ہی ہم سے تمہارے اعمال کے بارے میں کچھ پوچھا جائے گا" (قل لا تسئلون عما اجرمنا ولا نسئل عما تعملون)۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہاں پیغمبر اس بات پر مامور ہیں کہ اپنے بارے میں تو جرم کی تعبیر کرے اور اپنے مخالفین کے بارے میں ایسے کاموں سے تعبیر کرے کہ جو وہ انجام دیتے ہیں اور اس طرح سے اس حقیقت کو واضح و روشن کرے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا جوابدہ ہونا چاہیئے، کیونکہ ہر انسان کے اعمال کے نتائج ۔ وہ بُرے ہوں یا اچھے خود اسے ہی پہنچتے ہیں۔

ضمنی طور پر اس نکتہ کی طرف بھی ایک لطیف سا اشارہ ہے کہ اگر ہم تمہاری رہنمائی پر اصرار کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہارے گناہ ہمارے ذمہ لکھ دیئے جاتے ہیں یا تمہارا شرک ہمیں کچھ ضرر پہنچاتا ہے، بلکہ ہم تو دل سوزی و حق جوئی اور حق طلبی کی بناء پر اس کام پر اصرار کرتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

بعد میں آنے والی آیت درحقیقت گزشتہ دو آیات کے نتیجہ کا بیان ہے کیونکہ جس وقت انہیں اس بات سے آگاہ اور خبردار کر دیا گیا، کہ دونوں گروہوں میں سے ایک حق پر ہے اور دوسرا باطل پر ہے، اور اس بات کے لیے بھی خبردار کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے تو پھر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ سب کی وضع و کیفیت کی جانچ پڑتال کیسے ہوگی، اور حق و باطل ایک دوسرے سے کس طرح جدا ہوگا، اور ہر کسی کو اس کی ذمہ داریوں اور مسئولیت کے مطابق ہی جزا و سزا ملے گی، لہٰذا فرماتا ہے: "ان سے کہہ دے کہ ہمارا پروردگار ہم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا، اور پھر ہمارے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ اور ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گا تاکہ ہدایت یافتہ گمراہوں سے پہچانے جائیں، اور ہر ایک اپنے اعمال کے نتیجہ تک جا پہنچے" (قل یجمع بیننا ربنا ثم یفتح بیننا بالحق)۔

اگر تم یہ دیکھ رہے ہو کہ آج سب کے سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ہر ایک یہی

---

[1] سورہ نمل کی آیہ ۱، نور کی ۱۲، ہود کی ۹، قصص کی ۲ اور نحل کی آیہ ۹، کی طرف رجوع کریں۔

دعویٰ کرتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور میں ہی اہلِ نجات میں سے ہوں، تو یہ کیفیت ہمیشہ باقی اور برقرار نہیں رہے گی اور آخر کار ان صفوں کی جدائی کا دن آن پہنچے گا، کیونکہ پروردگار کی "ربوبیت" کا تقاضا یہی ہے کہ اچھائی برائی سے، خالص ناخالص سے، اور حق باطل سے آخر کار جدا ہو جائیں اور ہر ایک اپنے مقام پر رہے۔

اب تم غور کرو کہ تم اس دن کیا کرو گے؟ اور تم کون سی صف میں قرار پاؤ گے، کیا تم نے اس دن کے لیے پروردگار کے سوالات کا جواب تیار کر لیا ہے۔

آیت کے آخر میں اس حقیقت کو واضح و روشن کرنے کی غرض سے کہ یہ کام یقینی طور پر ہو کر رہے گا، مزید کہتا ہے: "وہی ہے فیصلہ کرنے والا اور حق کو باطل سے جدا کرنے والا، آگاہ اور جاننے والا"۔ (وھو الفتاح العلیم)۔

یہ دونوں نام کہ جو خدا کے اسماء حسنیٰ میں سے ہیں، ان میں سے ایک صفوں کو الگ کرنے کے مسئلہ پر قدرت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا اس کے بے پایاں علم کی طرف، کیونکہ حق و باطل کی صفوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ان دو کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اوپر والی آیت میں "رب" (پروردگار) کے عنوان پر تکیہ کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا ہم سب کا مالک و مربی ہے، اور یہ مقام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس قسم کے دن کے لیے پروگرام فراہم کیا جائے، اور حقیقت میں یہ "معاد" کی دلائل میں سے ایک دلیل کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

لفظ "فتح" جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے، اصل میں شبہات اور پیچیدگی کو ختم کرنے کے معنی میں ہے، اور وہ دو قسم پر ہے: کبھی تو یہ آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے، مثلاً تالا کھولنا اور کبھی غور و فکر کرنے سے اس کا ادراک ہوتا ہے، مثلاً غم و اندوہ اور دکھ درد کی پیچیدگی کو دُور کرنا، یا علوم کے سربستہ رازوں کو کھولنا، اور اسی طرح دو افراد کے درمیان فیصلہ کرنا، اور ان کے نزاع اور مخاصمت کی مشکل کو کھولنا۔

اس بناء پر اگر یہ لفظ صفوں کو جدا کرنے کے بارے میں — خاص طور پر جہاں وہ آپس میں ایک دوسرے سے ملی جلی ہوں — استعمال ہوا ہے، تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کے درمیان جدائی کے علاوہ قضاوت اور فیصلہ بھی — کہ جو فتح کا ایک معنی ہے — انجام پاتا ہے، اور ہر کسی کو جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، جزا دیتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں مشکلات کے حل کے لیے "یا فتاح" کے ذکر پر تکیہ کیا گیا ہے، کیونکہ خدا کا یہ عظیم نام کہ جو "فتح" سے صیغہ مبالغہ کی شکل میں آیا ہے، پروردگار کی ہر

مشکل کو حل کرنے کی طاقت، اور غم و اندوہ کو دور کرنے اور ہر فتح و کامرانی کے اسباب فراہم کرنے کی قدرت کو بیان کرتا ہے، واقعاً کوئی بھی اس کے سوا "فتاح" نہیں ہے اور بند دروازوں کی مفتاح اور چابی اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں کہ جو پیغمبرؐ کے لیے (اس سلسلے کا) پانچواں فرمان ہے پھر ایک مرتبہ مسئلہ توحید کی طرف ۔ کہ جس سے گفتگو کی ابتدا کی تھی ۔ دوبارہ لوٹتا ہے، اور اس مسئلہ کے ساتھ بحث کو ختم کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "کہہ دے کہ جنہیں تم نے شریک کے عنوان سے خدا کے ساتھ ملحق کیا ہے مجھے دکھا توسہی" (قل اروني الذين الحقتم به شركاء)۔

ان میں کون سی صلاحیت اور کیا قدر و قیمت ہے، اگر تمہاری مراد یہی مٹھی بھر بے جان اور خاموش پتھر اور لکڑیاں ہیں تو کتنی بدبختی اور شرمساری کی بات ہے کہ عالم جمادات میں سے اپنے ہی ہاتھ کی ساختہ و پرداختہ چیزوں کو کہ جو موجودات میں سے سب سے پست ہیں لے لو اور انہیں خداوند عظیم کے مانند خیال کرو۔

اور اگر تم انہیں ارواح اور فرشتوں کے مثل اور نمونہ سمجھتے ہو تو پھر بھی یہ ایک مصیبت ہے اور گمراہی ہے کیونکہ وہ بھی اسی کی مخلوق اور اسی کے تابع فرمان ہیں۔

لہٰذا اس جملہ کے بعد ایک ہی لفظ کے ساتھ ان تمام اوہام پر خطِ بطلان کھینچتے ہوئے کہتا ہے: "نہیں ہرگز نہیں ایسا نہیں ہے" (كلا)۔

یہ قطعاً معبود ہونے کے لائق نہیں اور تمہارے ان خیالات میں کچھ بھی واقعیت نہیں ہے، انتہا ہو چکی ہے اب تو تم بیدار ہو جاؤ، کب تک اس غلط راستے پر چلتے رہو گے۔

حقیقت میں "کلا" ایک ایسا چھوٹا سا لفظ ہے کہ جو ان تمام معانی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور آخر میں اس بات کی تاکید اور فیصلہ کے طور پر کہتا ہے: "بلکہ وہی صرف خداوند عزیز و حکیم ہے" (بل هو الله العزيز الحكيم)۔

اس کی عزت اور اس کے شکست ناپذیر ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے حریم الوہیت تک کسی کی رسائی نہ ہو اور اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس قدرت کو صحیح طور سے صرف کرے۔

ہاں! ان صفات کا حامل ہونا واجب الوجود ہونے کی نشانی ہے اور واجب الوجود لامتناہی ہستی ہوتی ہے کہ جو کبھی بھی قابلِ تعدد نہیں ہوتی اور اس کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہوتا، کیونکہ ہر تعدد اسے محدود و ممکن بناتا ہے، جبکہ وجود بے پایاں صرف ایک ہی ہے۔ (غور کیجئے)

نکتہ

دلوں کو تسخیر کرنے کا طریقہ

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اہلِ فضل اور دانشمند افراد، بحث و استدلال کے داؤ پیچ سے بے نیازی اور نفسیاتی پہلوؤں کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے، دوسرے کے افکار و نظریات میں بالکل نفوذ نہیں کر سکتے۔

اس کے برعکس ہم ایسے کئی افراد کو جانتے ہیں، کہ وہ علمی لحاظ سے اس پائے کے نہیں ہوتے، لیکن دلوں کو جذب کرنے اور انہیں مسخر کرنے اور دوسروں کے افکار میں نفوذ کرنے میں کامیاب اور موفق ہوتے ہیں۔

اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مباحث کو پیش کرنے کا طریقہ اور مدِمقابل سے مباحثہ کرنے کی طرز ایسے اصولوں کے ساتھ ہونی چاہیئے کہ جو اخلاقی اور نفسیاتی پہلو سے ملی ہوئی ہو تاکہ مدِمقابل میں منفی پہلوؤں کو نہ ابھارے، اور اُسے ہٹ دھرمی اور بغض و عناد پر نہ اکسائے، بلکہ اس کے برعکس اس کے وجدان کو بیدار کرتے ہوئے حق طلبی اور حق جوئی کی روح اس میں زندہ کرے۔

یہاں اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ انسان صرف غور و فکر اور عقل و خرد کا مجموعہ ہی نہیں ہے کہ وہ قدرتِ استدلال کے سامنے سرِتسلیم خم کر دے، بلکہ وہ اس کے علاوہ گوناں گوں "عواطف اور احساسات" وجذبات کا مجموعہ بھی ہے کہ جس کا اہم حصہ اس کی روح کو تشکیل دیتا ہے، وہ اس کے وجود کے اندر ہی چھپا ہوا ہے کہ جسے صحیح اور معقول طریقہ سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔

قرآن نے ہمیں اس راہ و روش کی تعلیم دی ہے کہ مخالفین کے مقابلہ میں کس طرح منطقی مباحث پیش کرتے ہوئے انہیں اخلاقی اصول کے ساتھ اس عنوان سے ملائیں کہ وہ ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر جائیں۔

نفوذ کی شرط یہ ہے کہ مدِمقابل یہ احساس کر لے کہ کہنے والا ان اوصاف کا حامل ہے:

۱۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اُن باتوں پر ایمان بھی رکھتا ہے، اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھ رہا ہے۔

۲۔ اس بحث سے اس کا مقصد حق جوئی و حق طلبی ہے، نہ کہ غالب آنا اور فوقیت حاصل کرنا۔

۳۔ وہ مدِمقابل کی قطعاً تحقیر و تذلیل نہیں چاہتا، اور اپنے آپ کو بزرگ اور بڑا کر کے پیش کرنا نہیں چاہتا۔

۴۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے دلسوزی اور خلوص سے کہہ رہا ہے اور اس کا اس میں کوئی خاص شخصی

نفع نہیں ہے۔

۵۔ وہ مدِمقابل کے لیے احترام کا قائل ہے، اور اسی وجہ سے وہ اپنی تعبیرات میں بحث کی نزاکت کو فراموش نہیں کرتا۔

۶۔ وہ اپنے مدِمقابل کی ہٹ دھرمی کی حس کو بلا وجہ بھڑکانا نہیں چاہتا اور اگر کسی موضوع پر کافی مقدار میں بحث ہوچکی ہو تو وہ اسی پر قناعت کرلیتا ہے اور بحث میں اصرار کرنے اور اپنی بات کو فوقیت دینے سے پرہیز کرتا ہے۔

۷۔ وہ انصاف کرنے والا ہے اور انصاف کے پہلو کو کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، چاہے مدِمقابل اس اصول کی رعایت نہ کرتا ہو۔

۸۔ وہ اپنے افکار کو دوسروں پر ٹھونسنا نہیں چاہتا، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ خود دوسروں میں ولولہ پیدا کردے تاکہ وہ خود اپنے شوق میں آزادی کے ساتھ حقیقت تک پہنچ جائیں۔

اوپر والی آیات میں غور و فکر کرنا، اور حکمِ خدا سے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مخالفین کے ساتھ مباحثہ کرنے کا طریقہ ــ جس میں بہت سے قابلِ غور نکات ہوتے تھے ــ اوپر والے مباحث پر بہترین گواہ ہیں۔

وہ بعض اوقات تو یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ وہ حتمی طور پر اس بات کا تعین بھی نہیں کرتے، کہ ہم تو راہِ ہدایت پر ہیں اور تم گمراہی کے طریقہ پر ہو، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ: "ہدایت یا گمراہی پر ہم ہیں یا تم"، تاکہ وہ اس بات میں غور کریں کہ ہدایت اور گمراہی کی نشانیاں کس گروہ میں پائی جاتی ہیں۔

یا وہ یہ کہتا ہے کہ: "قیامت کے دن خدا ہم سب کے درمیان فیصلہ کرے گا اور ہر کسی کو اس کی لیاقت کے مطابق جزا دے گا"۔

البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سب باتیں ان لوگوں کے بارے میں ہیں کہ جن کی ہدایت کی امید ہو، لیکن بے رحم، ظالم اور ہٹ دھرم دشمنوں کے ساتھ ــ جن کی طرف سے قبول کرنے کی کوئی امید ہی نہ ہو ــ قرآن ایک دوسرے طریقہ سے پیش آتا ہے[1]

اس بحث کے لیے ــ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کا اپنے مخالفین کے ساتھ بحث کا طریقہ ــ ایک بہترین نمونہ ہے، نمونہ کے طور پر اس سلسلے میں امام صادقؑ سے کتبِ حدیث میں جو کچھ نقل ہوا اس پر توجہ کیجئے۔

توحید مفضل بن عمر کی مشہور حدیث کے مقدمہ میں اس طرح نقل ہوا ہے: وہ کہتا ہے کہ میں

---

[1] اس تفسیر کی جلد نمبر ۹ سورہ عنکبوت کی آیت ۴۶ کے ذیل میں تفصیلی بحث کرچکے ہیں۔

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبرِ مطہر کے پاس تھا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ و مقامِ عظمت کے بارے میں غور و فکر کر رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ "ابن ابی العوجا" (مشہور مادہ پرست شخص) وارد ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا، اس طرح سے کہ میں اس کی باتیں سن سکتا تھا۔ جب اس کے ساتھی اس کے گرد جمع ہو گئے، تو اس نے کفر آمیز باتیں شروع کر دیں کہ جن کا نتیجہ محمدؐ کی نبوت کا انکار، اور اس سے بڑھ کر خداوند تبارک و تعالیٰ کا انکار تھا، اس نے بہت ہی شیطنت آمیز اور جچی تلی باتیں کیں۔

میں اس کی باتیں سُن کر غضبناک اور پریشان ہوا، میں اٹھ کھڑا ہوا اور چیخ کر کہا، اے دشمنِ خدا! کیا تو نے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے؟ اور اس خدا کا جس نے تجھے بہترین شکل میں پیدا کیا ہے انکار کر دیا ہے؟

"ابن ابی العوجا" نے میری طرف رُخ کیا اور کہا، تُو کون ہے، اگر تُو علمِ کلام کا عالم ہے تو دلیل پیش کر، تاکہ ہم تیری پیروی کریں اور اگر تُو عالم نہیں ہے، تو پھر تُو بات نہ کر، اور اگر تو جعفر بن محمد صادقؑ کے پیروکاروں میں سے ہے، تو وہ تو ہم سے اس طرح سے بات نہیں کرتے، جس طرح سے تُو بحث کر رہا ہے۔

انہوں نے تو اس سے بھی بڑھ کر باتیں ہم سے سُنی ہیں، انہوں نے تو کبھی بھی ناسزا اور گالی نہیں دی، اور ہمارے جواب میں غصہ یا زیادتی کا راستہ اختیار نہیں کیا، وہ تو ایک بردبار، عاقل، سمجھدار اور سنجیدہ آدمی ہیں، اور ان کے کبھی سبک سری دامن گیر نہیں ہوتی۔ وہ ہماری باتوں کو غور سے سنتے ہیں، اور ہمارے دلائل سے آگاہ ہوتے ہیں، جب ہم اپنی تمام باتیں کر لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان پر فتحیاب ہو گئے، تو اس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور جچی تلی باتوں کے ساتھ ہمارے تمام دلائل کا جواب دیتے ہیں، اور ہمارے تمام بہانوں کو قطع کر دیتے ہیں۔ اس طرح سے کہ پھر ہم میں جواب دینے کی قدرت و طاقت ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر تُو ان کے اصحاب میں سے ہے، تو پھر تُو بھی ہمارے ساتھ اسی طرح سے بات کر[1]

---

[1] "توحید مفضل" (اوائل کتاب)۔

(۲۸) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(۲۹) وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

(۳۰) قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ○

ترجمہ

(۲۸) ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر تمام لوگوں کے لیے (رسول بنا کر) تاکہ (انہیں خدائی جزاؔ اور ثواب کی) بشارت دے اور (اس کے عذاب سے) ڈرائے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۲۹) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ (قیامت کا) وعدہ کب ہوگا۔

(۳۰) تم کہہ دو: تمہارا وعدہ اس دن ہوگا کہ جس میں نہ ایک گھڑی کی تاخیر ہوگی اور نہ (ہی اس پر) مقدم ہو سکو گے۔

تفسیر

تم تمام جہان والوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہو

پہلی زیر بحث آیت پیغمبر اسلامؐ کی نبوّت کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور اس کے بعد والی آیات معاد و قیامت کے سلسلہ میں بحث کرتی ہیں' اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ آیات میں گفتگو توحید سے متعلق تھی، عقائد دینی کے ایک کامل مجموعہ کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جو سورۂ سبا جیسی مکی سورتوں کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی وسعت اور تمام انسانوں کے لیے ان کی نبوت کی عمومیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر تمام جہان کے لوگوں کے لیے، درآنحالیکہ تم سب کو خدا کی عظیم جزاؤں کی بشارت دیتے ہو اور عذاب الٰہی سے ڈراتے ہو لیکن اکثر لوگ اس معنی سے بے خبر ہیں" (وما ارسلناك الا كافة للناس بشيرًا و نذيرًا ولكن اكثر الناس لا يعلمون)۔

"کافّۃ" مادہ "کف" سے ہاتھ کی ہتھیلی کے معنی میں ہی ہے، اور چونکہ انسان اپنے ہاتھ سے چیزوں کو پکڑتا ہے، یا اپنے سے دور کرتا ہے لہٰذا یہ لفظ کبھی "جمع کرنے" کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "منع کرنے" کے معنی میں۔

مفسرین نے زیر بحث آیت میں دونوں احتمال دیئے ہیں، پہلا یہ کہ جمع کرنے کے معنی میں ہو، اور اس صورت میں آیت کا مفہوم وہی ہوگا کہ جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے "کہ ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر جہان کے تمام لوگوں کے لیے" یعنی یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے عالمی اور جہانی ہونے کو بیان کرتا ہے۔

متعدد روایات کہ جو شیعہ اور سنی طرق سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہیں وہ بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔

اس بنا پر آیت کا مفہوم و مطلب سورۂ فرقان کی آیہ ۱ کی طرح ہے کہ جو یہ کہتی ہے کہ (تبارك الذي نزل الفرقان على عبده ليكون للعالمين نذيرًا) "ہمیشہ ہی برکتوں والا ہے وہ خدا کہ جس نے اپنے بندے پر قرآن کو نازل کیا تاکہ سارے جہان کے تمام لوگوں کو ڈرائے"۔

اور سورۂ انعام کی آیہ ۱۹ کی طرح ہے کہ جو یہ کہتی ہے کہ: (واوحي الي هٰذا القراٰن لانذركم به و من بلغ) "یہ قرآن مجھ پر وحی ہوا ہے تاکہ میں تمہیں بھی اور تمام ان لوگوں کو بھی کہ جن تک یہ بات پہنچے، ڈراؤں"۔

ایک حدیث میں، کہ جسے بعض مفسرین نے اوپر والی آیت کی مناسبت سے ذکر کیا ہے، پیغمبرؐ کی دعوت کی عمومیت، ان کے ایک عظیم اعزاز و افتخار کی حیثیت سے منعکس ہو رہی ہے۔ آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ:

"اعطيت خمسًا — ولا اقول فخرًا — بعثت الى الاحمر والاسود، و جعلت لي الارض طهورًا ومسجدًا، واحل لي المغنم ولا يحل لاحد قبلي، نصرت بالرعب فهو يسير امامي مسيرة شهر، واعطيت الشفاعة فادخرتها لامتي يوم القيامة"

"خدا نے مجھے پانچ چیزیں عطا فرمائی ہیں — اور میں اس بات کو فخر و مباہات کے طور پر نہیں کہتا — (بلکہ شکرِ نعمت کے طور پر کہتا ہوں) مَیں تمام انسانوں کے لیے، خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، مبعوث ہُوا ہوں، اور میرے لیے زمین کو پاک و پاکیزہ اور اس کی ہر جگہ کو مسجد و عبادت گاہ قرار دیا گیا ہے، جنگ میں حاصل شدہ مالِ غنیمت میرے لیے حلال ہے، جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے بھی حلال نہیں کی گئی تھی۔ دشمنوں کے دل میں دہشت اور رعب ڈال کر میری مدد کی گئی ہے (اور خدا نے ہمارا رعب ہمارے دشمن کے دل میں ڈال دیا ہے) اس طور سے کہ وہ (رعب) میرے آگے آگے ایک مہینہ کی راہ کے برابر بڑھتا ہے اور مجھے مقامِ شفاعت دیا گیا ہے، اور مَیں نے اسے اپنی امت کی خاطر قیامت کے دن کے لیے ذخیرہ کیا ہُوا ہے"[1]

اگرچہ اوپر والی حدیث میں آیت کی تفسیر کے طور پر تصریح نہیں ہوئی ہے، البتہ اس سلسلہ میں اور بھی احادیث ہمارے پاس موجود ہیں کہ جن میں یا تو آیت کی تفسیر کی تصریح ہوئی ہے، اور یا "للناس کافة" کی تعبیر ہے، کہ جو وہی اوپر والی آیت کی تعبیر ہے[2] اور یہ سب کی سب اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اوپر والی آیت پیغمبرؐ کی دعوت کے جہانی ہونے کو بیان کر رہی ہے۔ دوسری تفسیر، جو اس آیت کے لیے بیان کی گئی ہے "کف" کے دوسرے معنی یعنی منع کرنے سے لی گئی ہے، اس تفسیر کے مطابق "کافة" پیغمبر کی صفت ہے[3] اور اس سے مراد یہ ہے کہ: خدا نے پیغمبر کو انسانوں کے لیے کفر و معصیت و گناہ سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ نزدیک نظر آتی ہے۔

بہر حال چونکہ تمام انسان جلبِ منفعت اور دفعِ ضرر کی خواہش رکھتے ہیں، لہٰذا پیغمبر بھی مقامِ "بشارت" و "نذارت" کے حامل تھے، تاکہ وہ ان دونوں خواہشات کو مجتمع رکھیں، اور انہیں حرکت میں لے آئیں لیکن غافل اور بے خبر اکثریت اپنے انجام پر توجہ کیے بغیر ان کے مقابلے میں کھڑی ہو جاتی اور خدا کی ان عظیم نعمتوں کا انکار کر دیتی۔

* * *

چونکہ گزشتہ آیات میں اس معنی کی طرف اشارہ ہُوا تھا کہ خدا قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع کرنے

---

[1] تفسیر مجمع البیان ذیل آیات زیرِ بحث، یہ حدیث در المنثور میں بھی ابنِ عباس سے نقل ہوئی ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۲۵۵ و ۲۵۶۔

[3] کبھی "تاء" اسم فاعل سے ملحق ہوتی ہے اور مبالغہ کا معنیٰ دیتی ہے، نہ کہ تانیث کا مثلاً "راویہ"۔

کے بعد ان کے درمیان فیصلہ کریگا۔ لہٰذا بعد والی آیت میں منکرین معاد کی طرف سے ایک سوال کو اس صورت میں نقل کرتا ہے کہ: "وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو پھر یہ قیامت کا وعدہ کس زمانہ میں پورا ہوگا"۔ (ویقولون متٰی ھٰذا الوعد ان کنتم صادقین)۔

یہ سوال منکرینِ معاد، پیغمبرِ اسلامؐ یا دوسرے تمام پیغمبروں سے بارہا کیا کرتے تھے، جو کبھی تو مطلب کو سمجھنے کے لیے ہوتا تھا، اور شاید اکثر استہزاء اور تمسخر کے طور پر ہوا کرتا تھا۔ کہ آخر یہ قیامت جس کا تم ہمیشہ سہارا لیتے ہو، اگر تم سچ کہتے ہو تو بتلاؤ کہ وہ کب آئے گی۔ ان کا یہ پوچھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچ بولنے والے آدمی کو اس مطلب کے تمام جزئیات کا جس کی وہ خبر دے رہا ہے علم ہونا چاہیئے اور اس کے کم وکیف اور زمان و مکان سے بھی آگاہ ہونا چاہیئے۔

لیکن قرآن ہمیشہ اس مطلب کے صریح جواب اور قیامت کے وقوع کے زمان کی تعین سے پہلوتہی کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے کہ جس کا علم خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے، اور اس کے علاوہ کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں ہے۔

لہٰذا بعد والی آیت میں اسی مطلب کو ایک دوسری عبارت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کہہ دو کہ تمہارا وعدہ اس دن ہوگا کہ نہ ایک گھڑی اس سے تاخیر ہوگی اور نہ ہی ایک لمحہ بھر اس سے آگے بڑھوگے" (قل لکم میعاد یوم لا تستأخرون عنه ساعة ولا تستقدمون)۔

یہ قیامِ قیامت کی تاریخ کا مخفی ہونا۔ یہاں تک کہ پیغمبرِ اسلامؐ پر بھی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اس بناء پر ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ لوگ ایسی آزادی عمل۔ جو انہیں ہمیشہ آمادہ رہنے کی حالت میں تیار رکھے۔ کے حامل ہوں کیونکہ اگر قیامت کی تاریخ معین ہوجائے تو اگر اس کا زمانہ دور ہوتا تو سب کے سب غفلت، غرور اور بے خبری میں جا پڑتے، اور اگر اس کا زمانہ نزدیک ہوتا، تو ممکن تھا کہ وہ آزادیٔ عمل کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے اور ان کے اعمال اضطراری صورت اختیار کر لیتے اور دونوں صورتوں میں انسان کے تربیتی ہدف بے نتیجہ رہ جاتے، اسی بناء پر قیامت کی تاریخ تمام لوگوں سے پوشیدہ ہے، جیسا کہ شب قدر کی تاریخ وہی رات کہ جو ہزار ماہ کی فضیلت رکھتی ہے، یا حضرت مہدیؑ کے قیام کی تاریخ۔

وہ تعبیر کہ جو سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۵ میں آئی ہے: "ان الساعة اٰتیة اکاد اخفیها لتجزٰی کل نفس بما تسعٰی" (قیامت یقینی طور پر آئے گی، میں چاہتا ہوں کہ اسے مخفی رکھوں تاکہ ہر شخص کو اس کی اپنی سعی و کوشش کے مقابلہ میں جزا دی جائے) اسی معنی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

اس ضمن میں کہ وہ یہ تصور کرتے تھے کہ پیغمبر جو قیامت کے بارے میں خبر دے رہا ہے، اگر وہ سچ کہہ رہا ہے تو اسے اس کی یقینی تاریخ کا بھی علم ہونا چاہیئے۔ یہ ان کی انتہائی غلط فہمی ہے، اور ان کے وظیفۂ نبوت

سے بے خبری اور لاعلمی کی دلیل ہے، کیونکہ وہ تو صرف احکام کو پہنچانے اور بشارت وانذار پر مامور تھے، باقی رہا قیامت کا مسئلہ تو وہ خدا سے مربوط ہے اور صرف وہی اس کے تمام جزئیات سے آگاہ ہے، اور صرف اسی حصّہ کو جسے مسائل تربیتی کے لیے اُس نے ضروری سمجھا پیغمبر کے اختیار میں دیا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن مخالفین کی تہدید کے مقام میں کہتا ہے کہ:

"تم قیامت کے مقررہ وعدہ سے ایک لحظہ کے لیے بھی تاخیر نہیں کرو گے" (لا تستاخرون) لیکن یہ کیوں کہتا ہے کہ ایک لحظہ کے لیے مقدم بھی نہیں ہوگی، قرآن کے ہدف میں اس بات کا کیا اثر ہے؟

اس کے جواب میں دو نکات کی طرف توجہ رکھنا ضروری ہے: پہلا یہ ہے کہ ان دونوں کو اکٹھا ذکر کرنا ہمیشہ کسی چیز کی تاریخ کے قطعی اور یقینی ہونے کی طرف اشارہ ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں کام میں دیری یا جلدی نہیں ہے بلکہ اس کے وعدہ کا وقت قطعی ویقینی ہے۔

دوسرا یہ کہ ہٹ دھرم کفار کی ایک جماعت ہمیشہ پیغمبروں پر دباؤ ڈالتی رہتی تھی کہ یہ قیامت آتی کیوں نہیں، دوسرے لفظوں میں انہیں اس کے لیے جلدی تھی خواہ استہزار کے طور پر یا بغیر استہزار کے، قرآن انہیں کہتا ہے کہ تم جلدی نہ کرو، اس کی تاریخ اور وقت وہی ہے جو خدا نے مقرر کیا ہوا ہے۔

(۳۱) وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ بِہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَلَا بِالَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ ؕ وَلَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ مَوۡقُوۡفُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚۖ یَرۡجِعُ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضِۣ الۡقَوۡلَ ۚ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لَوۡلَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا مُؤۡمِنِیۡنَ ○

(۳۲) قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡۤا اَنَحۡنُ صَدَدۡنٰکُمۡ عَنِ الۡہُدٰی بَعۡدَ اِذۡ جَآءَکُمۡ بَلۡ کُنۡتُمۡ مُّجۡرِمِیۡنَ ○

(۳۳) وَقَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا بَلۡ مَکۡرُ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ اِذۡ تَاۡمُرُوۡنَنَاۤ اَنۡ نَّکۡفُرَ بِاللّٰہِ وَنَجۡعَلَ لَہٗۤ اَنۡدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَۃَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ ؕ وَجَعَلۡنَا الۡاَغۡلٰلَ فِیۡۤ اَعۡنَاقِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ ہَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ○

ترجمہ

(۳۱) کافروں نے کہا کہ: ہم اس قرآن پر اور جو کتابیں اس سے پہلے تھیں ہرگز بھی ایمان نہیں لائیں گے، اور اگر تُو دیکھے کہ جس وقت یہ ستمگر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں (حساب کتاب اور جزا و سزا کے لیے) کھڑے ہوئے ہوں گے (تو ان کی وضع و کیفیت سے تجھے تعجب ہوگا) جبکہ ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن میں ڈال رہا ہوگا، مستضعفین مستکبرین سے کہہ رہے

ہوں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہو جاتے ۔

۳۲ (لیکن) مستکبرین مستضعفین کو جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روک رکھا تھا، اس کے بعد کہ وہ تمہارے پاس آئی (اور تم نے اسے اچھی طرح سے پا لیا تھا) بلکہ تم خود ہی مجرم تھے ۔

۳۳ مستضعفین مستکبرین سے کہیں گے، تمہارے رات دن کے فریب دینے والے وسوسے (ہماری گمراہی کا سبب بنے) جس وقت تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم خدا کا انکار کر دیں، اور اس کے لیے شریک قرار دیں، وہ جس وقت عذاب (الٰہی) کو دیکھیں گے تو اپنی ندامت اور پشیمانی کو چھپائیں گے (کہ کہیں زیادہ رسوا نہ ہوں) اور ہم کافروں کی گردن میں طوق و زنجیر ڈال دیں گے، کیا اس کے علاوہ کہ جو وہ عمل کرتے تھے کوئی اور جزا انہیں دی جائے گی ؟!

تفسیر

اس بحث کی مناسبت سے کہ جو گزشتہ آیات میں مسئلہ معاد پر مشرکین کی طرف سے اعتراضات کے بارے میں تھی، زیر بحث آیات میں ان کے لیے معاد کے بعض دردناک مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے تاکہ وہ اپنے کام کے انجام سے واقف ہو جائیں ۔

پہلے کہتا ہے کہ : "ہم اس قرآن پر اور جو کتابیں اس سے پہلے تھیں ہرگز بھی ایمان نہیں لائیں گے" (وقال الذین کفروا لن نؤمن بھذا القراٰن ولا بالذی بین یدیہ)۔

لفظ "لن" جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کی نفی کے لیے ہے، اس بنا پر وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر تم ابد تک بھی ہمیں تبلیغ کرو تو ہم ایمان نہیں لائیں گے' اور یہ ان کی ہٹ دھرمی کی دلیل ہے کہ انہوں نے ابد تک ۔۔ کے لیے اپنے ارادے کو پختہ کر لیا تھا، حالانکہ ایک حق طلب آدمی اگر کسی دلیل سے مطمئن نہ ہو تو وہ آئندہ کی احتمالی دلیلوں کا سنے بغیر انکار نہیں کر سکتا، اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں دوسرے دلائل کو بھی رد کرتا ہوں ۔

اس بارے میں کہ " الذین کفروا " سے کون لوگ مراد ہیں، مفسرین کی ایک جماعت نے تو اس کی مشرکین کے ساتھ تفسیر کی ہے' اور بعض نے یہود اور اہل کتاب کے ساتھ، لیکن بعد والی آیات کے قرائن، کہ جو شرک کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں' اس بات کی دلیل ہیں، کہ اس سے مراد مشرکین ہی ہیں۔" الذی بین یدیہ " سے مراد وہی کتب آسمانی ہیں کہ جو قرآن سے پہلے دوسرے پیغمبروں پر نازل ہوئی تھیں، کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں یہ تعبیر ۔خصوصاً ذکرِ قرآن کے بعد ۔ اسی معنی میں استعمال ہوئی ہے' اور یہ بات جس کا بعض نے احتمال دیا ہے کہ اس سے مراد "معاد" اور یا قرآن کے مضامین تھے، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

بہرحال پہلے انبیاء کی کتب پر ایمان سے انکار شاید اس بناء پر تھا کہ قرآن اس مطلب پر تکیہ کرتا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی نشانیاں تورات وانجیل میں وضاحت کے ساتھ آئی ہیں' اور پیغمبرِ اسلامؐ کی نبوت کی نفی کرنے کے لیے دوسری کتب آسمانی کی بھی نفی کرتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ نہ ہم اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں' اور نہ اس سے پہلے کی کتب پر۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کی طرف رُوئے سخن کرتے ہوئے قیامت میں ان کی وضع وکیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "اگر تُو دیکھے کہ جب یہ ستمگر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حساب وکتاب اور داد رسی کے لیے کھڑے کیے جائیں گے (تو ان کی وضع وکیفیت سے تُو حیرت میں ڈوب جائے گا) جبکہ ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن میں ڈالے گا، اور ایک دوسرے کے خلاف جھگڑا اور لڑائی کر رہے ہوں گے" (ولو ترٰی اذ الظالمون موقوفون عند ربھم یرجع بعضھم الٰی بعض القول) [1]

اوپر والی آیت سے ایک دفعہ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ظلم" کے اہم ترین مصادیق میں سے ایک وہی "شرک" اور "کفر" ہے۔

"عند ربھم" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسی ہستی کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے کہ جو اُن کا مالک اور پروردگار ہے' اور اس سے بڑھ کر شرمندگی وشرمساری کی اور کیا بات ہوگی کہ انسان ایک ایسی ہستی کے سامنے پیش ہو کہ نہ تو وہ اس پر ایمان لایا ہو اور نہ ہی اس کے احکامات و فرامین پر، درآنحالیکہ اس کا سارا وجود اسی کی نعمتوں کا مرہون منت ہو۔

"اس حال میں مستضعفین"، وہی بے خبر لوگ کہ جو آنکھ، کان بند کیے ہوئے دوسروں کے پیچھے لگے

---

[1] "یرجع" فعل لازم کی شکل میں بھی استعمال ہوتا ہے اور فعل متعدی کی شکل میں بھی، اور یہاں دوسری شکل میں ہے اور ارجاع اور لوٹانے کا معنی دیتا ہے اور چونکہ اس کے بعد (بعضھم الی بعض) آیا ہے لہٰذا نتیجہ "مفاعلۃ" کا معنی دیتا ہے۔

ہوتے تھے مستکبرین سے ۔ یعنی اُنہیں لوگوں سے ۔ کہ جو کبر و غرور اور دوسروں پر تسلط جانتے اور انہیں شیطانی سوچ کا راستہ دکھاتے تھے، اس طرح کہیں گے : "اگر تم نہ ہوتے اور اگر تمہارے شیطنت آمیز فریب دینے والے وسوسے نہ ہوتے تو ہم مومنین میں سے ہوتے " (یقول الذین استضعفوا للذین استکبروا لولا انتم لکنا مؤمنین) ۔

وہ اس طرح سے اپنے تمام گناہ ان بے رحم مستکبرین کی گردن میں ڈالنا چاہیں گے، اگرچہ دُنیا میں وہ اس قسم کی قطعی اور دو ٹوک بحث کرنے کی مجال نہ رکھتے تھے، چونکہ ضعف و ناتوانی ان کے وجود پر غالب آئی ہوئی تھی اور وہ اپنی حریت و آزادی کھو چکے تھے، لیکن اب جبکہ وہ تمام جھوٹے مفاہیم جنہوں نے مستکبرین کو ان سے جُدا کیا ہوا تھا برباد ہو گئے، اور سب کے اعمال کے نتائج ظاہر و آشکار ہو گئے تو ان کے عین سامنے کھڑے ہو جائیں گے اور صراحت کے ساتھ ان سے بات کریں گے، اور ان سے پرخاش رکھیں گے ۔

٭ ٭ ٭

لیکن مستکبرین بھی خاموش نہیں رہیں گے، "وہ جواب میں مستضعفین سے یہ کہیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں ہدایت کی راہ سے روکا تھا، جبکہ ہدایت بھی تمہارے پاس آگئی تھی، اور کافی حد تک اتمام حجت بھی ہو گئی تھی، اور پیغمبروں نے بھی تمام ضروری باتیں کہہ دی تھیں" (وقال الذین استکبروا للذین استضعفوا انحن صددناکم عن الھدٰی بعد اذ جاءکم) ۔

نہیں ہم تمہارے جوابدہ نہیں ہیں، "بلکہ تم خود ہی گنہگار تھے کہ تم نے آزادئ ارادہ رکھنے کے باوجود ہماری بے بنیاد باتوں کے سامنے سر تسلیم خم کیا، کفر و الحاد کی طرف رُخ کیا، اور انبیاء کی منطقی باتوں کو بھلا بیٹھے" (بل کنتم مجرمین) ۔

٭ ٭ ٭

یہ ٹھیک ہے کہ مستکبرین اپنے وسوسوں کی وجہ سے عظیم گناہ کے مرتکب ہوتے تھے لیکن ان کی یہ بات بھی واقعیت رکھتی ہے کہ ان پیچھے لگنے والوں کو آنکھ اور کان بند کر کے ان کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہیئے تھا، اس لحاظ سے ان کا گناہ خود انہیں کی گردن پر ہے ۔

٭ ٭ ٭

لیکن مستضعفین اس جواب پر قناعت نہیں کریں گے، اور مستکبرین کو مجرم ثابت کرنے کے لیے دوبارہ گفتگو شروع کر دیں گے، اور مستکبرین سے اس طرح کہیں گے : "بلکہ تمہارے وسوسے، سازشیں اور شب و روز کے مکارانہ پروپیگنڈے اس بات کا سبب بن گئے کہ ہم ہدایت حاصل کرنے سے باز رہیں، جس وقت تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم خدا کا انکار کر دیں اور اس کے لیے شریک و شبیہ قرار

دیں" (وقال الذین استضعفوا للذین استکبروا بل مکر اللیل والنھار اذ تأمروننا ان نکفر باللہ ونجعل لہ اندادًا)۔

ہاں ! تم ہی تو تھے جو اپنے بُرے پروپیگنڈے سے دست بردار نہیں ہوتے تھے اور دن رات اپنے بُرے مقاصد کی پیش رفت کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم قبول کرنے میں آزاد تھے اور قصوروار و گنہگار لیکن عامل فساد ہونے کی بنار پر تم بھی جوابدہ اور گنہگار ہو، بلکہ سنگِ بنیاد تو تمہارے ہی ناپاک ہاتھوں سے رکھا گیا، خاص طور پر جبکہ تم ہمیشہ ہی اپنی قدرت و طاقت اور اقتدار کی بنار پر بات کرتے تھے " تأمروننا" کی تعبیر اس مطلب پر گواہ ہے۔

یہ بات صاف طور پر واضح اور ظاہر ہے کہ مستکبرین اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے، اور اس عظیم جرم میں اپنی شرکت کا انکار نہیں کرسکتے تھے۔

لہٰذا دونوں گروہ اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے، مستکبرین تو دوسروں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے اور مستضعفین ان بُرے وسوسوں کو بلاقید و شرط قبول کرنے کی وجہ سے، "لیکن جس وقت عذاب الٰہی کو دیکھیں گے تو اپنی ندامت و پشیمانی کو چھپائیں گے کہ کہیں اور زیادہ رسوا نہ ہوجائیں، اور ہم طوق و زنجیر کافروں کی گردن میں ڈال دیں گے" (واسروا الندامۃ لما راوا العذاب وجعلنا الاغلال فی اعناق الذین کفروا)۔

اگرچہ اس جہان میں کہ جو ہر چیز کے ظاہر ہوجانے کا دن ہے اور اس دن کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھی جاسکے گی، کسی چیز کو چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن وہ اپنی اسی پرانی عادت کے مطابق کہ جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، اس خیال سے کہ وہ (یہاں بھی) اپنی حالت کو چھپا سکتے ہیں چھپانے کی کوشش کریں گے۔

ہاں ! وہ دنیا میں بھی جس وقت اپنی غلطی کو محسوس کرتے تھے، اور اس پر نادم و پشیمان ہوتے تھے تو اظہارِ ندامت کی جرأت ۔ جو تجدیدِ نظر اور بازگشت کے لیے ضروری تھی ۔ نہیں رکھتے تھے' اور اپنی اسی اخلاقی خصوصیت کو قیامت میں بھی استعمال کریں گے لیکن کیا فائدہ ؟

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ ندامت کو پنہاں رکھنا عذاب الٰہی کے مشاہدہ اور ان کی گردن میں طوق و زنجیر کے پڑنے سے شدتِ وحشت کی بنار پر ہوگا ان کے سانس ان کے سینوں میں رُک جائیں گے' اور ان کی زبان بات کرنے سے عاجز ہوگی۔

اگرچہ قیامت کے دوسرے مواقف میں وہی لوگ " یا ویلنا انا کنا ظالمین" "ہائے افسوس ! ہم ہی ظالم تھے" کی فریاد کریں گے۔ (انبیار - ۱۴)

بعض نے یہاں "اسرار" کا معنی "اظہار" کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لفظ عربی زبان میں دو متضاد معانی

میں استعمال ہوتا ہے اور اس کی مثالیں کم نہیں ہیں۔ لیکن قرآن میں بھی اور غیر قرآن میں بھی اس لفظ "اسرار" کے مواقع استعمال کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ معنی بعید نظر آتا ہے کیونکہ "سر" عام طور پر "علن" کے مقابلہ میں آتا ہے، اور راغب نے بھی "مفردات" میں اس قول کے ضعیف ہونے کی تصریح کی ہے اگرچہ بعض علماء لغت نے دونوں معانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔[1]

بہرحال یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے کہ جو انہوں نے پہلے سے فراہم کیا ہے "کیا انہیں کوئی اور جزا۔ سوائے ان اعمال کے کہ جو وہ انجام دیا کرتے تھے۔ ملے گی" (هل يجزون الا ما كانوا يعملون)۔

ہاں! یہ کفار و مجرمین کے اعمال و کردار ہی ہوں گے، جو اُن کی گردن اور ہاتھ پاؤں میں قید کی زنجیروں کی صورت میں ڈال دی جائے گی، وہ اِس جہان میں بھی ہوائے نفس اور زر و زور اور پستی و بلندی کے اسیر تھے، اور قیامت میں جب اعمال مجسم ہو کر سامنے آئیں گے تو وہی قیدیں دوسری شکل میں ظاہر ہوں گی۔

اوپر والی آیت ایک مرتبہ پھر تجسم اعمال کے مسئلہ کو، جس کی طرف ہم نے بارہا اشارہ کیا ہے، واضح کر رہی ہے، کیونکہ وہ یہی بات کہہ رہی ہے کہ "ان کی جزا خود انہیں کے اعمال ہیں" اور تجسم اعمال کے لیے اس سے زیادہ ظاہر و واضح اور کون سی تعبیر ہوگی۔

"الذين كفروا" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ اغوا اور گمراہ کرنے والے مستکبر بھی اسی انجام کو پہنچیں گے اور اغوا اور گمراہ ہونے والے مستضعف اور سب کافر بھی اسی انجام میں گرفتار ہوں گے، اور اصولی طور پر اس وصف کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی مجازات اور سزا کی علت وہی ان کا کفر ہے۔

---

[1] "لسان العرب" میں مادہ "سر" کے ذیل میں اس سلسلہ میں تفصیل بحث کی گئی ہے، اور اہل لغت و ادب کے اس بارے میں اختلاف کو نقل کیا ہے۔ (جلد ۴، صفحہ ۳۵۰)

(۳۴) وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِىۡ قَرۡيَةٍ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ○

(۳۵) وَقَالُوۡا نَحۡنُ اَكۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّاَوۡلَادًا ۙ وَّمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ ○

(۳۶) قُلۡ اِنَّ رَبِّىۡ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ○

(۳۷) وَمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ بِالَّتِىۡ تُقَرِّبُكُمۡ عِنۡدَنَا زُلۡفٰٓى اِلَّا مَنۡ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۙ فَاُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ جَزَآءُ الضِّعۡفِ بِمَا عَمِلُوۡا وَهُمۡ فِى الۡغُرُفٰتِ اٰمِنُوۡنَ ○

(۳۸) وَالَّذِيۡنَ يَسۡعَوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيۡنَ اُولٰٓـئِكَ فِى الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ ○

ترجمہ

(۳۴) ہم نے کسی شہر اور بستی میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مترفین (جو ناز و نعمت میں مست تھے) نے کہا کہ ہم اس سے کہ جو کچھ تم دے کر بھیجے گئے ہو کافر ہیں۔

(۳۵) اور انہوں نے یہ کہا کہ ہمارے اموال اور اولاد (سب سے) زیادہ ہیں (اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ خدا کا ہمارے ساتھ تعلق ہے) اور ہمیں ہرگز

عذاب نہیں ہوگا۔

۳۶ کہہ دے کہ میرا پروردگار جس کی چاہتا ہے روزی وسیع یا تنگ کر دیتا ہے (اور یہ بات اس کی بارگاہ میں قرب سے کوئی ربط نہیں رکھتی) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۳۷ تمہارے مال اور اولاد ہرگز تمہیں ہمارا مقرب نہیں بناتے، سوائے ان کے کہ ایمان لے آئیں اور عمل صالح انجام دیں، ان کے لیے ہی ان کے اعمال کے بدلے میں جو انہوں نے انجام دیئے ہیں کئی گنا جزا ہے اور وہ (جنت کے) بالاخانوں میں (انتہائی) امن و امان میں ہوں گے۔

۳۸ اور وہ لوگ کہ جو ہماری آیات کے انکار و ابطال کی کوشش کرتے رہے اور یہ خیال کرتے رہے کہ ہماری قدرت کے چنگل سے نکل کر بھاگ جائیں گے، وہ عذاب (الٰہی) میں داخل ہوں گے۔

تفسیر

مال و اولاد قربِ خدا کی دلیل نہیں ہیں

چونکہ گزشتہ آیات میں مستکبرین کے (لوگوں کو) اغواء کرنے کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں اس اغواگری کے ایک گوشے کو بیان کیا جا رہا ہے اور ضمنی طور پر پیغمبر گرامی اسلام کو بھی تسلی دی جارہی ہے، کہ اگر وہ تیری مخالفت کریں تو اس بات پر تعجب نہ کر کیونکہ مرفہ الحال مستکبرین کی طرف سے سچے پیغمبروں کی مخالفت کرنا تو ان کا شیوہ اور عادت رہی ہے۔

کہتا ہے: "ہم نے کسی شہر یا بستی میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مترفین۔ وہی لوگ جو ناز و نعمت میں مست اور مغرور ہو چکے تھے۔ نے کہا ہم اس چیز کے کہ جو تم دے کر بھیجے گئے ہو منکر و کافر ہیں، اور جسے تم خدائی پیغام کا نام دیتے ہو اُسے ہم قبول نہیں کرتے" (وما ارسلنا فی قریة

من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون)۔

"نذیر" کا معنی ہے ڈرانے والا اور یہ خدا کے پیغمبروں کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگوں کو ان کی کج رویوں، بیدادگریوں اور گناہ و فساد کے مقابلہ میں خدا کے عذاب سے ڈراتے تھے۔

"مترفوھا" جمع ہے "مترف" کی "ترف" "بروزن طرف" کے مادہ سے جو تنعم کے معنی میں ہے، اور مترف اس شخص کو کہتے ہیں کہ جسے نعمت کی زیادتی اور زندگی کی مرفہ الحالی نے مست، مغرور اور غافل کر دیا ہو اور سرکشی پر اکسایا ہو۔[1]

ہاں! عام طور پر وہ لوگ کہ جو انبیاء کے صف اوّل کے مخالف تھے، وہ یہی مترف، سرکش اور غافل لوگ تھے، چونکہ وہ ایک طرف سے تو انبیاء کی تعلیمات کو اپنے مقاصد کے حصول اور اپنی ہوس رانی سے مزاحم سمجھتے تھے اور دوسری طرف سے وہ اُسے اُن محرومین کے حقوق کا دفاع کرنے والا جانتے تھے کہ جن کے حقوق کو غصب کرکے وہ ایسی زرق برق زندگی گزار رہے تھے' اور تیسری طرف سے وہ ہمیشہ اپنے مال و ثروت کی حفاظت کے لیے حکومت کی قدرت کو معاون و مددگار سمجھتے تھے، اور پیغمبروں کو ان تمام جہات میں اپنا مدمقابل سمجھتے تھے' لہٰذا فوراً ان سے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ کسی خاص حکم یا تعلیم کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ تو کلی طور پر یہ کہتے تھے کہ: "ہم اُن تمام چیزوں کے کہ جن کے ساتھ تم مبعوث ہوئے ہو کافر ہیں" یہاں تک کہ ہم ایک قدم بھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہیں' اور ان کی یہ بات خود حق کے مقابلہ میں ان کی لجاجت، ہٹ دھرمی اور عناد کی بہترین دلیل تھی۔

یہ حقیقت ایک اہم مسئلہ ہے کہ جس سے قرآن نے مختلف آیات میں پردہ اٹھایا ہے کہ عام طور پر محرومین ہی پہلے وہ افراد ہوتے تھے کہ جو انبیاء کی دعوت پر لبیک کہتے تھے، اور مغرور ثروت مند متنعمین ہی وہ پہلا گروہ ہوتا تھا جو علمِ مخالفت بلند کرتا تھا۔

باوجودیکہ مسلّمہ طور پر دعوتِ انبیاء کے منکر اسی گروہ میں منحصر نہیں تھے لیکن عام طور پر عاملینِ فساد اور شرک و خرافات کی طرف دعوت دینے والے وہی ہوا کرتے تھے کہ جو ہمیشہ اس بات کی کوشش کیا کرتے تھے کہ زبردستی دوسروں کو بھی انہیں راستوں پر چلائیں۔

سورہ زخرف کی آیہ ۲۳، سورہ ہود کی آیہ ۱۱۶ اور سورہ مؤمنوں کی آیہ ۳۳ میں بھی یہی مطلب بیان ہوا ہے۔

---

[1] "لسان العرب" جلد ۹ ص ۱۷۔

نہ صرف انبیاء کے مقابلہ میں بلکہ ہر اصلاحی قدم جو کسی دانشمند، مصلح اور عالم مجاہد کی طرف سے اٹھے یہ گروہ مخالفت کے لیے سر اٹھاتا، اور مصلحین کے پروگراموں کو درہم برہم کرنے کے لیے سازشیں کرتا اور کسی بھی جرم کے ارتکاب سے باز نہیں رہتا۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت ان کی لچر اور پوچ منطق کی طرف ــ کہ جس سے ہر زمانہ میں اپنی برتری کو ثابت کرنے کے لیے متوسل ہوا کرتے تھے ــ اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ: "اور انہوں نے یہ کہا کہ ہم سب سے زیادہ ثروت مند اور سب سے زیادہ آل اولاد رکھتے ہیں" (و قالوا نحن اکثر اموالاً و اولاداً)۔

خدا ہم سے محبت رکھتا ہے، لہٰذا اس نے ہمیں مال بھی فراواں دے رکھا ہے اور بہت سی افرادی قوت بھی، اور یہ بات ہمارے حق میں اس کے لطف و کرم کی اور اس کی بارگاہ میں ہمارے مقام اور حیثیت کی دلیل ہے "اور ہم (نور چشموں) کو ہرگز بھی عذاب نہیں ہوگا" (وما نحن بمعذّبین)۔

کیا خدا اپنے معززین اور پیاروں کو عذاب دے گا؟! اگر ہم اس کی بارگاہ سے دھتکارے ہوتے ہوتے، تو وہ یہ ساری نعمتیں ہمیں کیوں دیتا؟ خلاصہ یہ ہے کہ ہماری دنیا کا آباد ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری آخرت بھی آباد ہوگی۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ (وما نحن بمعذّبین) کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کلی طور پر قیامت اور عذاب کے ہی منکر تھے، لیکن بعد والی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ جملہ اس معنی میں نہیں ہے، بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ وہ اپنی ثروت و دولت کو مقرب بارگاہ خدا ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔

بعد والی آیت ان کی اس گھٹیا اور عوام کو فریب دینے والی منطق کا انتہائی اعلیٰ طریقہ سے جواب دیتی ہے اور ان کی سرکوبی کرتی ہے، روئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ: "ان سے کہہ دے کہ میرا پروردگار جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے اس میں تنگی کر دیتا ہے" (اور یہ سب کچھ ایسی مصلحتوں کے مطابق کرتا ہے کہ جنہیں مخلوق کی آزمائش اور انسانی زندگی کے نظم و نسق کے لیے ضروری سمجھتا ہے اور یہ چیز بارگاہ خداوندی میں قدر و منزلت اور مقام و حیثیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی) (قل ان ربی یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر)۔

اس بناء پر وسعت رزق کو سعادت کی اور تنگیٔ رزق کو شقاوت کی دلیل ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے:

"لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں" (و لکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

البتہ بے خبر اور ناواقف اکثریت ایسی ہے، ورنہ واقف اور آگاہ لوگوں کیلئے یہ مسئلہ واضح و آشکار ہے۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے ساتھ اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے : "ہرگز ایسا نہیں ہے، کہ تمہارا مال و اولاد تمہیں ہمارا مقرب بنا دے" (وما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفی) [1]

یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ جو عوام کے ایک گروہ کو دامن گیر ہو گئی ہے۔ کہ جو یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ لوگ جو دنیا میں مادی لحاظ سے محروم ہیں وہ بارگاہِ خدا میں مغضوب و مطرود ہیں اور وہ لوگ کہ جو نعمت کی فراخی میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ اس کے محبوب و مقبول ہیں۔

کتنے ہی ایسے محروم افراد ہوتے ہیں کہ جن کی اس (محرومیت) کے ذریعہ آزمائش ہوتی ہے اور بدترین مقامات تک پہنچتے ہیں اور کتنے ہی متنعم افراد ایسے ہیں کہ جن کا مال و دولت ان کے لیے بلائے جان بن جاتا ہے اور ان کی گناہ گاری یا حد سے بڑھ جانے کا مقدمہ بنتا ہے۔

کیا قرآن سورہ تغابن کی آیہ ۱۵ میں صراحت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ : (انما اموالکم واولادکم فتنة واللہ عندہ اجر عظیم) "تمہارے مال اور اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں اور اجرِ عظیم خدا کے پاس ہے"۔

اس بات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان زندگی کے لیے لازمی و ضروری سعی و کوشش سے ہی دستبردار ہو جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اقتصادی وسائل اور افرادی انسانی قدرت و طاقت ہرگز خدا کی بارگاہ میں انسانوں کی معنوی قدر و قیمت کا معیار نہیں ہوتا۔

اس کے بعد انسانوں کی قدر و قیمت کا اصلی معیار اور جو چیز خدا کی بارگاہ میں تقرب کا سبب بنتی ہے اُسے بیان کرتے ہوئے (ایک استثنائے منفصل کی صورت میں) کہتا ہے کہ : "مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے ان کے لیے ان کے اعمال کے مقابلہ میں کئی گنا اجر و ثواب ہے، اور وہ جنت کے بالاخانوں میں انتہائی امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کریں گے" (الا من اٰمن وعمل صالحاً فاولٰئک لھم جزاء الضعف بما عملوا وھم فی الغرفات اٰمنون) [2]

اس بنا پر تمام معیار ان ہی دونوں امور کی طرف لوٹتے ہیں، "ایمان" اور "عمل صالح"

---

[1] "زلفی" اور "زلفة" "مقام و منزلت" اور منزل گاہ کے معنی میں آیا ہے (مفردات راغب) اسی بنا پر رات کی منازل کو زلف اللیل کہتے ہیں "التی" کی تعبیر اس بنا پر ہے کیونکہ بہت سے موارد میں مفرد مؤنث کی ضمیر جمع مکسر کی طرف لوٹتی ہے اس بنا پر یہاں تقدیر کی ضرورت نہیں ہے۔

[2] جزاء الضعف کی تعبیر موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی قبیل سے ہے۔

خواہ کوئی بھی آدمی ہو، ہر زمانے میں اور ہر جگہ، وہ کسی بھی طبقہ سے ہو یا کسی گروہ سے ہو، بارگاہ خدا میں انسانوں کے درمیان تفاوت اور فرق ان کے ایمان کے درجات اور عمل صالح کے مراتب کے تفاوت اور فرق کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

یہاں تک کہ علم و دانش اور بزرگ افراد کی طرف نسبت، یہاں تک کہ پیغمبروں کے ساتھ (نسبت بھی) اگر ان دونوں معیاروں سے توام نہ ہو، تو صرف یہ اکیلی نسبت انسان کی قدر و قیمت میں ذرا سا بھی اضافہ نہیں کرتی۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں قرآن نے اپنی بے نظیر صراحت کے ذریعہ پروردگار کے قرب کے عوامل کے سلسلہ میں اور انسان کی وجودی قدر و قیمت کے بارے میں تمام بے معنی اور لغو خیالات پر قلم بطلان کھینچ دیا ہے اور اصل معیار کا دو چیزوں میں خلاصہ کر دیا ہے کہ جن کے حاصل کرنے پر تمام انسان قدرت رکھتے ہیں اور مادی امکانات و وسائل اور محرومیتیں اس میں مؤثر نہیں ہیں۔

ہاں! اگر مال و اولاد بھی یہی راستہ اختیار کر لیں تو وہ بھی اسی خدائی رنگ میں رنگے جائیں گے، اور ایمان اور عملِ صالح کا رنگ قبول کر لیں گے اور قربِ خدا کا سبب بن جائیں گے، لیکن وہ مال اور اولاد کہ جو انسان کو خدا سے دور کر دیں اور ایک بُت کی طرح پوجے جانے لگیں اور فساد برپا کرنے کا سبب بن جائیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں، اور قرآن کے کہنے کے مطابق انسان کی جان اور اس کی سعادت و نیک بختی کے لیے دشمن ہیں۔ (یا ایھا الذین اٰمنوا ان من ازواجکم و اولادکم عدوًا لکم فاحذروھم) "اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور کچھ اولاد تمہاری دشمن ہے ان سے ڈرتے رہو" (تغابن - ۱۴)

ضمنی طور پر۔ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔ "ضعف" صرف "دگنے" کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ "چند برابر" (کئی گنا) کے معنی میں بھی آیا ہے، اور زیر بحث آیت میں اسی معنی میں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر نیک کام کی پاداش اور اجر، خدا کے ہاں کم از کم دس گنا ہے؛ (من جاء بالحسنة فله عشر امثالها)۔ (انعام - ۱۶۰) اور کبھی اس سے بھی کئی گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

"غرفات" جمع ہے "غرفه" کی کہ جو اُن کمروں کے معنی میں ہے کہ جو اوپر والے طبقہ میں ہوں کہ جن میں روشنی بھی زیادہ آتی ہے اور ہوا بھی بہتر ہوتی ہے اور آفات سے بھی بچے ہوئے ہوتے ہیں اسی بنا پر یہ تعبیر جنت کے اعلیٰ منازل کے لیے استعمال ہوئی ہے۔

یہ لفظ اصل میں مادہ "غرف" (بروزن برف) کسی چیز کو اوپر لے جانے اور اٹھانے کے معنی میں ہے۔

"اٰمنون" (وہ لوگ جو امن و امان میں زندگی بسر کرتے ہیں) کی تعبیر اہل بہشت کے بارے

میں بہت ہی جامع تعبیر ہے، کہ جو ان کی روح اور جسم کے آرام و سکون کو ہر لحاظ سے ظاہر کرتی ہے' کیونکہ وہاں انہیں نہ تو فنا و زوال کا اور موت کا خوف ہوگا، اور نہ ہی دشمن کے حملہ کا خطرہ، نہ کوئی بیماری اور آفت اور غم و اندوہ، یہاں تک کہ انہیں خوف کا بھی کوئی خوف نہیں ہوگا، اور اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوگی کہ انسان ہر لحاظ سے امن و امان میں زندگی بسر کرے، جیسا کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بدامنی سے بدتر کوئی بلا اور مصیبت نہیں ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اور بعد والی آیت میں ان کے مدِ مقابل گروہ کی توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے: "باقی رہے وہ لوگ کہ جو ہماری آیات کے انکار و ابطال کے لیے سعی و کوشش کرتے ہیں، نہ تو وہ خود ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو حق کی راہ میں قدم رکھنے کی اجازت دیتے ہیں، اس حال میں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہماری قدرت کے چنگل سے نکل کر بھاگ جائیں گے' وہ تو قیامت کے دن دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے" (والذین یسعون فی اٰیاتنا معاجزین اولٰئک فی العذاب محضرون)۔

یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے مال و اولاد اور افرادی قوت سے استفادہ کرتے ہوئے انبیاء کی تکذیب کرتے ہیں، اور مخلوقِ خدا کو وسوسے میں ڈالنے میں مشغول رہتے ہیں' اور وہ اس قدر مغرور ہو گئے تھے کہ وہ یہ گمان کرنے لگ گئے تھے کہ وہ عذابِ الٰہی کے چنگل سے نکل کر بھاگ جائیں گے لیکن وہ سب کے سب خدا کے حکم سے جلانے والی آگ کے اندر جھونک دیئے جائیں گے۔

"اولٰئک فی العذاب محضرون" کے جملہ میں کیونکہ آئندہ زمانہ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہے، لہٰذا ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اب اس وقت بھی عذاب میں گرفتار ہیں۔ اس زندان سے بڑھ کر اور کونسا عذاب ہوگا کہ جو انہوں نے مال و اولاد کے ذریعہ اپنے لیے بنا لیا ہے۔ یہ احتمال بھی اس میں موجود ہے کہ اوپر والی تعبیر اس بنا پر ہو کہ خدا کا یہ وعدہ ایسا مسلم اور یقینی ہے کہ گویا وہ اسی وقت اسی میں قرار پا گئے ہیں جیسا کہ جملہ " فھم فی الغرفات اٰمنون" میں بیان ہوا ہے۔

"معاجزین" کی تعبیر۔ جیسا کہ بعض اربابِ لغت نے کہا ہے ۔ اس معنی میں ہے کہ وہ اس طرح خیال کرتے ہیں کہ وہ خدا کی قدرت اور اس کے عذاب سے نکل کر فرار کر سکتے ہیں، حالانکہ یہ خیال باطل اور بے بنیاد ہے [1]

---

[1] "لسان العرب" اور "مفرداتِ راغب" نے "معاجزین" کی (ظانین انھم یعجزون اللہ) "گمان کرتے ہیں کہ وہ خدا کو عاجز کر دیں گے" کے ساتھ تفسیر کی ہے' اور حقیقت میں یہ "یخادعون اللہ ورسولہ" کی تعبیر کے مشابہ ہے کہ جو سورہ بقرہ کی آیہ ۹ میں آئی ہے، کیونکہ باب مفاعلہ کبھی کبھی اس معنی میں آتا ہے۔

چند نکات

قدروں کا تعین

فرد اور جامعہ کی زندگی میں اہم مسئلہ پہچاننے کے معیار اور اس جامعہ کے تمدن پر حاکم اقدار کا نظام ہے۔

کیونکہ فرد اور معاشرے کی زندگی کی تمام تحریکیں قدروں کے اسی نظام سے پھوٹتی ہیں، اور پھر یہی تحریکیں نئی اقدار کو پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

اس مسئلہ میں کسی قسم کی غلطی اور خیالی و بے بنیاد اقدار کو بروئے کار لانا، اُن کی تاریخ کو تباہی کی طرف کھینچ لے جانے کے لیے کافی ہے، اور واقعی اقدار اور سچے معیاروں کا ادراک ان کے ایوانِ سعادت کی محکم ترین بنیاد بنتا ہے۔

مغرور دنیا پرست قدر و قیمت کو صرف مال و منال، مادی وسائل اور افرادی قوتوں تک محدود سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ بارگاہِ خدا میں شخصیت کا معیار بھی انہیں چیزوں میں تصور کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے اوپر والی آیات میں اس کا نمونہ دیکھا، اور اس کے بہت سے اور نمونے قرآن میں نظر آتے ہیں۔

۱۔ زر و زور پرست اور جبار فرعون اپنے مصاحبین سے کہتا ہے: "مجھے یقین نہیں آتا کہ موسیٰ خدا کی طرف سے ہو۔ اگر وہ سچ کہتا ہے تو پھر اُسے سونے کے کنگن کیوں نہ دیئے گئے؟! (فلولا القی علیه اسورة من ذهب)۔ (سورہ زخرف۔ آیہ ۵۳)

یہاں تک کہ وہ اس قسم کے زر و زیور نہ رکھنے کو موسیٰؑ کے مقام اور مرتبہ کی پستی کی دلیل شمار کرتا تھا اور کہتا تھا: "ام انا خیر من هٰذا الذی هو مهین"۔ (سورہ زخرف۔ آیہ ۵۲)

۲۔ پیغمبرؐ کے زمانے کے مشرک اس بات سے کہ قرآن ایک تہی دست شخص پر نازل ہوا ہے تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ: "لولا نزل هٰذا القراٰن علٰی رجل من القریتین عظیم"۔ (یہ قرآن سرزمینِ مکہ یا طائف کی کسی عظیم ثروت مند شخصیت پر کیوں نازل نہ ہوا)۔ (زخرف، آیۃ ۳۱)

۳۔ بنی اسرائیل نے اپنے زمانہ کے پیغمبر "اشموئیل" سے لشکر کی فرماندہی کے لیے "طالوت" کے انتخاب کے سلسلے میں اعتراض کرتے ہوئے کہا: "نحن احق بالملك منه ولم یؤت سعة من المال"۔ (ہم فرماندہی اور حکمرانی کے لیے اس سے زیادہ حقدار ہیں، کیونکہ ہم مشہور و معروف خاندان سے ہیں، علاوہ ازیں طالوت کے پاس کچھ مال و دولت نہیں ہے)۔ (سورہ بقرہ۔ ۲۴۷)

۴۔ قومِ نوح کے مشرک ثروت مندوں نے اُن پر اعتراض کیا: "ان پست اور رذیل افراد نے تیرے اطراف کو کیوں گھیر رکھا ہے" اور پستی سے ان کی مراد مال و ثروت کا نہ ہونا ہے (قالوا انؤمن

لک واتبعک الارذلون) "کیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں حالانکہ اراذل اور پست لوگوں نے تیری پیروی کی ہے (اور تجھ پر ایمان لاتے ہیں"۔ (سورۂ شعراء، آیہ ۱۱۱)

۵۔ یہی اعتراض مکہ کے ثروت مندوں نے پیغمبر اسلامؐ پر کیا تھا، کہ پا برہنہ (غریب) لوگوں نے تجھے کیوں گھیر رکھا ہے؟ ہم تو ان کے بدن کی بدبو سے بھی ناراحت اور پریشان ہو جاتے ہیں، اگر تو انہیں اپنے سے دور کر دے تو پھر ہم تیرے پاس آئیں گے۔ قرآن سورۂ کہف میں اُن پر سختی کے ساتھ حملہ کرتا ہے اور شدید ترین لب و لہجہ میں انہیں تہدید کرتا ہے اور پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ تجھے ایسے ہی لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے کہ جو اگرچہ تہی دست ہیں، لیکن ان کے دل عشقِ خدا سے پُر ہیں، اور وہ صبح و شام درگاہِ خدا کی طرف رُخ کرتے ہیں، اور اس کے سوا کسی کو نہیں چاہتے، اے پیغمبر! تم انہیں کے ساتھ رہو، اور ان سے منہ نہ پھیرو۔ "واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشى يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم"۔ (کہف۔ ۲۸)

ان ہی وجوہات کی بنا پر انبیاء کا پہلا اور اہم ترین اصلاحی قدم اسی جھوٹی عزت اور قدر و قیمت کی دیوار کو توڑنا تھا، انہوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ ان غلط معیاروں کو ختم کیا، اور اصل خدائی اقتدار کو ان کا جانشین بنایا، اور ایک علمی انقلاب کے ذریعہ شخصیت کے محور کو مال و اولاد، ثروت و جاہ اور کنبہ و قبیلہ کی شہرت سے تقویٰ و ایمان اور عمل صالح میں بدل دیا۔

اس کا نمونہ ہم نے زیرِ بحث آیات میں پڑھ لیا ہے، کہ اموال و اولاد پر خطِ بطلان کھینچنے کے بعد بارگاہِ الٰہی میں تقرب کے ایک وسیلہ کے عنوان سے اور (وما اموالكم ولا اولادكم بالتي تقربكم عندنا زلفى) کہہ کر بلا فاصلہ اصل قدر و قیمت کو (الا من آمن وعمل صالحاً) کے جملہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

آیہ شریفہ: (ان اكرمكم عند الله اتقاكم) کہ جو ایک اسلامی شعار اور نعرے کی شکل میں آئی ہے، کنبہ اور قبیلہ سے وابستہ قدروں کی نفی کے بعد اسی فکری و اقداری انقلاب کو بیان کر رہی ہے۔

اسی آیہ (سورہ حجرات۔ ۱۳) کے مطابق کوئی چیز بھی اُس تقویٰ اور ایمان کے سوا کہ جو احساسِ مسئولیت اور پاکیزگیٔ عمل کے ساتھ ہو۔ انسانوں کی شخصیت اور قدر و قیمت کا معیار اور خدا کی بارگاہ میں ان کے قرب کا ذریعہ نہیں ہے، اور جو شخص اس اصل معیار سے زیادہ سے زیادہ حصّہ رکھتا ہے وہی زیادہ مقرب اور زیادہ باعزت اور گرامی قدر ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ سرزمینِ عرب کے ماحول میں، اسلام اور قرآن کی حیات بخش تعلیمات کے ظہور سے پہلے، زر و زور کی قدر و قیمت کے نظام کی حاکمیت کی وجہ سے اس ماحول کا نتیجہ اور ماحصل ابوسفیان، ابوجہل اور ابولہب جیسے غارت گر اور منہ پھٹ لوگ تھے۔ لیکن اسی ماحول سے،

اقدار کے نظام میں انقلاب آجانے کے بعد سلمان، ابوذر، مقداد اور عمار یاسر جیسے افراد سامنے آئے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید سورہ زخرف میں ان آیات کے ذکر کرنے کے بعد کہ جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہتا ہے: "نہ صرف یہ کہ مادی شان وشوکت شخصیت کی دلیل نہیں ہے، بلکہ اگر ایسا کرنے سے کچھ مفاسد وجود میں نہ آتے، تو ہم کافروں کے لیے ایسے گھر قرار دے دیتے کہ جن کی چھتیں چاندی کی ہوتیں اور اس کی سیڑھیاں (گراں قیمت) ہوتیں کہ جن کے ذریعہ وہ اوپر والے طبقات کی طرف جاتے اور ان کے کمروں کے لیے (شان وشوکت والے) ایسے دروازے اور (خوب صورت) تخت قرار دیتے کہ جن پر تکیہ لگاتے، اور ہر قسم کے زیورات ہم ان کے اختیار میں دے دیتے، لیکن یہ سب کچھ دنیاوی زندگی کے مال ومتاع ہیں، اور آخرت کا گھر تیرے پروردگار کے پاس پرہیزگاروں کیلئے ہے" (ولولا ان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر بالرحمٰن لبیوتھم سقفًا من فضة ومعارج علیھا یظھرون ٭ ولبیوتھم ابوابًا وسررًا علیھا یتکئون ٭ وزخرفًا وان کل ذالک لما متاع الحیاة الدنیا والاٰخرة عند ربك للمتقین ٭)

(زخرف، آیات ۳۳-۳۴-۳۵)

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ جھوٹی قدریں انسان کی واقعی اور حقیقی اقدار کی جگہ نہ لے لیں۔

(۳۹) قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَ یَقۡدِرُ لَهٗ ؕ وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَهُوَ یُخۡلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ ○

(۴۰) وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُهُمۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ یَقُوۡلُ لِلۡمَلٰٓئِکَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاکُمۡ کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ○

(۴۱) قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ اَنۡتَ وَلِیُّنَا مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ۚ بَلۡ کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ ۚ اَکۡثَرُهُمۡ بِهِمۡ مُّؤۡمِنُوۡنَ ○

(۴۲) فَالۡیَوۡمَ لَا یَمۡلِکُ بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ نَّفۡعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ وَ نَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ بِهَا تُکَذِّبُوۡنَ ○

ترجمہ

(۳۹) کہہ دے: میرا پروردگار جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ (اور محدود) کر دیتا ہے اور جو چیز تم (اس کی راہ میں) خرچ کروگے وہ اس کی جگہ اور دے دے گا، اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے۔

(۴۰) اور اُس دن کو یاد کر کہ جب خدا ان سب کو محشور کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا، کیا یہ تمہاری عبادت کرتے تھے؟

(۴۱) وہ کہیں گے: تُو (ان ناروا نسبتوں سے) منزہ اور پاک ہے، تُو ہی ہمارا ولی ہے، نہ کہ وہ (وہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے) بلکہ وہ تو جن کی پرستش کیا کرتے تھے! اور اُن میں سے اکثر ان پر ایمان رکھتے تھے۔

(۴۲) آج کے دن تم میں سے کوئی بھی کسی دوسرے کے لیے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے اور ہم ظالموں سے کہیں گے کہ تم اس آگ کا عذاب چکھو کہ جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے۔

تفسیر

معبودوں کی عبادت کرنے والوں سے بیزاری

ان آیات میں دوبارہ ان لوگوں کی گفتگو کی طرف رُخ کرتا ہے کہ جو اپنے اموال اور اولاد کو بارگاہِ خدا میں اپنے قرب کی دلیل سمجھتے تھے اور تاکید کے طور پر کہتا ہے: "کہہ دے کہ میرا پروردگار اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے روزی کو کشادہ یا محدود کر دیتا ہے" (قل ان ربی یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ و یقدر لہ)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، "تم راہِ خدا میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے خدا اس کی جگہ اور دے دے گا، اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے" (وما انفقتم من شیء فھو یخلفہ وھو خیر الرازقین)۔

اگرچہ اس آیت کا مضمون گزشتہ مطلب کی تاکید ہے، لیکن دو جہات سے نئی چیز بھی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ گزشتہ آیت، جس کا مفہوم یہی تھا، زیادہ تر کفار کے اموال و اولاد کے بارے میں تھی، جبکہ "عباد" (بندے) کی تعبیر زیرِ بحث آیت میں اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ مومنین کے بارے میں ہے، یعنی مومنین کے لیے بھی کبھی روزی کو فراخ اور کشادہ کرتا ہے ــــ جہاں مومن کے لیے مصلحت ہو ــــ اور کبھی ان کی روزی کو تنگ اور محدود کر دیتا ہے ــ جہاں اس کی مصلحت معلوم ہو، بہرحال معیشت کی وسعت و تنگی کسی چیز کی دلیل نہیں بن سکتی۔

دوسری بات یہ کہ گزشتہ آیت تو معیشت کی وسعت و تنگی کو دو مختلف گروہوں کے بارے میں بیان کر رہی تھی، جبکہ زیرِ بحث آیت میں ممکن ہے کہ یہ ایک ہی انسان کی دو مختلف حالتوں کی طرف

اشارہ ہو، کہ جس کی روزی کبھی کشادہ اور فراخ اور کبھی تنگ اور محدود ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ جو کچھ اس آیت کی ابتدا میں بیان کیا گیا ہے وہ حقیقت میں اس چیز کیلئے ایک مقدمہ اور تمہید ہے کہ جو آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے اور وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تشویق (شوق دلانا) ہے۔

«فھو یخلفہ» (وہ اس کی جگہ کو پُر کر دیتا ہے) کا جملہ، ایک جالب اور عمدہ تعبیر ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو کچھ راہ خدا میں خرچ کیا جاتا ہے وہ حقیقت میں ایک نفع بخش تجارت ہے، کیونکہ خدا نے اس کا بدلہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی کریم شخص کسی چیز کا بدلہ دینے کا وعدہ کرلے تو وہ صرف اس کے مساوی اور برابر ہی بدلہ نہیں دیتا بلکہ وہ اس سے کئی گنا اور کبھی سوگنا بدلہ دیتا ہے۔

یقیناً خدا کا یہ وعدہ آخری اور دوسرے جہان کے لیے ہی نہیں ہے، ویسے وہ اپنی جگہ پر مسلّم ہے لیکن وہ دنیا میں بھی راہِ خدا میں خرچ کرنے کی جگہ کو انواع و اقسام کی برکات سے احسن طریقہ سے پُر کرتا ہے۔

(ھو خیر الرازقین) "وہ بہترین روزی دینے والا ہے" کا جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور مختلف جہات سے قابلِ غور ہے۔

وہ تمام روزی دینے والوں سے بہتر ہے، اس بنا پر کہ وہ یہ جانتا ہے کہ کونسی چیز بخشے، اور کتنی مقدار میں روزی دے کہ جو فساد و تباہی کا سبب نہ بنے، کیونکہ وہ ہر چیز کا عالم ہے۔

وہ جو کچھ چاہے عطا کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وہ جو کچھ عطا فرماتا ہے اس کے بدلے میں کوئی اجر اور جزا نہیں چاہتا، کیونکہ وہ غنی بالذات ہے۔

وہ درخواست کرنے اور مانگنے کے بغیر بھی دیتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز سے باخبر اور حکیم ہے۔

بلکہ حقیقت میں اس کے علاوہ کوئی بھی "روزی دینے والا" نہیں ہے، کیونکہ جو شخص بھی جو کچھ بھی رکھتا ہے، وہ اسی کی طرف سے ہے، اور جو شخص بھی کسی کو کوئی چیز دیتا ہے وہ "انتقال روزی کا واسطہ" ہے نہ کہ روزی دینے والا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ "فانی" اموال کے مقابلہ میں "باقی رہنے والی" نعمتیں عطا فرماتا ہے، اور "قلیل" کے مقابلہ میں "کثیر" بخشتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اور چونکہ یہ ظالم اور سرکش دولت مندوں کا گروہ مشرکین کے زمرہ میں داخل تھا اور وہ یہ دعویٰ

کرتے تھے کہ ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور وہ قیامت میں ہماری شفاعت کریں گے، قرآن اس بے بنیاد دعوے کے مقابلے میں جواب دیتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "یاد کر اس دن کو جس میں خدا سب کو۔ عبادت کرنے والوں کو بھی اور جن کی عبادت کی جاتی ہے اُن کو بھی ۔ محشور کرے گا، اس کے بعد فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہے گا، کیا یہ تمہاری عبادت کیا کرتے تھے"؟! (ویوم یحشرھم جمیعاً ثم یقول للملائکة اھؤلاء ایاکم کانوا یعبدون)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ سوال کوئی ایسا سوال نہیں ہے کہ جو کسی مجہول چیز کو خدا کی ذات پاک کے لیے واضح کرے، کیونکہ وہ تو ہر چیز کا علم رکھتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ فرشتوں کے بیان کے ذریعہ حقائق بتائے جائیں، تاکہ عبادت کرنے والوں کا یہ گروہ نادم اور شرمندہ ہو اور جان لے کہ وہ ان کے عمل سے پورے طور پر بیزار ہیں، اور وہ ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں۔

اُن تمام معبودوں کے درمیان سے کہ جن کی مشرکین عبادت کیا کرتے تھے، صرف فرشتوں کا ذکر یا تو اس بناء پر ہے کہ جن جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اُن میں سے فرشتے شریف ترین مخلوق تھے، جہاں قیامت میں ان سے شفاعت حاصل نہ ہو تو پھر چند پتھروں اور لکڑیوں، جن اور شیاطین سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔

یا اس لحاظ سے ہے کہ بُت پرست پتھر اور لکڑیوں کو موجوداتِ علوی (فرشتوں اور ارواحِ انبیاء) کا مظہر اور سمبل سمجھتے تھے، اور اس طرح ان کی پرستش کرتے تھے، اور جیسا کہ قوم عرب کے درمیان بُت پرستی کی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے کہ "عمرو بن لحی[1] جس سفر میں شام گیا تھا تو اس نے وہاں ایک گروہ کو بُت پرستی کرتے دیکھا، اُس نے اُن سے اس سلسلہ میں سوال کیا، تو انہوں نے کہا کہ یہ وہ خدا ہیں کہ جنہیں ہم نے موجوداتِ علوی کی شکل میں بنایا ہے، ان سے ہم مدد طلب کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے بارش کی دعا کرتے ہیں، عمرو بن لحی نے ان کے اس عمل کو پسند کیا، اور ان کی پیروی اختیار کی، اور اپنے ساتھ ایک بُت سوغات کے طور پر حجاز کے لیے لایا، اور اسی وقت سے یہاں بت پرستی کی ابتداء ہوئی اور پھیلتی چلی گئی، یہاں تک کہ اسلام کا ظہور ہوا، اور اس کی بیخ کنی کی[2]

اب ہم دیکھتے ہیں کہ فرشتے، پروردگار کے سوال کے جواب میں کیا کہتے ہیں؟ وہ جامع ترین اور نہایت مؤدبانہ جواب کا انتخاب کرتے ہوئے، عرض کرتے ہیں: "اے پروردگار، تو ان ناروا نسبتوں

---

[1] عمرو بن لحی مکہ کی جانی پہچانی شخصیت تھی (لحی لام کی پیش اور حاء کی زبر اور یا کی تشدید کے ساتھ)۔

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۲ ص ۱۴۰ (زیر بحث آیت کے ذیل میں) سیرت ابن ہشام میں یہی مفہوم مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے، اور وہاں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے ساتھ شام سے "ہبل" بت لایا تھا۔ (سیرة ابن ہشام جلد ۱ ص ۷۹)

سے، کہ جو تیری مقدس ذات کی طرف انہوں نے دی ہیں پاک اور منزہ ہے" (قالوا سبحانک)۔
ہمارا اس گروہ سے کسی طرح کا بھی ربط و تعلق نہ تھا، "صرف تو ہی ہمارا ولی ہے نہ کہ وہ "
(انت ولینا من دونھم)۔

"وہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ تو جنوں کی عبادت کرتے تھے اور اُن میں سے اکثر جنات پر ایمان رکھتے تھے" (بل کانوا یعبدون الجن اکثرھم بھم مؤمنون)۔

اس بارے میں کہ فرشتوں کے جواب کا مفہوم کیا ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اور ہر ایک نے ایک الگ تفسیر کی ہے، لیکن جو زیادہ نزدیک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ "جن" سے مراد شیطان اور تمام ایسی خبیث موجودات ہیں کہ جو بُت پرستوں کو اس عمل کا شوق دلاتے تھے اور اُسے ان کی نظروں میں زینت دیتے تھے، اس بنا پر جن کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے فرمان کی اطاعت و پیروی اور ان کے وسوسوں کو قبول کرتے تھے۔

فرشتے اس کام پر راضی نہ ہونے کے اعلان اور بیزاری و نفرت کے اظہار کے ضمن میں کہتے ہیں کہ فساد کے اصل عامل شیاطین تھے، اگرچہ ظاہراً وہ ہماری عبادت کرتے تھے، لہٰذا اس کام کے واقعی چہرے کو کھول کر دکھانا چاہیئے۔

اور اس طریقہ سے وہ اُن عبادت کرنے والوں کو مکمل طور پر اپنے سے دور کرتے ہوئے نا امید کر دیں گے۔

اس معنی کی مثال ہمیں سورۂ یونس میں بھی ملتی ہے، جہاں یہ ارشاد ہوتا ہے: (و یوم نحشرھم جمیعا ثم نقول للذین اشرکوا مکانکم انتم و شرکاؤکم فزیلنا بینھم و قال شرکاؤھم ما کنتم ایانا تعبدون) "اس دن کو یاد کرو کہ جس میں ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ پر ٹھہرو، (تاکہ تمہارا حساب لیا جائے) پھر ہم انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیں گے اور ان کے معبود اُن سے کہیں گے کہ تم ہرگز ہماری عبادت نہیں کرتے تھے" (یونس - ۲۸)

یعنی حقیقت میں تم اپنی ہوا و ہوس اور اوہام و خیالات کی پرستش کرتے تھے نہ کہ ہماری، اس سے قطع نظر تمہاری یہ عبادت ہمارے حکم اور فرمان سے نہیں تھی اور نہ ہی ہماری رضامندی سے تھی اور جو عبادت اس طرح سے کی جائے وہ درحقیقت عبادت ہی نہیں ہے۔

اس طرح سے مشرکین کی امید اس دن مکمل نا امیدی میں بدل جائے گی اور یہ حقیقت ان کے لیے واضح طور پر روشن ہو جائے گی کہ ان کے معبود ان کے کام کی چھوٹی سے چھوٹی گرہ بھی نہ کھول سکیں گے، بلکہ وہ ان سے متنفر و بیزار ہوں گے۔

اس لئے بعد والی آیت میں ایک معنی خیز نتیجہ نکالتے ہوئے کہتا ہے : "آج کے دن تم میں سے کوئی بھی دوسرے کے لیے سود و زیاں اور نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے" (فالیوم لا یملک بعضکم لبعض نفعًا ولا ضرًا)۔

اس بنا پر نہ تو فرشتے ہی کہ جو ظاہراً ان کے معبود تھے ان کی کوئی شفاعت کر سکیں گے اور نہ ہی وہ خود آپس میں ایک دوسرے کی کوئی مدد انجام دے سکیں گے۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ہم ان ظالموں سے کہیں گے : "تم اس آگ کے عذاب کا مزہ چکھو کہ جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے" (ونقول للذین ظلموا ذوقوا عذاب النار التی کنتم بھا تکذبون)۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ جہاں قرآن مشرکین کے بارے میں ظالم اور ستمگر کی تعبیر کرتا ہے بلکہ قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں "کفر" کو "ظلم" سے اور "کفار و مشرکین" کی ظالمین سے تعبیر ہوئی ہے کیونکہ وہ ہر چیز سے پہلے خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں کہ پروردگار کی عبودیت کا پُر افتخار تاج اپنے سر سے اتار کر بتوں کی ذلیل کرنے والی بندگی کا طوق اپنی گردن میں ڈالتے ہیں، اور اپنی ساری حیثیت شخصیت اور قسمت کو برباد کر لیتے ہیں۔

حقیقت میں وہ قیامت کے دن اپنے شرک کی سزا بھی دیکھیں گے اور معاد و قیامت کے انکار کا عذاب بھی، اور (ونقول للذین ظلموا ذوقوا عذاب النار التی کنتم بھا تکذبون) کے جملہ میں دونوں معانی جمع ہیں۔

چند نکات

۱۔ انفاق زیادتی کا باعث ہے نہ کہ کمی کا

جو تعبیر اوپر والی آیت میں انفاق کے بارے میں بیان کی گئی ہے : "کہ جو چیز بھی تم راہِ خدا میں خرچ کرو گے خدا اس کے بدلے میں اور دے دے گا" بہت معنی خیز تعبیر ہے۔

اوّل اس لحاظ سے کہ لفظ "شیء" اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے، انفاق کی تمام اقسام کے لیے۔ خواہ وہ مادی ہوں یا معنوی، چھوٹی ہوں یا بڑی ۔۔ ہر ضرورت مند انسان کے لیے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو شامل ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان کے پاس جو بھی سرمایہ موجود ہے اُس میں سے خدا کی راہ میں بخشے چاہے وہ جس کیفیت میں ہو اور جس مقدار میں ہو۔

دوسرے انفاق کو فنا کے مفہوم سے باہر نکالتا ہے اور اسے بقاء کا رنگ دیتا ہے کیونکہ خدا نے اپنی مادی و معنوی نعمتوں کے ساتھ ۔۔ کہ جو کئی گنا اور کبھی ہزاروں گنا اور کم از کم دس گنا ہیں ۔۔ اس کی جگہ کو پُر کرنے کی ضمانت لی ہے، اور اس طرح سے انفاق کرنے والا شخص جس وقت اس جذبہ اور عقیدہ

کے ساتھ میدان میں آتا ہے تو ہاتھ اور دل زیادہ کھلا رکھے گا، وہ کمی کے احساس اور فقر کی فکر کو ہرگز اپنے دماغ میں جگہ نہ دے گا بلکہ وہ خدا کا شکر ادا کرے گا کہ جس نے اُسے اس قسم کی پُر نفع تجارت کی توفیق عطا فرمائی۔

یہ وہی تعبیر ہے کہ جو قرآن مجید میں سورۂ صف کی آیہ ۱۰ و ۱۱ میں بیان کی ہے کہ: (یا ایھا الذین اٰمنوا ھل ادلکم علٰی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم - تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون)

"اے وہ لوگو! کہ جو ایمان لاتے ہو، کیا میں تمہیں ایک ایسی پُر نفع تجارت کی طرف کہ جو دردناک عذاب سے رہائی بخشے رہنمائی کروں؟ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور راہ خدا میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو"

ایک روایت میں پیغمبرِ گرامیِ اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

- ینادی مناد کل لیلۃ لدوا للموت!
- وینادی مناد ابنوا للخراب!
- وینادی مناد اللھم ھب للمنفق خلفا!
- وینادی مناد اللھم ھب للممسک تلفا!
- وینادی مناد لیت الناس لم یخلقوا!
- وینادی مناد لیتھم اذ خلقوا فکروا فیما لہ خلقوا!

- ہر رات ایک آسمانی ندا کرنے والا یہ ندا کرتا ہے کہ مرنے کے لیے جیو۔
- اور دوسرا منادی یہ ندا کرتا ہے کہ ویرانی کے لیے بنا کرو۔
- اور ایک منادی یہ ندا کرتا ہے کہ خداوندا! جو انفاق کرتے ہیں ان کے لیے عوض قرار دے۔
- ایک اور منادی یہ ندا کرتا ہے کہ خداوندا! جو امساک کرتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے ان کے لیے تلف قرار دے۔
- اور ایک منادی یہ ندا کرتا ہے کہ کاش انسان پیدا ہی نہ ہوتے۔
- ایک اور ندا کرنے والا یہ ندا کرتا ہے کہ اے کاش اب جبکہ وہ پیدا ہو ہی گئے ہیں تو وہ اس امر میں غور و فکر کرتے کہ وہ کس لیے پیدا ہوئے ہیں [1]

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

(ان ندا کرنے والوں سے مراد وہ فرشتے ہیں کہ جو فرمانِ خدا سے اس عالم کے امور کی تدبیر کرتے ہیں)۔

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ:

"من ایقن بالخلف سخت نفسه بالنفقه"

جسے اس بات کا یقین ہو کہ اُسے بدلہ ضرور ملے گا تو وہ خرچ کرنے میں زیادہ سخی ہو گا۔[1]

یہی مفہوم امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔

لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ انفاق حلال اور مشروع اموال میں سے ہو، کیونکہ خدا اس کے سوا دوسرے کو قبول نہیں کرتا اور برکت نہیں دیتا۔

اس لیے ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہوا ہے کہ ایک شخص نے آپؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ قرآن میں دو آیات ایسی ہیں کہ میں جتنا ان پر عمل کرتا ہوں، اس کا نتیجہ نہیں دیکھتا، (اور اس کے مطلب کو حاصل نہیں کرتا)۔

امامؑ نے فرمایا وہ کونسی آیات ہیں؟

اس نے عرض کیا، پہلی تو خداوند بزرگ کی یہ بات ہے کہ اس نے یہ فرمایا ہے کہ: (ادعونی استجب لکم) "مجھے پکارو میں تمہاری دعا کو قبول کرتا ہوں" میں خدا کو پکارتا ہوں لیکن میری دعا قبول نہیں ہوتی۔

آپؑ نے فرمایا: کیا تیرا خیال یہ ہے کہ خدائے عزوجل نے اپنے وعدہ سے خلاف کیا؟

اس نے عرض کیا کہ: نہیں!

آپؑ نے فرمایا: پس اس کا سبب کیا ہے؟

اس نے عرض کیا کہ: مجھے معلوم نہیں ہے!

آپؑ نے فرمایا: لیکن میں تجھے بتاتا ہوں:

"من اطاع الله عزوجل فیما امره من دعائه من جهة الدعاء اجابه"

"جو شخص خداوند متعال کی اس چیز میں دعا کرے جس میں اس نے دعا کا حکم دیا ہے، اور اس میں جہت دعا کی رعایت کرے تو وہ اس کی دعا کو قبول کرے گا"

اس نے عرض کیا کہ: جہتِ دعا کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: کہ پہلے تو خدا کی حمد کرے گا اور اس

---

[1] نورالثقلین، جلد ۴ ص ۳۴۰۔

کی نعمتوں کو یاد کرے گا، اس کے بعد شکر ادا کرے گا، اس کے بعد پیغمبرؐ پر درود بھیجے گا، پھر اپنے گناہوں کو دل میں لائے گا اور ان کا اقرار کرے گا، پھر اُن سے خدا کی پناہ مانگے گا اور توبہ کرے گا۔ یہ ہے جہتِ دعا۔

پھر آپؑ نے فرمایا: دوسری آیت کونسی ہے؟

اس نے عرض کیا: وہ یہ آیت ہے کہ اس نے فرمایا ہے:

"وما انفقتم من شیء فھو یخلفہ وھو خیر الرازقین"

لیکن مَیں خدا کی راہ میں انفاق کرتا ہوں، مگر وہ چیز جو اس کے بدلے میں دی جاتی ہے وہ مجھے نہیں ملتی۔

امامؑ نے فرمایا: کیا تُو یہ خیال کرتا ہے کہ خدا نے اپنے وعدے کے خلاف کیا؟

اس نے عرض کیا کہ: نہیں!

آپؑ نے فرمایا: کہ پھر ایسا کیوں ہے؟

اس نے عرض کیا کہ: مَیں نہیں جانتا!

آپؑ نے فرمایا: "لو ان احدکم اکتسب المال من حلہ، وانفقہ فی حلہ، لم ینفق درھمًا الا اخلف علیہ"

اگر تم میں سے کوئی شخص کچھ حلال مال حاصل کرے، اور اُسے حلال طریقے سے ہی خرچ کرے، تو وہ کوئی ایک درہم بھی ایسا خرچ نہیں کرتا مگر یہ کہ خدا اس کا عوض اُسے دیتا ہے[1]

۲- اموال کا خدائی بیمہ

ایک مفسر نے یہاں ایک عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

تعجب کی بات یہ ہے کہ جب تاجر یہ جانتا ہو، کہ اس کے اموال میں سے کوئی مال تلف ہونے والا ہے، تو وہ اس بات پر بھی تیار ہو جاتا ہے کہ اُسے ادھار کے طور پر فروخت کر دے، چاہے لینے والا کوئی فقیر آدمی ہی ہو۔ وہ کہتا ہے: یہ بات اس سے بہتر ہے کہ اس مال کو یونہی چھوڑ دوں اور وہ نابود ہو جائے۔ اور اگر کوئی تاجر اِن حالات میں اپنے مال کو فروخت کرنے کا اقدام نہ کرے یہاں تک کہ وہ تلف اور نابود ہو جائے، تو اسے "خطا کار"

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۳ ص ۳۵۲۔

شمار کرتے ہیں ۔

اور اگر ان حالات میں کوئی سرمایہ دار خریدار مل جائے اور وہ اس کے پاس فروخت نہ کرے تو اُسے بے عقل کہتے ہیں ۔

اور اگر ان تمام باتوں کے ساتھ وہ خریدار مضبوط مالی حیثیت رکھتے ہوئے ہر قسم کا وثیقہ اسے سپرد کر دے، اور ایک قابلِ اطمینان سَند بھی اُسے لکھ دے، اور وہ تاجر اس کے پاس نہ بیچے تو اس کو دیوانہ کہتے ہیں ۔

لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ ہم سب یہی کام انجام دیتے ہیں اور کوئی اسے جنون شمار نہیں کرتا ۔

کیونکہ ہمارے تمام اموال معرضِ تلف میں ہیں اور خواہ مخواہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے حالانکہ راہِ خدا میں خرچ کرنا ایک قسم کا خدا کو قرض دینا ہے اور ایک بہت ہی معتبر ضامن، یعنی خدائے بزرگ فرماتا ہے کہ: (وما انفقتم من شیء فھو یخلفہ) "اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے وہ اس کا عوض دے گا" اور یہ اس حالت میں ہے جبکہ اُس نے اپنے اموال ہمارے پاس گروی رکھے ہوئے ہوں، کیونکہ جو کچھ انسان کے ہاتھ میں ہے وہ اس کی طرف سے عاریۃً ہے (اور کتبِ آسمانی میں سے ایک محکم ترین سند اس سلسلے میں اس نے ہمارے حوالہ کی ہوئی ہے) لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہم میں سے بہت سے اپنے اموال راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے، اور انہیں رہنے دیتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں، جس کے لیے نہ ہم کوئی اجر رکھتے ہیں نہ کوئی شکریہ[1]

۲- "انفاق" کے مفہوم کی وسعت

اس بات کو جاننے کے لیے کہ "انفاق" کا مفہوم اسلام میں کس قدر وسیع ہے، ہمارے لیے حدیث ذیل کو موردِ توجہ قرار دینا کافی ہے ۔

پیغمبر گرامیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"کل معروف صدقۃ، وما انفق الرجل علیٰ نفسہ واھلہ کتب لہ صدقۃ، وما وقی بہ الرجل عرضہ فھو صدقۃ، وما انفق الرجل من نفقۃ فعلی اللہ خلفھا، الا ما کان من نفقۃ فی بنیان او معصیۃ"

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵ ص ۲۶۳، زیر بحث آیات کے ذیل میں ۔

• ہر نیک کام جو کسی بھی شکل میں ہو صدقہ ہے، اور راہ خدا میں انفاق شمار ہوتا ہے۔ (اور یہ بات مالی انفاق تک ہی منحصر نہیں ہے)۔

• اور جو کچھ انسان اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضروریات زندگی میں صرف کرتا ہے وہ صدقہ لکھا جاتا ہے؛

• اور جس کے ساتھ انسان اپنی آبرو کو محفوظ رکھتا ہے وہ صدقہ شمار ہوتا ہے؛

• اور جو کچھ انسان راہ خدا میں انفاق کرتا ہے خدا اس کا عوض اسے دے گا سوائے اس کے کہ جو بناء میں صرف ہو (مثلاً گھر بنانے میں) یا معصیت کی راہ میں ہو۔[1]

ممکن ہے کہ گھر کا استثناء اس لحاظ سے ہو کہ اس کی اصل باقی ہے علاوہ ازیں لوگوں کی زیادہ تر توجہ اس کی طرف ہوتی ہے۔

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۹ ص ۵۲۸۹، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

(۴۳) وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

(۴۴) وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ○

(۴۵) وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ○

ترجمہ

(۴۳) جس وقت ہماری واضح آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ : یہ فقط ایک ایسا آدمی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں اس سے کہ جن کی تمہارے آباؤ اجداد پرستش کیا کرتے تھے روکے ، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ : یہ ایک بہت بڑے جھوٹ کے سوا کہ جو خدا پر باندھا گیا ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اور کافروں کے پاس جب حق پہنچا تو انہوں نے کہا کہ : یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے۔

(۴۴) ہم نے (اس سے پہلے) کتب آسمانی میں سے کوئی چیز انہیں نہیں دی کہ جسے وہ پڑھیں (اور اس کا سہارا لے کر تیری تکذیب کریں) اور تجھ سے پہلے ہم نے

کوئی (بھی) پیغمبر اِن کے لیے نہیں بھیجا۔

(۴۵) وہ لوگ کہ جو اُن سے پہلے تھے (انہوں نے بھی آیاتِ خدا کی) تکذیب کی تھی، حالانکہ یہ (اُن کی قدرت و طاقت کے) دسویں حصّہ کو بھی نہیں پہنچے (ہاں)! انہوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی، اب دیکھو! کہ میرا عذاب (ان کے لیے) کیسا تھا۔

تفسیر

کس دلیل کے ساتھ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں

گزشتہ آیات میں مشرکین اور بے ایمان افراد کی وضع و کیفیت کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں دوبارہ اس دُنیا میں ان کی وضع و کیفیت کو بیان کرتے ہوئے قرآن سننے کے مقابلہ میں ان کے ردِّ عمل کو بیان کیا جا رہا ہے، تاکہ یہ بات واضح و روشن ہو جائے کہ قیامت میں ان کا وہ بُرا انجام دنیا میں آیاتِ الٰہی کے مقابلہ میں اس غلط تنقید اور طرزِ عمل کے باعث ہوگا۔

پہلے کہتا ہے: "جس وقت ہماری واضح کرنے والی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ مرد تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہیں اُس سے کہ جس کی تمہارے بڑے عبادت کرتے تھے باز رکھے"۔ (واذا تتلیٰ علیھم اٰیاتنا بیّنات قالوا ما ھٰذا الا رجل یرید ان یصدکم عما کان یعبد اٰباؤکم)۔

ان "آیاتِ بیّنات" کے مقابلہ میں ان کا یہ پہلا ردِّ عمل تھا، کہ جو وہ اس متعصب قوم میں تعصب کے احساس کو تحریک کرنے کے لیے پیش کرتے تھے۔

خصوصاً "اٰباؤکم" (تمہارے آباؤ اجداد) کی تعبیر "اٰبائنا" (ہمارے آباؤ اجداد) کے بجائے زیادہ تر اسی بنا پر ہے تاکہ اس متعصب قوم کو سمجھائیں کہ تمہارے بزرگوں کی میراث خطرے میں ہے، لہٰذا تم کھڑے ہو جاؤ اور اس شخص کو اس کام سے روکو۔

"ما ھٰذا الا رجل" کی تعبیر دو لحاظ سے پیغمبر کی تحقیر و توہین ہے، ایک لفظ "ھذا" (یہ) اور دوسرا "رجل" (مرد) نکرہ کی صورت میں، درآنحالیکہ وہ سب کے سب پیغمبر کو اچھی طرح سے اس کے سابقہ واضح و روشن کارناموں کی وجہ سے پہچانتے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن "آیات" کی "بیّنات" کے ساتھ توصیف کرتا ہے یعنی اس کی حقانیت کی دلیلیں اس کے ساتھ ہیں اور جب بات عیاں ہو تو بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس کے بعد ان کی اُس دوسری گفتگو کو جو وہ پیغمبر کی دعوت کو باطل کرنے کے لیے پیش کرتے تھے بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) ایک بڑے جھوٹ کے سوا کہ جو خدا پر باندھا گیا ہے اور کچھ نہیں ہے" (وقالوا ماھٰذا الّا افك مفترى)۔

"افك" (بروزن فکر) جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، کہ یہ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی اصلی صورت سے بدلی ہوئی ہو، اسی لیے مخالف ہُواؤں کو "مؤتفکات" کہتے ہیں، اس کے بعد جھوٹ، تہمت اور ہر قسم کی غلط بات کو "افک" کہا گیا، لیکن بعض کے قول کے مطابق "افک" بہت بڑے جھوٹ کے لیے بولا جاتا ہے۔

باوجود اس کے کہ پیغمبرؐ کو جھوٹ کے متہم کرنے کے لیے "افك" کی تعبیر کافی تھی، لیکن وہ لفظ "مفترى" کے ذریعہ اس میں مزید تاکید پیدا کرتے تھے، جبکہ ان کے پاس اپنے اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں تھی۔

آخر میں تیسرا اتہام جو انہوں نے پیغمبرؐ پر باندھا "سحر" (جادو) کی تہمت تھی، جیسا کہ زیر بحث آیت کے آخر میں بیان ہوا ہے: "وہ لوگ کہ جو کافر ہوگئے جس وقت حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ چیز سوائے واضح جادو کے اور کچھ نہیں" (وقال الذین کفروا للحق لما جاءھم ان ھٰذا الّا سحر مبین)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ گمراہ گروہ اپنی تینوں تہمتوں کو صریح ترین تاکید کے ساتھ اسی حصر کے ذریعہ بیان کرتے تھے، ایک جگہ کہتے تھے یہ فقط سحر ہے دوسری جگہ کہتے تھے، یہ فقط جھوٹ ہے اور آخر میں تیسری جگہ کہتے تھے کہ: وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے بزرگوں کے معبودوں سے روک دے۔

یقیناً یہ تینوں ناروا نسبتیں آپس میں متضاد نہیں ہیں — اگرچہ وہ ضد و نقیض گفتگو سے انکار نہیں رکھتے تھے — اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق ہم ان تہمتوں میں سے ہر ایک کو کافروں کے ایک گروہ سے نسبت دیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے پہلے اور دوسرے مرحلہ میں لفظ "قالوا" کا استعمال کیا ہے لیکن تیسرے مرحلے میں اس کے بجائے (قال الذین کفروا) کا جملہ استعمال کیا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ بدبختیاں کفر، حق کے انکار اور حقیقت کے ساتھ دشمنی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ورنہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان کسی دلیل کے بغیر ان تمام تہمتوں کو یکے بعد دیگرے ایسے مرد کی طرف منسوب کرے

جس کی حقانیت کے دلائل اس کی گفتگو، اس کے عمل اور اس کے سابقہ کارناموں سے واضح ہیں۔

گویا وہ ان تینوں تہمتوں کے ساتھ پیغمبرؐ کے ساتھ مبارزہ کرنے میں ایک سوچے سمجھے پروگرام کو روبہ عمل لاتے تھے، ایک طرف وہ یہ دیکھتے تھے کہ یہ ایک نیا دین و آئین ہے، اور اس میں جذب و کشش موجود ہے۔

دوسری طرف، پیغمبرؐ کی دنیا و آخرت میں عذاب الٰہی سے تہدید خواہ مخواہ ایک گروہ کو وحشت زدہ بناتی تھی

اور تیسری طرف پیغمبرؐ کے معجزات خواہ مخواہ عام لوگوں کے نفوس میں اثرانداز ہوتے تھے۔

انہوں نے ان تینوں موضوعات کو بے اثر کرنے کے لیے ایک نہ ایک تدبیر سوچ رکھی تھی، اس نئے دین و آئین کے مقابلہ میں اپنے گزرے ہوئے بزرگوں اور آباؤ اجداد کی میراث کی حفاظت کے مسئلہ کو سامنے لے آتے حالانکہ ان کے گزرے ہوئے بزرگ قرآن کے قول کے مطابق (لا یعقلون شیئًا ولا یهتدون)، "کچھ نہیں سمجھتے تھے اور ہدایت یافتہ نہیں تھے" کے مصداق تھے۔ (بقرہ - ۱۷۰)

اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے کہ لوگوں کو اس قسم کی بیہودہ رسومات سے کہ جو بے وقوف جاہلوں کی میراث ہیں، سے باز رکھے۔

اور عذاب الٰہی سے پیغمبرؐ کی تہدیدوں کے مقابلہ میں دروغ گوئی اور جھوٹ کا مسئلہ گھڑ کے تیار کرلیا تھا تاکہ عامۃ الناس کو خاموش کرسکیں۔

اور معجزات کے مقابلہ میں "سحر" (جادو) کی تہمت لگاتے تھے، تاکہ اس کی اس ذریعہ سے توجیہ کرکے لوگوں کو اس کے سامنے جھکنے سے باز رکھیں۔

لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں اور تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے، کہ ان شیطانی وسوسوں میں سے کوئی بھی مؤثر نہ ہوا، اور آخر کار لوگ فوج در فوج اس آئین و دین پاک میں داخل ہوئے۔

٭ ٭ ٭

قرآن بعد والی آیت میں ان کے تمام دعووں پر خطِ بطلان کھینچ دیتا ہے اگرچہ بغیر کسی بیان کے بھی ان کا بطلان واضح ہے، ان کے تمام فضول اور بیہودہ دعووں کا ایک ہی جملہ کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: "ہم نے اس سے پہلے آسمانی کتابوں میں سے کوئی چیز انہیں نہیں دی ہے کہ جسے وہ پڑھ کر اس کی بنیاد پر تیری دعوت کا انکار کریں، اور تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر بھی ہم نے ان کے لیے نہیں بھیجا" (وما اٰتیناھم من کتب یدرسونھا وما ارسلنا الیھم قبلك من نذیر)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دعوے ایسا شخص کرسکتا ہے کہ جس کے پاس پہلے کوئی پیغمبر آیا ہو اور آسمانی کتاب اس کے پاس لے کر آیا ہو، اور وہ نئی دعوت کے مضمون کو اس کے مخالف

پاتا ہو، لہٰذا اس کی تکذیب کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، کبھی تو وہ یہ کہتا ہے کہ تمہارے بزرگوں کا دین تمہارے ہاتھ سے نہ جانے پائے، اور کبھی یہ کہتا ہے کہ یہ نئی دعوت جھوٹی ہے اور کبھی اس کے لانے والے کو ساحر اور جادوگر کہتا ہے۔

لیکن وہ شخص کہ جس نے اپنی فکر پر تکیہ کرتے ہوئے ۔۔کسی قسم کی آسمانی وحی کے بغیر۔۔ کچھ بھی علم نہ رکھنے کے باوجود، خرافات کو دل سے گھڑلیا ہے، اس قسم کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

اس آیت سے ضمنی طور پر اس نکتہ کا استفادہ ہوتا ہے، کہ انسان صرف اپنی قوتِ عقل کے بل بوتے پر زندگی کی نشیب و فراز سے پُر راہ طے نہیں کر سکتا، بلکہ اُسے وحی کی قوت سے مدد لینا چاہیئے اور خضرِ رسالت کی مدد سے قدم اٹھانا چاہیئے، ورنہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے کہ جس میں گمراہ ہو جانے کے خطرے سے ڈرنا ضروری ہے۔

۞ ۞ ۞

آخری زیرِ بحث آیت میں اس سرکش گروہ کو ایک مؤثر اور بلیغ بیان کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی تھی" (وکذّب الذین من قبلھم)۔

"درآنحالیکہ یہ لوگ قوت و قدرت کے لحاظ سے اس قوت کے دسویں حصّہ کو بھی نہیں پہنچے کہ جو ہم نے گزشتہ اقوام کو دی تھی" (وما بلغوا معشار ما اٰتینا ھم)۔

لیکن دیکھو! ان کا انجام کیا ہوا؟ ہاں! "انہوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی تھی، تو دیکھ لو میرا عذاب ان کے لیے کس طرح کا تھا" (فکذبوا رسلی فکیف کان نکیر)۔

ان کے ویران شدہ شہر، جو سرکوبی کرنے والے عذابِ الٰہی کی ضربوں کے ذریعہ تباہ و برباد ہوتے تھے، تمہارے نزدیک ہی اور شام کی طرف جاتے ہوئے تمہارے راستے میں پڑتے ہیں، اُن سے عبرت حاصل کرو، اور ان ویرانوں کی زبان سے ضروری و لازمی پند و نصائح سنو، اور اپنے انجام کا اس پر قیاس کرو کیونکہ نہ تو سنتِ الٰہی تغیّر پذیر ہے، اور نہ ہی تم اُن سے برتر ہو۔

"معشار" "عشر" کے مادہ سے ہے اور وہی معنی (دسواں حصہ) دیا ہے۔

بعض نے اس کو "عشر عشر" کے معنی یعنی سواں حصہ مراد لیا ہے، لیکن زیادہ تر کتب لغت و تفسیر نے اس پہلے معنی کو ہی ذکر کیا ہے، لیکن بہرحال اس قسم کے اعداد تعدادی پہلو نہیں رکھتے، اور تقلیل کے لیے ہیں، سات، ستر اور ہزار کے مقابلہ میں کہ جو تکثیر کے لیے ہیں۔

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ ہم نے تو ایسے ایسے سرکشوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے، جبکہ یہ تو ان کی قدرت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی نہیں رکھتے۔

اس معنی کی مثال قرآن کی دوسری متعدد آیات میں بھی وارد ہوئی ہے، منجملہ ان کے سورۂ انعام کی آیہ ۶ میں بیان ہوا ہے کہ: "الم یروا کم اھلکنا من قبلھم من قرن مکنٰھم فی الارض مالم نمکن لکم وارسلنا السماء علیھم مدرارًا وجعلنا الانھار تجری من تحتھم فاھلکنٰھم بذنوبھم وانشأنا من بعدھم قرنًا اٰخرین" "کیا انہوں نے اس بات کا مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے گزشتہ اقوام میں سے کتنوں کو ہلاک کیا ہے، ایسی اقوام کہ جو تم سے زیادہ طاقتور تھیں، انہیں ہم نے ایسے وسائل عطا کیے تھے کہ جو تمہیں نہیں دیئے، ہم نے ان کے لیے پے در پے بارشیں برسائیں اور ان کے باغوں کے درختوں کے نیچے ہم نے نہریں جاری کر رکھی تھیں لیکن جس وقت انہوں نے سرکشی اختیار کی، تو ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں نیست و نابود کر دیا، اور ان کے بعد ہم ایک دوسرا گروہ وجود میں لے آئے":

اسی معنی کی مثال سورۂ مومن کی آیہ ۲۱ اور سورہ روم کی آیہ ۹ میں بھی وارد ہوئی ہے۔

"نکیر" کا لفظ "انکار" کے مادہ سے ہے، اور انکار ہی کے معنی میں ہے، اور خدا کے انکار کرنے سے مراد وہی سزا اور عذاب ہے[1]

---

[1] بعض مفسرین نے ایک اور خیال کا بھی اظہار کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ (وما بلغوا معشار ما اٰتینٰھم) کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اتمام حجت کے لیے گزشتہ اقوام کے اختیار میں ان آیات کا دسواں حصہ بھی قرار نہیں دیا تھا کہ جو مشرکین قریش کے اختیار میں دی ہیں، تو جب گزشتہ لوگوں کو ہم نے اتنا سخت عذاب کیا ہے تو پھر مشرکین قریش کی حالت کہ جن پر ان سے دس گنا زیادہ اتمام حجت کیا گیا ہے واضح ہے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ پہلی تفسیر کے مطابق آیت میں جو چار ضمیریں ہیں ان میں سے پہلی اور دوسری ضمیر تو کفار قریش کی طرف لوٹتی ہے اور تیسری اور چوتھی گزشتہ مشرکین کی طرف۔ لیکن دوسری تفسیر کے مطابق پہلی مشرکین قریش، دوسری گزشتہ کفار، تیسری مشرکین قریش اور چوتھی گزشتہ کفار کی طرف لوٹتی ہے۔ (غور کیجئے)

(۴۶) قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ○

ترجمہ

(۴۶) کہہ دے کہ میں تو تمہیں صرف ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں، کہ تم دو دو افراد (مل کر) یا اکیلے اکیلے ہی خدا کے لیے کھڑے ہو جاؤ، اس کے بعد غور کرو اور سوچو (کہ) یہ تمہارا دوست اور ساتھی (محمدؐ) کسی قسم کا بھی جنون نہیں رکھتا، وہ تو صرف (خدا کے) سخت عذاب سے تمہیں ڈرانے والا ہے۔

تفسیر

انقلاب فکری ہر اصل انقلاب کی بنیاد ہے

آیات کے اس حصہ میں اور آئندہ آیات میں کہ جن میں اس سورہ کے آخری مباحث بیان ہوئے ہیں، پیغمبر اسلامؐ کو ایک بار پھر حکم دیتا ہے، کہ اب ان لوگوں کو مختلف دلائل کے ذریعہ حق کی طرف دعوت دیں، اور گمراہی سے روکیں، اور گزشتہ مباحث کی طرح پانچ مرتبہ پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "ان سے کہہ دے" (قل .....)۔

پہلی آیت میں تمام اجتماعی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور فرہنگی تغیرات اور تبدیلیوں کے اصل خمیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہت ہی مختصر اور پُرمعنی جملوں میں کہتا ہے کہ: "ان سے کہہ دو کہ میں تو تمہیں صرف ایک ہی چیز کے بارے میں نصیحت کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ تم خدا کے لیے کھڑے

ہو جاؤ۔ دو، دو افراد (مل کر) یا ایک ایک فرد (اکیلے اکیلے ہی) اور پھر غور و فکر کرو" (قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنٰی و فرادٰی ثم تتفکروا)۔

" یہ تمہارا دوست اور ساتھی (محمدؐ) کسی قسم کی فکری کجی اور جنون نہیں رکھتا" (مابصاحبکم من جنّۃ)۔

• بلکہ وہ تو صرف تمہیں خدا کے سخت عذاب سے ڈرانے والا ہے" (ان ھو الّا نذیر لکم بین یدی عذاب شدید)۔

اس آیت کے کلمات و تعبیرات میں سے ہر ایک' ایک اہم مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں سے دس نکات ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

۱۔ " اعظکم " (میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں) کا جملہ حقیقت میں اس واقعیت کو بیان کرتا ہے کہ اس گفتگو میں مجھے تمہاری خیر و صلاح مطلوب ہے نہ کہ کوئی اور دوسرا مسئلہ۔

۲۔ " واحدۃ " (صرف ایک ہی بات) کی تعبیر، خصوصاً " انما " کی تاکید کے ذریعہ اس واقعیت کی طرف ایک بولتا ہوا اشارہ ہے، کہ تمام انفرادی اور اجتماعی اصلاحات کی بنیاد فکر اور سوچ کو روبہ عمل لانا ہے جب تک کسی قوم و ملت کی سوچ اور فکر سوئی ہوئی ہے اس وقت تک وہ قوم و ملت دین و ایمان اور آزادی و استقلال کے چوروں اور ڈاکوؤں کے حملوں کی زد میں رہتی ہے لیکن جس وقت افکار بیدار ہو گئے، تو ان کے اوپر راستے بند ہو جاتے ہیں۔

۳۔ یہاں " قیام " کرنے کی تعبیر دو پاؤں پر کھڑے ہونے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ کام کو انجام دینے کی آمادگی کے معنی میں ہے، کیونکہ انسان جب اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے، تو وہ اپنی زندگی کے مختلف پروگراموں کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوتا ہے، اس بنا پر غور و فکر کرنا پہلے سے آمادگی کا محتاج ہوتا ہے کہ جس سے انسان میں وہ حرکت اور تیاری وجود میں آتی ہے جس سے وہ پختہ ارادہ کے ساتھ غور و فکر کرنے لگتا ہے۔

۴۔ " للہ " کی تعبیر اس معنی کو بیان کرتی ہے کہ قیام اور آمادگی میں خدائی جذبہ ہونا چاہیئے، اور وہ سوچ جس کی تحریک اس طرح سے ہو قیمتی ہوتی ہے، اصولی طور پر کاموں میں خلوص، یہاں تک کہ سوچنے اور غور و فکر کرنے میں بھی نجات اور برکت کا سبب ہوتا ہے۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ " اللہ " پر ایمان کا ہونا یہاں پر تسلیم شدہ مانا گیا ہے، اس بنا پر دوسرے مسائل کے لیے غور و فکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توحید ایک فطری امر ہے کہ جو بغیر کسی غور و فکر کے بھی واضح و روشن ہے۔

۵۔ " مثنٰی و فرادٰی " (دو دو یا ایک ایک) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غور و فکر

شور وغل سے دُور ہو کر کرنا چاہیئے۔ لوگوں کو ایک ایک کر کے اکیلے ہی یا زیادہ سے زیادہ دو دو ل کر قیام کرنا چاہیئے اور اپنی سوچ بچار اور فکر کو کام میں لانا چاہیئے، کیونکہ شور و غوغا کے درمیان سوچ دبچار گہرا اور عمیق نہیں ہوگا، خصوصاً جبکہ مجمع اور بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اپنے اعتقاد سے دفاع اور اس کی حمایت میں خود خواہی اور تعصب کے عوامل زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ دونوں تعبیریں اس بنا پر ہیں چونکہ "انفرادی" اور "اجتماعی" افکار یعنی مشورے کی آمیزش کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ہوتے ہیں، لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ ایک تو تنہائی میں سوچ بچار کرے اور دوم دوسروں کے افکار سے بھی فائدہ اٹھائے، کیونکہ فکر و رائے میں استبداد و استقلال تباہی کا باعث ہوتا ہے اور ہمفکری اور علمی مشکلات کے حل کے لیے کوشش کرنا ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ، جہاں بات شور و غوغا تک نہ پہنچے وہاں پر قابلِ اطمینان حد تک اس کا بہتر اثر ہوتا ہے اور شاید اسی بنا پر مثنیٰ کو فرادیٰ پر مقدم رکھا ہے۔

۶۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن یہاں کہتا ہے: "تتفکّروا" (غور و فکر کرو) لیکن کس چیز میں؟ اس لحاظ سے یہ مطلق ہے اور اصطلاح کے مطابق متعلق کا حذف ہونا عمومیت پر دلالت کرتا ہے یعنی ہر چیز میں، معنوی زندگی میں، مادی زندگی میں، اہم مسائل میں، اور چھوٹے سے چھوٹے مسائل میں، خلاصہ یہ کہ ہر کام میں پہلے غور کرنا چاہیئے، لیکن سب سے زیادہ اہم، ان چار سوالات کے جواب معلوم کرنے کے لیے سوچ بچار کرنا چاہیئے:

مَیں کہاں سے آیا ہوں؟ مَیں کس لیے آیا ہوں؟ مَیں کہاں جا رہا ہوں؟ اور اب مَیں کہاں ہوں؟

لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "تفکروا" کا متعلق یہاں اس کے بعد کا جملہ: (ما بصاحبکم من جنّۃ) ہے، یعنی اگر تم تھوڑا سا بھی غور و فکر کرو تو تمہیں اچھی طرح سے معلوم ہو جائے گا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنون کے سلسلے میں تمہارے بیہودہ اتہام سے پاک و منزہ ہے۔

لیکن پہلا معنی زیادہ واضح نظر آتا ہے۔

لیکن مسلّمہ طور پر منجملہ ان امور کے کہ جن میں غور و فکر کرنا چاہیئے یہی مسئلہ نبوت اور برجستہ (عمدہ) صفات کا مسئلہ ہے کہ جو پیغمبر اسلامؐ کی ذات اور ان کی عقل و خرد میں موجود تھیں، بغیر اس کے کہ (یہ غور و فکر کرنا) انہیں میں منحصر ہو۔

۷۔ "صاحبکم" (تمہارا ساتھی اور دوست) کی تعبیر، پیغمبرؐ کی ذات کے بارے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ آپ اُن کے غیر معروف اور ناشناختہ نہیں ہیں، آپ ان کے درمیان سالہا سال رہے ہیں، انہیں امانت و درایت اور صدق و راستی کے ساتھ تم نے پہچانا ہے، اب تک تم

نے ان کی زندگی کے نامۂ عمل میں کوئی کمزوری کا نقطہ مشاہدہ نہیں کیا ہے، تو اس بنا پر انصاف سے کام لو۔ جو اتہامات تم ان پر باندھ رہے ہو وہ سب کے سب بے بنیاد ہیں۔

۸۔ "جنّة" جنون کے معنی میں اصل میں مادہ (جن) بروزن ظن سے ستر و پوشش کے معنی میں ہے، اور چونکہ مجنون کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ گویا اس کی عقل چھپی ہوئی ہے اور اس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ تعبیر اس کے بارے میں استعمال ہوتی ہے۔ بہر حال قابلِ ملاحظہ نکتہ یہاں یہ ہے کہ گویا وہ اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ سوچ بچار اور فکر کی بیداری کی دعوت دینے والا خود مجنون ہو۔ جبکہ وہ سوچ بچار اور تفکر کرنے کی منادی کر رہا ہے۔ اس کی یہی بات اس کی انتہائی عقل و درایت کی دلیل ہے۔

۹۔ "ان ھو الا نذیر لکم" کا جملہ پیغمبر کی رسالت کو مسئلہ انذار میں خلاصہ کرتا ہے یعنی خدا کی دادگاہ میں جوابدہی اور اس کے عذاب سے ڈرانا، یہ ٹھیک ہے کہ پیغمبر بشارت کی رسالت بھی رکھتا ہے لیکن جو چیز انسان کو زیادہ سے زیادہ حرکت پر ابھارتی ہے وہ مسئلہ انذار ہے۔ اسی لیے قرآن کی بعض دوسری آیات میں بھی پیغمبر کی تنہا ذمہ داری کے طور پر ذکر ہوا ہے، مثلاً سورہ احقاف کی آیہ ۹ میں: (وما انا الا نذیر مبین) "میں ایک واضح انذار کرنے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں" اسی معنی کی نظیر سورہ ص کی آیہ ۶۵ اور دوسری آیات میں بھی آئی ہے۔

۱۰۔ "بین یدی عذاب شدید" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت اس قدر نزدیک ہے کہ گویا تمہارے چہرے کے سامنے ہے، اور سچ مچ دنیا کی عمر کے مقابلہ میں وہ اسی طرح ہے، یہ تعبیر اسلامی روایات میں بھی آئی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

"بعثت انا والساعة کھاتین" (وضم (ص) الوسطی والسبابة)۔ میری بعثت اور قیام قیامت ان دو کی طرح ہے۔ اس کے بعد آپ نے انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کو ایک دوسری سے ملا دیا[1]

چند نکات

۱۔ تمام انقلابات کی جڑ بنیاد

مادی اور کمیونسٹ مکاتبِ فکر کہ جو ہمیشہ سچے مذاہب کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے رہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ادیان کی دعوت اصل میں عوام الناس کے افکار کو بیکار کرنے

---

[1] تفسیر روح المعانی، ذیل آیہ زیر بحث جلد ۲۲ ص ۱۴۳۔

کے مترادف ہے۔ ان کی یہ رسوا تعبیر کہ " دین عوام الناس کے لیے افیون ہے " مشہور و معروف ہے۔

اسی طرح شرق و غرب کے سامراجی اس خوف و ہراس کی وجہ سے جو وہ مومنین کے قیام اور ان کے افکارِ مذہبی اور راہِ خدا میں شہادت کو قبول کرنے کے ضمن میں رکھتے ہیں یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے ماہرینِ نفسیات اور اسکالرز کو اس مطلب کی تلقین کریں کہ وہ اپنی اپنی اصطلاح میں ـــــ اپنی علمی کتابوں میں انہیں بیان کریں کہ مذہب طبعی طور پر انسانی جہالت اور نادانی کی پیداوار ہے۔

البتہ یہ ایک وسیع بحث ہے، اور اپنی جگہ پر انہیں دو ٹوک اور دندان شکن جواب دیئے گئے ہیں، کہ ان سب کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن زیر بحث آیت کی مانند بہت سی آیات کہ جو غور و فکر اور سوچ بچار کی طرف دعوت دیتی ہیں ـــ بلکہ دین کا نچوڑ اور انسان کی پیش رفت اور تکامل و ارتقاء کا سبب اسی غور و فکر کو جانتی ہیں ـــ ان جھوٹ اور افتراء باندھنے والوں کا سارا پول کھول کر رکھ دیتی ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام جیسا دین و آئین بے حسی یا شل کر دینے کا ذریعہ یا جہالت کی پیداوار ہو۔ حالانکہ اس کا لانے والا اپنی بلند آواز کے ساتھ تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سوئے ہوئے افکار کو بیدار کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہو اور قیام کرو۔ اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو پُر سکون اور شور و غوغا سے خالی ہو۔

ایسے ماحول میں کہ جو ہوا و ہوس اور مسموم اور زہریلے پروپیگنڈے سے دور ہو۔

تعصبات سے دور ہو، جھگڑوں اور ہٹ دھرمیوں سے دور ہو۔

خدا کے لیے قیام کرو اور غور و فکر کرو۔

کہ میری طرف سے تمہیں یہی تنہا وعظ و نصیحت ہے۔ اور بس۔

کیا اس قسم کے دین کو کہ جو نہ صرف اس مقام پر بلکہ بہت سے دوسرے مقامات پر بھی اسی دعوت کو دہراتا ہے، افکار کو سُن کرنے والے اور نشہ آور کے ساتھ متہم کرنا مضحکہ خیز اور قہقہہ لگانے والی بات نہیں ہے؟!

خاص طور پر یہ بات کہ وہ کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ تم اکیلے تنہائی اور انفرادی طور پر غور و فکر کرو، بلکہ دو دو افراد کی شکل میں، اور ایک دوسرے سے تعاون اور معاونت کی صورت میں بھی غور و فکر کرنے میں مشغول رہو، انبیاءؑ کی دعوت کے مطالب و مفاہیم کو سنو، ان کے دلائل کا بغور مطالعہ کرو، اگر وہ تمہاری عقل کے ساتھ ہم آہنگ ہوں تو اسے قبول کر لو۔

ہمارے زمانہ میں شرق و غرب کی تباہ کن جنگی طاقتوں اور قدرتوں کے مقابلہ میں جو حوادث، مختلف ممالک میں، انقلابی مسلمانوں کے قیام کی وجہ سے رونما ہوئے، انہوں نے مستکبرین کی نگاہ میں دنیا کو تیرہ و تاریک کر کے رکھ دیا ہے۔ اور ان کی طاقت و قدرت کی بنیادوں کو ہلا کے رکھ دیا ہے ان حوادث

نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ وہ یعنی مشرکین اچھی طرح سے اس نکتہ کو سمجھ چکے تھے کہ ان کے سخت ترین دشمن (مسلمان) کے اصل مذہبی عقائد ان کے لیے عظیم خطرہ ہیں، اور انہوں نے یہ بھی نشاندہی کر دی کہ ان اتہامات کا ہدف و مقصد کہ جو مذہب کے بارے میں کیے گئے ہیں کیا ہے؟

واقعاً عجیب بات ہے کہ مغربی فلسفی مردم شناسی کی اصطلاح کی تحلیلوں اور تجزیوں میں اس مسئلہ کو مسلم سمجھتے ہیں کہ ماوراء طبیعت یعنی اس دنیا کے اوپر کوئی عالم نہیں ہے۔ اور دین نوع بشر کی ایک خود ساختہ چیز ہے، پھر اس مسئلہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ اس کا عامل کیا ہے؟ اقتصادی مسائل ہیں؟ انسانوں کا خوف ہے؟ بشر کی لاعلمی اور عدم آگاہی ہے؟ روحانی عقدے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ؟

لیکن وہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ایک لحہ کے لیے ہی اس پہلے سے کیے ہوئے اپنے غلط فیصلہ سے خالی ہو کر فکر کریں کہ عالم طبیعت یعنی اس کائنات کے علاوہ ایک اور عالم ہے اور توحید کی روشن دلیلوں اور حضرت محمدؐ جیسے انبیاء کی نبوت کی آشکار اور واضح نشانیوں میں سوچ بچار سے کام لیں۔

یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کے مشرکین سے ملتے جلتے ہیں اس فرق کے ساتھ کہ وہ تو متعصب اور ہٹ دھرم تھے اس صورت میں کہ وہ اَن پڑھ تھے، یہ متعصب اور ہٹ دھرم ہیں پڑھے لکھے ہونے کے باوجود، اسی بناء پر زیادہ خطرناک اور زیادہ گمراہ کن ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات کا آخری حصّہ تفکر، تعقل اور تذکر کی دعوت ہے۔ کبھی کہتا ہے: "ان فی ذالک لاٰیة لقوم یتفکرون" (نحل - ۱۱ - ۶۹)۔

اور کبھی کہتا ہے کہ: "ان فی ذالک لاٰیات لقوم یتفکرون" (رعد ۳ - زمر ۴۲ اور جاثیہ - ۱۳)۔

اور کبھی کہتا ہے: "لعلھم یتفکرون" (حشر - ۲۱، اعراف - ۱۷۶)۔

اور کبھی اس جملہ کو دوبارہ خطاب کی صورت میں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کذالک یبین اللہ لکم الاٰیات لعلکم تتفکرون"

"اس طرح سے خدا تمہارے لیے اپنی آیات کو بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو۔"

(بقرہ - ۲۱۹ - ۲۶۶)۔

اسی طرح کے جملے قرآن میں بہت زیادہ ہیں، مثلاً قرآن کی بہت سی آیات میں "فقہ" (فہم) کی دعوت دی گئی ہے، عقل و تعقل کی دعوت اور ان افراد کی تعریف کی گئی ہے جو اپنی عقل کو استعمال کرتے ہیں، اور ان کی مذمت کہ جو اپنی فکر کو استعمال نہیں کرتے، یہ بات قرآن مجید کی ۴۹ آیات میں

علماء اور دانشمندوں اور علم و دانش کے مقام و مرتبہ کی اتنی زیادہ تعریف و توصیف کی ہے کہ اگر ہم ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی تفسیر کریں تو وہ خود ایک مستقل کتاب بن جائے۔

اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن دوزخیوں کی صفات میں سے ایک صفت تفکر و تعقل نہ کرنے کو بیان کرتا ہے: "وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السّعیر" (دوزخی کہیں گے کہ اگر ہم سننے والے کان اور بیدار عقل رکھتے ہوتے تو دوزخیوں میں سے نہ ہوتے)۔ کیونکہ دوزخ میں صاحبانِ عقل کی جگہ نہیں ہے۔ (مُلک - ۱۰)

اور ایک اور دوسری جگہ پر کہتا ہے: اصولی طور پر وہ لوگ کہ جو کان رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں، آنکھ رکھتے ہیں لیکن دیکھتے نہیں، اور عقل رکھتے ہیں لیکن سوچتے نہیں، وہ جہنم کے لیے نامزد ہو گئے ہیں۔

"ولقد ذرأنا لجهنم كثيرًا من الجن والانس لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم اٰذان لا يسمعون بها اولٰئك كالانعام بل هم اضل اولٰئك هم الغافلون"

"یقیناً جنوں اور انسانوں کے بہت سے گروہ جہنم کے لیے قرار دے دیئے ہیں۔ ان کی نشانی یہ ہے کہ وہ عقل رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ سوچتے نہیں، آنکھ رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں لیکن ان کے ساتھ سنتے نہیں، وہ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ، وہی تو اصل غافل ہیں" (اعراف - ۱۷۹)

۲۔ غور و فکر کے سلسلے میں روایاتِ اسلامی

روایاتِ اسلامی میں — قرآن کی پیروی کرتے ہوئے — غور و فکر کا مسئلہ اہمیت کے اعتبار سے درجہ اوّل میں قرار پاتا ہے، اور بہت ہی بلیغ اور پُرکشش تعبیرات اس سلسلہ میں دکھائی دیتی ہیں، کہ جن کے کچھ نمونے ہم یہاں پر پیش کرتے ہیں:

الف۔ غور و فکر کرنا عظیم ترین عبادت ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

"لیس العبادة کثرة الصلاة والصوم انما العبادة التفکر فی امر الله عزوجل"

(عبادت نماز و روزہ کی کثرت میں نہیں ہے، عبادت واقعی تو خداوند تعالیٰ کے کاموں اور جہانِ آفرینش کے کاموں میں غور و فکر کرنا ہے) [1]

---

[1] اصول کافی جلد ۲ کتاب "الکفر والایمان" باب التفکر (ص - ۴۵)۔

ایک دوسری روایت میں یہ منقول ہوا ہے :

"کان اکثر عبادة ابی ذر التفکر"

(ابوذر کی زیادہ تر عبادت غور و فکر اور سوچ بچار کرنا تھا) [1]

ب ۔ ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے ۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ :

"تفکر ساعة خیر من قیام لیلة"

ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک رات بھر عبادت کرنے سے بہتر ہے ۔

اس سے کیا مراد ہے' اور غور و فکر کس طرح کرنا چاہیئے ؟

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا :

"یمر بالخربة او بالدار فیقول این ساکنوك این بانوك مالك لا تتکلمین"

جب تو کسی ویرانے کے پاس سے گزرتا ہے، یا کسی ایسے گھر کے پاس سے (کہ جو اپنے بسنے والوں سے خالی ہو) گزرتا ہے تو کہتا ہے تجھ میں رہنے والے کہاں گئے؟ تیری بنیاد رکھنے والوں کا کیا ہوا؟ تو بولتا کیوں نہیں؟ [2]

ج ۔ غور و فکر سرچشمۂ عمل ہے ۔

امیرالمؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"ان التفکر یدعوا الی البر والعمل بہ"

"غور و فکر کرنا نیکی اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے" [3]

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۳۸۳، مادہ فکر ۔

[2] مدرک مذکورہ ۔

[3] سفینۃ البحار، جلد ۲، ص ۳۸۳، مادہ فکر ۔

(۴۷) قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○

(۴۸) قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○

(۴۹) قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ○

(۵۰) قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ○

ترجمہ

(۴۷) کہہ دے کہ: جو اجر اور بدلہ مَیں نے تم سے مانگا ہے وہ خود تمہارے ہی لیے ہے میرا اجر تو صرف خدا پر ہے، اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

(۴۸) کہہ دے کہ: میرا پروردگار حق کو (اپنے پیغمبروں کے دل پر) ڈالتا ہے۔ کیونکہ وہ علام الغیوب (اور تمام پوشیدہ اسرار سے واقف و آگاہ) ہے۔

(۴۹) کہہ دے کہ: حق آگیا ہے اور باطل (سے کچھ نہیں ہوسکتا) نہ تو کسی چیز کا آغاز ہی کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کی تجدید۔

(۵۰) کہہ دے کہ: اگر مَیں گمراہ ہوجاؤں تو مَیں خود اپنی طرف سے گمراہ ہوں گا اور اگر ہدایت یافتہ ہوجاؤں تو وہ اس وحی کے وسیلہ سے ہدایت حاصل کرتا ہوں کہ جو میرا پروردگار میری طرف کرتا ہے، وہ سننے والا اور نزدیک ہے۔

تفسیر

باطل سے کوئی کام نہیں ہوتا

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خدا آیات کے اس سلسلے میں پانچ مرتبہ اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان بے ایمان گمراہوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے بات کرو اور ہر طرف سے ان پر عذر کی راہ بند کردو۔

گزشتہ آیات میں تفکر کی دعوت کے بارے میں گفتگو تھی، اور پیغمبرؐ کی طرف سے ہر قسم کے روحانی عدم تعاون کی نفی تھی۔

پہلی زیر بحث آیت میں رسالت کے مقابلہ میں اجر اور مزدوری کے عدم مطالبہ کی گفتگو ہو رہی ہے۔

کہتا ہے: "کہہ دے کہ جو اجر و پاداش میں نے تم سے مانگا ہے وہ تمہارے ہی لیے ہے۔" (قل ما سألتكم من اجر فهو لكم)۔

"اور میرا اجر اور صلہ تو خدا ہی کے ذمہ ہے" (ان اجری الا علی الله)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عقلمند انسان جو کام بھی کرے اس کا کوئی نہ کوئی سبب اور محرک ہونا چاہیئے۔ تو جب میری عقل کا کامل ہونا تم پر ثابت ہو چکا ہے، اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ میں کوئی مادی سبب اور محرک نہیں رکھتا، تو تمہیں یہ جان لینا چاہیئے کہ خدائی اور معنوی محرک نے ہی مجھے اس کام پر آمادہ کیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، میں نے تمہیں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے تو تم اب اچھی طرح سے سوچ لو، اور اپنے وجدان سے سوال کرو، کہ کونسی چیز اس بات کا سبب بنی ہے کہ میں تمہیں خدا کے سخت عذاب سے انذار کروں، اور ڈراؤں، اس کام سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ اور اس میں میرا کونسا مادی فائدہ ہے؟

اس کے علاوہ اگر اس مخالفت اور حق سے روگردانی کرنے میں تمہارا بہانہ یہ ہے کہ تمہیں اس کیلئے بے بہا قیمت ادا کرنی پڑے گی، تو میں نے اصولاً تم سے کوئی اجر اور صلہ مانگا ہی نہیں ہے۔

چنانچہ یہی معنی سورہ قلم کی آیہ ۴۶ میں بھی صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے: (ام تسئلھم اجرا فھم من مغرم مثقلون) "کیا تو نے رسالت کی ادائیگی پر کوئی اجر اور صلہ ان سے مانگا ہے کہ جو ان کے کندھوں پر بوجھ بن گیا ہے"؟

اس بارے میں کہ (فھو لکم) کا جملہ کیا معنی رکھتا ہے، اس کے لیے دو تفاسیر موجود ہیں:

پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ یہ مطلقاً ہر قسم کی اجرت کا مطالبہ نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ: "جو کچھ ہم نے تجھ سے چاہا ہے خود تیرا ہی مال ہے" یہ اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ میں نے تجھ سے

کچھ بھی مطالبہ نہیں کیا، اس بات کا شاہد اس کے بعد والا جملہ ہے، کہ جس میں وہ کہتا ہے: (ان اجری الّا علی اللہ) "میرا اجر اور صلہ تو صرف خدا پر ہے"۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اگر تم یہ دیکھتے ہو، کہ مَیں نے اپنی بعض باتوں میں، کہ جو مَیں پروردگار کی طرف سے لایا ہوں تم سے یہ کہا ہے کہ: (لا اسئلکم علیہ اجرًا الّا المودۃ فی القربٰی) "مَیں تم سے کوئی صلہ اور اجر نہیں مانگتا سوائے اپنے اقربا کی دوستی کے": (شوریٰ - ۲۳)

تو اس کا فائدہ بھی خود تمہاری طرف ہی لوٹتا ہے، چونکہ (مودت ذی القربٰی) مسئلہ "امامت و ولایت" اور خطِ نبوت کے مسلسل جاری رہنے کی طرف بازگشت ہے کہ جو تمہاری ہدایت کے جاری رہنے کے لیے ضروری ہے۔

اس بات کی گواہ وہ شانِ نزول ہے کہ جو بعض مفسرین نے یہاں نقل کی ہے، کہ جس وقت آیہ: "قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الّا المودۃ فی القربٰی" نازل ہوئی، تو پیغمبرؐ نے مشرکینِ مکہ سے فرمایا میرے اقربا اور اعزا کو اذیت نہ دو، تو انہوں نے بھی اس فرمائش کو قبول کرلیا، لیکن جس وقت پیغمبرؐ نے اُن کے بتوں کو بُرا بھلا کہا تو وہ کہنے لگے کہ محمدؐ ہم سے منصفانہ برتاؤ نہیں کرتا، ایک طرف تو ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کے اعزا و اقربا کو بھی اذیت نہ پہنچائیں، لیکن دوسری طرف ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہہ کر ہیں اذیت و آزار پہنچاتا ہے تو اس موقع پر آیہ "قل ما سألتکم من اجر فھو لکم" (زیر بحث آیت) نازل ہوئی، اور ان سے کہا کہ جو کچھ مَیں نے تم سے اس بارے میں سوال کیا ہے وہ تمہارے ہی نفع کیلئے ہے، اب تمہاری مرضی ہے کہ آزار و تکلیف پہنچاؤ یا نہ پہنچاؤ۔[1]

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "اور وہ ہر چیز پر شاہد و گواہ ہے" (وھو علٰی کل شیءٍ شھید)۔

اگر مَیں اپنا اجر اور صلہ اسی سے چاہتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ میرے تمام اعمال اور نیتوں سے آگاہ اور باخبر ہے۔

علاوہ ازیں وہ میری حقانیت کا گواہ ہے کیونکہ یہ تمام معجزات اور آیاتِ بیّنات اس نے میرے قبضہ اور اختیار میں دے رکھے ہیں، اور واقعاً سب سے زیادہ برتر و افضل گواہ خود وہ ہے، کیونکہ جو شخص حقائق کو سب سے بہتر طور پر جانتا ہے، اور وہ سب سے بہتر طور پر انہیں ادا کرسکتا ہے اور حق کے سوا کوئی چیز اس سے صادر نہیں ہوتی، تو وہی سب گواہوں سے بہتر گواہ ہے، اور وہ خدا ہے۔

٭ ٭ ٭

پیغمبرؐ کی حقانیت کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس پر توجہ کرتے ہوئے، بعد والی آیت میں کہتا

---

[1] تفسیر روح البیان، جلد ۷، ص ۳۰۸۔

ہے : قرآن ایک ایسی حقیقت اور واقعیت ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ جو خدا کی طرف سے پیغمبرؐ کے دل پر القاء ہوا ہے۔ "کہہ دے کہ میرا پروردگار حق کو ڈالتا ہے، کہ جو علام الغیوب ہے اور تمام اسرارِ نہاں سے آگاہ ہے" (قل ان ربی یقذف بالحق علام الغیوب)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "یقذف" "قذف" کے مادے سے (بروزن حذف) دور دراز کی جگہ پر پھینکنے یا دور کے راستے سے لڑھکانے کے معنی میں ہے، اس آیت کے لیے بہت سی تفسیریں لکھی گئی ہیں، کہ وہ سب کی سب آپس میں قابلِ جمع ہیں۔

پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ "حق" کو پھینکنے سے مراد، کتب آسمانی اور وحی الٰہی کو انبیاء اور پروردگار کے بھیجے ہوؤں کے دلوں میں ڈالنا ہے۔ کیونکہ وہ علام الغیوب ہونے کے سبب آمادہ اور تیار دلوں کو پہچانتا ہے، اور ان کا انتخاب کرکے اپنی وحی کو ان میں ڈالتا ہے، تاکہ اس کی گہرائیوں میں نفوذ کرے۔

تو اس طرح یہ آیہ اُس مشہور حدیث :

" العلم نور یقذف اللہ فی قلب من یشاء "

"علم ایک نور ہے کہ جسے خدا جس دل میں چاہتا ہے اور جسے لائق دیکھتا ہے ڈال دیتا ہے"۔ سے مشابہت رکھتی ہے۔

تعبیر " علام الغیوب " اس معنی کی تائید کرتی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد حق کو باطل پر پھینکنا اور حق کے ذریعہ باطل کی سرکوبی کرنا ہے۔ یعنی حق اس طرح کی قوت و طاقت رکھتا ہے، کہ جو اپنے راستے سے تمام رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے اور کسی شخص کو اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت اور قدرت نہیں ہے۔ تو اس طرح سے یہ مخالفین کے لیے ایک تہدید ہے، کہ وہ قرآن کے مقابلہ کے لیے کھڑے نہ ہوں اور وہ یہ جان لیں کہ قرآن کی حقانیت انہیں درہم برہم کرکے رکھ دے گی۔

اور اس صورت میں یہ اس مطلب کے مشابہ ہے کہ جو سورہ انبیاء کی آیہ ۱۸ میں بیان ہوا ہے :

(بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق) "ہم حق کو باطل کے سر پر پھینکیں گے تاکہ وہ اس کو نابود اور ہلاک کر دے، اور باطل محو و نابود ہو جائے گا"۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہاں "قذف" کی تعبیر سے مراد قرآن کی حقانیت کا عالم کے دور و نزدیک کے نقاط میں نفوذ ہے، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آخرکار یہ وحی آسمانی عالمگیر ہو جائے گی، اور ہر جگہ کو اپنے نور سے روشن و منور کر دے گی۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: "کہہ دے کہ حق آگیا ہے، اور باطل سے اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ نہ تو وہ کوئی نیا کام انجام دے سکتا ہے، اور نہ ہی پرانے پروگرام کی تجدید کرسکتا ہے" (قل جاء الحق وما یبدئ الباطل وما یعید)[1]

اور اس طرح سے حق کے مقابلہ میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا، نہ تو کوئی جدید نقش واثر ہوگا اور نہ ہی کوئی تکراری نقش واثر ہوگا، کیونکہ اس کے تمام نقوش، نقش بر آب ہیں، اور ٹھیک اسی بنا پر وہ نورِ حق کی پردہ پوشی بھی نہیں کرسکتا اور اس کے اثر کو دلوں سے کم نہیں کرسکتا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت میں حق و باطل کو محدود مصادیق میں محصور کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ان دونوں کا مفہوم وسیع وکشادہ ہے، قرآن، وحی خداوندی، تعلیماتِ اسلام، سب کے سب "حق" کے مفہوم میں جمع ہیں۔ جبکہ "شرک" وکفر، ضلالت وگمراہی شیطانی وسوسے اور طاغوتی بدعتیں سب "باطل" کے معنی میں درج ہیں۔

اور حقیقت میں یہ آیت سورہ اسراء کی آیت ۸۱ کے مشابہ ہے کہ جس میں فرماتا ہے: "وقل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقًا" — "کہہ دے کہ حق آگیا اور باطل چلا گیا، کیونکہ باطل تو جانے والا ہی ہے"۔

ایک روایت میں ابن مسعود سے اس طرح منقول ہے، کہ پیغمبرؐ مکہ میں وارد ہوئے، درحالیکہ خانہ خدا کے اطراف میں ۳۶۰ بت تھے، آپ اس چھڑی کے ساتھ کہ جو آپ کے ہاتھ میں تھی ایک ایک بت کو گراتے اور فرماتے جاتے تھے: "جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقًا — جاء الحق وما یبدئ الباطل وما یعید"[2]

سوال

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر والی آیت یہ کہتی ہے، کہ حق کے ظہور کے ساتھ باطل رنگ باختہ ہو کر کلی طور پر کوئی نئی بات ایجاد کرنے سے باز آجاتا ہے، حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ باطل ابھی تک مصروفِ کار ہے اور بہت سے علاقوں کو اپنے زیرِ تسلط قرار دیئے ہوئے ہے؟

---

[1] "یبدء" مادہ "ابداء" سے ابتدائی طور پر ایجاد کرنے کے معنی میں ہے اور "یعید"، "اعادہ" کے مادہ سے تکرار کے معنی میں ہے، باطل اس کا فاعل ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: "مایبدء الباطل شیئًا وما یعید شیئًا" باطل نہ تو کسی چیز کی ابتداء کرسکتا ہے اور نہ ہی اعادہ"

[2] تفسیر مجمع البیان، جلد ۸ ص ۳۹۷۔

جواب

اس کے جواب میں اس نکتہ کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے کہ اولاً : تو حق کے ظاہر ہونے اور اس کے آشکار ہونے سے باطل یعنی شرک وکفر و نفاق اور جن جن کا وہ سرچشمہ ہے ، بے رنگ ہو جاتے ہیں' اور اگر وہ اپنی زندگی کو جاری بھی رکھیں تو وہ بھی زور وظلم اور دباؤ کے طریقہ سے ہوگا، ورنہ اس کے چہرے سے نقاب ہٹ جائے گا اور اس کا مکروہ چہرہ حق کے متلاشیوں کے لیے آشکار ہو جائے گا' اور حق کے آنے ' باطل کے محو ہو جانے سے یہی مراد ہے ۔

ثانیاً : حق کی حکومت کے قیام، اور سارے عالم میں باطل کی حکومت کے زوال کے لیے ، اُن امکانات و وسائل کے علاوہ کہ جو خدا نے بندوں کے اختیار میں دیئے ہیں، ایسے شرائط و حالات کا وجود بھی ان کی طرف سے ضروری ہے کہ جن میں سے اہم ترین چیز ان امکانات و وسائل سے استفادہ کے لیے مقدمات کی ترتیب دینا ہے ۔

دوسرے لفظوں میں حق کی باطل پر کامیابی نہ صرف مکتبی، منطقی و ہدفی پہلوؤں میں ہے' بلکہ اجرائی پہلوؤں میں دو بنیادوں پر قرار پاتی ہیں، "فاعلیت فاعل" اور "قابلیت قابل" اور اگر قابلیتوں کے نہ ہونے کے باعث اجراء کے مرحلہ میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو تو حق کی عدم کامیابی کی دلیل نہیں ہے ۔

مثال کے طور پر جیسا کہ قرآن کہتا ہے : "ادعونی استجب لکم" "مجھے پکارو تاکہ میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں" (مؤمن ۔ ۶۰) ۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ دعا کی قبولیت بے قید و شرط نہیں ہے ، اگر اس کے شرائط حاصل ہو جائیں تو اس کی اجابت قطعی و یقینی ہے' ورنہ اس صورت کے علاوہ اجابت و قبولیت کی توقع نہیں ہونا چاہیئے ۔ اس معنی کی تشریح سورہ بقرہ کی آیہ ۱۸۶ کے ذیل میں (جلد اول میں آچکی ہے) ۔

یہ ٹھیک اس طرح ہے کہ ہم ایک حاذق اور ماہر طبیب و ڈاکٹر کو ایک مریض کے پاس لائیں' اور ہم کہیں کہ تیری نجات کے اسباب فراہم ہو گئے ہیں ، اور جب ہم اس کی دوا بھی مہیا کر دیں، تو ہم کہتے ہیں کہ اب تیری مشکل حل ہو گئی ۔ حالانکہ یہ سب چیزیں تو وہ ہیں کہ جو مقتضی تھیں ، نہ کہ علت تامہ ۔ بیمار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوا سے استفادہ کرے اور طبیب کی شرائط پر کاربند ہو، اور وہ پرہیز کہ جو ضروری و لازمی ہیں ان کو نہ بھولے، تاکہ شفا کا حصول یقینی بن جائے ۔ (غور کیجئے)

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس بناء پر کہ وہ یہ واضح کر دے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے خدا کی طرف سے ہے ۔ اور ہر ہدایت خدا کی جانب سے ہے' اور وحی الٰہی میں ہرگز خطا کا گزر نہیں ہے ۔ مزید کہتا ہے کہ : کہہ دے کہ اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو میں خود اپنی طرف سے گمراہ ہوں گا، اور اگر میں ہدایت پاؤں تو میں اُس

چیز کے ذریعے سے کہ جو میرے پروردگار نے مجھے وحی کی ہے ہدایت پاؤں گا، (قل ان ضللت فانما اضل علیٰ نفسی وان اهتدیت فبما یوحی الیّ ربی) [1]

یعنی مَیں بھی اگر اپنی حالت پر رہوں تو گمراہ ہو جاؤں گا، کیونکہ باطل کے انبوہ میں سے راہِ حق کو تلاش کرنا پروردگار کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور ہدایت کا وہ نور کہ جس میں گمراہی کا کوئی گزر نہیں ہے، اس کی وحی کا نور ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ عقل ایک پُر فروغ چراغ ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ انسان معصوم نہیں ہے اور اس چراغ کی شعاع ظلمت کے تمام پردوں کو نہیں چیر سکتی، پس آؤ اور تم بھی اس وحیٔ الٰہی کے دامن میں ہاتھ ڈالو تاکہ وادیٔ ظلمات سے نکل سکو، اور سرزمین نور میں قدم رکھو۔

بہرحال جہاں پیغمبر باوجود اپنے پورے علم و آگاہی کے خدا کی ہدایت کے بغیر کسی جگہ پر نہیں پہنچتا تو دوسروں کا معاملہ تو ظاہر اور روشن ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "وہ سننے والا اور نزدیک ہے" (انہ سمیع قریب)۔

کہیں یہ خیال نہ کرلینا کہ وہ ہماری اور تمہاری باتوں کو نہیں سنتا، یا سنتا تو ہے لیکن ہم سے دُور ہے، ایسا نہیں ہے، وہ سنتا بھی ہے، اور نزدیک بھی ہے، اس بنا پر ہماری گفتگوؤں اور خواہشات کا ایک ذرہ بھی اس سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

---

[1] اس بارے میں کہ پہلے جملہ میں "علیٰ" کیوں لایا (علیٰ نفسی) اور دوسرے جملہ میں "با" (فبما یوحی الیّ ربی) بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ان جملوں میں سے ہر ایک میں محذوف ہے کہ جو ایک دوسرے قرینہ کی وجہ سے حذف ہوا ہے اور اس کی تقدیر اس طرح تھی "ان ضللت فانما اضل نفسی وان اهتدیت فانما اهتدی لنفسی بما یوحی الی ربی" اگر مَیں گمراہ ہو جاؤں تو مَیں خود سے گمراہ ہوا ہوں اور اگر مَیں ہدایت پاؤں تو میرے نفس نے اس چیز سے ہدایت حاصل کی ہے کہ جو میرے پروردگار نے میری طرف وحی کی ہے۔ (غور کیجئے)۔ تفسیر روح المعانی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

(۵۱) وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۙ

(۵۲) وَّقَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۚۖ

(۵۳) وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ

(۵۴) وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۧ

ترجمہ

(۵۱) اگر تو اُس وقت دیکھے جبکہ ان کی فریاد بلند ہوگی، لیکن وہ (عذابِ الٰہی کے پنجے سے) بھاگ نہ سکیں گے، اور وہ نزدیک کی جگہ (ایسی جگہ کہ جس کی انہیں امید تک نہ ہوگی) سے پکڑ لیے جائیں گے (تو تُو ان کی بے بسی پر تعجب کرے گا)۔

(۵۲) اور وہ (اس حالت میں) یہ کہیں گے کہ ہم ایمان لائے، لیکن وہ دُور کے فاصلے سے اس بات پر کیسے رسائی حاصل کر سکیں گے۔

(۵۳) وہ اس سے پہلے تو (جب کہ وہ انتہائی طور پر آزاد تھے) اس سے کافر ہو گئے تھے (اور اس کی طرف ناروا نسبتیں دیا کرتے تھے) اور دور ہی دور سے عالمِ غیب کے بارے میں اٹکل پچو باتیں بنایا کرتے تھے (اور اس کے لیے بغیر کسی غور و فکر

کے فیصلے کیا کرتے تھے)۔

(۵۴) (آخر کار) ان کے اور ان کی خواہشات، تمناؤں، آرزوؤں اور چاہتوں کے درمیان جدائی ڈال دی گئی، جیسا کہ ان کے پیروکاروں (اور ہم مسلکوں) کے ساتھ اس سے پہلے کیا گیا تھا، کیونکہ وہ شک و شبہ میں مبتلا تھے۔

تفسیر

ان کے لیے راہِ فرار نہ ہوگی

زیر بحث آیات میں کہ جو، سورہ سباء کی آخری آیات ہیں، ان مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو ہٹ دھرم مشرکین کے بارے میں گزشتہ آیات میں گزر چکی ہیں، دوبارہ پیغمبرؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے، اس گروہ کی حالت کو عذاب الٰہی کے چنگل میں گرفتاری کے وقت مجسم کرتا ہے، کہ وہ (عذاب الٰہی میں) گرفتار ہونے کے بعد کس طرح ایمان لانے کی فکر میں پڑیں گے لیکن ان کے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ فرماتا ہے: "اگر تو اس وقت دیکھے جبکہ ان کی فریاد بلند ہوگی، لیکن وہ بھاگ نہ سکیں گے اور عذاب الٰہی کے چنگل سے نکل نہ سکیں گے، اور انہیں بالکل قریب سے ہی پکڑ لیں گے اور گرفتار کر لیں گے تو تو ان کی بیچارگی اور بے بسی پر تعجب کرے گا" (ولو ترٰی اذ فزعوا فلا فوت واخذوا من مکان قریب)[1]

یہ بات کہ یہ نالہ وزاری اور فریاد و بے تابی کس زمانے سے تعلق رکھتی ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض اسے عذاب دنیا یا موت کے وقت کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں، اور بعض اسے روز قیامت کے عذاب سے متعلق جانتے ہیں۔

لیکن زیر بحث آیتوں میں سے آخری آیت میں ایک ایسی تعبیر موجود ہے کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ آیات، سب کی سب دنیا ہی میں پہنچنے والے عذاب کے ساتھ، یا جان کنی کے لمحہ کے ساتھ مربوط ہیں۔ کیونکہ آخری آیت میں وہ یہ کہتا ہے کہ: "ان کے اور ان کی چہیتی چیزوں کے

---

[1] "ولو ترٰی" جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: "لرأیت امرًا عظیماً" یا "لعجبت من احوالھم" (تو ایک امر عظیم دیکھتا۔ یا ان کے حالات پر تعجب کرتا)۔

درمیان جدائی ڈال دی جائے گی" جیساکہ اس سے پہلے کفار کے دوسرے گروہوں کے بارے میں یہی عمل انجام پایا ہے۔

یہ تعبیر روز قیامت کے عذاب کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ اس دن توسب کے سب ایک ہی جگہ حساب کے لیے جمع ہوں گے، جیساکہ سورہ ہود کی آیہ ۱۰۳ میں بیان ہوا ہے کہ: "ذالك يوم مجموع له الناس وذالك يوم مشهود۔" وہ ایسا دن ہے کہ جس میں تمام لوگ جمع ہوں گے اور وہ ایسا دن ہے کہ جس کاسب مشاہدہ کریں گے:

اور سورہ واقعہ کی آیت ۴۹،۵۰ میں یہ بیان ہوا ہے کہ: "قل ان الاولين والأخرين لمجموعون الیٰ میقات یوم معلوم" "کہہ دے کہ سب اولین و آخرین، روزِ معین کے وقت اکٹھے کیے جائیں گے"

اس بنا پر "اخذوا من مكان قريب" کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ یہ ستمگر اور بے ایمان لوگ نہ صرف یہ کہ وہ قدرتِ خدا کی حدود سے باہر نہ نکل سکیں گے بلکہ خدا انہیں ایسی جگہ سے گرفتار کرے گا کہ جو ان سے بہت ہی زیادہ قریب ہوگی۔

کیا فرعونی دریائے نیل کی لہروں میں کہ جو اُن کے لیے سرمایہ افتخار تھا دفن نہیں ہوتے؟ اور کیا قارون اپنے ہی خزانوں کے درمیان زمین میں نہیں دھنسا؟ اور کیا قوم سبا، کہ جن کی داستان اسی سورہ میں بیان کی گئی ہے، نزدیک ترین مکان یعنی اسی عظیم سد سے کہ جو اُن کی آبادی کا دل اور ان کی زندگی اور حرکت کا سرمایہ تھی۔ گرفتار نہیں ہوتے؟ اسی بنا پر خدا انہیں بھی نزدیک ترین جگہ سے ہی گرفتار کرے گا تاکہ وہ اس کی قدرت نمائی کو جان لیں۔

بہت سے ظالم بادشاہ اپنے نزدیک ترین افراد کے ذریعہ قتل ہوئے اور نابود ہو گئے اور بہت سے قدرتمند ستمگروں نے اپنے گھر کے اندر ہی آخری ضرب کھائی ہے۔

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہت سی روایات میں کہ جو شیعہ اور اہلِ سنت کے وسیلوں سے نقل ہوئی ہیں، یہ آیت "سفیانی" کے خروج اور اُس کے لشکر (وہ گروہ کہ جو ابوسفیان کے مکتب کے پیرو اور زمانہ جاہلیت کے پسماندگان ہیں اور حق کے طرفداروں کے خلاف قیام مہدیؑ کی ابتداء میں خروج کریں گے) پر منطبق ہوئی ہے، کہ وہ مکہ کی تسخیر کے لیے اس کی طرف چلنے کے موقع پر صحرا میں گرفتارِ عذاب ہوں گے، اور زمین میں اس کے شگافتہ ہونے اور ان کے اس میں دھنس جانے کے سبب سے شدید زلزلہ اور لرزہ طاری ہوگا۔ تو یہ حقیقت میں (اخذوا من مكان قريب) کے ایک مصداق کا بیان ہے، کہ وہ اسی نقطہ سے کہ جو ان کے پاؤں کے نیچے ہے عذابِ الٰہی کے چنگل میں گرفتار ہوں گے۔

اس حدیث کا مضمون "ابن عباس" "ابن مسعود" "ابو ہریرہ" "ابوحذیفہ" "ام سلمٰہ" اور حضرت عائشہ نے، اس کے مطابق کہ جو اہلِ سنت کی کتابوں میں آیا ہے، پیغمبر گرامی اسلامؐ

سے نقل کیا ہے۔[1]

اور بہت سے شیعہ مفسرین مثلاً "قمی"۔ "مجمع البیان"۔ "نورالثقلین"۔ "صافی" نے اور اہلِ سنت کے مفسرین کی ایک جماعت مثلاً "روح المعانی"۔ "روح البیان" اور "قرطبی" کے مؤلفین نے بھی اس کو زیر بحث آیات کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

مرحوم علامہ مجلسی نے متعدد روایات بحار الانوار میں امام محمد باقرؑ اور پیغمبر گرامی اسلامؐ سے اس سلسلہ میں نقل کی ہیں کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ زیر بحث آیات کے مصادیق میں سے ایک قیامِ مہدیؑ کے وقت "خروجِ سفیانی" کا مسئلہ ہے کہ جس کو خدا (اس کے لشکر سمیت) نزدیک ترین جگہ سے گرفتارِ عذاب اور نابود کر دے گا۔[2]

جیسا کہ ہم نے بارہا لکھا ہے کہ جو روایات آیات کی تفسیر میں وارد ہوتی ہیں وہ زیادہ تر واضح مصادیق کو بیان کرتی ہیں، اور وہ ہرگز آیات کے مفہوم کو محدود کرنے کی دلیل نہیں ہیں۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں، ان کے عذابِ الٰہی کے چنگل میں گرفتار ہونے کے وقت ان کی حالت کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ کہیں گے کہ ہم اس (قرآن، اس کے لانے والے اور مبدأ و معاد) پر ایمان لائے" (وقالوا اٰمنا بہ)۔[3]

"لیکن وہ اس دور دراز کے فاصلہ سے اس پر کس طرح دسترس حاصل کر سکیں گے" (وانّٰی لھم التناوش من مکان بعید)۔

ہاں! موت اور عذابِ استیصال کے آجانے پر بازگشت کے دروازے کلی طور پر بند ہو جاتے ہیں، اور انسان اور گزشتہ غلط کاریوں کی تلافی کے درمیان ایک محکم رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، اسی بنا پر اس وقت ایمان کا اظہار کرنا ایسا ہوگا جیسا کہ یہ بات کسی دور دراز مقام سے انجام پائے جہاں ہاتھ نہ پہنچ سکتا ہو۔

اصولی طور پر اس قسم کا ایمان ـــ کہ جو اضطراری پہلو رکھتا ہو، اور اس عذاب کے حد سے زیادہ خوف کی وجہ سے ہو، جسے وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں ـــ کوئی وقعت نہیں رکھتا، لہٰذا قرآن

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۶ ص ۴۱۹۔

[2] بحارالانوار، جلد ۵۲ ص ۱۸۵ سے آگے (باب علامات ظہور مہدی من السفیانی والدجال)۔

[3] "بہ" کی ضمیر "حق" کی طرف لوٹتی ہے، کہ جو اس سے قریب ترین مرجع ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ آیات میں "حق" ـــ قرآن اور اس کے مضامین اور مبدأ و معاد اور پیغمبر اسلامؐ کے معنی میں ہے۔

کی دوسری آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ: "یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، اگر یہ پلٹ جائیں تو پھر انہیں پروگراموں پر عمل کرنے لگیں گے" (انعام - ۲۸)۔

"تناوش" مادہ "نوش" (بروزن خوف) کسی چیز کو پکڑنے کے معنی میں ہے اور بعض نے سہولت کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں لیا ہے، یعنی وہ ایسے دُور دراز کے ہدف تک آسانی کے ساتھ کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس وقت جبکہ تمام چیزیں ختم ہوگئی ہیں وہ ایمان لاکر اپنی خطاؤں کی تلافی کیسے کرسکتے ہیں، حالانکہ وہ اس سے پہلے (جبکہ وہ انتہائی اختیار اور ارادہ کی آزادی کے مالک تھے) "اس سے کافر ہوگئے تھے" (وقد کفروا بہ من قبل)۔

وہ نہ صرف کافر ہی ہوتے تھے بلکہ پیغمبر اسلامؐ اور ان کی تعلیمات پر طرح طرح کی تہمتیں باندھتے تھے، اور عالم غیب ۔ عالم ماوراء طبیعت، قیامت اور پیغمبرؐ کی نبوت ۔۔ کے بارے میں ناروا فیصلے کیا کرتے تھے، اور دور دراز مقام سے اس کی طرف ناروا نسبتیں دیتے تھے۔ "و یقذفون بالغیب من مکان بعید"

"قذف" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کسی چیز کو اٹھا کر پھینکنے کے معنی میں ہے۔ اور "غیب" عالم ماوراء حس کے معنی میں ہے، اور "مکان بعید" "دور کی جگہ" کے معنی میں ہے، اور مجموعی طور پر یہ ایک لطیف کنایہ ہے، ایسے شخص کے بارے میں کہ جو عالم ماوراء طبیعت کے لیے آگاہی و اطلاع کے بغیر فیصلہ کرے۔ جیسا کہ دور کی جگہ سے کسی چیز کو پھینکنا بہت ہی کم نشانہ پر لگتا ہے، اسی طرح ان کا یہ ظن و گمان اور فیصلہ بھی ہدف اور نشانہ پر نہیں لگتا۔

وہ کبھی تو پیغمبرؐ کو ساحر اور جادوگر کہتے تھے، کبھی "دیوانہ" کبھی "کذاب" (جھوٹا) کبھی قرآن کو انسانی فکر سے گھڑا ہوا کلام جانتے تھے، اور کبھی جنت، جہنم اور قیامت کا کلی طور پر انکار کر دیتے تھے، یہ تمام باتیں ایک قسم کا "غیب کے بارے میں اٹکل پچو باتیں بنانا" اور "تاریکی میں تیر پھینکنا"، اور "دور دراز کے مکان سے پھینکنا" "قذف من مکان بعید" تھا۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ: "آخرکار ان کے اور ان تمام چیزوں کے درمیان کہ جن سے وہ علاقہ و تعلق رکھتے تھے، موت کے ذریعہ جدائی ڈال دی جائے گی، جیسا کہ ان کے مانند و مشابہ گروہوں کے ساتھ اس سے پہلے عمل ہوا" (وحیل بینھم و بین ما یشتھون کما فعل باشیاعھم من قبل)۔

ایک ہی درد ناک لمحہ میں دیکھیں گے کہ ان کا تمام مال و دولت، تمام محلات اور مقام و منصب اور ان کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں اُن سے جدا ہو رہی ہیں وہ لوگ کہ جو ایک ایک پیسے کے ساتھ (ایک ایک درہم و دینار سے) سختی کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے، اور معمولی سے معمولی مادی وسائل و اسباب سے بھی دل کو الگ نہیں کرتے تھے، ان کا اس لمحہ میں ۔ کہ جس میں انہیں ایک ہی مرتبہ سب کو الوداع کہنا پڑے گا، آنکھیں بند ہو جائیں گی اور ایک تاریک اور وحشت ناک مستقبل کی طرف قدم اٹھا رہے ہوں گے ۔ کیا حال ہوگا !

" حیل بینھم و بین مایشتھون " (ان کے اور ان تمام چیزوں کے درمیان کہ جن سے وہ علاقہ و تعلق رکھتے تھے جدائی ڈال دی جائے گی) کے جملہ کے لیے دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں :

پہلی تفسیر تو یہی ہے کہ جو اوپر بیان کی گئی ہے ۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ وہ چاہیں گے کہ ایمان لے آئیں، اور گزشتہ کی تلافی کریں، لیکن ان کے اور ان کی اس خواہش کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی ۔

لیکن پہلی تفسیر " مایشتھون " والے جملے کے معنی کے ساتھ زیادہ مناسب ہے ۔ علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں " انّی لھم التناوش من مکان بعید " کے جملہ میں موت اور عذاب استیصال کے وقت ایمان پر ان کی دسترس نہ ہونے کا مسئلہ بیان ہوا تھا، لہٰذا اس کے تکرار کی ضرورت نہیں تھی ۔

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے مفسرین نے ان آیات کو روز قیامت کے عذاب اور عرصہ محشر میں گنہگاروں کی ندامت سے متعلق جانا ہے ۔ لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آخری زیر بحث آیت میں " کما فعل باشیاعھم من قبل " کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، یہ معنی مناسب نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد موت کا لمحہ، اور خدا کی طرف سے نابود کرنے والے عذاب کا مشاہدہ ہی ہے ۔

٭ ٭ ٭

اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے، اور جان کنی کے لمحات اور دنیا کی نعمتوں سے جدائی کی اپنے نورانی کلمات میں بہت ہی واضح طریقہ سے تصویر کشی کی ہے :

" اجتمعت علیھم سکرة الموت، وحسرة الفوت، ففترت لھا اطرافھم و تغیرت لھا الوانھم !

ثم ازداد الموت فیھم ولوجًا، فحیل بین احدھم و بین منطقه، و انه لبین اھله ینظر ببصره و یسمع باذنه .....!

یفکر فیم افنا عمره ؟ و فیم اذھب دھره ؟ و یتذکر اموالا جمعھا اغمض فی مطالبھا، و اخذھا من مصرحاتھا و مشتبھاتھا .....!

فھو یعض یده ندامة علی ما اصحر له عند الموت من امره، و یزھد

فیما کان یرغب فیہ ایام عمرہ، ویتمنی ان الذی کان یغبطہ بھا ویحسدہ علیھا قد حازھا دونہ !"

"سکرات موت، اور دنیا کی نعمتوں کو ہاتھ سے کھونے کی حسرتیں ان کے اوپر حملہ آور ہو جاتی ہیں، ان کے بدن کے اعضاء سست ہو جاتے ہیں اور ان کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے۔

اس کے بعد موت کا پنجہ ان کے اندر اور زیادہ نفوذ کرنے لگتا ہے۔ اس طرح سے کہ ان کی زبان کام کرنا بند کر دیتی ہے، اس حالت میں کہ وہ اپنے گھر والوں کے درمیان پڑا ہوا ہوتا ہے، آنکھ سے دیکھ رہا ہوتا ہے، اور کان سے سُن رہا ہوتا ہے، (لیکن اس میں بات کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی)۔

وہ یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کو کس راہ میں تباہ کر دیا؟ اپنی زندگی کا وقت کس راہ میں گزارا؟ اس مال و دولت کو یاد کرتا ہے کہ جسے حلال و حرام کی طرف توجہ کیے بغیر جمع کیا تھا، اور اس کے حصول کے طریقے کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچا تھا۔

انگشت حسرت منہ میں رکھتا ہے، اور اپنا ہاتھ پشیمانی سے کاٹتا ہے کیونکہ موت کے وقت وہ مسائل اس پر روشن ہو جاتے ہیں کہ جو اس وقت تک مخفی و پوشیدہ تھے، وہ اس حالت میں ان تمام چیزوں سے کہ جن کے ساتھ وہ زندگی کے ایام میں شدت سے علاقہ اور لگاؤ رکھتا تھا بے اعتناء ہو جائے گا۔ اور یہ آرزو کرے گا کہ اے کاش! وہ لوگ کہ جو اس کی ثروت اور مال و دولت پر رشک اور حسد کیا کرتے تھے یہ مال اس کی بجائے ان کے قبضہ میں ہوتا"[1]

آخر میں آخری زیر بحث آیت کے آخری جملہ میں کہتا ہے کہ:

"ان سب مسائل کا سبب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شک و شبہ کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے، لہٰذا طبعاً اس قسم کا انجام ان کے انتظار میں تھا" (انھم کانوا فی شک مریب)۔

پروردگارا! ہمیں ان لوگوں سے قرار دے کہ جو اوقات کے ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں، اور جو کچھ ان سے فوت ہو چکا ہے اس کی

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۰۹۔

تلافی کرتے ہیں۔

بار الٰہا! دنیا کا جال بڑا سخت ہے اور دشمن طاقت ور اور قوی ہے۔ اگر تیرا لطف وکرم شاملِ حال نہ ہو اور ہماری مدد نہ کرے تو ہمارا حال خراب ہے۔

خداوندا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جو نعمتوں کے ملنے کے وقت ان کا شکر ادا کرتے ہیں، اور مغرور و غافل نہیں ہوتے، اور مصیبتوں کے نازل ہونے کے وقت آہ وزاری نہیں کرتے، بلکہ عبرت حاصل کرتے ہیں۔

سورہ سبا کا اختتام

اول اسفندیار ۱۳۶۲ مطابق ۱۷ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ

سورۂ فاطر

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۴۵ آیات ہیں

شروع : ۱۸/۱۶/۱۴۰۴
۲/اسفندیار/۱۳۶۲

بسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۂ فاطر کے مضامین

یہ سورہ کہ جسے کبھی سورہ فاطر اور کبھی سورۂ ملائکہ کا نام دیتے ہیں (اس کے آغاز کو مدّنظر رکھتے ہوئے کہ جو "فاطر" اور "ملائکہ" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے) مکی سورتوں میں سے ہے، اگرچہ بعض نے اس کی دو آیات کا استثناء کیا ہے اور انہیں مدنی شمار کیا ہے (آیہ ۲۹-۳۲) لیکن اس کے استثناء کی واضح دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔

چونکہ یہ سورہ مکی ہے لہٰذا مکی سورتوں کے عام مضامین یعنی "مبداء" و "معاد"، "شرک کے ساتھ مبارزہ"، "رسالت انبیاء کی دعوت"، "پروردگار کی نعمتوں کا تذکرہ" اور "روزِ جزاء میں مجرموں کا انجام" اس میں پورے طور پر منعکس ہیں۔

اس سورہ کی آیات کو پانچ حصّوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اس سورہ کی آیات کا ایک اہم حصہ عالم ہستی میں خدا کی عظمت کی نشانیوں اور توحید کے دلائل کے سلسلہ میں گفتگو کرتا ہے۔

۲۔ اس کا دوسرا حصّہ پروردگار کی ربوبیت اور سارے جہان کے لیے اور خصوصاً انسان کے بارے میں اس کی تدبیر، اس کی خالقیت و رازقیت اور مٹی سے انسان کی خلقت اور اس کے تکامل و ارتقاء سے بحث کرتا ہے۔

۳۔ اس کا تیسرا حصّہ معاد اور آخرت میں نتائج اعمال اور اس جہان میں خدا کی رحمت کی وسعت اور مستکبرین کے بارے میں اس کی تخلف ناپذیر سنت سے متعلق ہے۔

۴۔ اس کی آیات کا ایک حصّہ انبیاء کی رہبری اور ہٹ دھرم اور سخت قسم کے دشمنوں کے ساتھ مسلسل اور متواتر مبارزہ اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ کی دلداری اور تسلی کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔ آخری حصّہ میں خدائی مواعظ اور پند و نصائح کا بیان ہے، یہ بیان مختلف امور کے بارے میں گزشتہ مباحث کی تکمیل کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس ساری سورت کو ایک ہی حلقہ میں خلاصہ کیا ہے اور وہ خدا کی قاہریت کا مسئلہ ہے[1] یہ بات اگرچہ اس سورہ کی کچھ قابلِ توجہ آیات کے ایک حصّہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتی ہے

---

[1] تفسیر فی ظلال، آغاز سورہ فاطر۔

لیکن اس کے باوجود اس سورہ میں دوسری مختلف بحثوں کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سورہ کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

"من قرأ سورة الملائكة دعته يوم القيامة ثلاثة ابواب من الجنّة ان ادخل من ای الابواب شئت"

"جو شخص سورۂ فاطر کو پڑھے تو قیامت کے دن جنت کے دروازوں میں سے تین دروازے اسے اپنی طرف دعوت دیں گے کہ وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے"[1]

"اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ جنت کے دروازے وہی عقائد اور اعمالِ صالحہ ہیں کہ جو بہشت میں داخل ہونے کا سبب بنتے ہیں، جیسا کہ بعض روایات میں باب المجاہدین کے عنوان سے ذکر ہوا ہے، ممکن ہے کہ یہ روایت توحید، معاد اور رسالتِ پیغمبر کے اعتقاد کے تین دروازوں کی طرف اشارہ ہو۔"

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

"قرآن مجید میں دو سورتیں (یکے بعد دیگرے قرار پائی ہیں) سورہ سبا و سورہ فاطر کہ جو "الحمد للہ" سے شروع ہوتی ہیں، جو شخص انہیں رات کو پڑھے گا تو خدا اسے اپنی حمایت کے سائے میں حفاظت کرے گا، اور جو شخص دن میں پڑھے گا تو اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، اور خدا اسے اس قدر خیرِ دنیا و آخرت عطا فرمائے گا کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا ہوگا، اور کسی نے اس کی تمنا تک نہ کی ہوگی"[2]

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قرآن عمل پروگرام ہے اور اس کی تلاوت کرنا تفکر اور ایمان کا مقدمہ اور تمہید ہے، اور وہ اس کے معنی و مفہوم پر عمل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اور یہ سب اجر اور صلے بھی اسی کی بنا پر ہیں اور انہیں شرائط کے ساتھ حقیقت بنتے ہیں۔ (غور کیجئے)

---

[1] مجمع البیان، آغاز سورہ فاطر۔

[2] ثواب الاعمال مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۴۵۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

(۲) مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

(۳) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ڮ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

(۱) حمد و ثنا مخصوص اس خدا کے لیے ہے کہ جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، وہی خدا کہ جس نے فرشتوں کو رسول قرار دیا ہے کہ جو دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں، وہ جتنا چاہتا ہے آفرینش میں اضافہ کر دیتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲) خدا جس رحمت کو لوگوں پر کھول دے اُسے کوئی نہیں روک سکتا، اور خدا جس

کو روک لے اس کے سوا کوئی شخص اس کے بھیجنے پر قدرت نہیں رکھتا، اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

(۳) اے لوگو! تم اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو، کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق ہے کہ جو آسمان و زمین سے تمہیں روزی دے؟ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اس حالت میں تم باطل کی طرف کس طرح منحرف ہوتے ہو۔

تفسیر

بند دروازوں کا کھولنے والا وہی ہے

اس سورہ کی ابتداء سورۂ "حمد" و "سبا" اور "کہف" کی طرح پروردگار کی حمد سے ہوتی ہے، اس کی حمد و ثنا وسیع عالمِ ہستی کی خلقت و آفرینش کی بناء پر فرماتا ہے: "حمد مخصوص ہے اس خدا کے ساتھ کہ جو آسمان اور زمین کا خالق ہے" اور عالمِ ہستی کی تمام نعمات و مواہب کا سرچشمہ اسی کا وجود ذیجود ہے (الحمد للہ فاطر السّماوات والارض)۔

"فاطر" فطور کے مادہ سے اصل میں شگافتہ کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ موجودات کی آفرینش خلقت عدم کے شگافتہ ہونے اور نورِ ہستی کے باہر آنے کی مانند ہے اس لیے یہ تعبیر خلقت و آفرینش کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ خصوصاً جدید علوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ عالمِ ہستی کا مجموعہ ابتداء میں ایک ہی ٹکڑا تھا کہ جو بتدریج شگافتہ ہوا اور اس نے مختلف حصے جدا ہوئے، خدا کی ذاتِ پاک کے لیے لفظ "فاطر" کا اطلاق اپنے اندر زیادہ واضح اور روشن مفہوم رکھتا ہے۔[1]

ہاں! ہم اس کی خالقیت کی بناء پر اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں، کیونکہ جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے، اور کوئی شخص اس کے علاوہ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتا۔

اور چونکہ اس عالم کی تدبیر ـــ اس بناء پر کہ یہ عالم، عالمِ اسباب ہے ـــ پروردگار کی طرف سے فرشتوں کے ذمہ لگائی ہے، لہٰذا بلا فاصلہ ان کی خلقت اور ان کی عظیم قدرتوں کے متعلق کہ جو پروردگارِ عالم

---

[1] "فاطر" اور "فطور" کے معنی کے بارے میں چھٹی جلد ـــ (سورہ ابراہیم) کی آیہ ۱۰ کے ذیل میں، اور اسی طرح تیسری جلد ـــ (سورہ انعام کی آیہ ۱۴ کے ضمن میں بھی) ہم نے بیان کیا ہے۔

نے انہیں عطا کی ہیں گفتگو کرتا ہے : "وہی خدا کہ جس نے فرشتوں کو رسول قرار دیا ہے وہ دو دو تین تین اور چار چار پروں کے حامل ہیں" (جاعل الملائکۃ رسلاً اولی اجنحۃ مثنٰی وثلاث ورباع)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : "خدا جتنا چاہتا ہے خلقت میں اضافہ کر دیتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے" (یزید فی الخلق ما یشاء ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر)۔

یہاں تین سوال پیدا ہوتے ہیں :

پہلا سوال یہ ہے کہ ملائکہ اور فرشتوں کی رسالت کہ جو اوپر والی آیت میں بیان کی گئی ہے، کس چیز میں ہے ؟ کیا یہ رسالت تشریعی ہے ؟ یعنی خدا کی طرف سے انبیاء کی طرف اس کے پیغام کا لانا ہے یا یہ رسالت تکوینی ہے ؟ یعنی عالم آفرینش میں مختلف فرائض کی ذمہ داری کا سپرد ہونا، جیسا کہ نکات کی بحث میں اس کی طرف اشارہ ہوگا۔ یا یہ دونوں جہت ہیں ؟

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ جملے میں آسمان اور زمین کی خلقت کے بارے میں گفتگو تھی، اور زیر بحث جملے میں فرشتوں کے متعدد پروں کے متعلق گفتگو ہے، کہ جو اُن کی قدرت کی نشاندہی کرتا ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے بھی کہ تمام فرشتوں کے لیے رسالت کا بیان ہوا ہے۔

(یہ بات قابل توجہ ہے کہ "الملائکۃ" ایسی جمع ہے کہ جس کے ساتھ "الف و لام" آیا ہے لہٰذا یہ عموم کا معنی دیتا ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "رسالت" ایک وسیع وعریض معنی میں استعمال ہوا ہے کہ جو "رسالت تشریعی" اور "رسالت تکوینی" دونوں کو شامل ہے۔

رسالت کا اطلاق "تشریعی رسالت" پر اور انبیاء کی طرف وحی کے پیغام لانے پر، قرآن میں بہت زیادہ بیان ہوا ہے لیکن اس کا اطلاق "رسالت تکوینی" پر بھی کم نہیں ہے۔

سورہ یونس کی آیہ ۲۱ میں بیان ہوا ہے کہ : "ان رسلنا یکتبون ما تمکرون" "ہمارے رسول (ہمارے فرشتے) تمہارے مکر و فریب کو لکھتے رہتے ہیں"۔

اور سورۂ انعام کی آیہ ۶۱ میں بیان ہوا ہے کہ : "حتی اذا جاء احدکم الموت توفتہ رسلنا" (جس وقت تم میں سے کسی کی موت کا وقت آن پہنچتا ہے تو ہمارے رسول اس کی رُوح قبض کرتے ہیں)۔

سورۂ عنکبوت کی آیہ ۳۱ میں ان فرشتوں کے بارے میں کہ جو قوم لوط کی سرزمین کو زیر و زبر (تہ و بالا) کرنے پر مامور تھے یہ بیان ہوا ہے کہ : "ولما جاءت رسلنا ابراھیم بالبشری قالوا انا مھلکوا اھل ھذہ القریۃ ان اھلھا کانوا ظالمین" (جس وقت ہمارے رسول ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم اس آبادی میں رہنے والوں کو ہلاک کر دیں گے، کیونکہ وہ ستمگر لوگ ہیں)۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فرشتوں کے ذمہ جو مختلف کام لگائے گئے ہیں وہ

ان کی رسالتیں شمار ہوتے ہیں، اس بنا پر رسالت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ فرشتوں کے پَروں سے مراد، اور وہ بھی دو دو، تین تین اور چار چار، کیا ہے؟

بعید نہیں ہے کہ پر و بال سے مراد یہاں قدرت اور حرکت کی توانائی ہو کہ جس سے بعض دوسروں کی نسبت برتر اور بیشتر رکھتے ہوں۔

لہٰذا وہ بال و پَر میں ان کے لیے سلسلۂ مراتب کا قائل ہوا ہے کہ بعض چار بال (مثنیٰ۔ دو دو) اور بعض چھ بال اور بعض آٹھ بال رکھتے ہیں۔

"اجنحة" "جناح" (بروزن جمال) کی جمع ہے، جو پرندوں کے پَروں کے معنی میں ہے کہ جو انسان کے ہاتھوں کی طرح ہیں، اور چونکہ پَر پرندوں کی نقل و انتقال اور ان کی حرکت و فعالیت کا ذریعہ ہوتے ہیں لہٰذا کبھی یہ لفظ فارسی یا عربی میں حرکت و اعمال کے وسیلہ اور قدرت و توانائی کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے بال و پَر جل گئے، جو اس بات کا کنایہ ہے کہ اس سے حرکت و توانائی کی قوت سلب ہوگئی ہے، یا یہ کہ اُس نے فلاں شخص کو اپنے پَر و بال کے نیچے لے لیا، یا یہ کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ علم و عمل کے دو پَروں کے ساتھ پرواز کرے' اور اس قسم کی تمام تعبیرات کہ جو سب کی سب اس لفظ کے کنائی معنوں کو بیان کرتی ہیں۔

اور دوسرے موارد میں بھی کچھ تعبیرات، مثلاً: "عرش"۔ "کرسی"۔ اور "لوح" و "قلم"۔ ایسی نظر آتی ہیں کہ جن میں عام طور پر ان کے معنوی مفہوم کی طرف ہی توجہ ہے نہ کہ ان کے مادی جسم کی طرف۔

البتہ قرینہ کے بغیر قرآن کے الفاظ کو ظاہری معنی کے غیر پر حمل نہیں کرنا چاہیئے لیکن جہاں واضح قرائن پائے جاتے ہوں وہاں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جبرائیل (وحیٔ خدا پہنچانے والا) کے چھ سو پَر ہیں اور جس وقت اس حالت میں پیغمبر اسلامؐ سے ملاقات کی تو زمین و آسمان کے درمیانی فاصلہ کو پُر کر رکھا تھا۔[1]

یا یہ کہ "خدا کا ایک فرشتہ ہے کہ جس کے کان کی لَو سے آنکھ تک کا فاصلہ پانچ سو سال کی راہ ہے (تیز پرواز) پرندے کے ذریعہ"۔[2]

یا یہ کہ، نہج البلاغہ میں جس وقت پروردگار کے فرشتوں کی عظمت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تو فرماتے ہیں کہ:

"ومنهم الثابتة فی الارضين السفلی اقدامهم، والمارقة من

---

[2] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۴۹۔

السماء العليا اعناقهم، والخارجة من الاقطار اركانهم، والمناسبة لقوائم العرش اكتافهم "

"بعض فرشتے اس قسم کی عظمت رکھتے ہیں کہ ان کے پاؤں تو زمین کے نچلے طبقات میں قائم ہیں اور ان کی گردن آسمان بریں سے برتر ہے، ان کے وجود کے ارکان اقطار عالم سے باہر نکلے ہوتے ہیں اور ان کے کندھے عرشِ پروردگار کو اٹھانے کے لیے متناسب ہیں"[1]

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی تعبیرات کو مادی جسمانی پہلوؤں پر حمل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ یہ ان کی معنوی عظمت اور جہاتِ قدرت کو بیان کرنے والی تعبیرات ہیں۔

اصولی طور پر ہم جانتے ہیں کہ پَر صرف زمین کی فضا میں اڑنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، کیونکہ کرۂ زمین کے اطراف کو دباؤ ڈالنے والی ہوا نے گھیر رکھا ہے، اور پرندے اپنے پَروں کے ذریعہ امواجِ ہوا پر قرار پاتے ہیں، اور نیچے اوپر آجا سکتے ہیں، لیکن اگر زمین کی فضا کے محیط سے خارج ہو جائیں کہ جس میں ہوا نہیں ہے، تو وہاں پر پَر و بال اڑنے کے لیے معمولی سے معمولی تاثیر بھی نہیں رکھتے، اور اس لحاظ سے وہ ٹھیک دوسرے اعضاء کے مانند ہوتے ہیں۔

اس سے قطع نظر وہ فرشتہ کہ جس کے پاؤں زمین کی گہرائیوں میں ثبت ہیں اور اس کا سر برترین آسمان سے بالاتر ہے تو اُسے جسمانی پرواز کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اس بارے میں بحث کہ فرشتہ جسمِ لطیف ہے یا مجردات میں سے ہے ایک دوسری بحث ہے کہ جس کی طرف انشاء اللہ نکات کی بحث میں اشارہ ہوگا۔

یہاں پر صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ہم جان لیں کہ پَر و بال فعالیت اور حرکت و قدرت کا ذریعہ ہیں۔ اور اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے اوپر والے قرائن کافی گویا ہیں، جیسا کہ عرش و کرسی کی بحث میں ہم نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ اگرچہ "بلند پائے والے" اور "چھوٹے پائے والے" تختوں کے معنی میں ہے، لیکن مسلّمہ طور پر اس سے مراد عالم کے مختلف جہات میں پروردگار کی قدرت ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"الملائكة لا يأكلون ولا يشربون ولا ينكحون، وانما يعيشون بنسيم العرش"

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۔

"فرشتے نہ تو کھانا کھاتے ہیں اور نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی شادی بیاہ کرتے ہیں، وہ صرف نسیم عرش سے زندہ ہیں"۔[1] [2]

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا " یزید فی الخلق مایشاء " "وہ خلقت میں جتنا چاہتا ہے اضافہ کردیتا ہے" فرشتوں کے پَروبال کے اضافہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، یا یہ وسیع معنی رکھتا ہے، کہ جو اس کو بھی شامل ہے اور باقی افزائشوں کو بھی کہ جو آفرینش موجودات میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔

ایک طرف تو جملہ کا مطلق ہونا، اور دوسری طرف بعض ایسی اسلامی روایات کہ جو اوپر والی آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔

اُن میں سے ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا کہ:

"هوالوجه الحسن، والصوت الحسن، والشعر الحسن"

"اس سے مراد خوبصورت چہرہ، اچھی آواز اور خوبصورت بال ہیں"۔[3]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ:

"حسنوا القراٰن باصواتکم فان الصوت الحسن یزید القراٰن حسنا، وقرأ یزید فی الخلق مایشاء"

"قرآن کو خوبصورت آواز کے ساتھ زینت بخشو، کیونکہ اچھی آواز قرآن کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے، پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی "یزید فی الخلق مایشاء"

٭ ٭ ٭

پروردگار کی خالقیت اور فرشتوں کی رسالت کا بیان کرنے کے بعد کہ جو فیض خدا کا واسطہ ہیں، اپنی رحمت کو بیان فرمارہا ہے کہ جو تمام عالم ہستی کی بنیاد ہے، فرماتا ہے کہ: "خدا جس رحمت کو لوگوں کے لیے کھول دے اُسے کوئی نہیں روک سکتا" (ما یفتح الله للناس من رحمة فلا ممسك لها)۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نورالثقلین جلد ۴ ص ۳۴۹۔

[2] عرش کے معنی کے بارے میں ہم نے چھٹی جلد ص .... (سورہ اعراف ذیل آیہ ۵۴) کے ذیل میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

[3] مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں، قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس حدیث کو زیر بحث آیت کے ذیل میں پیش کیا ہے۔

"اور جسے روک لے اس کے سوا کوئی شخص اس کے بھیجنے پر قدرت نہیں رکھتا" (وما یمسك فلا مرسل له من بعده)۔

"کیونکہ وہ ایسا قدرت والا ہے کہ جو شکست ناپذیر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ حکیم و آگاہ ہے" (وهو العزيز الحكيم)۔

خلاصہ یہ ہے کہ رحمت کے تمام خزانے اس کے پاس ہیں، اور جس کو وہ لائق سمجھتا ہے اس کو مشمولِ رحمت کر لیتا ہے، اور جہاں اس کی حکمت کا تقاضا ہو اس کے دروازے کھول دیتا ہے، اگر تمام جہانوں کے لوگ مل کر یہ چاہیں کہ اس دروازے کو کہ جسے اس نے کھولا ہے بند کر دیں یا جس دروازے کو اس نے بند کیا ہے اُسے کھول دیں تو ان میں ہرگز یہ قدرت نہیں ہوگی، یہ حقیقت میں توحید کی ایک شاخ ہے کہ جو دوسری شاخوں کی بنیاد ہے۔ (غور کیجئے)

اس معنی کے مشابہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی بیان ہوا ہے، جہاں کہتا ہے کہ: "وان یمسسك الله بضر فلا کاشف له الا هو وان یردك بخیر فلا راد لفضله یصیب به من یشاء من عباده وهو الغفور الرحیم" "اگر خدا (امتحان یا غلطی کی سزا کے لیے) تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی بھی اسے برطرف نہیں کر سکتا، اور اگر وہ تیرے لیے کسی خیر اور بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی شخص اس کے فضل سے مانع نہیں ہوگا، وہ اپنے بندوں میں سے جس شخص کو چاہے اپنا فضل پہنچاتا ہے، اور وہ غفور و رحیم ہے" (یونس ـ ۱۰۷)

چند توجہ طلب امور

۱۔ "یفتح" کی تعبیر "فتح" کے مادہ سے کھولنے کے معنی میں ہے، یہ رحمتِ الٰہی کے خزانوں کے وجود کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، توجہ طلب بات یہ ہے کہ یہ خزانے ایسے ہیں کہ جو کھلنے کے ساتھ ہی مخلوقات پر جاری ہو جاتے ہیں اور کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور کوئی شخص اس سے مانع نہیں ہو سکتا۔

رحمت کے کھولنے کو اس کے امساک اور روکنے پر مقدم رکھنا اس بنا پر ہے کہ ہمیشہ خدا کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

۲۔ "رحمت" کی تعبیر بہت ہی وسیع اور کشادہ معنی رکھتی ہے کہ جو عالم کے مواہب اور نعمات کو شامل ہے، کبھی معنوی پہلو رکھتی ہے اور کبھی مادی پہلو، اسی بنا پر جب کبھی کوئی انسان تمام ظاہری دروازوں کو اپنے سامنے بند دیکھتا ہے تو پھر بھی وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ رحمتِ الٰہی اس کے دل و جان میں جاری و ساری ہے۔ لہٰذا وہ خوش و خرم اور آرام و مطمئن ہے، اگرچہ وہ زندان کی کال کوٹھری

میں گرفتار ہو۔

اس کے برعکس کبھی تمام ظاہری دروازوں کو انسان اپنے اوپر کھلا ہوا دیکھتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے رحمت الٰہی کے دروازے اس کی جان پر بند ہو گئے ہیں، لہٰذا وہ اپنے آپ کو اس طرح تنگی اور دباؤ میں محسوس کرتا ہے کہ جیسے دنیا اپنی پوری وسعت کے باوجود اس کے لیے ایک تاریک اور وحشت ناک زندان ہے، اور یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو بہت سے لوگوں کے لیے حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔

۳۔ دو اوصاف "عزیز و حکیم" کی تعبیر رحمت کے "ارسال" اور "امساک" پر اس کی قدرت کو بیان کرتی ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کھولنا اور باندھنا ہر جگہ حکمت کی بنیاد پر ہے، کیونکہ اس کی قدرت اس کی حکمت سے ملی ہوئی ہے۔

بہرحال اس آیت کے مفہوم و مضمون کی طرف توجہ ایک مومن انسان کو اس طرح سکون و آرام پہنچاتی ہے کہ وہ تمام حوادث و مصائب کے مقابلہ میں کھڑا ہو جاتا ہے، اور کسی مشکل سے نہیں ڈرتا، اور کسی کامیابی سے مغرور نہیں ہوتا۔[1]

ٹ

بعد والی آیت میں "توحید در عبادت" کے مسئلہ کی طرف "توحید در خالقیت و رازقیت" کی اساس پر اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: "اے لوگو! اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو" (یا ایھا الناس اذکروا نعمۃ اللہ علیکم)۔

ٹھیک طریقہ سے غور و فکر کرو کہ یہ تمام انعامات اور برکات، اور زندگی کے یہ تمام وسائل و امکانات کہ جو تمہارے اختیار میں قرار دیئے گئے ہیں اور تم ان نعمتوں کے اندر ڈوبے ہوئے ہو، ان کا اصل پیدا کرنے والا کون ہے اور ان کا سرچشمہ کیا چیز ہے؟

"کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق آسمان و زمین سے تمہیں روزی دیتا ہے" (ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض)۔

وہ کون ہے کہ جو سورج کی حیات بخش روشنی اور بارش کے زندہ کرنے والے قطرات اور بادِ نسیم

---

[1] قابل توجہ بات یہ ہے کہ "فلا ممسک لھا" کی ضمیر مؤنث کی شکل میں ہے اور "فلا مرسل لہ" میں مذکر کی شکل میں ہے، چونکہ پہلی کا مرجع لفظ "رحمت" ہے، اور دوسری کا "ما" ہے، علاوہ ازیں "من بعدہ" ظاہراً خدا کی طرف لوٹتا ہے یعنی خدا کے سوا کوئی اس کے کھولنے پر قادر نہیں ہے، یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ ضمیر "امساک" کی طرف لوٹے یعنی "من بعد امساک اللہ" کہ جو معنی کے لحاظ سے چنداں فرق نہیں رکھتا۔

کی روح پرور موجیں آسمان سے تمہاری طرف بھیجتا ہے؟ اور کون ہے وہ کہ جو زمین کے معادن، ذخائر، اور مواد غذائی، انواع و اقسام کے نباتات اور پھل اور دوسری برکات اس زمین سے تمہارے لیے نکالتا ہے۔

اب جبکہ تم اس بات کو جانتے ہو کہ ان سب برکات کا سرچشمہ وہی ہے تو پھر جان لو کہ :

"اس کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں ہے اور عبادت و پرستش صرف اسی کی ذات پاک کے لائق ہے" (لا الٰہ الّا ھو)۔

"اس حالت میں تم کس طرح حق کی راہ سے باطل کی طرف منحرف ہوتے ہو اور اللہ کے بجائے بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہو" (فانّٰی تؤفکون)۔

"تؤفکون" "افک" (بروزن فکر) کے مادہ سے ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ "افک" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں کہ جو اپنی اصلی حالت سے بدل جائے لہٰذا ہر اُس بات کو کہ جو حق سے انحراف پیدا کرے "افک" کہتے ہیں، اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جھوٹ اور تہمت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ اسی لحاظ سے ہے، البتہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ لفظ جھوٹ اور بڑی بڑی تہمتوں کو بیان کرتا ہے۔

نکتہ

ملائکہ قرآن مجید میں

قرآن مجید میں ملائکہ کا بہت زیادہ بیان ہوا ہے۔

بہت سی آیات قرآن فرشتوں کی صفات، خصوصیات، فرائض اور وظائف اور ذمہ داریوں کے سلسلہ میں گفتگو کرتی ہیں، یہاں تک کہ قرآن نے ملائکہ پر ایمان رکھنے کو خدا، انبیاء اور کتب آسمانی پر ایمان رکھنے کی ردیف میں قرار دیا ہے، اور یہ چیز اس مسئلہ کی بنیادی اہمیت کی دلیل ہے: (اٰمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل اٰمن باللّٰہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ)

"پیغمبر اسلام اس چیز پر کہ جو ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے ایمان لاتے، اور مومنین بھی خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور رسولوں سب پر ایمان لاتے ہیں" (بقرہ۔ ۲۸۵)

اس میں شک نہیں کہ فرشتوں کا وجود امور غیبیہ میں سے ہے کہ جس کے ثابت کرنے کے لیے ان صفات و خصوصیات کے ساتھ ادلہ نقلیہ کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں ہے اور ایمان بالغیب کے حکم کے مطابق انہیں قبول کرنا چاہیئے۔

قرآن مجید ان کی خصوصیات کو مجموعی طور پر اس طرح شمار کرتا ہے:

۱۔ فرشتے عاقل اور باشعور موجودات ہیں اور خدا کے گرامی قدر اور معزز بندے ہیں: (بل عباد مکرمون) ۔ (انبیاء۔۲۶)

۲۔ وہ خدا کے تابع فرمان ہیں اور ہرگز اس کی معصیت و نافرمانی نہیں کرتے (لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون) (انبیاء۔۲۷)

۳۔ وہ خدا کی طرف سے اہم اور بہت ہی متنوع ذمہ داریاں اور وظائف اپنے ذمہ رکھتے ہیں۔

ایک گروہ حاملین عرش کا ہے۔ (حاقہ۔ ۱۷)

ایک گروہ مدبر امر ہے، (نازعات۔ ۵)

ایک گروہ قابض ارواح فرشتوں کا ہے۔ (اعراف۔۳۷)

ایک گروہ اعمال انسانی کا نگران ہے۔ (سورہ انفطار۔ ۱۰ تا ۱۲)

ایک گروہ انسان کی خطرات و حوادث سے حفاظت کرتا ہے۔ (انعام۔۶۱)

ایک گروہ سرکش اقوام کو عذاب اور سزا دینے پر مامور ہے۔ (ہود۔ ۷۷)

ایک گروہ جنگوں میں خدا کی طرف سے مومنین کی مدد کرنے والا ہے۔ (احزاب۔ ۹)

اور بالآخر ایک گروہ انبیاء کے لیے وحی کا پہنچانے والا اور ان کے پاس کتب آسمانی کا لانے والا ہے۔ (نحل۔ ۲)

اگر ہم چاہیں کہ ان کی ایک ایک ذمہ داری اور ماموریت کو شمار کریں تو بحث طویل ہو جائے گی۔

۴۔ وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۵ میں بیان ہوا ہے: (والملائكة يسبحون بحمد ربهم ويستغفرون لمن في الارض) "فرشتے اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاتے ہیں، اور جو لوگ زمین میں ہیں ان کے لیے استغفار کرتے ہیں"۔

۵۔ اس کے باوجود انسان تکامل و ارتقاء کی استعداد کے مطابق ان سے بھی برتر و افضل تر ہے، یہاں تک کہ تمام فرشتے بغیر استثناء کے آدمؑ کی خلقت کے وقت اس کے سجدے میں گر پڑے، اور آدمؑ ان کے معلم قرار پائے۔ (بقرہ۔ ۳۰۔ ۳۴)

۶۔ وہ کبھی انسان کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور انبیاء بلکہ غیر انبیاء کے سامنے بھی آتے ہیں، جیسا کہ سورہ مریم میں بیان ہوا ہے کہ: "ایک عظیم خدائی فرشتہ ایک موزوں اور ٹھیک ٹھاک انسان کی شکل میں مریم کے سامنے ظاہر ہوا" (فارسلنا اليها روحنا فتمثل لها بشرا سويًّا)۔ (مریم۔۱۷)

دوسرے مقام پر انسانوں کی شکل میں ابراہیمؑ و لوطؑ پر ظاہر ہوئے۔ (ہود۔ ۶۹۔ ۷۷)

یہاں تک کہ ان آیات کے ذیل میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم لوط نے بھی انہیں موزوں انسانی شکلوں میں دیکھا تھا۔ (ہود۔ ۷۸)

کیا چہرۂ انسانی میں ظہور ایک واقعیت عینی ہے، یا قوتِ ادراک میں تمثیل و تصرف ہے؟ آیات قرآنی کا ظاہر پہلا معنی ہے۔ اگرچہ بعض بزرگ مفسرین نے دوسرے معنی کا انتخاب کیا ہے۔

۷۔ روایاتِ اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ کسی طرح بھی انسان کے ساتھ قابلِ قیاس نہیں ہیں جیسا کہ ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس وقت لوگوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ کیا فرشتوں کی تعداد زیادہ ہے یا انسانوں کی تو آپؐ نے فرمایا:

> "قسم ہے اس خدا کی کہ جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، آسمانوں میں خدا کے فرشتوں کی تعداد زمین کے خاک کے ذرات سے بھی زیادہ ہے، اور آسمان میں ایک قدم رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہاں ایک فرشتہ خدا کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے۔"[1]

۸۔ وہ نہ غذا کھاتے ہیں، نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی نکاح و ازدواج کرتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

> "ان الملائكة لا يأكلون ولا يشربون ولا ينكحون وانما يعيشون بنسيم العرش"

> "فرشتے نہ کھانا کھاتے ہیں، نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی نکاح و ازدواج کرتے ہیں، وہ تو صرف نسیم عرش سے زندگی بسر کرتے ہیں"[2]

۹۔ نہ انہیں نیند آتی ہے نہ سستی و غفلت ان پر طاری ہوتی ہے جیسا کہ حضرت علیؑ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ:

> "ليس فيهم فترة، ولا عندهم غفلة، ولا فيهم معصية .... لا يغشاهم نوم العيون ولا سهو العقول، ولا فترة الابدان، لم يسكنوا الاصلاب ولم تضمهم الارحام"

> "نہ اُن میں سستی ہے اور نہ غفلت، نہ عصیان و نافرمانی ہے اور نہ ہی ان پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان کی عقل سہو و نسیان میں گرفتار نہیں ہوتی، ان کا بدن سستی کی طرف مائل نہیں ہوتا، اور وہ باپوں کے صلب اور ماؤں کے رحم میں

---

[1] بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۷۶ (حدیث ۔ ۷)۔ اس سلسلے میں اور دوسری بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں۔

[2] بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۷۴ (حدیث ۴)۔

قرار نہیں پاتے۔[1]

۱۰۔ وہ مختلف مقامات اور متفاوت مدارج رکھتے ہیں، بعض ہمیشہ رکوع میں ہیں، اور بعض ہمیشہ سجدے میں ہیں۔

"ما منّا الّا لہ مقام معلوم و انّا لنحن الصافّون و انّا لنحن المسبّحون"

"ہم میں سے ہر ایک معلوم مقام رکھتا ہے، ہم ہمیشہ صف کشیدہ اس کے فرمان کے منتظر رہتے ہیں اور مسلسل اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں" (صافات ۱۶۴ تا ۱۶۶)

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"وان للہ ملائکۃ رکعًا الی یوم القیامۃ و ان اللہ ملائکہ سجدًا الی یوم القیامۃ"

"خدا کے کچھ فرشتے ایسے ہیں کہ جو قیامت تک رکوع میں ہیں اور کچھ فرشتے ایسے ہیں کہ جو قیامت تک سجدے میں ہیں"۔[2]

ملائکہ کے اوصاف اور ان کے اصناف سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرنے کے لیے کتاب "السماء والعالم"۔ بحار الانوار، ابواب الملائکہ (جلد ۵۹ ص ۱۴۴ تا ۳۲۶) کی طرف رجوع فرمائیں، اسی طرح نہج البلاغہ خطبہ ہائے اوّل و ۹۱۔ خطبہ اشباح: ۱۰۹ و ۱۷۱ سے رجوع کریں۔

٭ ٭ ٭

کیا ان اوصاف کے باوجود کہ جو فرشتوں کے بارے میں بیان ہوتے ہیں وہ کوئی مجرد وجود ہیں یا مادی؟

اس میں شک نہیں کہ وہ ان اوصاف کے ساتھ اس کثیف عنصری مادہ سے تو نہیں ہو سکتے، لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے، کہ وہ اجسام لطیفہ سے خلق ہوتے ہیں، ایسے اجسام کہ جو اس عام مادہ سے مافوق ہو کہ جس سے ہم آشنا نہیں۔

فرشتوں کے لیے "تجردِ مطلق" کا اثبات، حتیٰ زمان و مکان اور اجزاء سے "تجرد" کوئی آسان کام نہیں ہے، اور اس مسئلہ کے بارے میں تحقیق بھی کوئی زیادہ فائدہ مند نہیں ہے، زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم فرشتوں کو ان اوصاف کے ساتھ کہ جن کے ساتھ قرآن اور مسلّمہ روایاتِ اسلامی نے ان کی توصیف کی

---

[1] بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۷۵۔

[2] بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۷۴۔

ہے انہیں پہچانیں، اور انہیں خدا کی عظیم اور عمدہ موجودات میں سے ایک عظیم نوع سمجھیں، بغیر اس کے کہ ہم ان کے لیے مقام بندگی اور عبودیت کے سوا کسی اور مقام و مرتبہ کے ان کے لیے قائل ہوں اور انہیں خلقت یا عبادت میں خدا کا شریک سمجھیں کیونکہ یہ شرک اور کفر محض ہے۔

فرشتوں کے بارے میں ہم اسی قدر بحث پر قناعت کرتے ہیں اور اس کی تفصیل ان کتب کے حوالہ کرتے ہیں کہ جو خصوصیات کے ساتھ اس سلسلہ میں لکھی گئی ہیں۔

تورات کی بہت سی عبارتوں میں فرشتوں کو "خداؤں" کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کہ جو شرک آلود تعبیر ہے۔ اور موجودہ تورات کی تحریف کی نشانیوں میں سے ہے، لیکن قرآن مجید اس قسم کی تعبیروں سے پاک اور منزہ ہے۔ کیونکہ قرآن ان کے لیے مقام بندگی و عبادت' اور احکام و فرامینِ الٰہی کے اجراء کے سوا اور کسی مقام کا قائل نہیں ہوا ہے۔ یہاں تک کہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی مختلف آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانِ کامل کا مقام فرشتوں سے والاتر اور بالاتر ہے۔

(۴) وَاِنۡ یُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ‌ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ○

(۵) يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا ‌ۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ ○

(۶) اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَـكُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا‌ ؕ اِنَّمَا يَدۡعُوۡا حِزۡبَهٗ لِيَكُوۡنُوۡا مِنۡ اَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِؕ ○

(۷) اَلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ۖ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ كَبِيۡرٌ ○

ترجمہ

(۴) اگر وہ تجھے جھٹلائیں (توغم نہ کرو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) تجھ سے پہلے جو پیغمبر تھے انہیں بھی جھٹلایا گیا تھا، اور تمام کام خدا ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

(۵) اے لوگو! خدا کا وعدہ حق ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ زندگانی دنیا تمہیں مغرور کر دے اور کہیں شیطان تمہیں دھوکا دے کر، خدا (کے کرم) سے مغرور نہ کر دے۔

(۶) یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے، تم اس کو اپنا دشمن سمجھو، وہ تو صرف اپنے ہی حزب (گروہ) کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ جلانے والی (جہنم کی) آگ والے ہو جائیں۔

(۷) جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان کے لیے عذاب شدید ہے اور جو ایمان

لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔

تفسیر

دُنیا اور شیطان تمہیں فریب نہ دے

اِس سورہ کی آیات کے دوسرے حصّہ میں اس گفتگو کے بعد کہ جو توحید و خالقیت و رازقیت کے سلسلہ میں تھی پہلے رُوئے سخن پیغمبرؐ کی طرف اور پھر عام لوگوں کی طرف کرتے ہوئے ان کے عملی پروگرام کی گزشتہ عقیدے سے متعلق پروگرام کے بعد تشریح کرتا ہے۔

پہلے پیغمبر کو اپنی راہ پر چلنے کے لیے استقامت کا درس دیتا ہے، کہ جو آپؐ کے لیے اہم ترین درس ہے، فرماتا ہے کہ: "اگر وہ تیری تکذیب کریں تو غم نہ کرو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، تجھ سے پہلے جو پیغمبر ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی گئی تھی" (وان یکذبوك فقد كذبت رسل من قبلك)۔

انہوں نے بھی اس راہ میں ثابت قدمی سے کام لیا، جب تک فرضِ رسالت کو ادا نہ کرلیا بیٹھے نہیں تھے۔ تم بھی مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور ادائے رسالت کرو نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

"اہم بات یہ ہے کہ تمام کام خدا ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ہر چیز پر ناظر اور ہر کام کا حساب کتاب کرنے والا ہے" (و الی اللہ ترجع الامور)۔

وہ اس راہ میں تیری زحمات و تکالیف کو ہرگز بے اعتنائی سے نہیں دیکھتا۔ جس طرح سے کہ ان ہٹ دھرم مخالفین کے جھٹلانے کو بغیر سزا دیئے نہیں چھوڑتا، اگر قیامت کا دن آنے والا نہ ہوتا تو پریشانی کا مقام تھا، لیکن اس عظیم دادگاہ اور اس عظیم دن کے لیے لوگوں کے تمام اعمال کے ثبت و ضبط ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے پریشانی کی کونسی بات ہے؟

اس کے بعد انسانوں کے اہم ترین پروگرام کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "اے لوگو! خدا کا وعدہ حق ہے" (یا ایھا الناس ان وعد اللہ حق)۔

قیامت، حساب و کتاب، میزان، مجازات، کیفر، جنت، جہنم سب کے سب ایسے وعدے ہیں کہ جو خدائے قادر و حکیم کی طرف سے پورے ہونے والے ہیں۔

اس وعدۂ حق کی طرف توجہ کرتے ہوئے: "کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی زندگی تمہیں دھوکہ دے دے، اور دھوکہ دینے والا شیطان کہیں تمہیں فریب نہ دے دے، اور خدا کے عفو و کرم سے مغرور کردے" (فلا تغرنکم الحیوة الدنیا ولا یغرنکم باللہ الغرور)۔

ہاں سرگرم کرنے والے عوامل اور اس جہان کے دل فریب ٹھاٹھ باٹھ چاہتے ہیں کہ تمہارے سادہ دل کو ان سے بھر دیں، اور اس عظیم خدائی وعدے سے غافل بنا دیں۔

شیاطین، جن وانس فریب کاری کے گوناں گوں وسائل کے ساتھ لگا تار وسوسہ میں مشغول ہیں، وہ بھی چاہتے ہیں کہ تمہاری ساری فکر کو اپنی طرف مشغول رکھیں اور اس عظیم روزِ موعود سے کہ جو آگے آ رہا ہے اس سے تمہیں منحرف کر دیں، کہ اگر ان کے مکر و فریب اور وسوسے مؤثر ہو جائیں تو پھر تمہاری ساری زندگی تباہ و برباد اور تمہاری سعادت کی آرزو نقش بر آب ہو جائے گی لہٰذا ان سے بھی بچتے رہو۔

لوگوں کو بار بار اس بات کی تنبیہ کرنا کہ نہ تو وہ شیطانی وسوسوں سے مغرور ہوں اور نہ ہی دنیا کے واقع میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان میں گناہ کے نفوذ کی دو راہیں ہیں۔

۱۔ دنیا کے فریب دینے والے مظاہر، جاہ وجلال اور مال ومنال اور طرح طرح کی خواہشات۔

۲۔ خدا کے عفو وکرم پر مغرور ہونا، اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں شیطان ایک طرف تو اس عالم کے ٹھاٹھ باٹھ کو انسان کی نگاہ میں زینت دیتا ہے، اور اس کو ایک نقد متاع، پُرکشش اور قیمتی اور دوست رکھنے کے لائق چیز ظاہر کرتا ہے۔

اور دوسری طرف جب انسان یہ چاہتا ہے کہ قیامت اور پروردگار کی عظیم دادگاہ کو یاد کر کے اپنے آپ کو دنیا کے فریب اور اس کی شدید کشش کے مقابلہ میں کنٹرول کرے تو وہ اس کو عفو الٰہی اور اس کی رحمت کی وسعت کا بیان کر کے مغرور کر دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اُسے گناہ اور سرکشی کی دعوت دیتا ہے۔

وہ اس بات سے غافل ہے کہ خدا جس طرح رحمت کے مقام پر "ارحم الراحمین" (سب سے زیادہ رحم کرنے والا) ہے، سزا اور کیفر کے مقام پر "اشد المعاقبین" (سب سے سخت عقاب کرنے والا) بھی ہے، اس کی رحمت کبھی بھی گناہ کا شوق پیدا نہیں کرتی جیسا کہ اس کا غضب یاس وناامیدی کا سبب نہیں ہو سکتا۔

"غرور" (بر وزن جسور) مبالغہ کا صیغہ ہے اور اُس موجود کے معنی میں ہے کہ جو حد سے زیادہ فریب کار ہو، اور یہاں ممکن ہے کہ اس سے فریب کاری کا ہر عامل مراد ہو، جیسا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے خصوصیت کے ساتھ شیطان مراد ہو۔

البتہ دوسرا معنی بعد کی آیت کے ساتھ زیادہ مناسب ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ قرآنی آیات میں بارہا "فریب وغرور" کی شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں ایک تجزیہ کیا ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

وہ افراد کہ جو عوامل فریب کے مقابل قرار پاتے ہیں، تین گروہ ہیں:

ایک گروہ تو اس قدر ضعیف و ناتواں ہوتا ہے کہ جو معمولی سی چیز سے دھوکا کھا جاتا ہے۔

دوسرا گروہ کہ جو اُن سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے وہ صرف دنیا کے ٹھاٹھ باٹھ اور زرق برق سے فریفتہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف اس صورت میں فریب کھاتے ہیں کہ کوئی طاقتور وسوسہ ڈالنے والا انہیں تحریک کرے اور ان کے مفاسد اعمال کو ان کی نظر میں ہلکا کر کے پیش کرے، لہٰذا ایک طرف سے تو جلدی گزر جانے والی لذتیں اور دوسری طرف سے وسوسے انہیں بُرے اعمال کے انجام دینے پر ابھارتے ہیں۔

تیسرا گروہ وہ ہوتا ہے کہ جو ان سے بھی زیادہ طاقتور اور قوی ہے جو نہ تو خود ہی مغرور ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی دوسرا انہیں فریب دے سکتا ہے۔

" لا تغرنكم الحياة الدنيا " کا جملہ پہلے گروہ کی طرف اشارہ ہے، اور " ولا يغرنكم بالله الغرور " کا جملہ دوسرے گروہ کی طرف، اور باقی رہا تیسرا گروہ تو وہ درحقیقت " ان عبادی ليس لك عليهم سلطان " کے عنوان میں داخل ہے[1]

بعد والی آیت تمام مومنین کو، ان شیطانی وسوسوں کے مسئلہ سے مربوط کہ جس کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہوا تھا، ایک تنبیہ ہے، کہتا ہے کہ: "شیطان یقیناً تمہارا دشمن ہے، تم بھی اس کو اپنا دشمن سمجھو" (ان الشيطان لكم عدو فاتخذوه عدوا)۔

اس کی دشمنی آدمؑ کی پیدائش کے پہلے دن سے ہی شروع ہو چکی تھی، اور جس وقت وہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کے بارے میں حکم خدا کو تسلیم نہ کر کے راندۂ درگاہ ہو گیا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ کے لیے آدمؑ اور اس کی اولاد سے دشمنی رکھے گا، یہاں تک کہ اس کام کے لیے خدا سے مہلت اور طویل عمر کا تقاضا کیا۔

وہ اپنی کہی ہوئی بات پر اڑا ہوا ہے، اور دشمنی نکالنے کے لیے اور تم پر ضرب لگانے کے لیے تھوڑی سے تھوڑی فرصت کو بھی غنیمت شمار کرتا ہے۔ کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ تم اس کو اپنا دشمن نہ سمجھو اور ایک لحہ کے لیے بھی اس سے غافل رہو؟ چہ جائیکہ تم یہ چاہنے لگو کہ خطوات شیطانؑ اور اس کے قدموں کی پیروی کرو، یا یہ کہ تم اسے اپنا شفقت کرنے والا رفیق اور ناصح دوست سمجھنے لگو: (افتتخذونه وذريته اولياء من دونى وهم لكم عدو) "کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو میری بجائے اپنا دوست بناتے ہو، درحالیکہ وہ تمہارا بہت ہی سخت دشمن ہے؟ (کہف - ۵۰)

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۶ ص ۵ -

علاوہ ازیں وہ ایک ایسا دشمن ہے کہ جو ہر طرف سے حملہ کرتا ہے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے: "ثم لاٰتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم" (پھر میں ہر طرف سے اولادِ آدم کے پاس آؤں گا، ان کے آگے سے بھی، ان کے پیچھے سے بھی، ان کے دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی)۔ (اعراف - ۱۷)

خصوصاً وہ جبکہ ایسی کمین گاہ میں ہے کہ: "وہ تو انسان کو دیکھتا ہے، لیکن انسان اسے نہیں دیکھتا" (انہ یراکم ھو وقبیلہ من حیث لا ترونھم) "شیطان اور اس کا قبیلہ تو تمہیں دیکھتا ہے، جبکہ تم اس کو نہیں دیکھتے"۔ (اعراف، ۲۷)

البتہ یہ بات اس کے وسوسوں کے مقابلہ میں تمہارے اپنے آپ سے قدرتِ دفاع میں مانع نہیں ہے۔

موسیٰ بن عمران کو پروردگار کی وصیتوں میں ایک عمدہ تعبیر بیان ہوئی ہے، جیسا کہ امیرالمومنین حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ خدا نے موسیٰ سے فرمایا: میں تمہیں چار وصیتیں کرتا ہوں انہیں یاد رکھنا:

اولاً: "ما دمت لا تری ذنوبک تغفر فلا تشتغل بعیوب غیرک"

والثانیۃ: "ما دمت لا تری کنوزی قد نفدت فلا تھتم بسبب رزقک"

والثالثۃ: "ما دمت لا تری زوال ملکی فلا ترج احداً غیری"

والرابعۃ: "ما دمت لا تری الشیطان میتاً فلا تأمن مکرہ"

"پہلی وصیت تو یہ ہے کہ جب تک تُو اپنے گناہوں کو بخشا ہوا نہ دیکھ لے دوسروں کی عیب جوئی نہ کر۔

دوسری وصیت یہ ہے کہ جب تک تُو میرے خزانوں کو ختم ہونے والا نہ دیکھ لے اپنی روزی کے لیے غمناک نہ ہو۔

تیسری وصیت یہ ہے کہ جب تک تُو میری حکومت کو زائل ہونے والا نہ دیکھ لے میرے علاوہ کسی اور سے امید نہ باندھنا۔

چوتھی وصیت یہ ہے کہ جب تک تُو شیطان کو مرا ہوا نہ دیکھ لے اُس وقت تک اس کے مکروفریب اور اس کے منصوبوں سے امن میں نہ رہ۔"[1]

بہرحال بنی آدم کے ساتھ شیطان کی دشمنی ایک ایسا مضمون ہے جس کی طرف قرآن کی بہت سی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بار بار تکرار کے ساتھ اُسے "عدو مبین"

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۱ صفحہ ۵۰۱ مادہ ربع۔

(واضح دشمن) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے[1]

اس قسم کے دشمن سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیئے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے کہتا ہے: "وہ تو صرف اپنے ہی گروہ کو اس لیے دعوت دیتا ہے تاکہ وہ جہنم کی جلانے والی آگ میں داخل کیے جائیں" (انما یدعوا حزبہ لیکونوا من اصحاب السعیر)۔

"حزب" اصل میں جماعت اور ایسے گروہ کے معنی میں ہے کہ جو تشکل اور شدت عمل کا حامل ہو، لیکن عام طور پر ہر اس گروہ اور جمعیت کے لیے بولا جاتا ہے کہ جو ایک خاص پروگرام اور مقصد کی پیروی کرتا ہے۔

"حزب شیطان" سے مراد اس کے پیروکار اور وہ لوگ ہیں کہ جو اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں۔ البتہ شیطان ہر شخص کو اپنے حزب کا رسمی ممبر نہیں بنا سکتا، اور نہ ہی انہیں جہنم کی طرف دعوت دے سکتا ہے، اس کے حزب کے افراد تو وہ ہیں جن کا قرآن کی دوسری آیات میں بیان ہوا ہے، اور وہ ذیل کی نشانیاں رکھتے ہیں:

وہ لوگ کہ جنہوں نے اس کی بندگی اور ولایت و دوستی کا طوق اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے۔ "انما سلطانہ علی الذین یتولونہ" "اس کا تسلط صرف ان افراد پر ہے کہ جو اس کی ولایت کو قبول کرتے ہیں" (نحل - ۱۰۰)

"وہ لوگ کہ جن پر شیطان کا غلبہ ہے اس طرح سے کہ اُن سے خدا کی یاد کو بھلا دیا ہے' وہ شیطان کا حزب ہے' اور شیطان کا حزب ہی واقعی زیاں کار ہے" (استحوذ علیھم الشیطان فانسٰھم ذکر اللہ اولٰئک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون)۔ (مجادلہ - ۱۸)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں تین مقامات پر تو حزب اللہ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے، اور تین ہی مقامات پر حزب شیطان کے بارے میں، تاکہ دیکھیں کہ کون کون سے افراد اس حزب میں اپنا نام لکھاتے ہیں، اور کون سے اُس حزب کے ممبر بنتے ہیں۔

لیکن بہرحال یہ طبیعی امر ہے کہ شیطان اپنے حزب کو کس چیز کی دعوت دیتا ہے، آلودگی اور گناہ کی، شہوات کی پلیدی کی، شرک و طغیان کی، ظلم و ستم کی، اور آخر کار جہنم کی آگ کی طرف[2]

ہم انشاء اللہ "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" کی خصوصیات کے بارے میں مزید تفصیل سورہ مجادلہ کی آیہ ۲۲ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

---

[1] آیہ ۱۶۸، ۲۰۸ بقرہ - انعام آیہ ۱۴۲ - اعراف - ۲۲ - یوسف ۵ - یٰسین - ۶۰ - زخرف - ۶۲ -

[2] یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ "لیکونوا" "لام" لام علت بھی ہو سکتی ہے اور لام غایت بھی۔

آخری زیر بحث آیت میں حزب اللہ کا انجام کار اور حزب الشیطان کی دردناک عاقبت کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ: "جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے تو وہ مغفرت اور اجر عظیم کے مستحق ہیں" (الذین کفروا لهم عذاب شديد والذين اٰمنوا وعملوا الصالحات لهم مغفرة واجر كبير)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں عذاب کے استحقاق کے لیے تو صرف مسئلہ کفر پر قناعت کرتا ہے، لیکن مغفرت اور اجر کبیر کے مسئلہ میں ایمان کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ "عمل صالح" کا بھی اس پر مزید اضافہ کرتا ہے، کیونکہ کفر تو تنہا ہی عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا سبب ہے لیکن ایمان عمل کے بغیر سبب نجات نہیں ہوگا، بلکہ ایمان و عمل ایک لحاظ سے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں[1]

اوپر والی آیت میں آخر میں پہلے مغفرت کے بارے میں گفتگو ہے، اس کے بعد اجر کبیر کے بارے میں، کیونکہ مغفرت حقیقت میں مومنین کو ابتداء میں گناہوں سے دھو کر پاک کر دیتی ہے، اس کے بعد اس کو "اجر کبیر" کے قبول کرنے کے لیے آمادہ و تیار کر دیتی ہے۔ اصطلاح کے مطابق اوّل تخلیہ ہے اور دوسرا تحلیہ ہے۔

---

[1] "مغفرۃ" اور "عذاب" میں تنوین تعظیم و تفخیم کے لیے ہے یعنی عظیم مغفرت اور دردناک عذاب۔

(۸) اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖؗ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○

(۹) وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ○

(۱۰) مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ○

ترجمہ

(۸) وہ شخص کہ جس کے لیے اُس کا بُرا عمل (اس کی نظروں میں) زینت دے دیا گیا ہے اور وہ اُسے اچھا اور خوبصورت لگتا ہے (اس شخص کی مانند ہے کہ جو واقع کو اسی طرح سے دیکھتا ہے کہ جس طرح سے وہ ہے) خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اس بناء پر ان کے اوپر شدت تاسف کی وجہ سے اپنی جان نہ دے کیونکہ خدا اس سے کہ جو وہ

انجام دیتے ہیں باخبر ہے۔

⑨ اور خدا ہی ہے وہ کہ جس نے ہَواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو حرکت میں لائیں، پس ہم ان بادلوں کو مردہ زمینوں کی طرف بھیجتے ہیں اور ان کے ذریعہ زمین کو مُردہ ہونے کے بعد زندہ کرتے ہیں، معاد و قیامت بھی اسی طرح ہے۔

⑩ جو شخص عزت چاہتا ہے (اُسے خدا سے چاہنا چاہیئے) کیونکہ ساری عزت خدا ہی کے لیے ہے، پاکیزہ باتیں اس کی طرف صعود کرتی ہیں اور وہ عمل صالح کو اوپر لے جاتی ہیں اور وہ لوگ جو بُرے منصوبے بناتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے، اور اُن کا مکر (اور فساد کی کوششیں) نابود ہو جائیں گی (اور وہ اس میں کامیاب نہ ہوں گے)۔

تفسیر

پاک اور صالح گفتار و کردار خدا کی طرف لے جاتے ہیں

چونکہ گزشتہ آیات میں لوگوں کی دو گروہوں میں تقسیم ہوئی تھی، ایک "گروہ مؤمن" اور "ایک گروہ کافر" یا ایک گروہ "حزب اللہ اور شیطان کا دشمن" اور دوسرا گروہ" اس کا پیرو اور اس کا حزب" پہلی زیر بحث آیت ان دونوں گروہوں کی ایک اہم خصوصیت کو، جو واقع میں ان کے تمام پروگراموں کا سرچشمہ ہے، بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: "کیا وہ شخص کہ جس کے عمل کی برائی اس کی نظروں میں زینت دے دی گئی ہے، اور وہ اس کو ایک اچھی اور خوبصورت بات سمجھتا ہے، اس شخص کی مانند ہے کہ جو واقعات کو بعینہٖ اسی طرح سے جیسے کہ وہ ہیں ـ اچھے یا بُرے ـ درک کرتا ہے"؟ (افمن زین له سوء عمله فراٰه حسنًا)۔

حقیقت میں یہ مسئلہ گمراہ اور ہٹ دھرم قوموں کی سب بدبختیوں کی کلید ہے۔ کیونکہ ان کے تمام بُرے اعمال، ان کے سیاہ دل اور خواہشات نفسانی سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ان کی نظر

میں خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔

یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں ہے کہ اس قسم کا آدمی نہ تو وعظ و نصیحت کو قبول کرتا ہے، اور نہ ہی تنقید کو سننے کے لیے آمادہ ہوتا ہے، اور نہ ہی اپنی رفتار کو بدلنے پر تیار ہوتا ہے۔

نہ وہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں تجزیہ و تحلیل کرتا ہے اور نہ ہی ان کے انجام سے ڈرتا ہے۔

اور اس سے بالاتر بات یہ ہے کہ جس وقت برائی اور اچھائی یا قباحت و زیبائی کی بات چھڑتی ہے، تو اچھائیوں اور زیبائیوں کی ضمیر کا مرجع اپنی ذات کو سمجھتا ہے، اور برائیوں اور قباحتوں کی ضمیر کا مرجع مومنین کو۔ اور کتنے ہی کفارِ لجوج ایسے ہیں کہ جس وقت انہوں نے حزبِ شیطان پر گزرے ہوتے عذاب اور ان کے انجام کے بارے میں سُنا تو انہوں نے اس کو سچے مومنین پر منطبق کر دیا اور خود اپنے آپ کو حزب اللہ کا مصداق شمار کیا۔

اور یہ ایک بہت ہی بڑی مصیبت اور دکھ کی بات ہے۔

لیکن وہ کون ہے کہ جو بدکاروں کے بُرے اعمال کو ان کی نظر میں جلوہ دیتا ہے؟ کیا خدا؟ یا ہوائے نفس؟ یا شیطان؟

اس میں شک نہیں کہ عامل اصلی تو ہوائے نفس اور شیطان ہی ہے، لیکن چونکہ یہ اثر خدا نے ان کے اعمال میں پیدا کیا ہے لہٰذا انہیں خدا کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے، کیونکہ انسان جب کسی گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں تو ابتدا میں چونکہ ان کی فطرت پاک اور ان کا وجدان بیدار اور ان کی عقل واقع بیں ہوتی ہے لہٰذا وہ اپنے بُرے عمل سے بے چین اور پریشان ہوتے ہیں لیکن جس قدر وہ اُس عمل کو دہراتے ہیں تو ان کی پریشانی میں کمی ہوتی جاتی ہے۔

آہستہ آہستہ وہ بے پرواہی کے مرحلہ تک پہنچ جاتے ہیں اور اگر پھر بھی اس عمل کو دہراتے رہیں تو برائیاں ان کی نظر میں اچھائیاں ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے لیے افتخارات اور فضائل شمار کرنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ وہ بدبختی کی منجدھار میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جس وقت قرآن اس سوال کو پیش کرتا ہے کہ: "کیا وہ شخص کہ جس کے عمل کی برائی اس کی نظر میں مزیّن کر دی گئی ہے اور وہ اسے زیبا اور خوبصورت نظر آتی ہے ....." تو اس کے نقطۂ مقابل کو صراحت کے ساتھ ذکر نہیں کرتا۔ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ سننے والے کو ایک وسیع گنجائش دے تاکہ وہ ان مختلف امور کو کہ جو نقطۂ مقابل بن سکتے ہیں اپنی نظر میں مجسم کرے۔ اور انہیں زیادہ سے زیادہ سمجھ سکے۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ کیا اس قسم کے افراد واقع بیں افراد کی طرح ہیں؟

کیا اس قسم کے آدمی کے لیے بھی نجات کی اُمید ہے؟[1]

اس کے بعد قرآن ان دونوں گروہوں کے درمیان فرق کا سبب بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "خدا جس شخص کو چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت کرتا ہے" (فان اللہ یضل من یشاء و یھدی من یشاء)۔

اگر پہلے گروہ کے اعمال ان کی نظر میں زینت دے دیئے گئے ہیں تو یہ خدا کی طرف سے انہیں گمراہی میں رکھنے کا نتیجہ ہے، وہی خدا ہے کہ جس نے بُرے اعمال کی تکرار میں یہ خاصیت قرار دے دی ہے کہ نفسِ انسانی اس کا خوگر ہو جاتا ہے اور اس کے ہم رنگ اور ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

اور وہی خدا ہے کہ جو پاک دل مومنین کو ایسی ناقد و بینا آنکھیں اور ایسے کان ۔ کہ جو حقائق کو اس طرح درک کرنے والے ہوں جیسے کہ وہ ہیں ۔ بخشتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ مشیت الٰہی اس کی حکمت کے ساتھ توام ہے۔ اور ہر شخص کو جس کا وہ لائق ہے اس کو وہی دیتا ہے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "مبادا ان کی وضع و کیفیت پر شدت تاسف اور حسرت کے زیر اثر تُو اپنی جان دے بیٹھے" (فلا تذھب نفسک علیھم حسرات)۔

یہ تعبیر اسی تعبیر کی طرح ہے کہ جو سورہ شعراء کی آیہ ۳ میں بیان ہوئی ہے: (لعلک باخع نفسک الّا یکونوا مؤمنین) "گویا تُو چاہتا ہے کہ اپنی جان گنوا بیٹھے کہ وہ ایمان نہیں لاتے"۔

"حسرات" کی تعبیر کہ جو اصطلاح کے مطابق "مفعول لاجلہ" ہے گزشتہ جملہ کے لیے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تُو نہ صرف ایک ہی حسرت ان کے لیے رکھتا ہے، بلکہ تجھے ان پر کئی حسرتیں ہیں۔

نعمتِ ہدایت کو ہاتھ سے دینے کی حسرت، گوہرِ انسانیت ضائع کرنے کی حسرت، تشخیص کی حس ہاتھ سے دے بیٹھنے کی حسرت، یہاں تک کہ وہ برائی کو اچھائی سمجھنے لگے ہیں اور آخر میں پروردگار کے قہر و غضب کی آگ میں گرفتار ہونے کی حسرت۔

لیکن تُو حسرت نہ کر: "اس لیے کہ خدا ان کے اعمال سے آگاہ ہے اور وہ جس چیز کے لائق ہیں

---

[1] اس سے واضح ہو گیا ہے کہ اس آیت میں ایک جملہ مقدر ہے جو ممکن ہے کہ اس طرح ہو: "کمن لیس کذالک .... کمن یحساب نفسہ ویری القبیح قبیحا .... ھل یرجی لہ صلاح و متاب"۔

[2] اوپر والی آیت کے لیے مفسرین نے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ ان کے آزاروں اور مخالفتوں کی شدت اور سختی سے پریشان نہ ہو کیونکہ خدا ان کے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان سے برمحل انتقام لے گا۔

وہی چیز انہیں دے گا" (ان اللہ علیم بما یصنعون)۔

آیت کے لب و لہجہ سے پیغمبرِ اسلامؐ کی گمراہوں اور منحرفین کے بارے میں دل سوزی پورے طور پر ظاہر ہے۔

اور ایک سچے خدائی رہبر کی حالت یہی ہوتی ہے، کہ وہ لوگوں کے حق کو قبول نہ کرنے، اور باطل کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے' اور سعادت و نیک بختی کے تمام وسائل کو پسِ پشت ڈال دینے سے اس طرح غمگین ہوتا ہے جیسے کہ وہ اپنی جان ہی دے دے گا۔

بعد والی آیت میں گزشتہ مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔ کہ جو ہدایت وضلالت اور ایمان و کفر کے سلسلے میں گزر چکی ہیں۔ مبدأ و معاد کے بارے میں مختصر اور واضح بیان کر رہا ہے، اور "مبداء و معاد" کے اثبات کو ایک عمدہ دلیل میں ایک دوسرے کے قریب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا ذہی ہے کہ جس نے ہواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو چلائیں" (واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحابا)۔[1]

"پھر ہم ان بادلوں کو مُردہ اور خشک زمین کی طرف چلاتے ہیں" (فسقناہ الی بلد میت)۔

"اور اس کے ذریعہ ہم زمین کو مُردہ ہونے کے بعد زندہ کرتے ہیں" (فاحیینا بہ الارض بعد موتھا)۔

"ہاں! مُردوں کا موت کے بعد زندہ ہونا بھی اسی طرح ہے" (کذالک النشور)۔

ایک چچا تُلا نظام جو ہواؤں کے چلنے، اور اس کے بعد بادلوں کی حرکت اور اس کے بعد بارش کے حیات بخش قطرات کے برسنے' اور اس کے بعد مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے پر جاری ہے وہ خود بہترین دلیل اور عمدہ ترین گواہ ہے اس حقیقت پر کہ ایک حکیم و دانا کا دستِ قدرت اس کارخانے کے پیچھے برقرار ہے اور وہ اس کی تدبیر کر رہا ہے۔

پہلے گرم اور جلا دینے والی ہواؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ مناطق استوائیہ سے سرد منطقوں کی طرف جائیں اور اپنے راستے میں پڑنے والے سمندروں کے پانی کو بخارات میں تبدیل کرتے ہوئے آسمان کی طرف بھیجیں، اس کے بعد قطبین کی طرف سے منظم طور پر چلنے والی ٹھنڈی ہواؤں کو۔ کہ جو ہمیشہ پہلے چلنے والی ہواؤں کے مخالف سمت میں چلتی ہیں۔ حکم دیتا ہے کہ وہ حاصل شدہ بخارات کو جمع کر کے بادلوں کو تشکیل دیں۔

---

[1] اس بارے میں کہ پہلا فعل ماضی کی شکل میں کیوں آیا ہے (ارسل) اور دوسرا فعل مضارع کی صورت میں (فتثیر) ایک غائب کی صورت میں آیا ہے (ارسل) اور دوسرا متکلم کی صورت میں (فسقناہ) اس کی مفسرین نے کئی وجوہ بیان کی ہیں لیکن چونکہ ان میں کوئی دقیق بات نہیں لہٰذا ان سے صرف نظر کیا گیا ہے، ممکن ہے کہ یہ بیان میں تفنن اور گفتگو میں تنوع کے لیے ہو۔

پھر انہیں ہواؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ بادلوں کو اپنے دوش پر اٹھا کر مُردہ بیابانوں کی طرف دھکیل کر لے جائیں تاکہ بارش کے زندہ کرنے والے قطرات وہاں برسیں۔

پھر مخصوص حالات میں زمین اور ان نباتات کے بیجوں کو کہ جو اس میں بکھیرے ہوتے ہیں، پانی اور نشوونما کو قبول کرنے کا حکم دیتا ہے' اور ظاہراً پست و بے قدر و قیمت موجود سے زندہ اور بہت ہی متنوع اور زیبا، خرم و سرسبز اور پُر بار موجودات کو وجود میں لاتا ہے۔ یہ اس کی قدرت کی بھی دلیل ہے' اس کی حکمت پر بھی گواہ ہے' اور قیامتِ کبریٰ کی نشانی بھی ہے۔

حقیقت میں اوپر والی آیت چند جہات سے توحید کی طرف دعوت دیتی ہے۔

برہانِ نظم اور برہانِ حرکت کے لحاظ سے، کہ ہر متحرک موجود کے لیے کسی محرک کی ضرورت ہے' اور نعمتوں کے بیان کے لحاظ سے کہ جو فطری ہونے کی بنا پر منعم کا شکر ادا کرنے کا محرک ہے، اور کئی جہات سے مسئلہ معاد پر بھی دلیل ہے۔

موجودات کے سیرِ تکامل و ارتقاء کے لحاظ سے، اور مردہ زمین سے زندگی اور حیات کے چہرہ کے نمودار ہونے کے لحاظ سے، یعنی اے انسان معاد کا منظر ہر سال کی مختلف فصلوں میں تیری آنکھ کے سامنے اور تیرے پاؤں کے نیچے ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ "فتثیر" کا جملہ "اثارہ" کے مادہ سے منتشر کرنے اور پراگندہ کرنے کے معنی میں ہے اور اس مقام پر سمندروں کے اوپر ہواؤں کے چلنے کے اثر سے بادلوں کے پیدا ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، چونکہ بادلوں کے چلنے کا مسئلہ بعد والے جملہ (فسقناہ الیٰ بلد میت) میں آیا ہے۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ جو ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرمؐ سے منقول ہوئی ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ:

"یارسول اللہ کیف یحی اللہ الموتیٰ وما اٰیۃ ذالک فی خلقہ؟"

اے اللہ کے رسول! خدا مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا، اور عالمِ خلقت میں اس کی نشانی اور نمونہ کیا ہے؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اما مررت بوادی اھلک ممحلا ثم مررت بہ یھتز خضرا؟"

کیا تُو کبھی اپنے قبیلہ کی سرزمین سے نہیں گزرا درانحالیکہ وہ مردہ اور خشک تھی اور پھر تُو وہاں سے اس حالت میں نہیں گزرا کہ وہ خرم و سرسبز ہونے کی وجہ سے ایسے لگتی ہے جیسے کہ حرکت میں آگئی ہے۔

"قلت نعم یا رسول اللّٰہ"

"مَیں نے عرض کیا جی ہاں اے اللہ کے رسول"

"قال: فکذالک یحیی اللّٰہ الموتٰی و تلک اٰیتہ فی خلقہ"

آپؐ نے فرمایا: "خدا اس طرح سے مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور یہ عالم خلقت میں اس کا نمونہ اور نشانی ہے" [1]

ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد نہم میں سورۂ روم کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں ایک دوسری بحث اس سلسلہ میں بیان کی ہے۔

توحید کی اس بحث کے بعد مشرکین کے ایک بہت بڑے اشتباہ اور غلطی کی طرف۔ کہ وہ اپنے لیے بتوں سے عزت کے خواستگار تھے، اور پیغمبرؐ پر ایمان لانے کو اپنے گرد جمع شدہ لوگوں کی پراگندگی کا سبب سمجھتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ: "ان نتبع الهدٰی معك نتخطف من ارضنا" "اگر ہم تیرے ساتھ ہدایت کو قبول کرلیں، تو طاقتور دشمن ہمیں اس سرزمین سے اچک لیں" (قصص - ۵۷) — اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: "جو لوگ عزت چاہتے ہیں وہ خدا سے طلب کریں کیونکہ ساری عزت خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے" (من کان یرید العزۃ فللّٰہ العزۃ جمیعًا)۔

"عزت" "مفردات" میں راغب کے قول کے مطابق اصل میں وہ حالت ہے کہ جو انسان کو محکم، مضبوط اور ناقابلِ شکست بنا دیتی ہے، سخت اور محکم زمینوں کو بھی اسی لیے "عزاز" (بروزن اساس) کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ صرف اسی کی ذات پاک ہے کہ جو ناقابلِ شکست ہے۔ ورنہ تمام مخلوقات اپنی محدودیت کی بنا پر قابلِ شکست ہے۔ لہٰذا ساری عزت اسی کے لیے ہے۔ اور جو شخص بھی عزت حاصل کرتا ہے وہ اسی کے غیر متناہی دریائے عزت کی برکت سے ہے۔

ایک حدیث میں انس سے منقول ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"ان ربکم یقول کل یوم انا العزیز فمن اراد عز الدارین فلیطع العزیز!"

"تمہارا پروردگار ہر روز کہتا ہے کہ عزیز میں ہوں پس جو شخص دونوں جہانوں کی عزت چاہتا ہے وہ عزیز کی اطاعت کرے"

حقیقت میں آگاہ اور باخبر انسان کو چاہیئے کہ وہ پانی سرچشمہ سے حاصل کرے کیونکہ وہاں صاف شفاف اور فراواں پانی ہوتا ہے، نہ کہ چھوٹے چھوٹے برتنوں سے، کیونکہ ایک تو وہ محدود ہیں اور دوسرے آلودہ بھی، اور وہ اِس کے اور اُس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۴۰۹ (زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

امام حسن علیہ السلام کے حالات زندگی میں ہم پڑھتے ہیں کہ اپنی زندگی کے آخری وقت میں جبکہ آپ کے ایک صحابی "جنادہ بن ابی سفیان" نے آپ سے وعظ و نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے قیمتی اور مؤثر نصیحتیں اس کے لیے بیان کیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ:

"واذا اردت عزًا بلاعشیرة وھیبة بلاسلطان فاخرج من ذل معصیة اللّٰہ الی عز طاعة اللّٰہ"

"جب تو یہ چاہے کہ قبیلہ و عشیرہ کے بغیر عزیز رہے، اور اقتدارِ سلطنت کے بغیر ہیبت رکھے تو خدا کی معصیت کی ذلت سے نکل کر اس کی اطاعت کی عزت کی پناہ میں آجا" (بحارالانوار ج ۴۴ ص ۱۳۹)

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی بعض آیات میں "عزت" کو خدا کے علاوہ پیغمبر اور مومنین کے لیے بھی قرار دیتا ہے: "وللّٰہ العزة ولرسولہ وللمؤمنین" (منافقون - ۸)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی پروردگار کی عزت کے سایہ سے عزت حاصل کی ہے، اور اس کی اطاعت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں۔

اس کے بعد عزت حاصل کرنے کی راہ کی اس طرح تشریح کرتا ہے کہ: "پاکیزہ باتیں اس کی طرف صعود کرتی ہیں" (الیہ یصعد الکلم الطیب)۔ "اور وہ عملِ صالح کو اوپر لے جاتا ہے" (والعمل الصالح یرفعہ)۔

"الکلم الطیب" پاکیزہ باتوں کے معنی میں ہے، اور باتوں کی پاکیزگی اس کے مضمون کی پاکیزگی سے ہوتی ہے اور مضمون کی پاکیزگی ان مفاہیم کی بنا پر ہوتی ہے کہ جو پاک و درخشاں عینی واقعیتوں اور حقیقتوں کے مطابق ہوتے ہیں، اور خدا کی ذات پاک سے بالاتر اور اس کے حق و عدالت کے آئین سے بالاتر، اور اُن نیک اور پاک ہستیوں سے کہ جو اس کی نشر و اشاعت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں، سے بڑھ کر اور کونسی حقیقت ہوگی؟

اسی لیے "الکلم الطیب" کی، مبدا و معاد اور دینِ خدا کے بارے میں صحیح اعتقادات کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔

ہاں! ایسا ہی پاک و پاکیزہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جو خدا کی طرف بلند ہوتا ہے، اور اپنے حامل کو بھی پُرپرواز دیتا ہے، تاکہ وہ حق تعالیٰ کے قرب میں جگہ حاصل کرے اور خدائے عزیز کی عزت میں غلطاں ہوجائے۔

یقیناً اس پاک و پاکیزہ اصل سے ایسی شاخیں پھوٹتی ہیں کہ جن کا پھل عملِ صالح ہے، ہر شائستہ، مفید اور اصلاحی کام، چاہے وہ حق کی طرف دعوت ہو، چاہے مظلوم کی حمایت ہو، چاہے ظالم و ستمگر کے ساتھ مبارزہ ہو، چاہے خود سازی و عبادت ہو اور چاہے تعلیم و تربیت ہو، خلاصہ یہ کہ ہر وہ چیز

کہ جو اس وسیع و عریض مفہوم میں داخل ہو، اگر وہ خدا کے لیے اور اس کی رضا کے لیے انجام پائے تو وہ بھی بلند ہو جاتی ہے اور لطفِ پروردگار کے آسمان پر عروج کرتی ہے، اور اپنے حامل کی معراج اور تکامل وارتقاء کا سبب بنتی ہے، اور حق تعالیٰ کی عزت سے بہرہ اندوز ہوتی ہے۔

یہ وہی چیز ہے کہ جس کی طرف سورۂ ابراہیم کی آیہ ۲۴ میں اشارہ ہوا ہے: "الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃً طیّبۃً کشجرۃٍ طیّبۃٍ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا" "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاکیزہ باتوں کے لیے کیسی مثل بیان کی ہے؟ جیسا کہ وہ ایک پاک درخت ہے کہ جس کی جڑ ثابت اور برقرار ہے اور اس کی شاخ آسمان میں پھیلی ہوئی ہے، وہ ہر وقت اپنے پروردگار کے اذن سے اپنے پھل (اشتیاق رکھنے والوں کو) دیتا ہے"۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض مفسرین نے کلمہ طیبہ کی "لا الٰہ الّا اللہ" سے اور بعض دوسروں نے "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الّا اللہ واللہ اکبر" سے اور بعض نے توحید سے، توحید کے بعد "محمد رسول اللہ، و علی ولی اللہ وخلیفۃ رسولہ" کے ساتھ تفسیر کی ہے، یا بعض روایات میں "الکلم طیب" و "العمل الصالح" "ولایت اہل بیت" یا اسی کے مانند دوسری چیزوں سے تفسیر کی ہے، تو یہ سب اسی وسیع و عریض مفہوم کے واضح مصادیق کے بیان کی قبیل سے ہیں، اور اس کے مفہوم کو محدود نہیں کرتے کیونکہ ہر وہ بات کہ جو پاک و پاکیزہ اور بلند مفہوم کی حامل ہو وہ سب اس عنوان میں جمع ہو جاتی ہیں۔

بہر حال وہی خدا کہ جو گزشتہ آیت کے اقتضا کے مطابق مردہ زمین کو بارش کے حیات بخش قطرات سے زندہ کرتا ہے، وہی "کلام طیب" اور "عمل صالح" کو بھی پرورش کرتا ہے، اور اپنے قرب اور جوارِ رحمت تک پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد نقطۂ مقابل کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جو بُرے منصوبے بناتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے۔ (والذین یمکرون السیّئات لھم عذاب شدید)۔

"اور ان کی آلودہ و ناپاک و فاسد سعی و کوشش نابود ہو جاتی ہے اور کسی مقام تک نہیں پہنچتی (ومکر اولٰئک ھو یبور)۔

اگرچہ یہ فاسدین و مفسد یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ظلم و ستم اور جھوٹ اور مکاری کے ذریعہ اپنے لیے عزت حاصل کر سکتے ہیں، اور مال و دولت اور طاقت و قدرت بھی، لیکن انجام کار انہوں نے اپنے لیے عذابِ الٰہی بھی فراہم کیا ہے اور ان کی ساری کوششیں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جو قرآن کے بیان کے مطابق "بناوٹی خداؤں کو اپنے لیے باعثِ عزت خیال کرتے تھے" (واتخذوا من دون اللہ اٰلھۃً لیکونوا لھم عزًّا)۔ (مریم - ۸۱)

اور ایسے منافق بھی تھے کہ جو اپنے آپ کو عزیز اور مومنین کو ذلیل خیال کرتے تھے اور: " وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہم مدینہ میں پلٹ کر گئے تو عزت والے ذلیلوں کو باہر نکال پھینکیں گے" (یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعزّ منھا الاذل)۔ (منافقون - ۸)

کچھ افراد ایسے بھی تھے کہ جو فرعونوں کے قرب کو اپنی عزت کا سبب تصور کرتے تھے، یا گناہ و ظلم سے عزت و آبرو طلب کرتے تھے، لیکن وہ سب تباہ ہو گئے، اور یہ صرف ایمان و عمل صالح ہی ہے کہ جو خدائے عزیز کی طرف اوپر جاتا ہے۔

" مکر" اگرچہ لغت میں ہر قسم کی چارہ جوئی کے معنی میں ہے لیکن بعض مواقع پر ایسی چارہ جوئی کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ جو فساد کے ساتھ توأم ہو۔ زیر بحث آیت اسی معنی میں ہے۔

"سیئات" اوپر والی آیت میں تمام برائیوں اور قباحتوں کے لیے عام اس سے کہ وہ عقائد کی برائیاں ہوں یا عمل کی، سب کو شامل ہے۔

اور یہ جو بعض نے پیغمبر اسلامؐ کو قتل کرنے یا مکہ سے جلاوطن کرنے کے سلسلہ میں مشرکین کی سازشوں کے ساتھ تفسیر کی ہے تو یہ واقع میں اس کے ایک مصداق کو بیان کیا ہے، نہ کہ اس کے پورے مفہوم کو۔

" یبور" کا جملہ " بوار" اور " بوران" کے مادہ سے اصل میں حد سے زیادہ کساد بازاری کے معنی میں ہے، اور چونکہ اس قسم کا کساد نابودی کا سبب بنتا ہے، اس لیے یہ لفظ ہلاکت و نابودی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مشہور ضرب المثل ہے، (کسد حتی فسد) " اس قدر کساد اور مندا ہوا کہ فاسد ہو گیا"

چند نکات

۱۔ تمام " عزت" خدا کے لیے ہے

عزت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا ناقابل شکست ہونے کے مرحلہ تک پہنچنے کے علاوہ کوئی چیز ہے؟ اگر اس طرح ہے تو پھر عزت کو کہاں تلاش کرنا چاہیئے؟ اور کونسی چیز انسان کو عزت دے سکتی ہے؟

ہم ایک واضح تحلیل و تجزیہ کے ذریعے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عزت کی حقیقت پہلے درجہ میں ایک ایسی قدرت ہے کہ جو انسان کے دل و جان میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ اس کو طاغیوں، باغیوں اور سرکشوں کے مقابلہ میں خضوع و خشوع کرنے اور سر تسلیم خم کرنے سے روکتی ہے۔

ایسی قدرت کہ جس کے ہوتے ہوئے انسان خواہشات کا اسیر نہیں ہوتا، اور ہوا و ہوس کے مقابلہ میں سر نہیں جھکاتا۔

ایسی قدرت کہ جو اُسے نفوذ ناپذیری کے مرحلہ میں " زر" و " زور" کے مقابلہ میں ارتقار نکال بخشتی ہے

کیا اس قدرت کا سرچشمہ ایمان بخدا یعنی قدرت وعزت کے اصل منبع سے ارتباط کے بغیر ہو سکتا ہے؟
یہ بات تو تھی فکر وعقیدہ اور روح وجان کے مرحلہ میں لیکن عمل کے مرحلہ میں عزت کا سرچشمہ ایسے اعمال ہیں کہ جو صحیح بنیادوں اور حساب شدہ پروگرام اور طریقہ کے حامل ہوں، دوسرے لفظوں میں اسے عمل صالح میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے، یہی وہ دو چیزیں ہیں کہ جو انسان کو سربلندی وعظمت دیتی ہیں اور اُسے عزت اور ناقابلِ شکست ہونے کا شرف بخشتی ہیں۔

فرعون کے زمانے کے دُنیا پرست جادوگروں نے اپنے عجائبات کا اس کے نام اور اس کی عزت کے ساتھ آغاز کیا۔ (وقالوا بعزة فرعون انّا لنحن الغالبون) "انہوں نے کہا فرعون کی عزت کی قسم کہ ہم ہی کامیاب ہوں گے۔" (شعراء۔ ۴۴)

لیکن وہ بہت ہی جلد موسیٰؑ کے عصا سے شکست کھا گئے، لیکن وہی جس وقت فرعون کے ذلت بار پرچم کے سائے سے باہر نکلے اور توحید کے سائے میں قرار پائے اور ایمان لے آئے، تو ایسے طاقتور اور ناقابلِ شکست ہو گئے کہ فرعون کی سخت ترین دھمکیاں بھی ان پر اثر انداز نہ ہوئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ پاؤں یہاں تک کہ اپنی جان بھی عاشقانہ راہِ خدا میں دے دی اور شربتِ شہادت نوش کر لیا۔ انہوں نے اپنے اس عمل کے ذریعے یہ واضح کر دیا کہ وہ زر اور زور کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے اور وہ ناقابلِ شکست ہیں، اور ان کی یہ پُرافتخار تاریخ آج ہمارے لیے ایک سبق آموز دنیا ہے۔

۲۔ "کلام طیب" اور "عمل صالح" میں فرق

ممکن ہے کہ یہ سوال کیا جائے کہ زیر بحث آیت "کلامِ طیب" کے بارے میں یہ کیوں کہتی ہے کہ وہ خود بخود پروردگار کی طرف بلند ہوتا ہے لیکن عملِ صالح کے بارے میں یہ کہتی ہے کہ خدا اسے اوپر لے جاتا ہے؟

اس سوال کا اس طرح جواب دیا جا سکتا ہے کہ "کلامِ طیب" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ایمان اور پاکیزہ عقیدے کی طرف اشارہ ہے اور وہ خدا کی طرف عین بلندی ہے کیونکہ ایمان کی حقیقت اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے لیکن "عمل صالح" کو وہ قبول کرتا ہے اور اس کی پذیرائی کرتا ہے، اور اس پر کئی گنا اجر دیتا ہے اور اسے بقاء ودوام بخشتا ہے اور بلندی عطا کرتا ہے۔ (غور کیجئے)

(۱۱) وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○

(۱۲) وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ڰ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۱) خدا نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے، کوئی مادہ حاملہ نہیں ہوتی اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم کے ساتھ اور کسی شخص کی عمر نہیں بڑھتی اور نہ کسی شخص کی عمر میں کمی ہوتی ہے مگر یہ کہ (علمِ خدا کی) کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ خدا کے لیے آسان ہے۔

(۱۲) یہ دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک دریا کہ جس کا پانی شیریں اور پینے میں خوشگوار ہے اور ایک یہ کہ جو کھاری اور گلوگیر ہے (لیکن) تم دونوں سے ہی تر و تازہ گوشت کھاتے ہو، اور زینت کی چیزیں نکال کر پہنتے ہو، اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں ان کا سینہ چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں (اور ہر طرف کو بڑھ رہی ہیں) تاکہ تم فضلِ خدا

سے فائدہ اٹھاؤ اور شاید کہ تم (اس کی نعمتوں کا) شکر ادا کرو ۔

تفسیر

شیریں اور شور پانی والے دریا یکساں نہیں ہیں

گزشتہ آیات میں توحید، معاد اور صفاتِ خدا کے بارے میں گفتگو تھی ۔ زیر بحث آیات میں بھی جاندار مخلوقات اور آفاق میں اللہ کی بعض اور نشانیوں کا ذکر ہے کہ جو خدا کی قدرت کی بھی دلیل ہیں، اس کے علم کی بھی اور امکانِ معاد کی بھی ۔

پہلے مختلف مراحل میں انسان کی پیدائش کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: " خدا نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا " (واللّٰہ خلقکم من تراب) ۔

" پھر نطفہ سے " (ثم من نطفة) ۔

" پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے " (ثم جعلکم ازواجًا) ۔

یہ تین مرحلے انسان کی خلقت کے مراحل میں سے ہیں، مٹی، نطفہ اور زوجیت ۔

یہ بات مسلم ہے کہ انسان مٹی سے بنا ہے اس لحاظ سے بھی کہ انسانوں کے جدِ اعلیٰ حضرت آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ تمام مادے کہ جو جسم انسانی کو تشکیل دیتے ہیں یا انسان اُن سے غذا لیتا ہے، یا اُس کا نطفہ ان سے بنتا ہے وہ سب کے سب مٹی ہی سے نشوونما پاتے ہیں ۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مٹی سے پیدائش صرف پہلی خلقت کی طرف اشارہ ہے لیکن نطفہ سے پیدائش بعد کے مراحل کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ پہلے انسانوں کی خلقت کا اجمالی مرحلہ ہے (کیونکہ سب کا وجود آدم کے وجود سے چلتا ہے) اور دوسرا مرحلہ تفصیلی ہے کہ جس میں انسان ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے ۔

جبکہ زوجیت کا مرحلہ نسلِ انسانی کے تسلسل اور اضافے کا مرحلہ ہے ۔

نیز یہ جو بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ " ازواج " یہاں " اصناف " یا " روح وجسم " وغیرہ کے معنی میں ہے، بہت بعید نظر آتا ہے ۔

اس کے بعد حیاتِ انسانی کے چوتھے اور پانچویں مرحلے کا ذکر ہوتا ہے اور ماؤں کے حاملہ ہونے اور بچہ جننے کے بارے میں بات کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: " کوئی مادہ حاملہ نہیں ہوتی اور بچہ نہیں جنتی مگر وہ خدا کے علم میں ہوتا ہے " (وما تحمل من انثٰی ولا تضع الّا بعلمه) ۔

حمل ٹھہرنا اور پھر جنین کی حالت میں بہت ہی عجیب اور پیچیدہ تبدیلیاں اور اس کے بعد وضع حمل

یہ حساس اور حیرت انگیز تغیرات کہ جو ایک طرف ماؤں کو اور دوسری طرف جنین کو پیش آتے ہیں، اتنے عمیق اور دقیق ہیں کہ جو خدا کے بے پایاں علم کے بغیر ممکن نہیں ہیں، کیونکہ اگر ان پر حکم فرما نظام سوئی کی نوک کے برابر بھی معطل ہو جائے، تو حمل یا وضع حمل کے سارے پروگرام میں خلل واقع ہو جائے اور معاملہ تباہی تک پہنچ جائے۔

انسان کی زندگی کے ان پانچ مرحلوں میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر عجیب اور تعجب خیز ہے۔

بے جان مٹی کہاں اور زندہ، عقل مند، صاحب ہوش اور نو بہ نو کام کرنے والا انسان کہاں؟ بے قدر و قیمت نطفہ کہ جو متعفن پانی کے چند قطروں سے بنا ہے' کہاں؟ صاحبِ رشد خوبصورت' مختلف حواس کا حامل اور طرح طرح کی کاریگری کا مظہر انسان کہاں؟[1]

جب ہم اس مرحلہ سے گزر جاتے ہیں تو نوعِ انسان کی دو صنفوں "مذکر" اور "مؤنث" میں تقسیم کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ اس میں جسم اور فزیالوجی کے حوالے سے بہت سے اختلافات موجود ہیں۔ یہ دونوں انعقاد نطفہ کے آغاز ہی سے اپنے اپنے راستے ایک دوسرے سے جدا کر لیتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنی ذمہ داری کے مطابق آگے بڑھتے ہیں اور تکامل و ارتقاء کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

اس کے بعد اس بار کو قبول کرنے، اٹھانے، اس کی حفاظت کرنے، غذا دینے اور پرورش کرنے کے لیے ماں کی ذمہ داری کا ذکر آتا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس نے صدیوں سے عظیم علماء اور دانشوروں کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا ہے اور وہ اس بات کے معترف ہیں کہ یہ مسئلہ عالمِ ہستی کے عجیب ترین مسائل میں سے ہے۔

آخری مرحلہ بچہ کی پیدائش کا ہے، یہ ایک نہایت سخت اور تغیراتی مرحلہ ہے کہ جو بہت سے عجائبات کا حامل ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں کہ جو بچے کو شکمِ مادر سے باہر نکلنے کا حکم دیتے ہیں؟ اس حکم اور اندامِ مادر کا اس کے لیے آمادہ ہونا، ان دونوں کے درمیان کیسی مکمل ہم آہنگی برقرار ہوتی ہے؟

بچہ اس وضع و کیفیت کو کہ جس کا وہ نو ماہ سے عادی تھا لحظہ بھر میں کیسے بالکل بدل دیتا ہے اور ماں سے اپنا رابطہ منقطع کر لیتا ہے اور آزاد ہوا سے استفادہ کرنے لگتا ہے۔ اس کی غذا کی آمد و رفت

---

[1] "نطفہ" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اصل میں پانی یا تھوڑے سے صاف پانی کو کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس تھوڑے سے پانی کے لیے یہ لفظ بولا جانے لگا کہ جو انعقاد جنین کی بنیاد بنتا ہے۔

بند ناف کی راہ سے اچانک بند ہو جاتی ہے اور غذا کی آمد و رفت کے لیے ایک نیا راستہ یعنی اس کا منہ کام کرنے لگتا ہے۔ ماں کے پیٹ کا تاریک ماحول چھوڑ کر روشنی میں آجاتا ہے، اور ان تمام تغیرات کا مقابلہ کرتا ہے اور فوری طور پر خود کو ان کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

کیا یہ خدا کے بے پایاں علم و قدرت کی بہترین نشانی نہیں ہے؟ اور کیا بے شعور مادہ، اور بے ہدف طبیعت اور اندھے اتفاقات زنجیر خلقت کے ہزاروں حلقوں میں سے ایک چھوٹے سے حلقے کی تنظیم کا کام بھی سرانجام دے سکتے ہیں؟ کس قدر بے انصافی ہے کہ انسان اپنی خلقت کے بارے میں اس قسم کے موہوم خیالات کو قبول کرلے۔

اس کے بعد اس عجیب و غریب نظام عمل کے چھٹے اور ساتویں مرحلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ عمر کے مختلف مراحل کی مختلف عوامل کے زیر اثر زیادتی اور کمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "کوئی شخص طولانی عمر نہیں پاتا اور کسی کی عمر میں کمی نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ خدا کے علم کی کتاب میں ثبت ہے"۔ یہ کام ایسے قوانین اور نظام کی پیروی کرتا ہے، کہ جن پر اس کا علم و قدرت حکم فرما ہے (وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہ الا فی کتاب)۔[1]

وہ کون سے عوامل ہیں جو حیاتِ انسانی کو جاری رکھنے میں مؤثر ہیں اور وہ کون سے عوامل ہیں کہ جو اس کی حیات کو جاری رکھنے کی مخالفت کرتے ہیں؟ یعنی وہ کون سے عوامل ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے انسان سو سال یا اُس سے کم و بیش زندگی کو جاری رکھ سکے، اور وہ کون سے عوامل ہیں کہ جو انسانوں کی عمر میں اختلاف کا سبب بنتے ہیں؟

یہ سب کے سب امور دقیق اور پیچیدہ حقائق رکھتے ہیں، کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں ہے موجودہ زمانے میں ہم جو کچھ اس سلسلے میں جانتے ہیں وہ اس کے مقابلے میں کہ جسے ہم نہیں جانتے بہت ہی کم ہے اور زیادہ قدر و قیمت کا حامل نہیں ہے۔

"معمّر" "عمر" کے مادہ سے ہے۔ اصل میں یہ لفظ "عمارت" سے لیا گیا ہے کہ جو آبادی کے معنی میں ہے۔ یہ جو حیاتِ انسانی کی مدت کو "عمر" کہا جاتا ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ اس کے بدن کی "عمارت" اور آبادی اسی مدت میں ہے۔ "معمّر" اس شخص کے معنی میں ہے کہ جس کی عمر طولانی ہو۔

آخر کار آیت کو اس جملے پر ختم کر دیا گیا ہے: "یہ سب کچھ خدا کے لیے آسان ہے" (انّ ذالک علی اللہ یسیر)۔

---

[1] "کتاب" سے مراد خدا کا بے پایاں علم ہے اور یہ جو بعض اس سے لوح محفوظ یا "حیاتِ انسانی کا نامہ اعمال" مراد لیتے ہیں تو یہ مفہوم بھی علم خدا کی طرف لوٹتا ہے۔

اس عجیب و غریب موجود کی "مٹی" سے خلقت اور "نطفہ کے پانی" سے ایک کامل انسان کی خلقت کا آغاز اور اسی طرح زوجیت، حمل، وضع حمل اور عمر کی زیادتی و کمی سے متعلق مسائل چاہے وہ قدرت کے لحاظ سے ہوں یا علم و حساب کے لحاظ سے، سب کے سب اس کے لیے سہل اور آسان ہیں۔ یہ سب دنیائے انفس میں اُس کی نشانیوں کا ایک گوشہ ہے۔ یہ امور ایک طرف تو ہمیں عالم ہستی کے مبداء سے مربوط و آشنا کرتے ہیں اور دوسری طرف معاد و قیامت کے امکان پر زندہ دلائل شمار ہوتے ہیں۔

وہ ذات کہ جو "مٹی" اور "نطفہ" سے پہلی خلقت پر قادر ہے، کیا وہ انسانوں کی حیاتِ نو پر قادر نہیں ہے؟

اور وہ ذات کہ جو ان قوانین سے مربوط تمام جزئیات سے باخبر ہے، کیا اسے بندوں کے حساب و کتاب کو قیامت کے میدان کے لیے محفوظ رکھنے میں کوئی مشکل ہوگی؟

⁂

بعد والی آیت میں آفاق میں اس کی عظمت و قدرت کی کچھ نشانیاں ذکر کی گئی ہیں۔ دریاؤں کی خلقت اور ان کی برکات و فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "دو دریا یکساں نہیں ہیں، اُن میں سے ایک عمدہ، شیریں اور پینے میں خوشگوار ہے اور ان میں سے دوسرا کھاری اور گلوگیر ہے" (وما یستوی البحران ھٰذا عذب فرات سائغ شرابہ وھٰذا ملح اجاج)[1]

اگرچہ وہ دونوں پہلے دن تو بارش کے شیریں قطرات کی شکل میں آسمان سے زمین پر برسے تھے اور دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا، لیکن اب گویا دونوں کا چہرہ مختلف ہے اور مختلف فوائد کے حامل ہیں۔

اور تعجب کی بات یہ ہے کہ: "تم ان دونوں ہی سے تر و تازہ گوشت کھاتے ہو" (ومن کل تأکلون لحمًا طریًّا)۔

"اور دونوں سے ہی پہننے کے لیے زینت کی چیزیں نکالتے ہو" (وتستخرجون حلیۃ تلبسونھا)۔

علاوہ ازیں دونوں ہی سے مال و متاع اور نقل و حمل کے لیے فائدہ اٹھاتے ہو، لہٰذا تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ جو ہر طرف دریاؤں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں، تاکہ تم خدا کے فضل سے فائدہ اٹھاؤ، شاید اس کے شکر کا حق ادا کرو" (وتری الفلک فیہ مواخر لتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون)۔

---

[1] "عذب" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے پاکیزہ اور سرد کے معنی میں ہے اور "لسان العرب" میں اس کا معنی صرف پاکیزہ پانی بیان ہوا ہے (الماء الطیب) ممکن ہے کہ اس کا ٹھنڈا و شیریں ہونا بھی "طیب" کے مفہوم میں داخل ہو۔

چند قابلِ غور نکات

۱۔ "فرات" "لسان العرب" کے مطابق ایسا پانی ہے کہ جو بہت صاف ستھرا اور شیریں ہو۔ "سائغ" اس پانی کے معنی میں ہے کہ جو خوشگوار ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ گلے سے نیچے چلا جاتا ہے" "ملح" (شور پانی) کے برعکس۔ جبکہ "اجاج" ایسا کڑوا پانی ہے کہ جس سے گلے میں جلن ہو اور جو حلق کو بند کر دے۔

۲۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ مومن وکافر کی عدم مساوات کی ایک مثال ہے۔ لیکن قبل و بعد کی آیات کہ جو خلقت کی نشانیوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ یہ جملہ بھی اسرارِ توحید کے سلسلے میں ہے اور پانی کی مختلف قسموں، مختلف آثار اور مشترک فوائد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ اس آیت میں دریاؤں اور سمندروں کے بہت سے فوائد میں سے تین فائدے بیان ہوتے ہیں۔ ۱۔ غذا۔ ۲۔ زینت کی چیزیں اور ۳۔ نقل وحمل۔

ہم جانتے ہیں کہ سمندر اور دریا نوعِ بشر کے منابع غذائی میں سے ایک اہم منبع ہے، اور ہر سال کئی ملین ٹن گوشت اس سے حاصل کیا جاتا ہے بغیر اس کے کہ انسان اس کے لیے تکلیف اور مشقت اٹھائے۔ کارخانۂ قدرت نے اس سلسلے میں ایک دقیق نظام بنایا ہے تاکہ انسان خدا کے اس بچھے ہوئے دستر خوان اور خوانِ نعمت سے تھوڑی سی زحمت کرکے فائدہ حاصل کریں۔

زینت وتزئین کی مختلف چیزیں "صدف"، "موتی" اور "مرجان" اس سے نکالے جاتے ہیں۔ قرآن نے اس مسئلے کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ انسان کی روح چوپاؤں کی طرح نہیں ہے بلکہ مختلف جہات کی حامل ہے کہ جن میں سے ایک زیبائش کی حس ہے جو ذوق، ہنر اور ادب کا سرچشمہ ہے۔ یہ انسانی حس اگر ہر قسم کے افراط وتفریط اور اسراف و تبذیر سے بچتے ہوئے صحیح صورت میں سیر ہو تو یہ روح کی شادابی کا باعث ہے اور اس سے انسان کو نشاط اور سکون ملتا ہے اور وہ زندگی کے سخت کاموں کی انجام دہی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔

باقی رہا نقل وحمل کا مسئلہ تو یہ انسانی تمدن اور معاشرتی زندگی کی ایک اہم بنیاد ہے۔ سمندروں نے زیادہ تر زمین کے حصے کو گھیر رکھا ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، اس امر کی طرف توجہ کی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نقل وحمل کے سلسلے میں سمندر انسانوں کی نہایت اہم خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔

اس سازوسامان کا حجم کہ جس کی سمندروں کے ذریعے نقل وحمل ہوتی ہے اور وہ مسافر کہ جو ان

کے ذریعے اِدھر اُدھر آتے جاتے ہیں، اس قدر زیادہ ہیں کہ کسی بھی دوسرے ذریعے پر اس کا قیاس نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ بعض اوقات ایک سمندری جہاز ہزارہا موٹروں اور ٹرکوں کے برابر بار اٹھا کر لے جاتا ہے[1]

۴۔ البتہ سمندروں کے فوائد مذکورہ مسائل تک ہی منحصر نہیں ہیں اور قرآن ان کو ان ہی تین امور میں محدود نہیں کرتا، بادل ان سے بنتے ہیں، دوائیوں کے لیے مواد، تیل، پہننے کی چیزیں، بنجر زمینوں کی تقویت کے لیے مواد ان سے حاصل ہوتا ہے۔ ہَواؤں کے پیدا ہونے میں ان کا کردار بھی قابلِ ذکر ہے اور ان کے علاوہ سمندروں کی اور بھی برکات بہت سی ہیں۔

۵۔ "لحماً طریًا" (تر و تازہ گوشت) پر قرآن کا اظہار اس قسم کے گوشت کے غذائی فوائد کے بارے میں، پرانے اور ڈبوں میں بند اور اسی قسم کے دوسرے گوشتوں کے مقابلے میں ـــــ ایک پُرمعنی اشارہ ہے۔

۶۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کڑوے اور شور سمندر تو سارے کرۂ زمین میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن میٹھے پانی کے سمندر کہاں ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میٹھے پانی کے سمندر اور بحیرے بھی کرۂ زمین میں کم نہیں ہیں مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ وغیرہ میں میٹھے پانی کے چھوٹے چھوٹے سمندر ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے دریاؤں کو بھی "بحر" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے واقعے میں لفظ "بحر" کا دریائے نیل پر اطلاق ہوا ہے۔ (بقرہ۔ ۵۰، شعراء۔ ۶۳ اور اعراف ۱۳۸)۔

اس سے قطع نظر بڑے بڑے دریاؤں کا پانی سمندروں کے اندر تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ سمندروں کے شور پانی کو پیچھے دھکیل دیتا ہے اور کچھ عرصے تک ان میں مخلوط نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ خود میٹھے پانی کا ایک عظیم سمندر بنا دیتا ہے۔

۷۔ "لتبتغوا من فضلہ" (تاکہ اس کے فضل سے فائدہ اٹھاؤ) یہ جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس میں ہر وہ اقتصادی نقل و حرکت شامل ہے کہ جو سمندروں کے راستے سے ہوتی ہے۔

اور "لعلکم تشکرون" کا جملہ انسانوں کے احساسِ شکرگزاری کو بیدار کرنے کے لیے آیا ہے اور یہ احساس خدا جوئی اور خدا شناسی کے لیے ایک ذریعہ ہے۔

---

[1] اس وقت بھی پانچ لاکھ ٹن تک تیل لے جانے والے جہاز موجود ہیں۔ نقل و حمل کا کوئی بھی دوسرا ذریعہ ان کی جگہ نہیں لے سکتا اور سمندروں کے علاوہ کوئی بھی راستہ اس کو اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ گزشتہ زمانوں میں بھی کشتیوں اور بحری جہازوں کی صلاحیت چوپاؤں کی نسبت بہت زیادہ تھی۔

طویل عمر اور کم عمر کے روحانی عوامل

زیر بحث آیات میں پروردگار کے فرمان سے عمر کی زیادتی اور کمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں روایات بھی وارد ہوئی ہیں۔ اسی مناسبت سے مفسرین نے بھی عمر کے طویل اور کوتاہ ہونے کے بارے میں کئی بحثیں کی ہیں۔

البتہ طبیعی عوامل کا ایک سلسلہ عمر کی زیادتی یا کمی میں دخل رکھتا ہے کہ جن میں سے بہت سے عوامل کو نوعِ بشر نے اب تک پہچان لیا ہے۔ مثلاً افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صحیح غذا کھانا، کام اور حرکت میں رہنا، ہر قسم کے نشے، خطرناک عادات اور الکحل کی مشروبات سے پرہیز کرنا، ہر وقت کے ہیجانات سے دُور رہنا اور قوی اور مضبوط ایمان رکھنا کہ جو انسان کی زندگی کی ناہمواریوں میں سکون بخش سکے۔

ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے عوامل ہیں کہ جن کا طول عمر کے ساتھ ظاہری ارتباط ہم پر چنداں واضح نہیں ہے۔ مگر روایاتِ اسلامی میں ان کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل کی چند روایات پر توجہ فرمائیں:

الف۔ پیغمبر گرامیؐ فرماتے ہیں:

ان الصدقة وصلة الرحم تعمران الديار وتزيدان فی الاعمار۔

راہِ خدا میں خرچ کرنا اور صلہ رحمی گھروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتا ہے[1]

ب۔ ایک اور حدیث میں رسولِ اکرمؐ ہی سے منقول ہے:

من سره ان يبسط فی رزقه و ينسئ له فی اجله فليصل رحمه۔

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اُس کے رزق میں زیادتی ہو، اور اس کی اجل میں تاخیر ہو تو اسے چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے[2]

ج۔ بعض گناہوں بالخصوص زنا اور بدکاری کے متعلق وارد ہوا ہے کہ وہ انسان کی عمر میں کمی کا باعث بنتے ہیں۔ پیغمبرِ اکرمؐ کی مشہور حدیث میں ہے کہ:

یا معشر المسلمين اياكم والزنا فان فيه ست خصال: ثلاث فی الدنيا، و ثلاث فی الأخرة، اما التی فی الدنيا فانه يذهب بالبهاء و يورث الفقر و ينقص العمر۔

اے مسلمانو! زنا سے پرہیز کرو کیونکہ اس کے چھ بُرے نتائج ہیں، تین دنیا میں اور

---

[1] و [2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۵۴ و ص ۳۵۵۔

تین آخرت میں۔ وہ تین کہ جو دنیا میں ہیں، یہ ہیں: انسان کے (چہرے) کی رونق اور نورانیت ختم ہو جاتی ہے، فقر و فاقہ اور تنگدستی آ جاتی ہے اور انسان کی عمر کم ہو جاتی ہے [1]

د۔ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

البر وصدقة السر ينفيان الفقر و يزيدان فى العمر و يدفعان عن سبعين ميتة سوء۔

نیکوکاری اور پوشیدہ طریقے سے صدقہ دینا فقر و فاقہ کو دُور کرتا ہے، عمر میں زیادتی کرتا ہے اور ستر قسم کی بُری موت سے بچاتا ہے [2]

بعض دوسرے گناہوں کے متعلق مثلاً ظلم بلکہ مطلق گناہوں کے بارے میں بھی کچھ اشارے آتے ہیں۔

بعض مفسرین کہ جو "اجل حتمی" اور "اجل معلق" کے درمیان فرق نہیں کر سکے، انہوں نے اس قسم کی احادیث پر سخت اعتراض کیا ہے اور انہیں نصوصِ قرآنی کے مخالف سمجھا ہے کیونکہ وہ انسان کی حدِ عمر کو ثابت اور غیر متبدل سمجھتے ہیں [3]

اِس کی وضاحت

اس میں شک نہیں کہ انسان دو قسم کی اجل رکھتا ہے۔

ایک اجل حتمی کہ جو جسمِ انسانی کی استعدادِ بقار کا اختتام ہے۔ اس کے پہنچ جانے سے ہر چیز فرمانِ الٰہی سے ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری اجل معلق کہ جو حالات و شرائط بدلنے کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ مثلاً ایک انسان خودکشی کر لیتا ہے حالانکہ وہ اگر اس گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کرتا تو شاید سالہا سال زندہ رہتا۔ اسی طرح الکحل کے مشروبات، نشہ آور چیزیں اور بے لگام شہوت پرستی سے بھی انسان اپنے جسم کی توانائی مختصر سی مدت میں کھو بیٹھتا ہے، حالانکہ اگر یہ امور نہ ہوتے تو وہ سالہا سال تک زندہ رہ سکتا تھا۔

یہ ایسے امور ہیں کہ جو سب کے لیے قابلِ ادراک ہیں اور تجربے میں آ چکے ہیں اور کوئی بھی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۳۵۴ و صفحہ ۳۵۵۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۲۳ مادہ "صدقہ"۔

[3] تفسیر آلوسی جلد ۲۲ صفحہ ۱۶۴ (زیرِ بحث آیات کے ذیل میں)۔

اچانک پیش آنے والے واقعات اور حادثات کے بارے میں کچھ امور اجل معلق کے ساتھ مربوط ہیں کہ جو قابل انکار نہیں ہیں۔

اس بنا پر اگر بکثرت روایات میں یہ منقول ہوا ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنا یا صلہ رحمی عمر کو طولانی کر دیتا ہے اور مصیبتوں کو برطرف کر دیتا ہے تو وہ بھی حقیقت میں انہیں عوامل کے پیش نظر ہے۔

اگر ہم اجل اور عمر کے خاتمہ کی یہ دو قسمیں ایک دوسرے سے جدا نہ کریں تو قضا و قدر اور سعی و کوشش کے اثرات سے مربوط بہت سے مسائل انسانی زندگی میں لاینحل ہو کر رہ جائیں۔

اس بحث کو ایک عام اور سادہ مثال کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نئی موٹروں کا ایک کارخانہ لگاتا ہے۔ فرض کریں کہ مختلف تخمینوں کے مطابق کہ وہ بیس سال تک چل سکتی ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پوری احتیاط کے ساتھ ان کی دیکھ بھال کی جائے اور ضروری حفاظت کی جائے۔ اس صورت میں اس موٹر کی حتمی عمر بیس سال ہوگی کہ جس سے آگے وہ نہ چل سکے گی۔

لیکن اگر ضروری حفاظت اور دیکھ بھال نہ کی جائے اور اسے ناواقف اور بے پرواہ لوگوں کے سپرد کر دیا جائے اور اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لیا جائے، روزانہ سنگلاخ راستوں پر اسے چلایا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی بیس سالہ عمر آدھی رہ جائے یا دسویں حصے تک کم ہو جائے تو یہ اس کی "اجلِ معلق" ہے۔

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ بعض مشہور مفسرین نے اس قسم کے واضح اور روشن مسئلے کی طرف توجہ کیوں نہیں کی ہے۔

۱۳ يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِن قِطْمِيرٍ ۝

۱۴ إِن تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ۝

ترجمہ

۱۳ وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ سورج اور چاند کو اس نے (تمہارے لیے) مسخر کر دیا ہے' ان میں سے ہر ایک کو ایک معین وقت تک اپنی حرکت جاری رکھنا ہے۔ یہ ہے تمہارا پروردگار اللہ (سارے عالم کی) حاکمیت اسی کے لیے ہے۔ اور جنہیں تم اس کے علاوہ پکارتے ہو (اور ان کی عبادت کرتے ہو) وہ تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے برابر بھی حاکمیت (اور مالکیت) نہیں رکھتے۔

۱۴ اگر تم انہیں پکارو گے تو وہ تمہاری آواز نہیں سنیں گے اور اگر سن بھی لیں تو تمہیں کوئی جواب نہیں دیں گے، اور قیامت کے دن تمہارے شرک (اور پرستش) کا انکار کر دیں گے اور کوئی بھی تجھے خبیر (اور آگاہ خدا) کی مانند (حقائق سے

باخبر نہیں کرے گا۔

تفسیر

یہ جھوٹے معبود تو تمہاری آواز تک نہیں سنتے

ان آیات میں قرآن ایک مرتبہ پھر توحید کی نشانیوں اور پروردگار کی بے پایاں نعمتوں کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ انسان کے احساس تشکر کو ابھار کر اُسے معبودِ حقیقی کی شناخت کی طرف لایا جائے اور اسے ہر قسم کے شرک اور بے ہودہ عبادتوں سے باز رکھا جائے، فرمایا گیا ہے: "وہ وہی ہے کہ جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔" (یولج الیل فی النہار و یولج النہار فی الیل)۔

"یولج" "ایلاج" کے مادہ سے داخل کرنے کے معنی میں ہے، ممکن ہے اس لفظ سے ذیل کے دو معانی میں سے ایک کی طرف یا دونوں کی طرف اشارہ ہو۔

۱۔ سال بھر میں رات دن کی تدریجی زیادتی اور کمی کہ جو۔ اپنے تمام آثار و برکات کے ساتھ۔ مختلف موسموں کی پیدائش کا سبب ہے۔

شفق اور بین الطلوعین کے ذریعے رات کا دن میں اور دن کا رات میں بتدریج منتقل ہونا، کہ جو اچانک اور ناگہانی طور پر ظلمت سے نور کی طرف اور نور سے ظلمت کی طرف منتقل ہونے کے خطرات سے روکتا ہے، اور انسان کو مکمل اور بے خطر ایک کیفیت سے دوسری میں جانے کے قابل بناتا ہے[1]

اس کے بعد سورج اور چاند کی تسخیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔" (و سخر الشمس والقمر)۔

اس سے بڑھ کر اور تسخیر کیا ہوگی کہ وہ سب انسان کے فائدے میں حرکت کر رہے ہیں اور انسانی زندگی میں انواع و اقسام کی برکات کا سرچشمہ ہیں۔ اَبر، ہَوا، سورج، چاند اور فلک سب کے سب کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ انسان اپنی زندگی کو سنوار سکے اور غفلت میں وقت نہ گزارے اور مسلسل ان نعمات کے اصل منبع کی یاد میں رہے۔ (سورج اور چاند کی تسخیر کے سلسلے میں ہم جلد ۵ سورہ رعد کی آیہ ۲ اور سورہ ابراہیم کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں)۔

لیکن یہ سورج اور چاند باوجودیکہ پورے طور پر منظم طریقے سے اپنے راستے پر چل رہے ہیں اور انسان

---

[1] رات اور دن کی تدریجی تبدیلی کے بارے میں جلد دوم میں سورہ آل عمران کی آیہ ۲۷ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

کے اچھے خدمت گزار ہیں، تاہم جو نظام ان پر حاکم ہے وہ جاودانی اور ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ یہاں تک کہ یہ عظیم سیارے بھی باوجود اس نور کے آخرکار تاریک اور بے کار ہو جائیں گے۔

اس لیے قرآن تسخیر کے بارے میں بات کرنے کے بعد مزید کہتا ہے: "ان دونوں میں سے ہر ایک ایک خاص زمانے تک کہ جو ان کے لیے معین ہوا ہے اپنی حرکت جاری رکھے گا" (کل یجری لاجل مسمّی)۔

اور "اذا الشمس کورت، و اذا النجوم انکدرت" (تکویر۔ ۱ و ۲) کے تقاضے کے مطابق آخرکار یہ سب کے سب تاریکی اور خاموشی میں ڈوب جائیں گے۔

بعض مفسرین نے "اجل مسمّی" (معین وقت) کے لیے ایک دوسری تفسیر کی ہے اور وہ سورج اور چاند کی حرکت دوری ہے کہ جن میں سے پہلی ایک سال میں مکمل ہوتی ہے اور دوسری ایک ماہ میں ختم ہوتی ہے[1]

لیکن قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ تعبیر عمر کے ختم ہونے کے معنی میں آئی ہے۔ ان مواقع استعمال کی جانب توجہ کی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ تفسیر درست نہیں ہے اور پہلی تفسیر ہی درست ہے یعنی چاند اور سورج کی عمر کا اختتام۔ (نحل۔ ۶۱، فاطر۔ ۴۵، زمر۔ ۴۲، نور۔ ۴ اور مؤمن۔ ۶۷ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

پھر توحید کی اس بحث سے نتیجہ نکالنے کے طور پر فرمایا گیا ہے: "یہ ہے خدا تمہارا عظیم پروردگار" (ذالکم اللہ ربکم)۔

وہ خدا کہ جس نے سورج او چاند کے نور و ظلمت اور حرکات کے حساب شدہ نظام کو تمام برکات کے ساتھ مقرر فرمایا ہے۔

عالم ہستی میں حاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے" (لہ الملک)۔

"اور وہ معبود کہ جنہیں تم اسے چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ تو کھجور کی گٹھلی کے اوپر کی نازک جھلی کے برابر بھی عالم ہستی میں حق حاکمیت اور مالکیت نہیں رکھتے" (والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیر)[2]

"قطمیر" مفردات میں راغب کے مطابق وہ جھلی ہے کہ جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتی ہے اور مجمع البیان میں طبرسی کے مطابق اور تفسیر قرطبی کے مطابق یہ ایک پتلا سا سفید رنگ کا چھلکا ہے کہ جو پوری گٹھلی کو چھپاتے ہوتا ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی اور ابو الفتوح رازی۔

[2] الذین کی تعبیر کہ جو عام طور پر جمع مذکر عاقل کے لیے آتی ہے، بتوں کے بارے میں مشرکین کے توہم کی بنا پر ہے کہ جو وہ ان بے جان موجودات سے متعلق رکھتے تھے قرآن انہی کی تعبیر ذکر کرکے، پھر اس کی سختی سے تردید کرتا ہے۔

بہرحال یہ بہت ہی چھوٹی اور حقیر اسم چیز کی طرف اشارہ ہے۔

جی ہاں! یہ بُت نہ تو کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان، نہ وہ تمہارا دفاع کرسکتے ہیں اور نہ ہی اپنا، نہ وہ حاکمیت رکھتے ہیں اور نہ ہی مالکیت۔ یہاں تک کہ کھجور کی گٹھلی کے اوپر کی جھلی پر بھی نہیں اس حالت میں تم بے عقل کس طرح ان کی پرستش کرتے ہو اور اپنی مشکلات کا حل ان سے چاہتے ہو۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "اگر تم انہیں اپنی مشکلات کے حل کے لیے پکارو تو وہ ہرگز تمہاری پکار نہیں سنتے" (ان تدعوھم لایسمعوا دعائکم)۔

کیونکہ وہ چند پتھروں اور لکڑی کے ٹکڑوں کے علاوہ کچھ نہیں ہیں؛ وہ بے شعور جمادات ہی تو ہیں۔

"اور بالفرض وہ تمہارے نالہ و فریاد کو سن بھی لیں تب بھی وہ تمہاری حاجات کا جواب دینے کی توانائی نہیں رکھتے" (ولو سمعوا ما استجابوا لکم)۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ تو کھجور کی گٹھلی کی جھلی کے برابر بھی عالم ہستی میں سود و زیاں کے مالک نہیں ہیں، اس کے باوجود تم کس طرح سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے لیے کوئی کام کرسکیں گے یا تمہاری کوئی مشکل آسان کرسکیں گے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "جب قیامت کا دن ہوگا تو وہ تمہاری عبادت اور شرک کا انکار کردیں گے" (و یوم القیامة یکفرون بشرککم)۔

اور کہیں گے کہ خداوندا! یہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ حقیقت میں یہ تو اپنے نفس کی پرستش کرتے تھے۔

یہ گواہی یا تو زبانِ حال کے ساتھ ہے، کہ جو شخص بتوں کی حالت کو دیکھے تو وہ گوش ہوش کے ساتھ یہ بات ان سے سنتا ہے اور یا یہ بات ہے کہ وہ خدا جو اس دن انسان کے اعضاء و جوارح اور بدن کی جلد کو قوتِ گویائی دے گا، انہیں بھی بات کرنے کا فرمان جاری کرے گا، تاکہ وہ یہ گواہی دیں کہ یہ منحرف بُت پرست حقیقت میں اپنے اوہام اور خواہشات کی پرستش کرتے تھے۔

سورہ یونس کی آیت ۲۸ میں بھی ایسی بات بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

و یوم نحشرھم جمیعًا ثم نقول للذین اشرکوا مکانکم انتم و شرکاؤکم فزیلنا بینھم و قال شرکاؤھم ما کنتم ایانا تعبدون۔

"اور اس دن کو یاد کرو کہ جب ہم اُن سب کو جمع کریں گے، پھر ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ پر ٹھہرو (تاکہ تمہارا حساب کتاب چکایا جائے) پھر ہم انہیں ایک دوسرے سے جدا کردیں گے (تاکہ ہر ایک سے الگ الگ سوال ہو) تو وہاں ان کے معبود ان سے کہیں گے، تم ہرگز ہماری

عبادت نہیں کرتے تھے۔

مفسرین کے ایک گروہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ تعبیر ملائکہ اور حضرت عیسیٰ جیسے "معبودوں" کے بارے میں ہے، کیونکہ قیامت میں صرف وہی بات کرسکیں گے اور "ان تدعوھم لا یسمعوا دعائکم" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں ایسے مشغول ہوں گے کہ اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری باتوں کو نہیں سنیں گے۔[1]

لیکن "والذین تدعون من دونہ" کے مفہوم کی وسعت کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ مراد بُت ہی ہیں، "ان تدعوھم لا یسمعوا دعائکم" (اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری آواز کو نہیں سنتے) یہ جملہ ظاہراً دنیا کے ساتھ مربوط ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: "خدا کے مانند کہ جو ہر چیز سے آگاہ ہے، کوئی بھی تجھے باخبر نہیں کرے گا" (ولا ینبئک مثل خبیر)۔

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ بُت قیامت میں تمہاری پرستش کا انکار کردیں گے اور تم سے بیزاری اختیار کریں گے، تو اس سے تعجب نہ کرو، کیونکہ ایسی ذات اس موضوع کی خبر دے رہی ہے کہ جو تمام عالم ہستی اور اس کے ذرہ ذرہ سے آگاہ ہے، اس کے علم کی بارگاہ میں مستقبل بھی ماضی اور حال کی طرح آشکار ہے۔

اگرچہ اس جملے میں ظاہراً ذاتِ پیغمبرؐ مخاطب ہے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ نظر تمام انسانوں پر ہے۔

آیات سے سوءِ استفادہ اور انحرافی تفاسیر

اگرچہ آیات کی تفسیر کے دوران میں واضح ہوگیا ہے کہ آخری زیر بحث آیت "ان تدعوھم لا یسمعوا دعائکم" سے مراد بُت ہیں کہ جو اول تو اپنی عبادت کرنے والوں کے تقاضوں کو سننے والا کان ہی نہیں رکھتے، اور اگر رکھتے بھی تو ان کی مشکل حل کرنے پر قادر نہیں ہیں، اور نہ ہی وہ عالم ہستی میں سوئی کی نوک کے برابر مالکیت وحاکمیت رکھتے ہیں۔

لیکن بعض ہٹ دھرم وہابیوں نے پیغمبر اسلامؐ اور ہادیانِ برحق پیشواؤں سے توسل اور شفاعت طلب کرنے کے خلاف اس آیت اور اسی قسم کی دوسری آیات کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے کہ وہ تمام لوگ کہ جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو یہاں تک کہ انبیاء اور پیغمبر بھی تمہاری بات نہیں سنتے اور اگر سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے یا جیسا کہ سورہ اعراف کی آیہ ۱۹۷ میں بیان ہوا ہے کہ:

---

[1] یہ احتمال تفسیر مجمع البیان، تفسیر آلوسی اور قرطبی میں مذکور ہے۔

والذین تدعون من دونه لا یستطیعون نصرکم ولا انفسهم ینصرون۔

"خدا کے علاوہ جن جن کو تم پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ اپنی مشکلات میں اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں"۔

وہ لوگ اس قسم کی آیات اور اس طرح سے پیغمبروں اور آئمہ کے ارواح سے ہر قسم کے توسل کی نفی کرتے ہیں، اور اسے توحید کے مخالف شمار کرتے ہیں۔

حالانکہ ان آیات سے پہلے اور بعد کی آیات پر ایک سرسری سی نگاہ اس حقیقت کے ادراک کے لیے کافی ہے کہ اس سے مراد بت ہیں کیونکہ ان تمام آیات میں بتوں ہی کے بارے میں گفتگو ہے۔ پتھر اور لکڑی کے متعلق گفتگو ہے کہ جنہیں وہ خدا کا شریک خیال کرتے تھے اور وہ ان کے لیے خدا کی قدرت کے مقابلے میں قدرت کے قائل تھے۔

لیکن کون نہیں جانتا کہ شہداء راہ خدا کی طرح ۔ کہ جن کی زندگی کے بارے میں قرآن صراحت کے ساتھ بات کرتا ہے ۔ انبیاء و اولیاء بھی حیات برزخی کے حامل ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ برزخی زندگی میں روح کی فعالیت زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔ کیونکہ وہ مادی حجابات اور دنیوی تعلقات سے رہائی پا چکی ہوتی ہے۔

دوسری طرف ان ارواح پاک سے توسل اس معنی میں نہیں ہے کہ ہم ان کے لیے خدا کے مقابلے میں کسی استقلال کے قائل ہوں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کی جاہ و منزلت جو بارگاہ خدا میں ہے اس سے ہم مدد طلب کریں اور جو عظمت و احترام وہ درگاہ خدا میں رکھتے ہیں اس سے مدد چاہیں اور یہ عین توحید اور عبودیت پروردگار ہے۔ (غور کیجئے گا)

اس بناء پر جیسا کہ قرآن صراحت کے ساتھ مسئلہ شفاعت کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ خدا کے اذن اور فرمان سے شفاعت کریں گے:

من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنه

"کون ہے کہ جو بارگاہ خدا میں اس کے فرمان کے بغیر شفاعت کر سکے"۔ (بقرہ - ۲۵۵)

اسی طرح ان سے توسل بھی اسی طریقے سے ہے۔

کون شخص ہے کہ جو توسل کی صریح آیات کا انکار کر سکے؟ یا اُسے شرک خیال کرے اور قرآن کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے اور پھر توحید کا دم بھرے سوائے ایسے مغرور جاہلوں کے کہ جنہوں نے ایسے منحوس راگ الاپے ہیں کہ جو مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنے کا سبب ہیں۔

لہٰذا ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ وہ مشکلات کے وقت رسول اکرمؐ کی قبر کے پاس آتے تھے اور توسل قائم کرتے ہوئے آپؐ کی روح پاک سے بارگاہ خداوندی میں مدد

طلب کرتے تھے۔

جیساکہ اہلِ سنت کے مشہور محدث "بیہقی" نے نقل کیا ہے کہ خلیفۂ دوم کے زمانہ میں خشک سالی اور قحط پڑ گیا، تو حضرت بلالؓ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ پیغبرِ اکرمؐ کی قبر کے پاس آئے اور اس طرح کہا:

یا رسول اللہ استق لامتك .... فانهم قد هلکوا

"اے خدا کے رسولؐ! اپنی امت کے لیے بارش طلب کیجئے ... کہ وہ ہلاک ہوگئی ہے"[1]

آلوسی کے مانند اہلِ سنت کے بعض مفسرین نے اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل کی ہیں آلوسی ان احادیث کے بارے میں سختی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

مَیں ان تمام باتوں کے باوجود بارگاہِ خدا میں پیغمبر کے مرتبے سے توسل میں کچھ مانع نہیں دیکھتا، چاہے وہ حیات ہوں یا ان کی وفات کے بعد ...

اس کے بعد کچھ دوسرے لوگوں کا کہ جو بارگاہِ خدا میں مرتبہ و مقام رکھتے ہیں اضافہ کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ ان سے توسل رکھنا جائز ہے[2]

اس سلسلے میں ہم تفصیلی بحث جلد ۳ میں سورۂ مائدہ کی آیت ۳۵ کے ذیل میں کرچکے ہیں۔

---

[1] از کتاب "التوصل الی حقیقۃ التوسل"۔

[2] روح المعانی۔

۱۵ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ○

۱۶ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ○

۱۷ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ○

۱۸ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۱۵ اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور صرف خدا ہی بے نیاز ہے اور ہر قسم کی حمد و ثنا کے لائق ہے۔

۱۶ وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے۔

۱۷ اور یہ امر خدا کے لیے ناممکن (اور مشکل) نہیں ہے۔

۱۸ کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی بھاری بوجھ والا کسی دوسرے کو اپنے گناہ کا بوجھ اٹھانے کے لیے بلائے، تو وہ اس میں سے کوئی چیز اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا، اگرچہ وہ اس کے نزدیکیوں میں سے ہی ہو۔ تم تو صرف انہیں لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو کہ جو

بے دیکھے بھی اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو شخص پاکیزگی (اور تقویٰ) اختیار کرے تو اس کا نتیجہ اسی کو ملے گا اور سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔

تفسیر

کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا

گزشتہ آیات میں توحید کی دعوت تھی اور ہر قسم کے شرک اور بُت پرستی کی نفی کی گئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس سے بعض کے دل میں یہ توہم پیدا ہو کہ خدا کو ہماری پرستش کی کیا ضرورت ہے۔ اس قدر اصرار اور تاکید کیوں کی گئی ہے، اس لیے زیر بحث آیات میں اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے کہ ہمیں تو ضرورت ہے کہ اس کی عبادت کریں، وہ ہماری عبادت کا محتاج نہیں ہے، فرمایا گیا ہے: "اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور وہ ہر لحاظ سے بے نیاز اور حمد و ستائش کے لائق ہے" (یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید)۔

یہ کتنی اہم اور قیمتی گفتگو ہے کہ جو عالم ہستی میں ہمیں ہستی بخشنے والے کے سامنے ہماری حیثیت واضح کرتی ہے اور بہت سے عقدے کھولتی ہے اور بہت سے سوالات کا جواب دیتی ہے۔

ہاں! حقیقی بے نیاز اور تمام عالمِ ہستی میں قائم بالذات ایک ہی ہے اور وہ خدا ہے۔ تمام انسان بلکہ تمام موجودات سرتاپا احتیاج و فقر ہیں اور اس مستقل وجود کے ساتھ وابستہ ہیں، کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا ربط اُس سے ٹوٹ جائے تو وہ بے کار ہو کر رہ جائیں۔

جیسا کہ وہ بے نیازِ مطلق ہے، انسان فقیرِ مطلق ہے اور جس طرح کہ وہ قائم بالذات ہے، ساری مخلوق اس کے ساتھ قائم ہے۔ کیونکہ وہ ہر لحاظ سے ایک لامتناہی وجود ہے اور ذات و صفات میں واجب الوجود ہے۔

تو ان حالات میں اُسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ہماری عبادت کا محتاج ہو، یہ تو ہم ہی ہیں کہ جو اس کی عبادت اور اطاعت کے ذریعے تکامل و ارتقاء کی راہ طے کرتے ہیں اور بے پایاں فیض کے مبداء سے اس کی عبادت کے سائے میں لحہ بہ لحہ زیادہ سے زیادہ نزدیک ہوتے جاتے ہیں، اور اس کی ذات و صفات کے انوار سے بہرہ اندوز ہیں۔

حقیقت میں یہ آیت ان گزشتہ آیات کی ایک وضاحت ہے کہ جن میں فرمایا گیا ہے کہ:

"ذالكم الله ربكم له الملك ...."

"یہ ہے خدا، تمہارا پروردگار، عالم ہستی کی مالکیت وحاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔
دوسرے موجودات تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے برابر بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتے۔"

اس بناء پر انسان اس کے محتاج ہیں نہ کہ کسی اور کے۔ انہیں ہرگز اس کے غیر کے آستانے پر سر نہیں جھکانا چاہیئے۔

اور اپنی حاجت اُس کے غیر سے طلب نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ وہ سب کے سب اس مانگنے والے کی طرح ہی نیازمند اور محتاج ہیں، یہاں تک کہ خدائی پیغمبروں اور پیشوایانِ حق کی بزرگی وعظمت بھی اس بناء پر ہے کہ وہ اس کے بھیجے ہوئے نمائندے ہیں، نہ کہ وہ اپنی طرف سے قائم ہیں۔

اس بناء پر وہ غنی بھی ہے اور حمید بھی یعنی بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر عطا والا ہے کہ ہر قسم کی حمد وستائش کے لائق ہے، اور بخشندگی اور بندہ نوازی کے ساتھ ساتھ سب سے بے نیازی بھی ہے۔

اس حقیقت پر توجہ مومن انسانوں میں دو مثبت اثر رکھتی ہے۔ ایک طرف تو وہ انہیں غرور وتکبر اور خود خواہی اور سرکشی سے بچاتی ہے اور انہیں خبردار کرتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتے کہ جس پر فخر کرسکیں جو کچھ بھی ان کے پاس ہے پروردگار کی امانت ہے۔

دوسری طرف اُس کے غیر کی بارگاہ میں دستِ نیاز دراز نہ کریں اور غیر اللہ کی عبودیت کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالیں اور ان تمام بندھنوں سے آزاد ہو کر ہمت سے کام لیں۔

مومنین اس نظر سے عالم میں جو کچھ دیکھتے ہیں اسے اسی کے وجود کا پرتو سمجھتے ہیں اور ان کے اسباب کی طرف توجہ انہیں ہرگز مسبب الاسباب سے غافل نہیں کرتی۔

بعض فلاسفہ نے اس آیت کو "فقر وامکان" یا "امکان و وجوب واجب الوجود" کے بارے میں مشہور دلیل کی طرف اشارہ سمجھا ہے اگرچہ آیت وجودِ خدا کا استدلال پیش نہیں کر رہی بلکہ اس کے اوصاف بیان کر رہی ہے لیکن مذکورہ برہان کو مفہوم آیت کا ایک لازمی نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے۔

برہان امکان و وجوب (فقر وغنیٰ) کی وضاحت

تمام موجودات کہ جنہیں ہم اس جہان میں دیکھتے ہیں، وہ سب کے سب ایک دن معدوم تھے، پھر انہوں نے لباس وجود پہنا یا زیادہ دقیق تعبیر کے مطابق ایک دن وہ کچھ بھی نہ تھے اور پھر وجود میں آئے۔ یہ امر اس چیز کی دلیل ہے کہ وہ کسی اور وجود کے "معلول" ہیں اور وہ خود سے کوئی وجود وہستی نہیں رکھتے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر معلول وجود اپنی "علت" سے وابستہ اور اس کے ساتھ قائم ہے اور سراپا نیاز و احتیاج ہے۔ اب اگر وہ علت بھی کسی اور علت کی معلول ہو تو وہ بھی اپنے مقام پر محتاج اور نیاز مند ہوگی اور اگر یہ امر لامتناہی ہو تو نیاز مند اور محتاج موجودات کا ایک مجموعہ بن جائے۔ مسلّم ہے کہ اس قسم کا مجموعہ ہرگز وجود میں نہیں آسکتا کیونکہ لامتناہی احتیاج بہرحال احتیاج ہے اور لامتناہی فقر و نیاز بہرحال فقر و نیاز ہے۔ اور لامتناہی صفر کسی عدد کو وجود نہیں بخش سکتے اور لامتناہی وابستہ اور غیر مستقل سے استقلال حاصل نہیں ہو سکتا۔

تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انجام کار ہمیں ایک ایسے وجود تک پہنچنا چاہیئے کہ جو قائم بالذات ہو اور تمام جہات سے مستقل ہو۔ وہ خود علت ہو لیکن کسی اور کا معلول نہ ہو، اور وہی واجب الوجود ہے[1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ زیر بحث آیت میں صرف انسانوں اور ان کی خدا کی طرف احتیاج کے بارے میں گفتگو کیوں کی گئی ہے، جبکہ یہ فقر و احتیاج عالم ہستی میں عمومی حیثیت رکھتا ہے اور کائنات کی ہر چیز محتاج ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انسان جو کہ اس جہان کا گل سر سبد ہے، سرتاپا اس کا محتاج ہے تو پھر باقی موجودات کی حالت واضح ہے۔ دوسرے لفظوں میں باقی موجودات بھی علتِ فقر یعنی امکانِ وجود میں انسان کے ساتھ شریک ہیں۔

انسان کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اس بناء پر گفتگو کی گئی ہے کہ اسے مرکب غرور و تکبر سے نیچے اتارا جائے، اور وہ ہر حال میں ہر چیز کے لیے اور ہر جگہ اپنی حاجت کی خاطر خدا ہی کی طرف توجہ دے۔ وہی توجہ کہ جو صفاتِ فاضلہ اور ملکاتِ اخلاقی کی اصل بنیاد ہے۔ وہی توجہ کہ جو تواضع و انکساری، ترکِ ظلم و ستم، ترکِ غرور و تکبر اور ترکِ بخل و حرص و حسد کی رمز ہے اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی محرک ہوتی ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں انسانوں کی اسی احتیاج و فقر کی تاکید کے لیے ان سے فرمایا گیا ہے: "اگر وہ چاہے تو تمہیں اٹھا لے اور ایک نئی مخلوق لے آئے" (ان یشأ یذھبکم و یأت بخلق جدید)۔

اسی بناء پر اسے تمہاری اور تمہاری عبادت کی کوئی احتیاج نہیں اور یہ تم ہو کہ جو اس کے محتاج ہو۔

---

[1] اس بات پر بھی توجہ رہے کہ امکان و وجوب کی برہان کی دو تفسیریں ہیں۔ کیونکہ فلاسفہ نے امکان کے دو معانی کیے ہیں۔ امکان ماہوی اور امکان وجودی، اور چونکہ محققینِ فلاسفہ کی نظر اصالۃ الوجود پر ہے اس بناء پر یہاں امکان کی امکان وجودی کی شکل میں تفسیر کرنا چاہیئے کہ علت کی طرف نیاز و وابستگی اصل وجود میں ہے (اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے کتب فلسفہ کا مطالعہ کریں)۔

یہ آیت اسی مطلب کی مثال ہے کہ جو سورۂ انعام میں بیان ہوا ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

وربّك الغني ذوالرحمة ان يشأ يذهبكم ويستخلف من بعدكم ما يشاء كما انشأكم من ذرية قوم اٰخرين۔

"تیرا پروردگار بے نیاز و مہربان ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور جسے چاہے تمہاری جگہ لے آئے جیسا کہ تمہیں دوسری قوموں کی نسل سے وجود میں لایا ہے"۔ (انعام۔ ۱۳۳)

وہ نہ تو تمہاری اطاعت کا محتاج ہے اور نہ ہی اسے تمہارے گناہوں کا خوف ہے لیکن اس کے باوجود اس کی وسیع رحمت تم سب پر سایہ فگن ہے۔ نہ تو اس سارے جہان کے ختم ہو جانے سے اس کی عظمت میں کسی چیز کی کمی ہوگی اور نہ ہی اس عالم کی خلقت نے اس کے مقام کبریائی میں کوئی اضافہ کیا ہے۔

آیت کے آخر میں نئے سرے سے تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: "اور یہ کام خدا کے لیے ناممکن نہیں ہے" (وما ذالك على الله بعزيز)۔

جی ہاں! وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے، حکم دیتا ہے کہ ہو جا، وہ فوراً وجود میں آجاتی ہے تخلیقِ انسان تو معمولی سی بات ہے، یہ بات تو تمام عالمِ ہستی کے بارے میں صادق ہے۔

بہر حال اگر وہ تمہیں ایمان، اطاعت اور پرستش کا حکم دیتا ہے تو سب تمہارے ہی فائدہ میں ہے اور اس کی برکات تمہیں ہی حاصل ہوتی ہیں۔

* * *

آخری زیر بحث آیت گزشتہ آیات کے ربط میں پانچ "نکات" کی طرف اشارہ کرتی ہے:

اوّل یہ کہ گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ "اگر خدا چاہے تو وہ تمہیں اٹھا لے اور تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے"۔ یہ گفتگو ممکن ہے کہ بعض افراد کے لیے یہ سوال پیدا کرے کہ اس آیہ کے مخاطب تمام گنہگار افراد نہیں ہیں، کیونکہ ہر زمانے میں مومنین صالح موجود رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ بھی دوسروں کے گناہوں کی سزا میں گرفتار ہوں اور وہ بھی فنا ہو جائیں؟

اسی سبب سے فرمایا گیا ہے: "کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بار اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا" (ولا تزر وازرة وزر اُخرٰی)۔

"وزر" بوجھ کے معنی میں ہے اور "وزر" (بروزن "نظر") سے لیا گیا ہے کہ جو پہاڑوں کی پناہ گاہ کے معنی میں آیا ہے اور کبھی مسئولیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ "وزیر" کو اس لحاظ سے "وزیر" کہتے ہیں کہ وہ ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔ "موازرہ" بھی معاونت کے معنی میں ہے کیونکہ ہر شخص معاونت کرتے وقت دوسرے کے بار کا ایک حصہ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔

یہ جملہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ حقیقت میں یہ ایک طرف تو عدلِ خداوندی سے ارتباط رکھتا ہے کہ جو ہر شخص کو اس کے عمل کے بدلے گروی شمار کرتا ہے، اس کی سعی و کوشش کا اسے اجر دیتا ہے اور اس کے گناہوں کی اسے سزا دیتا ہے۔

اور دوسری طرف قیامت کے دن کی شدتِ مجازات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بھی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا چاہے اس سے انتہائی لگاؤ اور تعلق ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔

اس مطلب کی طرف توجہ انسانوں کی خود سازی میں زیادہ اثر رکھتی ہے کیونکہ جو شخص اپنے کو بچانا چاہے وہ ہرگز اس بہانے سے کہ اس کا ماحول یا اس کا معاشرہ خراب ہے، برائی میں کودنے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور ماحول کی خرابی کو اپنی بے راہ روی کے لیے وجہ جواز نہیں بنائے گا کیونکہ ہر شخص اپنے گناہ کا بوجھ خود ہی اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔

عدلِ الٰہی کا یہ پہلو انسانوں کو یہ ادراک اور سوجھ بوجھ بھی دیتا ہے کہ خدا معاشروں کا مجموعی طور پر حساب نہیں لیتا، بلکہ ہر شخص کا اپنا حساب لیا جائے گا یعنی اگر اس نے اپنی اصلاح کے لیے اور برائی کے خلاف جہاد کرنے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو نبھایا ہو تو اُسے کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا چاہے اس کے علاوہ سارے جہان کے لوگ کفر و شرک اور ظلم و گناہ میں آلودہ ہوں۔

اصولی طور پر کوئی تربیتی پروگرام اس بنیادی اصول کی طرف توجہ دیے بغیر مؤثر نہیں ہو سکتا۔ (غور کیجئے گا)۔

دوسرے جملے میں اسی مسئلے کو ایک دوسری شکل میں پیش کیا گیا ہے، قرآن کہتا ہے: "اگر کوئی شخص بھاری بوجھ اٹھاتے ہوئے ہو اور وہ کسی دوسرے شخص کو اپنے گناہوں کو اٹھانے کے لیے کہے، تو وہ اس کا منفی جواب دے گا اور اس کے گناہ اور جوابدہی میں سے کسی چیز کو نہیں اٹھائے گا، چاہے وہ اس کے قریبیوں اور رشتہ داروں میں سے ہو" (وان تدع مثقلة الی حملها لا یحمل منه شیء ولو کان ذا قربی)[1]

---

[1] "مثقلة" بھاری بوجھ کے معنی میں ہے اور یہاں وہ شخص مراد ہے جو گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھاتے ہوتے ہے اور "حمل" (بروزن "شعر") "مفردات" میں راغب کے قول کے مطابق "وہ بوجھ ہے جو پشت پر اٹھایا جاتا ہے" "حمل" (بروزن "حمد") کے مقابلے میں کہ یہ ایسا بوجھ ہے کہ جو پیٹ میں اٹھایا جاتا ہے مثلاً "جنین" یا وہ پانی کہ جو بادل کے اندر ہے یا وہ پھل کہ جو درخت کے اوپر ہے اور چونکہ زیر بحث آیت میں گناہ کو اُس بوجھ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جو کندھے پر اٹھایا جاتا ہے اس لیے "حمل" حا کی زیر کے ساتھ آیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے :

قیامت کے دن ایک ماں اور ایک بیٹے کو لایا جائے گا۔ ان دونوں ہی کے کندھوں پر گناہوں کا بھاری بوجھ ہوگا۔ ماں بیٹے سے تقاضا کرے گی کہ ان تمام زحمتوں کے بدلے میں کہ جو میں نے تیرے لیے دنیا میں جھیلی ہیں میرے گناہوں کی مسئولیت کا کچھ بوجھ اپنے کندھے پر اٹھالے، اس پر بیٹا ماں سے کہے گا کہ تو مجھ سے دور ہو جا، کیونکہ میں تو تجھ سے بھی زیادہ گرفتار ہوں [1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ آیت اُن بہت سی روایات کے منافی تونہیں جن میں سنتِ حسنہ و سنتِ سیئہ کا ذکر ہے۔ کیونکہ وہ روایات یہ کہتی ہیں کہ جو شخص کوئی اچھی سنت قائم کرے گا تو ان تمام لوگوں کا اجر کہ جنہوں نے اس پر عمل کیا ہے اس کے لیے لکھا جائے گا بغیر اس کے کہ ان کے اجر میں کچھ کمی ہو اور جو شخص بُری سنت کی بنیاد رکھے گا تو ان لوگوں کا بوجھ بھی کہ جو اس پر عمل کریں گے اُس پر ہوگا بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی ہو۔

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اس صورت میں ایک شخص کا گناہ دوسرے کے ذمہ نہیں لکھا جاتا کہ جب وہ کسی قسم کا دخل اس میں نہ رکھتا ہو لیکن اگر وہ کسی کام کی بنیاد رکھے، معاونت کرے یا ترغیب دے اور اس طرح اس میں حصہ دار ہو تو پھر یقیناً یہ اس کا عمل شمار ہوگا اور وہ اس میں شریک قرار پائے گا۔

تیسرے جملے میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ پیغمبرؐ کی تنبیہ صرف آمادہ دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "تم صرف انہی لوگوں کو ڈرا پاتے ہو جو اپنے پروردگار سے غیب اور تنہائی میں ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں" (انما تنذر الذین یخشون ربھم بالغیب و اقاموا الصلوٰۃ)۔

انبیاء اور اولیاء کے ڈراوے اس وقت تک بے اثر رہیں گے جب تک دل میں خوفِ خدا نہ ہو اور انسان پنہاں و آشکار اپنے اوپر ایک مافوق قوت کی نگرانی کا احساس نہ کرے اور نماز کے ذریعے اس اندرونی احساس کو قوی نہ کرے کیونکہ نماز دل کو زندہ کرتی ہے اور ذکرِ خدا پر ابھارتی ہے۔

---

[1] اگرچہ یہ حدیث مختلف تفاسیر میں کبھی فضیل بن عیاض سے اور کبھی ابن عباس سے نقل ہوئی ہے، لیکن یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ یہ بات انہوں نے خود اپنی طرف سے کہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اصل حدیث پیغمبرؐ سے منقول ہو (تفسیر ابوالفتوح، قرطبی اور روح البیان کی طرف رجوع کریں)۔

ابتدا میں جبکہ انسان نے کوئی عقیدہ نہ اپنایا ہو اور ایمان نہ لایا ہو، اگر اس میں حق جوئی اور حق طلبی کی روح موجود نہیں ہے، اور اس میں حقائق کی شناخت کے سلسلے میں جوابدہی کا احساس بھی نہیں ہے تو وہ انبیاء کی دعوت پر کان نہیں دھرے گا اور عالم ہستی میں پروردگار کی نشانیوں میں غور و فکر بھی نہیں کرے گا۔

چوتھے جملے میں قرآن پھر اس حقیقت کی طرف لوٹتا ہے کہ خدا سب سے بے نیاز ہے اور مزید کہتا ہے کہ: "جو شخص پاکیزگی اور تقویٰ اختیار کرے تو اس پاکیزگی کا نتیجہ خود اسی کو حاصل ہوگا" (ومن تزکّٰی فانما یتزکّٰی لنفسہ)۔

آخرکار پانچویں اور آخری جملے میں قرآن خبردار کرتا ہے کہ اگر نیک و بد افراد اس جہان میں اپنے اعمال کے نتائج نہ پائیں تو کوئی اہم بات نہیں ہے کیونکہ "سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور آخرکار وہ سب کا حساب چکائے گا" (والی اللہ المصیر)۔

(۱۹) وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ ۝

(۲۰) وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّورُ ۝

(۲۱) وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۝

(۲۲) وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ ۝

(۲۳) إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۝

ترجمہ

(۱۹) نابینا اور بینا ہرگز برابر نہیں ہیں۔

(۲۰) اور نہ ہی ظلمتیں اور روشنی۔

(۲۱) اور نہ ہی (آرام بخش) سایہ اور گرم جلانے والی ہوا۔

(۲۲) اور مُردہ اور زندہ بھی ہرگز برابر نہیں ہیں۔ خدا اپنا پیغام جس کے کان تک چاہتا ہے پہنچاتا ہے اور تم قبروں (میں سونے) والوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے۔

(۲۳) تم تو صرف ڈرانے والے ہو (اب اگر وہ ایمان نہ لائیں تو پریشان نہ ہونا کہ تم نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے)۔

تفسیر

نور و ظلمت یکساں نہیں ہیں

ان مباحث کی مناسبت سے کہ جو ایمان و کفر کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں بیان ہوئے تھے

زیر بحث آیات میں چار پُرکشش مثالیں مومن اور کافر کے بارے میں بیان کی گئی ہیں جن میں "ایمان و کفر" کے آثار نہایت واضح طور پر مجسم ہو گئے ہیں ۔

پہلی مثال میں کافر و مومن کو نابینا اور بینا کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے "نابینا اور بینا ہرگز برابر نہیں ہیں" (وما یستوی الاعمٰی والبصیر) ۔

ایمان نور ہے اور روشنی بخشنے والا ہے اور انسان کو کائنات شناسی، اعتقاد، عمل اور تمام زندگی میں روشنی اور آگاہی بخشتا ہے ۔ لیکن کفر ظلمت اور تاریکی ہے اور اس میں نہ تو سارے عالم ہستی کے بارے میں صحیح دانش و بینش ہے اور نہ صحیح اعتقاد اور عمل صالح کی کوئی خبر ہے ۔

قرآن مجید اسی سلسلے میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۵۷ میں حق مطلب ادا کرتے ہوئے کہتا ہے :

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور والذین کفروا اولیاؤھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات اولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون ۔

"خدا مومنوں کا ولی، راہنما اور سرپرست ہے ۔ وہ انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف ہدایت کرتا ہے لیکن کافروں کا ولی طاغوت ہے کہ جو انہیں روشنی سے ظلمتوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے ، وہ اصحاب دوزخ ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے" ۔

چشم بینا تنہا کافی نہیں ہے ، لہٰذا روشنی اور نور بھی ہونا چاہیئے تاکہ انسان ان دو عوامل کی مدد سے موجودات کا مشاہدہ کر سکے ۔ بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے : "نہ ہی تاریکیاں نور کے برابر ہیں" (ولا الظلمات ولا النور) ۔

چونکہ تاریکی گمراہی کا سبب ہے ، تاریکی سکون و جمود کی عامل ہے اور تاریکی طرح طرح کے خطرات کی عامل ہے لیکن نور اور روشنی حیات و حرکت ، رشد و نمو اور تکامل و ارتقاء کا منشاء ہے ۔ اگر نور ختم ہو جائے تو عالم کی تمام قوتیں اور طاقتیں ختم ہو جائیں ، اور موت سارے مادی عالم کو گھیر لے ، اور اسی طرح عالم روحانی میں نور ایمان ہے کہ وہ رشد و تکامل کا عامل ہے اور حیات و حرکت کا سبب ہے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : "(آرام بخش) سایہ گرم ہوا اور جلانے والی لُو کے برابر نہیں ہے" (ولا الظل ولا الحرور) ۔

مومن اپنے ایمان کے سائے میں سکون اور امن و امان سے زندگی بسر کرتا ہے لیکن کافر اپنے کفر کی وجہ سے تکلیف اور رنج میں جلتا رہتا ہے ۔

راغب مفردات میں کہتا ہے "حرور" (بروزن "قبول") گرم اور جلانے والی ہوا کے معنی میں ہے (مارنے والی اور خشک کر دینے والی ہوا) ۔

بعض اِسے بادِ سموم کے معنی میں سمجھتے ہیں اور بعض سورج کی سخت اور شدید حرارت کے معنی میں۔

زمخشری کشاف میں کہتا ہے کہ "سموم" موذی اور ہلاک کرنے والی ہَواؤں کو کہتے ہیں۔ جو دن کے وقت چلتی ہیں لیکن "حرور" کہا تو انہیں ہَواؤں کو جاتا ہے لیکن بغیر اس تیز کے کہ وہ دن کے وقت چلیں یا رات کو۔ بہر حال اس قسم کی ہَوائیں کہاں اور ٹھنڈا اور نشاط آفریں سایہ کہاں کہ جو انسان کی روح اور جسم کو نوازتا ہے۔

آخری تشبیہ میں فرمایا گیا ہے: "اور زندہ اور مردہ ہرگز برابر نہیں ہے" (وما یستوی الاحیاء ولا الاموات)۔

مومنین زندہ ہیں اور سعی و کوشش، حرکت و جنبش اور رشد و نمو کے حال میں۔ وہ شاخیں، پتے، پھول اور پھل رکھتے ہیں لیکن کافر خشک لکڑی کی طرح ہیں کہ جس میں نہ طراوت ہے نہ پتا، نہ پھول اور نہ کوئی سایہ اور سوائے جلانے کے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

سورۂ انعام کی آیہ ۱۲۲ میں ہے کہ:

اومن کان میتًا فاحییناہ وجعلنا لہ نورًا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منہا

"کیا وہ شخص کہ جو مُردہ تھا اور ہم نے اُسے زندہ کیا، اور ہم نے اسے نور عطا کیا کہ جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اُس شخص کے مانند ہے کہ جو ظلمات اور تاریکیوں میں غوطہ زن ہے اور ہرگز اس سے نہیں نکلے گا؟"

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: "خدا جسے چاہتا ہے سننے والا بنا دیتا ہے" تاکہ وہ حق کی دعوت کو دل کے کان سے سنے اور توحید کی منادی کرنے والوں کی ندا پر لبیک کہے" (ان اللہ یسمع من یشاء)۔ "اور تم اپنی بات ہرگز ان مُردوں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتے جو قبروں میں سوتے ہوتے ہیں" (وما انت بمسمع من فی القبور)۔

تمہاری فریاد چاہے جس قدر رسا ہو اور تمہاری گفتگو جس قدر بھی دل نشین ہو اور تمہارا بیان جتنا بھی فصیح و بلیغ ہو مُردے اس میں سے کسی چیز کو سمجھ نہیں سکتے اور وہ لوگ کہ جو گناہ پر اصرار اور تعصب، عناد، ظلم اور فساد میں غوطہ زن ہونے کی وجہ سے اپنی روح انسانی کو کھو بیٹھے ہیں، یقیناً تمہاری دعوت قبول کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

* * *

اس بنا پر ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے پریشان اور بے تاب نہ ہو۔ تمہاری ذمہ داری تو

صرف بات کو پہنچانا اور ڈرانا ہے۔"تم تو صرف ڈرانے والے ہو" (ان انت الا نذیر)۔

٭ ٭ ٭

چند اہم نکات

۱۔ ایمان وکفر کے آثار: ہم جانتے ہیں کہ قرآن جغرافیائی، نسل اور طبقاتی قسم کی سرحدوں میں سے کہ جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں کسی کا قائل نہیں ہے۔ اس نے تو صرف ایک ہی سرحد شمار کی ہے اور وہ ایمان وکفر کی سرحد ہے اور وہ اس طرح سے تمام انسانی معاشرے کو دو گروہوں ۔ مؤمن اور کافر میں تقسیم کر دیتا ہے۔

قرآن نے ایمان کے تعارف میں متعدد مواقع پر اُسے نور کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور کفر کو ظلمت کے ساتھ اور یہ تشبیہ ۔ نتیجہ خیزی کے لیے ۔ ایک زندہ ترین تشبیہ ہے۔[1]

ایمان ایک قسم کا باطنی ادراک اور بصیرت ہے۔ قلبی عقیدے اور جنبش و حرکت سے توأم یہ ایک قسم کا علم و آگاہی ہے۔ یہ ایک قسم کا یقین ہے کہ جو انسان کے قلب و روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور ایسے اسلامی کاموں کا سرچشمہ بن جاتا ہے کہ جو معاشرے کی رشد و نمو کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن کفر جہالت ہے، ناآگاہی اور بے یقینی ہے کہ جس کا نتیجہ عدم تحرک، احساس مسئولیت کا فقدان اور شیطانی اور مخرب حرکات ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ "نور" عالم مادہ میں انسان، حیوان اور نباتات کے لیے ہر قسم کی حیات، حرکت، نمو اور رشد کا مبداء ہے اور اس کے برعکس ظلمت و تاریکی خاموشی اور خواب و غفلت کی حامل ہے اور مسلسل جاری رہنے کی صورت میں موت ہے اور زندگی کے خاتمے کا سبب ہے۔

اس بنا پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان آیات میں ایمان وکفر کو نور و ظلمت سے، حیات و موت سے اور آرام بخش سائے اور باد سموم سے تشبیہ دی گئی ہے اور اسی طرح مومن و کافر کو بینا و نابینا سے تشبیہ دی گئی ہے۔

کہنے کے لائق تمام باتیں ان چار تشبیہوں میں بیان ہوگئی ہیں۔

ہم زیادہ دور نہ جائیں، جس وقت ہم ایک مومن کے ساتھ نشست و برخاست کرتے ہیں، تو ہم اس کے تمام وجود میں اس نور کا اثر محسوس کرتے ہیں اس کے افکار ضیا بخش ہوتے ہیں، اس کی باتیں درخشندہ ہوتی ہیں اور اس کے اعمال و اخلاق ہمیں حقیقت زندگی اور حیات واقعی سے آشنا کرتے ہیں۔

لیکن کافر کے تمام وجود سے تاریکی برستی ہے۔ وہ اپنے مادی اور وقتی مفادات کے علاوہ کچھ نہیں

---

[1] بقرہ ۲۵۷، مائدہ۔ ۱۵ و ۱۶، ابراہیم۔ ۱ و ۵، زمر۔ ۲۲، حدید۔ ۹ اور طلاق۔ ۱۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔

سوچتا، اس کی فکر کا افق اور فضا اس کی شخصی زندگی کی چار دیواری سے اوپر نہیں جاتے، وہ شہوات کے طوفانوں میں غوطہ زن ہوتا ہے اور اس کی ہمنشینی انسان کے قلب و روح کو ظلمات و تاریکی کی موجوں میں ڈبو دیتی ہے کیونکہ:

ہمدمی مُردہ دھد مُردگی صحبت افسردہ دل افسردگی

مُردے کی ہمنشینی سے مُردگی حاصل ہوتی ہے۔ اور افسردہ دل کی صحبت سے افسردگی ملتی ہے۔

اور اس طرح سے قرآن نے جو کچھ ان آیات میں بیان کیا ہے اسے ہم محسوس بھی کر سکتے ہیں، سمجھ بھی سکتے ہیں یعنی وہ قابلِ ادراک ہے۔

۲۔ کیا مُردے کسی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے؟: اوپر والی آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر توجہ دینے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ قرآن یہ کیسے کہتا ہے کہ: "تم اپنی آواز مُردوں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتے" حالانکہ مشہور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے جنگِ بدر کے دن یہ حکم دیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر کفار کے بدنوں کو کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ اس کے بعد آپؐ نے انہیں پکار کر فرمایا:

هل وجدتم ما وعد الله ورسوله حقًّا؟ فانی وجدت ما وعدنی الله حقًّا۔

"کیا تم نے اس چیز کو کہ جس کا خدا اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا حق پایا ہے؟ میں نے تو جس کا خدا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اُسے حق پایا ہے۔"

اس موقع پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ! آپؐ ایسے اجساد سے کس طرح گفتگو کر رہے ہیں جن میں روح ہی نہیں ہے؟ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا:

ما انتم باسمع لما اقول منهم غير انهم لا يستطيعون ان يردوا شيئا۔

"تم میری باتوں کو ان سے بہتر طور پر نہیں سنتے، بات صرف اتنی ہے کہ وہ جواب دینے کی توانائی نہیں رکھتے۔"[1]

اسی طرح آدابِ میت میں سے ایک یہ ہے کہ عقائدِ حقہ کی اسے تلقین کی جائے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات زیرِ بحث آیات کے ساتھ کس طرح مناسبت رکھتی ہے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ زیرِ بحث

---

[1] تفسیر روح البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ (صحیح بخاری جلد ۵ ص۹۷ باب قتل ابی جہل)۔

آیات مُردوں کے عدم ادراک کو معمول کے لحاظ سے اور طبعی حوالے سے بیان کرتی ہیں لیکن جنگِ بدر کی روایات یا تلقینِ میت والی روایت فوق العادۃ شرائط و حالات کے ساتھ مربوط ہے کہ خدا نے اپنے پیغمبر کی باتیں فوق العادۃ طور پر ان مُردوں کے کانوں تک پہنچائیں۔

دوسرے لفظوں میں عالم برزخ میں انسان کا ربط عالم دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے، سوائے ان موقعوں کے کہ جن کے بارے میں خدا حکم دے دے کہ یہ ارتباط برقرار رہے۔ اسی بنا پر عام حالات میں ہم مُردوں کے ساتھ ارتباط پیدا نہیں کر سکتے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ہماری آواز مُردوں کے کانوں تک نہیں پہنچتی تو پھر پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ پر سلام بھیجنا اور انہیں وسیلہ قرار دینا اور ان کی قبور کی زیارت کرنا اور بارگاہِ خداوندی میں ان سے شفاعت کا تقاضا کرنا کیا مفہوم رکھتا ہے؟

وہابیوں کی ایک جماعت کہ جو عام طور پر فکری جمود کے حوالے سے مشہور ہے، قرآن کی دوسری آیات کا مطالعہ کیے بغیر ابتدائی ظواہر سے یہی بات کرتی ہے۔ یہ لوگ بہت سی احادیث کو کہ جو پیغمبرؐ سے منقول ہوئی ہیں کوئی وقعت نہ دیتے ہوئے، مسئلہ توسل کی نفی کر دیتے ہیں اور یوں انہوں نے اپنے گمان ناقص سے ان پر خطِ بطلان کھینچ دیا ہے۔

اس سوال کا جواب بھی اُسی سے کہ جو ہم نے پہلے سوال کے جواب میں دیا ہے واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ پیغمبرِ اکرمؐ اور اولیائے خدا کا معاملہ دوسرے لوگوں سے الگ ہے۔ وہ شہداء کے مانند (بلکہ ان کی پہلی صف میں) قرار پاتے ہیں اور زندۂ جاوید ہیں اور "احیاء عند ربھم یرزقون" کے مصداق پروردگار کی روزی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ خدا کے حکم سے اس جہان کے ساتھ ان کا ارتباط باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ اس جہان میں رہتے ہوئے وہ مُردوں کے ساتھ ارتباط برقرار رکھ سکتے ہیں جیسا کہ مقتولین بدر کی مثال موجود ہے۔

اسی بنا پر بہت سی روایات میں کہ جو اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی کتابوں میں منقول ہوئی ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ اور آئمہؑ کچھ لوگوں کی باتیں جو دُور یا نزدیک سے اُن پر سلام بھیجتے ہیں سنتے ہیں اور انہیں جواب دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ امت کے اعمال بھی ان کی خدمت میں پیش ہوتے ہیں[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہمیں یہ حکم ہے کہ نماز کے تشہد میں پیغمبرِ اکرمؐ پر سلام بھیجیں اور یہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے چاہے وہ شیعہ ہوں یا اہلِ سنت، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آنحضرتؐ سے ایسی بات کریں

---

[1] کشف الارتیاب صفحہ ۱۰۹، آیہ ۱۰۵ سورہ توبہ کے ذیل میں ہم نے بھی "اعمال پیش ہونے کا مسئلہ" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (جلد ۸ تفسیرِ نمونہ صفحہ ۱۵۰ اردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں)۔

کہ جسے آپؐ بالکل نہیں سنتے۔

متعدد روایات میں صحیح مسلم میں ابو سعید خدریؓ اُبو ہریرہ سے خود پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لقنوا موتاکم لا الٰہ الا اللہ۔

"اپنے مُردوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو"[1]

نہج البلاغہ میں بھی مُردوں کی ارواح کے ساتھ ارتباط کے مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ حضرت علیؑ نے ان مومنین کے ارواح سے کہ جو کوفے کے نواحی قبرستان میں تھے گفتگو کی ہے[2]

۳۔ تعبیرات کا تنوع فصاحت کا ایک حصہ ہے: ان چار تشبیہوں میں کہ جو اوپر والی آیات میں بیان ہوئی ہیں مختلف تعبیرات نظر آتی ہیں۔ مثلاً "اعمیٰ" و "بصیر"۔ "ظل" و "حرور" مفرد کی صورت میں آئی ہیں جبکہ "احیاء" و "اموات" دونوں جمع کی صورت میں ہیں اور "ظلمات" و "نور" میں سے ایک لفظ مفرد اور دوسرا جمع کی صورت میں آیا ہے۔

نیز پہلی اور دوسری تشبیہ میں جو منفی صورت رکھتے ہیں انہیں مقدم رکھا ہے (اعمیٰ و ظلمات) جبکہ تیسری اور چوتھی تشبیہ میں جو کہ مثبت صورت رکھتے ہیں "ظل" اور "احیاء" کو مقدم رکھا گیا ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ پہلی تشبیہ میں حرفِ نفی کا تکرار نہیں ہوا جبکہ باقی تین تشبیہات میں نفی کا تکرار ہوا ہے۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ "ما یستوی" صرف پہلی اور آخری تشبیہ میں آیا ہے اور باقیوں میں نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے اس تفاوت کے لیے کچھ نکات بیان کیے ہیں۔ جن میں سے کچھ تو قابلِ ملاحظہ ہیں اور بعض قابلِ اعتراض۔

منجملہ ان نکات کے کہ جو قابلِ ملاحظہ ہیں ایک یہ ہے کہ "ظلمات" کا جمع ہونا اور "نور" کا مفرد ہونا اس بنا پر ہے کہ ظلمت یعنی کفر کے بہت سے شعبے ہیں، لیکن ایمان اور توحید کی صرف ایک ہی حقیقت ہے۔ ایمان خطِ مستقیم ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان ایک خطِ مستقیم کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا لیکن ظلمتِ کفر ٹیڑھے خطوط کی طرح ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان ہزار ہا ٹیڑھے خطوط ہوتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنائز حدیث ۱ و ۲ (جلد ۲ ص ۶۳۱)۔

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۱۳۰۔

پہلی دو مثالوں میں منفی صورتوں کو مقدم رکھنا آغازِ اسلام کی طرف اشارہ ہے کہ لوگوں نے جاہلیت کی نابینائی اور شرک کے ظلمات سے اسلام کی روشنی اور بینائی کی طرف ہدایت پائی ۔

لیکن دو دوسری مثالیں دوسرے مراحل کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جب اسلام نے اپنی جڑوں کو دلوں کی زمین میں محکم کر لیا تھا اور اپنی اثباتی صورتوں کو معاشرے میں وسعت دی تھی ۔

لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر اصولی طور پر بیان میں تنوع گفتگو میں ایک خاص قسم کی روح اور تازگی پیدا کر دیتا ہے اور اسے دل نشین، خوبصورت اور پرکشش بنا دیتا ہے ۔ جبکہ ایک ہی طرح کے کلام کی تکرار ۔ سوائے استثنائی مواقع کے ۔ گفتگو کی لطافت ختم کر دیتی ہے ۔ اسی بناء پر فصحاء و بلغاء ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی گفتگو کی تعبیروں کو متنوع اور دل نشیں بنائیں اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر ہے ۔

اس بناء پر اگر فصاحت و بلاغت کے علاوہ ان تعبیرات میں اور کوئی نکتہ نہ بھی ہوتا تب بھی یہی چیز کافی تھی ۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ آنے والے حضرات ان اسرار کے علاوہ کہ جو ہم نے پیش کیے ہیں، ان تعبیرات میں دوسرے اسرار بھی تلاش کر سکیں کہ جو اس وقت ہم سے پوشیدہ ہیں ۔

(۲۴) اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ؕ وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ ○

(۲۵) وَ اِنۡ یُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۚ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالۡكِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ ○

(۲۶) ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا فَكَیۡفَ كَانَ نَكِیۡرِ ○

ترجمہ

(۲۴) ہم نے تجھے حق کے ساتھ بشارت اور نذارت کے لیے بھیجا اور گزشتہ زمانہ میں ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی ڈرانے والا موجود رہا ہے۔

(۲۵) اگر وہ تیری تکذیب کرتے ہیں (تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے) جو لوگ ان سے پہلے تھے (وہ بھی اپنے پیغمبروں کی) تکذیب کیا کرتے تھے۔ وہ واضح دلائل، پند و نصائح کی کتب اور روشنی عطا کرنے والی آسمانی کتابیں (کہ جو معارف و احکام پر مشتمل تھیں) لے کر ان کے پاس آئے (لیکن دل کے اندھے ان پر ایمان نہ لاتے)۔

(۲۶) پھر میں نے کفار کو (اتمام حجت کے بعد) پکڑ لیا (اور انہیں سخت عذاب دیا) پس اُن پر میرا عذاب کیسا تھا؟

تفسیر

دل کے اندھے ایمان نہ لائیں تو تعجب نہیں

گزشتہ آیات میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ کچھ افراد ایسے ہیں کہ جو مُردوں اور نابیناؤں کی مانند ہیں کہ جن کے دل میں انبیاء کی باتیں معمولی سا اثر بھی نہیں کرتیں۔ اس کے بعد زیر بحث آیات میں

پیغمبر اکرمؐ کی اس سلسلے میں دلجوئی کے لیے تاکہ وہ غمگین اور پریشان نہ ہوں، پہلے فرمایا گیا ہے: "ہم نے تجھے حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور گزشتہ زمانے میں کوئی امت ایسی نہ تھی کہ جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو" (انا ارسلناک بالحق بشیرًا و نذیرًا و ان من امة الا خلا فیھا نذیر)۔

تُو "بشارت" و "انذار" کی ذمہ داری میں کوتاہی نہ کرے یہی تیرے لیے کافی ہے۔ تو اپنی ندا ان کے کانوں تک پہنچا، خدائی جزاؤں کی بشارت دے اور پروردگار کے عذاب سے انہیں ڈرا، چاہے وہ قبول کریں یا دشمنی اور ہٹ دھرمی اختیار کرلیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ بحث کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ: "ان انت الا نذیر" لیکن زیرِ بحث پہلی آیت میں یہ ہے کہ: "ہم نے تجھے برحق بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تُو ڈرانے والا ہے تو تُو خود اپنی طرف سے یہ کام نہیں کرتا، یہ تو ایک ماموریت ہے کہ جو ہم نے تیرے سپرد کی ہے۔

اور اگر گزشتہ آیت میں صرف انذار کا ذکر ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ہٹ دھرم جاہلوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ جو قبرستان کے مُردوں کی طرح کوئی بات قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے، لیکن یہاں پر انبیاء کی ذمہ داری کو کلّی طور پر بیان کیا جا رہا ہے کہ جو بشارت و انذار کے دونوں پہلوؤں کی حامل ہے۔ البتہ اس آیت کے آخر میں پھر نئے سرے سے "نذیر" کا ذکر ہے کیونکہ مشرکین اور ظالموں کے مقابلے میں انبیاء کی دعوت کا بنیادی حصہ "انذار" پر مشتمل تھا۔

"خلا" "خلاء" کے مادہ سے اصل میں اس مکان اور جگہ کے معنی میں ہے کہ جس میں کوئی ڈھانپنے والی چیز نہ ہو، یہ لفظ زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور مکان کے لیے بھی، اور چونکہ زمانہ گزر جانے والی چیز ہے اس لیے گزشتہ زمانوں کو "ازمنہ خالیہ" کہا جاتا ہے، کیونکہ اب وہ باقی نہیں ہیں اور دنیا ان سے خالی ہو چکی ہے۔

اس بنا پر "و ان من امة الا خلا فیھا نذیر" کا جملہ اس معنی میں ہے کہ: "گزشتہ امتوں میں سے ہر امت کے لیے گزشتہ زمانے میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا موجود رہا ہے"۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیت کے مطابق تمام امتیں خدا کی طرف سے انذار کرنے والا یعنی پیغمبر رکھتی تھیں، اگرچہ بعض نے اس کو ایک وسیع تر معنی میں لیا ہے کہ جس میں علماء اور ایسے دانشور بھی شامل ہیں کہ جو لوگوں کو متنبہ کیا کرتے ہیں لیکن یہ معنی ظاہرِ آیت کے خلاف ہے۔

بہرحال اس بات کا معنی یہ نہیں ہے کہ ہر شہر اور ہر علاقے میں ایک پیغمبر مبعوث ہوا ہو، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبروں کی دعوت اور ان کی باتیں ان سب لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی تھیں۔ کیونکہ قرآن

کہتا ہے: "خلا فیھا نذیر" یعنی "ان میں ڈرانے والا موجود تھا" یہ نہیں کہتا کہ "منھا" یعنی "خود" ان میں سے تھا۔
اس بنا پر جو کچھ زیر بحث آیت میں بیان ہوا ہے وہ سورۂ سبا کی آیہ ۴۴ سے اختلاف نہیں رکھتا کہ جو یہ کہتی ہے:

وما ارسلنا الیھم قبلک من نذیر۔

"ہم نے مشرکینِ مکہ کی طرف تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا تھا"۔

یہاں ڈرانے والا سے مراد خود انہیں میں سے ہے جبکہ زیرِ بحث آیت میں مراد پیغمبر کی دعوت کا ان تک پہنچنا ہے۔

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "اگر وہ تمہاری تکذیب کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور تم اس پر غمگین نہ ہو کیونکہ جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی جبکہ وہ واضح معجزات و دلائل، پند و نصائح سے معمور کتب اور ایسی آسمانی کتب لے کر اُن کے پاس آئے تھے کہ جو ضیا بخش احکام و قوانین پر مشتمل تھیں" (و ان یکذبوک فقد کذب الذین من قبلھم جاءتھم رسلھم بالبینٰت و بالزبر و بالکتاب المنیر) صرف تم ہی نہیں کہ جو معجزات اور آسمانی کتاب کے حامل ہو، اس کے باوجود اس جاہل قوم نے تمہاری تکذیب کی ہے، بلکہ گزشتہ پیغمبر بھی اسی طرح کی مشکل سے گزرتے رہے ہیں۔ اس بنا پر تم غمگین نہ ہو اور مضبوطی کے ساتھ اپنے راستے پر قدم بڑھاتے رہو اور جان لو کہ قبول کرنے والے قبول کر ہی لیں گے۔

"بیّنات"، "زبر" اور "کتاب منیر" کے درمیان فرق کے بارے میں مفسرین نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ واضح دو تفسیریں ہیں:

۱۔ "بیّنات" ان واضح اور روشن دلائل و معجزات کے معنی میں ہے کہ جو پیغمبر کی حقانیت ثابت کر دیں لیکن "زبر" کہ جو "زبور" کی جمع ہے، ان کتابوں کے معنی میں ہے کہ جنہیں مستحکم کر کے لکھا گیا ہو (پتھر وغیرہ پر لکھی ہوئی تحریر کے مانند) جبکہ یہاں ان کے مطالب کے استحکام کے لیے کنایہ ہے[1]

بہرحال یہ ایسی کتابوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو حضرت موسیٰؑ سے پہلے نازل ہوئیں جبکہ "کتاب منیر" کتابِ موسیٰ اور ان دوسری آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس کے بعد نازل ہوئیں (کیونکہ قرآن مجید میں سورہ مائدہ کی آیہ ۴۴ و ۴۶ میں تورات اور انجیل کو ہدایت و نور کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، اور اسی سورہ کی آیہ ۱۵ میں قرآن مجید کے بارے میں بھی نور کی تعبیر آئی ہے)۔

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے:

زبرت الکتاب کتبتہ کتابۃ عظیمۃ وکل کتاب غلیظ الکتابۃ یقال لہ زبور (مفردات مادہ زبر)

"میں نے مستحکم اور عظیم کتابت کی اور جس کتاب کی کتابت مستحکم اور سخت ہو اسے زبور کہتے ہیں"۔

۲۔ "زبر" سے مراد کتب انبیاء کا وہ حصّہ ہے جس کے مطالب اور مضامین صرف وعظ و نصیحت اور مناجات پر مشتمل تھے (مثلاً زبورِ داوٗد)۔

لیکن "کتاب منیر" آسمانی کتابوں کی وہ قسم ہے کہ جو احکام و قوانین اور مختلف اجتماعی و انفرادی دستور کی حامل تھیں، مثلاً توراۃ، انجیل اور قرآن مجید۔

دوسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں اس گروہ کے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ایسا نہیں تھا کہ وہ خدائی عذاب سے محفوظ رہ جائیں اور ہمیشہ اپنی تکذیبوں کو جاری رکھیں لہٰذا اس کے بعد ہم نے کافروں کو پکڑ لیا اور انہیں سخت سزا دی" (ثم اخذت الذین کفروا)[1]

کسی گروہ کو طوفان نے آلیا، کسی اور کو تیز اور ویران کن آندھی نے تباہ کر دیا اور کسی جماعت کو ہم نے آسمانی چنگھاڑ، صاعقہ اور زلزلہ کے ذریعے درہم برہم کر دیا۔

اس کے بعد آخر میں تاکید اور ان کی سزا کی شدت بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: "ان کے لیے میرا عذاب کیسا تھا؟" (فکیف کان نکیر)

یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ایک شخص کوئی اہم کام انجام دیتا ہے اور اس کے بعد حاضرین سے سوال کرتا ہے کہ میں نے یہ کام کیسا کیا ہے؟

بہرحال یہ آیات ایک طرف تو راہِ خدا کے تمام راہیوں خصوصاً ہر زمانے اور ہر امت کے سچے رہبروں اور پیشواؤں کی دلجوئی کرتی ہیں اور ان کے دلوں کو گرماتی ہیں کہ وہ مخالف صداؤں سے دل تنگ اور مایوس نہ ہوں اور یہ جان لیں کہ خدائی دعوتیں ہمیشہ ہٹ دھرموں، متعصبوں اور مفاد پرست ظالموں کی طرف سے شدید مخالفتوں کا سامنا کرتی رہی ہیں جبکہ کچھ دل سوز طالبانِ حق اور عاشقانِ پاکباز بھی موجود رہتے ہیں کہ جو داعیانِ حق کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی جان کو قربان کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف یہ آیات ان ہٹ دھرم مخالفین کے لیے ایک دھمکی کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ وہ یہ جان لیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے شرمناک اور مخرب اعمال جاری نہیں رکھ سکتے۔ جلد یا بدیر خدائی عذاب دامنگیر ہو کر رہے گا۔



---

[1] "اخذت" "اخذ" کے مادہ سے پکڑنے اور گرفت کرنے کے معنی میں ہے لیکن یہاں سزا کے لیے کنایہ ہے کیونکہ گرفت میں لینا اور پکڑنا سزا کی تمہید ہے۔

(۲۷) اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا ؕ وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ وَّحُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَغَرَابِيۡبُ سُوۡدٌ ○

(۲۸) وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ ○

ترجمہ

(۲۷) کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل فرمایا کہ جس کے ذریعے ہم نے زمین سے گوناں گوں رنگ کے پھل نکالے اور پہاڑوں میں بھی (پروردگار کے لطف سے) سفید و سرخ رنگ کے راستے پیدا ہوئے مختلف رنگوں میں اور کبھی گہرے سیاہ رنگ میں۔

(۲۸) اور انسانوں، چلنے پھرنے والے جانداروں اور چوپاؤں کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ (ہاں!) حقیقت یہی ہے کہ خدا کے بندوں میں سے صرف علماء اُس سے ڈرتے ہیں۔ خدا عزیز و غفور ہے۔

تفسیر

وجود کے در و دیوار پر عجیب نقش و نگار

ان آیات میں پھر مسئلہ توحید زیرِ بحث ہے اور کتابِ تکوین کا ایک نیا صفحہ انسانوں کی نگاہوں کے سامنے کھولا ہے، تاکہ ہٹ دھرم مشرکین اور سخت منکرینِ توحید کا ایک دندان شکن جواب پیدا ہو۔

اس عظیم کتابِ آفرینش کے اس خوبصورت صفحہ میں بے جان موجودات کے تنوع کا ذکر ہے اور نباتات، حیوانات اور انسانوں کی دنیا میں حیات کے مختلف اور خوبصورت چہروں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دعوت دی گئی ہے کہ دیکھیں خدا نے کس طرح بے رنگ پانی سے لاکھوں رنگ ظاہر کیے ہیں اور معین و محدود عناصر سے بالکل متنوع موجودات پیدا کیے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے زیادہ زیبا اور خوبصورت ہے۔

اس غالب و ماہر نقاش نے ایک ہی قلم اور سیاہی سے انواع و اقسام کے نقش ایجاد کر دیئے ہیں کہ جو دیکھنے والوں کو فریفتہ و شیفتہ کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے فرمایا گیا ہے "کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے مختلف رنگ کے پھل پیدا کیے" (الم تر انّ اللّٰہ انزل من السماء ماءً فاخرجنا بہ ثمرات مختلفاً الوانھا)۔

اس جملے کی استفہام تقریری کے ذریعہ ابتداء، انسانوں کی تلاش و جستجو کی حس کو تحریک دیتے ہوئے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطلب اتنا روشن و واضح ہے کہ جو شخص بھی نگاہ کرے گا، دیکھ لے گا۔ ہاں! وہ اس حقیقت کو دیکھ لے گا کہ ایک ہی پانی اور زمین سے کہ جن میں سے ایک بے رنگ ہے اور دوسری صرف ایک رنگ رکھتی ہے، یہ سب مختلف قسم کے رنگ، طرح طرح کے پھلوں، خوبصورت پھولوں، پتوں اور شگوفوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔

"الوان" ممکن ہے کہ پھلوں کے ظاہری رنگوں کے معنی میں ہو کہ ایک ہی قسم کے پھل میں بھی کئی قسم کے رنگ پائے جاتے ہیں۔ جیسے سیب مختلف رنگوں میں ہوتا ہے اور مختلف قسم کے پھلوں کی تو بات ہی اور ہے، اور ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے ذائقے، ساخت اور خواص میں اختلاف کی طرف اشارہ ہو، یہاں تک کہ ایک ہی پھل کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، مثلاً انگور کی شاید پچاس قسمیں ہیں اور کھجور کی تقریباً ستر قسمیں ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں فعل غائب کی شکل میں آیا ہے، اس کے بعد متکلم کی صورت میں شروع میں ہے کہ "خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا" پھر اضافہ کیا گیا ہے کہ "ہم نے اس کے ذریعہ رنگا رنگ میوے اور پھل نکالے" یہ طرزِ تعبیر صرف اسی آیت میں منحصر نہیں ہے، قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ گویا پہلا جملہ مخاطب کو خدا کے بارے میں ایک تازہ ادراک و معرفت عطا کرتا ہے، اور وہ اس ادراک و معرفت کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور جب وہ حاضر ہو جاتا ہے تو اللہ اُس سے گفتگو کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں ان راستوں کے تنوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں، یہ فرق مختلف راستوں کی پہچان کا سبب بنتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "پہاڑوں میں بھی راستے بنائے

گئے ہیں سفید و سرخ رنگ کے، مختلف رنگوں کے اور (کبھی) گہرے سیاہ رنگ کے" (ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانھا وغرابیب سود)[1]

رنگوں کا یہ اختلاف ایک طرف تو پہاڑوں کو خوبصورت بناتا ہے اور دوسری طرف راستوں کو معلوم کرنے اور پُرپیچ کوہستانی سڑکوں میں گم نہ ہو جانے کا سبب ہے اور آخر میں ہر چیز میں خدا کی قدرت کی دلیل ہے۔

"جدد" جمع "جدہ" (بروزن "غدہ") جادہ اور راستے کے معنی میں ہے۔

"بیض" "ابیض" کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے "سفید" اور "حمر" "احمر" کی جمع ہے، اس کا معنی ہے "سرخ"۔

"غرابیب" "غربیب" (بروزن "کبریت") کی جمع ہے گہرے سیاہ رنگ کے معنی میں ہے، یہ جو عرب لوگ کوے کو "غراب" کہتے ہیں، تو یہ بھی اسی بنا پر ہے۔ نیز لفظ "سود" "اسود" کی جمع ہے اور سیاہ ہی کے معنی میں ہے یہ "غرابیب" کے بعد یہ لفظ اسی معنی کی تاکید کے طور پر آیا ہے اور یہ بعض کوہستانی راستوں کے گہرے سیاہ ہونے کے معنی میں ہے[2]

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ خود پہاڑ بھی خط اور راستوں کی مانند ہیں کہ جو زمین کی سطح کے اوپر کھینچے گئے ہیں اور وہ دُور کے فاصلوں سے خصوصیت کے ساتھ مکمل طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ایسے خطوط کہ جو بعض سفید رنگ کے ہیں بعض سرخ رنگ کے اور بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں، یہ ایسے خطوط ہیں کہ جو پروردگار کے دستِ تقدیر نے زمین کے چہرے پر نقش کیے ہیں[3]

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں انسانوں اور دوسرے جانداروں میں رنگوں کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "انسانوں، جانداروں اور چوپایوں میں سے بھی مختلف رنگوں والے ہوتے ہیں" (ومن الناس

---

[1] بعض نے اس جملے کو جملہ استینافیہ سمجھا ہے ("من الجبال" "خبر مقدم" اور "جدد" "مبتدائے مؤخر ہے") اور بعض نے کہا ہے کہ یہ تقدیر میں اس طرح تھا:

الم تران من الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانھا۔

[2] جس طرح سے کہ بعض کتب لغت مثلاً "لسان العرب" اور بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ زیر بحث آیت میں "سود" "غرابیب" کا بدل ہے کیونکہ رنگوں کے بارے میں تاکید مقدم نہیں ہوتی، (اس بات پر توجہ رکھیے کہ "غرابیب" میں سیاہی کے لحاظ سے "سود" کی نسبت زیادہ تاکید ہے) لہٰذا انہوں نے کہا ہے کہ اصل میں "سود غرابیب" تھا۔

[3] تفسیر المیزان، جلد ۱۷، ص ۴۲۔

والدواب والانعام مختلف الوانه)۔

ہاں! سب انسان باوجودیکہ ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں مکمل طور پر مختلف قبیلوں اور رنگوں کے حامل ہیں بعض برف کی طرح سفید، بعض سیاہی کے مانند سیاہ، یہاں تک کہ ایک ہی نسل اور خاندان میں بھی رنگوں میں بہت اختلاف ہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو جڑواں بچے بھی رنگ اور روپ میں یکساں نہیں ہوتے۔ اگرچہ انہوں نے جسم میں تمام مراحل ایک دوسرے کے ساتھ طے کیے ہیں اور ابتدار سے ایک دوسرے کے ہم آغوش رہے ہیں، باوجودیکہ وہ ایک ماں اور ایک باپ سے ہیں، ایک ہی وقت میں ان کا نطفہ قرار پاتا ہے اور انہوں نے ایک ہی قسم کی غذا کھائی ہوتی ہے۔

ظاہری چہرے سے قطع نظر، ان کے باطنی رنگ، ان کے اخلاق و عادات، ان کی صفات خصوصیات اور ان کی استعداد اور ذوق بالکل متنوع اور مختلف ہیں یہاں تک کہ تمام ضروریات کے ساتھ مجموعی طور پر ایک منظم اکائی معرضِ وجود میں آتی ہے۔

جانداروں کی دنیا میں ہزارہا قسم کے حشرات، پرندے، رینگنے والے، دریائی اور وحشی جنگلی جانور موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک اپنی خصوصیات اور عجائبات خلقت کے ساتھ آفریدگار کی قدرت، حکمت اور علم کی نشانی ہیں۔

جس وقت ہم کسی بڑے چڑیا گھر میں قدم رکھتے ہیں، تو باوجودیکہ وہاں پر عالم کے زندہ موجودات کا ہزارواں حصہ بھی موجود نہیں ہوتا پھر بھی ہم اس طرح سے مبہوت و مسحور اور دنگ ہو جاتے ہیں کہ بے اختیار ہو کر اس خدا کی ستائش کرنے لگتے ہیں کہ جس نے وجود کے در و دیوار پر یہ تمام نقش بنائے ہیں۔

توحید کی ان نشانیوں کو بیان کرنے کے بعد آخر میں مجموعی طور پر فرمایا گیا ہے: ہاں! "معاملہ اسی طرح ہے" (کذالك)[1]

اور چونکہ ان عظیم آیات خلقت سے بہرہ اندوز ہونا سب سے زیادہ عقلمند اور دانشمند افراد کا کام ہے اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "صرف علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں" (انما یخشی اللہ

---

[1] اس بارے میں کہ "کذالك" کا اعراب کے لحاظ سے کیا مقام ہے علماء نے مختلف آراء ذکر کی ہیں بعض اسے مستقل جملہ سمجھتے ہیں کہ جو تقدیر میں اس طرح تھا "الامر کذالك" اور ہم نے تفسیر میں اسی معنی کو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ زیادہ پُرکشش اور زیادہ مناسب ہے لیکن بعض نے اسے قبل کے جملے سے متعلق قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کا معنی اس طرح ہے: "کما ان الثمرات وجدد الجبال مختلف الوانها کذالك الناس والدواب والانعام" یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ بعد والے جملے سے مربوط ہے اور اس کا معنی یوں ہے:

[illegible] تختلف احوال العباد فی الخشیة ۔

من عبادہ العلماء)۔

جی ہاں! تمام بندوں میں سے علماء ہی ہیں کہ جو خشیت کے عالی مقام پر فائز ہوتے ہیں یعنی وہ پروردگار کے مقام کی عظمت کو سمجھتے ہوئے دل میں مسئولیت کا خوف رکھتے ہیں۔ "خشیت" کی یہ حالت انفس وآفاق کی نشانیوں میں سیر، پروردگار کے علم وقدرت سے آگاہی اور مقصدِ آفرینش کو جاننے کا نتیجہ ہے۔

راغب "مفردات" میں کہتا ہے کہ "خشیت" اس خوف کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ تعظیم کی آمیزش ہو اور زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے کہ جب خوف کا سرچشمہ کسی چیز سے علم وآگاہی ہو۔ اس بناء پر قرآن مجید میں یہ مقام علماء کے ساتھ مخصوص شمار ہوا ہے۔

ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ خدا کا خوف ان مسئولیتوں اور ذمہ داریوں کے خوف کے معنی میں ہے کہ جو انسان پر خدا کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ اس بات کا خوف کہ کہیں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ اس سے قطع نظر اصولی طور پر عظمت کا ادراک، وہ بھی ایسی عظمت کہ جو غیر محدود و بے پایاں ہے، انسان جیسے محدود وجود کے لیے خوف آفرین ہے (غور کیجئے گا)

اس جملے سے ضمناً یہ واضح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقی علماء وہی ہیں کہ جو اپنی ذمہ داریوں کی جوابدہی کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اہلِ علم ہیں، اہلِ گفتار نہیں ہیں، چونکہ علم بغیر عمل کے عدم خشیت کی دلیل ہے اور ایسے افراد زیرِ بحث آیت میں علماء کے زمرے میں شمار نہیں ہوتے۔

یہی حقیقت ایک حدیث میں امام زین العابدین علی بن الحسینؑ سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

وما العلم باللہ والعمل الا الفان مؤتلفان فمن عرف اللہ خافہ: وحثہ الخوف علی العمل بطاعۃ اللہ، وان ارباب العلم واتباعھم (ھم) الذین عرفوا اللہ فعملوا لہ، ورغبوا الیہ، وقد قال اللہ: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔

"علم وعمل دو مخلص دوست ہیں، جو شخص خدا کو پہچان لے وہ اس سے ڈرتا ہے اور یہی خوف اسے عمل اور فرمانِ خدا کی اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔ صاحبانِ علم اور ان کے پیروکار وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو اچھی طرح پہچانا ہے اور اس کے لیے عمل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ عشق رکھتے ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء"[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۵۹، بحوالہ روضۃ الکافی۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ:

یعنی بالعلماء من صدق قوله فعله ومن لم یصدق قوله فعله فلیس بعالم۔

"علماء سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن کے اعمال ان کے اقوال کے ساتھ ہم آہنگ ہوں، جس شخص کی گفتار و کردار ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ ہو وہ عالم نہیں ہے"[1]

ایک اور دوسری حدیث میں آیا ہے:

اعلمکم باللہ اخوفکم للہ۔

"تم میں سے زیادہ عالم وہ ہے جس کا خوفِ خدا سب سے زیادہ ہے"[2]

مختصر یہ کہ قرآن کی منطق کے مطابق علماء وہ لوگ نہیں ہیں کہ جن کا دماغ اس کی اور اُس کی آرا و افکار کا صندوقچہ ہو اور عالمی قوانین اور علمی فارمولوں سے بھرا ہو اور ان کی زبان ان مسائل کو بیان کرتی ہو اور ان کی زندگی مدارس، یونیورسٹیوں اور کتاب خانوں میں گزرتی ہوں بلکہ علماء تو وہ صاحبِ نظر اور دانشمند ہیں کہ جن کے نورِ علم و دانش نے ان کے تمام وجود کو خدا کے نور اور ایمان و تقویٰ سے روشن کیا ہو اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں سختی سے احساسِ مسئولیت رکھتے ہوں اور سب سے زیادہ پابند ہوں۔

ہم نے سورہ قصص میں بھی پڑھا ہے کہ جس وقت مغرور و خودپسند قارون نے کہ جو ایک مقام علم کا بھی مدعی تھا اپنی ثروت کی نمائش کی تو دنیا پرست لوگوں نے جو اس کے ٹھاٹھ باٹھ سے بہت زیادہ متاثر تھے' یہ آرزو کی کہ اے کاش! وہ بھی اس قسم کے اموالِ دنیا سے بہرہ ور ہوتے لیکن بنی اسرائیل کے علماء نے پکار کر ان سے کہا "تم پر وائے ہو! خدائی اجر و ثواب تو ان لوگوں کے لیے ہے کہ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے' اور وہ بہتر ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جو صرف صابر اور صاحبِ استقامت لوگوں کیلئے ہے"۔

وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن اٰمن وعمل صالحاً ولا یلقٰھا الا الصابرون (قصص-۸۰)

آیت کے آخر میں سابقہ بیان پر ایک مختصر دلیل کے عنوان سے فرمایا گیا ہے: "خدا عزیز و غفور ہے"۔ (ان اللہ عزیز غفور)۔

اس کی بے پایاں "عزت" و قدرت علماء کے خوف و خشیت کا سرچشمہ ہے' اور اس کی "غفوریت" کہ جو اس کی بے انتہا رحمت کی نشانی ہے ان کی رجاء و امید کا سبب ہے اور اس طرح سے یہ دو مقدس نام خدا کے بندوں کو خوف و رجاء کے درمیان محفوظ رکھتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ تکامل و ارتقا کی طرف مسلسل حرکت ان دو صفات سے متصف ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

---

[1] و [2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۹ إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَٰبَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَٰرَةً لَّن تَبُورَ ۝

۳۰ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ غَفُورٌ شَكُورٌ ۝

ترجمہ

۲۹ جو لوگ کتاب خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے پنہاں و آشکار انفاق کرتے ہیں وہ (ایسی نفع بخش) تجارت کی امید رکھتے ہیں کہ جس میں گھاٹا نہیں ہے۔

۳۰ (وہ یہ اعمال صالح اس لیے انجام دیتے ہیں) تاکہ خدا انہیں مکمل اجر اور صلہ دے اور اپنے فضل کا ان پر اضافہ کرے کہ وہ بخشنے والا اور قدر دان ہے۔

تفسیر

پروردگار کے ساتھ نفع بخش تجارت

گزشتہ آیات میں علماء کے خوف و خشیت کے مقام کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ زیر بحث آیات میں ان کے مقام "امید و رجاء" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ دو چیزوں کے ساتھ ہی انسان آسمانِ سعادت کی بلندی پر پرواز کر سکتا ہے اور تکامل و ارتقاء کی راہ طے کر سکتا ہے۔
پہلے فرمایا گیا ہے: "جو لوگ کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے پنہاں و آشکار خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں کہ جس میں گھاٹا نہیں ہے" (ان الذین یتلون کتاب اللہ و اقاموا الصلوٰۃ و انفقوا ممّا رزقنا ہم

سرًا و علانیۃ یرجون تجارۃ لن تبور[1]

یہ بات واضح ہے کہ یہاں "تلاوت" سرسری اور غور و فکر سے خالی قرأت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس سے ایسا پڑھنا مراد ہے کہ جو غور و فکر کا سرچشمہ ہو، وہ فکر کہ جو عمل صالح کا سرچشمہ بنے، ایسا عمل کہ جو ایک طرف تو انسان کا خدا سے رشتہ جوڑ دے جس کا مظہر نماز ہے اور دوسری طرف اسے مخلوق کے ساتھ مربوط کر دے کہ جس کا مظہر انفاق ہے۔

خرچ بھی تمام چیزوں میں سے کہ جو خدا نے انسان کو دی ہیں، اپنے علم میں سے، اپنے مال و ثروت اور اثر و رسوخ میں سے، اپنی قوی فکر و نظر میں سے اور اپنے اخلاق و تجربات میں سے، خلاصہ یہ کہ تمام خداداد نعمات میں سے۔

یہ انفاق کبھی تو پوشیدہ طریقے سے ہوتا ہے تاکہ مکمل اخلاص کی نشانی بنے (سرًا) اور کبھی آشکارا اور علی الاعلان تاکہ دوسروں کے لیے تشویق کا سبب ہو اور شعائر الٰہی کی تعظیم بھی ہو (علانیۃ)۔

ہاں! وہ عمل کہ جو اس قسم کا اثر رکھتا ہو وہ رجاء و امید کا سبب بنتا ہے۔

اس آیت میں اور گزشتہ آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سچے علماء ان صفات کے حامل ہوتے ہیں۔

روحانی لحاظ سے ان کا دل عظمت خدا کے احساس سے خوف و خشیت سے معمور ہوتا ہے۔

گفتگو کے لحاظ سے ان کی زبان آیات خدا کی تلاوت میں مشغول ہوتی ہے۔

روحانی اور جسمانی عمل کے لحاظ سے نماز پڑھتے ہیں اور اسے بطور عبادت بجا لاتے ہیں۔

دولت سے متعلق عمل کے لحاظ سے جو کچھ ان کے پاس ہے اسے آشکارا اور پنہاں انفاق کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مقصد کے لحاظ سے اُن کا افق فکر اتنا بلند و بالا ہے کہ ان کا دل زُود گزر مادی دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے، ان کی نظر صرف سود مند خدائی تجارت پر ہوتی ہے کہ جس کے دامن کی طرف فنا کا ہاتھ دراز نہیں ہوتا۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "تبور" "بوار" کے مادہ سے، سخت گھاٹے کے معنی میں ہے اور چونکہ شدید گھاٹا باعث تباہی ہوتا ہے لہٰذا "بوار" ہلاکت کے معنی میں آیا ہے، اس طرح "بوار" سے خالی تجارت وہ ہے کہ جو نہ گھاٹا ہو اور نہ ہی تباہی۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

---

[1] توجہ رکھیے کہ "یرجون" "انّ" کی خبر ہے۔

ایک شخص نے رسولِ خداؐ کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے موت کیوں پسند نہیں؟

آپؐ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس کچھ مال و دولت ہے؟

اس نے عرض کی: ہاں!

فرمایا: اسے اپنے سے پہلے آگے بھیج دے۔

عرض کیا: میں ایسا نہیں کرسکتا۔

فرمایا:

ان قلب الرجل مع ماله ان قدمه احب ان یلحق به' وان اخره احب ان یتأخر معه۔

"انسان کا دل اس کے مال کے ساتھ ہوتا ہے، اگر وہ اسے اپنے آگے بھیج دے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ جاملے اور اگر اسے اپنے پاس روک رکھے تو چاہتا ہے کہ وہ بھی اس کے ہمراہ پیچھے رہے"[1]

یہ حدیث حقیقت میں زیرِ بحث آیت کی روح کو منعکس کرتی ہے، کیونکہ ارشاد ہوتا ہے: کہ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور راہِ خدا میں انفاق کرتے ہیں وہ دارِ آخرت کی امید اور اس سے لگاؤ رکھتے ہیں چونکہ انہوں نے نیکیوں کو اپنے سے پہلے بھیج دیا ہے لہٰذا وہ اس کے ساتھ جاملنے کی آرزو کرتے ہیں۔

آخری زیرِ بحث آیت سچے مومنین کے مقصد کو اس طرح بیان کرتی ہے: "وہ یہ اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں تاکہ خدا انہیں مکمل اجر اور صلہ دے اور اپنے فضل سے اضافہ بھی کرے کہ وہ بخشنے والا اور شکور ہے" (لیوفیھم اجورھم ویزیدھم من فضلہ انہ غفور شکور)[2]

یہ جملہ حقیقت میں ان کے انتہائی خلوص کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال میں خدائی اجر و ثواب کے سوا اور کسی چیز پر نظر نہیں رکھتے جو کچھ چاہتے ہیں اُس سے چاہتے ہیں اور ریا، دکھاوے اور لوگوں کی تحسین و تعریف کے لیے قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ اعمالِ صالح میں اہم ترین مسئلہ وہی نیت خالص ہے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۸، صفحہ ۴۰۷ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] "لیوفیھم" یا تو "یتلون کتاب اللہ ..." سے متعلق ہے اس لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کا مقصد تلاوت، نماز اور انفاق سے خدا کا اجر و ثواب حاصل کرنا ہے اور یا یہ "لن تبور" سے متعلق ہے اور اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کی تجارت کبھی بھی گھاٹے کی طرف نہیں جائے گی کیونکہ ان کا اجر و صلہ دینے والا خدا ہے۔

"اجور" "اجر" کی جمع ہے اور "مزدوری" کے معنی میں ہے۔ حقیقت میں یہ تعبیر پروردگار کی طرف سے ایک لطف کی مظہر ہے گویا وہ بندوں کو اعمالِ صالح کے بدلے کا حقدار سمجھتا ہے۔ حالانکہ بندوں کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے، یہاں تک کہ اعمالِ صالح انجام دینے کی طاقت بھی اسی کی عطا کردہ ہے۔

اس تعبیر سے بھی زیادہ محبت آمیز "ویزیدھم من فضلہ" کا جملہ ہے کہ جس سے انہیں نوید اور خوشخبری دی گئی ہے کہ عام اجر کے علاوہ کہ جو خود بھی عمل سے سینکڑوں گنا اور کبھی ہزاروں گنا ہے، اپنے فضل سے مزید اس میں اضافہ کرتا ہے اور وہ نعمتیں کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتیں اور اس جہان میں کوئی بھی شخص ان کا تصور نہیں کر سکتا اپنے وسیع فضل سے انہیں بخشے گا۔

ایک حدیث میں ابن مسعود سے منقول ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا:

هو الشفاعة لمن وجبت له النار ممن صنع اليه معروفاً فی الدنيا۔

"اس سے مراد مرتبہ و مقامِ شفاعت ہے کہ جو انہیں حاصل ہوگا تاکہ وہ ان لوگوں کی شفاعت کریں کہ جنہوں نے اُن سے دنیا میں کوئی نیکی کی ہے لیکن اپنے اعمال کی وجہ سے مستحقِ عذاب ہو گئے ہیں"[1]

اس طرح سے نہ صرف وہ خود اہلِ نجات ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی پروردگار کے فضل سے نجات کا باعث ہیں۔

بعض مفسرین نے "ویزیدھم من فضلہ" کو مقامِ "شہود" کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو قیامت میں مومنین کو حاصل ہوگا یعنی وہ پروردگار کے جمال و جلال کی طرف دیکھیں گے اور اس منظر سے بہت لذت حاصل کریں گے۔

لیکن ظاہراً مذکورہ جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں مذکورہ حدیث کا مضمون بھی شامل ہے اور دوسری نعمات بھی شامل ہیں۔

"انہ غفور شکور" کا جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پہلا لطفِ پروردگار تو اُن کے حق میں وہی گناہوں اور لغزشوں کی بخشش ہے کہ جو کبھی کبھی ان سے سرزد ہوتے رہے ہیں کیونکہ انسان کی زیادہ تر پریشانی اسی وجہ سے ہوگی۔

جب وہ اس لحاظ سے آسودہ خاطر ہو جائیں گے تو اللہ انہیں ان کے اعمال کا شکریہ ادا کرے گا اور انہیں افضل ترین جزا دے گا۔

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

تفسیر مجمع البیان میں یہاں عربوں کی ایک جاذبِ نظر ضرب المثل نقل ہوئی ہے کہ وہ کہتے ہیں:

اشکر من برو قه

"فلاں شخص درخت بروقہ سے بھی زیادہ شکر گزار ہے"[1]

اور یہ ایک چھوٹے سے درخت کی طرف اشارہ ہے کہ جو سرزمین عربستان میں ہوتا تھا اور عربوں کا عقیدہ تھا کہ جب اس پر بادل کا سایہ ہوتا ہے تو یہ فوراً سرسبز ہو جاتا ہے اور بادل برسے بغیر اس کے پتے نکل آتے ہیں اور یہ انتہائی شکر گزاری کے لیے ایک ضرب المثل ہے کہ جو معمولی سی خدمت کے بدلے بڑی سے بڑی جزا اور اجر دینے کے موقع پر بولی جاتی ہے[2]

البتہ اس قسم کے درخت کا خالق و مالک اس سے بھی زیادہ قدر دانی کرنے والا اور بخشش کرنے والا ہے۔

اِس تجارت کی عجیب شرائط

پُرلطف بات یہ ہے کہ بہت سی آیاتِ قرآنی میں اس جہان کو ایسے تجارت گھر سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کے تاجر انسان ہیں اور خریدار پروردگارِ عظیم اور مال و متاع عملِ صالح ہیں اور قیمت بہشت اور خدا کی رحمت و رضا ہے[3]

اگر ہم صحیح طور پر غور و فکر کریں تو خداوندکریم کے ساتھ یہ عجیب و غریب تجارت بے مثال ہے، کیونکہ یہ ایسے امتیازات کی حامل ہے جو کسی بھی تجارت میں موجود نہیں ہیں :

۱۔ تمام سرمایہ اس نے خود ہی بیچنے والے کو دیا ہے اس کے بعد خود ہی خریدار بن جاتا ہے۔

۲۔ وہ خریدار ہے، حالانکہ اُسے ان اعمال کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر چیز کے خزانے اُسی کے پاس ہیں۔

۳۔ وہ "متاعِ قلیل" کو بہت زیادہ قیمت پر خریدتا ہے :

یا من یقبل الیسیر ویعفو عن الکثیر

"اے وہ خدا کہ جو تھوڑے سے عمل کو قبول کر لیتا ہے اور بہت سے گناہوں کو بخش دیتا ہے"

---

[1] "بروقہ" بروزن "حمزہ"۔

[2] مجمع البیان، جلد ۸ صفحہ ۴۰۷۔

[3] صف - ۱۰، توبہ - ۱۱۱، بقرہ - ۲۰۷، نساء - ۷۴۔

۴۔ یہاں تک کہ وہ معمولی قسم کے مال و متاع بھی خرید لیتا ہے:

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ۔

"جو ذرہ برابر بھی عمل کرتا ہے وہ اسے دیکھے گا"

۵۔ کبھی وہ سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی کہیں زیادہ قیمت دیتا ہے۔ (بقرہ - ۲۶۱)

۶۔ اس عظیم قیمت کے علاوہ اپنے فضل و رحمت سے اتنا اضافہ کرے گا کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ "ویزیدھم من فضلہ" (زیر بحث آیت)

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک آزاد اور عاقل انسان اس قسم کی تجارت سے آنکھ بند کر لے اور اس کے غیر کی طرف رُخ کرے اور اس سے بھی بدتر بات یہ کہ اپنی ہستی اور وجود کے مال و متاع کو بے قیمت بیچ ڈالے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وانہ لیس لانفسکم ثمن الا الجنۃ فلا تبیعوھا الا بھا۔

"جان لو کہ تمہارے سرمایہ ہستی کی قیمت جنت کے علاوہ کچھ نہیں اسے جنت کے علاوہ کسی اور چیز کے بدلے نہ بیچو"[1]

[1] نہج البلاغہ - کلمات قصار - جملہ ۴۵۶ -

(۳۱) وَالَّذِيٓ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ مِنَ الۡكِتٰبِ هُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيۡرٌۢ بَصِيۡرٌ ○

(۳۲) ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡكَبِيۡرُ ○

ترجمہ

(۳۱) ہم نے کتاب میں سے جو کچھ تجھے وحی کیا ہے وہ حق ہے اور اس سے پہلے والی کتب کے ساتھ ہم آہنگ ہے، خدا اپنے بندوں سے باخبر اور بینا ہے۔

(۳۲) پھر ہم نے یہ کتابِ آسمانی اپنے برگزیدہ بندوں میں سے ایک گروہ کو میراث میں دے دی (لیکن) ان میں سے ایک گروہ نے اپنے اوپر ظلم کیا اور ان میں سے کچھ میانہ رو تھے اور ایک جماعت اذنِ خدا سے نیکیوں میں سب سے (سبقت) لے گئی اور یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔

تفسیر

میراثِ انبیاء کے حقیقی وارث

گزشتہ آیات میں پاک دل مومنین کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو کتاب اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ زیرِ بحث آیات میں اس آسمانی کتاب اور اس کی صداقت کے دلائل اور اسی طرح اس کتاب کے حقیقی حاملین کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے گزشتہ آیات میں

توحید کے بارے میں بحث تھی اور یہاں نبوت کے متعلق گفتگو سے سلسلۂ کلام کی تکمیل کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے کتاب میں سے جو کچھ تجھے وحی کیا ہے وہ حق ہے اور جو کچھ گزشتہ کتب میں آیا ہے یہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ خدا اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ اور بینا ہے" (والذی اوحینا الیك من الکتاب ھوالحق مصدقاً لمابین یدیه ان الله بعبادہ لخبیر بصیر)۔

حق کا معنی ہے "ایسی چیز جو واقعیت سے ہم آہنگ اور اس کے مطابق ہو" یہ تعبیر اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے ایک دلیل ہے کہ یہ آسمانی کتاب پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ ہم اس کے مضامین میں جس قدر بھی غور و فکر کرتے ہیں اسے اتنا ہی حقائق کے ساتھ ہم آہنگ پاتے ہیں۔

اس میں کوئی تناقض ہے نہ جھوٹ اور نہ کوئی بیہودہ پن۔ اس کے اعتقادات و معارف عقل و منطق سے ہم آہنگ ہیں، اس کی تاریخ افسانوں اور من گھڑت قصوں سے خالی ہے اور اس کے قوانین انسانی احتیاجات کے موافق ہیں۔ اس کی حقانیت اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ یہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

اس مقام پر تو قرآن کے مقام اور حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ "حق" سے استفادہ کیا گیا ہے جبکہ قرآن کی دوسری آیات میں لفظ "نور"۔ "برہان"۔ "فرقان"۔ "ذکر"۔ "موعظہ" اور "ہدیٰ" سے استفادہ کیا گیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک قرآن کی مختلف برکتوں اور پہلوؤں میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور "حق" لفظ ان سب کا جامع ہے۔

راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "حق" دراصل مطابقت اور موافقت کے معنی میں ہے اور یہ لفظ کئی معانی کے لیے بولا جاتا ہے:

پہلا: وہ ذات کہ جو کسی چیز کو حکمت کی اساس پر ایجاد کرے۔ اسی بناء پر خدا کو حق کہا جاتا ہے۔

فذالکم الله ربکم الحق (یونس۔ ۳۲)۔

دوسرا: وہ چیز کہ جو حکمت کی بنیاد پر ایجاد ہوئی ہے اسے بھی حق کہا جاتا ہے اور چونکہ عالم ہستی خدا کا فعل ہے اور حکمت کے موافق ہے لہٰذا وہ سب کا سب حق ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ماخلق الله ذالك الّا بالحق۔

"خدا نے ان موجودات (سورج اور چاند اور ان کی منازل) کو حق کے سوا پیدا نہیں کیا" (یونس۔ ۵)

تیسرا: ان عقائد کو کہ جو حقیقت کے مطابق ہیں حق کہا جاتا ہے:

فھدی الله الذین اٰمنوا لما اختلفوا فیه من الحق۔

"خدا نے مومنین کی اس بات کی طرف کہ جس میں انہوں نے حق سے اختلاف کیا تھا ہدایت فرمائی"۔ (بقرہ - ۲۱۳)

چوتھا اُن باتوں اور افعال کو بھی حق کہا جاتا ہے جو ذمہ داری کے مطابق اور وقت مقررہ پر انجام پاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ تیری بات حق ہے اور تیرا کردار حق ہے[1]

اس بناء پر قرآن مجید کا حق ہونا اس لحاظ سے بھی ہے کہ یہ مصلحت اور حقیقت کے مطابق گفتگو کرتا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس میں موجود عقائد و معارف حقیقت سے ہم آہنگ ہیں اور یہ خدا کا کام بھی ہے کہ جسے اس نے حکمت کی بنیاد پر ایجاد کیا ہے۔ خود خداوندِ عالم کہ جو عین حق ہے کی اس میں تجلی ہے اور عقل اس چیز کی تصدیق کرتی ہے کہ جو حق اور واقعیت ہے۔

"مصدقا لما بین یدیه" کا جملہ اس کتابِ آسمانی کی صداقت کی دوسری دلیل ہے کیونکہ وہ ایسی نشانیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو گزشتہ کتب میں اس کے بارے میں اور اس کے لانے والے کے بارے میں آئی ہیں (اس سلسلے میں ہم سورۂ بقرہ کی آیہ ۴۱ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں)[2]

"ان الله بعباده لخبیر بصیر" کا جملہ قرآن کی حقانیت کی علت ہے اور حقائق اور انسانی تقاضوں کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کو بیان کرتا ہے کیونکہ یہ اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ جو اپنے بندوں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے اور ان کی احتیاجات کے بارے میں بصیر و بینا ہے۔

"خبیر" اور "بصیر" کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس بارے میں عرض ہے کہ "خبیر" تو انسان کے باطن، اس کے عقائد، نیت اور روح کے معنی میں ہے اور "بصیر" اس کے ظواہر اور رونما ہونے والے جسمانی امور کے بارے میں بینا ہونے کے معنی میں ہے[3]

بعض مفسرین "خبیر" کو انسان کی اصل خلقت کی طرف اور "بصیر" کو اس کے اعمال و افعال کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں[4]

البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اگرچہ آیت سے دونوں معانی مراد ہونا بھی بعید نہیں ہے۔

* * *

بعد والی آیت میں اس عظیم آسمانی کتاب کے حاملین کا ذکر ہے یعنی وہ لوگ کہ جنہوں نے پیغمبرِ اکرمؐ

---

[1] مفرداتِ راغب مادہ "حق"۔

[2] جلد اول صفحہ ۱۴۰ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

[3] فخر رازی تفسیر کبیر زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[4] روح البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کے پاکیزہ دل پر قرآن کے نزول کے بعد اس مشعل فروزاں کو ہر زمانے میں روشن رکھا اور اس کی پاسداری کی۔ ارشاد ہوتا ہے: "پھر ہم نے یہ آسمانی کتاب اپنے برگزیدہ بندوں میں سے ایک گروہ کو میراث میں دے دی" (ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا)۔

واضح رہے کہ یہاں "کتاب" سے مراد وہی چیز ہے جو گزشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے (یعنی قرآن مجید) اور اصطلاح کے مطابق اس میں الف اور لام عہد کا ہے اور یہ جو بعض علماء نے اسے تمام کتب آسمانی پر اشارہ سمجھا ہے اور اسے جنس کے لیے آنے والا الف لام سمجھا ہے بہت ہی بعید نظر آتا ہے اور گزشتہ آیات سے مناسبت نہیں رکھتا۔

قرآن مجید میں یہاں اور اس کے مشابہ دوسرے مواقع پر "ارث" کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ "ارث" ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی زحمت کے بغیر ہاتھ آئے اور خدا نے بھی یہ بہت ہی عظیم کتاب اسی طرح مسلمانوں کو عطا کر دی ہے۔

اس مقام پر اہل بیتؑ کے حوالے سے بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں اُن سب میں خدا کے برگزیدہ بندوں سے مراد ائمہ معصومین لیے گئے ہیں[1]

یہ روایات جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے، واضح اور درجہ اوّل کے مصادیق بیان کرتی ہیں۔ یہ بات اس میں مانع نہیں کہ امت کے علماء، صالحین اور شہداء کہ جنھوں نے اس کتاب آسمانی کی حفاظت و پاسداری اور اس کے فرامین کو دوام بخشنے کے لیے کوشش کی ہے "الذین اصطفینا من عبادنا" (خدا کے برگزیدہ بندے) کے مفہوم میں داخل ہوں۔

اس کے بعد اس سلسلے میں لوگوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "ان میں سے کسی گروہ نے اپنے اوپر ظلم کیا، کسی نے درمیانی راہ اختیار کی اور کسی گروہ نے حکم خدا سے نیکیوں میں دوسروں سے سبقت حاصل کر لی اور یہ بہت بڑی فضیلت ہے" (فمنھم ظالم لنفسه و منھم مقتصد و منھم سابق بالخیرات باذن الله ذالك ھو الفضل الکبیر)۔

آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ "خدا کے برگزیدہ بندوں" میں سے ہیں کہ جو وارث و حامل کتاب الٰہی ہیں۔

زیادہ واضح تعبیر میں خدا نے اس کتاب آسمانی کی پاسداری اور حفاظت اپنے پیغمبرؐ کے بعد اس امت کے ذمہ رکھی ہے۔ وہ امت کہ جو خدا کی برگزیدہ ہے لیکن اس امت کے درمیان مختلف طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ان میں سے بعض اس کتاب کی پاسداری اور اس پر عمل کرنے کی عظیم ذمہ داری

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ صفحہ ۳۶۱ کی طرف رجوع کریں۔

میں کوتاہی کرتے ہیں لہذا انہوں نے حقیقت میں اپنے اوپر ظلم کیا ہے، یہ "ظالم لنفسہ" کے مصداق ہیں۔

دوسرے گروہ نے کافی حد تک اس ذمہ داری کو پورا کیا ہے اور کتاب پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ ان سے کچھ لغزشیں اور خطائیں بھی ہوئی ہیں یہ "مقتصد" کے مصداق ہیں۔

ایک ممتاز گروہ وہ ہے جس نے اپنی بھاری ذمہ داری کو احسن طریقے سے انجام دیا ہے اور مقابلہ کے اس عظیم میدان میں یہ لوگ سب سے بازی لے گئے ہیں۔ یہ ان سب کے پیشوا ہیں جنہیں آیت میں "سابق بالخیرات باذن اللہ" کہا گیا ہے۔

ممکن ہے کہ یہاں یہ کہا جائے کہ "اصطفینا" اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام گروہ خدا کے برگزیدہ ہیں، لیکن یہاں ایک ظالم گروہ کا ذکر اس امر کے منافی ہے۔

ہم جواب میں کہیں گے کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے بنی اسرائیل کے بارے میں سورۂ مومن کی آیہ ۵۳ میں ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ولقد اٰتینا موسی الھدی واورثنا بنی اسرائیل الکتاب۔

"ہم نے موسٰی کو ہدایت (آسمانی کتاب) دی اور یہی آسمانی کتاب ہم نے بنی اسرائیل کو میراث کے طور پر عطا کی۔"

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ سارے بنی اسرائیل نے اپنی اس عظیم میراث کے بارے میں اپنا فریضہ انجام نہیں دیا۔

اسی طرح سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۱۰ میں بھی ہے کہ:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔

"تم مسلمان بہترین امت ہو کہ جنہوں نے انسانوں کے فائدہ کے لیے عرصۂ حیات میں قدم رکھا۔"

اسی طرح سورۂ جاثیہ کی آیہ ۱۶ میں بنی اسرائیل کے بارے میں ہے:

وفضلناھم علی العالمین۔

"ہم نے انہیں عالمین پر فضیلت دی۔"

اسی طرح سورہ حدید کی آیہ ۲۶ میں ہے کہ:

ولقد ارسلنا نوحًا وابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ والکتاب فمنھم مھتد وکثیر منھم فاسقون۔

"ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی ان میں سے بعض تو ہدایت یافتہ ہیں اور بہت سے فاسق اور گنہگار ہیں۔"

مختصر یہ کہ اس قسم کی تعبیرات کا مقصد امت کا ہر فرد نہیں ہے بلکہ پوری امت مراد ہے، اگرچہ اس

میں مختلف طرح کے گروہ اور لوگ پائے جاتے ہیں [1]

بہت سی روایات میں کہ جو اہلِ بیتؑ کے طرق سے وارد ہوئی ہیں "سابق بالخیرات" سے امام معصوم مراد لیا ہے اور "ظالم لنفسہ" سے وہ افراد کہ جو امام کی معرفت اور شناخت نہیں رکھتے اور "مقتصد" سے امام کے عارف پیروکار مراد لیے گئے ہیں [2]

یہ تفاسیر اس بات کی واضح گواہ ہیں کہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ وارثانِ کتابِ الٰہی میں یہ تینوں گروہ شامل ہیں جیسا کہ ہم نے تفسیر آیت میں کہا ہے۔

شاید اس بات کی یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ مذکورہ بالا روایات کی تفسیر واضح مصادیق کا بیان ہے، یعنی امام معصوم "سابق بالخیرات" کی صفِ اوّل میں ہے اور علماء اور دینِ الٰہی کے محافظین دوسری صفوں میں ہیں۔

وہ تفسیر کہ جو ان روایات میں "ظالم" و "مقتصد" کے بارے میں بیان کی گئی ہے وہ بھی مصداق بیان کرتی ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ روایات میں آیت کے مفہوم میں علماء کی بالکل نفی کی گئی ہے تو ایسا درحقیقت ان صفوں کے آگے آگے امام معصوم کے وجود کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ اور موجودہ مفسرین میں سے بعض نے ان تینوں گروہوں کے بارے میں دوسرے بہت سے احتمال بھی ذکر کیے ہیں کہ جو سارے کے سارے اس کے مصداق کا ہی بیان ہیں [3]

---

[1] بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ تقسیم "عبادنا" کے ساتھ مربوط ہے نہ کہ برگزیدہ افراد کے ساتھ۔ اس بناء پر یہ تینوں گروہ وارثانِ کتابِ الٰہی میں شامل نہیں ہیں بلکہ وہ تمام بندگانِ خدا میں تو شامل ہیں لیکن برگزیدہ اور چنے ہوئے صرف تیسرے گروہ کے افراد یعنی سابق بالخیرات ہوں گے۔ لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ گروہ ان لوگوں کا تجن کا آیت میں ذکر کیا جا رہا ہے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آیت تمام عباد کے بارے میں نہیں بلکہ برگزیدہ لوگوں کے متعلق گفتگو ہے۔ اس سے قطع نظر "عباد" کی "نا" کی طرف اضافت ایک طرح کی مدح کو بیان کرتی ہے کہ جو دوسری تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۳۶۱ کے بعد اسی طرح اصول کافی جلد ۱ باب ان من اصطفاہ اللہ من عبادہ ....

[3] بعض نے تو یہ کہا ہے کہ "سابق بالخیرات" "اصحاب پیغمبرؐ" ہیں اور "مقتصد" "تابعین کا طبقہ" ہے اور "ظالم لنفسہ" دوسرے افراد ہیں۔

بعض دوسروں نے "سابق" سے وہ لوگ مراد لیے ہیں جن کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور "مقتصد" سے وہ لوگ کہ جن کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہے اور ظالم وہ کہ جن کا ظاہر ان کے باطن سے بہتر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "سابقون" "صحابہ" ہیں اور "مقتصدون" "ان کے تابعین" ہیں اور "ظالمون" "منافق" ہیں۔

بعض نے اس آیت کو ان تینوں گروہوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جن کا ذکر سورہ واقعہ کی آیت ۷ تا ۹ میں آیا ہے:

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے ظالمین کے بارے میں پھر درمیانے افراد کے بارے میں اور سب سے آخر میں "سابق بالخیرات" کے بارے میں بات کیوں کی گئی ہے جبکہ کئی ایک جہات سے الٹی ترتیب بہتر نظر آتی ہے۔

بعض بزرگ مفسرین نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس کا مقصد سلسلۂ کمال میں لوگوں کے مقامات کی ترتیب بیان کرنا ہے کیونکہ پہلا مرحلہ عصیان و غفلت کا ہے، اس کے بعد توبہ و انابت کا مقام ہے اور انجام کار خدا کی طرف توجہ اور اس کے قرب کی منزل ہے۔ جس وقت انسان سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو وہ "ظالم" ہے اور جس وقت وہ مقام توبہ میں آتا ہے تو "مقتصد" ہے اور جس وقت اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے اور خدا کی راہ میں اس کی مساعی بہت بڑھ جاتی ہیں تو وہ اس کے مقام قرب میں پہنچ جاتا ہے اور "سابق بالخیرات" میں شمار ہونے لگتا ہے[1]

بعض نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ ترتیب ان تینوں گروہوں کے افراد کی زیادتی اور کمی کے لحاظ سے ہے۔ ظالمین اکثریت میں ہوتے ہیں اور مقتصدین بعد والے مرحلہ میں اور سابقین بالخیرات کہ جو خلص اور پاک لوگ ہیں سب سے کم ہوتے ہیں اگرچہ کیفیت کے لحاظ سے سب سے بلند مرتبہ ہیں[2]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ظالم کو اس سبب سے مقدم رکھا ہے تاکہ وہ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو جائے اور سابق بالخیرات کو اس لیے مؤخر کیا ہے تاکہ وہ اپنے عمل پر مغرور نہ ہوں[3]

لہٰذا ممکن ہے کہ تینوں معانی مراد ہوں۔

آخری بات اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ "ذالک ھو الفضل الکبیر" (یہ بہت بڑی فضیلت ہے) کے جملے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ کہ اس میں مشارالیہ کیا ہے؟ بعض نے کہا ہے

سابقہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ: وکنتم ازواجاً ثلاثۃ فاصحاب المیمنۃ ما اصحاب المیمنۃ واصحاب المشئمۃ ما اصحاب المشئمۃ والسابقون السابقون اولئک المقربون۔

ایک حدیث میں "سابق بالخیرات" سے ائمہ بزرگوار حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور شہیدانِ آل محمدؐ مراد لیا گیا ہے اور "مقتصد" سے متدین مجاہد ہیں اور "ظالم" سے وہ کہ جن کے نیک اعمال غیر صالح اعمال کے ساتھ ملے جلے ہیں۔

یہ تمام تفسیریں بیانِ مصداق کے عنوان سے قابلِ قبول ہیں سوائے پہلی تفسیر کے کہ اس کا کوئی درست مفہوم نہیں ہے۔

حاشیہ صفحہ ہٰذا:

1. طبرسی "مجمع البیان"، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
2. تفسیر "فی ظلال القرآن" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
3. تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۹، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کہ اس سے مراد کتاب الٰہی کی میراث ہی ہے اور بعض نے اسے اس توفیق کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو "سابق بالخیرات" کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ اذنِ خدا سے اس راہ کو طے کرتے ہیں لیکن پہلا معنی ظاہر آیت کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

کتابِ الٰہی کے پاسدار کون ہیں؟

قرآن مجید کی گواہی کے مطابق خداوند تعالیٰ نے امتِ اسلامیہ کو اتنی عظیم نعمتیں عطا کی ہیں کہ جن میں سے زیادہ اہم خدا کی عظیم میراث قرآن مجید ہی ہے۔

اُس نے امت مسلمہ کو ساری امتوں پر برتری عطا کی اور اُسے یہ نعمت دی لیکن انہیں اپنے لطف خاص سے نوازا ہے تو اُن پر اسی نسبت سے ذمہ داری بھی عائد کی ہے۔

وہ صرف اسی صورت میں اس میراث عظیم کی پاسداری کا حق ادا کر سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو "سابق بالخیرات" کی صف میں داخل کرنے کے قابل بنالیں یعنی تمام امتوں سے نیکیوں کی انجام دہی میں آگے بڑھ جائیں، علم و دانش کے حصول میں سبقت حاصل کریں اور تقویٰ و پرہیزگاری میں، عبادت و خدمتِ خلق میں، جہاد و کوشش میں، نظم و ضبط اور حساب و کتاب میں اور ایثار و فداکاری میں سب سے بڑھ کر رہیں اس صورت کے علاوہ وہ اس کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔

خصوصاً "سابق بالخیرات" کی تعبیر اتنا وسیع اور کشادہ مفہوم رکھتی ہے کہ جو زندگی کے تمام مثبت پہلوؤں میں اور نیک اعمال میں تقدم حاصل کرنے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

ہاں! اس قسم کی میراث کے حامل ایسے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔

یہاں تک کہ وہ لوگ جو اس عظیم آسمانی عنایت کی طرف پشت کر لیتے ہیں اور اس کی حرمت کا خیال نہیں رکھتے، "ظالم لنفسہ" کا مصداق ہیں اور خود اپنے ہی اوپر ظلم کرتے ہیں کیونکہ اس کے مطالب ان کی نجات، خوش بختی اور کامیابی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ وہ آدمی کہ جو کسی شفا بخش نسخہ کو استعمال نہیں کرتا اس نے اپنے درد اور تکلیف کے باقی رہنے میں خود کمک کی ہے اور جو شخص کسی تاریک راستے کو طے کرنے کے موقع پر اپنے روشن چراغ کو توڑ دیتا ہے وہ خود کو بے راہی اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ خدا سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔

اس کے باوجود اس گنہگار گروہ کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ بھی زیر بحث آیت کے مضمون کے مطابق "پروردگار کے برگزیدہ لوگوں" کے زمرے میں آتا ہے اور یہ استعداد رکھتا ہے کہ مرحلۂ ظلم کو پس پشت ڈال کر مقتصد کے مرحلے میں قدم رکھے اور وہاں سے پرواز کرکے "سابق بالخیرات" کے اوج افتخار پر جا پہنچے کیونکہ وہ بھی فطرت اور روحانی ساخت کے لحاظ سے حق تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں۔

(۳۳) جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ وَّ لُؤۡلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُہُمۡ فِیۡہَا حَرِیۡرٌ ○

(۳۴) وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَذۡہَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوۡرٌ شَکُوۡرُۨ ○

(۳۵) الَّذِیۡۤ اَحَلَّنَا دَارَ الۡمُقَامَۃِ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیۡہَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیۡہَا لُغُوۡبٌ ○

ترجمہ

(۳۳) (ان کی جزا) جنت کے ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں کہ وہ جن میں داخل ہوں گے۔ وہاں پر انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا اور وہاں ان کے لباس ریشم کے ہوں گے۔

(۳۴) وہ کہیں گے کہ حمد (اور ستائش) اس خدا کے لیے ہے کہ جس نے ہمارا غم دُور کر دیا۔ بے شک ہمارا پروردگار غفور و شکور ہے۔

(۳۵) وُہ خدا کہ جس نے اپنے فضل سے (ابدی) قیام کی اس جگہ پر ہمیں ٹھہرایا ہے کہ جہاں نہ تو ہمیں کوئی رنج و تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی سستی اور تھکان ہو گی۔

تفسیر

جہاں غم ہے نہ تھکان

جو کچھ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے یہ آیات حقیقت میں اُسی کا ایک نتیجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"نیکیوں میں پیش قدمی کرنے والوں کے لیے دائمی بہشت کے باغات ہیں جس میں وہ سب کے سب داخل ہوں گے" (جنات عدن یدخلونها)۔[1]

"جنّات" "جنة" کی جمع ہے اور باغ کے معنی میں ہے اور "عدن" استقرار و ثبات کے معنی میں ہے اور معدن کو اس وجہ سے معدن کہتے ہیں کیونکہ وہ مختلف دھاتوں اور جواہرات کے استقرار کی جگہ ہے۔ اس بناء پر "جنات عدن" کا معنی ہے "بہشت کے ہمیشہ رہنے والے باغات"۔

بہرحال یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہشت کی عظیم نعمتیں جاودانی اور قائم رہنے والی ہیں اور مادی دنیا کی نعمتوں کی طرح ان کے بارے میں زوال کا خوف نہیں ہے۔ بہشت میں رہنے والوں کے لیے بہشت کا ایک ہی باغ نہیں ہوگا بلکہ بہشت کے باغات ان کے پاس ہوں گے۔

اس کے بعد جنت کی نعمتوں کے تین حصّوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے بعض مادی اور ظاہری پہلو رکھتے ہیں، بعض روحانی اور باطنی اور ایک حصہ ہر قسم کے مزاحم کی نفی کرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے "نیکیوں میں بڑھ جانے والے یہ لوگ بہشت جاودانی میں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ ہوں گے اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا" (یحلون فیها من اساور من ذهب ولؤلؤا ولباسهم فیها حریر)۔

انہوں نے اس دنیا میں اُس کے زرق برق سے بے اعتنائی برتی تھی اور خود کو سونے اور زیورات کا اسیر نہیں بنایا تھا۔ محروم لوگ سوتی لباس سے بھی محروم تھے تو انہوں نے بھی فاخرہ لباس نہیں پہنا تھا خدا اسی چیز کی تلافی کے طور پر انہیں دوسرے جہان میں بہترین لباس اور زیور پہنائے گا۔

انہوں نے اس جہان ظاہر میں اپنے آپ کو راہ خدا میں خیرات کے ساتھ آراستہ کیا تھا، خدا بھی دوسرے جہان میں کہ جو تجسم اعمال کا جہان ہے انہیں طرح طرح کے زیورات سے آراستہ کرے گا۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ ہمارے الفاظ اس جہان کی محدود زندگی کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ یہ قیامت کے عظیم عالم کے مفاہیم ہرگز بیان نہیں کر سکتے۔ ان نعمتوں کے بیان کے لیے کسی اور طرح کی الف۔ با اور کوئی دوسری زبان اور لغت کی ضرورت ہے لیکن بہرحال اس غرض سے کہ اس جہان میں مقید افراد کو ان عظیم نعمتوں کا ایک تصور پیش کرنے کے لیے انہی ناچیز اور نارسا الفاظ سے مدد لینا پڑتی ہے اس مادی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد ایک خاص روحانی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

---

[1] جنات عدن ..... ممکن ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو اور تقدیر میں "جزائهم جنات عدن ..." یا "اولئك لهم جنّات عدن" تھا (نظیر آیہ ۳۱ سورہ کہف) بعض نے اسے "فضل کبیر" سے بدل سمجھا ہے، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "فضل کبیر" کتاب آسمانی کی میراث کی طرف اشارہ ہے لہٰذا "جنّت" اس سے بدل نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ ہم مسبب کو سبب کا جانشین بنا لیں۔

گیا ہے: "وہ کہیں گے کہ حمد و ستائش اس خدا کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس نے ہم سے غم دُور کر دیا" (وقالوا الحمد للّٰہ الذی اذھب عنا الحزن)۔

وہ اس عظیم نعمت کے لیے خدا کی حمد کرتے ہیں کہ جو انہیں نصیب ہوئی ہے اور خدا کے لطف کی برکت سے ان کی زندگی سے غم کے تمام عوامل دور ہو گئے ہیں اور ان کی روح کا آسمان رنج و غم کے تاریک بادلوں سے پاک ہو گیا ہے۔ نہ تو انہیں خدا کے عذاب کا کوئی خوف ہے اور نہ ہی مرگ و فنا سے کوئی وحشت۔ نہ دل کی بے اطمینانی کی کوئی وجہ ہے اور نہ بدخواہوں کی آزار نہ جابروں کا دباؤ ہے اور نہ ہی بُروں اور کم ظرفوں کی ہم نشینی۔

بعض مفسرین نے اس حزن کو دنیاوی غموں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو میدانِ حشر میں انہیں اپنے عمل کے نتیجہ کے بارے میں ہوگا۔ یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تضاد نہیں رکھتیں اور دونوں ہی آیت کے معنی میں جمع ہو سکتی ہیں۔

"حزن" (بروزن "غذم") اور "حزن" (بروزن "مزد") جیسا کہ لغت اور تفسیر کی بہت سی کتابوں میں آیا ہے دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ اصل میں یہ زمین کی ناہمواری کے معنی میں ہے اور چونکہ غم و اندوہ روح انسانی کو ناہموار اور سخت کر دیتے ہیں اس لیے یہ تعبیر اس معنی میں استعمال ہوئی ہے[1]

اس کے بعد یہ بہشتی مومنین مزید کہیں گے کہ "ہمارا پروردگار غفور و شکور ہے" (انّ ربنا لغفور شکور)۔

اپنی غفوریت کی صفت کی بناء پر اس نے لغزشوں اور گناہوں کا بھاری غم دور کر دیا ہے اور اپنی شکوریت کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتیں کہ جن کے اوپر کبھی بھی غم و اندوہ کا منحوس سایہ نہیں پڑتا ہمیں عطا کی ہیں۔

ہمارے بہت سے گناہوں کو اس کے غفران نے چھپا لیا ہے اور ہمارے حقیر اور تھوڑے سے اعمال کا اپنی شکوریت کی بناء پر ہمیں بہت زیادہ اجر اور صلہ دیا ہے۔

❁ ❁ ❁

آخر میں آخری نعمت کا بیان ہے ان کا قول نقل کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "حمد و ستائش اس خدا کے لیے ہے کہ جس نے اپنے فضل سے ہمیں اس ابدی ٹھکانے میں جگہ دی کہ جس میں نہ رنج و غم ہے

---

[1] تاج العروس میں بعض علماء ادب سے منقول ہے کہ جس وقت یہ لفظ رفع اور جر کے اعراب کے ساتھ استعمال ہو تو پھر (ز) کے سکون کے ساتھ اس کا تلفظ ہوتا ہے اور جب نصب اور زبر کی صورت میں ہو تو پھر (ز) کی فتح کے ساتھ۔ لیکن ادبیات عرب میں یہ امر ایک قانون کی صورت میں ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتا اگرچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں بعض مواقع پر حالتِ نصب میں بھی (ز) کے سکون کے ساتھ آیا ہے۔

اور نہ ہی خستگی اور تھکان" (الذی احلنا دار المقامة من فضله لا یمسنا فیها نصب ولا یمسنا فیها لغوب)۔

ایک طرف تو وہ ٹھہرنے اور قیام کی جگہ ہے اور ایسا نہیں ہے کہ انسان ابھی اسی ماحول سے آشنا ہو رہا ہوگا اور اس کے ساتھ دل لگا رہا ہو کہ کوچ کا نقارہ بج جاتے گا۔

دوسری طرف اس کے باوجود کہ اس کی عمر طولانی اور ابدی ہوگی اور اس قسم کی مدت میں قاعدتاً تھکان، تکلیف اور زحمت ہوتی لیکن وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر روز نئی نعمت اور نعمتوں کی تازہ بہار اور پروردگار کے جلوے اہل بہشت کو نظر آئیں گے۔

"نصب" (بروزن "حسب") مشقت اور زحمت کے معنی میں ہے اور "لغوب" کو بھی بہت سے ارباب لغت اور مفسرین نے اسی معنی میں لیا ہے جبکہ بعض نے ان دونوں کے درمیان یہ فرق کیا ہے کہ "نصب" جسمانی مشقتوں اور "لغوب" روحانی تھکان کو کہتے ہیں [1]

بعض نے "لغوب" کو بھی اس سستی اور تھکاوٹ کے معنی میں سمجھا ہے کہ جو مشقت اور رنج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح سے "لغوب" "نصب" کا نتیجہ ہوگا [2]

گویا وہاں نہ تو مشقتِ جسمانی کے عوامل موجود ہیں اور نہ ہی روحانی رنج و تکلیف کے اسباب کی کوئی خبر ہے۔

---

[1] و [2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۲ صفحہ ۱۸۱ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

(۳۶) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِىْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۚ ○

(۳۷) وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِىْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۚ ○

(۳۸) اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

ترجمہ

(۳۶) جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہرگز ان کی موت کا فرمان جاری نہیں ہوگا کہ وہ مر جائیں اور نہ ہی ان کے لیے عذاب میں کوئی تخفیف ہو سکے گی۔ اس طرح سے ہم ہر کفران کرنے والے کو سزا دیں گے۔

(۳۷) وہ دوزخ میں فریاد کریں گے، پروردگارا! ہمیں نکال، تاکہ ہم ان اعمال کے بجائے کہ جو ہم انجام دیا کرتے تھے (اب) نیک عمل بجا لائیں۔ (انہیں جواب دیا جائے گا) کیا ہم نے تمہیں اس قدر عمر نہیں دی تھی کہ انسان چاہے تو اس میں متوجہ ہو جائے؟ اور کیا (خدا کی طرف سے) متنبہ کرنے والا تمہارے پاس

نہیں آیا تھا؟ پس اب تم (اس کا مزہ) چکھو کیونکہ ظالموں کے لیے کوئی یاور و مددگار نہیں ہے۔

(۳۸) خدا آسمانوں اور زمین کے غیب سے آگاہ ہے اور جو کچھ دلوں میں ہے وہ اُسے بھی جانتا ہے۔

تفسیر

ہمیں لوٹا دو تاکہ ہم اچھے عمل کریں

عام طور پر قرآن "وعدوں" کے ساتھ "وعید" اور بشارت کے ساتھ نذارت کا ذکر کرتا ہے تاکہ خوف و رجاء کے دونوں عوامل کو تقویت دے، کیونکہ یہ دونوں باہم انسان کے رشد و کمال کا سبب ہیں انسان حُبِ ذات کے تقاضے کے ماتحت فائدے کے حصول اور دفع ضرر کی خواہش رکھتا ہے، اس لیے گزشتہ آیات میں "خیرات میں سبقت کرنے والے مومنین" کی عظیم اور روح پرور جزاؤں کے بارے میں گفتگو کی تھی اور زیر بحث آیات میں کفار کی دردناک سزا کے بارے میں بات کی جارہی ہے۔

یہاں بھی مادی اور روحانی دونوں سزاؤں سے متعلق گفتگو ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "وہ لوگ کہ جنھوں نے راہ کفر اختیار کی ان کے لیے جہنم کی آگ ہے" (والذین کفروا لھم نار جھنم)۔

جس طرح اُن لوگوں کے لیے بہشت جاودانی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی جگہ اور ٹھہرنے کا گھر ہے اسی طرح دوزخ بھی اِس گروہ کے لیے ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا مقام ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "ان کے لیے ہرگز موت کا حکم صادر نہیں ہوگا کہ وہ مرجائیں اور اس رنج و الم سے رہائی پائیں" (لایقضٰی علیھم فیموتوا) [1]

اس کے باوجود کہ جلانے والی آگ اور وہ تمام دردناک عذاب ہر لحہ موت کے منہ میں لے جا سکتا ہے لیکن چونکہ موت و حیات سمیت ہر چیز اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے اس کی طرف سے موت کا حکم صادر نہیں ہوگا لہٰذا وہ نہیں مریں گے بلکہ انہیں زندہ رہنا پڑے گا تاکہ وہ عذابِ الٰہی کا مزہ چکھیں۔

موت تو اس قسم کے لوگوں کے لیے نجات کا ایک ذریعہ ہوگی لیکن اس جملے میں یہ دریچہ بند ہوگیا ہے

---

[1] "لایقضٰی علیھم" "لایحکم علیھم" کے معنی میں ہے۔

اب ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ زندہ رہیں اور ان کی سزا میں تدریجاً تخفیف ہو یا ان میں قوتِ برداشت کا اضافہ ہو تاکہ اس کے نتیجہ میں درد اور تکلیف میں تخفیف ہو۔ اس دریچے کو بھی ایک اور جملے کے ساتھ بند کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "دوزخ کے عذاب میں سے ان کے لیے کسی چیز کی تخفیف نہیں کی جائے گی" (ولا یخفف عنھم من عذابھا)۔

آیت کے آخر میں اس وعیدِ الٰہی کے قطعی ہونے کی تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: "ہر کفران کرنے والے کو ہم اسی طرح سے جزا دیں گے" (کذالك نجزی کل کفور)۔

جنہوں نے پہلے تو وجودِ انبیاء اور کتب آسمانی کی نعمت کا کفران کیا ہے، ان خداداد صلاحیتوں کو ضائع کر دیا ہے کہ جو راہِ سعادت میں ان کے لیے مددگار ہو سکتی تھیں۔ ہاں! کفران کرنے والوں کی جزا آگ کے دردناک عذاب میں جلنا ہی ہے۔ ایسی آگ کہ جس کو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے دنیا کی زندگی میں روشن کیا ہے۔ اس کا ایندھن ان کے انکار و اعمال اور ان کے وجود بنیں گے۔

"کفور" مبالغے کا صیغہ ہے اس لیے یہ کافر سے زیادہ عمیق اور گہرا معنیٰ رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں کافر مومن کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے لیکن "کفور" تمام نعمتوں کا کفران کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا مفہوم زیادہ وسیع ہے۔ اس طرح سے "کفور" ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہوں نے تمام خدائی نعمتوں کا کفران کیا ہے اور اس جہان میں اس کی رحمت کے تمام دروازوں کو اپنے اوپر بند کر لیا ہے۔ اس لیے آخرت میں خدا بھی نجات کے تمام دروازے ان پر بند کر دے گا۔

❁ ❁ ❁

بعد والی آیت ان کے دردناک عذاب کے ایک اور حصہ کو بیان کرتی ہے اور اس سلسلے میں بعض حساس نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: "وہ دوزخ میں فریاد کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس جگہ سے نکال، تاکہ ہم عملِ صالح بجا لائیں، اُن اعمال کے بجائے کہ جو ہم پہلے انجام دیتے تھے" (وھم یصطرخون فیھا ربنا اخرجنا نعمل صالحاً غیر الذی کنا نعمل)[1]

ہاں! وہ اپنے بُرے اعمال کو دیکھ کر گہری ندامت میں جا پڑیں گے اور دل سے فریاد کریں گے۔ وہ ایک محال چیز کا تقاضا کریں گے یعنی اعمالِ صالح بجا لانے کے لیے دنیا کی طرف بازگشت کرنے کا مطالبہ۔

"صالحاً" کی تعبیر (نکرہ کی شکل میں) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے کوئی معمولی سا عمل

---

[1] "یصطرخون" "صراخ" کے مادہ سے شدید فریاد اور چیخ و پکار کے معنی میں ہے کہ جو انسان استغاثہ کرنے اور درد و تکلیف دور کرنے کے لیے اور مددگار کو بلانے کے لیے دل سے نکالتا ہے۔

بھی انجام نہیں دیا اور لازمی طور پر یہ سب عذاب اور رنج و تکلیف ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے کہ جو زندگی میں خدا کے ساتھ کوئی ربط و تعلق اور واسطہ نہیں رکھتے تھے اور عصیان و گناہ میں غرق تھے اس بناء پر ممکن ہے کہ کچھ تھوڑے بہت اعمالِ صالح بھی نجات کا سبب بن جائیں ۔

"نعمل" کہ جو فعل مضارع اور استمرار کی دلیل ہے اسی معنی کی تاکید ہے کہ "ہم ہمیشہ غیر صالح اعمال میں مشغول رہے"۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "صالح" کی "کنا نعمل" کے جملہ کے ساتھ توصیف ایک لطیف نکتے کی حامل ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے بُرے اعمال کو ہوائے نفس اور شیطان کی طرف سے مزین کیے جانے کی وجہ سے اعمالِ صالح خیال کرتے تھے ۔ اب ہمارا مصمم ارادہ ہے کہ اگر ہم واپس چلے جائیں تو ان اعمال کے بجائے کہ جو ہم پہلے انجام دیتے تھے، واقعی اعمالِ صالح بجا لائیں گے ۔

ہاں! گنہگار شروع شروع میں اپنی پاکیزگی فطرت کے مطابق اپنے اعمال کی برائی کا ادراک کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کی برائی اس کی نظر میں کم ہوتی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ اس سے بھی اوپر چلا جاتا ہے اور اس کی نظر میں وہی برائی اچھائی دکھائی دینے لگتی ہے ۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے :

"زین لھم سوء اعمالھم"

"ان کے بُرے اعمال کو ان کی نظر میں اچھا بنا دیا جاتا ہے"۔ (توبہ - ۳۷)

قرآن کبھی یہ بھی کہتا ہے :

وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا ۔

"وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ نیک عمل انجام دے رہے ہیں"۔ (کہف - ۱۰۴)

بہرحال اس تقاضے کے مقابلے میں خدا کی طرف سے انہیں ایک قاطع اور دو ٹوک جواب دیا جائے گا: "کیا ہم نے تمہیں بیداری اور غور و فکر کے لیے کافی عمر نہیں دی تھی" (اولم نعمرکم ما یتذکر فیہ من تذکر) ۔

اور کیا خدا کی طرف سے ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں آیا تھا" (وجاءکم النذیر) ۔

اب جبکہ یہ بات ہے کہ نجات کے تمام وسائل تمہیں میسر تھے اور تم نے اُن سے فائدہ نہیں اٹھایا تو پھر اسی جگہ گرفتارِ بلا رہو ، "پس اب تم مزہ چکھو کیونکہ ستمگروں کے لیے کوئی یار و مددگار نہیں ہے" (فذوقوا فما للظالمین من نصیر) ۔

یہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی کیونکہ تمہارے پاس کافی مہلت تھی اور ضروری تعداد میں خدا کی طرف سے ڈرانے والے بھی تمہارے پاس آئے، بیداری و نجات کے یہ دونوں

ممکن تمہیں حاصل ہو گئے تھے۔ اس بناء پر تمہارے لیے کوئی عذر اور بہانہ نہیں رہا۔ اگر تمہارے پاس کافی مقدار میں مہلت نہ ہوتی تو عذر تھا اور اگر مہلت تو ہوتی لیکن معلم و مربی اور رہبر و ہادی تمہارے پاس نہ آتا تب بھی کوئی عذر تھا لیکن ان دونوں کے ہوتے ہوتے کونسا عذر و بہانہ باقی رہ جاتا ہے۔

لفظ "نذیر" (ڈرانے والا) آیات قرآن میں عام طور پر وجود انبیاء خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کی طرف اشارے کے طور پر آیا ہے لیکن بعض مفسرین نے اس کے لیے ایک وسیع تر معنی بیان کیا ہے کہ جس میں انبیاء، کتب آسمانی اور بیدار کن حوادث ۔ مثلاً دوستوں اور رشتہ داروں کی موت اور پیری و ناتوانی ۔ بھی شامل ہے۔ خصوصاً عربی اشعار میں لفظ "نذیر" بڑھاپے کے معنی میں بہت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر میں:

رأیت الشیب من نذر المنایا

لصاحبه وحسبك من نذیر

"میں نے بڑھاپے کے سفید بالوں کو موت سے ڈرانے والا دیکھا ہے اور تیرے لیے یہی "نذیر" کافی ہے"[1]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں عمر کی اس حد کے بارے میں کہ جو انسان کی بیداری اور توجہ کے لیے کافی ہے، مختلف تعبیرات بیان کی گئی ہیں۔ بعض میں ساٹھ سال بیان ہوئی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے:

من عمره الله ستین سنة فقد اعذر الیه۔

جسے خدا نے ساٹھ سال عمر دی ہے اس کے لیے عذر کی راہ بند کر دی ہے[2]

یہی معنی امیر المومنین علیؑ سے بھی نقل ہوا ہے[3]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ:

اذا کان یوم القیامة نودی (این) ابناء الستین؟ وهو العمر الذی قال الله فیه: اولم نعمرکم ما یتذکر فیه من تذکر۔

"جس وقت قیامت کا دن ہوگا تو منادی ندا کرے گا کہ ساٹھ سالہ لوگ کہاں ہیں؟ یہ وہی عمر ہے کہ جس کے بارے میں خدا فرماتا ہے: "کیا ہم نے تمہیں اتنی مقدار میں عمر نہیں دی تھی کہ جس میں لوگ اچھی طرح غور و فکر کرتے ہیں"[4]

---

[1] و [2] و [3] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[4] تفسیر قرطبی اور تفسیر در المنثور۔

لیکن ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے اس کی مقدار صرف اٹھارہ سال معین ہوئی ہے۔[1]
البتہ ممکن ہے کہ آخری روایت کم سے کم کی طرف اشارہ ہو اور گزشتہ روایات زیادہ سے زیادہ کی طرف۔
اس بنا پر ان روایات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔
یہاں تک کہ ــ افراد کے اختلاف کے ساتھ ــ دوسرے برسوں پر بھی قابل تطبیق ہے بہرحال آیت کے مفہوم کی وسعت پھر بھی باقی رہتی ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں کفار کے اس تقاضے کا جو وہ دوزخ میں دنیا کی طرف بازگشت کے لیے کریں گے، جواب دیا گیا ہے: "خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے، ایسا خدا یقیناً اس چیز سے بھی آگاہ ہے کہ جو دلوں کے اندر ہے" (ان اللہ عالم غیب السماوات والارض انہ علیم بذات الصدور)۔

درحقیقت پہلا جملہ دوسرے جملے کی ایک دلیل ہے یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا دلوں کے بھیدوں سے بے خبر ہو جبکہ زمین و آسمان کے تمام اسرار اور عالم ہستی کی تمام غیب چیزیں اس کے لیے آشکار ہیں۔

ہاں! وہ جانتا ہے کہ اگر دوزخیوں کے تقاضے کا مثبت جواب دیا جائے اور وہ دنیا کی طرف لوٹ آئیں تو وہی اعمال جاری رکھیں گے۔ جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۲۸ میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے:

ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ و انھم لکاذبون

اگر وہ پلٹ جائیں تو وہ پھر انہیں کاموں کو انجام دیں گے کہ جن سے انہیں منع کیا گیا ہے۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ آیت تمام مومنین کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ اپنی نیتوں میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کریں اور خدا کے علاوہ کسی پر نظر نہ رکھیں کیونکہ اگر ان کی نیت اور محرکاتِ عمل میں معمولی سی بھی ناخالصی ہوئی تو وہ جو تمام غیوب سے آگاہ ہے اُسے بھی جانتا ہے اور اسی کے مطابق جزا دے گا۔

چند اہم نکات

۱۔ "ذات الصدور" سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید کی دس سے زیادہ آیات میں بعینہ یہی جملہ آیا ہے یا تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ بات آئی ہے:

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ان اللہ علیم بذات الصدور۔

"ذات" کا لفظ کہ جس کا مذکر "ذو" ہے اصل میں "صاحب" کے معنی میں ہے۔ اگرچہ فلاسفہ کی تعبیرات میں، عین و حقیقت اور گوہر اشیاء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن مفردات میں راغب کے قول کے مطابق یہ ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جو کلام عرب میں موجود نہیں ہے۔ اس بنا پر "ان اللہ علیم بذات الصدور" کا مفہوم یہ ہوگا کہ "خدا دلوں کے صاحب و مالک سے باخبر ہے"۔ یہ جملہ انسانوں کے عقائد و نیات کے بارے میں ایک لطیف کنایہ ہے کیونکہ عقیدے اور نیتیں جس وقت دل میں گھر کرلیں تو گویا وہ قلبِ انسان کی مالک ہوجاتی ہیں اور اس پر حکومت کرتی ہیں اور اسی بنا پر یہ عقائد و نیات انسانی دل کے صاحب و مالک شمار ہوتے ہیں۔

یہ وہی بات ہے کہ جس سے بعض بزرگ علماء نے استفادہ کرتے ہوئے اُسے اس عبارت میں مجسم کیا ہے:

الانسان أرائه و افکاره، لاصورته و اعضائه۔

"انسان تو بس اس کے عقائد و افکار ہی ہوتے ہیں، نہ کہ اس کی شکل و صورت اور اعضاءِ بدن"[1]

۲۔ واپسی کی کوئی راہ نہیں: یقیناً قیامت اور موت کے بعد کی زندگی دنیا کی نسبت ایک مرحلۂ تکامل و ارتقاء ہے اور وہاں سے اس جہان کی طرف بازگشت کوئی معقول بات نہیں ہے۔ کیا ہم گزرے ہوئے کل کی طرف لوٹ سکتے ہیں؟ کیا نومولود بچہ جنینی دور کی طرف لوٹ سکتا ہے؟ کیا وہ پھل جو شاخ سے جدا ہوگیا ہے ممکن ہے کہ پھر شاخ کی طرف لوٹ جائے؟ اسی بناء پر آخرت والوں کے لیے دنیا کی طرف بازگشت ممکن نہیں ہے۔

اگر بالفرض ممکن بھی ہو تو بھی فراموش کار انسان اپنی اس گزشتہ روش کو برقرار رکھے گا۔

دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم نے بارہا خود اپنے آپ کو آزمایا ہے کہ خاص حالات میں جبکہ ہم کسی تنگی یا سختی میں گرفتار ہوتے ہیں، تو اس وقت اپنے خدا کے ساتھ مخلصانہ عہد و پیمان کرتے ہیں، لیکن جس وقت وہ حالات بدل جاتے ہیں تو ہم تمام قول و قرار بھول جاتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو سچ مچ اپنے اندر ایک گہری تبدیلی پیدا کرلیتے ہیں۔ ایسی تبدیلی نہیں کہ جو حالات کے ساتھ مشروط ہو۔

یہ حقیقت قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوئی ہے۔ سورۂ انعام کی آیہ ۲۸ میں قرآن صریحاً ایسے افراد کی تکذیب کرتے ہوئے کہتا ہے:

---

[1] عالم بزرگوار مرحوم کاشف الغطاء کی "اصل الشیعہ و اصولها"

"اگر یہ پلٹ بھی جائیں تو ان کا طرزِ عمل وہی پہلے والا ہو گا۔"

لیکن سورۂ اعراف کی آیہ ۵۳ میں صرف اسی بات پر قناعت کی گئی ہے کہ وہ زیاں کار لوگ ہیں لیکن ان کی بازگشت کی درخواست کا صراحت کے ساتھ جواب نہیں دیا گیا:

فهل لنا من شفعاء فيشفعوا لنا او نرد فنعمل غير الذی كنا نعمل قد خسروا انفسهم وضل عنهم ما كانوا يفترون۔

"کیا آج ہمیں کوئی شافعی مل جائیں گے کہ جو ہماری شفاعت کریں یا پھر ہمیں اجازت ملے کہ ہم واپس چلے جائیں اور جو عمل ہم پہلے کیا کرتے تھے اس کے بجائے نیک عمل انجام دیں؟ انہوں نے اپنے وجود کا سرمایہ گنوا دیا ہے اور اپنا ہی نقصان کیا ہے اور وہ سارے جھوٹے معبود جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو گئے اور ان کے بناوٹی معبودوں کا کوئی نام و نشان وہاں نہیں ملے گا۔"

یہی مطلب سورۂ مومنون کی آیہ ۱۰۷ و ۱۰۸ میں دوسری طرح بیان ہوا ہے:

ربنا اخرجنا منها فان عدنا فانا ظالمون قال اخسئوا فيها ولا تكلمون۔

"پروردگارا! ہمیں دوزخ سے نکال، اگر ہم پلٹ گئے (اور پھر انہیں اعمال کو دہرایا) تو پھر ہم ظالم ہیں، وہ ان کے جواب میں فرمائے گا: دور ہو جاؤ اور مجھ سے بات نہ کرو۔"

بہرحال یہ ایک بے بنیاد تقاضا ہے اور محال آرزو ہے شاید وہ بھی کم و بیش یہ جانتے ہیں لیکن شدتِ بیچارگی کی وجہ سے اس تقاضے کو دہرائیں گے لہٰذا آج ہی جبکہ ہمیں موقع میسر ہے ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ انجام دینا چاہیئے۔

(۳۹) هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ○

(۴۰) قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ○

(۴۱) اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ○

ترجمہ

(۳۹) وہ وہی ہے کہ جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا۔ اب جو شخص کافر ہوگا تو اس کا نقصان خود اُسی کو ہوگا اور کافروں کا کفر پروردگار کے ہاں ان کیلئے غضب کے سوا اور کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا اور ان کا کفر خسارے کے سوا اور کچھ نہیں بڑھاتا۔

(۴۰) کہو: کیا تم اپنے ان معبودوں کے بارے میں غور نہیں کرتے ہو جنہیں تم نے خدا کا شریک قرار دیا ہے۔ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین کی کس چیز کو پیدا کیا ہے یا یہ آسمانوں (کی خلقت اور مالکیت) میں کیا شرکت رکھتے ہیں؟ یا ہم نے

انہیں کوئی ایسی (آسمانی) کتاب دی ہے کہ جس میں سے اپنے (شرک کے) لیے کوئی دلیل رکھتے ہیں؟ نہیں ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے بلکہ ظالم لوگ صرف ایک دوسرے سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔

(۴۱) خدا ہی آسمان وزمین کو روکے ہوئے ہے تاکہ وہ اپنے نظام سے منحرف نہ ہو جائیں اور اگر وہ منحرف ہو جائیں تو اُس کے علاوہ کوئی اور انہیں روک نہیں سکتا۔ وہ حلیم وغفور ہے۔

تفسیر

آسمان وزمین اس کی قدرت سے قائم ہیں

ان مباحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں کفار ومشرکین کے انجام کے بارے میں تھیں زیر بحث آیات میں ایک اور طریقے سے ان سے باز پرس کی گئی ہے اور ان کے طرز عمل کے بطلان کو کچھ اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "وہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا" (هو الذی جعلکم خلائف فی الارض)۔

یہاں پر "خلائف" چاہے زمین میں خدا کے خلفاء اور خدائی نمائندوں کے معنی میں ہو اور خواہ گزشتہ اقوام کے جانشینوں کے معنی میں (اگرچہ یہاں پر دوسرا معنی ہی زیادہ صحیح نظر آتا ہے) انسانوں پر خدا کے انتہائی لطف وکرم کی دلیل ہے کہ اس نے زندگی کے تمام وسائل انہیں عطا فرمائے ہیں۔

اسی نے عقل وشعور اور فکر وہوش دیئے ہیں اور اسی نے مختلف جسمانی قویٰ انسان کو عطا کیے ہیں۔ اسی نے روئے زمین کو طرح طرح کی نعمتوں سے بھر دیا ہے۔ اسی نے ان وسائل سے استفادہ کرنے کا طریقہ بھی انسان کو سکھایا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے ولی نعمت کو بھلا کر بے حقیقت اور بناوٹی خداؤں کے دامن سے کیسے وابستہ ہو جاتا ہے؟

درحقیقت یہ جملہ توحید وربوبیت کا بیان ہے کہ جو توحید عبادت پر ایک دلیل ہے۔

ضمنی طور پر یہ جملہ تمام انسانوں کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ وہ جان لیں کہ ان کی یہ زندگی ابدیُ جاودانی نہیں ہے۔ جس طرح سے یہ دوسری اقوام کے جانشین بنے ہیں، کچھ دنوں کے بعد چلے جائیں گے

اور دوسری قومیں ان کی جانشین ہو جائیں گی ۔ لہٰذا ٹھیک طرح سے سوچ لیں کہ وہ اس چند روزہ زندگی میں کیا کر رہے ہیں اور اپنے مستقبل کو کس طرح لکھ رہے ہیں اور اُن سے متعلق دُنیا میں کس طرح کی تاریخ باقی رہ جائے گی ؟

اسی بنا پر ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے :"جو شخص کافر ہو جائے گا اس کا کفر خود اسی کے نقصان میں ہوگا" (فمن کفر فعلیہ کفرہ) ۔

"نیز کافروں کا کفر پروردگار کے نزدیک غضب کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا" (ولا یزید الکافرین کفرھم عند ربھم الا مقتاً) ۔

"اور ان کا کفر خسارے کے سوا ان کے لیے کچھ بھی زیادہ نہیں کرتا" (ولا یزید الکافرین کفرھم الا خسارًا) ۔

درحقیقت آخری دو جملے "من کفر فعلیہ کفرہ" کی تفسیر ہیں کیونکہ یہ جملہ کہتا ہے کہ انسان کا کفر صرف اس کے اپنے نقصان پر تمام ہوتا ہے اس کے بعد اس مسئلے کے لیے دو دلیلیں قائم کرتا ہے ،

پہلی دلیل یہ ہے کہ یہ کفران اور بے ایمانی ان کے پروردگار کے ہاں کہ جو تمام نعمتوں کا بخشنے والا ہے اس کے غضب کے سوا کوئی نتیجہ نہیں رکھتی ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ خشم الٰہی کے علاوہ یہ کفر گھاٹے کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا، وہ اپنی ہستی کا سرمایہ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں اور انحطاط اور ذلت کو اپنے لیے خرید لیتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا نقصان ہوگا ؟

ان دونوں میں سے ہر ایک دلیل اس غلط روش کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے ۔

"لا یزید" (زیادہ نہیں کرتا) کی تکرار وہ بھی فعل مضارع کی شکل میں کہ جو استمرار کی دلیل ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان طبعی طور پر افزائش کی جستجو میں ہوتا ہے ۔ اگر وہ توحید کا راستہ اختیار کرلے تو سعادت و کمال میں افزائش ہوگی اور اگر کفر کی راہ میں قدم رکھے گا تو اسے پروردگار کے غضب اور خسارے میں اضافہ نصیب ہوگا ۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ پروردگار کا غضب اور غصہ اس معنی میں نہیں ہے کہ جو انسانوں میں ہوتا ہے کیونکہ انسان میں تو غصہ ایک قسم کا ہیجان اور اندرونی برافروختگی ہے کہ جو تند و تیز اور شدید حرکات کا سرچشمہ ہوتی ہے اور انسانی قوتوں کو دفاع کے لیے یا انتقام لینے کے لیے مجتمع کرتی ہے ۔ لیکن پروردگار میں ان مفاہیم میں سے کوئی بھی بات نہیں ۔ اور یہ تو متغیر اور ممکن موجودات کے آثار ہیں بلکہ غضبِ الٰہی سے مراد ایسے لوگوں سے کہ جو بُرے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں رحمت کے دامن کو کھینچ لینا اور اپنے لطف کو روک لینا ہے ۔

بعد والی آیت ایک اور دو ٹوک جواب مشرکین کو دیتی ہے اور انہیں یہ بات سمجھاتی ہے کہ اگر انسان کسی کی پیروی کرتا ہے یا اس سے دل لگاتا ہے تو اسے چاہیئے کہ اس کے لیے کوئی عقلی دلیل رکھتا ہو یا منقولات میں سے کوئی قطعی دلیل اس کے پاس ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے پاس تو ان دونوں میں سے کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس صورت میں تو تم صرف دھوکے اور فریب میں مبتلا ہو۔

فرمایا گیا ہے: "ان سے کہہ دے، کیا تم ان جعلی معبودوں کے بارے میں غور نہیں کرتے کہ جنہیں تم نے خدا کا شریک سمجھ لیا ہے۔ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین میں سے کس چیز کو پیدا کیا ہے" (قل ارءیتم شرکائکم الذین تدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض)[1]

"یا کیا وہ آسمانوں کی خلقت میں شریک ہیں" (ام لهم شرك في السماوات)۔

اس حال میں ان کی پرستش کی کیا دلیل ہے؟ معبود ہونا خالق ہونے کی فرع ہے اور جبکہ تم جانتے ہو کہ آسمان و زمین کا خالق تو صرف خدا ہے تو اس کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں ہوگا کیونکہ ہمیشہ خالقیت میں توحید، عبودیت میں توحید کی دلیل ہے۔

اب جبکہ ثابت ہوگیا کہ کوئی عقلی دلیل تمہارے مُدعا کے لیے نہیں ہے تو کیا کوئی دلیلِ منقول تمہارے پاس موجود ہے؟ "کیا ہم نے کوئی (آسمانی) کتاب انہیں دی ہے اور اپنے اس کام کے لیے اس میں ان کے پاس کوئی واضح دلیل ہے"؟ (ام اٰتیناهم کتابا فهم علی بینة منه)۔

نہیں کتابِ الٰہی میں سے اُن کے پاس کوئی واضح دلیل اور برہان نہیں ہے۔

پس ان کا سرمایہ مکر و فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ "بلکہ یہ ستمگر ایک دوسرے سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں" (بل ان یعد الظالمون بعضهم بعضا الا غرورا)۔

دوسرے لفظوں میں اگر ہر گروہ کے بت پرست اور تمام مشرک یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ روئے زمین میں ان کے بُت ان کی مرادوں کو پورا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، تو انہیں چاہیئے کہ کوئی ایسی چیز نمونے کے طور پر پیش کریں کہ جو زمین میں اُن کے معبودوں نے خلق کی ہو۔

اگر اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ بت فرشتوں اور آسمان کی مقدس مخلوقات کے مظہر ہیں ــ جیسا کہ ان کی ایک جماعت کا عقیدہ تھا ــ تو انہیں چاہیئے کہ آسمانوں میں ان کی خلقت کی شرکت کی نشاندہی کریں۔

اور اگر ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلقت میں تو شریک نہیں ہیں البتہ انہیں صرف مقامِ شفاعت حاصل ہے ــ جیسا کہ بعض کا دعویٰ تھا ــ تو انہیں چاہیئے کہ وہ کتبِ آسمانی سے کوئی سند اس مدعا کو ثابت کرنے

---

[1] "ارایتم" کا جملہ، کیا تم دیکھتے نہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟ کے معنی میں ہے لیکن بعض مفسرین نے اسے "اخبرونی" (مجھے خبر دو) کے معنی میں لیا ہے۔ ہم نے جلد ۳ میں سورہ انعام کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔

کے لیے پیش کریں۔

اب جبکہ ان مدارک میں سے کوئی بھی مدرک ان کے پاس نہیں ہے تو یہ ستمگر ایسے فریب کار ہیں کہ جو جھوٹی باتیں ان سے کہتے رہتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "زمین و آسمان" سے مراد یہاں زمینی اور آسمانی مخلوق کا مجموعہ ہے اور زمین کے بارے میں خلقت اور آسمان کے بارے میں شرکت کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانوں میں شرکت بھی خلقت کے حوالے سے ہونا چاہیئے۔

اور "کتابًا" کی تعبیر "نکرہ" کی شکل میں اور وہ بھی پروردگار کی طرف استناد کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی بھی آسمانی کتاب میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی دلیل بھی ان کے دعویٰ پر نہیں ہے۔

"بینۃ" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ واضح و روشن دلیل آسمانی کتب سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

"ظالمون" کی تعبیر دوبارہ اس معنی پر ایک تاکید ہے کہ "شرک" واضح اور آشکار "ظلم" ہے۔

"غرور" کے وعدوں کی تعبیر اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ بت پرست یہ خرافات و اوہام کھوکھلے وعدوں کی شکل میں ایک دوسرے سے کرتے تھے اور مروج اور بے بنیاد تقلیدوں کی صورت میں ایک دوسرے کی طرف القا کرتے تھے۔

بعد والی آیت میں آسمانوں اور زمین پر خدا کی حاکمیت کے بارے میں گفتگو ہے۔ حقیقت میں بناوٹی معبودوں کی عالم ہستی میں دخالت کی نفی کے بعد خالقیت و ربوبیت میں توحید کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "خدا ہی آسمان اور زمین کو روکے ہوئے ہے تاکہ وہ اپنی راہ سے منحرف اور زائل نہ ہو جائیں" (ان اللہ یمسک السماوات والارض ان تزولا)[1]

نہ صرف ابتدائی خلقت ہی خدا کی طرف سے ہے بلکہ ان کی نگہداری، تدبیر اور حفاظت بھی اسی کے دستِ قدرت میں ہے بلکہ ان میں ہر لحظہ جدید تخلیقات ہوتی رہتی ہیں اور ہر زمانے میں ایک نئی خلقت ہوتی ہے اور اس مبداء فیاض سے لحہ بہ لحہ فیضِ ہستی انہیں پہنچتا رہتا ہے کیونکہ اگر ایک لمحے کے لیے بھی ان کا رابطہ اس عظیم مبداء سے منقطع ہو جائے تو وہ فنا کی راہ اختیار کر لیں۔

اگر نازی کند یکدم فرو ریزند قالبہا

"اگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی ناز کرے تو تمام سانچے گر پڑیں۔"

---

[1] "ان تزولا" کا جملہ تقدیر میں اس طرح تھا:
لئلا تزولا۔ یا۔ کراھۃ ان تزولا۔

یہ درست ہے کہ آیت عالمِ ہستی کے اعلیٰ نظام کی حفاظت کا ذکر کرتی ہے لیکن جیسا کہ فلسفیانہ مباحث میں ثابت ہو چکا ہے، ممکنات اپنی بقاء میں بھی اسی طرح سے مبداء کے محتاج ہیں جس طرح سے کہ اپنے حدوث میں؛ لہٰذا اس طرح نظام کی حفاظت نئی تخلیقات کو جاری رکھنے اور فیض خداوندی کو جاری رکھنے کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آسمانی کُرّے بغیر اس کے کہ کسی جگہ بندھے ہوتے ہوں، ہزاروں لاکھوں سال سے اپنے معین مدار پر حرکت کر رہے ہیں۔ بغیر اس کے کہ ذرہ برابر بھی انحراف کریں۔ اس کا نمونہ نظامِ شمسی میں دیکھتے ہیں۔ ہماری زمین کئی ملین بلکہ کئی ارب سال سے سورج کے گرد اپنے راستے پر دقیق نظم کے تحت چکر لگا رہی ہے کہ جس کا سرچشمہ قوتِ جاذبہ اور قوتِ دافعہ کا اعتدال ہے اور فرمانِ پروردگار پر سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔

پھر تاکید کے طور پر مزید فرمایا گیا ہے: "اگر وہ یہ چاہیں کہ اپنے مدار سے باہر نکل جائیں تو کوئی بھی خدا کے سوا انہیں روک نہیں سکتا" (ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ)۔

نہ تمہارے گھڑے ہوئے بُت، نہ فرشتے اور نہ ہی ان کے علاوہ کوئی اور، کوئی بھی شخص اس کام پر قادر نہیں۔

آیت کے آخر میں اس بناء پر کہ گمراہ مشرکین کے سامنے توبہ کا دروازہ بند نہ کیا جائے اور ہر مرحلے میں انہیں بازگشت کا موقع میسر رہے، فرمایا گیا ہے: "خدا ہمیشہ حلیم و غفور ہے" (انہ کان حلیماً غفوراً)۔

اپنے حلم کی وجہ سے ان کی سزا میں جلدی نہیں کرتا اور اپنی غفوریت کی وجہ سے ان کی توبہ اس کی شرائط کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ اس بناء پر آیت میں مشرکین کی کیفیت اور توبہ و بازگشت کے وقت خدا کی رحمت ان کے شاملِ حال ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے ان دو اوصاف کو آسمان و زمین کی حفاظت کے ساتھ مربوط سمجھا ہے کیونکہ ان کا زوال عذاب و مصیبت ہے اور خدا اپنے حلم و غفران کی وجہ سے اس عذاب و مصیبت کو لوگوں کے دامن گیر نہیں ہونے دیتا اگرچہ اُن میں سے بہت سوں کے گفتار و اعمال کا تقاضا یہی ہے کہ یہ عذاب نازل ہو۔ جیسا کہ سورۂ مریم کی آیات ۸۸ تا ۹۰ میں بیان ہوا ہے:

وقالوا اتخذ الرحمٰن ولداً لقد جئتم شیئاً ادًّا تکاد السمٰوات یتفطرن منہ وتنشق الارض وتخر الجبال ھدًّا۔

"انہوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن نے اپنے لیے بیٹا انتخاب کیا ہے۔ تم نے یہ کیسی بُری اور تکلیف دہ بات کہی ہے؟ قریب ہے کہ آسمان اس بات کو سُن کر منتشر ہو جائے اور زمین پھٹ پڑے اور پہاڑ شدت سے نیچے گر پڑیں۔"

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ " ولئن زالتا ... " کا جملہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اگر وہ زائل ہو جائیں تو خدا کے سوا کوئی بھی انہیں نہیں روکے گا بلکہ اس معنی میں ہے کہ اگر وہ مائل بہ زوال ہوں تو خدا ہی ان کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ورنہ زوال کے بعد محفوظ رکھنے کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

پوری انسانی تاریخ میں بارہا یہ امر پیش آیا ہے کہ بعض ستارہ شناسوں نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ ممکن ہے کہ فلاں دُمدار ستارہ یا اس کے علاوہ کوئی ستارہ اپنے راستے اس کرۂ زمین کے قریب سے گزرے تو اس کے ٹکرا جانے کا احتمال ہے۔ ایسی پیش گوئیوں نے کئی دفعہ تمام دنیا والوں کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ ان حالات میں سب کو یہ احساس ہوتا تھا کہ ایسے میں کسی شخص سے کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر فلاں کرۂ آسمانی زمین کی طرف آجائے اور قوتِ جاذبہ کے زیرِ اثر دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں تو نوعِ بشر کے کئی ہزار سالہ تمدن کا نام و نشان مٹ جائے یہاں تک کہ دوسرے زندہ موجودات بھی صفحۂ زمین پر باقی نہ رہیں پروردگار کی قدرت کے سوا کوئی اس حادثے کو روکنے پر قادر نہیں۔

اس قسم کے حالات میں سب کے سب نیازِ مطلق کا احساس بے نیازِ مطلق خدا کی طرف ہی کریں گے لیکن جب احتمالی خطرات برطرف ہو جائیں گے تو بھول اور نسیان انسانوں پر سایہ فگن ہو جائے گا۔

نہ صرف آسمانی کُروں اور سیاروں کا ٹکرانا ہولناک ہے بلکہ کسی ایک سیارے کا مختصر سا انحراف مثلاً زمین کا اپنے مدار سے ہٹ جانا کئی ہولناک حادثوں کا سبب ہو سکتا ہے۔

اس کی قدرت کے سامنے چھوٹا بڑا سب برابر ہے

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں آسمانوں کے اپنی جگہ پر قائم رہنے کو خدا کی قدرت کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ قرآن کی دوسری آیات میں یہی تعبیر امواجِ ہوا کے اوپر پرندوں کی موجودگی کے بارے میں آئی ہے:

الم یروا الی الطیر مسخرات فی جوّ السماء ما یمسکھن الّا اللہ ان فی ذالک لاٰیات لقوم یؤمنون۔

"کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ جو آسمان کی بلندیوں میں مسخر ہیں۔ خدا کے سوا کوئی بھی انہیں نہیں روکتا۔ اس چیز میں ایمان لانے والوں کے لیے خدا کی عظمت و قدرت کی نشانیاں ہیں"۔ (النحل - ۷۹)

تعبیرات کی یہ ہم آہنگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پروردگار کی بے انتہا قدرت کے لیے تمام آسمانوں کے کُروں اور زمین کی نگہداری امواجِ ہوا کے اوپر ایک پرندہ کی نگہداری کے مانند ہے۔

ایک مقام پر تو وہ وسیع آسمان کی خلقت کو اپنے وجود کی نشانی بتاتا ہے اور دوسری جگہ مچھر جیسے چھوٹے

سے حشرہ کی خلقت کو اپنی قدرت کی نشانی قرار دیتا ہے۔

کبھی "سورج" کی قسم کھاتا ہے کہ جو عالم ہستی میں قوت وطاقت کا عظیم منبع ہے اور کبھی بہت ہی عام "انجیر" جیسے پھل کی قسم کھاتا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی قدرت کے سامنے چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وما الجليل واللطيف والثقيل والخفيف، والقوى والضعيف فى خلقه الّا سواء۔

چھوٹا اور بڑا، بھاری اور ہلکا، قوی اور ضعیف سب اس کی توانائی کے سامنے یکساں ہیں[1]

ان تمام مسائل کی دلیل ایک ہی چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کا وجود ایک ایسا وجود ہے کہ جو ہر جہت سے لامتناہی ہے اور "لامتناہی" کے مفہوم پر غور وخوض اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کر دیتا ہے کہ "سخت" اور "آسان"، "چھوٹا" اور "بڑا"، "پیچیدہ" اور "سادہ" جیسے مفاہیم صرف محدود موجودات کو پیش آتے ہیں جس وقت لامحدود قدرت کے بارے میں بات ہوتی ہے تو پھر یہ مفاہیم بالکل بدل جاتے ہیں اور سب کے سب بلاتفریق ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۵۔

(۴۲) وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَهُمۡ نَذِيۡرٌ لَّيَكُوۡنُنَّ اَهۡدٰى مِنۡ اِحۡدَى الۡاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ نَذِيۡرٌ مَّا زَادَهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرَا ۙ ○

(۴۳) اۨسۡتِكۡبَارًا فِى الۡاَرۡضِ وَمَكۡرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيۡقُ الۡمَكۡرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهۡلِهٖ ؕ فَهَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِيۡنَ ۚ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا ○

(۴۴) اَوَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ وَكَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعۡجِزَهٗ مِنۡ شَىۡءٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيۡمًا قَدِيۡرًا ○

ترجمہ

(۴۲) انہوں نے انتہائی تاکید کے ساتھ قسم کھائی کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا پیغمبر ان کے پاس آئے تو وہ سب سے زیادہ ہدایت یافتہ امت ہوں لیکن جب ان کے پاس پیغمبر آیا تو سوائے فرار اور (حق سے) دوری کے ان میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا۔

(۴۳) یہ سب کچھ اس بناء پر تھا کہ انہوں نے زمین میں استکبار کیا اور بُری سے بُری

چالیں چلیں لیکن بُری چالبازیاں صرف اپنے چلانے والوں کا دامن ہی پکڑتی ہیں۔ کیا انہیں اپنے سے پہلے لوگوں کے ساتھ برتے جانے والے طرزِ عمل (اور اُن پر ہونے والے سخت عذاب) سے مختلف کی توقع ہے۔ تم ہرگز خدا کے طریقے میں کوئی تبدیلی نہ دیکھو گے۔ اور ہرگز خدا کی سنت میں کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔

(۴۴) کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو اُن سے پہلے تھے اُن کے ساتھ کیا ہوا؟ (جبکہ وہ لوگ ان سے زیادہ قوی (اور زیادہ طاقتور تھے) آسمان اور زمین میں سے کوئی چیز اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں جائے گی۔ وہ دانا اور توانا ہے۔

شانِ نزول

تفسیر درالمنثور، روح المعانی، مفاتیح الغیب اور دوسری تفسیروں میں ہے کہ مشرکین عرب جس وقت یہ سنتے تھے کہ بعض گزشتہ امتوں مثلاً یہودیوں نے خدائی پیغمبروں کی تکذیب کی تھی اور انہیں شہید کر دیا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ایسے نہیں ہیں، اگر خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہمارے پاس آئے تو ہم تمام امتوں کی نسبت زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے، لیکن وہی لوگ تھے کہ جب اسلام کا آفتاب عالم تاب ان کی سرزمین سے طلوع ہوا اور پیغمبرِ اسلامؐ سب سے عظیم کتاب لے کر اُن کے پاس آئے تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی بلکہ جھٹلایا، طرح طرح کے مکر و فریب بھی کیے اور آپؐ کے خلاف لڑے بھی۔

زیر نظر آیات اسی ضمن میں نازل ہوئیں اور انہیں ان کھوکھلے اور بے بنیاد دعووں پر ملامت و سرزنش کی [1]

تفسیر

استکبار اور سازشیں - ان کی بد بختی کا سبب

گزشتہ آیات میں مشرکین اور دنیا و آخرت میں ان کے انجام کے بارے میں گفتگو تھی، زیرِ بحث

---

[1] اکثر تفاسیر، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

آیات میں بھی وہی بحث جاری ہے ۔

پہلی آیت کہتی ہے کہ :"انہوں نے انتہائی تاکید کے ساتھ قسم کھائی کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے پاس آئے تو یقیناً وہ تمام امتوں کی نسبت زیادہ ہدایت یافتہ ہوں" (و اقسموا باللّٰہ جهد ایمانهم لئن جاءهم نذیر لیکونن اهدٰی من احدی الامم)[1]

"ایمان" ، "یمین" کی جمع ہے اور قسم کے معنی میں ہے ۔ یمین اصل میں دائیں ہاتھ کے معنی میں ہے اور چونکہ قسم کھاتے اور عہد باندھتے وقت دایاں ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس بناء پر یہ لفظ آہستہ آہستہ قسم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ۔

"جهد" "جهاد" کے مادہ سے سعی و کوشش کے معنی میں ہے ۔ اس بناء پر "جهد ایمانهم" کی تعبیر تاکیدی قسم کی طرف اشارہ ہے ۔

جی ہاں ! وہ جس وقت تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کرتے تھے کہ جو گزشتہ امتوں ۔ خصوصاً یہودیوں ۔ کی اپنے پیغمبروں سے بے وفائیوں ، ناشکریوں ، وعدہ شکنیوں اور جرائم کی داستان بیان کرتی تھی تو بہت تعجب کرتے تھے اور اپنے بارے میں دعوے اور لاف زنی کیا کرتے تھے ۔

لیکن جب تجربے کی کسوٹی اور امتحان کی گرم بھٹی سے گزرے ، ان کی خواہش کے مطابق اللہ کی طرف سے رسول آگیا تو انہوں نے ثابت کیا کہ وہ بھی اُسی قماش کے ہیں ۔ جیسا کہ قرآن اسی آیت کے آخر میں کہتا ہے :"جس وقت خدا کی طرف سے خبردار کرنے والا اور ڈرانے والا ان کے پاس آیا تو فرار کرنے اور حق سے دور ہونے کے سوا ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا" (فلما جاءهم نذیر ما زادهم الا نفورًا) ۔

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ پہلے بھی اپنے دعویٰ کے برخلاف حق کے طرفدار نہیں تھے ۔ دینِ ابراہیمی کا جو حصہ ان کے پاس تھا وہ اُسے محترم نہیں سمجھتے تھے ۔ ہر روز کسی بہانے سے اسے پاؤں کے نیچے روندتے تھے ۔ "مستقلاتِ عقلیہ" اور حکمِ عقل کی قدر و قیمت کے بھی قائل نہیں تھے ۔ جب پیغمبرِ اسلامؐ نے قیام کیا اور ان کے جاہلانہ تعصب اور ناجائز مفادات پر زد پڑی تو وہ حق سے اور زیادہ

---

[1] چونکہ احدی مفرد ہے لہٰذا آیت کا مفہوم پہلی نظر میں یہ ہوگا کہ وہ امتوں میں سے ایک امت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے کہ جو احتمالاً قوم یہود کی طرف اشارہ ہے (کیونکہ اثباتیہ جملہ میں مفرد عموم کا معنی نہیں رکھتا) لیکن جیسا کہ بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے کہ قرائن حال اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کی مراد اس مفرد سے عموم تھا ۔ کیونکہ وہ مبالغہ اور تاکید کے مقام پر تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دعویٰ کریں کہ ان کے درمیان پیغمبر کے مبعوث ہونے کی صورت میں وہ سب امتوں سے آگے نکل جائیں گے ۔

دُور ہو گئے۔ ہاں! وہ ہمیشہ سے حق سے دُور ہی تھے اور اب یہ دُوری ہر زمانے کی نسبت زیادہ ہو گئی تھی۔

بعد والی آیت اسی بات کی تشریح ہے کہ جو گزشتہ آیت میں گزر چکی ہے، یہ آیت کہتی ہے "حق سے ان کی دُوری اس بنا پر تھی کہ انہوں نے زمین میں تکبّر کی راہ اختیار کر رکھی تھی اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے تھے" (استکبارًا فی الارض)[1]

"اور اس بنا پر بھی تھا کہ انہوں نے قبیح اور بُری چالوں کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا" (ومکر السیئ)[2]

"لیکن یہ بُری چالیں صرف چالبازوں کے ہی دامن گیر ہوتی ہیں" (ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ)۔

"لا یحیق" "حاق" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے "نازل نہیں ہوتا، درستی کو نہیں پہنچتا، اور احاطہ نہیں کرتا" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہو سکتا ہے وقتی طور پر دوسرے لوگ ان کی چالوں کا شکار ہو جائیں لیکن آخرکار وہ حیلہ سازی خود حیلہ ساز کی طرف لوٹتی ہے۔ اُسے مخلوقِ خدا کے سامنے رسوا اور بدنام کرتی ہے اور بارگاہِ خدا میں شرمسار کرتی ہے۔ اور یہی رسوائی مشرکینِ مکہ نے حاصل کی۔

درحقیقت یہ آیت کہتی ہے کہ انہوں نے صرف خدا کے عظیم پیغمبر سے دُوری اختیار کرنے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ آپ پر ضرب لگانے کے لیے اپنی پوری طاقت سے مدد لی اور اس کا اصل سبب اور محرک کبر و غرور اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنا تھا۔

اس آیت کے آخر میں اس متکبر، مکار اور خیانت کار گروہ کو ایک پُرمعنی اور ہلا دینے والے جملے کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "کیا انہیں گزشتہ لوگوں کے سے انجام کے علاوہ کسی اور کی توقع ہے" (فھل ینظرون الا سنت الاولین)[3]

یہ مختصر سا جملہ تمام سرکش اقوام مثلاً قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم فرعون کے بُرے اور منحوس انجام

---

[1] بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ "استکبارًا" ترکیب نحوی کے لحاظ سے "مفعول لہٗ" ہے اور "نفورًا" اور حق سے دور ہونے کی علت کا بیان ہے اور "مکر السیئ" کو اس پر عطف سمجھتے ہیں اور بعض نے اسے "نفورًا" پر عطف سمجھا ہے۔

[2] "مکر السیئ" جنس کی نوع کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے جیسے علم الفقہ کیونکہ مکر ہر قسم کی چارہ جوئی اور تدبیر کے معنی میں ہے وہ چاہے بُری ہو یا اچھی، اسی لیے کبھی اس کی خدا کی طرف بھی نسبت دی گئی ہے مثلاً "ومکروا ومکر اللّٰہ" (آل عمران ۵۴) لیکن "سیئ" مکر کی ایک خاص نوع ہے کہ جو حیلہ سازی اور چالبازی ہے۔

[3] "نظر" اور "انتظار" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے کبھی ایک ہی معنی میں آتے ہیں۔

کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں سے ہر قوم بلائے عظیم میں گرفتار ہوئی۔ قرآن نے بارہا ان کی دردناک سرنوشت کے بعض گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں اسی ایک مختصر سے جملے کے ساتھ ان سب کو اس گروہ کی آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیا ہے۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: "تو سنّتِ الٰہی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائے گا اور سنتِ الٰہی میں تجھے ہرگز کوئی تغیّر نہ ملے گا" (فلن تجد لسنت اللہ تبدیلاً ولن تجد لسنت اللہ تحویلاً)۔

کیسے ممکن ہے کہ خدا ایک قوم کو تو کچھ اعمال کی بناء پر سزا دے لیکن کسی دوسرے گروہ کو کہ جس کا وہی طرزِ عمل ہو اسے معاف کر دے؟ کیا وہ حکیم و عادل نہیں ہے اور کیا وہ ہر کام حکمت اور عدل کی بناء پر انجام نہیں دیتا؟ سنتوں کی تبدیلی اُس کے بارے میں متصور ہوتی ہے کہ جو محدود آگاہی رکھتا ہے اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ایسے مسائل سے واقف ہوتا ہے کہ جو اُسے گزشتہ طریقے سے باز رکھتے ہیں یا وہ کہ جو آگاہ تو ہے لیکن حکمت و عدالت کی میزان کے مطابق عمل نہیں کرتا اور مخصوص میلانات اس کی فکر پر حاوی ہوں لیکن وہ پروردگار کہ جو ان تمام امور سے منزہ اور پاک ہے، اس کی سنت آئندہ کے لوگوں کے بارے میں بھی وہی ہے کہ جو گزشتہ لوگوں کے بارے میں تھی، اس کی سنتیں ثابت اور تغیر ناپذیر ہیں۔

قرآن نے متعدد آیات میں خدائی سنتوں کے تغیر ناپذیر ہونے کا ذکر کیا ہے اس کے بارے میں ہم نے جلد ۹ میں سورہ احزاب کی آیہ ۶۲ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

اجمالی طور پر یہ ہے کہ اس جہان کے عالم تکوین و تشریع میں ثابت اور غیر متغیر قوانین ہیں کہ جنہیں قرآن نے خدائی سنتوں کے ساتھ تعبیر کیا ہے جن میں ہرگز تبدیلی اور تغیر کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ قوانین جس طرح سے گزشتہ ایام پر نافذ تھے اسی طرح آج بھی اور آئندہ کل پر بھی نافذ ہیں۔ بے ایمان متکبرین کی سزا جبکہ خدا کی طرف سے پند و نصیحت سود مند نہ ہو، اسی طرح راہروانِ راہِ حق کی مدد جبکہ وہ مخلصانہ کوشش سے دستبردار نہ ہوں۔ انہیں سنتوں میں سے ہے۔ اور یہ دونوں سنتیں گزشتہ زمانے میں بھی تغیر ناپذیر تھیں اور آج بھی تغیر ناپذیر ہیں۔[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات میں صرف خدائی سنتوں کے تبدیل نہ ہونے کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے (احزاب - ۶۲) اور بعض دوسری آیات میں ان کے عدم تحویل کی بات ہوئی ہے۔ (بنی اسرائیل ۷۷)

لیکن زیرِ بحث آیت میں دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تاکید کی صورت میں لایا گیا ہے اور

---

[1] اس سلسلے میں جلد ۹ میں سورہ احزاب کی آیہ ۶۲ کے ذیل میں بحث کے علاوہ ہم نے جلد ۶ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۷۷ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ "سنتِ الٰہی کے لیے تجھے نہ تبدیلی ملے گی اور نہ تحویل"۔
کیا ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور تاکید کے لیے دونوں الفاظ اکٹھے بیان ہوئے ہیں یا ان میں سے ہر ایک کسی مستقل معنی کی طرف اشارہ ہے؟

ان دونوں الفاظ کے بنیادی مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں دو مختلف معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں "تبدیل" یہ ہے کہ کسی چیز کو بالکل بدل دیا جائے یعنی اسے لے جا کر کوئی دوسری چیز اس کی جگہ پر رکھ دی جائے لیکن "تحویل" یہ ہے کہ اُسی موجود کو "کیفیت" یا "کمیت" کے لحاظ سے تبدیل کر دیا جائے۔

اسی طرح سے خدائی سُنتیں نہ تو بالکل بدلتی ہیں اور نہ ہی کم و بیش اور ضعیف و شدید ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا مشابہ گناہوں اور جرائم کے بارے میں ہر جہت سے مشابہ سزا دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک گروہ کے لیے تو سزا ہو اور دوسرے گروہ کو معاف کر دے یا کسی گروہ کی سزا کو کم یا ہلکا کر دے۔ وہ قانون کہ جو ایک ثابت بنیاد پر استوار ہے اس میں نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی تغیر و تبدل[1]

آخری نکتہ جو اس آیہ کے بارے میں نظر آتا ہے یہ ہے کہ ایک جگہ "سنت" کی اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے اور اسی آیت میں دوسری جگہ "سنت" کی گزرے ہوئے لوگوں کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلی نظر میں ان دونوں کے درمیان اختلاف کا خیال پیدا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ پہلے موقع پر فاعل کی طرف اضافت ہے جبکہ دوسرے موقع پر مفعول کی طرف۔ پہلے موقع پر سنت گزار کے بارے میں گفتگو ہے، اور دوسرے موقع پر اس شخص کے بارے میں گفتگو ہے کہ جس کے بارے میں یہ سنتِ الٰہی جاری ہوگی۔

⁂

بعد والی آیت، اس مشرک اور مجرم گروہ کو گزرے ہوئے لوگوں کے آثار اور ان کا انجام مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ انہوں نے جو کچھ تاریخ میں ان کے بارے میں سنا ہے، ان کے علاقوں میں جا کر

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں "تحویل" کو "عذاب کے نقل مکانی" کے معنی میں تفسیر کیا ہے، اس معنی میں کہ خدا اپنی سزا ایک شخص سے اٹھا کر دوسرے کو دے دے ۔ یہ تفسیر زیرِ بحث آیت سے ہم آہنگ نظر نہیں آتی۔ گفتگو یہ نہیں ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کی جگہ سزا نہ دے بلکہ گفتگو یہ ہے کہ سزا کی و زیادتی اور تغیر و تبدل پیدا نہیں کر سکتی۔ گویا ان مفسرین نے "تحوّل" کے مادہ کا "تحویل" کے ساتھ اشتباہ کیا ہے۔ بعض متون لغت مثلاً "مجمع البحرین" میں اس طرح آیا ہے:

التحویل: تغییر الشیئ علی خلاف ما کان، والتحول: التنقل من موضع الی موضع۔

"کسی چیز کا اس حالت کے برخلاف ہو جانا کہ جس پر پہلے تھی تحویل ہے۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا تحوّل ہے"۔

اور ان کے آثار کے اندر پہنچ کر خود اپنی آنکھ سے دیکھیں تاکہ بات عین الیقین میں بدل جائے۔

فرمایا گیا ہے: "کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا کہ جو ان سے پہلے تھے" (اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلھم)۔

اگر یہ لوگ تصور کرتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ طاقتور ہیں تو انتہائی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ "وہ ان سے زیادہ قوی اور طاقتور تھے" (وکانوا اشد منھم قوة)۔

وہ فرعونی کہ جنہوں نے سرزمین مصر کو اپنے اقتدار کی جولان گاہ بنایا ہوا تھا اور وہ نمرودی کہ جنہوں نے اپنی پوری طاقت و قوت کے ساتھ بابل کی وسیع سرزمین اور دوسرے ملکوں پر حکومت کی تھی اتنے قوی تھے کہ مکہ کے بت پرست تو ان کے مقابلے میں کسی شمار و قطار میں بھی نہیں۔

علاوہ ازیں انسان خواہ جتنے بھی طاقتور اور قوی ہوں، ان کی طاقت خدا کی قدرت کے مقابلے میں صفر ہے کیونکہ "کوئی چیز آسمان میں سے اور نہ ہی زمین میں سے، اس کی قدرت کے احاطے سے نہیں نکل سکتی اور نہ ہی اسے عاجز و ناتواں کر سکتی ہے" (وما کان اللّٰہ لیعجزہ من شیء فی السّمٰوٰت ولا فی الارض)[1]

وہ دانا بھی ہے اور توانا بھی۔ نہ کوئی چیز اس کی نگاہ سے مخفی رہ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی کام اس کی قدرت کے سامنے مشکل ہے اور نہ ہی کوئی شخص اس پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ دل کے اندھے متکبر اور مکار حیلہ گر اگر یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اس کی قدرت کے چنگل سے بھاگ کر نکل سکتے ہیں تو یہ ان کی کورچشمی ہے اور اگر وہ اپنے قبیح اور شرمناک اعمال سے دستبردار نہ ہوں گے تو وہ بھی آخر کار گزرے ہوئے سرکشوں کے سے ہولناک انجام میں گرفتار ہوں گے۔

قرآن مجید میں بارہا یہ مطلب ہمارے سامنے آیا ہے کہ خدا بے ایمان اور سرکش افراد کو، "زمین میں سیر کرنے" اور ان اقوام کے آثار کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتا ہے جو عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔

سورہ روم کی آیہ ۹ میں ہے:

اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلھم
کانوا اشد منھم قوة و اثاروا الارض وعمروھا اکثر مما عمروھا وجآءتھم
رسلھم بالبیّنٰت فما کان اللّٰہ لیظلمھم ولٰکن کانوا انفسھم یظلمون۔

"کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی تاکہ وہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا کہ جو

---

[1] "لیعجزہ" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اعجاز سے ہے اور عاجز کرنے کے معنی میں ہے اسی بنا پر بہت سے مواقع پر قلمرو قدرت سے فرار نہ کر سکنے یا کسی پر قابو نہ پانے کے معنی میں آیا ہے۔

ان سے پہلے تھے ـــ وہی کہ جو ان سے زیادہ قوت رکھتے تھے اور انہوں نے زمین کو دگرگوں کیا اور زمین پر اُن کی آبادی ان سے زیادہ تھی اور ان کے پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ان کے پاس آئے تھے مگر وہ اپنی خود سری پر قائم رہے اور خدا کے دردناک عذاب میں گرفتار ہوئے، خدا نے ہرگز ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔

یہی مطلب سورۂ یوسف کی آیہ ۱۰۹ میں،

سورۂ حج کی آیہ ۴۶ میں،

سورۂ مؤمن کی آیہ ۲۱ اور ۸۲ میں

اور سورۂ انعام کی آیہ ۱۱ میں اور قرآن کی بعض دوسری سورتوں میں بھی بیان ہوا ہے۔

یہ مکرر تاکیدیں انسانوں کے نفوس میں ان مشاہدات کے بہت اثر انداز ہونے کی دلیل ہیں۔ انہیں ان مقامات پر جانا چاہیئے اور جو کچھ انہوں نے تاریخ میں پڑھا ہے یا لوگوں سے سنا ہے اسے آنکھ سے دیکھنا چاہیئے۔

وہ جائیں اور فرعونوں کے الٹے ہوئے تخت، بادشاہانِ کسریٰ کے ویران محلات، قیصروں کی اکھڑی ہوئی قبروں اور نمرودوں کی بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیوں اور قوم لوط و ثمود کی تباہ شدہ سرزمینوں کو قریب سے دیکھیں، خاموش آثار کے پند و نصائح سنیں، مٹی کے اندر سونے والوں کی فریادوں پر کان دھریں اور جو کچھ انجام کار ان کے اوپر آنے والا ہے اسے اپنی آنکھ سے دیکھیں [1]

---

[1] ایک معاصر شاعر نے اس سلسلے میں بہت عمدہ اشعار کہے ہیں اور اس قرآنی حقیقت کو مصر کے سفر اور فراعنہ کے آثار دیکھنے کے بعد بہت ہی لطیف، پُرکشش اور ہلا دینے والے اشعار میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

بہ مصر رفتم و آثار باستان دیدم	بہ مصر آنچہ شنیدم ز داستان دیدم
بسی چنین و چناں خواندہ بودم از تاریخ	بہ مصر از تو چہ پنہاں کہ بر عیاں دیدم
تو کاخ دیدی و من خفتگاں در دل خاک	ہنوز در طلب ملک جاوداں دیدم
تو تاج دیدی و من ملک رفتہ بر تاراج	تو عاج دیدی و من مشت استخواں دیدم
تو تخت دیدی و من بخت واژگوں از تخت	تو صخرہ دیدی و من سخرہ زماں دیدم
گزشتہ در دل آیندہ آنچہ پنہاں داشت	بہ مصر از تو چہ پنہاں کہ بر عیاں دیدم

ترجمہ: میں مصر گیا اور آثارِ قدیمہ دیکھے، مصر کی جو داستان سنی تھی اُسے خود دیکھا۔
بہت سی ایسی ویسی باتیں تاریخ میں پڑھی تھیں اور مصر میں بہت سی چیزیں جو تجھ سے پنہاں ہیں انہیں عیاں دیکھا۔
تُو نے محل دیکھا اور میں نے مٹی میں سونے والے دیکھے، جو ابھی تک ملک جاوداں کے طالب ہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۴۵) وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝

ترجمہ

(۴۵) اور اگر خدا لوگوں کو اُن کاموں کی وجہ سے کہ جو انہوں نے انجام دیئے ہیں سزا دے تو زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا جاندار باقی نہ چھوڑے، لیکن (وہ اپنے لطف سے) انہیں ایک معین مدت تک تاخیر میں ڈالے گا (اور انہیں مہلت دے گا تاکہ وہ اپنی اصلاح کرلیں) لیکن جب اُن کی اجل آجائے گی (تو پھر خدا ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا) کیونکہ وہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے (اور سب کے اعمال و نیات سے آگاہ ہے)۔

تفسیر

اس کا لطف نہ ہوتا تو کوئی جاندار زمین پر باقی نہ رہتا

زیرِ نظر آیت سورۂ فاطر کی آخری آیت ہے۔ اس سورہ کی گزشتہ آیات میں تند و تیز بحثیں اور شدید تہدیدیں تھیں اور آخری آیت میں پروردگار کے لطف و رحمت کا بیان ہے۔ جیسے اس سورہ کا آغاز لوگوں پر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ): تُونے تاج دیکھا اور مَیں نے تاراج شدہ ملک دیکھا، تُونے ہاتھی دانت دیکھے اور مَیں نے مُٹھی بھر ہڈیاں دیکھیں۔
تُونے تخت دیکھا اور مَیں نے سرنگوں شدہ تخت دیکھا، تُونے پتھر دیکھے اور مَیں نے زمانے کو ان کا مذاق اڑاتے دیکھا۔
ماضی نے ہر آنے والے کے دل میں جو کچھ چھپایا ہوا تھا وہ بہت کچھ مصر میں مَیں نے عیاں دیکھا ہے۔
زمین میں سیر کرنے اور خدا کے آثارِ تکوینی کا مطالعہ کرنے اور اسی طرح گزشتہ لوگوں کے آثار اور ان کے روحِ انسان کی تربیت کے لیے بے حد اثرات کے سلسلے میں ہم نے سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۳۷ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔

اللہ کی وسیع رحمت کے ذکر سے ہوا تھا۔ اس طرح سے اس کے آغاز و اختتام پر رحمتِ الٰہی کا بیان ہے۔

گزشتہ آیت بے ایمان مجرموں کو گزشتہ لوگوں کی سرنوشت کے حوالے سے تہدید کرتی ہے۔ اس لیے بہت سے لوگوں کے سامنے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اگر تمام سرکشوں کے بارے میں سنتِ الٰہی یہی ہے تو پھر مکہ کی اس مشرک اور سرکش قوم کو خدا سزا کیوں نہیں دیتا؟

اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: "اگر خدا تمام لوگوں کو ان اعمال کی بناء پر کہ جو انہوں نے انجام دیئے ہیں سزا دے (اور اصلاح، تجدیدِ نظر اور خود سازی کے لیے انہیں کچھ بھی مہلت نہ دے) تو پھر کسی بھی جاندار کو زمین پر باقی نہ چھوڑے گا" (ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علی ظھرھا من دابۃ)۔

ایسے پے در پے عذاب نازل ہوں اور بجلیاں، زلزلے اور طوفان ظالم گنہگاروں کی سرکوبی کریں کہ زمین کسی کے لیے زندہ رہنے کی جگہ نہ رہے۔

"لیکن خدا اپنے لطف و کرم سے انہیں معین زمانے تک تاخیر میں ڈالے گا اور انہیں توبہ و اصلاح کی مہلت دے گا" (ولکن یؤخرھم الی اجل مسمّی)۔

لیکن یہ حلم اور خدائی مہلت ایک حساب سے ہوتی ہے۔ یہ اس وقت تک کے لیے ہے کہ ان کی اجل آن پہنچے گی تو ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا کیونکہ خدا اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے، وہ ان کے اعمال کو بھی دیکھ رہا ہے اور ان کی نیتوں سے بھی باخبر ہے" (فاذا جاء اجلھم فان اللہ کان بعبادہ بصیرًا)۔[1]

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں جن کا جواب اس سے کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے واضح ہو جاتا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ حکم عام کہ اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے سزا دے تو کوئی بھی صفحۂ زمین پر باقی نہ بچے گا، انبیاء و اولیاء اور صالحین کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

---

[1] "اذا جاء اجلھم" کا جملہ شرط ہے اور اس کی جزا مقدر ہے۔ یہ واقع میں اس طرح تھا:

فاذا جاء اجلھم یجازی کل احد بما عمل۔

اس بناء پر "فان اللہ" کا جملہ جزا کی علت ہے کہ جو محذوف معلول کا جانشین ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون" کی جزا ہو کہ جو قرآن کی دوسری آیات مثلاً سورہ نحل کی آیہ ۶۱ میں بیان ہوئی ہے۔

تو اس بناء پر "فان اللہ کان بعبادہ بصیرًا" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ سب کو پہچانتا اور جانتا ہے کہ کس کی اجل آن پہنچی ہے، تاکہ اسے اپنی قدرت کے ذریعے پکڑ لے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ اس قسم کے احکام عامۃ الناس اور اکثریت قاطع سے متعلق ہوتے ہیں۔ انبیاء، آئمہ اور صالحین کہ جو اقلیت میں ہیں مسلمہ طور پر اس سے خارج ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر حکم استثناء رکھتا ہے اور وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بعینہٖ اس طرح ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں اہل جہان غافل ہیں، حریص ہیں اور مغرور ہیں اور اس سے مراد ان کی اکثریت ہے۔

سورہ روم کی آیہ ۴۱ میں ہے:

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون

"لوگوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی اور تری میں خرابی آشکار ہوگئی ہے، خدا چاہتا ہے کہ اُن کے اعمال کے بعض نتائج انہیں چکھائے تاکہ وہ پلٹ آئیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ خرابی تمام لوگوں کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اکثریت پر نظر ہے۔

اسی سورہ کی آیہ ۳۲ کہ جو انسانوں کو تین گروہوں۔ ظالم، درمیانے اور "سابق بالخیرات" میں تقسیم کرتی ہے، اس معنی پر ایک اور گواہ ہے۔

اس بناء پر زیر بحث آیت عصمتِ انبیاء سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا زیر بحث آیت میں "دابّۃ" (چلنے پھرنے والا) غیر انسانوں کے لیے بھی ہے؟ یعنی وہ بھی انسانوں کی سزا کی بناء پر ختم ہو جائیں گے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دوسرے جانداروں کے وجود کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائیں اور جب نسلِ بشر ہی ختم کر دی جائے تو پھر اُن کے وجود کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی[1]

آخر میں ہم اس بحث کو پیغمبرِ اکرمؐ کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں کہ جو آخری آیت کی تفسیر میں بیان ہوئی ہے۔

اس حدیث کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"خداوندِ عالم نے فرمایا ہے کہ اے آدم کے بیٹے تُو میرے ارادے اور مشیت کے مطابق آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ تُو جو کچھ اپنے لیے چاہے اختیار کر سکتا ہے اور تُو میرے ارادے کے ساتھ صاحبِ ارادہ

---

[1] "دابّۃ" "دبیب" کے مادہ سے آہستہ آہستہ چلنے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے معنی میں ہے لیکن لغوی معنی کے لحاظ سے عام طور پر چلنے پھرنے والے کو کہتے ہیں چاہے وہ جلدی جلدی چلے یا آہستہ آہستہ لیکن کبھی "دواب" سواری کے جانوروں کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

ہوا ہے تو جو کچھ اپنے لیے ارادہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ ان نعمتوں کے ذریعے کہ جو میں نے تجھے دی ہیں تو نے قوت حاصل کی ہے اور میری معصیت کا مرتکب ہوا ہے اور میری عطا کردہ قدرت و عافیت کے ساتھ تو میرے فرائض کو ادا کر سکتا ہے۔ اس بناء پر میں تیرے حسنات اور نیکیوں کے سلسلے میں خود تجھ سے اولیٰ ہوں اور تو اپنے گناہوں کے سلسلے میں مجھ سے اولیٰ ہے۔ میری طرف سے ان نعمتوں کے ذریعے کہ جو میں نے تجھے دی ہیں ہمیشہ خیرات ہی پہنچی ہیں اور تیری طرف سے تیرے جرائم کی بناء پر ہمیشہ شر اور برائی تجھ تک پہنچتی ہے.... میں نے تجھے انذار کرنے اور پند و نصیحت کرنے میں ہرگز کوئی کسر نہیں چھوڑی اور غرور و غفلت کے موقع پر میں نے تجھے فوراً سزا نہیں دی (بلکہ میں نے توبہ و اصلاح کے لیے تجھے کافی مہلت دی)۔

اس کے بعد پیغمبرؐ نے فرمایا کہ یہ وہی چیز ہے کہ جس کے متعلق خدا فرماتا ہے کہ:

"ولو یؤاخذ الله الناس بما کسبوا ما ترک علی ظهرها من دابة"[1]

پروردگارا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جو موقع نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں اور تیری طرف پلٹ آتے ہیں اور اپنے تاریک ماضی کو حسنات کے نور اور تیری رضا سے روشن کرتے ہیں۔

بارالٰہا! اگر تیری رحمت شامل حال نہ ہوتی تو وہ آگ کہ جو ہمارے بُرے اعمال کے اندر سے بھڑکتی ہمیں نگل جاتی اور اگر تیری بخشش کے نور اور روشنی کا ہمارے دل پر چھڑکاؤ نہ ہوتا تو شیطان کا لشکر اس پر قبضہ کر لیتا۔

خداوندا! ہمیں ہر قسم کے شرک سے محفوظ رکھ اور ایمان اور خالص توحید کا چراغ ہمارے دل میں روشن فرما اور ہماری گفتار و اعمال میں تقویٰ کی روشنی زیادہ کر دے۔

سورۂ فاطر کا اختتام

۱۲ رجب ۱۴۰۴ ہجری

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۴ صفحہ ۳۷۷ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم۔

سورۂ یٰسٓ

- مکہ میں نازل ہوئی
- اس کی ۸۳ آیات ہیں

★

تاریخ آغاز ۱۳ رجب المرجب ۱۴۰۴ ہجری
روز ولادت باسعادت امام المتقین
امیرالمومنین علی علیہ السلام
جعلنا اللہ من شیعتہ ومحبیہ
ورزقنا شفاعتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ یٰسٓ کے مضامین

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس بنا پر اس کے مضامین بالکل مکی سورتوں کے سے ہیں یعنی توحید، معاد، وحی، قرآن اور نذارت و بشارت سے متعلق گفتگو۔ اس سورہ میں چار حصے خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں:

۱۔ سب سے پہلے پیغمبر اسلامؐ کی رسالت، قرآن مجید، اس آسمانی کتاب کے نازل کرنے کا مقصد اور اس کے گرویدہ ہونے والوں کا بیان ہے اور یہ بیان آیہ ۱۱ تک جاری رہتا ہے۔

۲۔ اس سورہ کے دوسرے حصے میں انبیاء الٰہی میں سے تین کی رسالت اور توحید کی طرف ان کی دعوت کی کیفیت اور شرک کے خلاف ان کے مسلسل اور زبردست معرکے کے بارے میں بیان ہے کہ جو درحقیقت پیغمبر اسلامؐ کو ایک قسم کی تسلی ہے اور انہیں اس عظیم ذمہ داری کی انجام دہی کی راہ دکھائی گئی ہے۔

۳۔ اس سورہ کا تیسرا حصہ آیہ ۳۳ سے شروع ہوتا ہے اور آیہ ۴۴ تک چلتا ہے یہ توحید کے پرکشش نکات سے معمور ہے اور عالم ہستی میں پروردگار کی نشانیوں کا فصیح و بلیغ بیان ہے۔ اس کے بعد پھر اسی بحثِ توحید اور آیاتِ الٰہی کے بیان کی طرف بازگشت ہے۔

۴۔ اس سورہ کا ایک اہم حصہ معاد و قیامت سے مربوط مسائل، اس کے مختلف دلائل، حشر و نشر کی کیفیت، قیامت کے دن سوال و جواب، عالم کے اختتام اور جنت و جہنم کے بارے میں بیان پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں بہت ہی اہم اور دقیق نکتے پوشیدہ ہیں۔

ان چاروں مباحث کے درمیان غافلوں اور بے خبروں کی بیداری کے لیے ہلا دینے والی آیات آئی ہیں کہ جو قلب و روح کے لیے بہت اثر آفریں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس سورہ میں انسان خلقت، قیامت، موت و حیات اور نذارت و بشارت کے مختلف مناظر کا سامنا کرتا ہے کہ جس سے مجموعی طور پر ایک بیدار کن اور شفا بخش نسخہ تیار ہوتا ہے۔

سورۂ یٰسٓ کی فضیلت

متعدد احادیث کی گواہی کے مطابق یہ قرآن کی ایک نہایت اہم سورۃ ہے۔ اس طرح سے کہ احادیث میں اسے "قلبِ قرآن" کہا گیا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے:

ان لکل شیء قلباً و قلب القراٰن یٰسٓ

"ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰسٓ ہے"[1]

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے بھی یہی مطلب منقول ہے۔ اس کے ذیل میں امامؑ مزید فرماتے ہیں :

فمن قرء یٰسٓ فی نہارہ قبل ان یمسی کان فی نہارہ من المحفوظین والمرزوقین حتی یمسی۔ ومن قرأھا فی لیلہ قبل ان ینام وکل بہ الف ملک یحفظونہ من کل شیطان رجیم و من کل اٰفۃ۔

"جو شخص سورۂ یٰسٓ کو غروب سے پہلے دن میں پڑھے تو سارا دن محفوظ اور روزی سے بھرا رہے گا اور جو اسے رات کو سونے سے قبل پڑھے تو خدا ایک ہزار فرشتے اس پر مامور کرتا ہے جو شیطان مردود اور ہر آفت سے اس کی حفاظت کرتے ہیں ..."[2]

اس کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

سورۃ یٰسٓ تدعی فی التوراۃ المعمۃ قیل وما المعمۃ ؟ قال تعم صاحبھا خیر الدنیا والاٰخرۃ ....!

"سورہ یٰسٓ تورات میں "عمومیت آفرین" کے عنوان سے موسوم ہوئی ہے۔ پوچھا گیا کہ اسے عمومیت آفرین کیوں کہا جاتا ہے ؟ فرمایا کہ اس بنا پر کہ جو شخص اس سورہ کا ہمدم اور ہمنشیں ہو اسے تمام خیر دنیا و آخرت سے نوازا جاتا ہے ...."[3]

اہلِ تشیع اور اہلِ سنت کی کتابوں میں دوسری روایات بھی اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ اگر ہم ان سب کو نقل کرنا چاہیں تو گفتگو طویل ہو جائے گی۔

اس طرح سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شاید قرآن مجید میں بہت کم ایسی سورتیں ہوں گی کہ جو ان تمام فضائل کی حامل ہوں۔

جیسا کہ بارہا بیان کیا گیا ہے، یہ فضیلت ان لوگوں کے لیے نہیں جو صرف الفاظ پڑھتے ہیں اور ان کے مفاہیم کو طاقِ نسیان پر رکھ دیتے ہیں بلکہ یہ عظمت اس سورہ کے عظیم مضامین اور مطالب کی بنا پر ہے۔

بیدار کرنے والے، ایمان بخشنے والے، ذمہ داریوں کا احساس دلانے والے اور تقویٰ بیدار کرنے والے مضامین کہ جب انسان ان پر غور و فکر کرتا ہے اور یہ غور و فکر اس کے اعمال میں سایہ فگن ہو جاتا ہے

---

[1]، [2]، [3] مجمع البیان آغاز سورہ یٰسٓ۔

تو پھر دنیا و آخرت کی بھلائی کا سبب بن جاتا ہے۔

مثلاً اس سورہ کی آیہ ۶۰ میں ایک پیمان کے بارے میں ذکر ہے کہ جو خدا نے تمام اولادِ آدم سے لیا ہے کہ شیطان کی پرستش نہ کریں کیونکہ شیطان ایک کھلا دشمن ہے:

الم اعهد الیکم یا بنی اٰدم ان لا تعبدوا الشیطان انه لکم عدو مبین

یہ بات واضح ہے کہ جب انسان اس پیمانِ الٰہی کا پابند ہوگا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث میں بیان ہوا ہے۔ تو وہ ہر شیطانِ رجیم سے امان میں ہوگا لیکن اگر اس آیہ کو سرسری طور پر پڑھے اور عمل میں وہ شیطان کا مخلص دوست اور یارِ وفادار ہے تو پھر وہ اس عظیم افتخار کو حاصل نہیں کر سکتا۔

اسی طرح اس سورہ کی ہر ہر آیت اور کلمے کے پیشِ نظر انسان کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) یٰسٓ ۝

(۲) وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ ۝

(۳) اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۝

(۴) عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۝

(۵) تَنۡزِیۡلَ الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ۝

(۶) لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُہُمۡ فَہُمۡ غٰفِلُوۡنَ ۝

(۷) لَقَدۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ عَلٰۤی اَکۡثَرِہِمۡ فَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝

(۸) اِنَّا جَعَلۡنَا فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ اَغۡلٰلًا فَہِیَ اِلَی الۡاَذۡقَانِ فَہُمۡ مُّقۡمَحُوۡنَ ۝

(۹) وَجَعَلۡنَا مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡہِمۡ سَدًّا وَّمِنۡ خَلۡفِہِمۡ سَدًّا فَاَغۡشَیۡنٰہُمۡ فَہُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ۝

(۱۰) وَسَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

(۱) یٰسٓ

(۲) قرآن حکیم کی قسم!

(۳) یقیناً تو (خدا کے) رسولوں میں سے ہے۔

(۴) صراطِ مستقیم پر۔

(۵) (یہ قرآن) خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

(۶) تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے کہ جن کے آباؤ اجداد کو ڈرایا نہیں گیا تھا اسی لیے وہ غافل ہیں۔

(۷) ان میں سے اکثر کے بارے میں (اللہ کا) فرمان حق ہو کر آچکا ہے اسی بنا پر وہ ایمان نہیں لاتے۔

(۸) ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں کہ جو ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوتے ہیں اور اس لیے انہوں نے سروں کو اوپر کر رکھا ہے۔

(۹) ہم نے ان کے سامنے بھی ایک دیوار بنا دی ہے اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار بنا دی ہے اور ان کی آنکھوں کو ہم نے ڈھانپ دیا ہے۔ اس لیے وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے۔

(۱۰) ان کے لیے یکساں ہے چاہے تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

"قلبِ قرآن" کا سرآغاز

یہ سورت قرآن مجید کی دوسری ۲۸ سورتوں کی طرح حروف مقطعات کے ساتھ شروع ہوتی ہے (یا اور سین)۔

ہم نے حروف مقطعہ کی تفسیر کے بارے میں سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور اعراف کی ابتدا میں

مفصل گفتگو کی ہے۔[1]

لیکن خصوصیت کے ساتھ سورہ یٰسین میں ان حروف مقطعہ کے لیے کچھ اور تفسیریں بھی ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لفظ مرکب ہے "یا" حرف ندا اور "سین" سے یعنی ذات پیغمبرِ اسلامؐ سے اور اس طرح سے پیغمبرِ اکرمؐ کو بعد والے مطالب کے بیان کرنے کے لیے مخاطب کیا گیا ہے۔

مختلف احادیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ یہ لفظ پیغمبرِ گرامی اسلامؐ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔[2]

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہاں مخاطب انسان ہے "سین" اس کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ احتمال بعد والی آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ ان آیات میں روئے سخن صرف پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف ہے۔

اسی لیے ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

یٰسٓ اسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم والدلیل علیٰ ذٰلک قولہ تعالیٰ انک لمن المرسلین علیٰ صراط مستقیم۔

"یٰسین رسولِ خدا کا نام ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تو مرسلین میں سے ہے اور صراطِ مستقیم پر ہے" (نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۳۷۵)۔

٭ ٭ ٭

ان حروف مقطعہ کے بعد ۔ بہت سی ان سورتوں کی طرح کہ جو حروفِ مقطعہ سے شروع ہوتی ہیں ۔ قرآن مجید کے بارے میں گفتگو ہے۔ البتہ یہاں قرآن کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے "والقرآن الحکیم" (قرآنِ حکیم کی قسم)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "قرآن" کی "حکیم" کے ساتھ توصیف کی گئی ہے جبکہ حکمت عام طور پر زندہ اور عاقل شخص کی صفت ہے۔ گویا قرآن کا زندہ و عاقل اور رہبر و پیشوا کے طور پر تعارف کروایا جا رہا ہے کہ جو حکمت کے دروازے انسانوں کے سامنے کھول سکتا ہے اور اس صراطِ مستقیم کی طرف کہ جس کی طرف بعد والی آیات میں اشارہ کیا ہے، رہنمائی کر سکتا ہے۔

٭ ٭ ٭

البتہ خدا قسم کھانے کا محتاج نہیں ہے لیکن قرآن کی قسمیں ہمیشہ دو اہم فوائد کی حامل ہوتی ہیں، پہلا کسی مطلب کی تاکید کے لیے اور دوسرا اس چیز کی عظمت بیان کرنے کے لیے کہ جس کی قسم کھائی جا رہی ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ کی جلد اول، جلد دوم اور جلد چہارم میں مذکورہ سورتوں کے آغاز کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] نور الثقلین، جلد ۴ صفحہ ۳۷۳ و صفحہ ۳۷۵۔

کیونکہ کوئی بھی شخص کم قدر و قیمت موجودات کی قسم نہیں کھاتا۔

بعد والی آیت اس چیز کو کہ جس کی خاطر پہلی آیت میں قسم کھائی گئی تھی بیان کرتی ہے، فرمایا گیا ہے:
"یقیناً تو خدا کے رسولوں میں سے ہے" (انک لمن المرسلین)۔
"ایسی رسالت کہ جو حقیقت اور تیرے صراطِ مستقیم پر ہونے سے منسلک ہے" (علیٰ صراط مستقیم)[1]
پھر مزید ارشاد ہوتا ہے: "یہ وہ قرآن ہے جو خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے نازل ہوا ہے"
(تنزیل العزیز الرحیم)[2]

خدا کے "عزیز" ہونے کا ذکر اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ وہ اس قسم کی عظیم اور شکست ناپذیر کتاب پر قدرت رکھتا ہے کہ جو تمام زمانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک معجزہ کی صورت میں باقی رہے گی اور کوئی طاقت اس کی عظمت کو دلوں سے محو نہیں کر سکتی۔

خدا کی "رحیمیت" کا ذکر یہ حقیقت بیان کرنے کے لیے ہے کہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ اس قسم کی عظیم نعمت انسانوں کو دے۔

بعض مفسرین نے ان دو اوصاف کو دو قسم کے ردِ عمل کا بیان سمجھا ہے جو ممکن ہے اس کتاب آسمانی کے نزول اور اس رسول کے بھیجنے پر لوگوں کی طرف سے ظاہر ہو۔

اگر وہ انکار پر تل جائیں تو خدا نے انہیں اپنی عزت و قدرت کے ساتھ تہدید کی ہے اور اگر اسے دل سے تسلیم اور قبول کریں تو خدا نے انہیں اپنی رحمت کی بشارت دی ہے۔[3]

اس بناء پر اس نے اپنی عزت و رحمت کو باہم ملا دیا ہے۔ جن میں سے عزت ڈراوے کی مظہر ہے اور

---

[1] "علیٰ صراط مستقیم" کی ترکیب کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض "جار و مجرور" کو "مرسلین" سے متعلق جانتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ "تیری رسالت جادۂ مستقیم پر ہے" بعض نے اسے خبر کے بعد خبر جانا ہے، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تو صراطِ مستقیم پر قائم ہے۔ بعض نے اسے موضع نصب میں "حال" ہونے کے معنی میں لیا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تو مرسلین میں سے ہے جبکہ تو صراطِ مستقیم پر ہے (البتہ معنی کے لحاظ سے ان تینوں احتمالوں میں چنداں فرق نہیں ہے)۔

[2] "تنزیل" کا منصوب ہونا اس بناء پر ہے کہ وہ فعل مقدر کا مفعول ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

منزل تنزیل العزیز الرحیم

اس جملے کی ترکیب کے بارے میں دوسرے احتمال بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

[3] تفسیر کبیر، فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

رحمت بشارت کی مظہر ہے گویا اُس نے اپنی عزت و رحمت کی بناء پر عظیم آسمانی کتاب انسانوں کو دی ہے۔
یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی پیغمبر یا آسمانی کتاب کی حقانیت کو قسم اور تاکید کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے؟
اس سوال کا جواب خود زیر نظر آیات میں چھپا ہوا ہے کیونکہ ایک طرف تو قرآن کی حکیم ہونے کے ساتھ توصیف کی گئی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی حکمت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اور اپنی حقانیت کی دلیل آپ ہے۔
دوسری طرف یہ کہ پیغمبر کی صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے ساتھ توصیف کی گئی ہے یعنی ان کی دعوت کے مطالب خود یہ بات بیان کرتے ہیں کہ ان کی راہ سیدھی ہے۔ان کی سابقہ زندگی کے حالات بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ صراطِ مستقیم کے سوا ان کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔
ہم نے انبیاء کی حقانیت کے دلائل میں اس مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی حقانیت کو معلوم کرنے کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی دعوت کے مضامین و مطالب کا بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ اگر وہ فطرت، عقل اور وجدان کے ساتھ ہم آہنگ ہوں اور ایسی سطح پر ہوں کہ جو ایک انسان سے بشری قوت کے ساتھ ممکن نہ ہوں، اس کے علاوہ خود پیغمبر کی زندگی کے سابقہ حالات بھی ایسے ہوں کہ جو اس بات کی نشاندہی کریں کہ وہ امین و صادق ہے اور اس میں دروغ و فریب نہیں ہے تو یہ امور اس بات کے زندہ قرائن ہوں گے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے اور زیر بحث آیات حقیقت میں ان ہی دو مطالب کی طرف اشارہ ہیں۔ اس بناء پر یہ قسم اور دعویٰ ہرگز بے دلیل نہیں ہے۔
اس سے قطع نظر، فنِ مناظرہ کے لحاظ سے، ہٹ دھرم منکرین کے دلوں میں نفوذ کے لیے جس قدر زیادہ محکم، زیادہ قاطع اور بیشتر تاکید کے ساتھ عبارتیں آئیں گی اتنا ہی وہ اُن پر اثر انداز ہوں گی۔
پھر ایک اور سوال سامنے آتا ہے کہ اس جملے میں ذاتِ پیغمبرؐ کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے اور مشرکین اور عام لوگوں کو کیوں نہیں؟
اس کا جواب یہ ہے کہ مقصد یہ تھا کہ اس بات کی تاکید کی جائے کہ تُو حق پر اور صراطِ مستقیم پر ہے، چاہے وہ قبول کریں یا نہ کریں۔ بنا بریں تو اپنی عظیم ذمہ داری کی ادائیگی میں کوشاں رہ اور مخالفین کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے فعالیت میں ہرگز کمی نہ آنے دے۔
بعد والی آیت نزولِ قرآن کے اصل مقصد کو اس طرح پیش کرتی ہے:
"ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ تُو اس قوم کو خبردار کرے کہ جن کے آباء و اجداد کو خبردار نہیں کیا گیا۔ اس بناء پر وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں" (لتنذر قوماً ما

انذر اٰباؤھم فھم غافلون[1]

یقیناً اس قوم سے مراد وہی مشرکین عرب ہیں ہو سکتا ہے یہ کہا جائے کہ کوئی قوم انذار کرنے والے کے بغیر نہیں تھی اور زمین کبھی بھی حجت خدا سے خالی نہیں رہی، اس کے علاوہ سورہ فاطر کی آیہ ۲۴ میں یہ بیان ہوا ہے کہ:

وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر

"کوئی امت ایسی نہیں تھی کہ اس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو"

اس کا جواب یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں ایسا عظیم اور آشکار ڈرانے والا پیغمبر مراد ہے کہ جس کی شہرت ہر جگہ پہنچی ہوئی ہو۔ ورنہ مشتاق اور طالبان حق کے لیے ہر زمانے میں حجت الٰہی موجود ہوتی ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے دور اور پیغمبر اسلامؐ کے درمیانی عرصہ کو فترت کا زمانہ شمار کرتے ہیں تو یہ اس معنیٰ میں نہیں کہ اُن کے لیے حجت خدا مطلقاً موجود ہی نہیں تھی، بلکہ یہ عظیم اور اولوالعزم پیغمبروں کے لحاظ سے فترت کا زمانہ تھا۔

امیرالمومنین علیؑ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

ان اللہ بعث محمداً ولیس احد من العرب یقرء کتاباً ولا یدعی نبوۃ۔

---

[1] اس بارے میں کہ اوپر والی آیت میں "ما" نافیہ ہے یا کوئی اور، مختلف احتمال ذکر کیے گئے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اسے "نافیہ" قرار دیا ہے اور ہم نے بھی مذکورہ بالا تفسیر میں یہی معنی اپنایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً "فھم غافلون" اس معنی پر گواہ ہے کیونکہ انذار کرنے والے کا نہ ہونا غفلت کا سبب بنتا ہے۔ سورہ سجدہ کی آیہ ۳ بھی اسی بات پر شاہد ہے، جہاں قرآن کہتا ہے:

لتنذر قوماً ما اتاھم من نذیر من قبلک لعلھم یھتدون

مقصد یہ ہے کہ تو ایسی قوم کو انذار کرے کہ جس کے لیے تجھ سے پہلے کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت حاصل کریں"

بعض "ما" کو موصولہ سمجھتے ہیں کہ جس سے اس کا مفہوم یہ ہوگا:

"وہ انہیں اسی طرح انذار کرتا ہے کہ جس طرح ان کے آباؤ اجداد کو انذار کیا گیا تھا"

بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "ما" مصدریہ ہے اور اس لحاظ سے اس جملہ کا معنی اس طرح ہوگا:

"تاکہ تو اس قوم کو انذار کرے اسی مقدار میں کہ جتنا ان کے آباؤ اجداد ڈرائے گئے تھے"

لیکن یہ دونوں احتمال ضعیف ہیں۔

"خدا نے ایسے وقت میں محمدؐ کو مبعوث فرمایا کہ جس وقت عرب میں کوئی بھی کتاب آسمانی نہیں پڑھتا تھا اور نہ ہی کسی کو دعویٰ نبوت تھا" (نہج البلاغہ خطبہ ۳۳، ۱۴۴)۔

بہر حال نزولِ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ غافل اور سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کیا جائے، جن خرافات نے اُن کا احاطہ کیا ہوا ہے انہیں اُن کی طرف متوجہ کیا جائے اور جن گناہوں اور شرک و فساد میں وہ آلودہ ہیں انہیں اُن سے نکلنے کی دعوت دی جائے۔

ہاں! قرآن تو آگاہی و بیداری کی ایک بنیاد ہے اور قلب و روح کو پاک کر دینے والی کتاب ہے۔

اس کے بعد قرآن کفر و شرک کے سرغنوں کے بارے میں ایک پیشگوئی کے طور پر کہتا ہے: "ان میں سے اکثر کے اوپر وعدۂ الٰہی حق بن کر نافذ ہو چکا ہے، پس وہ ایمان نہیں لائیں گے" (لقد حق القول علیٰ اکثرھم فھم لا یؤمنون)۔

"قول" سے یہاں کیا مراد ہے، اس ضمن میں مفسرین نے مختلف احتمال ذکر کیے ہیں لیکن ظاہراً اس سے مراد شیطان کے پیروکاروں کے لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہی ہے۔ جیسا کہ سورہ سجدہ کی آیہ ۱۳ میں ہے کہ:

ولٰکن حق القول منی لاملئن جھنم من الجنة والناس اجمعین

"لیکن میری بات ان کے لیے نافذ ہو چکی ہے کہ میں دوزخ کو جن وانس سے بھر دوں گا"

سورۂ زمر کی آیہ ۷۱ میں بھی ہے:

ولٰکن حقت کلمة العذاب علی الکافرین

"لیکن عذاب کا حکم اور وعدہ کافروں کے بارے میں حق ہو کر نافذ ہو چکا ہے"

بہر حال یہ ایسے افراد کے بارے میں ہے کہ جنہوں نے خدا سے ہر قسم کا ربط منقطع کر لیا تھا، ہر قسم کے رشتے توڑ لیے تھے اور اپنے لیے ہدایت کے تمام دریچے بند کر لیے تھے اور ہٹ دھرمی اور عناد کو آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔ ہاں! یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور ان کے لیے بازگشت کی کوئی راہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اپنے پیچھے کے تمام پُل خود تباہ کر دیئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اسی صورت میں اصلاح پذیر اور قابلِ ہدایت ہے جبکہ اس نے بُرے اعمال اور اپنے پست اخلاق کے ذریعے اپنی فطرتِ توحیدی کو بالکل پامال نہ کر دیا ہو۔ ورنہ مطلق تاریکی اس کے دل پر غالب آ جائے گی اور امید کے سارے دریچے اس پر بند ہو جائیں گے۔

ضمنی طور پر اس بات سے واضح ہو گیا کہ اس اکثریت سے مراد کہ جو ہرگز ایمان نہیں لائے گی شرک و کفر کے سرغنے ہیں کہ جن میں سے کچھ تو اسلامی جنگوں میں شرک اور بُت پرستی کی حالت میں مارے گئے اور کچھ جو باقی رہ گئے تھے آخر عمر تک دل سے ایمان نہ لائے ورنہ مشرکین مکہ کی اکثریت تو فتح مکہ

کے بعد :

یدخلون فی دین اللہ افواجاً (نصر-۲)

کے مطابق گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو گئی تھی۔

اس کے بعد کی آیات کے مطابق ان کے سامنے اور پیچھے دیوار موجود ہے اور وہ نابینا ہیں اور آیہ یہ تصریح بھی کرتی ہے کہ ان کے لیے انذار کرنا اور نہ کرنا یکساں ہے۔ یہ آیت بھی اسی مذکورہ معنی کی شاہد ہے[1]

بہر حال بعد والی آیت اس اثر ناپذیر گروہ کے تعارف میں ہے: ان کے پہلے تعارف میں کہتی ہے: ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں کہ جو اُن کی ٹھوڑیوں تک آتے ہوئے ہیں اور ان کے سروں کو اوپر کیا ہوا ہے" (انا جعلنا فی اعناقھم اغلالاً فھی الی الاذقان فھم مقمحون)۔

" اغلال " " غل " کی جمع ہے اور اصل میں مادہ "غل" سے ایسی چیز کے معنی میں ہے کہ جو چند چیزوں کے درمیان موجود ہو، مثلاً وہ جاری پانی کہ جو درختوں کے درمیان سے گزرتا ہے اُسے " غلل " (بروزن "عمل") کہتے ہیں اور " غل " وہ حلقہ تھا کہ جسے گردن یا ہاتھ میں ڈالتے تھے پھر اُسے زنجیر کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور چونکہ گردن یا ہاتھ اس کے درمیان ہوتا تھا لہٰذا یہ لفظ اُس کے بارے میں استعمال ہوا ہے کبھی وہ طوق کہ جو گردن میں ہوتے تھے انہیں علیٰحدہ زنجیر کے ساتھ باندھا جاتا تھا اور ہاتھ کے حلقے علیٰحدہ ہوتے تھے، لیکن کبھی کبھی ہاتھوں کو حلقوں میں ڈال کر اس حلقے کے ساتھ کہ جو گردن میں ہوتا تھا باندھ دیتے تھے اور قیدی کو انتہائی اذیت دی جاتی تھی۔

نیز پیاس یا شدت غم اور غصے کی حالت کو " غلہ " (بروزن " قلہ ") کہا جاتا ہے تو یہ بھی اس حالت کے انسان کے دل اور جسم پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے ہے۔ اصولاً مادہ " غل " (بروزن " جد ") بھی داخل ہونے اور داخل کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اسی لیے گھر کے اناج اور زراعت وغیرہ کو بھی " غلہ " کہتے ہیں[2]

ہر صورت میں جب طوق " غل " گردن میں ڈالا جاتا تھا تو وہ ٹھوڑی تک پہنچا ہوا ہوتا تھا اور سر کو اوپر کر دیتا تھا اور جب قیدی اور اسیر اس کی وجہ سے بہت سختی میں ہوتا تھا تو اپنے گرد و پیش کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

---

[1] جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ " اکثرھم " کی ضمیر " قوم " کی طرف کہ جو اس سے پہلے ہے نہیں لوٹتی، بلکہ قوم کے سرغنوں کی طرف لوٹتی ہے اور اس کی شاہد اس کے بعد کی آیات ہیں۔

[2] مفردات راغب اور قطر المحیط اور مجمع البحرین (مادہ " غل ")۔

ہٹ دھرم بُت پرستوں کی حالت کی یہ تشبیہ کتنی عمدہ ہے کہ جو ایسے انسانوں کے ساتھ دی گئی ہے کہ جنہوں نے "تقلید" کا طوق اور بیہودہ عادات و رسوم کی زنجیر و طوق کو اپنی گردن اور ہاتھ پاؤں میں باندھ لیا ہے، اور ان کے وہ طوق ایسے ہیں کہ انہوں نے اُن کے سروں کو اوپر کر رکھا ہے اور حقائق کو دیکھنے سے محروم کر دیا ہے وہ ایسے قیدی ہیں کہ نہ تو حرکت کر سکتے ہیں اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں [1]

بہر حال زیرِ بحث آیت اس بے ایمان گروہ کے حالاتِ دنیا کی ایک تصویر ہے اور آخرت میں اُن کے حالات کا ایک بیان بھی ہے، جو اس جہان کی کیفیت کا ایک مرقع ہے؛ اور اگر یہ لفظ ماضی کی شکل میں ذکر ہوا ہے تو اس سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئندہ ہونے والے مسلمہ اور یقینی واقعات صیغہ ماضی میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے کہ جو ادبا کی زبان میں معروف ہے کہ "متحقق الوقوع مضارع، ماضی کی شکل اختیار کر لیتا ہے" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو، ان کی اس عالم میں حالت کے بارے میں بھی اور دوسرے جہان کے بارے میں بھی۔

مفسرین کی ایک جماعت نے زیرِ بحث آیت اور اس کے بعد کی آیت کی کئی شانِ نزول بیان کی ہیں، ان کے مطابق یہ "ابوجہل" کے بارے میں یا قبیلہ بنی مخزوم یا قریش کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، انہوں نے پیغمبرِ اکرمؐ کے قتل کا بارہا مصمم ارادہ کیا لیکن خدا نے انہیں معجزانہ طور پر اس کام سے باز رکھا اور اس حساس لمحے میں جب کہ وہ پیغمبرِ اکرمؐ کے نزدیک پہنچ کر یہ چاہتے تھے کہ آپؐ پر ضرب کاری لگائیں تو ان کی آنکھیں بے کار ہو گئیں یا حرکت کی طاقت اُن سے سلب ہو گئی [2]

لیکن یہ تمام بیان کردہ شانِ نزول آیت کے مفہوم کی عمومیت اور اس کے معنی کی وسعت سے مانع نہیں ہے اور یہ کفر کے تمام سرغنوں اور ہٹ دھرم متعصب لوگوں کے بارے میں ہے۔ ضمنی طور پر ہم نے جو کچھ "فھم لا یؤمنون" کی تفسیر میں بیان کیا ہے یہ اس کی ایک تائید ہے کہ اس سے مراد مشرکین کی اکثریت نہیں ہے بلکہ شرک، کفر اور نفاق کے سرغنوں کی اکثریت مراد ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں انہیں افراد کی ایک اور صفت بیان کی گئی ہے اور ان کی اثر ناپذیری کے عوامل کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔ فرمایا گیا ہے: "ہم نے ایک دیوار تو ان کے سامنے بنا دی ہے اور ایک دیوار اُن

---

[1] ہم نے جو کچھ سطور بالا میں بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ "ھی" کی ضمیر (فھی الی الاذقان) میں "اغلال" کی طرف لوٹتی ہے کہ وہ ان کی ٹھوڑی تک کھنچے ہوئے ہیں اور "فھم مقمحون" اس پر تفریع ہے اور یہ جو ایک جماعت نے خیال کیا ہے کہ "ھی" کی ضمیر (ایدی) "ہاتھوں" کی طرف لوٹتی ہے کہ جس کا آیہ میں ذکر نہیں، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

[2] تفسیر آلوسی، جلد ۲۲ ص ۱۹۹۔

کے پیچھے" (وجعلنا من بین ایدیھم سدًا ومن خلفھم سدًا)۔

وہ ان دونوں دیواروں کے درمیان اس طرح سے محصور ہو کر رہ گئے ہیں کہ نہ تو آگے جانے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ ہے اور نہ ہی واپس لوٹنے کے لیے" اور اس حالت میں ہم نے ان کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا ہے، لہٰذا وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے" (فاغشیناھم فھم لا یبصرون)۔

کیسی عجیب بولتی ہوئی تصویر ہے۔ ایک طرف سے تو وہ ایسے قیدیوں کی مانند ہیں کہ جو طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور دوسری طرف سے گردن میں پڑے ہوئے طوق کا حلقہ اتنا بڑا ہے کہ اس نے اُن کے سروں کو آسمان کی طرف اٹھا رکھا ہے اور وہ اپنے اطراف کی کوئی چیز نہیں دیکھ پاتے۔

ایک دیوار نے ان کا آگے سے اور ایک نے پیچھے سے محاصرہ کیا ہوا ہے اور آگے اور پیچھے کا راستہ ان کے لیے بند کر دیا ہے۔

نیز ان کی آنکھیں بھی بند کر دی گئی ہیں اور دیکھنے کی بصارت بے کار ہو گئی ہے۔

خوب غور کریں کہ جو شخص ایسی کیفیت سے دوچار ہو وہ کیا کر سکتا ہے، کیا سمجھ سکتا ہے، کیا دیکھ سکتا ہے اور کس طرح قدم بڑھا سکتا ہے؟ خود غرض و خود بین مستکبرین اندھے، بہرے مقلدین اور ہٹ دھرم متعصبین کی کیفیت حقائق کے سامنے ایسی ہی ہے۔

اسی بناء پر آخری زیر بحث آیت میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے: "ان کے لیے برابر ہے چاہے تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے" (وسواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون)۔

تیری گفتگو چاہے جتنی بھی پُر تاثیر ہو اور وحی آسمانی چاہے جس قدر بھی مؤثر ہو، جب تک دلوں کی زمین اہل اور تیار نہ ہو اثر نہ کرے گی۔ اگر آفتاب عالم تاب ہزاروں سال شورہ زار پر چمکتا رہے اور پُر برکت بارشیں اس پر برستی رہیں اور نسیم بہار مسلسل اس کے اوپر سے گزرتی رہے، خس و خاشاک کے سوا اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ فاعل کی فاعلیت کے ساتھ ساتھ قابل کی قابلیت بھی شرط ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ آلاتِ شناخت کا بیکار ہو جانا: انسان اس بناء پر کہ اپنے وجود سے باہر کے عالم سے بھی آگاہ ہو سکے کچھ وسائل و آلات سے فائدہ اٹھاتا ہے، جنہیں آلاتِ شناخت کہا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک حصہ تو "ذات کے اندر" ہوتا ہے اور دوسرا حصہ "ذات سے باہر"۔ عقل و خرد اور وجدان و فطرت تو ذات کے اندر والے شناخت کے آلات ہیں اور انسان کے حواس ظاہری ۔ جیسے بینائی و شنوائی ۔ ذات سے باہر کے آلاتِ شناخت ہیں۔

ان خداداد وسائل سے اگر صحیح طور پر استفادہ کیا جائے تو روز بروز زیادہ قوی اور زیادہ طاقتور ہوتے جائیں گے اور مزید بہتر اور مزید دقیق حقائق کی شناخت کریں گے۔

لیکن اگر وہ ایک مدت تک انحرافی راہوں میں چلتے رہیں یا اُن سے بالکل استفادہ نہ کیا جائے تو آہستہ آہستہ کمزور پڑ جائیں گے یا بالکل بگڑ جائیں گے اور حقائق کی برعکس نشاندہی کریں گے، ٹھیک ایک صاف و شفاف آئینہ کی مانند کہ جسے ایک دبیز و ضخیم گرد و غبار ڈھانپ لے یا زیادہ اور گہری خراشیں اس پر لگ جائیں تو پھر اس میں کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی اور اگر دکھائی دے بھی تو ہرگز حقیقت کے مطابق نہیں ہوگی۔

انسان کے یہی غلط اعمال اور انحرافی فائدے اٹھانا، آلاتِ شناخت کی اس عظیم نعمت کو اس سے چھین لیتے ہیں۔ اس بنا پر قصوروار وہ خود ہے اور اس کا گناہ بھی خود اسی کی گردن پر ہے۔

اوپر والی آیات اس اہم اور سرنوشت ساز مسئلہ کی بولتی ہوئی تصویر ہیں۔ متکبر ہوس بازوں اور متعصب خود خواہوں کو ان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو طوق و زنجیر میں گرفتار ہیں۔ یہ وہی ہوا و ہوس، کبر و غرور اور اندھی تقلید کی زنجیریں ہیں کہ جو خود انہوں نے اپنے ہاتھ اور گردن میں ڈالی ہیں اور یہ اُن لوگوں کے مشابہ ہیں کہ جو ایک قوی اور ناقابلِ عبور چار دیواری کے محاصرے میں آگئے ہیں۔

اور دوسری طرف سے اُن کی آنکھیں بند اور نابینا ہیں۔

صرف طوق و زنجیر ہی ان کو حرکت سے روکنے کے لیے کافی ہیں جبکہ دو عظیم دیواریں بھی ان کی فعالیت میں مانع ہیں اور ان کی آنکھیں بھی کچھ دیکھنے کے قابل نہیں ہیں۔

یہ دونوں دیواریں گویا اس قدر بلند اور نزدیک ہیں کہ جو انہیں کچھ دیکھنے نہیں دیتیں اور انہیں حرکت سے بھی محروم کر دیتی ہیں۔

ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ انسان کا ہدایت قبول کرنا اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ اس مرحلے تک نہ پہنچ گیا ہو لیکن جب وہ اس مرحلے تک پہنچ جائے تو پھر تمام انبیاء و اولیاء بھی جمع ہو جائیں اور تمام کتب آسمانی اس کے سامنے پڑھی جائیں تو بھی اس پر مؤثر نہ ہوں گی۔

اور یہ جو روایاتِ اسلامی اور اسی طرح آیاتِ قرآنی میں تاکید کی گئی ہے کہ اگر کسی انسان سے کوئی لغزش ہو جائے اور کوئی گناہ اس سے سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کر لے اور خدا کی طرف لوٹ آئے اور لیت و لعل، تاخیر اور اصرار و تکرار سے پرہیز کرے، تو یہ اس لیے ہے کہ معاملہ اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ جو زنگ لگ چکا ہے اُترنے ہی نہ پائے۔ چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں کو ایک بڑی رکاوٹ میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی ختم کر دے اور پیش رفت اور حرکت کی گنجائش باقی رکھے اور غبار کو اپنی آنکھوں سے ہٹا دے تاکہ راستے کو واضح طور پر دیکھ سکے۔

۲۔ **آگے اور پیچھے حائل دیواریں:** بعض مفسرین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ حرکت کو جاری رکھنے میں اصل رکاوٹ تو آگے اور سامنے کی رکاوٹیں ہوتی ہیں، پیچھے کی دیوار کے کیا معنی ہیں؟

بعض نے تو یہ جواب دیا ہے کہ انسان دو قسم کی ہدایت کا حامل ہے:

۱۔ نظری اور استدلالی ہدایت اور

۲۔ فطری و وجدانی ہدایت

سامنے کی دیوار اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ہدایت نظری سے محروم ہوگا، وہ چاہے گا کہ پیچھے کی طرف لوٹ جائے اور ہدایت فطری کی طرف نظر کرے تو پیچھے کی دیوار اسے فطرت کی طرف بازگشت سے روکے گی[1]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ آگے والی دیوار ان رکاوٹوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو اُسے آخرت اور سعادت جاودانی تک پہنچنے سے روکتی ہیں اور پیچھے والی دیوار وہ چیز ہے کہ جو اسے دنیا کی سعادت اور آرام و سکون تک پہنچنے نہیں دیتی[2]

یہ احتمال بھی آیت کی تفسیر میں موجود ہے کہ انسان جس وقت مقصد تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ کا سامنا کرتا ہے تو وہ پیچھے کی طرف لوٹتا ہے تاکہ مقصد تک پہنچنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے لیکن جب دونوں طرف ایک ایک دیوار بن چکی ہو تو وہ ہر حالت میں مقصد کی طرف جانے سے محروم ہو جائے گا۔

ضمنی طور پر اس سوال کا جواب واضح ہوگیا کہ دائیں اور بائیں طرف دیوار کا کوئی بیان کیوں نہیں ہوا کیونکہ دائیں بائیں چلنا کبھی بھی انسان کو مقصد تک نہیں پہنچاتا، اسے تو کوئی راستہ آگے کی طرف ہی نکالنا چاہیئے۔

علاوہ ازیں عام طور پر دیوار ایسی جگہ پر بنائی جاتی ہے کہ جب دائیں اور بائیں طرف راستہ بند ہو اور دونوں کے درمیان صرف ایک ہی گزرگاہ موجود ہو تو دیوار تعمیر ہو جانے سے وہ گزرگاہ بھی بند ہو جاتی ہے اور عملی طور پر انسان محاصرے میں آجاتا ہے۔

۳۔ **انفس و آفاق کی دنیا میں سیر سے محرومی:** خدا کی شناخت کے لیے عام طور پر دو راستے موجود ہیں۔ ایک تو خدا کی اُن نشانیوں کا مطالعہ کہ جو انسان کے جسم و روح میں موجود ہیں اور انہیں "آیاتِ انفس" کہا جاتا ہے۔

دوسرا ان آیات اور نشانیوں کا مطالعہ کہ جو اس کے وجود سے باہر زمین و آسمان، ثوابت و سیارات اور کوہ و دریا میں پائی جاتی ہیں۔ انہیں "آیاتِ آفاق" کہتے ہیں کہ جن کی طرف قرآن مجید سورہ حٰم السجدہ کی

---

[1] تفسیر کبیر، فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

آیہ ۵۳ میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

سنریهم اٰیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسهم حتّٰی یتبیّن لهم انه الحق

ہم عنقریب انہیں آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر ثابت ہو جائے کہ خدا حق ہے ۔

جس وقت انسان کی قوتِ شناخت بے کار ہو جاتی ہے تو آیاتِ انفس کا مشاہدہ بھی اس پر بند ہو جاتا ہے اور آیاتِ آفاق کا مشاہدہ بھی ۔

زیرِ بحث آیات میں " انّا جعلنا فی اعناقهم اغلالاً فهی الی الاذقان فهم مقمحون " کا جملہ پہلے معنی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ طوق ان کے سروں کو اس طرح سے اوپر کیے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بھی دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے اور آگے اور پیچھے کی دیواریں ان کی آنکھ کو اس طرح سے اپنے اطراف کے مشاہدہ سے باز رکھتی ہیں ، وہ دیکھنے کی جتنی بھی کوشش کرتے ہیں اس دیوار کے سوا انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا اور آفاقی آیات کے مشاہدہ سے بھی محروم رہ جاتے ہیں ۔

(۱۱) اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ○

(۱۲) اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۗ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ○

ترجمہ

(۱۱) تُو تو صرف اس شخص کو ڈرا سکتا ہے کہ جو اس خدائی نصیحت کی پیروی کرتا ہے اور خدائے رحمٰن سے پوشیدہ طور سے ڈرتا ہے ایسے شخص کو بخشش اور بہترین اجر و ثواب کی بشارت دے دے۔

(۱۲) ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے اور ان کے تمام آثار کو ہم لکھتے ہیں اور ہم نے ہر چیز کا واضح "کتاب" میں احصاء کر دیا ہے۔

تفسیر

کس قسم کے لوگ تیری تنبیہ کو قبول کرتے ہیں

گزشتہ آیات میں ایسے گروہ کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو کسی طرح بھی خدائی تنبیہوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور ان کو ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ زیر بحث آیات ایک اور گروہ کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ یہ لوگ مذکورہ گروہ کے بالکل مدِ مقابل قرار پاتے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ایک کا دوسرے سے موازنہ کر کے۔ مسئلہ زیادہ واضح ہو جائے اور یہی قرآن کا طریق کار ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "تُو تو صرف اسی کو خدا سے ڈرا سکتا ہے جو اس کے ذکر کی پیروی کرے اور خداوند رحمان سے پوشیدہ طور پر اور غیب میں ڈرے" (انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمٰن بالغیب)۔

"اور جو ایسا ہے اسے مغفرت اور بہترین اجر و ثواب کی بشارت دے" (فبشرہ بمغفرۃ واجر کریم)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ اس آیت میں ایسے اشخاص ۔ کہ جن پر پیغمبر کا "انذار" اور پند و نصیحت مؤثر ہے کے دو اوصاف بیان ہوئے ہیں:

۱۔ نصیحت کی پیروی۔

۲۔ پوشیدہ طور پر خدا سے ڈرنا۔

البتہ ان دو اوصاف سے مراد آمادگی اور صلاحیت ہے۔ یعنی انذار صرف ان افراد پر مؤثر ہوتا ہے جو سننے والا کان اور آمادہ دل رکھتے ہیں۔ انذار ان میں دو اثر پیدا کرتا ہے پہلا ذکر و قرآن کی پیروی اور دوسرا پروردگار اور اس کی طرف سے عائد ذمہ داریوں کی ادائیگی کا احساس۔

دوسرے لفظوں میں ان دو اوصاف کی صلاحیت ان میں موجود ہے لیکن انذار کے بعد وہ عملی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہٹ دھرم، دل کے اندھوں اور غافل لوگوں کے برخلاف کہ جو نہ تو سننے والے کان رکھتے ہیں اور نہ ہی خشیت و خوفِ الٰہی کے لیے آمادگی۔

یہ آیت سورۂ بقرہ کی پہلی آیات کے مانند ہے کہ جن میں فرمایا گیا ہے:

ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدًی للمتقین

"اس کتابِ آسمانی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور یہ پرہیزگاروں کے لیے باعثِ ہدایت ہے۔"

٭ ٭ ٭

۲۔ بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق "ذکر" سے مراد قرآن مجید ہے۔ کیونکہ یہ لفظ قرآن میں بارہا اسی شکل میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے[1]

لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اس سے مراد اس کا لغوی معنی یعنی ہر قسم کا تذکرہ اور نصیحت ہو اور اس میں آیاتِ قرآن اور پیغمبر اکرمؐ اور خدائی رہبروں کے تمام انذار اور پند و نصائح بھی اس کے مفہوم میں شامل ہوں۔

---

[1] سورہ نحل ۔ ۴۴، حٰم السجدۃ ۔ ۴۱، زخرف ۔ ۴۴ اور قمر ۔ ۲۵۔ جبکہ "ذکر" قرآن میں بارہا مطلق ذکر کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

۳۔ "خشیت" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اس خوف کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ احساسِ عظمت موجود ہو نیز "رحمٰن" کی تعبیر کہ جو خدا کی رحمتِ عامہ کی مظہر ہے، یہاں ایک لطیف نکتے کی حامل ہے اور وہ یہ کہ عظمتِ خدا کے خوف کے ساتھ ساتھ وہ اس کی رحمت کی امید بھی رکھتے ہوں تاکہ خوف و رجاء کے دونوں پلڑے ۔ کہ جو تکامل وارتقاء کی طرف مسلسل حرکت کے حامل ہیں ۔ متوازن رہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بعض آیاتِ قرآنی میں رجاء و اُمید کے بارے میں تو "اللہ" کے نام کا ذکر ہوا ہے جو کہ ہیبت و عظمت کا مظہر ہے:

لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاٰخر (احزاب - ۲۱)

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رجاء بھی خوف کے ساتھ ہونا چاہیئے اور خوف رجاء کے ساتھ۔ (غور کیجئے گا)۔

۴۔ "بالغیب" کی تعبیر یہاں پر استدلال و بُرہان کے ذریعے خدا کی شناخت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کی پاک ذات انسانی حواس سے پنہاں ہے۔ صرف دل کی آنکھ سے اور اس کے آثار کے ذریعے اس کے اجلال و جمال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "غیب" یہاں پر لوگوں کی آنکھ سے پنہاں کے معنی میں ہو یعنی اس کا مقام خشیّت و خوف، ریا کے پہلو سے اور لوگوں کی موجودگی میں ہی نہ ہو بلکہ وہ تنہائی میں بھی خشیّت کا حامل ہو۔

بعض نے اسے "قیامت" کے معنی میں تفسیر کیا ہے کیونکہ اس کے واضح مصادیق میں سے وہ امور بھی ہیں کہ جو ہماری حس سے پنہاں ہیں لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۵۔ "فبشرہ" کا لفظ درحقیقت "انذار" کی تکمیل ہے کیونکہ خدا کا پیغمبر ابتدا میں انذار کرتا ہے اور جس وقت فرمانِ خدا کی پیروی اور احساسِ عظمت کے ساتھ خوف پیدا ہو جائے اور اس کے اثرات انسان کے قول و فعل میں ظاہر ہوں، تو وہ بشارت دیتا ہے۔

کس بات کی بشارت دیتا ہے؟ پہلے تو اس بات کی کہ جو انسانی فکر کو ہر دوسری چیز سے زیادہ اپنی طرف مشغول رکھتی ہے اور پھر اُن لغزشوں کے بارے میں کہ جو کبھی کبھار اس سے سرزد ہوتی ہیں ۔ کہ خدائے بزرگ و برتر نے وہ سب بخش دی ہیں۔ اس کے بعد اجرِ کریم اور بہترین جزاء کی بشارت دیتا ہے کہ جس کے مختلف پہلوؤں کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "مغفرت" بھی نکرہ کی شکل میں بیان ہوا ہے اور "اجر کریم" بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے مواقع پر نکرہ کی صورت میں لفظ کا آنا عظمت کے بیان کے لیے ہے۔

٭ ٭ ٭

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "فبشرہ" میں "فاء" کہ جو تفریع کے لیے ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے

کہ مغفرت اور اجر کریم ترتیب وار نصیحت کی پیروی اور پروردگار کے خوف کا نتیجہ ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

گزشتہ آیات میں مومنین اور انبیاء کے انذار کو قبول کرنے والوں کے اجر و ثواب کا ذکر ہے۔ اسی مناسبت سے بعد والی آیت میں مسئلہ معاد و قیامت اور حساب و کتاب اور جزاء کے لیے ثبتِ اعمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "ہم مُردوں کو زندہ کرتے ہیں" (انا نحن نحی الموتٰی)۔

"نحن" (ہم) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس عظیم قدرت کے ہوتے ہوئے کہ جس کا تم سب کو ہمارے متعلق علم ہے مزید کسی بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں ہے کہ بوسیدہ اور گلی سڑی ہڈیاں نئے سرے سے کس طرح زندہ ہوں گی اور لباسِ حیات کس طرح زیبِ تن کریں گی۔

نہ صرف یہ کہ ہم مُردوں کو زندہ کریں گے بلکہ "ہم وہ تمام کچھ کہ جو انہوں نے آگے بھیجا ہے اور اس کے تمام آثار بھی لکھ رہے ہیں" (ونکتب ما قدّموا و اٰثارھم)۔

اس بناء پر کوئی چیز فروگزاشت نہیں ہوگی اور ہر چیز نامۂ اعمال میں روزِ حساب کے لیے محفوظ ہو جائے گی۔

"ما قدّموا" (جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے) ان اعمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو انہوں نے انجام دیئے ہیں اور اُن کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ لیکن "واٰثارھم" کی تعبیر انسان کے ان اعمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو باقی رہ جاتے ہیں اور ان کے آثار معاشرے میں منعکس ہوتے ہیں۔ مثلاً صدقات جاریہ (انسان کی تعمیرات، اوقاف اور ایسے مراکز کہ جو بعد ازاں باقی رہ جاتے ہیں اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں)۔

یہ احتمال بھی آیت کی تفسیر میں موجود ہے کہ "ما قدّموا" تو ان اعمال کی طرف اشارہ ہو کہ جو شخصی جنبہ رکھتے ہیں اور "اٰثارھم" ان کاموں کی طرف کہ جو رواج پا جاتے ہیں اور انسان کے بعد بھی موجب خیر و برکت یا موجب شر و زیاں اور سببِ گناہ بنتے ہیں۔

البتہ آیت کا مفہوم وسیع ہے اور ممکن ہے کہ دونوں تفاسیر اس کے مفہوم میں جمع ہوں۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے اضافہ کیا گیا ہے: "ہم نے تمام چیزوں کا واضح اور آشکار کتاب میں احصار کر دیا ہے" (وکل شیء احصیناہ فی امامٍ مبین)۔

اکثر مفسرین نے یہاں "امام مبین" سے "لوحِ محفوظ" مراد لی ہے۔ یعنی وہ کتاب کہ جس میں اس جہان کے تمام موجودات، واقعات اور اعمال ثبت و محفوظ ہیں۔

نیز "امام" کی تعبیر ممکن ہے کہ اس نظر سے ہو کہ یہ کتاب قیامت میں ثواب و عقاب کے تمام مامورین کے لیے رہبر اور پیشوا ہے اور انسانوں کے اعمال کی قدر و قیمت پرکھنے کے لیے ان کی جزا و سزا کا

ایک معیار ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "امام" قرآن کی بعض دوسری آیات میں "تورات" کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

افمن کان علٰی بینة من ربه و یتلوه شاهد منه ومن قبله کتاب موسٰی اماما ورحمة (ہود۔ ۱۷)

"کیا وہ شخص کہ جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہو اور اسی کی طرف سے اس کے پیچھے ایک شاہد بھی ہو اور اس سے پہلے موسٰی کی کتاب کہ جو امام اور رحمت تھی اس پر گواہی دیتی ہے (اس شخص کی مانند ہے کہ جو ایسا نہیں ہے)"۔

اس آیہ میں لفظ "امام" کا اطلاق تورات پر اس کے معارف و احکام کی بنا پر ہے۔ اسی طرح اس میں بیان شدہ پیغمبر اسلامؐ کی ان نشانیوں کی وجہ سے ہے اور ان تمام امور میں وہ مخلوق کے لیے رہبر و پیشوا بن سکتی ہے۔ اس بنا پر مذکورہ لفظ "امام" ہر موقع پر اس موقع کی مناسبت سے مفہوم دیتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ثبتِ اعمال کی مختلف کتابیں: قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال چند کتابوں میں ثبت ہوتے ہیں تاکہ حساب و کتاب کے وقت کسی شخص کے لیے بھی کسی قسم کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔

پہلی کتاب تو "شخصی نامۂ اعمال" ہے کہ جو ایک فرد کی ساری عمر کے اعمال ثبت کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص سے کہا جائے گا:

اقرأ کتابك کفٰی بنفسك الیوم علیك حسیبا۔

"تو خود ہی اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے، تو خود ہی اپنے نفس کا حساب کرنے کے لیے کافی ہے" (بنی اسرائیل۔ ۱۴)۔

یہ وہ مقام ہے کہ مجرمین کی فریاد بلند ہوگی:

یقولون یاویلتنا مال هٰذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها۔

"وہ کہیں گے کہ وائے ہو ہم پر یہ کیسی کتاب ہے کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا گناہ ایسا نہیں ہے کہ جو اس میں ثبت نہ ہو" (کہف۔ ۴۹)۔

"یہ وہی کتاب ہے کہ جو نیکوکاروں کے دائیں ہاتھ میں اور بدکاروں کے بائیں ہاتھ میں ہوگی" (حاقہ۔ ۱۹ و ۲۵)۔

دوسری کتاب "امتوں کا نامۂ اعمال" ہے، اور ان کی اجتماعی زندگی کے اعمال بیان کرتی ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

کل امة تدعیٰ الیٰ کتابها

"قیامت کے دن ہر امت کو اس کے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائے گا" (جاثیہ - ۲۸)۔

تیسری کتاب اعمال نامۂ جامع و عمومی یعنی لوح محفوظ ہے کہ جس میں نہ صرف اولین و آخرین کے تمام انسانوں کے اعمال بلکہ عالم کے تمام واقعات یکجا ثبت ہیں۔ یہ قیامت کے اس عظیم موقع پر آدمی کے اعمال پہ ایک اور گواہ ہے اور حقیقت میں یہ کتاب حساب و کتاب کے فرشتوں اور جزاء و سزا کے ملائکہ کے لیے امام و رہبر ہے [1]

٭ ٭ ٭

۲۔ ہر چیز ثبت ہوتی ہے: ایک گویا اور بیدار کرنے والی حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

ان رسول الله نزل بارض قرعاء فقال لاصحابه: ائتوا بحطب، فقالوا: یارسول الله نحن بارض قرعاء! قال فلیأت کل انسان بما قدر علیه، فجاءوا به حتی رموا بین یدیه، بعضه علی بعض، فقال رسول الله (ص) هکذا تجمع الذنوب ثم قال ایاکم والمحقرات من الذنوب، فان لکل شیء طالبًا الا وان طالبها یکتب ما قدموا وآثارهم وکل شیء احصیناه فی امام مبین۔

رسولِ خداؐ ایک بے آب و گیاہ علاقے میں پہنچے تو آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: لکڑیاں اور ایندھن اکٹھا کرکے لاؤ۔

انہوں نے عرض کیا: اے خدا کے رسولؐ! یہ خشک سرزمین ہے کہ جس میں کوئی لکڑی اور ایندھن نہیں ہے۔

آپؐ نے فرمایا: تم جاؤ اور تم میں سے جس سے جتنا ہو سکتا ہے جمع کرے۔

ان میں سے ہر ایک تھوڑا سا ایندھن اور خشک لکڑی لے آیا اور اسے پیغمبر خداؐ کے سامنے ایک دوسرے پر ڈال دیا (اسے آگ لگائی گئی تو اس سے بڑے بڑے شعلے

---

[1] "لوح محفوظ" کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۵ میں سورہ رعد کی آیہ ۳۹ کے ذیل میں اور اسی طرح جلد ۳ میں سورۂ انعام کی آیہ ۵۹ کے ذیل میں بحث کی ہے۔

بھڑکنے لگے)۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: اس طرح سے (چھوٹے چھوٹے) گناہ ایک دوسرے میں جمع ہوتے جاتے ہیں (اور تم ان کو فرداً فرداً ایک سمجھ کر اہمیت نہیں دیتے)۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: چھوٹے چھوٹے گناہوں سے ڈرو کیونکہ ہر چیز کا ایک حساب کنندہ ہے اور جو کچھ تم نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ اس کے آثار باقی رہ گئے ہیں اس کا حساب کنندہ اُسے لکھتا ہے اور اس نے ہر چیز کو کتابِ مبین میں ثبت کیا ہے[1]

یہ ہلا دینے والی حدیث اس امر کی منہ بولتی تصویر ہے کہ جب چھوٹے چھوٹے گناہ جمع ہوتے ہیں تو ان کا مجموعہ ایک بہت بڑی آگ کا سامان بن جاتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ قبیلہ "بنو سلمہ" مدینہ سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ انہوں نے مسجد نبوی کے قریب نقل مکانی کرنے کا ارادہ کیا تو زیر بحث آیت نازل ہوئی (انا نحن نحی الموتٰی .....) تو پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا: "ان اٰثارکم تکتب" تمہارے آثار (مسجد کی طرف آنے کے لیے تمہارے قدم) تمہارے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں گے (اور ان کا اجر و ثواب تمہیں ملے گا) جب بنی سلمہ نے یہ سنا تو انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اپنی اسی جگہ پر رہ گئے[2]

واضح رہے کہ یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور ان امور میں سے ہر ایک اس کا ایک مصداق ہے۔

وہ چیز کہ جو ممکن ہے ابتدائی نظر میں اوپر والی تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ متصور نہ ہو، اہل بیتؑ سے مروی وہ روایات ہیں کہ جن میں "امام مبین" سے امیرالمومنین مراد لیے گئے ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث امام باقرؑ سے مروی ہے۔ آپؑ نے اپنے والد گرامی سے اور انہوں نے اپنے دادا سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس وقت یہ آیہ: "وکل شیء احصیناہ فی امام مبین" نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر و عمر کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! کیا اس سے مراد تورات ہے؟ فرمایا نہیں! عرض کیا: انجیل ہے؟ فرمایا نہیں! عرض کیا: قرآن ہے؟ فرمایا نہیں! اسی حالت میں امیرالمومنین علیؑ رسول اللہؐ کی طرف آئے جس وقت آپؐ کی نگاہ ان پر پڑی تو فرمایا:

هو هذا! انه الامام الذی احصی الله تبارك و تعالٰی فيه علم كل شیء۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۷۸۔

[2] تفسیر قرطبی میں یہ حدیث ابوسعید خدری سے صحیح ترمذی سے نقل ہوئی ہے اور اس کے مشابہ حدیث صحیح مسلم میں "جابر بن عبداللہ انصاری" سے بھی منقول ہے دوسرے مفسرین مثلاً آلوسی، فخر رازی، طبرسی اور علامہ طباطبائی نے بھی اسے کچھ فرق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

"امام مبین یہ شخص ہے یہی ہے وہ امام کہ جس میں خداوند تعالٰی نے ہر چیز کے علم کا احصار کر دیا ہے"۔[1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں ابنِ عباس کے واسطہ سے خود امیرالمومنین سے بھی نقل ہُوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

انا واللہ الامام المبین ابین الحق من الباطل ورثتہ من رسول اللہ

"خدا کی قسم! مَیں وہ امام مبین ہوں کہ جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے۔ یہ علم مَیں نے رسول اللہؐ سے ورثہ میں حاصل کیا ہے اور اُن سے سیکھا ہے"[2]

اگرچہ بعض مفسرین ــ جیسے آلوسی ــ نے شیعہ حوالوں سے ایسی روایات نقل کرنے سے خوف کھایا ہے اور اسے تفسیر آیہ سے بے خبری اور نادانی کی طرف منسوب کیا ہے لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی روایات "امام مبین" کی "لوح محفوظ" کے ساتھ تفسیر کے منافی نہیں ہیں کیونکہ پیغمبرؐ کا پاک دل پہلے درجہ میں اور ان کے جانشین کا دل دوسرے درجہ میں ایسے آئینے ہیں کہ جو لوح محفوظ کو منعکس کرتے ہیں اور ان علوم کا ایک عظیم حصّہ کہ جو "لوح محفوظ" میں ہے خدا کی طرف سے ان کی طرف الہام ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ "لوح محفوظ" کا ایک نمونہ ہیں۔ اس بنا پر "امام مبین" کا اطلاق اس مطلب پر کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ایسی شاخ ہے کہ جو اسی جڑ کی طرف لوٹتی ہے۔

اس سے قطع نظر جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسان کامل کا وجود ایک "عالم صغیر" ہے کہ جس میں عالم کبیر سمایا ہُوا ہے اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف یہ شعر منسوب ہے:

اتزعم انک جرم صغیر؟ وفیک انطوی العالم الاکبر!

"کیا تُو یہ گمان کرتا ہے کہ تُو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ عالم کبیر تجھ میں سمو دیا گیا ہے"۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عالم ہستی ایک لحاظ سے علم خدا اور لوح محفوظ کا ایک صفحہ ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ آلوسی نے باوجودیکہ مذکورہ روایات کا شدت سے انکار کیا ہے تاہم آخری تفسیر کو چنداں بعید نہیں سمجھا۔

بہرحال اس بات میں کہ "امام مبین" سے مراد "لوح محفوظ" ہی ہے کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ مذکورہ روایات بھی اس پر قابلِ تطبیق ہیں۔ (غور کیجئے گا)۔

---

[1] "معانی الاخبار صدوق" باب معنی الامام المبین ص۹۵۔

[2] نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۷۹۔

(۱۳) وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۚ○

(۱۴) اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ○

(۱۵) قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ○

(۱۶) قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ○

(۱۷) وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

(۱۸) قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(۱۹) قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۳) اُن سے بستی والوں کی مثال بیان کیجئے کہ جس وقت خدا کے رسول ان کی طرف آئے۔

(۱۴) جبکہ ہم نے دو رسول ان کی طرف بھیجے لیکن انہوں نے (ہمارے) رسولوں کی تکذیب کی۔ اس لیے ہم نے ان دونوں کی تقویت کے لیے تیسرے کو بھیجا

اُن سب نے کہا کہ ہم تمہاری طرف (خدا کے) بھیجے ہوئے ہیں۔

(۱۵) لیکن انہوں نے (جواب میں کہا) کہ تم تو ہم جیسے بشر کے سوا اور کچھ نہیں ہو اور خداوند رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے تم صرف جھوٹ بولتے ہو۔

(۱۶) انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار آگاہ ہے کہ ہم یقینی طور پر تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔

(۱۷) اور ہمارے ذمہ تو واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

(۱۸) انہوں نے کہا کہ ہم تو تمہیں اپنے لیے فالِ بد سمجھتے ہیں (اور تمہارا وجود منحوس ہے) اور اگر تم ان باتوں سے دستبردار نہ ہوگے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی۔

(۱۹) انہوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تو خود تمہاری ہی طرف سے ہے، اگر تم اچھی طرح سے غور کرو، بلکہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو۔

تفسیر

بستی والوں کی سرگزشت ایک عبرت ہے

قبل ازیں قرآن، پیغمبرِ اسلامؐ کی نبوت، سچے مومنین اور ہٹ دھرم منکرین کے بارے میں بحث گزری ہے۔ زیرِ بحث آیات میں اس ضمن میں گزشتہ امتوں کی کیفیت کا ایک نمونہ بیان ہو رہا ہے۔ ان آیات اور بعد والی چند آیات کے ضمن میں کہ جو مجموعی طور پر ۱۸ آیات بنتی ہیں، چند گزشتہ پیغمبروں کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ یہ انبیاء ایک مشرک اور بت پرست قوم کی ہدایت کے لیے مامور ہوئے تھے۔ قرآن نے انہیں "اصحاب القریہ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ لوگ مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے اور انجام کار عذاب میں گرفتار ہوئے ۔۔ یہ سرگزشت اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ مشرکین مکہ کے لیے تنبیہ ہو اور پیغمبرِ اکرمؐ اور اس وقت کے تھوڑے سے مومنین کے لیے تسلی کا باعث ہو۔

بہرحال اس سورہ کے قلب میں کہ جو خود قرآن کا دل ہے اس سرگزشت کا ذکر اس زمانے کے مسلمانوں سے اس کی کامل شباہت کی بنا پر ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "تم ان سے بستی والوں کی مثال بیان کرو کہ جس وقت خدا کے رسول ان کی طرف آئے" (واضرب لهم مثلًا اصحاب القرية اذ جاءها المرسلون)۔[1]

"قرية" اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جہاں لوگ جمع ہوں اور کبھی خود انسانوں کو بھی "قرية" کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جو شہروں کے لیے بھی ہے اور دیہات کے لیے بھی، اگرچہ فارسی زبان میں عام طور پر صرف دیہات کے لیے بولا جاتا ہے لیکن عربی زبان میں اور قرآن مجید میں بارہا اہم شہروں اور علاقوں مثلاً مصر اور مکہ وغیرہ پر اطلاق ہوا ہے۔

اس بارے میں کہ شہروں میں سے یہ کونسا شہر تھا، چنانچہ مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ وہ شامات کے شہروں میں سے "انطاکیہ" تھا اور یہ قدیم روم کے مشہور شہروں میں سے تھا اور اب بھی جغرافیائی لحاظ سے ترکی کا حصہ ہے۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل ہم نکات میں بیان کریں گے۔

بہرحال اس سورہ کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شہر کے رہنے والے بت پرست تھے اور یہ رسول انہیں توحید کی دعوت دینے اور شرک کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے ان کے پاس آئے تھے۔

⁂

قرآن اس اجمالی بیان کے بعد ان کے قصے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ وقت کہ جب ہم نے دو رسولوں کو اُن کی طرف بھیجا لیکن انہوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی، لہٰذا ہم نے ان دو کی تقویت کے لیے تیسرا رسول بھیجا، ان تینوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف خدا کے بھیجے ہوئے ہیں" (اذ ارسلنا اليهم اثنين فكذبوهما فعززنا بثالث فقالوا انا اليكم مرسلون)۔[2]

اس طرح پروردگار کے تین رسول اس گمراہ قوم کی طرف آئے (دو پہلے آئے اور ایک بعد ازاں ان کی تقویت کے لیے)۔

اس بارے میں کہ یہ رسول کون تھے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ ان دو

---

[1] بعض کا نظریہ ہے کہ "اصحاب القرية"، "اضرب" کا پہلا مفعول ہے اور "مثلاً" اس کا دوسرا مفعول ہے کہ جو پہلے مفعول پر مقدم ہوا ہے اور بعض نے اسے "مثلاً" کا بدل مراد لیا ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

[2] بعض مفسرین نے لفظ "اذ" کو یہاں "اصحاب القرية" کا بدل مراد لیا ہے اور بعض — اسے فعل محذوف یعنی "اذكر" سے متعلق سمجھتے ہیں۔

کے نام "شمعون" اور "یوحنا" تھے اور تیسرے کا نام "پولس" تھا اور بعض نے ان کے دوسرے نام ذکر کیے ہیں۔

اس بارے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر اور رسول تھے یا حضرت مسیحؑ کے بھیجے ہوئے اور ان کے نمائندے تھے (اور اگر خدا یہ فرماتا ہے کہ ہم نے انہیں بھیجا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیح کے بھیجے ہوئے بھی خدا ہی کے رسول ہیں)۔ زیر بحث آیات کا ظاہر پہلی تفسیر کے موافق ہے اگرچہ اس نتیجہ میں کہ جو قرآن لینا چاہتا ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

٭ ٭ ٭

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس گمراہ قوم نے ان رسولوں کی دعوت پر کیا ردعمل ظاہر کیا؟ قرآن کہتا ہے، انہوں نے بھی وہی بہانہ کیا کہ جو بہت سے سرکش کافروں نے گزشتہ خدائی پیغمبروں کے جواب میں کیا تھا، "انہوں نے کہا، تم تو ہم ہی جیسے بشر ہو اور خدائے رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے۔ تمہارے پاس جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے"۔ (قالوا ما انتم الا بشر مثلنا وما انزل الرحمٰن من شیء ان انتم الا تکذبون)۔

اگر خدا کی طرف سے کوئی بھیجا ہوا ہی آنا تھا تو کوئی مقرب فرشتہ ہونا چاہیئے تھا، نہ کہ ہم جیسا انسان اور اسی امر کو انہوں نے رسولوں کی تکذیب اور فرمانِ الٰہی کے نزول کے انکار کی دلیل خیال کیا۔

حالانکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ پوری تاریخ میں سب رسول نسلِ آدمؑ ہی سے ہوئے ہیں ان میں حضرت ابراہیمؑ بھی تھے کہ جن کی رسالت سب مانتے تھے، یقیناً وہ انسان ہی تھے۔ اس سے قطع نظر کیا انسانوں کی ضروریات، مشکلات اور تکلیفیں انسان کے علاوہ کوئی اور سمجھ سکتا ہے[1]

آیت میں خدا کی صفتِ رحمانیت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ممکن ہے کہ یہ اس لحاظ سے ہو کہ خدا ان کی بات کو نقل کرتے ہوئے خصوصیت سے اس صفت کا ذکر کرتا ہے تاکہ ان کا جواب خود ان کی بات ہی سے حل ہو جائے۔ کیونکہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کہ جس کی رحمتِ عامہ نے سارے عالم کو گھیر رکھا ہے وہ انسانوں کی تربیت اور رشد و تکامل کی طرف دعوت دینے کے لیے پیغمبر نہ بھیجے؟

یہ احتمال بھی ہے کہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ وصفِ رحمٰن کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ خداوند مہربان اپنے بندوں کا کام پیغمبروں کے بھیجنے اور مشکل ذمہ داریاں عائد کرنے سے نہیں کرتا وہ تو آزاد رکھتا ہے۔ یہ کمزور اور بے بنیاد منطق اس گروہ کے انکار کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔

---

[1] پیغمبروں اور امتوں کے ہم نوع ہونے کے فلسفہ کے بارے میں ہم جلد ۹ صفحہ ۲۰۴ (سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۹۴ کے ذیل میں) تفصیل سے بحث کر چکے ہیں (اردو ترجمہ دیکھیے)۔

بہرحال یہ پیغمبر اس گمراہ قوم کی شدید اور سخت مخالفت کے باوجود مایوس نہ ہوئے اور انہوں نے کمزوری نہ دکھائی اور ان کے جواب میں کہا: ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ یقیناً ہم تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں" (قالوا ربنا یعلم انّا الیکم لمرسلون)۔

"اور ہمارے ذمہ تو واضح اور آشکار طور پر ابلاغ رسالت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے" (وما علینا الّا البلاغ المبین)۔

مسلمہ طور پر انہوں نے صرف دعویٰ ہی نہیں کیا اور قسم پر ہی قناعت نہیں کی، بلکہ "بلاغ مبین" کی تعبیر سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے دلائل و معجزات بھی پیش کیے تھے ورنہ ان کا ابلاغ "بلاغ مبین" کا مصداق نہ ہوتا کیونکہ "بلاغ مبین" تو اس طرح ہونا چاہیئے کہ حقیقت سب تک پہنچ جائے اور یہ بات یقینی اور محکم دلائل اور واضح معجزات کے سوا ممکن نہیں ہے۔

بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کی طرح بعض ناقابل علاج بیماروں کو، حکم خدا سے، شفا بخشی۔

لیکن یہ دل کے اندھے واضح منطق اور معجزات کے سامنے نہ صرف جھکے نہیں بلکہ انہوں نے اپنی خشونت اور سختی میں اضافہ کر دیا اور تکذیب کے مرحلے سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے تہدید اور شدتِ عمل کے مرحلے میں داخل ہو گئے "انہوں نے کہا: ہم تو تمہیں فال بد سمجھتے ہیں تمہارا وجود منحوس ہے اور تم ہمارے شہر کے لیے بدبختی کا سبب ہو" (قالوا انّا تطیرنا بکم)[1]

ممکن ہے کہ ان انبیاء الٰہی کے آنے کے ساتھ ہی اس شہر کے لوگوں کی زندگی میں ان کے گناہوں کے زیر اثر یا خدائی تنبیہ کے طور پر بعض مشکلات پیش آئی ہوں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے نقل بھی کیا ہے کہ ایک مدت تک بارش کا نزول منقطع رہا[2] لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ کوئی عبرت حاصل نہیں کی بلکہ اس امر کو پیغمبروں کی دعوت کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

پھر اس پر بس نہیں کی بلکہ کھلی دھمکیوں کے ساتھ اپنی قبیح نیتوں کو ظاہر کیا اور کہا "اگر تم ان باتوں سے دستبردار نہ ہوئے تو ہم یقینی طور پر تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی" (لئن لم تنتھوا لنرجمنکم ولیمسنکم منّا عذاب الیم)۔

کیا دردناک سزا (عذاب الیم) سنگسار کرنے کے بارے میں تاکید ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور

---

[1] "تطیّر" کے بارے میں اور فال بد لینے اور اس لفظ کے بنیادی مفہوم کے متعلق ہم نے جلد ۲ میں سورہ اعراف کی آیہ ۱۳۱ کے ذیل میں اور جلد ۸ میں سورہ نمل کی آیہ ۴۷ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

[2] تفسیر قرطبی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

سزا ہے؟ یہ دو احتمال ہیں۔

دوسرا احتمال ہمیں زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔ کیونکہ سنگسار کرنا سزا کی بدترین قسم ہے جو کبھی کبھی موت پر بھی منتج ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ "عذاب الیم" کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہم تمہیں یہاں تک سنگسار کریں گے کہ وہ تمہاری موت کا سبب بن جائے یا یہ کہ سنگسار کرنے کے علاوہ دوسری قسم کی سختیاں ہوں کہ جو گزشتہ زمانے کے ظالم لوگ کیا کرتے تھے۔ مثلاً سلائیاں گرم کرکے آنکھوں میں داخل کرنا یا پگھلی ہوئی دھات حلق میں ڈالنا اور اسی قسم کے دوسرے عذاب بھی ہم تمہیں دیں گے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ سنگسار کرنا تو جسمانی عذاب تھا لیکن "عذاب الیم" روحانی عذاب تھا۔[1]

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ہاں! باطل کے طرفدار اور ظلم و فساد کے حامی چونکہ کوئی منطق پیش کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے لہٰذا ہمیشہ دھمکیوں، دباؤ اور تشدد کا سہارا لیتے ہیں، وہ اس بات سے غافل ہیں کہ راہِ خدا کے راہرو اس قسم کی دھمکیوں کے آگے نہیں جھکتے بلکہ ان کی استقامت میں اور اضافہ ہوتا ہے جس دن انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے اسی روز اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایثار و قربانی کے لیے آمادہ ہوگئے ہیں۔

*

یہ وہ مقام تھا کہ خدا کے پیغمبر اپنی منہ بولتی منطق کے ساتھ ان کی فضول ہذیانی باتوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گئے اور "انہوں نے کہا: تمہاری بدبختی اور نحوست خود تمہاری ہی طرف سے ہے اور اگر تم ٹھیک طرح سے غور کرو تو اس حقیقت سے واقف ہو جاؤ گے" (قالوا طائرکم معکم ائن ذکرتم)۔

اگر بدبختی اور منحوس حوادث تمہارے معاشرے کو گھیرے ہوئے ہیں اور برکات الٰہیہ تمہارے درمیان میں سے اُٹھ گئی ہیں تو اس کا عامل اپنے اندر اپنے پست افکار اور قبیح اعمال میں تلاش کرو نہ کہ ہماری دعوت میں۔ یہ تمہیں تو ہو کہ جنہوں نے بُت پرستی، خود غرضی، ظلم اور شہوت پرستی سے اپنی زندگی کی فضا کو تیرہ و تاریک بنا ڈالا ہے اور خدا کی برکات کو اپنے آپ سے منقطع کرکے رکھ دیا ہے۔

بعض مفسرین نے "ائن ذکرتم" کو ایک مستقل مطلب کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا کے نبی آئیں اور تمہیں نصیحت کریں اور ڈرائیں تو کیا اس کی جزا یہ ہے کہ تم انہیں عذاب اور سزا کی دھمکیاں دو اور ان کے وجود کو منحوس خیال کرو؟ وہ تو تمہارے لیے نور و

---

[1] اور یہ اس صورت میں ہے کہ "لنرجمنکم" "رجم" کے مادہ سے گالیاں دینے، ناسزا کہنے اور تہمت لگانے کے معنی میں ہو۔

ہدایت اور خیر و برکت کا تحفہ لائے ہیں تو کیا اس خدمت کا جواب وہ دھمکیاں اور بد کلامیاں ہیں جو رات دن تم انہیں دیتے رہتے ہو۔[1]

آخرکار پروردگار کے ان بھیجے ہوئے افراد کی آخری گفتگو ان سے یہ تھی کہ "تم حد سے بڑھے ہوئے اور تجاوز کرنے والے لوگ ہو" (بل انتم قوم مسرفون)۔

تمہاری اصلی بیماری وہی تمہارا حد سے تجاوز ہے اگر تم توحید کا انکار کرتے ہوئے شرک کی طرف رُخ کرتے ہو تو اس کی وجہ حق سے تجاوز ہے اور اگر تمہارا معاشرہ بُرے انجام میں گرفتار ہوا ہے تو اس کا سبب بھی گناہ میں زیادتی اور شہوات میں آلودگی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر خیر خواہوں کی خیر خواہی کے جواب میں تم انہیں موت کی دھمکی دیتے ہو تو یہ بھی تمہارے تجاوز کی بنا پر ہے۔

ہم ان رسولوں کے تاریخی واقعہ اور ان حوادث کے وقوع کے مقام کے بارے میں اس داستان کی باقی ماندہ آیات کی تفسیر کے بعد تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

---

[1] بہرحال جملہ شرطیہ کی جزا محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: ائن ذکرتم قابلتمونا بھذہ الامور۔ یا ائن ذکرتم علمتم صدق ما قلنا۔

(۲۰) وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝

(۲۱) اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

(۲۲) وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

(۲۳) ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۝

(۲۴) اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(۲۵) اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۝

(۲۶) قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝

(۲۷) بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝

(۲۸) وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝

(۲۹) اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝

(۳۰) يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

ترجمہ

(۲۰) ایک (باایمان) مرد شہر کے دور دراز مقام سے دوڑتا ہوا آیا (اور) اُس

نے کہا : اے میری قوم ! رسولانِ خدا کی پیروی کر لو۔

(۲۱) ایسے لوگوں کی پیروی کر لو کہ جو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے اور وہ خود ہدایت یافتہ ہیں۔

(۲۲) مَیں کیوں اس ہستی کی پرستش نہ کروں کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

(۲۳) کیا مَیں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود اپنا لوں جبکہ خدائے رحمٰن چاہے کہ مجھے نقصان پہنچے تو اُن کی شفاعت میرے لیے کچھ بھی فائدہ مند نہ ہو اور نہ ہی وہ مجھے (اس کے عذاب سے) نجات دلا سکیں۔

(۲۴) اگر مَیں ایسا کروں تو پھر تو مَیں کھلی گمراہی میں ہوں گا۔

(۲۵) (اسی بنا پر) میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں، میری باتیں کان لگا کر سنو۔

(۲۶) (آخرکار انہوں نے اُسے شہید کر دیا) اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا تو اس نے کہا کہ اے کاش میری قوم کو علم ہوتا۔

(۲۷) کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا ہے اور مکرم و محترم لوگوں میں سے قرار دیا ہے۔

(۲۸) ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے نہیں بھیجا اور نہ ہی ہماری یہ سنت تھی۔

(۲۹) صرف ایک آسمانی للکار تھی، پس اچانک سب خاموش ہو گئے۔

(۳۰) افسوس ہے ان بندوں پر کہ جن کی ہدایت کے لیے جو بھی پیغمبر آیا وہ اس کا مذاق اُڑاتے رہے۔

تفسیر

ایک جان بکف مجاھد

زیرِ بحث آیات میں ان رسولوں کی جدوجہد کا ایک اور حصّہ بیان کیا گیا ہے۔ اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے تھوڑے سے مومنین نے بڑی شجاعت سے ان انبیاء کی حمایت کی اور وہ کافر ومشرک اور ہٹ دھرم اکثریت کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور جب تک جان باقی رہی انبیاء الٰہی کا ساتھ دیتے رہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "ایک (باایمان) مرد شہر کے دور دراز مقام سے بڑی تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا کافر گروہ کے پاس آیا اور کہا: اے میری قوم! مرسلین خدا کی پیروی کرو" (وجاء من اقصا المدینة رجل یسعٰی قال یاقوم اتبعوا المرسلین)۔

اس شخص کا نام اکثر مفسرین نے "حبیب نجار" بیان کیا ہے۔ وہ ایسا شخص تھا کہ جو پروردگار کے پیغمبروں کی پہلی ہی ملاقات میں ان کی دعوت کی حقانیت اور ان کی تعلیمات کی گہرائی کو پا گیا تھا وہ ایک ثابت قدم اور مصمم کار مومن ثابت ہوا۔ جس وقت اُسے خبر ملی کہ وسطِ شہر میں لوگ ان انبیاء الٰہی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور شاید انہیں شہید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس نے خاموش رہنے کو جائز نہ سمجھا۔ چنانچہ "یسعٰی" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی تیزی اور جلدی کے ساتھ مرکزِ شہر تک پہنچا اور جو کچھ اس کے بس میں تھا حق کی حمایت اور دفاع میں فروگزاشت نہ کی۔

"رجل" کی تعبیر ناشناختہ شکل میں شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک عام آدمی تھا، کوئی قدرت وشوکت نہیں رکھتا تھا اور اپنی راہ میں یکہ وتنہا تھا لیکن اس کے باوجود ایمان کے نور وحرارت نے اس کا دل اس طرح سے روشن اور مستعد کر رکھا تھا کہ راہِ توحید کے مخالفین کی سخت مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میدان میں کود پڑا۔ اس کا واقعہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ آغازِ اسلام میں مومنین کہ جو بہت تھوڑی سی تعداد میں تھے اسے اپنے لیے نمونۂ عمل سمجھیں اور جان لیں کہ تنہا ایک مومن بھی پوری طرح ذمہ دار ہوتا ہے، اور اس کے لیے خاموش رہنا جائز نہیں ہے۔

"اقصی المدینة" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان رسولوں کی دعوت شہر کے دور دراز کے مقامات تک پہنچ گئی تھی اور آمادہ دلوں میں اثر کر چکی تھی۔ اس سے قطع نظر کہ شہر کے دور دراز

کے علاقے ہمیشہ ایسے مستضعفین کے مرکز ہوتے ہیں کہ جو حق کو قبول کرنے کے لیے زیادہ آمادہ و تیار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس شہروں میں نسبتاً خوشحال لوگ زندگی بسر کرتے ہیں جن کو حق کی طرف راغب کرنا آسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

"یا قوم" (اے میری قوم) کی تعبیر اس شخص کی اہلِ شہر کے بارے میں ہمدردی کو بیان کرتی ہے اور رسولوں کی پیروی کی دعوت ایک مخلصانہ دعوت ہے جس میں اس کی ذات کے لیے کوئی فائدہ اور نفع نہیں ہے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ یہ مومن مجاہد اپنے شہر والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کس منطق اور دلیل کو اختیار کرتا ہے۔

اس نے پہلے یہ دلیل اختیار کی کہ: "ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے اپنی دعوت کے بدلے میں کوئی اجر طلب نہیں کرتے" (اتبعوا من لا یسئلکم اجرًا)۔

یہ ان کی صداقت کی پہلی نشانی ہے کہ ان کی دعوت میں کسی قسم کی مادی منفعت نہیں ہے۔ وہ تم سے کوئی مال چاہتے ہیں اور نہ ہی جاہ و مقام، یہاں تک کہ وہ تو تشکر و سپاس گزاری بھی نہیں چاہتے اور نہ ہی کوئی اور صلہ۔

عظیم انبیاء کے خلوص، بے غرضی اور اُن کی صفائے قلب کی نشانی کے طور پر بارہا آیات قرآنی میں اس بات کا ذکر آیا ہے۔ صرف سورۂ شعراء میں پانچ مرتبہ "وما اسئلکم علیه من اجر" کی تکرار ہے[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: (علاوہ ازیں) یہ رسول جیسا ان کی دعوت کے مطالب اور ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے "کہ وہ ہدایت یافتہ افراد ہیں" (وھم مھتدون)۔

یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کسی کی دعوت کو قبول نہ کرنا یا تو اس بناء پر ہوتا ہے کہ اس کی دعوت حق نہیں ہے اور وہ بے راہ روی اور گمراہی کی طرف کھینچ رہا ہے یا یہ کہ ہے تو حق لیکن اس کو پیش کرنے والے اس کے ذریعے کوئی خاص مفاد حاصل کر رہے ہیں کیونکہ یہ بات خود اس قسم کی دعوت کے بارے میں بدگمانی کا ایک سبب ہے لیکن جب نہ وہ بات ہو اور نہ یہ، تو پھر تامل و تردد کے کیا معنی؟

⁂ ⁂ ⁂

اس کے بعد قرآن ایک اور دلیل پیش کرتا ہے اور اصل توحید کے بارے میں بات کرتا ہے کیونکہ یہی انبیاء کی دعوت کا اہم ترین نکتہ ہے۔ کہتا ہے: "میں اس ہستی کی پرستش کیوں نہ کروں کہ جس نے مجھے پیدا

---

[1] سورہ شعراء آیہ ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰

کیا ہے "(ومالی لا اعبد الذی فطرنی) [1]

وہ ہستی پرستش کے لائق ہے کہ جو خالق و مالک ہے اور نعمات بخشنے والی ہے، نہ کہ یہ بُت کہ جن سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ فطرت سلیم کہتی ہے کہ خالق کی عبادت کرنا چاہیئے نہ کہ اس بے قدر و قیمت مخلوق کی۔

"فطرنی" (جس نے مجھے پیدا کیا ہے) ممکن ہے اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو کہ میں جس وقت اپنی فطرتِ اصلی اور سرشتِ حقیقی پر غور کرتا ہوں تو اچھی طرح سے محسوس کرتا ہوں کہ میرے اندر سے ایک ایسی رَسا آواز بلند ہوتی ہے کہ جو مجھے میرے خالق کی پرستش کی طرف دعوت دے رہی ہے۔ وہ دعوت کہ جو عقل و خرد کے ساتھ ہم آہنگ ہے، میں "فطرت" اور "عقل و خرد" کی اس دُہری دعوت کو کس طرح اہمیت نہ دوں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ شخص یہ نہیں کہتا کہ "مالکم لا تعبدون الذی فطرکم" (تم اس خدا کی عبادت کیوں نہیں کرتے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے) بلکہ کہتا ہے کہ "مَیں کیوں اس طرح نہ کروں" یعنی خود اپنے آپ سے شروع کرتا ہے تاکہ بات زیادہ مؤثر ہو۔

اس کے بعد خبردار کرتا ہے کہ یاد رکھو "تم سب کے سب آخرکار اکیلے ہی اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے" (والیہ ترجعون)۔

یعنی نہ صرف تمہارا اس جہان کی زندگی میں اس کے ساتھ تعلق ہے بلکہ دوسرے جہان میں بھی تمہاری ساری سرنوشت اسی کے دستِ قدرت میں ہوگی ہاں! اسی کی طرف رُخ کرو کہ دونوں جہانوں میں تمہاری سرنوشت جس کے اختیار میں ہے۔

٭ ٭ ٭

اپنے تیسرے استدلال میں بُتوں کی کیفیت بیان کرتا ہے اور خدا کے لیے عبودیت کے اثبات کو، بتوں کی عبودیت کی نفی کے ذریعے تکمیل کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا مَیں خدا کے سوا اور معبود اپنالوں۔ جبکہ خدائے رحمٰن مجھے کچھ نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے معمولی سا فائدہ بھی نہ دے گی اور وہ مجھے اس کے عذاب سے نہ بچا سکیں گے" (ءاتخذ من دونہ الھۃ ان یردن الرحمٰن بضر لا تغن عنی شفاعتھم شیئًا ولا ینقذون)۔

اس مقام پر پھر اپنے بارے میں بات کرتا ہے تاکہ تحکم اور آمریت کا لہجہ نہ ہو اور دوسرے اپنا حساب

---

[1] "ومالی لا اعبد ...." میں کچھ محذوف ہے اور وہ تقدیر میں اس طرح تھا،

ای شیء لی اذا لم اعبد خالقی (مجمع البیان)۔

بعض مفسرین نے "مالی" کو "لمو" "کیوں" کے معنی میں لیا ہے۔ (تبیان زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

وہ دراصل بُت پرستوں کے بہانے کی نشاندہی کرتا ہے: وہ کہتے تھے کہ ہم تو ان کی اس بناء پر پرستش کرتے ہیں کہ وہ بارگاہِ خدا میں ہمارے شفیع ہوں۔ کہتا ہے: کونسی شفاعت اور کونسی مدد و نجات؟ وہ تو خود تمہاری مدد کے محتاج ہیں، حوادث کی تنگنائے میں وہ تمہارا کیا کام دے سکتے ہیں۔

"الرحمٰن" کی تعبیر یہاں پر خدا کی رحمت کی وسعت اور تمام نعمتوں کی اسی کی طرف بازگشت ہونے کی جانب اشارہ ہے اور یہ خود توحیدِ عبادت کی دلیل ہے اس کے علاوہ یہ اس نکتہ کو بھی بیان کرتی ہے کہ خدائے رحمٰن کسی کے لیے ضرر اور نقصان نہیں چاہتا مگر یہ کہ انسان کی غلط روش اپنے انتہائی درجہ کو پہنچ جائے جو اس کو خدا کی وسیع رحمت سے دور کر کے اس کے غضب کی وادی میں گرفتار کر دے۔

اس کے بعد یہ مجاہد مومن مزید تاکید و توضیح کے لیے کہتا ہے: "اگر میں اس قسم کے بتوں کی پرستش کروں اور انہیں پروردگار کا شریک قرار دوں تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا" (انی اذاً لفی ضلال مبین)۔

اس سے بڑھ کر کھلی گمراہی کیا ہوگی کہ عاقل و باشعور انسان ان بے شعور موجودات کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور انہیں زمین و آسمان کے خالق کے برابر جانے۔

اس مجاہد مومن نے ان استدلالات اور مؤثر و وسیع تبلیغات کے بعد ایک پُر تاثیر آواز کے ساتھ سارے مجمع کے سامنے اعلان کیا سب لوگ جان لو کہ میں ان رسولوں کی دعوت پر ایمان لایا ہوں اور میں نے ان رسولوں کی دعوت کو قبول کر لیا ہے" (انی اٰمنت بربکم)۔

"اس بناء پر میری باتوں کو سنو، اور جان لو کہ میں ان رسولوں کی دعوت پر ایمان رکھتا ہوں اور تم میری بات پر عمل کرو کہ یہی تمہارے فائدہ کی بات ہے (فاسمعون)۔

اس جملے میں اور اسی طرح "انی اٰمنت بربکم" میں، مخاطب کون ہے؟ اس بارے میں یہ عرض ہے کہ گزشتہ آیات کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہی مشرکین اور بت پرستوں کا گروہ ہے کہ جو اس شہر میں رہتا تھا۔ "ربکم" (تمہارا پروردگار) کی تعبیر بھی اس معنی سے تضاد نہیں رکھتی کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں انہی استدلالات توحید بیان کرتے ہوئے آئی ہے [1]

نیز "فاسمعون" (میری بات پر کان دھرو) بھی اس بات کے ساتھ کہ جو بیان ہوئی کوئی مخالفت نہیں رکھتا کیونکہ وہ یہ لفظ انہیں اپنی گفتگو کی پیروی کرنے کی دعوت کے لیے کہتا ہے۔ جیسا کہ مومن آلِ فرعون کی داستان میں آیا ہے۔ وہ فرعونیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

یاقوم اتبعون اھدکم سبیل الرشاد

---

[1] آیہ ۳، ۳۲ یونس - ۳ ہود - ۵۲ ہود - ۲۴ نحل - ۲۹ کہف وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

"اسے میری قوم! میری پیروی کرو تاکہ مَیں تمہیں سیدھے راستے کی ہدایت کروں"۔ (مومن-۳۸)

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس جملے میں وہ رسول مخاطب ہیں کہ جو خدا کی طرف سے اس قوم کو دعوت دینے کے لیے آئے تھے اور "ربکم" کی تعبیر اور فاسمعون کو اس پر قرینہ قرار دیا ہے، اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

* * *

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس پاکباز مومن کے جواب میں اس ہٹ دھرم قوم کا ردِعمل کیا تھا۔ قرآن نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی لیکن بعد والی آیات کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے شہید کر دیا۔

ہاں! اس کی پُرجوش اور ولولہ انگیز گفتگو قوی اور طاقتور استدلالات اور ایسے عمدہ و دلنشین نکات کے ساتھ تھی۔ مگر اس سے نہ صرف یہ کہ ان سیاہ دلوں اور مکر و غرور سے بھرے ہوئے سروں پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوا بلکہ کینہ و عداوت کی آگ ان کے دلوں میں ایسی بھڑکی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور انتہائی سنگدلی اور بے رحمی سے اس شجاع مردِ مومن کی جان کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے اسے پتھر مارنے شروع کیے اور اس کے جسم کو اس طرح سے پتھروں کا نشانہ بنایا کہ وہ زمین پر گر پڑا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اس کے لبوں پر مسلسل یہ بات تھی کہ "خداوندا! میری اس قوم کو ہدایت فرما کہ وہ جانتے نہیں ہیں"۔[1]

ایک اور روایت کے مطابق اسے اس طرح پاؤں کے نیچے روندا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔[2]

لیکن قرآن اس حقیقت کو ایک عمدہ اور سربستہ جملہ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اُسے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا" (قیل ادخل الجنۃ)۔

یہ وہی تعبیر ہے کہ جو راہِ خدا کے شہیدوں کے بارے میں قرآن کی دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے:

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتاً بل احیاء عند ربھم یرزقون

"یہ گمان نہ کرو کہ جو لوگ راہِ خدا میں قتل کیے گئے ہیں وہ مُردہ ہیں بلکہ وہ تو زندۂ جاوید ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق پاتے ہیں"۔ (آلِ عمران - ۱۶۹)

جاذبِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ مردِ مومن شہادت پاتے ہی جنت میں داخل ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان اس قدر کم فاصلہ تھا کہ قرآن مجید نے اپنی لطیف تعبیر میں اس

---

[1] تفسیر قرطبی، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر مجمع البیان، تبیان، تفسیر ابوالفتوح رازی وغیرہ۔

کی شہادت کا ذکر کرنے کے بجائے اس کے بہشت میں داخل ہونے کو بیان کیا۔ شہیدوں کی منزل یعنی بہشتِ سعادت کس قدر نزدیک ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں بہشت سے مراد برزخ والی بہشت ہے کیونکہ قرآنی آیات سے بھی اور روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہشت جاوداں مومنین کو قیامت میں نصیب ہوگی اور دوزخ بھی بدکاروں کے لیے اسی طرح ہے۔

اس بنا پر عالم برزخ میں ایک دوسری جنت و دوزخ ہے کہ جو قیامت کی جنت و دوزخ کا ایک نمونہ ہے جیسا کہ امیرالمومنین علیؑ کی ایک روایت میں قبر کے بارے میں منقول ہوا ہے:

القبر اما روضة من ریاض الجنة او حفرة من حفر النیران۔

"قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے"[1]

بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ جملہ اس خطاب کی طرف اشارہ ہے کہ جو قیامت کے دن اس مجاہد اور ایثار پیشہ مومن سے کیا جائے گا اور یہ مستقبل کا پہلو رکھتا ہے نہ کہ حال کا۔ یہ احتمال ظاہر آیہ کے خلاف ہے۔

بہر حال اس شخص کی پاک روح آسمانوں کی طرف، رحمت الٰہی کے قرب اور بہشتِ نعیم کی طرف پرواز کر گئی اور وہاں اسے صرف یہ آرزو تھی کہ: "اے کاش میری قوم جان لیتی" (قال یالیت قومی یعلمون)۔

"اے کاش وہ جان لیتے کہ میرے پروردگار نے مجھے اپنی بخشش اور عفو سے نوازا ہے اور مجھے مکرم لوگوں کی صف میں جگہ دی ہے"۔ (بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین)[2]

اے کاش ان کی آنکھ حق بین ہوتی۔ ایسی آنکھ کہ جس پر مادی دنیا کے ضخیم پردے پڑے ہوتے نہ ہوتے اور جو کچھ اس پردے کے پیچھے ہے اسے دیکھ لیتے۔ یعنی وہ ان سب نعمتوں اور خدا کے اکرام و الطاف کو دیکھ لیتے اور جان لیتے کہ ان کی اہانتوں کے بدلے خدا نے میرے حق میں کیا لطف فرمایا ہے۔

اے کاش! وہ دیکھتے اور ایمان لے آتے لیکن افسوس!

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر گرامی اسلامؐ نے فرمایا:

انه نصح لهم فی حیاته وبعد موته۔

---

[1] بحارالانوار، جلد ۶ ص ۲۱۸۔

[2] "ما" "بما غفرلی ربی" میں مصدریہ ہے یا موصولہ ہے یا استفہامیہ؟ تین احتمال ذکر کیے گئے ہیں لیکن استفہامیہ والا احتمال بعید نظر آتا ہے۔ دوسرے دو احتمالوں میں سے موصولہ والا احتمال زیادہ ترجیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ معنی کے لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

"اس باایمان شخص نے اپنی زندگی میں بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور موت کے بعد بھی ان کی ہدایت کی آرزو رکھتا تھا۔"[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ پہلے غفرانِ الٰہی کی نعمت کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس کے اکرام کا۔ کیونکہ پہلے انسان کی روح کو گناہوں کی آلودگی سے مغفرت کے پانی کے ساتھ پاک ہونا چاہیئے اور جب پاک ہو جائے تو پھر بساطِ قرب اور اکرامِ الٰہی کا مقام پاتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ خدا کا اکرام و اعزاز اور بزرگی — بہت سے بندوں کو نصیب ہوتی ہے اور اصولاً "تقویٰ" اور "اکرام" دوش بدوش آگے بڑھتے ہیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (حجرات - ۱۳)۔

لیکن "اکرام" بطور کامل اور کسی شرط کے بغیر قرآن مجید میں دو گروہوں کے بارے میں آیا ہے۔

پہلا گروہ خدا کے مقرب فرشتے ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ:

بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون

"وہ خدا کے مکرم بندے ہیں کہ جو بات کرنے میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان پر کاربند رہتے ہیں۔" (انبیاء - ۲۶-۲۷)

اور دوسرے کامل الایمان بندے کہ جنہیں قرآن نے "مخلصین" کے نام سے یاد کیا ہے اور ان کے بارے میں کہتا ہے:

اولٰئک فی جنٰت مکرمون

"وہ جنت کے باغوں میں مکرم ہوں گے قدر ہوں گے۔" (معارج - ۳۵)[2]

* * *

بہرحال یہ تو اس مردِ مومن اور سچے مجاہد کا انجام تھا کہ جس نے اپنی ذمہ داری کی انجام دہی اور خدا کے پیغمبروں کی حمایت میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور آخر کار شربتِ شہادت نوش کیا اور خدا کے جوارِ رحمت میں جگہ پائی۔

لیکن آیئے دیکھیں کہ اس ظالم اور سرکش قوم کا انجام کیا ہوا؟

اگرچہ قرآن میں ان تین پیغمبروں کے انجام کار کے متعلق۔ کوئی بات نہیں کی گئی کہ جو اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قوم نے، اس مردِ مومن کو شہید کرنے کے علاوہ اپنے

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۴۶۴۔

[2] المیزان، جلد ۱۷ ص ۸۲ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

پیغمبروں کو بھی شہید کر دیا جبکہ بعض نے تصریح کی ہے کہ اس مردِ مومن نے لوگوں کو اپنے ساتھ مشغول رکھا تاکہ وہ پیغمبر اس سازش سے بچ جائیں۔ کہ جو اُن کے خلاف کی گئی تھی۔ اور کسی پُر امن جگہ منتقل ہو جائیں لیکن اس قوم پر خدا کا دردناک عذاب نازل ہوا کہ جس کی طرف بعد والی آیات میں ارشاد ہوا ہے: یہ امر پہلے قول کی ترجیح کے لیے قرینہ ہے۔ اگرچہ "من بعدہ" (اس مردِ مومن کی شہادت کے بعد) کی تعبیر نزولِ عذاب کے بارے میں اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دوسرا قول صحیح ہے۔ (غور کیجئے گا)

٭ ٭ ٭

ہم نے دیکھا کہ شہر انطاکیہ کے لوگوں نے خدا کے پیغمبروں کی کیسے مخالفت کی۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے: "ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے نہیں بھیجا اور اصولاً ہمارا یہ طریقہ ہی نہیں ہے کہ ایسی سرکش اقوام کو نابود کرنے کے لیے ان امور سے کام لیں" (وما انزلنا علٰی قومہ من بعدہ من جند من السماء وما کنا منزلین)۔

ہم ان امور کے محتاج نہیں ہیں۔ صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ جس سے ہم ان سب کو خاموش کر دیں اور انہیں دیارِ عدم کی طرف بھیج دیں اور ان کی زندگی کو درہم برہم کر دیں۔

صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ ان کے حیات کے عوامل ہی ان کی موت کے عامل میں بدل جائیں اور مختصر سے وقت میں ان کی زندگی کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیں۔

پھر قرآن مزید کہتا ہے: "صرف ایک آسمانی چیخ پیدا ہوئی، ایسی چیخ کہ جو ہلا دینے والی اور موت کا پیغام تھی اچانک سب پر موت کی خاموشی طاری ہو گئی" (ان کانت الا صیحۃ واحدۃ فاذا ھم خامدون)۔

کیا یہ چیخ بجلی کی کڑک تھی کہ جو بادل سے اٹھی اور زمین پر جا پڑی اور ہر چیز کو لرزہ براندام کر دیا اور تمام عمارتوں کو تباہ کر دیا اور وہ سب خوف کی شدت سے موت کی آغوش میں چلے گئے؟

یا یہ ایسی چیخ تھی کہ جو زمین کے اندر سے ایک شدید زلزلے کی صورت میں اٹھی اور فضا میں دھماکہ ہوا اور اس دھماکے کی لہر نے انہیں موت کی آغوش میں سلا دیا۔

ایک چیخ وہ جو کچھ بھی تھی، لحہ بھر سے زیادہ نہ تھی ۔۔ وہ ایک ایسی آواز تھی کہ جس نے سب آوازوں کو خاموش کر دیا اور ایسی ہلا دینے والی تھی کہ جس نے تمام حرکتوں کو بے حرکت کر دیا اور خدا کی قدرت ایسی ہی ہے اور ایک گمراہ اور بے ثمر قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔

بسوزند چوب درختان بی بر   سزا خود ہمیں است مر بی بری را

"بے ثمر درختوں کی لکڑی جلانے ہی کے کام آتی ہے کیونکہ بے ثمر چیز کی سزا یہی ہے۔"

آخری زیر بحث آیت میں بہت ہی جامع اور موثر انداز میں تاریخ کے تمام سرکشوں کے دعوتِ انبیاءً سے ٹکراؤ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "افسوس ہے ان بندوں پر کہ کوئی ایسا پیغمبران کی ہدایت کے لیے نہیں آیا جس کا انہوں نے مذاق نہ اڑایا ہو" (یاحسرۃ علی العباد مایأتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزءون)۔

وائے ہے ان لوگوں پر کہ جنہوں نے خدا کی رحمت کا دریچہ خود سے بند کر لیا۔

افسوس ان پر کہ جنہوں نے اپنی ہدایت کے چراغ توڑ ڈالے۔

ہائے سعادت سے محروم وہ لوگ کہ جو نہ صرف پیغمبروں کی ندا پر کان نہیں دھرتے بلکہ ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں اور پھر انہیں تہ تیغ کر دیتے ہیں حالانکہ گزشتہ بے ایمان سرکشوں کا بُرا انجام دیکھ چکے ہیں اور ان کے دردناک انجام کے بارے میں سُن چکے ہیں یا تاریخ کے صفحات میں پڑھ چکے ہیں لیکن انہوں نے کچھ بھی تو عبرت حاصل نہیں کی اور انہوں نے بھی اسی وادی میں قدم رکھ دیا اور اس انجام میں گرفتار ہو گئے۔

واضح رہے کہ یہ جملہ خدا کی گفتار ہے چونکہ یہ تمام آیات اس کی طرف سے بیان ہو رہی ہیں۔ البتہ "حسرت" کا لفظ۔ ان واقعات پر کہ جن کے بارے میں انسان سے کچھ ہو نہ سکے اندرونی پریشانی کے معنی میں ہوتا ہے۔ خدا کے بارے میں یہ لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا جیسا کہ "خشم" اور "غضب" اور اس قسم کے دیگر امور بھی اس کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان بدبختوں کا حال ایسا تھا کہ جو انسان بھی ان کی کیفیت سے آگاہ ہوتا، وہ متاسف و متاثر ہوتا کہ وہ نجات کے ان تمام وسائل کے ہوتے ہوئے اس ہولناک گرداب میں کیوں غرق ہو گئے۔[1]

"عباد" (خدا کے بندے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تعجب اس چیز پر ہے کہ خدا کے بندے کہ جو اس کی نعمتوں میں مستغرق ہیں اس قسم کا جرم کرتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **انطاکیہ کے رسولوں کی داستان:** انطاکیہ، شام کے علاقہ کا ایک قدیم شہر ہے بعض کے قول کے مطابق یہ شہر مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے تعمیر ہوا۔ یہ شہر قدیم زمانے میں دولت و ثروت اور علم و تجارت کے لحاظ سے مملکتِ روم کے تین بڑے شہروں میں سے ایک شمار ہوتا تھا۔

شہر انطاکیہ حلب سے ایک سو کلومیٹر سے کچھ کم اور اسکندریہ سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "حسرت" اس چیز پر غم کے معنی میں ہے کہ جو انسان کے ہاتھ سے نکل جائے۔

یہ شہر خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ابو عبیدہ جراح کے ہاتھوں فتح ہوا اور رومیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

اس میں رہنے والے لوگ عیسائی تھے۔ انہوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اپنے مذہب پر باقی رہ گئے[1]

پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ شہر فرانسیسیوں کے قبضہ میں آگیا۔ اہل انطاکیہ زیادہ تر عیسائی اور فرانسیسیوں کے ہم مذہب تھے اس لیے جب فرانسیسیوں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو اس بات کے پیش نظر کہ ان کے شام سے نکلنے کے بعد اس ملک میں ہونے والے فتنہ و فساد سے عیسائیوں کو کوئی گزند نہ پہنچے انہوں نے اُسے ترکی کے حوالے کر دیا۔

انطاکیہ عیسائیوں کی نگاہ میں اسی طرح سے دوسرا مذہبی شہر شمار ہوتا ہے جس طرح سے مسلمانوں کی نظر میں مدینہ ہے اور ان کا پہلا شہر بیت المقدس ہے کہ جس سے حضرت عیسیٰؑ نے اپنی دعوت کی ابتداء کی اور اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے والوں میں سے ایک گروہ نے انطاکیہ کی طرف ہجرت کی اور پولس اور برنابا[2] شہروں کی طرف گئے۔ انہوں نے لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دی۔ وہاں سے دینِ عیسوی نے وسعت حاصل کی۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں اس شہر کے بارے میں (زیر بحث آیات میں) خصوصیت کے ساتھ گفتگو ہوئی ہے[3]

مفسر عالی قدر طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں: حضرت عیسیٰؑ نے حوارین میں سے اپنے دو نمائندے انطاکیہ کی طرف بھیجے۔ جس وقت وہ شہر کے پاس پہنچے تو انہوں نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ جو چند بھیڑیں چرانے کے لیے لایا تھا۔ یہ "حبیب" صاحبِ یٰس تھا۔ انہوں نے اسے سلام کیا۔ بوڑھے نے جواب دیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم عیسیٰؑ کے نمائندے ہیں، ہم اس لیے آئے ہیں کہ تمہیں بُتوں کی عبادت کے بجائے خدائے رحمان کی طرف دعوت دیں۔

بوڑھے نے کہا کہ کیا تمہارے پاس کوئی معجزہ یا نشانی بھی ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں! ہم بیماروں کو شفا دیتے ہیں اور مادر زاد اندھوں اور برص میں مبتلا لوگوں کو حکم خدا سے صحت و تندرستی بخشتے ہیں۔

---

[1] فرہنگ قصص قرآن مادہ "انطاکیہ" صنہ ۳۲۰۔

[2] "پولس" مشہور عیسائی مبلغ ہے۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ کے بعد عیسائیت پھیلانے میں بہت کوشش کی ہے اور "برنابا" کا اصلی نام "یوسف" ہے، اور وہ "پولس" اور "مرقس" کے اصحاب میں سے تھا۔ اس کی ایک انجیل ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کی بہت زیادہ بشارتیں نظر آتی ہیں لیکن عیسائی اسے غیر قانونی شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایک مسلمان نے لکھی ہے۔

[3] تفسیر ابوالفتوح رازی حاشیہ از مرحوم عالم بزرگوار شعرانی۔

بوڑھے نے کہا: میرا ایک بیمار بیٹا ہے کہ جو سالہا سال سے بستر پر پڑا ہے۔

انہوں نے کہا: ہمارے ساتھ چلو تاکہ ہم تمہارے گھر جا کر اس کا حال معلوم کریں۔

بوڑھا ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے اس کے بیٹے پر ہاتھ پھیرا تو وہ صحیح و سالم اپنی جگہ پر اُٹھ کھڑا ہوا۔

یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی اور خدا نے اس کے بعد بیماروں میں سے ایک کثیر گروہ کو اُن کے ہاتھ سے شفا بخشی۔

ان کا بادشاہ بُت پرست تھا۔ جب اس تک خبر پہنچی تو اس نے انہیں بُلا بھیجا اور اُن سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟

انہوں نے کہا: کہ ہم عیسیٰؑ کے فرستادہ ہیں، ہم اس لیے آئے ہیں کہ یہ موجودات جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں ان کی عبادت کے بجائے ہم تمہیں اس کی عبادت کی طرف دعوت دیں جو سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کیا ہمارے خداؤں کے علاوہ کوئی اور معبود بھی موجود ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں! وہی کہ جس نے تجھے اور تیرے معبودوں کو پیدا کیا ہے۔

بادشاہ نے کہا: اُٹھ جاؤ کہ میں تمہارے بارے میں کچھ سوچ بچار کروں۔

یہ ان کے لیے ایک دھمکی تھی۔ اس کے بعد لوگوں نے ان دونوں کو بازار میں پکڑ کر مارا پیٹا۔

لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ عیسیٰؑ کے ان دونوں نمائندوں کو بادشاہ تک رسائی حاصل نہ ہوئی اور ایک مدت تک وہ اس شہر میں رہے۔ ایک دن بادشاہ اپنے محل سے باہر آیا ہوا تھا تو انہوں نے تکبیر کی آواز بلند کی، اور "اللہ" کا نام عظمت کے ساتھ لیا۔ بادشاہ غضب ناک ہوا اور انہیں قید کرنے کا حکم دے دیا اور ہر ایک کو سو کوڑے مارے۔

جس وقت عیسیٰؑ کے ان دونوں نمائندوں کی تکذیب ہوگئی اور انہیں زدوکوب کیا گیا تو حضرت عیسیٰؑ نے شمعون الصفا کو ان کے پیچھے روانہ کیا۔ وہ حواریوں کے بزرگ تھے۔

شمعون اجنبی صورت میں شہر میں پہنچے اور بادشاہ کے اطرافیوں سے دوستی پیدا کر لی۔ انہیں ان کی دوستی بہت بھائی اور ان کے بارے میں بادشاہ کو بھی بتایا۔ بادشاہ نے بھی ان کو دعوت دی اور انہیں اپنے ہمنشینوں میں شامل کر لیا۔ بادشاہ ان کا احترام کرنے لگا۔

شمعون نے ایک دن بادشاہ سے کہا: میں نے سنا ہے کہ دو آدمی آپ کی قید میں ہیں اور جس وقت انہوں نے آپ کو آپ کے دین کے بجائے کسی دوسرے دین کی دعوت دی تو آپ نے انہیں مارا پیٹا؟ کیا کبھی آپ نے ان کی باتیں سنی بھی ہیں؟

بادشاہ نے کہا: کہ مجھے ان پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے ان کی کوئی بات نہیں سنی۔

شمعون نے کہا: اگر بادشاہ مصلحت سمجھیں تو انہیں بلالیں تاکہ ہم دیکھیں تو سہی کہ ان کے پلّے ہے کیا۔

بادشاہ نے انہیں بلالیا۔ شمعون نے یوں ظاہر کیا جیسے انہیں پہچانتے ہی نہ ہوں اور ان سے کہا: تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا: اس خدا نے کہ جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

شمعون نے کہا: تمہارا معجزہ اور نشانی کیا ہے؟

انہوں نے کہا: جو کچھ تم چاہو!

بادشاہ نے حکم دیا اور ایک اندھے غلام کو لایا گیا جسے انہوں نے حکم خدا سے شفا بخشی۔ بادشاہ کو بہت تعجب ہوا۔ اس مقام پر شمعون بول اٹھے اور بادشاہ سے کہا: اگر آپ اس قسم کی درخواست اپنے خداؤں سے کرتے تو کیا وہ بھی اس قسم کے کام کی قدرت رکھتے تھے؟

بادشاہ نے کہا: تم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ ہمارے یہ خدا کہ جن کی ہم پرستش کرتے ہیں نہ تو کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں، نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی اور خاصیت رکھتے ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے ان دونوں سے کہا: اگر تمہارا خدا مُردے کو زندہ کر سکتا ہے تو ہم اس پر اور تم پر ایمان لے آئیں گے۔

انہوں نے کہا: ہمارا خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بادشاہ نے کہا: یہاں ایک مُردہ ہے جسے مرے ہوئے سات دن گزر چکے ہیں ابھی تک ہم نے اُسے دفن نہیں کیا۔ ہم اس انتظار میں ہیں کہ اس کا باپ سفر سے آجائے۔ اُسے زندہ کر دکھاؤ۔

مُردہ کو لایا گیا تو وہ دونوں تو آشکار دعا کر رہے تھے اور شمعون دل ہی دل میں۔ اچانک مُردے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میں سات روز سے مرچکا ہوں۔ میں نے جہنم کی آگ اپنی آنکھ سے دیکھی ہے اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تم سب خدائے یگانہ پر ایمان لے آؤ۔

بادشاہ نے تعجب کیا۔ جس وقت شمعون کو یقین ہوگیا کہ اس کی باتیں اس پر اثر کر گئی ہیں تو اسے خدائے یگانہ کی طرف دعوت دی اور وہ ایمان لے آیا اور اس کے ملک کے باشندے بھی اس کے ساتھ ایمان لے آئے۔ اگرچہ کچھ لوگ اپنے کفر پر باقی رہے۔

اس روایت کی نظیر تفسیر عیاشی میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے بھی نقل ہوئی ہے۔ اگرچہ ان کے درمیان کچھ فرق ہے۔[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۸ صفحہ ۴۱۹ زیر بحث آیات کے ذیل میں (تلخیص کے ساتھ)۔

لیکن گزشتہ آیات کے ظاہر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس شہر والوں کا ایمان لانا بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ وہ صیحۂ آسمانی کے ذریعہ ہلاک ہو گئے۔

ممکن ہے کہ روایت کے اس حصہ میں راوی سے اشتباہ ہوا ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں "مرسلون" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ پیغمبر اور خدا کے بھیجے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں قرآن کہتا ہے کہ شہر کے لوگوں نے اُن سے کہا کہ تم ہم جیسے بشر ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو اور خدا نے کوئی چیز نازل نہیں فرمائی۔

قرآن مجید میں اس قسم کی تعبیرات عام طور پر خدائی پیغمبروں کے بارے میں آئی ہیں، یہ کہنا پیغمبروں کے بھیجے ہوئے بھی تو خدا کے بھیجے ہوئے ہیں تو یہ توجیہ یہاں بعید نظر آتی ہے۔

۲۔ اس داستان کے تربیتی اور اصلاحی نکات: زیر بحث آیات میں اس داستان کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے بہت سے مسائل سیکھے جا سکتے ہیں کہ جن میں سے کچھ حسب ذیل ہیں:

(ا) صاحب ایمان افراد راہ خدا میں کبھی بھی تنہائی سے نہیں گھبراتے۔ جیسا کہ ایک مرد مومن حبیب نجار شہر کے مشرکین کے انبوہ سے وحشت زدہ نہیں ہوا۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ایها الناس لا تستوحشوا فی طریق الهدی لقلة اهله

اے لوگو! ہدایت کی راہ میں افراد کی کمی سے کبھی بھی وحشت نہ کرو[1]

(ب) مومن لوگوں کی ہدایت کا عاشق ہوتا ہے اور ان کی گمراہی سے اسے دُکھ پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی شہادت کے بعد بھی یہ آرزو رکھتا ہے کہ اے کاش! دوسرے لوگ اس کے مقامات کو دیکھ لیتے اور ایمان لے آتے۔

(ج) انبیاء کی دعوت کے مطالب خود اس کی ہدایت و حقانیت کے بہترین گواہ ہوتے ہیں (و هم مهتدون)۔

(د) اللہ کی طرف دعوت میں کسی بھی اجر پر نگاہ نہیں ہونی چاہیئے ورنہ وہ اثر انداز نہ ہو سکے گی۔

(ہ) بعض اوقات گمراہی کا عالم پوشیدہ نہیں ہوتا بلکہ یہ عالم ضلالِ مبین اور آشکار ہوتا ہے اور بت پرستی شرک "ضلالِ مبین" کا واضح مصداق ہیں۔

(و) مردانِ حق حقیقتوں پر تکیہ کرتے ہیں اور گمراہ لوگ موہومات و خیالات پر۔

(ز) اگر نحوست و بدبختی موجود ہو تو اس کا سرچشمہ خود انسان اور اس کے اعمال ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۱۔

(ح)۔ "اسراف" اور تجاوز بہت سی بدبختیوں اور انحرافات کا عامل ہے۔

(ط)۔ پیغمبروں اور ان کے راستے پر چلنے والوں کا فریضہ "بلاغ مبین" اور ہر میدان میں واضح و آشکار دعوت دینا ہے۔ چاہے لوگ اُسے قبول کریں یا نہ کریں۔

(ی)۔ اجتماع و جمعیت کامیابی، عزت اور قوت کے اہم عوامل میں سے ایک ہے (فعززنا بثالث)۔

(ک)۔ خدا سرکش لوگوں کی سرکوبی کے لیے آسمان و زمین کے عظیم لشکر جمع نہیں کرتا بلکہ ایک ہی اشارے سے اُن کی ہر چیز درہم برہم کر دیتا ہے۔

(ل)۔ شہادت اور بہشت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اور شہید اپنی سواری سے زمین پر آنے سے پہلے ہی حور العین کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔

(م)۔ خدا انسان کو پہلے تو گناہ کی آلودگی سے پاک کرتا ہے اور پھر اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیتا ہے (بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین)۔

(ن)۔ دشمنانِ حق کی مخالفت اور سختی سے گھبرانا نہیں چاہیئے کیونکہ پوری تاریخ میں یہ ان کا ہمیشہ سے طریقہ رہا ہے (یٰحسرۃ علی العباد ما یأتیھم من رسول الّا کانوا بہ یستھزءون)۔

اس سے بڑھ کر اور کونسی حسرت کی بات ہوگی کہ انسان ہدایت کے دروازوں کو تعصب، ہٹ دھرمی اور غرور کی بنا پر اپنے اوپر بند کر دے اور حق کے آفتاب عالمتاب کو نہ دیکھے۔

(س)۔ انبیاء پر سب سے پہلے ایمان لانے والے معاشرے کے مستضعفین ہوا کرتے تھے (وجاء رجل من اقصی المدینۃ)۔

(ع)۔ وہی لوگ تھے کہ جو راہِ طلب میں کبھی تھکے نہیں تھے اور ان کی سعی و کوشش ہمیشہ جاری رہتی تھی (یسعٰی)۔

(ف)۔ تبلیغ کا طریقہ انبیاء الٰہی سے ہی سیکھنا چاہیئے کہ جو بے خبر دلوں پر تاثیر کرنے کے لیے تمام مؤثر طریقوں سے استفادہ کرتے تھے کہ جن کا ایک نمونہ زیرِ نظر آیات اور ان روایات میں کہ جو ان کی تفسیر میں آئی ہیں مشاہدے میں آتا ہے۔

۲۔ برزخ کی سزا و جزا:

زیر بحث آیات میں سے پچھلی مذکورہ "مومن" نے شہادت کے بعد خدائی بہشت میں جگہ پائی اور وہ یہ آرزو رکھتا تھا کہ اے کاش! پیچھے رہ جانے والے اس کی قسمت سے آگاہ ہو جاتے۔ یقیناً یہ آیات شہداء سے مربوط آیات کی طرح قیامت والی ابدی و جاودانی جنت سے مربوط نہیں ہیں جس میں آیات قرآنی کے مطابق مُردوں کے قیامت میں اٹھنے اور محشر کے حساب و کتاب کے بعد داخلہ ہوگا۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے لیے برزخ میں بھی ایک طرح کی جنت و دوزخ ہے کہ جس میں شہید تو نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور "آلِ فرعون" جیسے سرکش صبح و شام اس کی آگ میں معذب ہوتے ہیں۔ اس مطلب کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت سے ایسے مسائل حل ہو جاتے ہیں کہ جو بہشت و دوزخ کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ معراج کی روایات اور اس جیسے دیگر واقعات کے بارے میں پیدا ہونے والے سوالات۔[1]

۴۔ اُمتوں میں سب سے سبقت کرنے والے : تفسیر ثعلبی میں پیغمبر گرامی السلامؑ سے منقول ہے :

سباق الامم ثلاثة لم یکفروا باللّٰه طرفة عین علی بن ابی طالب وصاحب یٰس و مؤمن اٰل فرعون، فهم الصدیقون وعلی افضلهم۔

"امتوں میں سب سے سبقت کرنے والے تین افراد ہیں کہ جنہوں نے ایک چشم زدن کے لیے ہرگز خدا سے کفر نہیں کیا، علی بن ابی طالبؑ اور صاحب یٰس (حبیب نجار) اور مؤمن آلِ فرعون۔ انہوں نے اپنے زمانے کے پیغمبر کی (قولاً اور عملاً) تصدیق کی ہے اور علیؑ اُن سب سے افضل و برتر ہیں۔"

یہی معنی و مفہوم تفسیر درمنثور میں ایک دوسری عبارت سے رسول اللہؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

الصدیقون ثلاثة : حبیب النجار مؤمن اٰل یٰس الذی قال یاقوم اتبعوا المرسلین، وحزقیل مؤمن اٰل فرعون الذی قال اتقتلون رجلاً ان یقول ربی اللّٰه، وعلی بن ابی طالب (ع) وهو افضلهم

"انبیاء کی تصدیق کرنے والے تین آدمی تھے حبیب نجار مؤمن آلِ یٰس کہ جس نے پکار کر یہ کہا کہ اے میری قوم! خدا کے رسولوں کی پیروی کرو اور حزقیل مؤمن آلِ فرعون (کہ جس نے موسٰیؑ کا دفاع کیا اور ان کی حمایت کرتے ہوئے ان کے قتل کی سازش کے مقابلے میں جو فرعونیوں کی طرف سے ترتیب دی گئی تھی) کہا: کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے؟ اور علی بن ابی طالبؑ کو جو ان سب سے افضل و برتر ہیں۔"[2]

---

[1] مجمع البیان، تفسیر قرطبی، المیزان اور نور الثقلین۔

[2] المیزان، جلد ۱۷، ص ۸۶ بحوالہ تفسیر درمنثور۔

(۳۱) اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○

(۳۲) وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ○

ترجمہ

(۳۱) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی اقوام کو (ان کے گناہوں کی بنا پر) ہلاک کیا ہے۔ وہ ہرگز ان کی طرف واپس نہیں لوٹیں گے۔

(۳۲) اور وہ سب کے سب قیامت کے دن ہمارے پاس حاضر ہوں گے۔

تفسیر

دائمی غفلت

گزشتہ آیات زمانۂ ماضی میں دنیا کے لوگوں کے ایک بڑے حصے کی مسلسل غفلت کے بارے میں گزری ہے۔ اب ان آیات میں فرمایا گیا ہے: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے پہلی اقوام میں سے بہت سے افراد کو ان کے ظلم اور سرکشی کے سبب ہلاک کر ڈالا" (الم یروا کم اهلکنا قبلهم من القرون) [1]

یہ کوئی پہلا گروہ نہیں ہے کہ جس نے روئے زمین پر قدم رکھا ہے بلکہ ان سے پہلے دوسری سرکش قومیں بھی اس جہان میں زندگی بسر کرتی رہی ہیں، ان کا دردناک انجام کہ جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے اور ان کے غم انگیز آثار کہ جو ان کے شہروں کے ویرانوں میں باقی رہ گئے ہیں، ان کی آنکھوں کے

---

[1] زیر نظر آیت میں استفہام، تقریری استفہام ہے اور "کم" خبریہ ہے اور یہاں کثرت کے معنی میں آیا ہے اور (یروا) کا مفعول ہے اور "من القرون" اس کا بیان ہے۔ "قرون" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے، "قرن" کی جمع ہے کہ جو طویل زمانے کے معنی میں بھی بولا گیا ہے اور ایسے لوگوں کے معنی میں بھی کہ جو ایک ہی زمانے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

سامنے موجود ہیں۔کیا اتنا کچھ درسِ عبرت کے لیے کافی نہیں ہے؟

اس بارے میں کہ "الم یروا" (کیا انہوں نے دیکھا نہیں) میں جمع کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے، مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر "اصحاب القریۃ" کی طرف لوٹتی ہے کہ جن کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو ہوئی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد اہلِ مکہ ہیں کہ جنہیں یہ آیات تنبیہ کرنے اور خبردار کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

لیکن گزشتہ آیت (یا حسرۃ علی العباد ....) اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس سے مراد تمام انسان ہیں کیونکہ مذکورہ آیت میں لفظ "عباد" پوری تاریخ کے اُن تمام انسانوں کے لیے ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے افراد کی تکذیب کرتے اور مذاق اڑاتے تھے۔بہر حال یہ عالم کے تمام لوگوں کو ایک دعوت ہے کہ وہ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا غور کے ساتھ مطالعہ کریں اور ان کے باقی ماندہ آثار کو دیکھیں اور انہیں عبرت حاصل کرنے کے لیے دل کی نگاہوں سے دیکھیں اور سرکشوں کے ویران محلوں کے ایوانوں کو آئینۂ عبرت سمجھیں۔

آیت کے آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: "وہ کبھی بھی ان کی طرف نہیں لوٹیں گے" (انھم الیھم لا یرجعون)[1]

سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دنیا کی طرف بازگشت اور گزشتہ گناہوں اور بدبختیوں کی تلافی کا امکان باقی نہیں رہا۔ان کے گزشتہ سفر کے تمام پُل تباہ ہو چکے ہیں اور اب ان کا لوٹ کر جانا ممکن ہی نہیں رہا۔

یہ تفسیر اُس بات کے مانند ہے کہ جو علی علیہ السلام نے مُردوں سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہوئے نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں ارشاد فرمائی ہے:

لا عن قبیح یستطیعون انتقالاً ولا فی حسن یستطیعون ازدیاداً

"نہ تو اُس بات ہی کا امکان ہے کہ وہ اپنے قبیح اعمال سے نکل سکیں گے اور نہ ہی وہ اس بات کی طاقت رکھتے ہیں کہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کرسکیں (کیونکہ واپس لوٹنے کی راہ

---

[1] یہ جملہ "کم اھلکنا" کا بدل ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے:

الم یروا انھم الیھم لا یرجعون۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ حالیہ ہے (ہلاک ہونے والوں کا حال)۔

بند ہو چکی ہے اور تلافی کا امکان نہیں رہا"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۸)

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "وہ سب کے سب بلا استثناء قیامت کے دن ہمارے پاس حاضر ہوں گے" (وان کل لمّا جمیع لدینا محضرون)[1]

یعنی اس طرح نہیں ہے کہ اگر وہ گروہ ہلاک ہو گئے اور اس جہان میں واپس نہ پلٹ سکے تو مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ موت حقیقت میں نہ تو ابتدائے کار ہے اور نہ ہی انتہائے کار، بلکہ وہ سب کے سب بہت جلد عرصۂ محشر میں حساب کتاب کے لیے جمع ہوں گے اور اس کے بعد دردناک عذابِ الٰہی، کہ جو ایک مسلسل اور دائمی سزا ہو گی اُن کا منتظر ہے۔

تو ان حالات میں کیا یہ عبرت حاصل کرنے کا مقام نہیں ہے؟ چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو اُن کے سے انجام میں مبتلا نہ کریں اور جب تک کچھ بھی موقع باقی ہے اس ہولناک گرداب سے دُور رہیں۔

ہاں! اگر موت پر ہر چیز کا خاتمہ ہو جانا ہوتا تو یہ بات ممکن تھی کہ وہ کہتے کہ یہ زندگی تو ہمارے سکون و راحت کی ابتداء ہے لیکن افسوس کہ اس طرح نہیں ہے اور بقول شاعر:

ولو انا اذا متنا ترکنا لکان الموت راحة کل حیّ
ولکنا اذا متنا بعثنا ونسئل بعده عن کل شیٔ

"اگر ہمیں مرجانے کے بعد اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو موت تمام زندوں کے لیے راحت و آرام کا باعث ہوتی۔"

"لیکن جب ہم مر جائیں گے تو ہم دوبارہ زندہ ہوں گے اور اس کے بعد ہم سے ہر چیز کے متعلق سوال ہو گا۔"

---

[1] اس آیت کی ترکیب کے بارے میں مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ "ان" نافیہ ہے (اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مخففہ ہے۔ اسی بنار پر اس نے اپنے مابعد کو نصب نہیں دیا) اور "لمّا" "الا" کے معنی میں ہے کیونکہ "لمّا" کا "الا" کے معنی میں آنا عرب ادباء کے کلام میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس بنا پر "کسائی" کی مخالفت سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور "جمیع" "مجموع" کے معنی میں "کل" کی خبر ہے ("کل" کی تنوین مضاف الیہ محذوف کا بدل ہے اور اصل میں یہ "کلھم" تھا) اور "محضرون" یا تو خبر کے بعد خبر ہے یا جمیع کی صفت ہے۔ اس طرح سے اس جملے کا معنی کچھ اس طرح ہو گا:

وما کلھم الا مجموعون یوم القیامة محضرون لدینا۔

"اور نہیں ہیں وہ سب کے سب مگر قیامت کے دن اکٹھے مجموعی طور پر ہمارے پاس حاضر ہوں گے۔"

(۳۳) وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ○

(۳۴) وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ○

(۳۵) لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○

(۳۶) سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

(۳۳) مُردہ زمین بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے۔ ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے دانے نکالے۔ اسی میں سے وہ کھاتے ہیں۔

(۳۴) اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگائے اور اس میں چشمے جاری کیے۔

(۳۵) تاکہ وہ اس کے پھل کھائیں جبکہ اس کے بنانے میں ان کے ہاتھ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کیا وہ خدا کا شکر ادا نہیں کرتے۔

(۳۶) منزہ ہے وہ ذات کہ جس نے زمین سے اُگنے والی چیزوں کے اور خود انہی لوگوں کے اور ان چیزوں کے جنہیں یہ نہیں جانتے سب کے جوڑے

پیدا کیے ہیں۔

تفسیر

کچھ اور نشانیاں

گزشتہ آیات میں فرستادگانِ الٰہی کی شرک و بُت پرستی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں گفتگو تھی۔ نیز گزشتہ آخری آیت میں مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہُوا تھا۔ اب زیرِ بحث آیات توحید و معاد کی نشانیوں کو یکجا بیان کرتی ہیں تاکہ یہ نشانیاں منکرین کے لیے بیداری اور مبدا و معاد پر ایمان لانے کا ذریعہ بن جائیں۔

ان آیات میں پہلے مُردہ زمینوں کے زندہ کرنے اور ان برکات سے کہ جن سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں بحث کی گئی ہے فرمایا گیا ہے: "مُردہ زمین بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے (مبدا و معاد کی) ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے دانے نکالے اور اسی میں سے وہ کھاتے ہیں" (وآیة لهم الارض المیتة احییناها واخرجنا منها حبًّا فمنه یأکلون)[1]

وجودِ حیات توحید کے اہم ترین دلائل میں سے ہے۔ یہ بہت زیادہ پیچیدہ اور حیرت انگیز مسئلہ ہے کہ جس نے تمام علماء اور دانشوروں کی عقل کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور تمام ترقیوں کے باوجود کہ جو علم و دانش میں نوعِ بشر کو نصیب ہوئی ہیں ابھی تک کسی نے اس کے معمے کو حل نہیں کیا۔ ابھی تک کوئی بھی شخص ٹھیک طرح سے نہیں جانتا کہ کن عوامل کے زیرِ اثر پہلے دن بے جان موجودات زندہ خلیوں میں تبدیل ہوئیں۔

ابھی تک کوئی نہیں جانتا کہ نباتات کے بیج اور ان کے مختلف طبقات کس طرح بنتے ہیں اور کون سے قوانین و رموز ان پر حکم فرما ہیں۔ موافق حالات فراہم ہوتے ہی یہ بیج حرکت میں آجاتے ہیں اور نشوونما کا آغاز کر دیتے ہیں اور مردہ زمین کے ذرات کو اپنے وجود میں جذب کر لیتے ہیں اور اس طریقے سے مُردہ موجودات کو زندہ موجود کی بافت و بُن میں تبدیل کر دیتے ہیں، تاکہ ہر روز حیات کا ایک نیا جلوہ دکھائیں۔

---

[1] زیرِ بحث آیت کے سلسلے میں علماء نے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں لیکن جو چیز سب سے زیادہ واضح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ "اٰیة لهم" خبر مقدم ہے اور "الارض المیتة" مبتدائے مؤخر ہے اور "احیینا" مستانفہ ہے کہ جو گزشتہ لفظ کی توضیح و تفسیر ہے۔

عالم نباتات وحیوانات میں حیات کا مسئلہ اور مُردہ زمینوں کا زندہ ہونا، ایک طرف تو اس بات کی ایک واضح و روشن دلیل ہے کہ اس جہان کی خلقت میں ایک عظیم علم و دانش سے کام لیا گیا ہے اور دوسری طرف سے یہ قیامت کی ایک واضح نشانی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ "لھم" کی ضمیر "عباد" کی طرف لوٹتی ہے کہ جو گزشتہ آیات میں ہے اور یہاں "عباد" سے مراد وہ تمام بندے ہیں جو مبدا و معاد سے مربوط مسائل میں انحراف یا غلط فہمی میں گرفتار ہیں اور قرآن ان کی کیفیت کو حسرت و تاسف کا سبب شمار کرتا ہے۔

"اٰیۃ" کی تعبیر نکرہ کی صورت میں اس توحیدی نشانی کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔

"فمنہ یأکلون" ایک طرف تو اس بات کا اشارہ ہے کہ انسان نباتات کے کچھ دانوں سے غذا حاصل کرتا ہے اور کچھ انسان کی غذا کے قابل نہیں ہیں لیکن ان کے دوسرے فوائد ہیں مثلاً جانوروں کی غذا، رنگ کرنے کے مادے، دوائیاں اور دوسرے امور کہ جن سے انسانی زندگی میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

دوسری طرف "منہ" کو "یأکلون" پر مقدم رکھنا کہ جو عام طور پر حصر کے لیے آتا ہے، اس نکتے کو بیان کرتا ہے کہ انسان کے لیے زیادہ تر اور بہترین غذا نباتات سے حاصل ہوتی ہے بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تمام تر غذا گویا اسی سے حاصل ہوتی ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت گزشتہ آیت کی توضیح و تشریح ہے اور مُردہ زمینوں کی حیات کی کیفیت بیان کرتی ہے فرمایا گیا ہے: "ہم نے زمین میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگائے ہیں اور اس میں سے چشمے نکالے ہیں" (وجعلنا فیھا جنّٰت من نخیل واعناب وفجرنا فیھا من العیون)۔

گزشتہ آیت میں اناج کے متعلق گفتگو تھی لیکن یہاں قوت بخش اور غذائی پھلوں کے متعلق بات کی گئی ہے۔ ان کے دو عمدہ اور کامل نمونے "کھجور" اور "انگور" ہیں کہ جن میں سے ہر ایک مکمل غذا شمار ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی مفصل طور سے بیان کر چکے ہیں کہ ماہرین کے مطالعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ دونوں پھل انواع و اقسام کے ضروری وٹامن اور انسانی بدن کے لیے درکار مختلف حیاتی مواد کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ دونوں پھل سال بھر تازہ اور خشک شکل میں غذا کیلئے محفوظ رکھنے اور استفادہ کرنے کے قابل ہیں[1]

---

[1] ان دونوں حیات بخش پھلوں (انگور و خرما) کے بارے میں اور ان کی غذائی اہمیت کے متعلق ماہرین کی گواہی کے سلسلے میں ہم بالترتیب جلد ۶ اور جلد ۷ (سورہ نحل آیہ ۱۱۔ اور سورہ مریم آیہ ۲۶) میں بحث کر چکے ہیں۔

راغب کے بقول " اعناب " جمع ہے " عنب " کی اور " نخیل " جمع ہے " نخل " کی ۔ فرق یہ ہے کہ " عنب " خود انگور کو کہا جاتا ہے اور انگور کے پودے کے لیے یہ لفظ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے لیکن " نخل " اس درخت کا نام ہے اور اس کے پھل کو " رطب " " متمر " (تازہ اور خشک کھجور) کہتے ہیں ۔

بعض کا نظریہ ہے کہ تعبیر کا یہ فرق کہ ایک جگہ تو درخت کی بات ہے اور دوسری جگہ پھل کی ، اس وجہ سے ہے کہ کھجور کے درخت کی جیساکہ مشہور ہے ہر چیز قابلِ استفادہ ہے اس کا تنا ، شاخیں اور پتے سب مختلف امور میں کام آتے ہیں اور اس کا پھل ان سب کا سردار ہے ۔ جبکہ انگور کا پودا عام طور پر اس کے پھل کی وجہ سے مطلوب ہے اور اس کا تنا ، شاخیں اور اس سے جدا شدہ اجزاء کا کوئی زیادہ مصرف نہیں ہے ۔

نیز یہ بات کہ یہ دونوں صیغے جمع کی صورت میں آئے ہیں تو ممکن ہے کہ یہ ان دونوں پھلوں کی مختلف انواع و اقسام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی دسیوں قسمیں ہیں جن کی مختلف خصوصیات اور ذائقے ہیں ۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ آیت میں صرف مُردہ زمینوں کے زندہ کرنے کا ذکر تھا کہ جو قرآن مجید میں عام طور پر بارش کے نزول کے ساتھ آیا ہے لیکن اس آیت میں جاری پانی کے چشموں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے کیونکہ بہت سی زراعتوں کے لیے تو اکیلا بارش کا پانی ہی کافی ہے جبکہ پھلدار درختوں کو عام طور پر جاری پانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔

" فجرنا " " تفجیر " کے مادہ سے ، یہ لفظ وسیع اور کھلا شگاف پیدا کرنے کے معنی میں ہے ۔ چشمے چونکہ زمین کو شگافتہ کرکے پھوٹتے ہیں ، اس لیے یہ تعبیر چشموں کے زمین سے باہر نکلنے کے بارے میں استعمال ہوتی ہے [1] ۔

بعد والی آیت ان پُر بار درختوں کے مقصد خلقت کو یوں بیان کرتی ہے : " مقصد یہ ہے کہ وہ اس کے پھل کھائیں ، حالانکہ ان کے بنانے میں ان کے ہاتھ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے ۔ کیا وہ خدا کا شکر بجا نہیں لاتے " (لیأکلوا من ثمرہ وما عملته ایدیھم افلا یشکرون) ۔

ہاں ! وہ پھل کہ جو درختوں کی شاخوں پر ایک کامل غذا کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں ، انہیں پکانے یا دوسری کسی قسم کی تبدیلی کی معمولی سے معمولی ضرورت بھی نہیں ہوتی ، وہ درختوں سے توڑتے

---

[1] قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس کا ثلاثی مجرد کا صیغہ بھی شگاف کرنے کے معنی میں ہے لیکن جب اسے باب " تفعیل " کی طرف لے جاتے ہیں (جیساکہ زیرِ بحث آیت میں ہے) تو پھر تکثیر اور تشدید کا معنی دیتا ہے ۔

ہیں قابلِ استعمال ہوتے ہیں اور یہ بات پروردگار کی انسانوں کے لیے انتہائی لطف اور عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔

یہاں تک کہ اس نے اس تیار اور لذیذ غذا کی اس طرح سے پیکنگ کی ہے کہ وہ ایک مدت تک محفوظ رہ سکتی ہے اور ان کی غذائی قدر و قیمت بھی ضائع نہیں ہوتی، ان غذاؤں کے برخلاف کہ جنہیں انسان خداداد موادِ غذائی سے اپنے ہاتھ سے بناتا ہے کہ جو زیادہ تر جلدی خراب ہو جاتی ہیں۔

آیت کے معنی میں ایک دوسری تفسیر بھی موجود ہے اور وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ ایسے پھلوں کی طرف بھی اشارہ کرے کہ جو بغیر کسی تبدیلی کے استعمال کے قابل ہوتے ہیں اور ایسی مختلف غذاؤں کی طرف بھی کہ جو ان پھلوں پر کچھ عمل انجام دینے سے حاصل ہوتی ہیں (پہلی تفسیر کی رُو سے "ما عملته ایدیهم" میں "ما" نافیہ ہے اور دوسری تفسیر کی رُو سے موصولہ)

بہر صورت مقصد یہ ہے کہ انسانوں میں حق شناسی اور شکر گزاری کی حس کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ شکر گزاری کے ذریعے معرفت پروردگار کے مرحلے میں قدم رکھیں کیونکہ شکر منعم معرفت کردگار کا پہلا قدم ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت پروردگار کی تسبیح و تنزیہ کے بارے میں بات کرتی ہے اور مشرکین کے شرک پر کہ جس کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو تھی خطِ بطلان کھینچتی ہے اور سب کو راہِ توحید اور یکتا پرستی کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتی ہے: "منزہ ہے وہ ذات کہ جس نے زمین سے اُگنے والی چیزوں کے اور خود انہی لوگوں کے اور ان چیزوں کے جنہیں یہ نہیں جانتے سب کے جوڑے پیدا کیے ہیں"

(سبحان الذی خلق الازواج کلها مما تنبت الارض ومن انفسهم ومما لا یعلمون)[1]

ہاں! وہ خدا کہ جس نے ان تمام جوڑوں کو اس وسیع عالمِ ہستی میں پیدا کیا ہے، اس کا علم و قدرت بے انتہا ہے۔ اس میں کوئی نقص اور عیب موجود نہیں ہے، اس لیے اس کا کوئی شریک و شبیہ و نظیر بھی نہیں ہے۔

یہ جو بعض نے بے جان پتھروں، لکڑیوں اور دوسری مخلوقات کو اس کا شبیہ قرار دے رکھا ہے ایسی

---

[1] بعض مفسرین اور علماء ادب کے قول کے مطابق "سبحان" "علم" ہے "تسبیح" کا کیونکہ علم (مخصوص نام) کبھی تو اشخاص کے لیے ہوتا ہے اور اس کو "علم شخص" کہتے ہیں اور کبھی جنس کے لیے ہوتا ہے اور اسے "علم جنس" کہتے ہیں اور کبھی کسی معنی کے لیے ہوتا ہے اور اس کو "علم معنی" کہتے ہیں۔ اس بناء پر اس کا مفہوم خدا کی تنزیہ اور اسے ہر اس چیز سے پاک شمار کرنا ہے کہ جو عیب و نقص ہو۔ ایسی تنزیہ کہ جو عظمتِ پروردگار کے شایانِ شان ہو اور علم معنی کے سوا "علم" کی کبھی بھی اضافت نہیں ہوتی۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "سبحان" مصدری معنی رکھتا ہے اور فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے اور ہر صورت میں خدائی تنزیہ کو نہایت پُر زور طریقے سے بیان کرتا ہے۔

ناروانسبتوں سے اس کے دامن کبریائی پر کوئی گرد نہیں پڑتی ۔

یہ بات واضح ہے کہ خدا اس چیز کا محتاج نہیں ہے کہ وہ خود اپنی تسبیح و تنزیہ کرے، بلکہ یہ تو بندوں کے لیے ایک تعلیم ہے اور تکامل و ارتقاء کا سفر طے کرنے کے لیے ایک دستور العمل ہے ۔

اس بارے میں کہ یہاں "ازواج" سے کیا مراد ہے مفسرین نے بہت اختلاف کیا ہے ۔

جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ "ازواج" "زوج" کی جمع ہے ۔ یہ لفظ عام طور پر مذکر و مؤنث دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، چاہے وہ حیوانات ہوں یا ان کے علاوہ ۔ بعد ازاں اس لفظ کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور ہر ان دو موجود پر کہ جو ایک دوسرے سے نزدیک ہوں یہاں تک کہ ایک دوسرے کی ضد ہی ہوں "زوج" کا اطلاق ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک گھر کے دو مشابہ کمروں کے لیے یا دروازے کے دو کواڑوں کے لیے یا دو اکٹھے کام کرنے والے ساتھیوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس طرح سے عالم ہستی کے ہر موجود کے لیے ایک زوج (جوڑا) متصور ہوتا ہے ۔

بر حال بعید نہیں ہے کہ یہاں پر "زوجیت" اسی خاص معنی یعنی صنف مذکر و مؤنث میں ہو اور قرآن مجید اس آیت میں تمام عالم نباتات، انسانوں اور دوسرے موجودات میں کہ جن سے لوگ مطلع نہیں ہیں، زوجیت کی خبر دے رہا ہو۔

ممکن ہے یہ موجودات نباتات ہوں ۔ اُس زمانہ میں ان میں زوجیت کے دائرے کی وسعت ابھی تک ظاہر نہ ہوئی تھی ۔

یا ہو سکتا ہے سمندروں کی گہرائیوں میں پائے جانے والے حیوانات کی طرف اشارہ ہو کہ جن سے اس زمانے میں کوئی آگاہ نہیں تھا اور موجودہ زمانے میں ان کا کچھ حصہ انسان کے لیے ظاہر ہوا ہے ۔

یا دوسری موجودات کی طرف اشارہ ہو کہ جو دوسرے آسمانی کرّوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ۔

یا خوردبینی زندہ موجودات مراد ہوں، اگرچہ اس زمانے کے ماہرین ان کے نر اور مادہ کو ابھی تک معلوم نہیں کر سکے، لیکن اس زندہ موجودات کی بنا اس قدر پوشیدہ معموں میں سے ہے کہ ممکن ہے کہ انسانوں کے علم و دانش نے ابھی تک اس کے اس حصہ تک رسائی حاصل نہ کی ہو، یہاں تک کہ عالم نباتات میں نر اور مادہ ہونے کا وجود بھی ۔۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے قرآن کے نزول کے زمانے میں ۔۔ سوائے خاص خاص مواقع مثلاً کھجور وغیرہ کے درختوں کے ۔۔ پہچانا نہیں گیا تھا اور قرآن نے اس سے پردہ اٹھایا تھا اور آج کے زمانے میں سائنسی طریقوں سے یہ مطلب پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ عالم نباتات میں مسئلہ زوجیت ایک عمومی اور مشترک امر ہے ۔

یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہاں "زوجیت" تمام ایٹموں کے اندر مثبت اور منفی ذرات کے وجود کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس جہان کی تمام چیزیں ایٹم سے بنی ہیں اور ایٹم حقیقت میں عالم

مادہ کے اس عظیم محل کی عظیم تعمیر کے لیے اینٹ کے مانند ہے۔

جس وقت تک "ایٹم" کو توڑا نہیں گیا تھا اس وقت تک اس زوجیت کا کوئی پتہ نہیں تھا لیکن اس کے بعد ایٹم میں اور ان الیکٹرانوں کی صورت میں کہ جو اس کے گرد گھومتے ہیں اور ان پروٹونوں کی صورت میں کہ جو اُن کے اندر موجود ہیں ازواج (جوڑوں) کا وجود پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔

بعض نے اسے اشیاء کی مادہ وصورت یا جوہر و عرض سے ترکیب کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعض دوسرے اسے نباتات، انسانوں، حیوانوں اور دوسری موجودات کی مختلف انواع و اقسام کیلئے کنایہ سمجھتے ہیں۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ جب ہم ان الفاظ کو حقیقی معنی (صنف مذکر و مؤنث) پر محمول کرسکتے ہیں اور اس کے برخلاف کوئی قرینہ بھی موجود نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم کنائی معانی کی طرف جائیں اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ زوجیت کے حقیقی معنی کی کئی عمدہ تفاسیر یہاں پر موجود ہیں۔

بہرحال یہ آیت بھی ان آیات میں سے ایک ہے کہ جو انسانی علم کا محدود ہونا بیان کرتی ہیں اور اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس جہان میں بہت سے حقائق ایسے ہیں کہ جو ہمارے علم و دانش سے پوشیدہ ہیں[1]

---

[1] موجوداتِ عالم کی زوجیت کے بارے میں اور خصوصاً عالم نباتات میں مذکر و مؤنث کی موجودگی سے متعلق ہم جلد ۵ ص ۶۲۱ (اُردو ترجمہ) اور جلد ۸ سورہ شعراء کی آیہ ۷ کے ذیل میں بحث کرچکے ہیں۔

(۳۷) وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۙ

(۳۸) وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۭ

(۳۹) وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ

(۴۰) لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ

ترجمہ

(۳۷) رات بھی ان کے لیے (عظمتِ خدا کی) ایک نشانی ہے ہم اس سے دن کو لے جاتے ہیں تو اچانک تاریکی انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔

(۳۸) اور سورج (بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے) کہ جو ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے، یہ خدائے قادر و دانا کی تقدیر ہے۔

(۳۹) اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں قرار دی ہیں (اور جب وہ ان منازل کو طے کرلیتا ہے تو) آخرکار کھجور کی پرانی شاخ (زرد کمان) کے مانند ہو جاتا ہے۔

(۴۰) نہ تو سورج چاند تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

تفسیر

سورج اور چاند بھی آیتِ الٰہی ہیں

زیرِ بحث آیات عالمِ ہستی میں عظمتِ خدا کی نشانیوں کے ایک اور حصے کو بیان کرتی ہیں۔ گزشتہ آیات میں قیامت، مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے اور نباتات اور درختوں کی پرورش کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ اب توحید کا ایک اور پہلو بیان کیا جارہا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "رات بھی ان کے لیے عظمتِ خدا کی ایک آیت اور نشانی ہے" (وایة لهم اللیل)۔

لا جب آفتاب کی روشنی ہر جگہ پھیلی ہوتی ہے اور اس نے تاریکی کے لشکر کو پیچھے دھکیلا ہوتا ہے اس وقت ہم دن کی روشنی کو اٹھا لیتے ہیں اور ان سب کو اچانک تاریکی ڈھانپ لیتی ہے" (نسلخ منه النهار فاذا هم مظلمون)۔

"نسلخ" کی تعبیر مادہ "سلخ" (بروزن "بلخ") سے ہے۔ اصل میں یہ لفظ جانور کا چمڑہ اتارنے کے معنی میں ہے۔ یہ ایک لطیف تعبیر ہے، گویا دن کی روشنی سفید لباس کے مانند ہے کہ جو رات کے بدن پر پہنایا گیا ہے۔ غروبِ آفتاب کے وقت یہ لباس اس سے اتار لیا جاتا ہے تاکہ اس کا باطن اور اندر کا حصہ آشکار ہو جائے۔

اس تعبیر کے بارے میں غور و خوض کرنے سے یہ نکتہ عیاں ہو جاتا ہے کہ کرۂ زمین کی اصل فطرت تاریکی اور ظلمت ہے۔ نور اور روشنی اس کی ایک عارضی صفت ہے کہ جو ایک دوسرے منبع سے اُسے دی جاتی ہے۔ اس لباس کی طرح کہ جو کسی کے بدن پر پہناتے ہیں کہ جس وقت وہ اس لباس کو اتار دے تو بدن کا فطری اور اصلی رنگ ظاہر ہو جاتا ہے [1]

یہاں قرآن مجید نے رات کی تاریکی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گویا گزشتہ آیات میں آیتِ الٰہی کے طور

---

[1] "راغب" مفردات میں کہتا ہے کہ "سلخ" کا معنی جانور کی کھال اتارنا ہے اور بدن سے زرہ اتارنے اور مہینے کے اختتام کے لیے بھی بولا جاتا ہے لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اس صورت میں ہے کہ جب سلخ "عن" کے ساتھ متعدی ہو اور اگر "من" کے ساتھ متعدی ہو تو پھر باہر نکالنے کے معنی میں ہے لیکن اس فرق کی کوئی واضح دلیل ہمیں کتب لغت میں نہیں ملی اگرچہ لسان العرب میں یہ ہے کہ:

انسلخ النهار من اللیل خرج منه خروجًا

دن رات سے نسلخ ہوا یعنی اس سے نکلا۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ پہلے ہی معنی سے لیا گیا ہے۔

پر مُردہ زمینوں کو زندہ کرنے کے ذکر کے بعد ـــــ دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں تبدیل ہوجانے کو' زندگی کے بعد موت کے نمونے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

بہرحال جس وقت انسان رات کی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے تو وہ نور اور اس کی برکات، ہیجانات اور اس کے منبع وجود کو یاد کرتا ہے اور ایک موازنے کے ذریعے "نور و ظلمت" کے خالق سے آشنا ہوتا ہے۔

تیسری نشانی کہ جس کی طرف رات کی نشانی کے بعد اشارہ ہُوا ہے نور، روشنی اور سورج کی نشانی ہے۔ قرآن کہتا ہے: "خورشید بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے کہ جو ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے" (والشمس تجری لمستقر لھا) [1]

یہ آیت سورج کی مسلسل اور دائمی حرکت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے لیکن اس بارے میں کہ اس حرکت سے کیا مراد ہے مفسرین نے بہت بحث کی ہے۔

بعض اسے زمین کے گرد سورج کی ظاہری حرکت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ یہ حرکت اس عالم کے اختتام تک جاری و ساری ہے ـــ کہ جو درحقیقت سورج کا ٹھکانا اور اس کی زندگی کا اختتام ہے۔

بعض نے گرمیوں اور سردیوں میں، زمین کے شمال و جنوب کی طرف، سورج کے جھکنے کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج موسم بہار کے آغاز سے خطِ اعتدال سے شمال کی طرف جھکنے لگتا ہے اور ۲۳ درجہ شمال کے مدار تک جاتا ہے اور گرمیوں کے آغاز سے پیچھے کی طرف لوٹتا ہے یہاں تک کہ آغازِ خزاں تک خطِ اعتدال تک پہنچ جاتا ہے اور اسی خط پر وہ اپنا سفر سردیوں کے آغاز تک جنوب کی طرف جاری رکھتا ہے اور سردیوں کے آغاز سے خطِ اعتدال کی طرف حرکت کرتا ہے اور آغازِ بہار میں وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

البتہ یہ تمام حرکتیں حقیقت میں زمین کی حرکت اور اس کے محور کے اس کے مدار کی نسبت جھکاؤ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ ظاہر میں سورج کی حرکت محسوس ہوتی ہے۔

بعض دوسروں نے اسے "کرہ آفتاب" کی حرکتِ وضعی کی طرف اشارہ جانا ہے کیونکہ ماہرین اور سائنسدانوں کی تحقیق نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ سورج خود اپنے محور کے گرد گردش کرتا ہے [2]

زیرِ بحث آیت کی آخری اور جدید ترین تفسیر وہی ہے جو ماہرین نے کشف کی ہے اور وہ سورج کا،

---

[1] اس جملے کی ترکیب میں دو احتمال ہیں، پہلا یہ کہ "الیل" پر عطف ہے۔ اس صورت میں معنی اس طرح ہوگا "وآیۃ لھم الشمس" (اور سورج ان کے لیے آیت ہے) اور دوسرا یہ کہ الشمس مبتدا ہے اور تجری اس کی ضمیر ہے۔ ہم نے پہلے احتمال کو اختیار کیا ہے۔

[2] اس تفسیر کے مطابق "لمستقر لھا" میں "لام" "فی" کے معنی میں ہے۔

ہماری کہکشاؤں کے وسط میں، تمام نظامِ شمسی کے ساتھ ایک معین سمت اور دور دراز کے ستارے کی طرف کہ جسے "وگا" کہتے ہیں، حرکت کرتا ہے۔

یہ سب معانی ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تضاد نہیں رکھتے اور ممکن ہے کہ "تجری" ان تمام حرکات اور بعض دوسری حرکات کی طرف بھی اشارہ ہو کہ جن تک ہمارا علم نہیں پہنچا اور شاید آئندہ زمانے میں وہ معلوم ہو جائیں۔

بہرحال سورج کے اتنے بڑے عظیم کرے کو حرکت دینا کہ جو ہماری زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے اور وہ بھی اس فضائے بیکراں میں پورے حساب کتاب کے ساتھ حرکت دینا، کسی کے بس میں نہیں ہے سوائے اس خدا کے کہ جس کی قدرت تمام قدرتوں سے مافوق ہے اور جس کا علم غیر متناہی ہے۔ اسی بنا پر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "یہ خدائے قادر و دانا کی تقدیر ہے" (ذٰلک تقدیر العزیز العلیم)۔

اس آیہ کے سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ اس کی تعبیرات میں شمسی سال کے پُرمعنی نظام کی طرف اشارہ ہے کہ جو مختلف بروج میں سورج کے حرکت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسا نظام کہ جو انسانی زندگی کو نظم و ضبط اور پروگرام دیتا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو منظم کرتا ہے۔

⁂

اس لیے بعد والی آیت میں اس بحث کی تکمیل کے لیے، چاند کی حرکت اور اس کی منازل کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ جس سے مہینے کے دنوں کا نظام بنتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: "ہم نے چاند کے لیے منزلیں قرار دی ہیں اور جس وقت وہ ان منزلوں کو طے کر لیتا ہے تو آخر کار کھجور کی پرانی شاخ کی مانند، کمان کی صورت اور زرد رنگ اختیار کر لیتا ہے" (والقمر قدرناہ منازل حتیٰ عاد کالعرجون القدیم)۔

"منازل" سے مراد وہی اٹھائیس منزلیں ہیں کہ جنہیں چاند "محاق" اور مطلق تاریکی سے پہلے طے کرتا ہے۔ کیونکہ جس وقت مہینے کے تیس دن پورے ہوں تو وہ اٹھائیس راتوں تک آسمان پر دیکھا جاسکتا ہے لیکن اٹھائیسویں رات بہت ہی باریک، زرد رنگ، کم نور ہلال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور باقی دو راتوں میں نظر بھی نہیں آتا۔ کہ جسے "محاق" کا نام دیتے ہیں لیکن وہ مہینے جو انتیس دن کے ہوتے ہیں ان میں ستائیسویں رات تک چاند آسمان پر نظر آتا ہے اور باقی دو راتیں "محاق" کی ہیں۔

یہ منزلیں مکمل طور پر حساب شدہ ہیں اس طرح سے کہ منجمین سینکڑوں سال پہلے اپنے دقیق حساب کتاب کے مطابق پیش گوئی کر سکتے ہیں۔

یہ عجیب و غریب نظام انسانوں کی زندگی کو نظم و ضبط بخشتا ہے اور یہ ایک طبیعی آسمانی تقویم ہے کہ جسے ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ بخوبی پڑھ سکتا ہے۔ اس طرح سے کہ اگر انسان مختلف راتوں میں چاند کی کیفیت میں تھوڑا سا غور کرے تو اسے دیکھنے سے ہی صحیح صحیح یا قریب قریب جان سکتا ہے کہ یہ رات مہینے کی کون سی

رات ہے (ہم نے خود اس بات کو آزمایا ہے)۔

کیونکہ ابتدائے ماہ میں چاند کی نوکیں اوپر کی طرف ہوتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ چاند کے حجم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ساتویں تک پورے چاند کا آدھا دائرہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ چودھویں رات کو بدر کامل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے بعد چاند نیچے کی سمت سے گھٹتا اور کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اکیسویں تک (گھٹتے گھٹتے) پھر آدھے دائرے کی شکل میں ہو جاتا ہے اور اسی طرح اس میں کمی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اٹھائیسویں شب کو ضعیف اور کم رنگ ہلال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس رات اس کی نوکیں نیچے کی طرف ہوتی ہیں۔

ہاں! انسانوں کی زندگی کی بنیاد تنظیم سے ہی درست رہتی ہے اور نظم و ضبط، زمانہ اور وقت کے دقیق تعین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ خدا نے آسمان میں یہ ماہانہ اور سالانہ دقیق تقویم اسی مقصد کے لیے قرار دی ہے۔

یہیں سے "کالعرجون القدیم"[1] کی لطیف تعبیر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ "عرجون" جیسا کہ اکثر مفسرین اور ارباب لغت نے بیان کیا ہے، کھجور کے خوشے کے اس حصے کو کہتے ہیں کہ جو درخت سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ خرمے خوشے کی شکل میں درخت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس خوشے کا نچلا حصہ زرد رنگ کمان کی شکل میں ہوتا ہے کہ جو درخت کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور اس کی نوک جارو کی طرح ہوتی ہے اور خرمے کے دانے انگور کے دانوں کی طرح اس کے دھاگوں کے ساتھ متصل ہوتے ہیں۔ جس وقت کھجور کے خوشے کو کاٹتے ہیں تو وہ قوسی شکل کا نچلا حصہ درخت پر باقی رہ جاتا ہے اور جس وقت وہ خشک اور پژمردہ ہو جاتا ہے تو مکمل طور پر "محاق" سے پہلے والے ہلال کی طرح ہوتا ہے کیونکہ جس طرح آخری ماہ میں ہلال آسمان کے مشرق کی طرف صبح کے وقت یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خمیدہ، پژمردہ اور زرد رنگ ہوتا ہے اور اس کی نوکیں نیچے کی طرف ہوتی ہیں "عرجون القدیم" بھی اسی طرح ہوتا ہے۔

حقیقت میں یہ مشابہت مختلف جہات میں ظاہر ہوتی ہے۔ کھجور کے خوشے کی لکڑی کے ہلالی نما ہونے کے لحاظ سے زرد رنگ ہونے کے لحاظ سے پژمردگی کے لحاظ سے اس کی قوس کی نوک کے نچلی طرف مائل ہونے کے لحاظ سے اور کھجور کے درخت کی سبز رنگ شاخوں کے درمیان ہونے کے لحاظ سے کہ جو سیاہ رنگ آسمان پر آخری رات کے ہلال کے قرار پانے

---

[1] "عرجون" بعض ارباب لغت کے مطابق "انعراج" کے مادہ سے "اعوجاج" اور "انعطاف" (ٹیڑھے پن اور جھکاؤ) کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اس بنا پر اس کی نون زائد ہے اور "فعلون" کے وزن پر ہے لیکن بعض دیگر کے نزدیک یہ لفظ "عرجن" کے مادہ سے لیا گیا ہے اور اس کی نون اصلی ہے اور یہ شاخ کے نچلے حصے کے معنی میں ہے کہ جو ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور کھجور کے درخت پر باقی رہ جاتا ہے اور "قدیم" ہر اس کہنہ اور پرانی چیز کے معنی میں ہے کہ جسے ایک زمانہ گزر گیا ہو۔

کے ساتھ غیر مشابہ نہیں ہے۔

تیز اسے "قدیم" کہنا اس کی کہنگی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس قدر یہ شاخیں، زیادہ کہنہ ہو جاتی ہیں اسی قدر زیادہ باریک اور زیادہ زرد رنگ ہو جاتی ہیں! آخر ماہ کے ہلال سے زیادہ مشابہ ہو جاتی ہیں سبحان اللہ ایک چھوٹی سی تعبیر میں کتنی لطافتیں اور کیسی کیسی زیبائیاں پنہاں ہیں۔

* * *

آخری زیر بحث آیت میں سال، ماہ اور شب و روز کے اس نظام کے ثبات و دوام کے بارے میں گفتگو ہے۔ پروردگار نے ان کے لیے اس طرح سے پروگرام منظم کیا ہے کہ ان کی کیفیت میں معمولی سا اختلاف بھی پیدا نہیں ہوتا اور تاریخ بشر اسی ثبات کی بنا پر مکمل طور سے منظم رہتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "نہ تو سورج کے بس میں ہے کہ چاند تک پہنچ جائے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں" (لا الشمس ینبغی لها ان تدرك القمر ولا الليل سابق النهار وكل فی فلك يسبحون)۔

ہم جانتے ہیں کہ سورج اپنا دورہ بارہ برجوں میں ایک سال میں مکمل کرتا ہے۔ جبکہ چاند اپنی منزلوں کو ایک مہینے میں طے کرتا ہے۔

اس بنا پر چاند کا اپنے مدار میں گردش کرنا، سورج کی اپنے مدار میں گردش سے بارہ گنا زیادہ تیز ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ سورج اپنی گردش میں ہرگز چاند تک نہیں پہنچتا اور وہ اپنی ایک سالہ حرکت کو ایک ماہ میں انجام نہیں دیتا اور سالانہ نظام درہم برہم نہیں ہوتا۔

اسی طرح رات دن پر سبقت حاصل کر کے اس کا ایک حصہ اپنے اندر داخل نہیں کر لیتی کہ موجودہ نظام ٹوٹ جائے بلکہ یہ سب کے سب اپنا سفر ہزاروں سال سے بغیر کسی تبدیلی کے جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس بحث میں سورج کی حرکت سے مراد اس کی وہ حرکت ہے کہ جو ہماری حس کے مطابق ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ تعبیر اس امر کے پایۂ ثبوت کو پہنچ جانے کے بعد بھی ــ کہ سورج اپنی جگہ پر ساکن ہے اور زمین ایک سال کی مدت میں اس کے گرد چکر لگاتی ہے ــ کارآمد ہے، مثلاً آج بھی ہم یہ کہتے ہیں کہ سورج برج حمل میں داخل ہو گیا ہے یا سورج دائرۂ نصف النہار پر پہنچ گیا ہے یا اس کا میل کلی تک پہنچنا ہے (میل کلی سے مراد گرمیوں کی ابتداء میں نصف کرہ شمالی میں سورج کا اپنے آخری نقطہ ارتفاع تک پہنچ جانا یا اس کے برعکس سردیوں کی ابتداء میں آخری نچلی حد تک پہنچنا ہے)۔

یہ سب کی سب تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ زمین کے سورج کے گرد گردش کرنے اور

سورج کے ساکن ہونے کے انکشاف کے بعد بھی سورج کی حرکت سے متعلق گزشتہ تعبیرات ہی استعمال ہوتی ہیں کیونکہ حسّی طور پر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ سورج حرکت میں ہے۔

سورج اور چاند کا اپنے اپنے افلاک میں تیرنے (کل فی فلک یسبحون) کا مفہوم بھی یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ سورج کے اپنے فلک میں تیرنے سے مراد نظامِ شمسی اور اس کہکشاں کے ساتھ اس کا حرکت کرنا ہے کہ جس میں ہم موجود ہیں۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارا نظامِ شمسی اس عظیم کہکشاں کا ایک جُزء ہے کہ جو خود اپنے گرد گردش کر رہی ہے[1]

کیونکہ " فلک " جیسا کہ اربابِ لغت نے بیان کیا ہے اصل میں لڑکیوں کے پستان اُبھرنے اور گول شکل اختیار کرنے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ زمین کے ان قطعات کے لیے کہ جو گول ہیں یا دوسری گول چیزوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اسی بنا پر سیاروں کی گردش کے راستوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

" کل فی فلک یسبحون " کا جملہ بہت سے مفسرین کے نظریے کے مطابق سورج ، چاند اور ستاروں میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ ہے کہ جو اپنا اپنا راستہ اور مدار رکھتے ہیں ، اگرچہ آیات میں ستاروں کا نام نہیں آیا لیکن " لیل " (رات) کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور ستاروں کا چاند اور سورج کے مانند ہونے کو دیکھتے ہوئے مذکورہ جملے سے اس معنی کو سمجھنا بعید نظر نہیں آتا۔ خاص طور پر جبکہ " یسبحون " صیغۂ جمع کی شکل میں بیان ہوا ہے۔

یہ تفسیر بھی موجود ہے کہ ممکن ہے یہ جملہ سورج ، چاند اور رات اور دن کی طرف اشارہ ہو کیونکہ رات اور دن میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک مدار رکھتے ہیں اور کرۂ زمین کے گرد گردش کرتے ہیں ، تاریکی کرۂ زمین کے نصف حصہ کو ہمیشہ چھپائے رکھتی ہے اور روشنی دوسرے نصف حصّہ پر رہتی ہے اور یہ دونوں چوبیس گھنٹوں میں ایک پورا دَور زمین کے گرد لگاتے ہیں۔

" یسبحون " " سباحت " کے مادہ سے ہے ، مفردات میں راغب کے مطابق اصل میں یہ لفظ پانی اور ہَوا میں سریع اور تیز حرکت کے معنی میں ہے[2] یہاں یہ لفظ آسمانی کُرّوں کی سریع حرکت کی طرف اشارہ کر رہا

---

[1] یہ حرکت اس حرکت کے علاوہ ہے کہ جو پورے نظامِ شمسی کی کہکشاں کے اندر ہے کہ جو ستارہ " وگا " کی طرف حرکت میں ہے اور اس کی طرف ہم نے اشارہ بھی کیا ہے۔

[2] یہ جو خدا کے ذکر اور اس کی عبادت کو " تسبیح " کہتے ہیں تو وہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ وہ بھی پروردگار کی اطاعت و عبادت کی راہ میں ایک تیز حرکت ہے۔ (مفردات راغب مادۂ " سبح ")

ہے اور انہیں ایسی عاقل موجودات سے تشبیہ دے رہا ہے کہ جو تیزی کے ساتھ اپنی گردش جاری رکھے ہوئے ہوں۔ موجودہ زمانے میں بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ اجرام سماوی بہت ہی حیران کن تیزی کے ساتھ اپنے مدار میں حرکت کرتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ سورج کی "دورانی" اور جریانی حرکت: عربی زبان میں "دوران" دائرہ کی صورت میں حرکت کو کہتے ہیں جبکہ "جریان" طولی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں قرآن سورج کے لیے جریانی حرکت کا بھی قائل ہے اور دورانی حرکت کا بھی۔ ایک جگہ کہتا ہے: "والشمس تجری ...." اور دوسری جگہ سورج کے فلک میں تیرنے (دائرے کی صورت میں حرکت) کی بات کرتا ہے: "کل فی فلک یسبحون"

جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، ہیئت بطلیموس کا مفروضہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ محافلِ علمی میں تسلیم شدہ تھا۔ اس مفروضے کے مطابق اجرام فلکی کی اپنی کوئی حرکت نہیں بلکہ وہ افلاک کے اندر میخوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں جبکہ افلاک پیاز کے چھلکوں کے مانند ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ بلوریں اجسام کی صورت میں ہیں اور اجرام فلکی کی حرکت ان کے افلاک کی حرکت کے تابع ہے۔ اس بنا پر اُس زمانے میں نہ سورج کا تیرنا کوئی مفہوم رکھتا تھا اور نہ ہی اس کی طولی و جریانی حرکت۔

لیکن حالیہ صدیوں کے انکشافات نے بطلیموس کے مفروضے کو ختم کر دیا اور اجرام آسمانی کے بلوریں افلاک سے آزاد قرار دے دیا۔ اس کے بعد اس نظریے نے قوت پکڑی کہ سورج نظامِ شمسی کے مرکز میں ثابت اور غیر متحرک ہے اور سارا نظامِ شمسی پروانہ وار اس کے گرد گھومتا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر بھی زیرِ بحث آیات کی تعبیروں کا مفہوم واضح نہیں تھا کیونکہ یہ تو سورج کی طرف طولی اور جریانی حرکت کی نسبت دے رہی تھیں۔

یہاں تک کہ سائنس نے اپنی پیش رفت مزید جاری رکھی اور آخر کار سورج کی چند ایک حرکات ثابت ہو گئیں:

(۱) اس کی خود اپنے گرد وضعی حرکت۔

(۲) نظامِ شمسی کے ساتھ آسمان کے ایک مشخص نقطے کی طرف اس کی طولی حرکت۔

(۳) اس کی دورانی حرکت اس کہکشاں کے مجموعے کے ساتھ کہ جس کا یہ سورج حصّہ ہے۔

اس طرح سے قرآن کا ایک اور علمی معجزہ ثبوت کو پہنچ گیا۔

اس مسئلے کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ہم اس بحث کا ایک حصہ یہاں پیش کرتے ہیں کہ جو ایک دائرۃ المعارف

میں سورج کی حرکت کے بارے میں بیان ہُوا ہے:

سورج "ظاہری" حرکات (یومیہ حرکت اور سالانہ حرکت) اور "واقعی" حرکات کا حامل ہے۔

سورج کرۂ آسمانی کی یومیہ اور ظاہری حرکت میں شریک ہے۔ ہمارے آدھے کرہ میں مشرق سے طلوع کرتا ہے، جنوب کی طرف نصف النہار کے مقام سے گزرتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے۔ نصف النہار سے اس کا عبور حقیقی ظہر کو مشخص کرتا ہے۔

سورج کی ایک سالانہ "ظاہری" حرکت زمین کے گرد بھی ہے کہ جو اس کو ہر "روز" مغرب سے مشرق کی طرف تقریباً ایک درجہ لے جاتی ہے۔ اس حرکت میں سورج سال میں ایک مرتبہ بُرجوں کے سامنے سے گزرتا ہے۔ اس حرکت کا مدار "دائرۃ البروج" میں واقع ہے۔ یہ حرکت علم نجوم کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ "اعتدالین" و "انقلاب" اور "میل کلی" اسی کے ساتھ مربوط ہے اور شمسی سال اسی سے وجود پاتا ہے۔

ان ظاہری حرکات کے علاوہ کہکشاں کی حرکت دورانی سورج کو قریباً گیارہ لاکھ تیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کے ساتھ فضا میں گردش دیتی ہے لیکن کہکشاں کے اندر بھی سورج ثابت و ساکن نہیں ہے بلکہ قریباً بہتر ہزار چار سو کلومیٹر کی رفتار سے صورت فلکی (جاثی علی رکبتیہ)[1] کی جانب حرکت کرتا ہے۔

اور یہ جو ہم فضا میں سورج کی اس تیز حرکت سے بے خبر ہیں، تو یہ اجرام فلکی کے دُوری ہونے کی وجہ سے ہے، کہ جو اس خاص حرکت وضعی کی تشخیص کا ماخذ بھی ہے۔

سورج کی حرکت وضعی اس کے استوا میں تقریباً پچیس دن میں ہوتی ہے۔[2] و [3]

۲۔ "تدرک" اور "سابق" کی تعبیر: قرآنی تعبیرات اس قدر جچی تلی ہوتی ہیں کہ جن کی باریکیاں شمار نہیں ہوسکتیں۔ زیر بحث آیات میں جس وقت سورج اور چاند کی ماہانہ اور سالانہ گردش کے سلسلے میں ظاہری حرکت کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے، تو قرآن یہ کہتا ہے کہ "سورج کے لیے سزاوار نہیں ہے کہ وہ چاند تک پہنچ جائے" (کیونکہ چاند اپنے سفر کو ایک ماہ میں طے کرتا ہے اور سورج ایک سال میں، تیز رفتاری کا

۱۔ "جاثی علی رکبتیہ" ستاروں کا ایک مجموعہ ہے کہ جو ایک فلکی صورت تشکیل دیتا ہے۔ یہ اس شخص سے مشابہ ہے کہ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا اور کھڑا ہونے کے لیے تیار ہو اور یہ تعبیر اس معنی سے لی گئی ہے۔

۲۔ یعنی سورج ہمارے پچیس شب و روز میں ایک مرتبہ اپنے گرد گردش کرتا ہے۔ یہ امر ماہرین نے سورج کے سطحی ٹکڑوں کے مطالعہ سے اخذ کیا ہے کیونکہ انھوں نے دیکھا ہے کہ یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اور پچیس دنوں کے بعد پھر مکمل طور پر اپنی جگہ پر واپس آجاتے ہیں۔

۳۔ دائرۃ المعارف "دہخدا" مادہ خورشید، جلد ۲۲۔

یہ فرق اس قدر ہے کہ یہ ہرگز اس تک نہیں پہنچ سکتا (لا الشمس ینبغی لھا ان تدرك القمر)۔

لیکن دن رات کے بارے میں وہ آپس میں چنداں فاصلہ نہیں رکھتے اور بالکل ایک دوسرے کے پیچھے موجود ہیں۔

۳- انسانی زندگی میں نور و ظلمت کا نظام: آیات زیرِ بحث میں دو ایسے موضوعات کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسانی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور انہیں آیاتِ الٰہی قرار دیا گیا ہے اور وہ ہیں رات کی تاریکی اور دوسرا سورج اور اس کی روشنی۔

اس سے پہلے بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ نور، عالم مادہ کے موجودات میں سے لطیف ترین اور پُربرکت ترین موجود ہے۔ نہ صرف روشنی اور ہماری زندگی بلکہ ہر حرکت سورج کے نور کے ساتھ وابستگی رکھتی ہے۔ بارش کے قطروں کا نزول، نباتات کی نشو و نما، غنچوں کا چٹخنا، پھلوں کا پکنا، ندی نالوں کا زمزمہ، انسانوں کے دسترخوان پر انواع و اقسام کی غذائیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے کارخانوں کے پہیوں کا چلنا، بجلی اور طرح طرح کی صنعتی پیداوار سب کا تعلق توانائی (ENERGY) کے اسی عظیم منبع ــ یعنی سورج کی روشنی سے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کرۂ زمین کی تمام توانائیاں (سوائے اس توانائی کے جو ایٹم کے ذرے کو توڑنے سے پیدا ہوتی ہے) سورج کے نور سے مدد لیتی ہیں اور اگر وہ نہ ہوتا تو ہر جگہ خاموشی ہوتی اور ہر چیز بے روح، بے نور، بے حرکت اور مُردہ ہوتی۔

رات کی تاریکی اگرچہ موت اور فنا کی بُو دیتی ہے لیکن نورِ آفتاب کی تبدیلی کے لحاظ سے اور جسم و روح کے آرام و سکون نیز سورج کی روشنی کی ایک ہی طرح کی تپش کے خطرات سے بچانے میں اس کا کردار انسانوں کے لیے حیات بخش شمار ہوتا ہے کیونکہ اگر رات اور دن باری باری نہ آتے تو کرۂ زمین میں حرارت اتنی بڑھ جاتی کہ تمام چیزوں کو آگ لگ جاتی۔ جیسا کہ چاند میں طولانی راتیں اور دن ہیں (ہر ایک کرۂ زمین کے پندرہ رات دن کے برابر ہے) اگر یوں ہوتا تو دنوں میں تباہ کن گرمی ہوتی اور راتوں کو ہولناک سردی ہوتی۔

اس بنا پر ان دونوں (نور و ظلمت) میں سے ہر ایک آیاتِ الٰہیہ میں سے ایک عظیم آیت ہے۔

اس سے قطع نظر ایک بہت ہی دقیق نظام کہ جو ان دونوں پر حاکم ہے، انسانوں کی زندگی کی منظم تاریخ کو وجود میں لانے والا ہے۔ ایسی تاریخ کہ اگر وہ نہ ہوتی تو اجتماعی روابط ختم ہو کر رہ جاتے اور انسان کے لیے زندگی بہت مشکل ہو جاتی۔ اس لحاظ سے بھی یہ دونوں آیاتِ الٰہی میں سے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن ان آیات میں کہتا ہے کہ: "رات دن پر سبقت حاصل نہیں کرتی" یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دن کو رات سے پہلے خلق کیا گیا ہے اور رات اس کے بعد میں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اگر کوئی شخص کرۂ زمین کے باہر سے نگاہ کرے تو وہ ان دونوں کو دو سیاہ و سفید موجودات کے

مانند دیکھے گا کہ جو مسلسل کرۂ زمین کے گرد گردش کر رہے ہیں، اور اس دائرے کی حرکت میں پہلے اور بعد کا تصور نہیں ہو سکتا۔

لیکن ہمیں اس حقیقت پر توجہ دینا چاہیئے کہ ہماری زمین کا یہ کرہ پہلے سورج کا ہی ایک جزء تھا اور اس وقت ہر جگہ دن ہی دن تھا اور رات کا کوئی وجود ہی نہیں تھا، لیکن جونہی زمین اس سے جُدا ہوئی تو اس کا مخروطی شکل کا سایہ نورِ آفتاب کی مخالف سمت میں پڑا تو رات پیدا ہوگئی، وہ رات کہ جو دن کے پیچھے حرکت کر رہی ہے۔ اس پہلو پر نظر کرنے سے یہاں اس تعبیر کی دقت و گہرائی اور لطافت واضح ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے نہ صرف سورج اور چاند اس فضائے بیکراں میں تیر رہے ہیں بلکہ رات اور دن بھی اس فضا میں کرۂ زمین کے گرد تیر رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک مدار اور گردش کی رہگذر رکھتا ہے۔

ایسی بہت سی روایات میں بھی کہ جو اہلِ بیت علیہم السلام سے منقول ہیں، اس معنی کی تصریح ہوئی ہے کہ خدا نے دن کو رات سے پہلے پیدا کیا ہے۔

ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

خلق النهار قبل الليل

"دن کو رات سے پہلے خلق کیا گیا ہے۔"[1]

ایک دوسری روایت میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے:

النهار خلق قبل الليل

"دن رات سے پہلے خلق ہوا۔"

پھر امامؑ نے "لا الشمس ينبغي لها ان تدرك القمر ولا الليل سابق النهار" کی آیت سے اس سلسلے میں استدلال فرمایا۔[2]

اسی مطلب کی ایک حدیث امام باقرؑ سے بھی بصورت ذیل منقول ہے:

ان الله عزوجل خلق الشمس قبل القمر وخلق النور قبل الظلمة۔

"خدائے بزرگ نے سورج کو چاند سے پہلے اور نور کو ظلمت سے پہلے خلق کیا۔"[3]

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نور الثقلین، جلد ۴ ص ۳۸۰، بحوالہ احتجاج طبرسی۔

[3] نور الثقلین، جلد ۴ ص ۳۸۰، بحوالہ روضۃ الکافی۔

(۴۱) وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝

(۴۲) وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ۝

(۴۳) وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ۝

(۴۴) اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝

ترجمہ

(۴۱) یہ بھی ان کے لیے (عظمتِ پروردگار کی) ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو (وسائل زندگی اور سازوسامان سے) بھری ہوئی کشتیوں میں سوار کیا۔

(۴۲) اور ہم نے ان کے لیے اُس جیسی دوسری سواریاں بھی پیدا کیں۔

(۴۳) اور اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں، اس طرح سے کہ نہ تو کوئی ان کا فریادرس ہو اور نہ ہی کوئی انہیں دریا سے نکال سکے۔

(۴۴) مگر یہ کہ پھر دوبارہ ہماری رحمت ہی ان کے شامل حال ہو اور ایک معین وقت تک وہ اس زندگی سے بہرہ ور ہوں۔

تفسیر

کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا بھی آیتِ الٰہی ہے

اگرچہ قرطبی اور بعض دوسرے مفسرین نے زیر بحث پہلی آیت کو اس سورہ کی پیچیدہ ترین آیت شمار

کیا ہے لیکن ان آیات میں غور کرنے اور گزشتہ آیات سے ان کا تعلق دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ ان آیات کی تفسیر میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں ہے کیونکہ گزشتہ آیات میں سورج، چاند، رات، دن اور اسی طرح زمین اور زمین کی برکات کی خلقت میں پروردگار کی نشانیوں کے بارے میں گفتگو تھی جبکہ زیر بحث آیات میں دریاؤں اور سمندروں کی نعمتوں یعنی ان میں تجارتی اور مسافر بردار کشتیوں اور جہازوں کے چلنے کے بارے میں گفتگو ہے۔

علاوہ ازیں کشتیوں کا سمندر کے اندر چلنا، آسمانی ستاروں کی فضا کے سمندر میں حرکت کرنے کے ساتھ غیر مشابہ نہیں ہے۔

اس لیے پہلے فرمایا گیا ہے کہ "یہ بھی ان کے لیے عظمت پروردگار کی ایک نشانی ہے کہ ہم ان کی اولاد و ذریت کو ان کشتیوں میں کہ جو وسائل زندگی سے پُر ہیں، سوار کرتے ہیں" (و اٰیة لهم انا حملنا ذریتهم فی الفلك المشحون)۔

"لهم" کی ضمیر نہ صرف مشرکین مکہ کی طرف بلکہ ان تمام عباد اور بندگان خدا کی طرف لوٹتی ہے کہ جن کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو تھی۔

"ذریة" جیسا کہ راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے، اصل میں چھوٹی اولاد کے معنی میں ہے اگرچہ بعض اوقات تمام چھوٹی بڑی اولاد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ لفظ مفرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع کے معنی میں بھی۔

قرآن کہتا ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو (یا چھوٹی اولاد کو) ان کشتیوں میں سوار کیا۔ گویا اولاد کے بارے میں گفتگو ہے اور خود ان کے بارے میں کوئی بات نہیں۔ شاید یہ اس مناسبت سے ہے کہ بچے اس سواری کی زیادہ احتیاج رکھتے ہیں کیونکہ بڑی عمر کے لوگ تو دریاؤں کے ساحل کے ساتھ ساتھ چل کر بھی راستہ طے کر لیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر یہ تعبیر ان کے احساسات و میلانات کی تحریک کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

لفظ "مشحون" (مملو اور پُر) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ صرف وہ خود کشتی میں سوار ہوتے ہیں بلکہ ان کے مال تجارت اور ضروریات زندگی کی نقل و حمل بھی اس کے ذریعے ہوتی ہے۔ بعض نے اس آیت میں "فلك" سے خاص طور پر حضرت نوحؑ کی کشتی مراد لی ہے اور "ذریة" کی آباؤ اجداد کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ "ذرا" کے مادہ سے خلقت کے معنی میں ہے۔

یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے ہاں اگر اس سے مراد ایک واضح مصداق بیان کرنا ہو تو پھر ٹھیک ہے۔

بہر حال کشتیوں کا چلنا کہ جو بشر کے لیے نقل و حمل کا ایک عظیم اور اہم ترین ذریعہ ہے اور ان سے

جو کام لیا جاتا ہے وہ دوسرے ذرائع نقل و حمل کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے پانی کے اپنے خواص کا، ان اجسام کے مخصوص وزن کہ جن سے کشتی بنتی ہے، بادبانی کشتیوں کے لیے ہواؤں کی خاصیت کا ——— انجن والی کشتیوں کے بخارات کی قوت کا اور ان کشتیوں میں کہ جو ایٹمی طاقت سے کام کرتی ہیں ایٹمی توانائی کا۔

یہ سب ایسی قوتیں اور طاقتیں ہیں کہ جنہیں خدا نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک (علیحدہ علیحدہ بھی) اور مجموعی طور پر بھی آیات الٰہی میں سے ہیں۔

نیز اس بناپر کہ یہ وہم نہ ہو کہ خداداد سواریاں صرف کشتیاں ہی ہیں اس کے بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "ہم نے ان کے لیے دوسری سواریاں بھی ان کے مانند خلق کی ہیں" (وخلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون)۔ وہ سواریاں کہ جو خشکی یا ہوا اور فضا میں چلتی ہیں اور انسانوں اور ان کے سازوسامان کو اپنے دوش پر اٹھاتی ہیں۔

اگرچہ بعض نے خصوصیت کے ساتھ یہاں اونٹ مراد لیا ہے جس کا نام "صحرائی کشتی" یا "صحرا کا جہاز" پڑ گیا ہے۔ بعض نے تمام چوپائے مراد لیے ہیں اور بعض نے ہوائی جہاز اور فضائی کشتیاں مراد لی ہیں جو ہمارے زمانے میں بنی ہیں (اور ان کے بارے میں "خلقنا" کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ ان کا مواد اور وسائل پہلے سے خلق شدہ ہیں)۔

لیکن آیت کی تعبیر کا اطلاق ایک وسیع مفہوم کی تصویر پیش کرتا ہے کہ جس میں یہ سب اور ان کے علاوہ اور دوسری سواریاں بھی موجود ہیں۔

البتہ قرآن کی متعدد آیات میں "انعام" (چوپائے کا) "فلک" (کشتیوں) کے ساتھ ذکر ہوا ہے مثلاً:

وجعل لکم من الفلك والانعام ما ترکبون

کشتیوں پر بھی اور چوپاؤں میں سے بھی اس نے ایسے پیدا کیے ہیں کہ جن پر تم سوار ہوتے ہو (زخرف - ۱۲)۔

اور سورہ مؤمن کی آیت ۸۰ میں ہے:

وعلیھا وعلی الفلك تحملون

اور تم چوپاؤں اور کشتیوں پر بوجھ لادتے (اور سوار ہوتے) ہو۔

لیکن یہ آیات بھی زیر بحث آیت کے مفہوم کی عمومیت کے ساتھ تضاد نہیں رکھتیں۔

بعد والی آیت میں، اس عظیم نعمت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے، ایک حالت بیان کی گئی ہے — کہ جو اس نعمت کے دگرگوں ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ فرمایا گیا ہے: "اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کردیں اس طرح کہ نہ تو کوئی ان کا فریاد رس ہو اور نہ ہی کوئی ایسا آدمی کہ جو انہیں دریا سے باہر نکال سکے" (وان

نشأ نغرقهم فلا صريخ لهم ولا هم ينقذون)۔

ہم کسی عظیم لہر کو حکم دے دیں گے کہ وہ ان کی کشتی کو اُلٹ دے یا ایک بھنور کو مامور کر دیں گے کہ وہ انہیں نگل لے یا ایک طوفان کو حکم دے دیں گے کہ وہ انہیں ایک تنکے کی طرح اٹھا کر موجوں کے اندر پھینک دے۔

اگر ہم چاہیں تو پانی اور کشتی کی خاصیت اور ہوا چلنے کے نظام اور دریا کے سکون کو درہم برہم کر دیں تاکہ ان کی ہر چیز تباہ ہو جائے۔ یہ ہم ہی ہیں کہ جو اس نظام کو دوام بخشتے ہیں تاکہ وہ بہرہ در ہوں اور اگر ہم کبھی کبھی اس قسم کے حادثات بھیجتے ہیں تو یہ اس بنا پر ہے کہ وہ اس نعمت کی اہمیت کو سمجھیں کہ جس میں وہ مستغرق ہیں۔

"صریخ" "صراخ" کے مادہ سے، فریاد رس کے معنی میں ہے اور "ینقذون"، "انقاذ" کے مادہ سے پکڑ لینے اور نجات دینے کے معنی میں ہے۔

⁂

آخر میں آخری زیر بحث آیت — اس گفتگو کی تکمیل کے لیے مزید کہتی ہے: "مگر یہ کہ پھر بھی ہماری رحمت ہی ان کے شامل حال ہو اور وہ ایک معین زمانے تک اس زندگی سے فائدہ اٹھائیں" (الا رحمة منا ومتاعا الی حین)۔

ہاں! وہ کسی بھی ذریعے سے نجات نہیں پا سکتے مگر یہ کہ ہماری ہی رحمت کی بادِ نسیم چلے اور ہمارا ہی لطف وکرم ان کی مدد کے لیے آئے۔

"حین" وقت کے معنی میں ہے اور اس آیت میں انسان کی زندگی کے اختتام اور اس کی اجل کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے اس سے اس جہان کا اختتام مراد لیا ہے۔

ہاں وہ لوگ کہ جو کشتی پر سوار ہوتے ہیں (خواہ وہ قدیم زمانے کی چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں ہوں یا موجودہ زمانے کے کوہ پیکر سمندری جہاز) انہوں نے اچھی طرح سے اس آیت کی تعبیر کی گہرائی کو سمجھا ہے کہ دنیا بھر کے عظیم بحری جہاز، دریاؤں کی عظیم موجوں اور سمندروں کے ہولناک طوفانوں کے مقابلے میں ایک تنکے کے مانند ہیں اور اگر رحمت الٰہی انسانوں کے شامل حال نہ ہو تو ان کی نجات ممکن نہیں ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ اس مختصر سے وقفے میں کہ جو موت اور زندگی کے درمیان ہے، اپنی عظیم قدرت کی انسانوں کو نشاندہی کرائے کہ شاید راستے سے بھٹکے ہوئے انسان ہوش میں آجائیں اور اس طریقے سے اس کے راستے پر آجائیں۔

(۴۵) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

(۴۶) وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ○

(۴۷) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

ترجمہ

(۴۵) اور جس وقت ان سے یہ کہا جائے کہ جو کچھ (عذابِ الٰہی میں سے) تمہارے آگے اور پیچھے ہے اس سے ڈرو تاکہ رحمتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہو (تو وہ پرواہ نہیں کرتے)۔

(۴۶) اور ان کے پروردگار کی آیات میں سے کوئی آیت نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔

(۴۷) اور جس وقت ان سے یہ کہا جائے کہ خدا نے جو تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے (خدا کی راہ میں) خرچ کرو، تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے شخص کو کھانا کھلائیں کہ جسے خدا چاہتا تو کھلا دیتا (لہٰذا خدا نے یہی چاہا ہے کہ وہ بھوکا رہے) تم تو محض کھلی گمراہی میں ہو۔

تفسیر

وہ تمام آیاتِ الٰہی کو نظر انداز کر دیتے ہیں

گزشتہ آیات میں، وسیع عالمِ ہستی سے متعلق پروردگار کی آیات کے بارے میں گفتگو تھی، اب زیرِ بحث آیات میں ہٹ دھرم کفار کا طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے کہ جو وہ آیاتِ الٰہی اور دعوتِ پیغمبر اور عذابِ الٰہی سے ڈرانے کے جواب میں پیش کرتے ہیں۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: "جس وقت ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ عذابِ الٰہی میں سے جو کچھ تمہارے آگے اور تمہارے پیچھے ہے اس سے ڈرو تاکہ رحمتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہو تو وہ پہلو تہی کرتے ہیں اور روگردان ہو جاتے ہیں" (واذا قیل لھم اتقوا ما بین ایدیکم وما خلفکم لعلکم ترحمون)[1]

"ما بین ایدیکم" (جو کچھ تمہارے سامنے ہے) "وما خلفکم" (اور جو کچھ تمہارے پیچھے ہے) سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں۔

ان میں ایک یہ ہے کہ "ما بین ایدیکم" سے مراد دنیا کی سزائیں اور عذاب ہیں کہ جن کا ایک نمونہ گزشتہ آیات میں بیان ہوا ہے اور "وما خلفکم" سے مراد آخرت کے عذاب ہیں کہ جو ان کے پیچھے ہیں۔ پیچھے کی تعبیر اس بنا پر ہے، کہ ابھی ان کی نوبت نہیں آئی، گویا وہ انسان کے پیچھے چل رہے ہیں اور انجام کار کسی دن اس تک پہنچ جائیں گے اور اس کا دامن پکڑ لیں گے، اور ان عذابوں سے پرہیز کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے عوامل مہیا نہ کیے جائیں دوسرے لفظوں میں ایسے کام نہ کیے جائیں کہ جن کی وجہ سے انسان ان عقوبتوں کے مستحق بنیں۔

اس گفتگو کا شاہد یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی میں "اتقوا" کی تعبیر یا تو خدا کے بارے میں استعمال ہوئی ہے یا قیامت کے دن اور خدائی عذاب کے متعلق۔ جبکہ حقیقت میں دونوں کی بازگشت ایک ہی معنی کی طرف ہے کیونکہ خدا سے ڈرنا اس کے عذاب سے ڈرنا ہے۔

یہ بات خود اس امر کی دلیل ہے کہ زیرِ بحث آیت میں بھی اس جہان اور دوسرے جہان میں خدائی عذاب اور سزا سے پرہیز ہی مراد ہے۔

---

[1] "واذا قیل لھم..." جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے کہ جس کا بعد والی آیت سے استفادہ ہوتا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

واذا قیل لھم اتقوا .... اعرضوا عنہ۔

جب ان سے کہا جائے کہ ڈرو تو وہ اعراض کرتے ہیں۔

بعض نے اس معنی کے برعکس تعبیر کی ہے۔ انہوں نے "مابین ایدیکم" سے عذابِ آخرت اور "ماخلفکم" سے عذابِ دنیا مراد لیا ہے کیونکہ آخرت ہمارے سامنے قرار پائی ہے (یہ تفسیر نتیجے کے لحاظ سے پہلی تفسیر سے چنداں مختلف نہیں)۔

لیکن بعض نے کہا ہے کہ "سامنے" سے مراد وہ گناہ ہیں کہ جو "پہلے" انجام پائے ہیں اور ان سے پرہیز توبہ و تلافی کے معنی میں ہے اور "پیچھے" سے مراد وہ گناہ ہیں کہ جو بعد میں انجام پائیں گے۔

بعض دوسرے مفسرین کا نظریہ ہے کہ "سامنے" سے مراد آشکارا اور ظاہری گناہ ہیں اور "پیچھے" پوشیدہ پنہاں گناہوں کے معنی میں ہے۔

بعض دوسرے "مابین ایدیکم" کو طرح طرح کے عذابِ دنیا کی طرف اشارہ اور "ماخلفکم" کو موت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں (جبکہ موت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے پرہیز کیا جاسکے)۔

بعض مفسرین جیسے "فی ظلال" کے مؤلف نے ان دونوں تعبیروں کو موجباتِ غضب اور عذابِ الٰہی کے احاطہ کے لیے کنایہ سمجھا ہے کہ جنہوں نے کافروں کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔

آلوسی نے "روح المعانی" میں اور فخر رازی نے "تفسیر کبیر" میں یعنی ہر دو نے متعدد احتمال ذکر کیے ہیں کہ جن میں سے کچھ بیان ہو چکے ہیں۔ علامہ طباطبائی تفسیر "المیزان" میں "مابین ایدیکم" کو دنیا کے شرک و معاصی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور "ماخلفکم" کو عذابِ آخرت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں[1]

حالانکہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ دونوں جملے ایک ہی چیز کی طرف اشارہ ہیں صرف زمانے کا فرق ہے نہ کہ ایک شرک و گناہ کی طرف اور دوسرا عذاب و سزا کی طرف اشارہ ہو۔

بہرحال اس جملے کی بہترین تفسیر وہی ہے کہ جو ابتدا میں بیان ہو چکی ہے اور قرآن کی مختلف آیات بھی اس پر گواہ ہیں اور وہ یہ کہ "مابین ایدیکم" سے مراد دُنیا کا عذاب ہیں اور "ماخلفکم" سے مراد آخرت کا عذاب۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں اسی مطلب پر تاکید کی گئی ہے اور دل کے ان اندھوں کی آیاتِ الٰہی اور پیغمبروں کی تعلیمات کو نظر انداز کرنے میں ہٹ دھرمی کو واضح کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے: "اُن کے پروردگار کی آیات میں سے کوئی آیت ان کے پاس نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں" (وما تأتيهم من اٰية من اٰيات ربهم الا كانوا عنها معرضين)۔

نہ تو آیاتِ انفس کا بیان ان پر مؤثر ہے اور نہ ہی آیاتِ آفاقی کا ذکر، نہ تہدید و انذار اور نہ ہی رحمت

---

[1] المیزان جلد ۱۷ ص ۹۶ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

الٰہی کی بشارت و نوید۔ نہ ہی وہ عقل و خرد کی منطق کو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی فرمانِ فطرت کو۔ وہ ان اندھوں کے مانند ہیں کہ جو اپنے اطراف کی نزدیک ترین چیزوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے یہاں تک کہ وہ تو سورج کی روشنی اور رات کی تاریکی میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد قرآن ان کی ہٹ دھرمی اور روگردانی کی ایک اہم صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "جس وقت ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کرو تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم اسے کھانا کھلائیں کہ جسے خدا چاہتا تو سیر کر دیتا تم تو واضح گمراہی میں ہو" (و اذا قیل لهم انفقوا مما رزقکم الله قال الذین کفروا للذین اٰمنوا انطعم من لو یشاء الله اطعمه ان انتم الا فی ضلال مبین)۔

یہ وہی ایک عامیانہ منطق ہے کہ جو ہر زمانے میں خود غرض اور بخیل افراد کی طرف سے پیش ہوتی رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں، اگر فلاں شخص فقیر ہے تو ضرور اس نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے خدا چاہتا ہے کہ وہ فقیر رہے اور اگر ہم تونگر اور مالدار ہیں تو ضرور ہم نے کوئی ایسا عمل انجام دیا ہے کہ ہم لطفِ خداوندی کے حامل ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر ان کا فقر اور ہماری تونگری حکمت و مصلحت کے بغیر نہیں ہے۔

وہ اس بات سے غافل ہیں کہ یہ جہان آزمائش و امتحان کا میدان ہے، خدا ایک کی تنگدستی کے ساتھ آزمائش کرتا ہے اور دوسرے کو غنا و تونگری سے اور بعض اوقات ایک ہی انسان کو دو زمانوں میں ان دونوں کے ساتھ امتحان کی بھٹی میں سے گزارتا ہے کہ کیا وہ فقر و فاقہ کے موقع پر امانت، قناعت طبع اور شکر گزاری کے مراتب بجا لاتا ہے یا سب کو پاؤں تلے روند ڈالتا ہے؟ اور تونگری کے موقع پر جو کچھ اس کے پاس ہے اُسے اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے یا نہیں؟

اگرچہ بعض نے اس آیت کو کسی مخصوص گروہ پر منطبق کیا ہے مثلاً یہود یا مشرکینِ عرب، یا دین و آئینِ انبیاء کے منکرین و ملحدین۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت عمومی مفہوم رکھتی ہے کہ جس کے مصداق ہر زمانے میں مل سکتے ہیں اگرچہ نزولِ آیت کے زمانے میں اس کے مصداق یہود یا مشرکین کے کچھ افراد تھے۔

یہ تو ہمیشہ سے ایک بہانہ تھا اور ہے کہ ایسے اشخاص کہتے ہیں: اگر خدا رازق ہے تو پھر ہم سے کیوں چاہتے ہو کہ ہم فقیروں کو کھانا کھلائیں اور خدا نے یہ چاہا ہے کہ وہ محروم رہیں تو پھر ہم کیوں کسی ایسے کو بہرہ مند کریں جسے خدا نے محروم کر رکھا ہے؟

وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ نظامِ تکوین ایک چیز کا تقاضا کرتا ہے اور نظامِ تشریع کسی دوسری چیز کا۔

نظامِ تکوین کا تقاضا ہے کہ خدا زمین کو اس کی تمام نعمتوں کے ساتھ بشر کو دے دے اور اسے تکامل و

ارتقار کی راہ طے کرنے کے لیے ان کے اعمال میں آزاد چھوڑ دے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں کچھ جبلتیں بھی خلق کی ہیں کہ جو اسے اپنے تقاضوں کے مطابق چلنے کو کہتی ہیں۔

نظام تشریع کا تقاضا ہے کہ کچھ قوانین، ایثار و قربانی، فداکاری و درگذر اور انفاق کے ذریعے سے انسانوں کی جبلت کو کنٹرول کیا جائے اور اس طریقے سے تہذیب نفوس کی جائے اور انسان کو کہ جو خلیفہ الٰہی کے مقام تک پہنچنے کی استعداد رکھتا ہے، اس طریقہ سے اس بلند مقام تک پہنچایا جائے۔ زکوٰۃ کے ذریعے نفوس کی تطہیر کی جائے، راہِ خدا میں خرچ کے ذریعے بخل کو دلوں سے دُور کیا جائے اور طبقاتی فاصلہ کہ جو انسان کی زندگی میں ہزارہا مفاسد کے پیدا ہونے کا سبب ہے، اس کو ختم کیا جائے۔

یہ بات بالکل ایسے ہے کہ کچھ افراد یہ کہیں کہ کیا ضرورت ہے جو ہم درس پڑھیں یا دوسرے کو درس پڑھائیں؟ اگر خدا چاہتا تو ہم سب کو علم دیتا تاکہ کسی شخص کو علم حاصل کرنے کی احتیاج نہ رہتی۔ کیا کوئی بھی عاقل اس منطق کو قبول کرے گا؟[1]

«قال الذین کفروا» کا جملہ کہ ان کے کفر کا ذکر کر رہا ہے، حالانکہ اس کے بجائے ضمیر سے بھی استفادہ ہو سکتا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان بہانہ سازوں کی اس خرافاتی منطق کا سرچشمہ کفر ہے۔

یہ جو مومنین سے کہا گیا ہے کہ «انفقوا مما رزقکم اللہ» (انفاق کرو اس رزق سے کہ جو خدا نے تمہیں دیا ہے) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت اصلی مالک خدا ہے اگرچہ یہ امانت چند دنوں کے لیے انسانوں کے سپرد ہوئی ہے کتنے بخیل ہیں وہ لوگ کہ جو کسی کے مال کو اسی کے حکم سے بھی دوسرے کو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں؟

"ان انتم الا فی ضلال مبین" (تم واضح گمراہی میں ہو) کی تفسیر کے بارے میں تین احتمال ہیں:

پہلا احتمال: یہ ہے کہ یہ کفار کی مومنین کے ساتھ گفتگو کا تتمہ ہے۔

دوسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ خدا کا کفار سے خطاب ہے۔

تیسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ کفار کے مقابلے میں مومنین کی گفتگو ہے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ کفار کے کلمات کے ساتھ متصل اور مربوط ہے۔ درحقیقت وہ یہ چاہتے تھے کہ مومنین کو بالمثل جواب دیں اور ان کی طرف «ضلل مبین» کی نسبت دیں۔

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ عرب اس زمانے میں مہمان نوازی میں مشہور تھے اور خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ کافروں کا مقصد یہ تھا کہ وہ مومنین کا مذاق اڑائیں کیونکہ وہ سب چیزوں کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے۔ انہوں نے بھی استہزاء کے طور پر کہا کہ اگر خدا چاہتا اور اس کی مشیت ہوتی تو فقراء کو بے نیاز کر دیتا لہٰذا ہمارے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے وہ زیادہ مناسب نظر آتی ہے (تفسیر تبیان، تفسیر قرطبی، تفسیر روح المعانی کی طرف زیر بحث آیات کے ذیل میں رجوع کریں)۔

(۴۸) وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

(۴۹) مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ○

(۵۰) فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ○

(۵۱) وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ○

(۵۲) قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ○

(۵۳) اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ○

ترجمہ

(۴۸) وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ (قیامت کا) وعدہ کب پورا ہوگا۔

(۴۹) انہیں اس کے علاوہ اور کوئی انتظار نہیں ہے کہ ایک عظیم (آسمانی) چیخ انہیں آگھیرے جبکہ وہ (دنیاوی امور میں) جھگڑ رہے ہوں۔

(۵۰) (وہ ایسے غافل ہوں گے کہ) وہ وصیت بھی نہ کرسکیں گے اور نہ ہی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر جاسکیں گے۔

(۵۱) (پھر دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو وہ یکایک (اپنی قبروں سے نکل کر) دوڑتے

ہوئے اپنے پروردگار کی (عدالت کی) طرف جائیں گے۔

(۵۲) وہ کہیں گے: وائے ہو ہم پر، ہمیں ہماری خوابگاہوں سے کس نے اٹھا دیا؟ (ہاں) یہ وہی چیز ہے کہ جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور (اس کے) رسولوں نے سچ کہا تھا۔

(۵۳) وہ ایک چیخ سے زیادہ نہیں ہوگی (ایک زور دار آواز بلند ہوگی) ناگہاں سب کے سب ہمارے پاس حاضر ہو جائیں گے۔

تفسیر

قیامت کی چیخ

گزشتہ آیات میں خرچ کرنے کے سلسلے میں کفار کی کمزور اور بہانہ ساز منطق کا ذکر کرنے کے بعد اب زیر بحث آیات میں قیامت کے بارے میں ان کے استہزاء سے بات شروع کی گئی ہے۔ نیز انکار معاد کے بارے میں ان کی بوسیدہ منطق کو دو ٹوک جواب کے ساتھ توڑ دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں توحید کے بارے میں جو گفتگو آئی ہے معاد کی گفتگو کر کے اس سلسلۂ کلام کی تکمیل کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ وعدہ جس کا تم ذکر کر رہے ہو کب پورا ہو گا" (و یقولون متیٰ ھٰذا الوعد ان کنتم صادقین)۔ یہی بات کہ تم قیام قیامت کی تاریخ کا تعین نہیں کر سکتے اس امر کی دلیل ہے کہ تم اپنی گفتگو میں سچے نہیں ہو۔

بعد والی آیت میں استہزاء کے طور پر کئے گئے اس سوال کا ایک محکم اور سنجیدہ جواب دیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے: قیام قیامت اور اس جہان کا اختتام خدا کے لیے کوئی پیچیدہ مسئلہ اور مشکل کام نہیں ہے "وہ اس کے علاوہ کسی اور چیز کے منتظر نہیں ہیں کہ ایک عظیم صیحۂ آسمانی انہیں اپنی گرفت میں لے لے اور انہیں اچانک اس حالت میں گھیر لے کہ وہ دنیاوی امور کے بارے میں جھگڑ رہے ہوں" (ما ینظرون الا صیحة واحدة تأخذھم وھم یخصمون)۔

ایک زور دار آسمانی چیخ ہی کافی ہے کہ سب لوگوں کی روح قبض کر لے ۔ ایک ہی لمحے میں ہر ایک کو اسی مکان میں اور اسی حالت میں کہ جس میں وہ ہے اچک لے ۔ اور ان کی پُر غوغا مادی زندگی ایک

خاموش اور بے صدا دنیا میں بدل دے۔ وہی دنیا کہ جو ہمیشہ سے ان کا میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔

روایاتِ اسلامی میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے:

تقوم الساعة والرجلان قد نشرا ثوبهما يتبايعانه فما يطويانه حتى تقوم! والرجل يرفع اكلته الى فيه فما تصل الى فيه حتى تقوم! والرجل يليط حوضه ليسقي ماشيته فما يسقيها حتى تقوم[1]

صیحۂ آسمانی اس طرح غفلت کی حالت میں ہو گی کہ دو آدمیوں نے کپڑے کا تھان کھولا ہو گا اور وہ معاملہ کرنے میں مشغول ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ معاملہ ختم ہو اور وہ اس کو لپیٹیں، دنیا ختم ہو جائے گی۔ کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ انہوں نے کھانے کا لقمہ لپیٹ سے اٹھایا ہو گا لیکن اس سے پہلے کہ ان کے منہ تک پہنچے صیحۂ آسمانی آن پہنچے گی اور دنیا ختم ہو جائے گی۔ کچھ لوگ حوض کی تعمیر میں مشغول ہوں گے کہ چوپایوں کو اس سے سیراب کریں اس سے پہلے کہ چوپائے سیراب ہوں قیامت برپا ہو جائے گی۔

"ماینظرون" یہاں "انتظار نہیں کریں گے" کے معنی میں آیا ہے، کیونکہ "نظر" کا مادہ جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے، کسی چیز کے مشاہدے یا ادراک کے لیے غور و فکر کرنے کے معنی میں ہے اور کبھی تأمل اور جستجو کرنے کے معنی میں ــــ اور جستجو کرنے سے حاصل شدہ معرفت کے معنی میں بھی آیا ہے۔

بنیادی طور پر "صیحہ" لکڑی یا کپڑے کو چیرنے یا پھاڑنے سے بلند ہونے والی آواز کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں ہر بلند صدا اور چیخ جیسی آواز کے لیے استعمال ہوا ہے۔ بعض اوقات طولِ قامت کے لیے بھی آیا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ:

بارض فلان شجر قد صاح

"فلاں زمین میں ایک درخت ہے کہ جو چیخ رہا ہے۔"

یعنی اس قدر لمبا ہو گیا ہے کہ گویا چیخ و پکار کر رہا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔

"یخصمون" خصومت کے مادہ سے نزاع اور جنگ کے معنی میں ہے۔

لیکن وہ کس چیز کے بارے میں جنگ و جدال کرتے ہیں، آیت میں اس کا ذکر نہیں ہوا۔ البتہ واضح

---

[1] "مجمع البیان" زیرِ بحث آیات کے ذیل میں، یہی روایت مختصر سے فرق کے ساتھ دوسری تفاسیر مثلاً تفسیر قرطبی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی آئی ہے۔

ہے کہ اس سے مراد امر دینا اور مادی زندگی کے امور میں جدال کرنا ہے۔ البتہ بعض نے اسے امرِ معاد میں جدال کے معنی میں لیا ہے جبکہ پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ اگرچہ ایسے جامع معنی مراد لینا بھی بعید نہیں جو دونوں معانی پر محیط ہو اور ہر قسم کے جنگ و جدال اور مخاصمت کو اپنے اندر لے لے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت میں موجود تمام ضمیریں مشرکینِ مکہ کی طرف لوٹتی ہیں کہ جو امرِ معاد میں شک رکھتے تھے اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے کہ قیامت کب برپا ہوگی؟

لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس سے ان کی ذات مراد نہیں ہے بلکہ ان کی نوع ہے (معاد سے غافل اور بے خبر انسانوں کی نوع) کیونکہ وہ تو مر گئے اور انہوں نے اس صیحہ آسمانی کو ہرگز نہیں سُنا ... (غور کیجئے گا)۔

بہرحال قرآن اس مختصر اور دوٹوک تعبیر کے ساتھ انہیں تنبیہ کرتا ہے کہ اوّل تو قیامت ناگہانی طور پر اور غفلت کی حالت میں برپا ہوگی اور دوسرے یہ کوئی ایسا پیچیدہ موضوع نہیں ہے کہ وہ اس کے امکان کے بارے میں بحث و مخاصمت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس ایک ہی چیخ کے ساتھ ہر چیز ختم ہو جائے گی اور دنیا تمام ہو جائے گی۔

اس لیے بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر تیز رفتار بجلی کی طرح غافلانہ ہوگا کہ انہیں وصیت کرنے تک کی بھی طاقت نہیں ہوگی اور انہیں اپنے گھر اور گھر والوں کی طرف واپس لوٹنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی (فلا یستطیعون توصیة ولا الی اهلهم یرجعون)۔

عام طور پر جب کوئی حادثہ انسان کو پیش آتا ہے تو وہ یہ احساس کرتا ہے کہ اس کی زندگی قریب الاختتام ہے لہٰذا کوشش کرتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے اپنے گھر اور ٹھکانے تک جا پہنچے اور اپنے بیوی اور بچوں کے پاس چلا جائے اور پھر اپنے ادھورے پڑے ہوئے کاموں اور اپنے پسماندگان کی سرنوشت وصیت کے ذریعے کسی نہ کسی کے ذمہ لگائے اور دوسروں کو ان کے بارے میں سفارش کر جائے۔

مگر کیا دنیا کے خاتمہ کی چیخ کسی کو مہلت دے گی یا بالفرض مہلت ہو بھی تو کیا کوئی زندہ بچے گا کہ وہ کسی انسان کی وصیت کو سنے یا کیا مثلاً بیوی اور اولاد اپنے شوہر اور باپ کے سرہانے بیٹھیں گے اور اس کا سر اپنی آغوش میں لیں گے تاکہ وہ آرام و سکون کے ساتھ جان دے دے؟ ان امور میں سے کوئی چیز بھی ممکن نہیں ہے۔

اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "توصیة" نکرہ کی صورت میں آیا ہے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں ایک وصیت اور چھوٹی سی سفارش کرنے تک کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔

* * *

اس کے بعد ایک دوسرے مرحلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو موت کے بعد حیات کا مرحلہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "(پھر دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو وہ یکایک (اپنی) قبروں سے (نکل کر) دوڑتے ہوئے اپنے پروردگار کی (عدالت کی) طرف جائیں گے" (و نفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الیٰ ربھم ینسلون)۔

مٹی اور بوسیدہ ہڈیاں حکم پروردگار سے لباس حیات زیب تن کر لیں گی اور قبر سے نکل آئیں گی اور حساب و کتاب کے لیے سب کے سب اس عجیب عدالت میں حاضر ہو جائیں گے جس طرح سے ایک ہی "صیحہ" کے ساتھ سب مر گئے تھے اسی طرح سے ایک ہی "نفخہ (صور پھونکنے)" سے سب کے سب زندہ ہو جائیں گے۔ نہ ان کا مارنا خدا کے لیے کوئی مشکل کام ہے اور نہ ہی ان کا زندہ کرنا۔ ٹھیک اس بگل کے مانند کہ جو لشکر کو جمع کرنے اور تیار کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے تو ایک ہی لمحے میں وہ سب کے سب نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں اور خیموں سے باہر دوڑ پڑتے ہیں اور صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا کے لیے مُردوں کو زندہ کرنا بھی اسی طرح آسان اور سریع ہے۔

"اجداث" "جدث" (بروزن "قفس") کی جمع ہے اور قبر کے معنی میں ہے' یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ معاد و قیامت جنبۂ روحانی کے علاوہ جنبۂ جسمانی بھی رکھتی ہے اور اسی پہلے والے جسم کے مواد سے ہی جدید جسم تیار ہوگا۔

"نفخ" (پھونکا جائے گا) کی تعبیر فعل ماضی کی شکل میں اس بنا پر ہے چونکہ عرب آئندہ کے یقینی مسائل کو عام طور پر فعل ماضی کی صورت میں بیان کرتے ہیں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے، گویا یہ کام پہلے سے ہو چکا ہے۔

"ینسلون" "نسل" (بروزن "فصل") کے مادہ سے سریع اور تیزی کے ساتھ چلنے کے معنی میں ہے۔ راغب مفردات میں کہتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں کسی چیز سے جدا ہونے کے معنی میں ہے اور یہ جو انسان کی اولاد کو "نسل" کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے ماں باپ سے جدا ہوتے ہیں (اس بنا پر جب انسان سرعت کے ساتھ دور ہوتا ہے اور جدا ہو جاتا ہے تو یہ تعبیر استعمال ہوتی ہے)۔

"ربھم" (ان کا پروردگار) کی تعبیر گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی ربوبیت' مالکیت اور پرورش ظاہر کرتی ہے کہ حساب و کتاب اور معاد و قیامت ہونا چاہیئے۔

بہر حال آیات قرآنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا اختتام اور دوسرے جہان کا آغاز دونوں ایک ہی جنبش انقلابی کے ساتھ اچانک صورت پذیر ہوگا اور ان میں سے ہر ایک کو نفخہ (صور پھونکنا) سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس کی مکمل تشریح انشاء اللہ سورہ زمر کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں آئے گی۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے "اس وقت قیامت اور معاد کے منکر یہ کہیں گے کہ وائے ہو ہم پر ہمیں کس نے ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا ہے" (قالوا یا ویلنا من بعثنا من مرقدنا)۔

"یہ تو وہی چیز ہے کہ جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور اس کے رسولوں نے سچ کہا تھا" (ھٰذا ما وعد الرحمٰن وصدق المرسلون)۔

ہاں! یہ منظر ایسا ہی منہ بولتا اور دہشت انگیز ہوگا کہ انسان تمام باطل اور لغو مسائل کو بھول جائے گا اور حقیقتوں کے صریح اعتراف کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہ ہوگا۔ قبروں کو خوابگاہ سے تشبیہ دے گا اور قیامت کو نیند سے بیدار ہونا قرار دے گا جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں بھی آیا ہے:

کما تنامون تموتون وکما تستیقضون تبعثون

"جس طرح سے تم سوتے ہو اسی طرح مرو گے اور جس طرح نیند سے بیدار ہوتے ہو اسی طرح زندہ ہو جاؤ گے"۔

یہاں وہ پہلے وحشت زدہ ہو کر فریاد کریں گے کہ وائے ہو ہم پر ہمیں کس نے اس نیند سے بیدار کر دیا ہے اور کس نے ہماری خوابگاہ سے ہمیں اٹھا دیا ہے۔

لیکن بہت جلد وہ متوجہ ہو جائیں گے اور انہیں یاد آجائیں گے کہ سچے پیغمبروں نے خدا کی طرف سے انہیں اسی دن کا وعدہ کیا تھا لہٰذا وہ خود اپنے آپ کو یہ جواب دیں گے کہ یہ تو خدائے رحمٰن کا وعدہ ہے۔ وہ خدا کہ جس کی رحمت عامہ نے سب کو گھیر رکھا ہے اور اس کے پیغمبروں نے سچ کہا ہے اور ہمیں اس دن سے آگاہ کیا ہے لیکن افسوس کہ ہم نے ان سب کا مذاق اور تمسخر اڑایا ہے۔

اس بنا پر "ھٰذا ما وعد الرحمٰن وصدق المرسلون" کا جملہ قیامت کے انہیں منکرین کی گفتگو کا آخری حصہ ہے لیکن بعض نے اسے فرشتوں یا مومنین کا کلام سمجھا ہے جو کہ آیت کے ظاہر کے برخلاف ہے اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ اس دن منکرین کا حقائق کا اعتراف کرنا کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو اسی آیت میں آئی ہو جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیہ ۹۷ میں بیان ہوا:

واقترب الوعد الحق فاذا ھی شاخصة ابصار الذین کفروا یاویلنا قد کنا فی غفلة من ھٰذا بل کنا ظالمین

"وعدۂ حق (قیامت کے بارے میں) نزدیک ہو جائے گا، اس وقت کافروں کی آنکھیں شدت وحشت سے پتھرا جائیں گی (اور وہ کہیں گے:) وائے ہو ہم پر کہ ہم اس امر سے غافل تھے، بلکہ ہم تو ظالم تھے"۔

بہرحال "مرقد" کی تعبیر کہ جو "خوابگاہ" اور "نیند" کے معنی میں آتی ہے[1] اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ وہ لوگ عالم برزخ میں ایک ایسی حالت میں ہوں گے کہ جو نیند کے مشابہ ہوگی۔ نیز جیسا کہ ہم نے سورہ

---

[1] پہلی صورت میں اسم مکان اور دوسری صورت میں "مصدر میمی" ہے۔

مومنون کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ جو ایمان وکفر کی ایک درمیانی حالت میں ہوں گے ان کیلئے عالم برزخ نیند کی حالت سے غیر مشابہ نہیں ہے، جبکہ اچھے مومنین اور حد سے بڑھے ہوئے بدکار کافر وہاں پورے طور پر ایک طرح کی بیداری کے عالم میں ہوں گے اور مومن نعمتوں سے فیضیاب ہوں گے اور کافر طرح طرح کے عذاب میں گرفتار ہوں گے[1]

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ قیامت کا ہول اور وحشت اس قدر ہے کہ اس کے مقابلے میں برزخ کا عذاب آرام وہ اور نیند سے زیادہ نہیں ہے۔

اس کے بعد اس نفخ صور کے وقوع کی سرعت کے بارے میں وضاحت کے لیے فرمایا گیا ہے: "وہ ایک چیخ سے زیادہ کچھ نہیں ہے ایک زوردار آواز بلند ہوگی اور وہ سب کے سب ہمارے پاس حاضر ہو جائیں گے" (ان کانت الا صیحة واحدة فاذا هم جمیع لدینا محضرون)۔

اس بنا پر مُردوں کے زندہ ہونے اور ان کے قبروں سے باہر نکلنے اور پروردگار کی عدالت میں حاضر ہونے کے لیے زیادہ وقت اور زمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ لوگوں کو مارنے کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں تھی۔ پہلی چیخ موت کی پکار ہے اور دوسری چیخ پھر سے زندگی ملنے اور پروردگار کی عدالت میں حاضر ہونے کی پکار ہے۔

"صیحة" (ایک چیخ) کی تعبیر اور "واحدة" کے ساتھ اس کی تاکید اور پھر "اذا" کہ جو اس قسم کے موقعوں پر کسی چیز کے ناگہانی اور اچانک وقوع کی خبر دیتا ہے اور جملہ اسمیہ کی صورت میں "هم جمیع لدینا محضرون" کی تعبیر سب قیامت کے تیزی کے ساتھ واقع ہونے کی دلیل ہیں۔

ان آیات کا دوٹوک لب ولہجہ اور ان کا پُر تاثیر انداز انسانوں کے دل میں اس طرح سے اتر جاتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اس آواز کو دل کے کانوں سے سن رہے ہیں کہ اے سوئے ہوئے انسانو! اے بکھری ہوئی مٹی! اور اے بوسیدہ ہڈیو! کھڑی ہو جاؤ اور حساب وکتاب اور جزا وسزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ نے دیکھا کہ کس قدر زیبا ہیں قرآنی آیات اور کس قدر ناطق ہیں اس کی تنبیہیں؟

---

[1] ہم "برزخ" کے بارے میں اور وہاں لوگوں کی کیفیت کے متعلق جلد ۸ میں گفتگو کر چکے ہیں۔

۵۴ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○

۵۵ إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ ○

۵۶ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ ○

۵۷ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَا يَدَّعُونَ ○

۵۸ سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبٍّ رَحِيمٍ ○

ترجمہ

۵۴ آج کے دن کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور سوائے اس عمل کے کہ جو تم کیا کرتے تھے تمہیں اور کوئی جزا نہیں دی جائے گی۔

۵۵ بہشت والے آج کے دن خدا کی نعمتوں میں مشغول و مسرور ہوں گے (اور بے آرام کرنے والی ہر فکر سے دُور ہوں گے)۔

۵۶ وہ اور ان کی بیویاں (بہشت کے محلوں اور درختوں کے) سایوں کے نیچے تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔

۵۷ ان کے لیے جنت میں بہت ہی لذت بخش پھل ہیں اور جو کچھ وہ چاہیں گے انہیں میسر ہوگا۔

۵۸ ان کے لیے (خدائی درود و) سلام ہے یہ قول ہے مہربان پروردگار کی طرف سے۔

تفسیر

اہلِ بہشت مادی و روحانی نعمتوں سے سرشار ہونگے

قرآن یہاں میدانِ حشر میں حساب و کتاب کی کیفیت کے بارے میں بحث کو سربستہ چھوڑتے ہوئے گزر جاتا ہے اور صالح مومنین اور بد اعمال کافروں کے انجام کار کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

"آج کے دن کسی پر ظلم نہیں ہوگا" (فالیوم لا تظلم نفس شیئًا) ۔

نہ تو کسی کے اجر و ثواب میں کمی ہوگی اور نہ ہی کسی کی سزا میں اضافہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک سوئی کی نوک کے برابر بھی کمی، زیادتی، ناانصافی اور ظلم و ستم نہیں ہوگا۔

اس کے بعد ایک ایسے امر کو بیان کیا گیا ہے کہ جو حقیقت میں اس عظیم عدالت میں ظلم و ستم کے نہ ہونے کی ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔ فرمایا گیا ہے : "تمہیں سوائے اس عمل کے کہ جو تم کیا کرتے تھے اور کوئی جزا نہیں دی جائے گی" (ولا تجزون الّا ما کنتم تعملون) ۔

اس تعبیر کا ظاہر، بغیر اس کے کہ اس میں کوئی چیز مقدر ہو، یہ ہے کہ تم سب کی جزا وہی تمہارے اعمال ہی ہیں۔ غور کیجئے کونسی عدالت اس سے بہتر و برتر ہو سکتی ہے؟

دوسرے لفظوں میں، جو نیک و بد اعمال تم اس دنیا میں انجام دیتے ہو وہی وہاں تمہارے ہمراہ ہوں گے۔ وہی اعمال مجسم ہو جائیں گے اور محشر کے تمام مواقف میں اور حساب و کتاب کے اختتام کے بعد تمہارے ہمدم و ہمنشیں ہوں گے۔ کیا کسی کے اعمال کا حاصل اس کے حوالے کرنا عدالت کے خلاف ہے اور کیا خود اعمال کو مجسم کرنا اور اس کا ساتھی بنانا ظلم ہے؟

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ بنیادی طور پر "ظلم" کا اس جگہ کوئی مفہوم ہی نہیں ہے اور اگر ہماری اس دنیا میں انسانوں کے درمیان کبھی عدالت ہوتی ہے اور کبھی ظلم، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ توانائی نہیں رکھتے کہ ہر شخص کے اعمال خود اس کی تحویل میں دے دیں۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ تصور کر لیا ہے کہ آخری جملہ بد اعمالوں اور کفار کے لیے مخصوص ہے کہ جو اپنے اعمال کے مطابق سزا بھگتیں گے اور مومن اس میں شامل نہیں ہیں کیونکہ خدا انہیں ان کے اعمال سے زیادہ اجر و ثواب دے گا۔

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے یہ اشتباہ دور ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں جزا و سزا میں عدالت اور استحقاق کی بنیاد پر صلہ حاصل کرنے سے متعلق گفتگو ہے اور یہ چیز اس سے تضاد نہیں رکھتی کہ خدا مومنین کے لیے اپنے فضل و رحمت سے ہزاروں گنا اضافہ کر دے اور یہ "تفضل" کا مسئلہ ہے اور وہ استحقاق کا مسئلہ ہے۔

اس کے بعد مومنین کی جزا کے ایک گوشے کو بیان کیا گیا ہے سب سے پہلے سکونِ قلب اور راحت و آرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "اہلِ بہشت اس دن خدا کی نعمتوں میں ایسے مشغول ہوں گے کہ ہر قسم کی بے آرام کرنے والی فکر سے دور ہوں گے" (انّ اصحاب الجنة الیوم فی شغل)۔

"اور وہ انتہائی خوشی و سرور میں ہوں گے" (فاکھون)۔

"شغل" (بروزن "شتر") اور "شغل" (بروزن "قفل") دونوں ایسے امور و حالات کے معنی میں ہیں کہ جو انسان کو پیش آتے ہیں اور اسے اپنے ساتھ مشغول رکھتے ہیں چاہے وہ مسرت بخش ہوں یا غم انگیز۔

لیکن چونکہ اس کے بعد بلا فاصلہ لفظ "فاکھون" لایا گیا ہے اور یہ لفظ "فاکہ" کی جمع ہے کہ جو مسرور و شاداب کے معنی میں ہے اس لیے ہو سکتا ہے یہ ایسے امور کی طرف اشارہ ہو کہ جو انسان کو فرطِ مسرت سے اس طرح مشغول رکھتے ہیں کہ جو پریشان کن امور سے بالکل غافل کر دیتے ہیں گویا وہ سرور و نشاط میں اس طرح محو ہو گا کہ اس پر کوئی غم واندوہ غالب نہ آسکے گا۔ یہاں تک کہ وہ وحشت جو قیامِ قیامت اور عدالتِ الٰہی میں حاضر ہوتے وقت اسے ہوئی تھی وہ بھی بھول جائے گا کیونکہ اگر سچ مچ وہ نہ بھولے تو ہمیشہ پریشانی اور غم واندوہ کا سایہ اس کے دل پر بوجھ بنا رہے گا۔ اس بنا پر اس اشتغال ذہنی کا ایک اثر محشر کی ہولناکیوں کو بھول جانا ہے۔[1]

بہر حال اطمینانِ قلب کی نعمت جو تمام نعمتوں کی بنیاد ہے اور تمام نعمتوں سے استفادہ کی شرط ہے، اس کے بعد دوسری نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "وہ اور ان کی بیویاں لذت بخش سایوں کے نیچے (خلوت گاہوں میں) تختوں کے اوپر تکیہ لگائے ہوں گے" (ھم و ازواجھم فی ظلال علی الارائك متكئون)۔[2]

"ازواج" بہشتی بیویوں یا ان مومن بیویوں کے معنی میں ہے کہ جو اس دنیا میں ان کی شریکِ حیات تھیں۔ بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ ہمطراز و ہم فکر افراد کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورہ صافات کی آیہ ۲۲ میں بیان ہوا ہے:

احشروا الذین ظلموا و ازواجھم

"ظالموں اور ان کے ہمطراز لوگوں کو حاضر کرو۔"

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "فاکھة" ہر قسم کے پھل کے معنی میں ہے اور "فکاہ" ان باتوں کو کہا جاتا ہے کہ جو انسان کو مانوس و مشغول رکھیں اور ابن المنظور لسان العرب میں کہتا ہے کہ "فکاہ" مزاج کے معنی میں ہے اور "فاکہ" خوش مزاج انسان کو کہا جاتا ہے۔

[2] اس آیت کی ترکیب میں علماء نے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں لیکن ان سب میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "ھم" مبتدا، اور "متكئون" خبر ہے اور "علی الارائك" اس کے متعلق ہے اور "فی ظلال" بھی اسی کے متعلق ہے یا ایک محذوف کے متعلق ہے۔

یہ خیال یہاں بہت بعید نظر آتا ہے، خاص طور پر جبکہ مفسرین اور ارباب لغت کی ایک کثیر جماعت کے مطابق «ارائک» «اریکہ» کی جمع ہے کہ جو اُن تختوں کے معنی میں ہے جو حجلہ گاہ میں ہوتے ہیں [1]

«ظلال» (سائے) کی تعبیر جنت کے درختوں کے سایوں کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے نیچے اہل جنت کے تخت بچھے ہوں گے یا بہشتی محلوں کے سائے کی طرف اشارہ ہے اور یہ سب امور اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہاں بھی ایک سورج ہوگا لیکن وہ آزار و تکلیف دینے والا سورج نہیں ہوگا۔ ہاں! انہیں جنت کے دل پسند سایوں میں ایک اور ہی نشاط و سرور حاصل ہوگا۔

❁ ❁ ❁

علاوہ ازیں "ان کے لیے بہت ہی لذت بخش میوے اور پھل ہوں گے اور وہ جو کچھ چاہیں گے انہیں میسر ہوگا" (لهم فيها فاكهة ولهم ما يدعون)۔

قرآن مجید کی دوسری آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کی غذا صرف پھل ہی نہیں ہیں لیکن زیر بحث آیت کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کے پھل بھی۔ جو ایک خاص قسم کے پھل ہیں جو اس جہان کے پھلوں سے ذائقے میں بہت زیادہ لطیف ہیں۔ بہشت کی افضل ترین غذا ہیں، یہاں تک کہ اس جہان میں بھی غذا شناس ماہرین کی گواہی کے مطابق پھل انسان کے لیے بہترین اور مناسب ترین غذا ہیں۔

"یدعون" «دعایہ» کے مادہ سے طلب کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ جو کچھ طلب کریں گے اور جس چیز کی تمنا کریں گے وہ انہیں حاصل ہو جائے گی اور ان کے دل میں کوئی ایسی آرزو نہ ہوگی جو پوری نہ ہو۔

مرحوم طبرسی «مجمع البیان» میں کہتے ہیں کہ عرب یہ تعبیر «تمنا» کے موقع پر استعمال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں:

ادع علی ماشئت

"جو تیرا دل چاہے مانگ اور مجھ سے تمنا کر"۔

اس طرح سے آج جو کچھ انسان سوچ سکتا ہے وہ بھی اور جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے وہ بھی طرح طرح کی نعمتیں وہاں مہیا ہیں اور خدا اپنے مہمانوں کی بہت اچھی پذیرائی کرے گا۔

❁ ❁ ❁

لیکن سب نعمتوں سے زیادہ اہم دینی روحانی نعمتیں ہیں کہ جن کی طرف آخری زیر بحث آیت میں اشارہ

---

[1] لسان العرب، مفردات راغب، مجمع البیان، قرطبی، روح المعانی اور دوسری تفاسیر۔

کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "ان کے لیے سلام اور خدائی تہنیت ہے، یہ قول ہے ان کے رحیم اور مہربان پروردگار کی طرف سے" (سلام قولاً من رب رحیم)[1]

اس کی یہ روح افزا و نشاط بخش اور مہر و محبت سے پُر ندا، انسان کی روح کو اس طرح سے اپنے اندر جذب کرے گی اور اسے لذت و خوشی اور روحانی سرور بخشے گی کہ کوئی نعمت اس کے برابر نہیں ہو گی۔

ہاں! محبوب کی ندا سننا، ایسی ندا جو محبت بھری ہو اور لطف و کرم سے پُر ہو، اہلِ بہشت کو سرتاپا سرور و خوشی میں غرق کر دے گی کہ جس کا ایک ہی لحہ دنیا و مافیہا سے برتر ہے۔

ایک روایت میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ جس وقت بہشتی لوگ جنت کی نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہوں گے تو ایک نور ان کے سروں کے اوپر ظاہر ہو گا۔ یہ لطفِ خدا کا نور ہے کہ جو اُن کے اوپر سایہ فگن ہو گا اور اس سے ندا آئے گی کہ سلام ہو تم پر اے بہشت میں رہنے والو اور یہ وہی ہے کہ جو قرآن میں آیا ہے "سلام قولاً من رب رحیم"، یہ وہ مقام ہے کہ لطفِ خدا کا احساس انہیں اس طرح مشغول کر دے گا کہ وہ سوائے اس کے ہر چیز سے غافل ہو جائیں گے اور اس حالت میں جنت کی تمام نعمتوں کو فراموش کر دیں گے اور یہ وہ منزل ہے کہ فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے اور کہیں گے تم پر درود ہو[2]

ہاں! محبوب کے شہود کا جذبہ اور لطفِ دوست کا دیدار اس قدر لذت بخش اور شوق انگیز ہے کہ اس کا ایک لحہ بھی کسی نعمت کے یہاں تک کہ سارے جہان کے برابر نہیں ہے۔ اس کے دیدار کے عاشق اس طرح ہیں کہ اگر فیض روحانی ان سے منقطع ہو جائے تو ان کی روح جسم سے پرواز کر جائے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں امیرالمومنینؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لو حجبت عنه ساعة لمت

"اگر میں گھڑی بھر کے لیے اس کے دیدار سے محجوب رہ جاؤں تو جان دے دوں"[3]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ پروردگار کا یہ سلام کہ جو بہشتی مومنین پر نچھاور ہو گا مستقیم و بلاواسطہ سلام ہے۔ ایک ایسا سلام کہ جو پالنے والے اور پروردگار کی طرف سے ہے۔ ایسا سلام کہ جو اس کی رحمتِ خاصہ یعنی مقامِ رحیمیت کے سرچشمہ سے حاصل ہوتا ہے کہ جس میں تمام الطاف و کرامات جمع ہیں اور یہ کتنی عمدہ نعمت ہے؟

---

[1] "قولاً" کے اعراب کے محل کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے اور سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ وہ "مفعول مطلق" ہے فعل محذوف کا اور تقدیر میں "یقول قولاً" تھا۔

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۳ ص ۳۵ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[3] روح البیان جلد ۷، ص ۴۱۶۔

سلام کہ جو اہل بہشت پر نچھاور ہوں گے

اصولی طور پر بہشت "دارالسلام" ہے جیسا کہ سورۂ یونس کی آیہ ۲۵ میں بیان ہوا ہے کہ:

واللّٰہ یدعوا الیٰ دارالسّلام

"خدا لوگوں کو دارالسلام اور سلامتی و آرام کی طرف دعوت دیتا ہے۔"

بہشتی کہ جو اس سرزمین کے ساکن ہیں کبھی تو انہیں فرشتے سلام کریں گے کہ جو ان کے جنت میں داخل ہونے کے وقت ہر دروازے سے آئیں گے اور کہیں گے:

"جو صبر تم نے کیا ہے اس کی وجہ سے تم پر سلام ہو اور یہ گھر کیسا اچھا نتیجہ ہے کہ جو تمہیں نصیب ہوا ہے۔"

والملائکۃ یدخلون علیھم من کل باب سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار (رعد ۲۳، ۲۴)

اور کبھی اعراف میں رہنے والے انہیں پکاریں گے اور کہیں گے:

"تم پر سلام ہو۔"

ونادوا اصحاب الجنۃ ان سلام علیکم (اعراف ۔ ۴۶)

اور کبھی جنت میں داخل ہونے کے بعد فرشتوں کے سلام و درود پہنچیں گے اور کبھی قبض روح کے وقت یہ سلام موت کے فرشتوں کی جانب سے نذر ہوگا اور وہ کہیں گے:

"تم پر سلام ہے جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کی وجہ سے جو تم انجام دیتے تھے۔"

الذین تتوفّٰھم الملائکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون (نحل ۔ ۳۲)

کبھی وہ خود ایک دوسرے پر سلام و درود بھیجیں گے اور اصولاً

"وہاں پر ان کا تحیّۃ وہی سلام ہے۔"

تحیتھم فیھا سلام (ابراہیم ۔ ۲۳)۔

بالآخر، ان سب سے برتر اور بالاتر پروردگار کا سلام ہے"

سلام قولاً من رب رحیم)۔

خلاصہ یہ ہے کہ:

"نہ تو وہاں پر کوئی لغو بات سنی جائے گی اور نہ ہی کوئی بیہودہ کلام، صرف سلام ہی سلام ہے۔"

لایسمعون فیھا لغوًا ولا تاثیمًا الّا قیلًا سلامًا سلامًا (واقعہ ۔ ۲۵، ۲۶)۔

لیکن یہ ایسا سلام نہیں ہوگا کہ جو صرف لفظوں ہی سے عبارت ہو۔ بلکہ یہ ایسا سلام ہوگا کہ اس کا آرام بخش اور سلامت آفرین اثر انسان کی روح اور دل کی گہرائیوں میں اتر جائے گا اور سب کو آرام و سکون اور سلامتی میں شرابور کر دے گا۔

(۵۹) وَامۡتَازُوا الۡيَوۡمَ اَيُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ○

(۶۰) اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۙ○

(۶۱) وَّاَنِ اعۡبُدُوۡنِىۡ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ○

(۶۲) وَلَقَدۡ اَضَلَّ مِنۡكُمۡ جِبِلًّا كَثِيۡرًا ؕ اَفَلَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡقِلُوۡنَ ○

ترجمہ

(۵۹) اے گنہگارو! آج کے دن الگ ہو جاؤ۔

(۶۰) اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے؟

(۶۱) اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا کیونکہ صراطِ مستقیم یہی ہے؟

(۶۲) اس نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

تفسیر

شیطان کی پرستش کیوں کرتے ہو؟

گزشتہ آیات میں اہلِ بہشت کے شوق انگیز اور پُر افتخار انجام کا کچھ ذکر تھا۔ زیر بحث آیات میں اہلِ دوزخ اور شیطان کے بندوں کے انجام کا کچھ تذکرہ ہے۔

پہلے تو یہ کہ اس دن انہیں تحقیر آمیز انداز سے خطاب کیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا: "اے گنہگارو!

آج کے دن تم الگ ہو جاؤ" (وامتازوا الیوم ایھا المجرمون)۔
یعنی تو سمجھتے کہ جو دنیا میں اپنے آپ کو مومنین کی صفوں میں رکھ کر ان کے رنگ میں سامنے آتے تھے اور ان کی حیثیت اور اعتبار سے استفادہ کرتے تھے۔ آج تم ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنے اصلی چہرے میں ظاہر ہو جاؤ۔ یہ حقیقت میں اسی وعدۂ الٰہی پر عملدرآمد ہے کہ جو سورۂ ص کی آیہ ۲۸ میں بیان ہوا ہے:

ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصّالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجّار

"کیا ہم ان لوگوں کو کہ جو ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیتے ہیں زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح قرار دے دیں؟ یا پرہیزگاروں کو بداعمالوں کی طرح کا قرار دے دیں"؟

بہر حال زیر بحث آیت کا ظاہری مفہوم مجرموں کی صفوں کا مومنین سے جدا کرنا ہی ہے اگرچہ مفسرین نے کئی دوسرے احتمال بھی ذکر کیے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ مجرموں کی صفوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا اور ان میں سے ہر گروہ کا ایک صنف میں قرار پانا۔

۲۔ یا ان کا اپنے شفیعوں اور معبودوں سے جدا ہونا۔

۳۔ یا ان کے ہر فرد کا ایک دوسرے سے جدا ہونا اس طرح سے کہ دوزخ کے عظیم رنج وغم کے علاوہ ہر شخص اور ہر چیز سے جدائی کا غم بھی ان پر اپنا سایہ ڈالے۔

لیکن خطاب چونکہ سب سے ہے لہٰذا "وامتازوا" کا مفہوم پہلے معنی کو ہی تقویت دیتا ہے کہ جو ہم نے بیان کیا ہے۔

بعد والی آیت قیامت کے دن خدا کی طرف سے مجرموں کے لیے معنی خیز ملامتوں اور سرزنشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: "اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش اور اطاعت نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے" (الم اعھد الیکم یابنی اٰدم الّا تعبدوا الشیطان انہ لکم عدو مبین)۔

یہ خدائی پیمان مختلف طریقوں سے انسان سے لیا گیا ہے اور بارہا یہ مفہوم اسے گوش گزار کرایا گیا ہے۔ سب سے پہلے اُس دن کہ جب آدم کی اولاد نے زمین میں پھلنا پھولنا شروع کیا تو انہیں یہ خطاب ہوا:

یابنی اٰدم لا یفتننکم الشیطان کما اخرج ابویکم من الجنۃ ینزع عنھما لباسھما لیریھما سواٰتھما انہ یرٰکم ھو وقبیلہ من حیث لا ترونھم

انّا جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون۔

"اے اولادِ آدم! شیطان تمہیں دھوکا نہ دے جس طرح سے کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کا لباس ان کے بدن سے اتروا دیا تھا تاکہ ان کی شرمگاہ کو ان پر ظاہر کر دے۔ وہ اور اس کے پیرو تو تمہیں دیکھتے ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھتے۔ (اچھی طرح) جان لو کہ ہم نے شیاطین کو ایسے لوگوں کے (دوست اور) اولیاء قرار دیا ہے کہ جو ایمان نہیں لاتے۔" (اعراف - ۲۷)

اس کے بعد یہی تنبیہ بارہا انبیاء کی زبان پر جاری ہوئی۔ جیسا کہ سورۂ زخرف کی آیہ ۶۲ میں ہے:

ولا یصدنکم الشیطان انہ لکم عدو مبین

"شیطان تمہیں راہِ حق سے روک نہ دے کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

نیز سورہ بقرہ کی آیہ ۱۶۸ میں ہے:

ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین

"تم شیطان کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

دوسری طرف یہ پیمان عالم "تکوین" میں انسان سے اطاعتِ عقل کے حوالے سے بھی لیا گیا ہے کیونکہ عقلی دلائل وضاحت کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انسان کو کبھی ایسے کا حکم نہیں ماننا چاہیئے جس نے پہلے ہی دن سے اس کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ جس نے اُسے جنت سے باہر نکلوایا ہے اور اس کی اولاد کو گمراہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔

تیسری طرف تمام انسانوں کو خدا کی دی ہوئی سرشت اور فطرتِ توحید اور ذاتِ الٰہی کے لیے اطاعت کے منحصر ہونے سے بھی عملی طور پر انسان سے یہ عہد لیا ہے۔ اس طرح سے صرف ایک زبان سے نہیں بلکہ یہ خدائی تنبیہ کئی زبانوں سے ہو چکی ہے اور یہ سرشت ساز عہد قبول ہو چکا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "لا تعبدوا الشیطان" میں "عبادت" "اطاعت" کے معنی میں ہے کیونکہ عبادت ہمیشہ پرستش اور رکوع و سجود کے معنی میں نہیں آتی بلکہ اس کی ایک صورت اطاعت کرنا ہے۔ جیسا کہ سورۂ مومنون کی آیہ ۴۷ میں ہے کہ فرعون اور اس کے اطرافیوں نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کے مبعوث ہونے کے بعد کہا:

انؤمن لبشرین مثلنا و قومھما لنا عابدون

"کیا ہم ایسے دو انسانوں پر کہ جو ہم ہی جیسے ہیں ایمان لے آئیں حالانکہ ان کی قوم ہماری عبادت (اطاعت) کرتی ہے۔"

نیز سورۂ توبہ کی آیہ ۳۱ میں ہے کہ خدا یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرماتا ہے:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دون اللّٰہ والمسیح ابن مریم وما امروا الّا لیعبدوا الٰھًا واحدًا

"انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو خدا کے مقابلے میں معبود قرار دے لیا اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ انہیں خدائے یگانہ کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے کی عبادت کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔"

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک روایت میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے اس آیہ کے ذیل میں منقول ہے:

اما واللّٰہ ما دعوھم الی عبادۃ انفسھم ولو دعوھم ما اجابوھم ولکن احلوا لھم حراما وحرموا علیھم حلالاً فعبدوھم من حیث لا یشعرون

خدا کی قسم! انہوں نے (علماء اور راہبوں نے) یہود و نصاریٰ کو اپنی عبادت کی طرف دعوت نہیں دی تھی اور اگر وہ اس بات کی دعوت دیتے تو یہود و نصاریٰ کبھی بھی ان کی اس دعوت کو قبول نہ کرتے لیکن انہوں نے تو ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا تھا (اور انہوں نے اُسے قبول کر لیا تھا) اور اسی طرح سے لاشعوری طور پر ان کی عبادت کی تھی[1]

اسی مفہوم کی نظیر کچھ فرق کے ساتھ دوسری روایات میں بھی موجود ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

من اطاع رجلا فی معصیۃ فقد عبدہ

جس شخص نے کسی انسان کی پروردگار کی معصیت میں اطاعت کی تو اس نے اس کی پرستش کی ہے[2]

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

من اصغی الٰی ناطق فقد عبدہ، فان کان الناطق یؤدی عن اللّٰہ فقد عبد اللّٰہ، وان کان الناطق یؤدی عن الشیطان فقد عبد الشیطان۔

"جو شخص کسی بولنے والے کی بات پر کان دھرے (اور اس کی باتوں کو قبول کرے)

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۸۹ (ابواب صفات القاضی باب ۱۰ حدیث ۱)۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۹۱ (ابواب صفات القاضی باب ۱۰ حدیث ۸، ۹)۔

تو اس نے اس کی پرستش کی؛ اگر بولنے والا حکمِ خدا کو بیان کرتا ہے تو اس نے خدا کی عبادت کی ہے اور اگر وہ شیطان کی طرف سے بات کر رہا ہے تو اس نے شیطان کی عبادت کی ہے۔[1]

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں مزید تاکید اور اولادِ آدم کی ذمہ داریوں اور فرائض کو بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ: "میری ہی عبادت کرنا اور میری اطاعت کرنا کیونکہ سیدھا راستہ یہی ہے" (وان اعبدونی ھٰذا صراط مستقیم)۔

ایک طرف تو یہ عہد لیا کہ شیطان کی اطاعت نہ کرنا کیونکہ اس نے اپنی دشمنی اور عداوت کو پہلے ہی دن سے آشکار کر دیا تھا لہٰذا کونسا عقلمند ایسا ہے کہ جو اپنے دیرینہ اور کھلے ہوئے دشمن کا حکم مانے گا۔

اس کے مقابلے میں یہ عہد لیا کہ صرف اسی کی اطاعت کریں اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ صراطِ مستقیم یہی ہے۔ یہ بات حقیقت میں انسانوں کے لیے بہترین محرک ہے کیونکہ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص خشک اور جلا دینے والے بیابان میں پھنس جائے اور اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جان اور اپنے مال و متاع کو چوروں اور بھیڑیوں کے خطرے میں دیکھے تو سب سے اہم چیز کہ جس کے بارے وہ غور و فکر کرے گا وہ یہ ہے کہ منزل کی طرف سیدھی راہ کونسی ہے ایسی راہ کہ جو زیادہ جلدی اور زیادہ آسانی کے ساتھ اسے منزلِ نجات تک پہنچا دے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہان قیام کرنے کا مقام نہیں ہے۔ کیونکہ راستہ ایسے شخص کو دکھایا جاتا ہے کہ جو کسی گزرگاہ سے عبور کر رہا ہو اور اسے کسی منزلِ مقصود تک پہنچنا ہو۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس دیرینہ خطرناک دشمن سے زیادہ سے زیادہ آگاہی کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: "اس نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے" (ولقد اضل منکم جبلاً کثیرًا افلم تکونوا تعقلون)۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ شیطان اپنے پیروکاروں پر کیسی کیسی بدبختیاں لایا ہے؟ کیا تم نے گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تاکہ تم دیکھتے کہ اس کے بندے اور غلام کس بُرے اور دردناک انجام میں گرفتار ہوئے ہیں؟ اُن کے اُن دیکھے شہروں کے ویرانے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کا غم انگیز انجام ہر اُس شخص کے لیے واضح ہے کہ جو تھوڑی سی بھی عقل رکھتا ہو۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۹۱ (ابواب صفات القاضی باب ۱۰) حدیث ۸، ۹)۔

پھر تم سنجیدگی کے ساتھ اس دشمن کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے ۔ کہ جو بارہا اپنی عداوت و دشمنی ثابت کر چکا ہے؟ پھر اس سے دوبارہ دوستی گانٹھتے ہو، یہاں تک کہ اسے اپنا رہبر، ولی اور رہنما بناتے ہو۔

مفرداتِ راغب کے مطابق "جِبِلّ" اس جماعت اور گروہ کے معنی میں ہے کہ جو عظمت و بزرگی کے لحاظ سے جَبَل (بروزن "عَمَل") جو پہاڑ کے معنی میں ہے سے مشابہت رکھتا ہو اور "کثیرًا" کی تعبیر شیطان کے پیروکاروں کے بارے میں زیادہ تاکید کے لیے ہے کہ جو ہر معاشرہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں۔

بعض نے "جبل" کی تعداد دس ہزار یا اس سے زیادہ لکھی ہے اور اس سے کمتر کے لیے یہ تعبیر مناسب نہیں سمجھی[1]

لیکن بعض اس تعداد کو ضروری نہیں سمجھتے[2]

بہرحال عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس قسم کے خطرناک دشمن سے خوب ڈرتا رہے کہ جو کسی انسان پر رحم نہیں کرتا اور اس کے ہاتھوں برباد ہونے والے ہر جگہ خاکِ ہلاکت پر پڑے ہوتے ہیں ۔ ایسے دشمن سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہمارے آگاہ و بیدار پیشوا امیرالمومنین حضرت علیؑ اپنے ایک خطبے میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

فاحذروا عباد الله ! عدو الله، ان یعدیکم بدائه ، و ان یستفزکم بندائه ، و ان یجلب علیکم بخیله ورجله ، فلعمری لقد فوق لکم سهم الوعید ، و اغرق الیکم بالنزع الشدید ، ورماکم من مکان قریب ، فقال رب بما اغویتنی لا زینن لهم فی الارض ولا غوینهم اجمعین ۔

"اے خدا کے بندو! خدا کے اس دشمن سے ڈرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنی بیماری (غرور و تکبر) میں مبتلا کر دے اور آواز دے کر تمہیں حرکت میں لے آئے اور اپنے سوار اور پیادہ لشکر کے ذریعے تمہیں اپنا بنا لے ۔ مجھے اپنی جان کی قسم! اُس نے تمہیں شکار کرنے کے لیے ایک خطرناک تیر کمان میں رکھا ہوا ہے اور اپنی پوری توانائی سے شدت کے ساتھ کھینچا ہوا ہے اور اس نے نزدیک ترین جگہ سے تمہیں نشانہ بنا رکھا ہے۔ اس نے

---

[1] تفسیر روح المعانی و قرطبی' زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخر رازی' زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

یہ اعلان بھی کر رکھا ہے کہ اسے پروردگار! مجھے تو تُو نے گمراہ کیا ہی ہے لہٰذا میں بھی زندگی کے زرق و برق اور ٹھاٹھ باٹھ کی ان کی آنکھوں میں چکا چوند کر دوں گا اور ان سب کو اغوا اور گمراہ کر دوں گا، (حالانکہ خدا اس کی گمراہی کا سبب نہیں تھا بلکہ ہوائے نفس نے اسے گمراہ کیا تھا) [1]

واقعاً عجیب بات ہے کہ ہم اس قسم کے دشمن کو اپنا دوست بنائیں۔

بقولِ شاعر ؎

کجا بر سر آیم ازیں عار و ننگ
کہ با او بہ صلیم و با حق بہ جنگ

"ہم اس عار و ننگ سے کس طرح باہر نکل سکتے ہیں، کہ اس (شیطان) سے تو ہماری صلح ہے اور حق کے خلاف جنگ ہے"۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)۔

(۶۳) هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○

(۶۴) اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○

(۶۵) اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ○

(۶۶) وَ لَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤى اَعْیُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى یُبْصِرُوْنَ ○

(۶۷) وَ لَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِیًّا وَّ لَا یَرْجِعُوْنَ ○

(۶۸) وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِی الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

(۶۳) یہ وہی دوزخ ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

(۶۴) آج تم اس میں داخل ہو جاؤ اور اس کی آگ میں جلو اس کفر کی بنا پر کہ جو تم کیا کرتے تھے۔

(۶۵) آج ہم ان کے منہ پر مُہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے خود کردہ کاموں کی گواہی دیں گے۔

(۶۶) اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں موند دیں پھر اگر وہ چاہیں راستہ طے کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں تو وہ دیکھ کیسے سکیں گے۔

(۶۷) اور اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کی جگہ پر ہی مسخ کر دیں (اور انہیں بے جان مجسموں میں بدل کے رکھ دیں) کہ نہ تو وہ آگے کو سفر جاری رکھ سکیں اور نہ ہی پیچھے کی طرف پلٹ سکیں۔

(۶۸) جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں اُسے خلقت کے اعتبار سے پلٹ دیتے ہیں (اور اُسے بچپن کی ناتوانی کی طرف پلٹا دیتے ہیں) کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے؟

تفسیر

جب زبان چپ ہوگی، اعضا گواہی دیں گے

گزشتہ آیات میں قیامت میں مجرموں کے لیے خدا کی سرزنش کا ذکر ہے اور اس کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ دیگر باتوں کا بیان ہے۔ زیر بحث آیات میں بھی وہی سلسلۂ کلام جاری ہے۔

ہاں! اس دن کہ جب کہ جہنم کی جلانے والی بھڑکتی ہوئی آگ مجرموں کی آنکھوں کے سامنے ہوگی تو اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجرموں کو مخاطب کیا جائے گا: "یہ وہی دوزخ ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا" (هٰذه جهنم التی کنتم توعدون)۔

* * *

خدا کے نبی یکے بعد دیگرے آتے رہے اور تمہیں اس دن اور ایسی آگ سے ڈراتے رہے لیکن تم نے ان سب کا تمسخر اڑایا: "آج اس میں داخل ہو جاؤ اور اس کی آگ میں جلو، کیونکہ یہ اس کفر کی جزا ہے کہ جو تم کرتے تھے" (اصلوها الیوم بما کنتم تکفرون)[1]

* * *

اس کے بعد قیامت کے دن کے گواہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ گواہ کہ جو خود انسان کے جسم کا حصہ ہیں اور ان کی باتوں کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے: "آج ہم ان کے منہ پر

---

[1] "اصلوا"، "صلی" کے مادہ سے آگ جلانا یا آگ میں جلانا اور بھوننا، یا آگ میں داخل ہونا، اور اس کو لازم کر لینے کے معنی میں ہے۔

گواہی دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور اُن کے پاؤں اُن کاموں کی کہ جو انہوں نے انجام دیتے تھے ہمارے حضور شہادت دیں گے" (الیوم نختم علٰی افواھھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون)۔

ہاں! اس دن انسان کے اعضاء اس کی مرضی کے تابع نہیں ہوں گے، وہ اپنا حساب انسان کے پورے وجود سے جدا کر کے پروردگار کا حکم مانیں گے اور اس کے آستانۂ مقدس پر سر جھکا دیں گے اور اپنی شہادت کے ذریعے حقائق آشکار کر دیں گے۔ وہ کتنی عجیب عدالت ہے کہ جس کے گواہ خود انسان کے بدن کے اعضاء ہیں، وہی آلات کہ جن کے ذریعے اس نے گناہ انجام دیا تھا۔

شاید اعضاء کی گواہی اس بناء پر ہو کہ ان مجرموں کو جس وقت یہ کہا جائے گا کہ جو عمل تم انجام دیا کرتے تھے اس کی سزا جہنم ہے، تو وہ یہ گمان کرتے ہوئے کہ شاید یہ دنیاوی عدالت ہے کہ جس میں حقائق سے پیٹھ پھیر کر انکار کیا جا سکتا ہے، ان کا انکار کر دیں گے۔ اس پر اعضاء کی گواہی شروع ہو جائے گی۔ ایسے میں اُن پر تعجب اور وحشت چھا جائے گی اور بھاگنے کے تمام راستے ان پر بند ہو جائیں گے۔

اعضاء کے بولنے کی کیفیت کیا ہوگی، اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں:

۱۔ خدا اس دن ایک ایک عضو میں بات کرنے کا ادراک وشعور پیدا کر دے گا اور اعضاء سچ سچ باتیں کریں گے اور اس میں تعجب کی کونسی بات ہے کہ وہی ذات جس نے گوشت کے ایک ٹکڑے کو جسے زبان کہتے ہیں، یا انسان کے دماغ میں یہ قدرت پیدا کی ہے، وہ دوسرے اعضاء میں بھی یہ قدرت پیدا کر سکتا ہے۔

۲۔ وہ ادراک وشعور سے بہرہ مند نہیں ہوں گے، لیکن خدا انہیں بات کرنے کا حکم دے گا اور حقیقت میں اعضاء گفتگو کے ظہور کا محل ہوں گے، اور حقائق کو خدا کے فرمان اور حکم سے آشکار کریں گے۔

۳۔ ہر انسان کے بدن کے اعضاء کے ساتھ ان اعمال کے آثار بھی یقیناً ہوں گے جو انہوں نے عمر بھر میں انجام دیے ہیں کیونکہ اس جہان میں کوئی عمل بھی نابود نہیں ہوتا۔ یقیناً اس کے آثار بدن کے ایک ایک حصے پر اور فضائے محیط میں باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ دن کہ جو ظاہر و آشکار ہونے کا دن ہے یہ آثار بھی ہاتھ پاؤں اور باقی اعضاء پر ظاہر ہو جائیں گے اور ان آثار کا ظہور ان کی شہادت شمار ہوگا۔

یہ تعبیر روزمرہ کی باتوں اور ادباء کی تعبیر میں بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

عینك تشھد بسھرك

"تیری آنکھ تیرے جاگتے رہنے کی گواہ ہے"۔

یا ہم کہتے ہیں:

الحیطان تبکی علٰی صاحب الدار

"دیواریں اس گھر کے مالک پر گریہ کرتی ہیں"۔

ایک فارسی شاعر بھی کہتا ہے:

رنگ رخسارہ خبری دھد از سر درون

"رخسار کا رنگ اندرونی راز کی خبر دے رہا ہے"۔

بہرحال قیامت میں اعضاء کی گواہی مسلّم ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کیا ہر خاص عضو اسی کام کو بیان کرے گا کہ جو اس نے انجام دیا ہے یا تمام کاموں کو؟ تو بلاشک وشبہ احتمالِ اوّل ہی مناسب ہے۔ لہٰذا قرآن کی دوسری آیات میں کان، آنکھ اور جلدِ بدن کے بات کرنے کا ذکر ہوا ہے۔

جیسا کہ سورۂ حٰم السجدہ کی آیہ ۲۰ میں ہے:

حتّٰی اذا ما جاءوها شهد عليهم سمعهم وابصارهم وجلودهم بما كانوا يعملون

"جس وقت وہ جہنم کی آگ کے کنارے آکھڑے ہوں گے، توان کے کان، آنکھ اور بدن کی جلد ان اعمال کی گواہی دے گی کہ جو وہ انجام دیتے تھے"۔

نیز سورۂ نور کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے:

يوم تشهد عليهم السنتهم وايديهم وارجلهم بما كانوا يعملون

"اس دن ان کی زبان، ہاتھ اور پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے کہ جنہیں وہ انجام دیتے تھے"۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ایک جگہ تو یہ فرمایا گیا ہے:

"ان کی زبانیں گواہی دیں گی"

جیسا کہ سورۂ نور میں ہے اور زیرِ بحث آیات میں فرمایا گیا ہے: "ہم ان کی زبان پر مہر لگا دیں گے"۔

ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس بناء پر ہو کہ پہلے تو انسان کی زبان پر مُہر لگا دی جائے گی اور اس کے دوسرے اعضاء کلام کریں گے۔ جب وہ دیکھے گا کہ دوسرے اعضاء شہادت دے رہے ہیں تو اس کی زبان کھل جائے گی اور اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی لہٰذا زبان بھی اعتراف کرے گی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ زبان کی شہادت سے مراد عام تکلم نہ ہو بلکہ باقی اعضاء کی طرح کا تکلم ہو کہ جو اس کے اندر سے ابھرے نہ کہ باہر سے (اس عظیم عدالت کے گواہوں کی تعداد اور ان کی گواہی کی کیفیت کے سلسلے میں ہم انشاء اللہ سورۂ حٰم السجدہ کی آیات ۱۹ - ۲۳ کے ذیل میں اس سے زیادہ تفصیلی گفتگو کریں گے)۔

آخری بات یہ ہے کہ اعضاء کی گواہی کفار اور مجرموں کے ساتھ مربوط ہے، ورنہ مومنین کا مسئلہ تو واضح ہے اس لیے امام باقر علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

لیست تشهد الجوارح علی مؤمن، انما تشهد علی من حقت علیه لمة العذاب، فاما المؤمن فیعطی کتابه بیمینه، قال الله عزوجل فمن اوتی کتابه بیمینه فاولٰئك یقرءون کتابهم ولا یظلمون فتیلاً۔

"اعضاء جسمانی مومن کے خلاف گواہی نہیں دیں گے بلکہ اس شخص کے برخلاف گواہی دیں گے جس پر فرمانِ عذاب مسلّم ہو چکا ہوگا، باقی رہا مومن تو اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا (اور وہ خود ہی اُسے پڑھے گا) جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے (وہ سرفرازی اور افتخار کے ساتھ) اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے اور ان پر معمولی سا ظلم بھی نہیں ہوگا[1]"

* * *

بعد والی آیت میں ایک عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ خدا اس مجرم گروہ کو اسی دنیا میں اس عذاب میں مبتلا کردے۔ ایک ایسا عذاب کہ جو دردناک بھی ہے اور وحشت انگیز بھی، ارشاد ہوتا ہے: "اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں ملیا میٹ کر دیں" (ولو نشاء لطمسنا علی اعینھم)[2]

اس حالت میں انہیں انتہائی وحشت گھیر لے گی "وہ چاہیں گے کہ جیسے وہ پہلے کیا کرتے تھے اسی طرح ایک دوسرے پر سبقت حاصل کریں لیکن وہ کس طرح سے دیکھ سکتے ہیں" (فاستبقوا الصراط فانّٰی یبصرون)۔

وہ تو اپنے گھر کا راستہ تک بھی تلاش نہ کر پائیں گے چہ جائیکہ وہ راہِ حق کو تلاش کر سکیں اور صراطِ مستقیم پر چل سکیں۔

دوسری دردناک سزا یہ ہے کہ "اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کی اپنی جگہ پر ہی مسخ کر دیں (بے روح اور بے حس و حرکت مجسموں یا مفلوج جانوروں کی طرح) اس طرح سے کہ نہ تو وہ آگے کو سفر جاری رکھ سکیں اور نہ ہی پیچھے کی طرف مڑ سکیں" (ولو نشاء لمسخناھم علی مکانتھم فما استطاعوا مضیًّا ولا یرجعون)[3]

---

[1] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] "طمسنا"، "طمس" (بروزن "شمس") کے مادہ سے محو کرنے اور کسی چیز کے آثار ختم کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں آنکھ کے نود یا خود آنکھ کو اس طرح محو کرنے کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں سے کوئی چیز باقی نہ رہ جائے اور وہ بالکل محو ہو جائے۔

[3] "مکانة" "ٹھہرنے کی جگہ" کے معنی میں ہے، اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا انہیں ان کی اسی جائے قیام میں، انسانی شکل سے محروم کر دے گا، ان کی شکل بھی بدل جائے گی اور چلنے پھرنے کی توانائی بھی ان میں باقی نہ رہے گی بالکل بے روح مجسموں کی طرح۔

"فاستبقوا الصراط" ممکن ہے کہ اس راستے کی تلاش میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے معنی میں ہو جس پر وہ عام طور پر جایا کرتے تھے۔ یا راستے سے بھٹک جانے اور اسے نہ پا سکنے کے معنی میں ہو۔ کیونکہ بعض ارباب لغت نے کہا ہے کہ "فاستبقوا الصراط" "جاوزوہ و ترکوہ حتی ضلوا" کے معنی میں ہے۔ یعنی راستے سے آگے نکل گئے اور اسے پیچھے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو گئے [1]

بہرحال اس تفسیر کے مطابق کہ جسے اکثر مفسرین نے قبول کیا ہے یہ دونوں آیات عذاب دنیا کے ساتھ مربوط ہیں اور کفار و مجرمین کو اس بات کی تنبیہ و تہدید کرتی ہیں کہ خدا انہیں اس جہان میں ایسے دردناک انجام میں مبتلا کر سکتا ہے لیکن اس نے اپنے لطف و رحمت کی بنا پر ایسا نہیں کیا کہ شاید یہ ہٹ دھرم بیدار ہو جائیں اور راہ حق کی طرف پلٹ آئیں۔

لیکن ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ آیات روز قیامت کے عذاب سے متعلق ہیں نہ کہ دنیا کے۔ درحقیقت گزشتہ آیت کہہ رہی تھی کہ ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے۔ ان آیات میں دو دوسری سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا چاہے تو یہ سزائیں ان پر لاگو کر دے۔

پہلی یہ کہ ان کی آنکھوں کو نابینا کر دے تاکہ وہ "صراط" جنت کے راستے کو نہ پا سکیں اور دوسری یہ کہ ان لوگوں کو کہ جو دنیا میں راہ سعادت پر نہیں چلتے تھے اس دن انہیں بے روح مجسموں کی صورت میں ظاہر کر دے تاکہ وہ عرصۂ محشر میں حیران و پریشان ہو کر رہ جائیں۔ نہ تو انہیں آگے کی طرف کوئی راستہ سجھائی دے اور نہ ہی پیچھے کی طرف۔ البتہ جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے آیات کی مناسبت اس تفسیر کے لیے ایک تائید ہے۔ اگرچہ اکثر مفسرین نے پہلی تفسیر کو قبول کیا ہے [2]

٭ ٭ ٭

زیر بحث آخری آیت میں، عقل و جسم کے ضعف و ناتوانی کے لحاظ سے، عمر کے آخر میں انسان کی حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کے لیے کہ جو راہ ہدایت اختیار کرنے میں آج اور کل کرتے رہتے ہیں، ایک تنبیہ بھی ہو اور ان لوگوں کا جواب بھی ہو کہ جو اپنی کوتاہیوں کو عمر کی کمی کے سر ڈال دیتے ہیں اور یہی بات خدا کی قدرت کی دلیل بھی ہو کہ وہ جس طرح ایک قوی اور طاقتور انسان کو ایک نومولود کی ناتوانی کی طرف پلٹا سکتا ہے کچھ ایسے ہی وہ معاد پر بھی قادر ہے اور اسے مجرموں کو نابینا کرنے اور چلنے پھرنے

---

[1] لسان العرب، قطر المحیط، المنجد (مادہ "سبق")۔

[2] اس تفسیر کو "فی ظلال" نے اکیلی تفسیر کی صورت میں ذکر کیا ہے جبکہ پہلی تفسیر کو جمع البیان، تبیان، المیزان، صافی، روح المعانی، روح البیان، قرطبی اور تفسیر کبیر از فخرالدین رازی میں اختیار کیا گیا ہے۔

سے باز رکھنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: "جس شخص کو ہم طول عمر دیتے ہیں اسے خلقت کے اعتبار سے پلٹ دیتے ہیں، کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے" (و من نعمرہ ننکسہ فی الخلق افلا یعقلون)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ "ننکسہ" "تنکیس" کے مادہ سے کسی چیز کو اس طرح سرنگوں کر دینا ہے کہ سر پاؤں کی جگہ اور پاؤں سر کی جگہ آجائیں اور یہاں انسان کے بالکل بچپن کی حالت کی طرف پلٹ جانے کے لیے کنایہ ہے کیونکہ انسان ابتدائے خلقت میں ضعیف ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ رشد و کمال کی طرف جاتا ہے۔ شکم مادر کے دَور میں ہر روز نئی خلقت اور جدید رُشد سے گزرتا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد بھی جسم و روح میں اپنے تکامل و ارتقاء کو تیزی کے ساتھ جاری و ساری رکھتا ہے اور خدا داد قوتیں اور صلاحیتیں کہ جو اس کے وجود کے اندر چھپی ہوتی ہیں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ جوانی کا دَور اور اس کے بعد پختگی کا وقت آن پہنچتا ہے اور انسان جسمانی و روحانی تکامل و ارتقاء کی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں بعض اوقات جسم و روح اپنے سفر کو ایک دوسرے سے جدا کر لیتے ہیں۔ روح تو اسی طرح سے اپنے تکامل وارتقا کو جاری رکھتی ہے جبکہ جسم پیچھے کی طرف پلٹنا شروع کر دیتا ہے لیکن انجام کار عقل میں بھی تنزل شروع ہو جاتا ہے اور یہ آہستہ آہستہ اور کبھی تیزی کے ساتھ بچپن کے مراحل کی طرف لوٹ آتی ہے۔ بچوں جیسی حرکتیں، بچوں جیسی سوچ، یہاں تک کہ بہانہ تراشیاں بھی بچوں کی طرح ہی ہو جاتی ہیں اور جسمانی کمزوری بھی اس کے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بچوں کی یہ حرکتیں اور پیاری لگتی ہیں اور امید بخش و مسرت آفریں مستقبل کی خوشخبری ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے بالکل قابل برداشت ہوتی ہیں لیکن بوڑھوں کی طرف سے ناپسندیدہ اور کبھی نفرت خیز یا ترحم انگیز ہوتی ہیں۔

سچ مچ ایسے دن آن پہنچتے ہیں کہ جو بہت ہی درد ناک ہوتے ہیں اور جن کی تکلیف کی گہرائی کا بڑی مشکل سے تصور کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید سورۂ حج کی آیہ ۵ میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے۔

و منکم من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئاً

"تم میں سے بعض اس قدر عمر رسیدہ ہو جاتے ہیں کہ وہ بدترین زندگی اور بڑھاپے کے مرحلے کو پہنچ جاتے ہیں اس طرح سے کہ جو علم انہوں نے حاصل کیا ہے وہ بھی یاد نہیں رہتا (یہاں تک کہ اپنے گھر کے افراد میں سے قریب ترین افراد کو بھی نہیں پہچان سکتے)۔

لہٰذا بعض روایات میں ستر سالہ افراد کو "اسیر اللّٰہ فی الارض" (زمین میں خدا کے قیدی) کے نام سے یاد کیا گیا ہے[1]

---

[1] یہ جملہ حدیث نبوی (کتاب سفینہ مادہ "عمر") میں آیا ہے جبکہ دوسری روایات میں نوّے سال کا ذکر ہے۔

بہرحال "افلا یعقلون" اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب تنبیہ ہے اور انسانوں سے کہتی ہے کہ اگر یہ قدرت و توانائی کہ جو تم رکھتے ہو عاریتاً نہ ہوتی تو اتنی آسانی کے ساتھ تم سے نہ چھین لی جاتی۔ جان لو کہ کسی اور کا دستِ قدرت تمہارے سر پر ہے کہ جو ہر چیز پر قادر ہے۔

جب تک تم اس مرحلے تک نہیں پہنچے اپنی خبر لو اور اس سے پہلے کہ نشاط و زیبائی پژمردگی میں تبدیل ہو اس چمن کے پھول چُن لو اور آخرت کے طولانی سفر کا توشہ اس جہان سے لے لو۔ کیونکہ ناتوانی، بڑھاپے اور درماندگی کے وقت تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

اسی لیے جن پانچ چیزوں کی پیغمبر اکرمؐ نے ابوذرؓ کو وصیت کی تھی ان میں سے ایک یہ تھی کہ بڑھاپے سے پہلے دورِ جوانی کو غنیمت جانو:

اغتنم خمسًا قبل خمس: شبابك قبل هرمك، وصحتك قبل سقمك، وغناك قبل فقرك، وفراغك قبل شغلك وحياتك قبل موتك

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو۔ اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، اپنی صحت کو بیماری سے پہلے، اپنی تونگری کو فقر و فاقہ سے پہلے، اپنی فراغت کو مشغولیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے۔[1]

یا بقول شاعر:

چنیں گفت روزی بہ پیری جوانی کہ چوں است با پیریت زندگانی
بگفتا دریں نامہ حرفی است مبہم کہ معنیش جز وقت پیری ندانی
تو بہ کز توانائی خویشتن گوئی چہ می پرسی از دورۂ ناتوانی
متاعی کہ من رائیگاں دادم از کف تو گر می توانی مدہ رائگانی

"ایک دن ایک نوجوان نے ایک بوڑھے سے پوچھا کہ تیرے بڑھاپے کے دن کیسے گزر رہے ہیں؟
اُس نے جواب دیا کہ اس خط میں ایک مبہم بات ہے کہ جس کا معنی تُو بڑھاپے سے پہلے نہیں جان سکتا۔
بہتر ہے کہ تُو اپنی قوت و توانائی کی بات کرے، ناتوانی اور عجز کے دور کے متعلق کیا پوچھتا ہے۔
"وہ متاع کہ جو مَیں اپنے ہاتھ سے مفت میں دے چکا ہوں اگر تجھ سے ہو سکے تو اسے رائیگاں اور مفت میں نہ جانے دے"

---

[1] بحار، جلد ۷۷، صـ۷۷ـ۔

(۶۹) وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ

(۷۰) لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ

(۶۹) ہم نے ہرگز اُسے شعر نہیں سکھایا اور وہ اس کے لائق بھی نہیں ہے۔ یہ (کتاب آسمانی تو) صرف ذکر اور قرآن مبین ہے۔

(۷۰) مقصد یہ ہے کہ تو ان لوگوں کو ڈرائے کہ جو زندہ ہیں اور کفار پر اتمام حجت ہوجائے اور عذاب کا حکم ان کے لیے مسلّم ہوجائے۔

تفسیر

رسولؐ شاعر نہیں بلکہ وہ زندوں کو ڈرانے والا ہے

ہم نے بیان کیا تھا کہ اس سورہ میں اصول دین میں سے توحید، معاد اور نبوت کے بارے میں زندہ اور جامع مباحث بیان کیے گئے ہیں اور گفتگو کے مختلف حصے یکے بعد دیگرے ایک خاص انداز سے آتے چلے جاتے ہیں۔

گزشتہ آیات میں توحید و معاد کے سلسلے میں مختلف بحثیں آئی ہیں۔ زیر نظر دونوں آیات میں نبوت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ پر جو اتہامات لگائے جاتے تھے ان میں سے جو اتہام سب سے زیادہ تھا اسے عنوان بنا کر انہیں دنداں شکن اور سبق آموز جواب دیا گیا ہے اور وہ ہے شعر گوئی کا الزام۔ فرمایا گیا ہے:

"ہم نے اُسے شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی اس کے لیے مناسب اور لائق ہے کہ وہ شاعر ہو" (وما علمناه الشعر وما ينبغي له)۔

وہ پیغمبرِ اکرمؐ پر ایسے الزامات کیوں لگاتے تھے حالانکہ آپؐ نے کبھی بھی شعر نہیں کہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب لوگ دلوں میں قرآن کی تاثیر اور کشش محسوس کرتے تھے اور اس کے لفظ و معنی کی زیبائی اور فصاحت و بلاغت انکار کے قابل نہیں تھی۔ یہاں تک کہ خود مشرکین بھی قرآن کی آواز اور بیان سے اتنے متاثر ہوتے تھے کہ بعض اوقات رات کے وقت چھپ چھپ کر پیغمبرِ اکرمؐ کی منزل کے قریب آتے تھے تاکہ رات کی تاریکی میں آپؐ کی تلاوت کا زمزمہ سُن سکیں۔

کتنے ہی لوگ ایسے تھے جو قرآن کی چند آیات سنتے ہی اس کے شیفتہ اور فریفتہ ہو گئے اور ایک ہی مجلس میں اسلام قبول کرلیا اور قرآن کی آغوش میں پناہ لے لی۔

یہی سبب تھا کہ اس عظیم تاثیر کی توجیہ اور اس آسمانی وحی سے لوگوں کو غافل رکھنے کے لیے انہوں نے ہر جگہ پیغمبرِ اکرمؐ کی شعر گوئی کا پروپیگنڈہ کیا اور یہ باطنی طور پر قرآن کی انتہائی تاثیر کا ایک اعتراف تھا۔

لیکن شاعر ہونا پیغمبر کی شان کے لائق کیوں نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ "وحی" کا راستہ شعر کے راستے سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ:

۱۔ عام طور پر شعر کا سرچشمہ تخیلات و تصورات ہوتے ہیں، شاعر زیادہ تر خیال کے دوش پر سفر کرتا ہے جبکہ "وحی" کا سرچشمہ مبداء ہستی ہے اور یہ حقیقتوں کے گرد گردش کرتی ہے۔

۲۔ شعر انسانی تغیر پذیر حالت سے وقوع میں آتا ہے اور ہمیشہ تغیر کی حالت میں ہوتا ہے جبکہ وحی آسمانی ثابت شدہ حقائق کو بیان کرتی ہے۔

۳۔ شعر کا لطف اکثر موقعوں پر مبالغہ آرائی میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہا گیا ہے کہ:

احسن الشعر اکذبه

"سب سے بہتر شعر وہ ہے کہ جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو۔"

جبکہ وحی میں صداقت اور سچائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

۴۔ شاعر بہت سے موقعوں پر لفظ کی زیبائیوں کی خاطر مجبور ہو جاتا ہے کہ خود کو الفاظ کے سپرد کر دے اور اس کے پیچھے پیچھے چلے اور کتنے ہی حقائق ایسے ہوتے ہیں کہ جو ایسی باتوں میں پامال ہو جاتے ہیں۔

۵۔ ایک مفسر کے خوبصورت خیال میں "شعر" ان آرزوؤں کا مجموعہ ہے کہ جو زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرتی ہیں لیکن وحی ایسے حقائق کا مجموعہ ہے جو آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں اور یہ دونوں راستے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان شعراء کا حساب جدا سمجھیں کہ جو مقدس مقاصد کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور اپنے شعر کو غیر مطلوب عوارض سے دور رکھتے ہیں۔ چاہیئے کہ ایسے شعراء کے مقام اور فن کی قدر و قیمت کو فراموش نہ کریں۔ لیکن بہرحال عام طور پر شعر کا مزاج اور طبیعت یہی ہے کہ جو بیان ہوا ہے۔

اسی بنا پر قرآن مجید سورۂ شعراء کے آخر میں کہتا ہے :

والشعرآء یتبعھم الغاوون

"شعراء تو وہ ہیں جن کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں"۔ (شعراء - ۲۲۴)

اس کے بعد مختصر اور پُر معنی عبارت میں اس کی دلیل پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

الم تر انھم فی کل واد یھیمون ۝ و انھم یقولون مالا یفعلون ۝

"کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں (ہمیشہ خیالات و تصورات کی دنیا اور اپنی شاعرانہ تشبیہات میں ڈوبے رہتے ہیں) اور ہیجانات کی موجوں اور خیالی تحرکات کے سامنے جھکے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیکھتے نہیں ہو کہ جو باتیں وہ کہتے ہیں ان پر عمل نہیں کرتے"۔ (شعراء ۲۲۵-۲۲۶)

البتہ انہی آیات کے آخر میں ان شعراء کو جو صاحبِ ایمان اور نیک و صالح ہیں اور جن کا فن ان کے اہداف و مقاصد کے کام آتا ہے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور ان کی قدر افزائی کی گئی ہے اور ان کا معاملہ دوسروں سے جدا رکھا گیا ہے۔

لیکن بہر حال پیغمبر شاعر نہیں ہو سکتا اور جس وقت قرآن یہ کہتا ہے کہ "خدا نے اُسے شعر کی تعلیم نہیں دی" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا پیغام شعر کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کی تمام تعلیمات کا منبع خدا ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تواریخ و روایات میں بارہا نقل ہوا ہے کہ جس وقت پیغمبرِ اکرمؐ چاہتے تھے کہ کسی شعر کو بطور مثال پیش کریں اور اُسے اپنے قول کا شاہد قرار دیں تو اسے توڑ کر پیش کرتے تھے تاکہ دشمن کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آجائے، چنانچہ ایک دن پیغمبرؐ چاہتے تھے کہ عربوں کا یہ مشہور شعر پڑھیں :

ستبدی لك الایام ماکنت جاھلا و یاتیك بالاخبار من لم تزود

"عنقریب زمانہ تیرے لیے ایسے حقائق آشکار کر دے گا جن سے تُو آگاہ نہیں تھا اور ایسے افراد تیرے لیے خبریں لے کر آئیں گے جن کے لیے تُو نے زاد و توشہ مہیا نہیں کیا تھا"۔

تو پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا :

یاتیك من لم تزود بالاخبار، اور جملے کو آگے پیچھے کر دیا [1]

قرآن پیغمبرِ اکرمؐ کے بارے میں شعر کی نفی کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ "یہ آیات سوائے بیداری کے وسیلہ اور آشکار قرآن کے اور کچھ نہیں ہیں" (ان ھو الا ذکر و قرآن مبین)۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

"اس سے مقصد یہ ہے کہ تُو ان لوگوں کو ڈرائے جو زندہ ہیں اور کافروں پر اتمام حجت ہو جائے اور حکم عذاب ان کے لیے مسلّم ہو جائے" (لینذر من کان حیًّا و یحق القول علی الکافرین) [1]

ہاں! یہ آیات "ذکر" ہیں اور نصیحت و بیداری کا وسیلہ ہیں۔ یہ قرآن مبین کی آیات ہیں کہ جو کسی قسم کی پردہ پوشی کے بغیر بڑی صراحت کے ساتھ حق کو بیان کرتی ہیں۔ اور اسی بنا پر بیداری اور حیات کا موجب ہیں۔

ایک مرتبہ پھر ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ قرآن "ایمان" کو "حیات" اور مومنین کو "زندہ" اور بے ایمان افراد کو "مُردہ" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ایک طرف تو "حیّ" (زندہ) ہے اور اس کے مقابل میں "کافرین" ہے۔ یہ وہی معنوی حیات و موت ہے جو ظاہری موت و حیات سے کئی درجے بڑھ کر ہے اور اس کے آثار زیادہ وسیع ہیں۔ اگر حیات سانس لینے، کھانا کھانے اور چلنے پھرنے کا نام ہو تو یہ ایسی چیز ہے کہ جس میں تمام جانور شریک ہیں۔ یہ انسانی حیات نہیں ہے۔ حیاتِ انسانی تو، روحِ انسانی میں، عقل و خرد اور اعلیٰ ملکات کے پھول کھلنے، تقویٰ، ایثار، فداکاری، نفس پر قابو رکھنے اور فضیلت و اخلاق کا نام ہے اور قرآن انسانوں کے وجود میں اس حیات کی پرورش کرتا ہے۔

بہرحال انسان قرآن کی دعوت کے مقابلے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ زندہ و بیدار افراد کا ہے کہ جو اس کی ہر دعوت پر لبیک کہتا ہے اور اس کی تنبیہوں پر توجہ دیتا ہے۔ دوسرا گروہ مردہ دل کفار کا ہے کہ جو اس کے جواب میں مثبت ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتا لیکن یہ انذار ان پر اتمام حجت اور حکم عذاب کے مسلّم ہونے کا باعث ہے۔

٭ ٭ ٭

دلوں کی موت اور زندگی:

انسان چند قسموں کی موت و حیات کا حامل ہے۔

پہلی تو "نباتی" موت و حیات ہے جو نشو و نما، غذا کھانے اور تولیدِ نسل کی مظہر ہے۔ اس لحاظ سے انسان تمام نباتات کے مانند ہے۔

دوسری موت و حیات "حیوانی" ہے کہ جس کی واضح نشانی حس و حرکت ہے اور ان دونوں خصوصیات میں انسان تمام حیوانات کے ساتھ شریک ہے۔

البتہ تیسری قسم حیات کی وہ ہے جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے، جو انہیں نباتات اور دوسرے

---

[1] "لینذر" "ذکر" سے متعلق ہے کہ جو اس سے پہلے کی آیت میں ہے اور بعض نے اسے "علمنا" یا "نزلنا" سے متعلق سمجھا ہے کہ جو مقدر ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

حیوانات سے جدا کرتی ہے اور وہ ہے حیاتِ انسانی و روحانی۔ یہ وہی چیز ہے جسے اسلامی روایات میں حیات القلوب قرار دیا گیا ہے۔ یہاں پر "قلب" سے مراد وہی روح، عقل اور احساساتِ انسانی ہیں۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام کے ارشادات میں نہج البلاغہ کے خطبات اور کلمات قصار میں اس مسئلے کا ذکر بہت کیا گیا ہے۔ ایک خطبے میں آپ قرآن کے بارے میں فرماتے ہیں:

تفقھوا فیہ فانہ ربیع القلوب

"قرآن کے بارے میں غور و فکر کرو، کیونکہ اس میں دلوں کو حیات بخشنے والی بہار ہے[1]"

دوسری جگہ حکمت و دانش کے متعلق فرماتے ہیں:

ھی حیاۃ للقلب المیت

"حکمت و دانائی مردہ دلوں کے لیے سببِ حیات ہے[2]"

کبھی دل کی بیماری کا بدن کی بیماری سے تقابل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

واشد من مرض البدن مرض القلب

"بدن کی بیماری سے دل کی بیماری بدتر ہے[3]"

کبھی فرماتے ہیں:

ومن قل ورعہ مات قلبہ

"جس میں پرہیزگاری کی روح کم ہو جائے اس کا دل مر جاتا ہے[4]"

دوسری طرف قرآن مجید نے انسان کے لیے ظاہری بینائی و شنوائی اور شعور و ادراک کے علاوہ ایک خاص قسم کی بینائی و شنوائی اور شعور و ادراک کا ذکر کیا ہے جیسا کہ کفار کے بارے میں ہے:

صم بکم عمی فھم لا یعقلون

"وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور اسی بنا پر عقل و شعور نہیں رکھتے۔" (بقرہ - ۱۷۱)

دوسری جگہ منافقین کو دل کے بیماروں کا نام دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا

"خدا ان کی بیماری میں اضافہ کر دیتا ہے۔" (بقرہ - ۱۰)

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۰۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۳۔

[3] نہج البلاغہ، کلمات قصار کلمہ ۳۸۸۔

[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار کلمہ ۳۴۹۔

نیز جن لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہے انہیں قرآن سنگدل قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ثم قست قلوبکم من بعد ذالک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ

"ان کا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے"۔ (بقرہ - ۷۴)

اور کافروں کو "ناپاک دل والے افراد" کے ساتھ تعارف کراتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اولٰئک الذین لم یرد اللّٰہ ان یطھّر قلوبھم

"وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کو پاک نہیں کرنا چاہتا"۔ (مائدہ - ۴۱)

ایک اور جگہ کہتا ہے:

"تیری دعوت کو صرف وہ زندہ لوگ ہی قبول کریں گے کہ جو سننے والے کان رکھتے ہیں، نہ کہ مُردہ لوگ"۔

انما یستجیب الذین یسمعون والموتٰی یبعثھم اللّٰہ ثم الیہ یرجعون۔

ایک اور جگہ ہے:

"صرف وہ لوگ ہی کہ جو سننے والے کان رکھتے ہیں تیری دعوت قبول کریں گے۔ باقی رہے مُردے تو انہیں خدا قیامت میں اٹھائے گا پھر وہ اس کی طرف پلٹ کر جائیں گے"۔ (انعام - ۳۶)

ان تعبیرات کے مجموعے اور ان سے مشابہ بہت سی دوسری تعبیروں سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن موت و حیات کا محور اسی عقل والے انسانی محور کو شمار کرتا ہے کیونکہ انسان کی تمام قدر وقیمت اسی حصے میں چھپی ہوئی ہے۔

حقیقت میں حیات و ادراک، دیکھنا اور سننا وغیرہ انسانی وجود کے اسی حصے میں مجتمع ہوتا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے ان تعبیرات کو مجاز سمجھا ہے لیکن وہ اس مقام پر روحِ قرآنی سے ہم آہنگ نہیں ہیں کیونکہ قرآن کی نگاہ میں حقیقت یہی ہے اور حیوانی موت وحیات ایک مجاز سے زیادہ نہیں ہے۔

روحانی موت و حیات کے عوامل و اسباب بہت زیادہ ہیں لیکن قدر مسلّم یہ ہے کہ نفاق، تکبر، غرور، تعصب، جہالت اور گناہانِ کبیرہ دل کو مردہ کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام کی پندرہ مناجاتوں میں سے تائبین کی مناجات میں بیان ہے:

وامات قلبی عظیم جنایتی

"میرے بڑے بڑے جرائم نے میرے دل کو مُردہ کر دیا ہے"[1]

زیرِ بحث آیات بھی اسی حقیقت پر ایک تاکید ہیں۔

---

[1] امام علی بن الحسینؑ کی پندرہ مناجاتوں میں سے پہلی مناجات (مناجاتِ تائبین)۔

کیا وہ لوگ زندہ ہیں کہ جو زندگی میں صرف اس بات پر قانع ہو گئے ہیں کہ وہ بے خبری کی حالت میں ہمیشہ عیش و نوش میں زندگی بسر کریں، نہ کسی مظلوم کی فریاد سنیں، نہ منادیانِ حق کی ندا پر لبیک کہیں، نہ ظالم کے ظلم سے ناراحت اور پریشان ہوں اور نہ مظلومین کی محرومیت پر ان میں جنبش و حرکت پیدا ہو، صرف اپنے بارے میں سوچیں اور اپنے غیر بلکہ خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہوں۔

کیا زندگی یہی ہے کہ جس کا ماحصل صرف کچھ غذا کا کھا لینا، کچھ کپڑے بوسیدہ کر لینا اور سونے اور جاگنے کی تکرار کرتے رہنا؟

اگر زندگی یہی ہے تو پھر حیوان اور عالمِ انسانی میں کیا فرق ہے؟

پس یہ بات قبول کرنی ہی پڑے گی کہ اس ظاہری زندگی کے ماوراء، اور پس پردہ ایک حقیقت ہے کہ جس کا قرآن ذکر کرتا ہے اور اس کے بارے میں بات کرتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایسے مرنے والے کہ جن کی موت میں بھی حیاتِ انسانی کے آثار پائے جاتے ہیں قرآن کی نگاہ میں مر کر بھی زندہ ہیں لیکن وہ زندہ کہ جن میں حیاتِ انسانی کے آثار میں سے کوئی نظر نہیں آتا، قرآن کی منطق میں مُردہ ہیں۔ ایک جانکاہ و رقت بار موت۔

﴿۷۱﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ○

﴿۷۲﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ○

﴿۷۳﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○

﴿۷۴﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ؕ

﴿۷۵﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ○

﴿۷۶﴾ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ○

ترجمہ

﴿۷۱﴾ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں ہم اپنی قدرت سے روبہ عمل لاتے ہیں ان میں ہم نے ان کے لیے چوپاتے پیدا کیے ہیں کہ جن کے وہ مالک ہیں۔

﴿۷۲﴾ ہم نے انہیں ان کے لیے یوں رام کر دیا ہے کہ انہی میں سے سواری کا کام بھی لیتے ہیں اور انہیں میں سے غذا بھی حاصل کرتے ہیں۔

﴿۷۳﴾ نیز ان (حیوانات) میں ان کے لیے دوسرے منافع بھی ہیں اور پینے کی اچھی چیزیں ہیں، کیا وہ اس حالت میں شکر نہیں کرتے۔

(۷۴) انہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ کچھ معبود بنا لیے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید ان کی مدد کی جائے۔

(۷۵) لیکن وہ ان کی مدد پر قادر نہیں ہیں اور یہ (عبادت کرنے والے قیامت میں) آتشِ جہنم میں حاضر ہونے والا اُن کا لشکر ہوں گے۔

(۷۶) لہٰذا ان کی باتیں تمہیں غمگین نہ کریں، ہم اُن تمام باتوں کو جانتے ہیں کہ جنہیں وہ پنہاں رکھتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں۔

تفسیر

چوپایوں کے عظیم فائدے

ان آیات میں قرآن مجید ایک بار پھر توحید و شرک کے مسئلے کی طرف لوٹتا ہے اور انسانوں کی زندگی میں عظمتِ خدا کی کچھ نشانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ خدا ہی اپنے بندوں کی حاجات کو پورا کرتا ہے اور بُت اس سلسلے میں بے بس اور ناتواں ہیں۔ اس طرح ایک واضح موازنہ کرتے ہوئے راہِ توحید کی حقانیت اور راہِ شرک کے بطلان کو واضح کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں ہم اپنی قدرت سے روبہ عمل لائے ہیں ان میں ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے ہیں کہ جن کے وہ مالک ہیں" (اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاما فھم لھا مالکون) [1]

* * *

اس غرض سے کہ وہ ان چوپایوں سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکیں، ہم نے انہیں ان کے لیے رام کر دیا ہے۔ (و ذللنا ھا لھم)۔

"یہ ان میں سے اپنے لیے سواریاں بھی فراہم کرتے ہیں اور ان سے غذا بھی حاصل کرتے ہیں" (فمنھا رکوبھم و منھا یأکلون)۔

---

[1] ۔ اولم یروا..... ایک ایسا جملہ ہے کہ جو واو عطف کے ساتھ اپنے سے پہلے جملہ پر عطف ہوا ہے البتہ چونکہ ہمزہ استفہام ہمیشہ صدر نشین ہوتا ہے اس لیے واؤ عاطفہ سے پہلے آیا ہے اور یہاں ممکن ہے کہ رویت جاننے یا دیکھنے کے معنی میں ہو۔

ان چوپایوں کے فائدے صرف یہی نہیں ہیں بلکہ "ان کے لیے ان حیوانات میں دوسرے فائدے بھی ہیں اور اچھے مشروبات بھی ہیں" (ولھم فیھا منافع و مشارب)۔

"کیا ان حالات میں بھی وہ ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے" وہ شکر کہ جو اللہ کی معرفت کا وسیلہ اور ولی نعمت کی شناخت کا ذریعہ ہے (افلا یشکرون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ مختلف نعمتیں کہ جن میں انسان سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا ہے، ان میں سے یہاں چوپایوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کیونکہ وہ انسان کی روزمرہ کی زندگی میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں۔ انسانی زندگی ان کے ساتھ اس حد تک وابستہ ہے کہ اگر وہ انسانی زندگی سے حذف ہو جائیں تو واقعاً انسان کی زندگی مشکل اور پیچیدہ ہو جائے۔

۲۔ "عملت ایدینا" (ہمارے ہاتھوں نے انہیں انجام دیا)۔ یہ جملہ پروردگار کی مستقیم DIRECT قدرت کے اعمال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ انسان کا اہم ترین عضو کہ جس کے ساتھ وہ اپنی قدرت کو عمل میں لاتا ہے، اس کے ہاتھ ہیں۔ اسی وجہ سے "ید" (ہاتھ) قدرت کے لیے کنایہ ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے،

ید اللہ فوق ایدیھم

"خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے"۔ (فتح۔ ۱۰)

بہرحال "ایدی" کا ذکر جمع کی شکل میں پروردگار کی قدرت کے گوناں گوں مظاہر کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ "فھم لھا مالکون" (فاء تفریع کے ساتھ) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے چوپایوں کو اپنی قدرت کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن اس کی مالکیت انسانوں کو بخش دی ہے اور اس سے لطفِ پروردگار کی انتہا ظاہر ہوتی ہے۔ اس بناء پر وہ اشکال کہ جو بعض مفسرین کے لیے یہاں "فاء تفریع" میں پیدا ہو گیا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ہم کسی سے کہیں کہ یہ باغ ہم نے آباد کیا ہے لیکن تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گے اور یہ انتہائی محبت و ایثار کی نشانی ہے۔

۴۔ "ذللناھا لھم" انسانوں کے لیے چوپائے رام ہونے کے اہم مسئلے کی طرف اشارہ ہے یہ طاقتور حیوانات کہ جو کبھی کبھی نادر طور پر خدا کے "ذللناھا" کے فرمان کو فراموش کرتے ہوئے عصیان و طغیان پر اتر آتے ہیں تو اس قدر خطرناک ہو جاتے ہیں کہ دسیوں افراد ان کے مقابلہ میں عاجز آجاتے ہیں لیکن عام حالات میں اونٹوں کی ایک قطار کو ایک رسی سے باندھ کر ایک چند سالہ بچے کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے تو وہ انہیں جہاں اس کا دل چاہے لے جاتا ہے۔

واقعاً عجیب بات ہے، نہ تو انسان اس بات پر قادر ہیں کہ ایک مکھی ہی پیدا کر سکیں اور نہ ہی وہ

ایک مکھی کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا سکتے ہیں ، لیکن خدائے قادر و منان نے لاکھوں قسم کے چوپائے پیدا کیے ہیں اور انہیں انسان کے لیے رام اور مطیع کردیا ہے اور وہ ہمیشہ انسان کی خدمت میں لگے رہتے ہیں ۔

۵۔ "فمنها رکوبهم و منها یأکلون" میں " رکوب " صفت مشبہ ہے اور " مرکوب " یعنی وہ جانور کہ جس پر سوار ہوتے ہیں کے معنی میں ہے ۔ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کچھ حیوانات کو تو مرکب اور سواری کے طور پر استعمال کرتا ہے اور کچھ کو کھانے کے لیے ۔

اگرچہ تمام عام جانوروں کا گوشت اسلام کی نظر میں حلال ہے لیکن عملی طور پر ان میں سے کچھ ہی جانور کھانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں ۔ مثلاً گدھے کا گوشت سوائے مجبوری کی حالت کے کوئی نہیں کھاتا ۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ " منها " کو دونوں جملوں میں " تبعیض " کے معنی میں لیا جائے لیکن اگر پہلا " منها " تبعیض حیوانات اور دوسرا " تبعیض " اجزاء کے لیے ہو ، تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ بعض جانوروں کو تم اپنی سواری بناتے ہو اور بعض کے اجزائے بدن سے غذا حاصل کرتے ہو (کیونکہ ہڈیاں وغیرہ غذا کے قابل نہیں ہیں) ۔

۶۔ " لهم فیها منافع " کا جملہ ان دوسرے بہت سے فوائد کی طرف اشارہ ہے کہ جو چوپایوں سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں ۔ ان کی اون سے طرح طرح کے لباس اور خیمے بنتے ہیں اور ان کا چمڑا لباس ، جوتا ، ٹوپی اور زندگی کی دوسری مختلف ضروریات کے کام آتا ہے ۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں بھی جبکہ مصنوعات نے انسانی زندگی کا چہرہ ہی بدل کے رکھ دیا ہے ، پھر بھی انسانوں کی یقینی ضرورت لباس کے لحاظ سے بھی اور باقی وسائل زندگی کے لحاظ سے بھی چوپایوں سے اپنی پوری شد و مد کے ساتھ باقی ہے ۔

یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں انواع و اقسام کے سیرم (EXTRACT) اور ویکسین (VACCINE) کہ جو بیماریوں کا مقابلہ کرنے یا حفظ ماتقدم کے لیے مؤثر ترین ذریعہ ہیں چوپایوں سے ہی حاصل ہوتی ہیں کہ جو ان کے خون سے مہیا کیا جاتا ہے ۔

یہاں تک کہ چوپایوں کی زندگی کی بے قدر و قیمت چیزیں گوبر اور پیشاب سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے اور اسے زمینوں اور درختوں کے لیے کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ۔

۷۔ " مشارب " کی تعبیر اس دودھ کی طرف اشارہ ہے کہ جو مختلف جانوروں سے حاصل کیا جاتا ہے اور انسان کی غذا کا ایک اہم حصہ اس سے اور اس سے بنائی ہوئی چیزوں سے حاصل ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ آج دنیا میں دودھ کی پیداوار اور دودھ سے بنی ہوئی صنعتیں مختلف ممالک کی درآمد و برآمد کا ایک اہم حصہ ہیں ۔ وہی دودھ کہ جو انسان کے لیے ایک مکمل غذا ہے اور یہ خوش گوار دودھ گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے کہ جو پینے والے کے لیے باعث لذت اور ناتوانوں

کے لیے توانائی بخش ہے۔[1]

۸۔ "افلا یشکرون" استفہام انکاری کی صورت میں آیا ہے۔ یہ جملہ خدا کی بے پایاں نعمتوں پر احساس تشکر ابھارنے کی غرض سے ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں "شکر منعم کا لزوم" "معرفت خدا" کے لیے ایک بنیادی چیز ہے۔ کیونکہ شکر، نعمت بخشنے والے کی پہچان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ان نعمتوں کا مطالعہ اور اس بات کا شعور کہ بتوں کا ان میں ہرگز کوئی عمل دخل نہیں، شرک کو باطل کرنے کا ایک وسیلہ ہوگا۔

* * *

اس لیے بعد والی آیات میں مشرکین کی حالت بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "انہوں نے خدا کے علاوہ اپنے لیے کچھ معبود بنالیے ہیں، اس امید پر کہ وہ ان کی مدد کریں گے" (اور انہیں بتوں کی حمایت حاصل ہوگی) (واتخذوا من دون الله اٰلهة لعلهم ينصرون)۔

کیا خیال خام اور باطل نظریہ ہے کہ ان کمزور موجودات کو جو خود اپنے دفاع پر بھی قادر نہیں ہیں، زمین و آسمان کے خالق اور ان تمام نعمتوں کے بخشنے والے کے برابر قرار دے دیا جائے اور زندگی کے مشکل امور میں ان سے مدد طلب کی جائے۔

واتخذوا من دون الله اٰلهة ليكونوا لهم عزًّا

"ہاں! وہ کبھی اس بنا پر بتوں کے پیچھے جاتے تھے کہ وہ ان کے لیے سرمایۂ عزت ہوں گے۔" (مریم - ۸۱)

اور کبھی انہیں خدا کی بارگاہ میں شفیع خیال کرتے۔

ويعبدون من دون الله ما لا يضرهم ولا ينفعهم ويقولون هٰؤلاء شفعاؤنا عند الله

"وہ خدا کے علاوہ کچھ ایسی موجودات کی پرستش کرتے ہیں کہ جو نہ انہیں کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نفع، وہ کہتے ہیں کہ یہ بارگاہِ خدا میں ہمارے شفیع ہیں۔" (یونس - ۱۸)

بہرحال یہ تمام خیالات نقش برآب ہیں اور جیسا کہ قرآن سورۂ اعراف کی آیہ ۱۹۲ میں فرماتا ہے،

ولا يستطيعون لهم نصرًا ولا انفسهم ينصرون

"یہ بت نہ تو اپنے عبادت گزاروں کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی خود اپنی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔"

---

[1] جانوروں کے پستانوں سے نکلنے والے دودھ میں خدا کی قدرت نمائی اور دودھ کی خوبیوں کے بارے میں ہم تفصیلی بحث جلد ۶ میں سورہ نحل کی آیہ ۶۶ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "وہ اپنے عبادت گزاروں کی مدد کرنے پر قادر نہیں ہیں اور یہ عبادت کرنے والے قیامت کے دن ان کا لشکر ہوں گے اور سب کے سب دوزخ میں حاضر ہوں گے" (لا یستطیعون نصرھم وھم لھم جند محضرون)۔

کتنی دردناک صورتِ حال ہے کہ یہ پیروکار اس دن سپاہیوں کی صورت میں بُتوں کے پیچھے کھڑے ہوں گے اور سب کے سب خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے۔ اس کے بعد سب کے سب دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے بغیر اس کے کہ وہ اپنے لشکر کی کوئی مشکل حل کر سکیں۔

اصولی طور پر "محضرون" کی تعبیر ہر جگہ تحقیر و تذلیل کی علامت ہوتی ہے اور لوگوں کو ان کے مائل ہوتے بغیر حاضر کرنا ان کی حقارت کی نشانی ہے۔

اس تفسیر کے مطابق "وھم لھم جند محضرون" میں پہلی ضمیر "ھم" عابدوں کی طرف اور دوسری ضمیر معبودوں کی طرف لوٹتی ہے۔ جبکہ بعض مفسرین نے اس کے برخلاف بھی خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ یہ کہ معبود اور بُت اس دن عبادت کرنے والوں کا لشکر ہوں گے اور لشکر ہونے کے باوجود معمولی سی مدد بھی ان سے نہ ہو سکے گی۔

البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

بہر حال یہ تعبیریں صرف صاحب شعور شیاطین اور سرکش جن و انس جیسے معبودوں کے بارے میں صادق آتی ہیں لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس دن خدا ان بتوں میں عقل و شعور پیدا کر دے گا جو انہوں نے پتھر اور لکڑی سے بنائے ہوں گے۔ تاکہ وہ اپنے عبادت کرنے والوں کی سرزنش کریں ضمنی طور پر یہی پتھر اور لکڑیاں جہنم کے ایندھن کے طور پر ان کے ساتھ ہوں گی۔ جیسا کہ قرآن مجید سورہ انبیاء کی آیہ ۹۸ میں کہتا ہے:

انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم انتم لھا واردون

"تم بھی اور جن جن کی تم خدا کے سوا عبادت کیا کرتے تھے، جہنم کا ایندھن ہوں گے اور سب کے سب اس میں داخل ہوں گے۔"

آخرکار زیر بحث آخری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی تسلی اور ان مخالفتوں، فتنہ انگیزیوں اور خرافاتی اعمال و افکار کے مقابلے میں انکی رُوحانی تقویت کے لیے فرمایا گیا ہے: "اب جبکہ ایسا ہے تو ان کی باتیں تجھے غمگین نہ کریں کہ کبھی وہ تجھے شاعر کہتے ہیں اور کبھی جادوگر اور کبھی دوسری تہمتیں باندھتے ہیں، کیونکہ جس چیز کو وہ دلوں میں مخفی رکھتے ہیں یا زبان کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں ہم وہ سب کچھ جانتے ہیں" (فلا یحزنک قولھم انا نعلم ما یسرون وما یعلنون)۔

نہ تو ان کی نیتیں ہم سے پوشیدہ ہیں اور نہ ہی ان کی خفیہ سازشیں اور نہ ہی ان کی آشکارا تکذیبیں

اور شیطنتیں ۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں اور ان کا حساب روزِ حساب کے لیے محفوظ رکھتے ہیں اور تجھے ہم اس جہان میں بھی ان کے شر سے محفوظ رکھیں گے ۔

نہ صرف پیغمبرؐ بلکہ ہر مومن اس الٰہی گفتار سے مطمئن ہو سکتا ہے ۔کیونکہ اس عالم کی ہر چیز خدا کے حضور میں ہے اور دشمنوں کے مکر و فریب میں سے کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ۔ وہ اپنے دوستوں کو سختی کے لمحات میں اکیلا نہیں چھوڑتا اور ہمیشہ ان کا حامی و محافظ رہتا ہے ۔

ایک اہم نکتہ

خدا پرستوں کے لیے توحید کی بصیرت ، زندگی میں ایک خاص راستہ پیدا کر دیتی ہے کہ جو انہیں شرک آلود راستوں سے جُدا کر دیتی ہے کہ جو بُتوں اور اپنے ہی جیسے کمزور انسانوں کی پناہ لینے کی بنیاد بنتے ہیں

ہم اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔آج کی دنیا میں جبکہ سارا عالم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے اور مشرق و مغرب کی دو سُپر طاقتیں ان پر حکومت کر رہی ہیں تو عام طور پر بہت سے چھوٹے اور درمیانے ممالک یہ سوچتے ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے ان دو طاقتوں یعنی ان دو بُتوں میں سے کسی ایک کی پناہ لینی چاہیئے اور اس کی حمایت حاصل کرنی چاہیئے ۔ حالانکہ تجربات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سخت حالات ، مشکلات اور بحرانوں میں ، یہ بظاہر بڑی طاقتیں نہ تو اپنی کوئی مشکل حل کر سکتی ہیں اور نہ ہی اپنے مُہروں اور پیروکاروں کی ۔ قرآن نے کیا خوب کہا ہے :

ولا یستطیعون لھم نصرًا ولا انفسھم ینصرون

"نہ تو اپنے عبادت کرنے والوں کی مدد و حمایت کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی خود کو بچا کر رکھ سکتے ہیں " (الاعراف ۔ ۱۹۲)

یہ تمام مسلمانوں اور توحید خالص کے حامیوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ ان تمام بتوں سے الگ ہو جائیں اور لطفِ الٰہی کے سائے میں پناہ لیں ۔ صرف اپنے آپ پر اور قوتِ ایمانی اور مسلمانوں کی روحانی قوت پر تکیہ کریں اور ان شرک آلود افکار کو ہرگز ذہن میں جگہ نہ دیں کہ مشکل کے دن ان طاقتوں سے مدد لینا چاہیئے اور اصولی طور پر اسلامی معاشروں کو اس قسم کے افکار سے پاک کرنا چاہیئے اور جان لینا چاہیئے کہ انہوں نے اب تک اس طریقے سے کس قدر مصیبتیں اٹھائی ہیں ۔ خواہ غاصب اسرائیل سے مقابلہ ہو یا دوسرے دشمنوں سے حالانکہ قرآن کا اگر یہ بنیادی قانون ان کے درمیان حاکم ہوتا تو کبھی بھی ایسی المناک شکستوں کا سامنا کرتے اس دن کی امید میں کہ جب ہم سب اس قرآنی تعلیم کے سائے میں اپنے افکار کو نئے سرے سے درست کریں اپنے اوپر بھروسہ کریں اور اللہ کے لطف و کرم کے سائے میں پناہ لیں اور سربلند اور آزاد زندگی بسر کریں ۔

(۷۷) اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ○

(۷۸) وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ○

(۷۹) قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

(۷۷) کیا انسان نے دیکھا نہیں (وہ جانتا نہیں) کہ ہم نے اُسے ایک بے وقعت نطفے سے پیدا کیا ہے اور (جب اُسے قدرت وشعور اور نطق حاصل ہوا تو) وہ کھلم کھلا جھگڑنے لگا۔

(۷۸) اور ہمارے لیے مثال دینے لگا اور اپنی خلقت کو بھول گیا اور کہنے لگا کہ جب یہ ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا۔

(۷۹) کہیے! اسے وہی زندہ کرے گا جس نے اُسے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق سے خوب آگاہ ہے۔

شانِ نزول

اکثر تفاسیر میں نقل ہوا ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص جس کا نام ابی بن خلف یا امیہ بن خلف یا عاص بن وائل تھا بوسیدہ ہڈی کا ایک ٹکڑا تلاش کر کے لایا اور کہا کہ میں اس محکم دلیل کے ساتھ

محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے جھگڑا کروں گا اور معاد کے بارے میں اس کی بات کو باطل کر دوں گا۔ وہ اُسے لے کر پیغمبر اسلامؐ کے پاس آیا (اور شاید اس میں سے کچھ حصہ پیس کر ریزہ ریزہ کیا اور زمین پر پھینک دیا) اور کہا کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو از سر نو کون زندہ کر سکتا ہے (اور کونسی عقل اسے مان سکتی ہے) اس کے جواب میں مذکورہ بالا آیات اور ان سے بعد کی چار آیتیں نازل ہوئیں جو مجموعی طور پر سات آیتیں بنتی ہیں۔ ان آیات میں اسے اور اس کے ہم فکر لوگوں کو ایک منطقی اور دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

خلقتِ اوّل معاد پر ایک دلیل قاطع ہے

ہم نے بیان کیا تھا کہ سورۂ یٰسین میں کہ جو قلبِ قرآن ہے مبدا، معاد اور نبوت سے مربوط گفتگو مختلف حصّوں میں آئی ہے۔ یہ سورہ قرآن مجید اور مسئلہ نبوت سے شروع ہوئی تھی اور سات ایسی منظم آیات پر ختم ہو رہی ہے کہ جو معاد کے بارے میں قوی ترین بیانات کی حامل ہیں۔

پہلے تو انسان کو خود اس کی زندگی کے آغاز کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جبکہ وہ ایک حقیر نطفے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ بات انسان کو سوچنے پر آمادہ کرتی ہے اور کہتی ہے: "کیا انسان نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اُسے نطفے سے پیدا کیا ہے اور بڑھتے بڑھتے وہ ایسا جری، باشعور اور ذی نطق ہُوا کہ خدا ہی کے ساتھ جھگڑنے کھڑا ہو گیا اور کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہو گیا" (اولم یر الانسان انا خلقناه من نطفة فاذا هو خصيم مبين)[1]

کیسی عمدہ اور منہ بولتی تعبیر ہے! پہلے انسان کا ذکر کرتا ہے، یعنی ہر انسان۔ چاہے جس اعتقاد اور مکتب سے تعلق رکھتا ہو، جتنی بھی عقل کا مالک ہو، اس حقیقت کو پا سکتا ہے۔

پھر قرآن "نطفہ" کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ لغت میں "نطفہ" دراصل ناچیز اور بے قدر و قیمت پانی کے معنی میں ہے۔ یہ ذکر اس لیے ہے کہ مغرور و خود پسند انسان تھوڑا بہت غور و فکر کر کے یہ جان لے کہ پہلے روز وہ کیا تھا؟ دوسری بات یہ ہے کہ پانی کا یہ ناچیز قطرہ بھی مکمل طور پر اس کی نشوونما کا مبدا نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی چھوٹا سا زندہ خلیہ LIFE CELL کہ جو آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ وہ ہزاروں خلیے کہ جو پانی کے قطرے میں تیر رہے تھے یہ ان میں سے ایک تھا۔ ایک بہت ہی چھوٹے سے زندہ خلیے کے ساتھ کہ جو عورت کے رحم میں تھا مل کر یہ ایک مرکب بنا اور انسان نے اس خوردبینی موجود سے عالم ہستی میں قدم رکھا۔

---

[1] "خصیم" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو خصومت اور جھگڑے کے درپے ہو اور "رؤیت" یہاں جاننے کے معنی میں ہے۔

پھر اس نے تکامل و ارتقاء کے مراحل یکے بعد دیگرے طے کیے۔ جن میں سے قرآن کی سورۂ مؤمنون کے اوائل کے مطابق چھ مرحلے رحم کے اندر تھے (نطفہ، پھر علقہ، اس کے بعد مضغہ، اس کے بعد ہڈیوں کا ظاہر ہونا، پھر ہڈیوں پر گوشت کا چڑھنا اور آخر میں روح یعنی حس و حرکت کا پیدا ہونا)۔

تولد کے موقع پر وہ ایک بہت ہی ضعیف و ناتواں بچہ تھا۔ اس کے لیے تکامل و ارتقاء کے مراحل تیزی کے ساتھ طے کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جسمانی اور عقلی بلوغ و رشد کی حد تک پہنچ گیا۔

ہاں! یہ ضعیف و ناتواں موجود اتنا قوی ہو گیا کہ "اللہ" کی دعوت کے مقابلے میں لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے اپنے ماضی و مستقبل کو بالکل ہی فراموش کر دیا اور "خصیم مبین" کا واضح مصداق بن گیا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "خصیم مبین" (واضح طور پر جھگڑنے والا) کی تعبیر، ایک تو قوت کے جنبہ کی حامل ہے اور ایک ضعف و کمزوری کے جنبہ کی۔ یہاں پر ظاہراً قرآن کے پیش نظر دونوں جہات ہیں۔

ایک طرف تو یہ کام انسان کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ صاحبِ عقل و شعور ہے اور استقلال، ارادہ، اختیار اور قدرت رکھتا ہے (اور ہم جانتے ہیں کہ انسانی زندگی کا اہم ترین امتیاز یہ ہے کہ وہ صاحبِ نطق ہے) بات کرتا ہے اور ان باتوں کے مضامین و مطالب اس کے دماغ میں پہلے پیدا ہوتے ہیں، پھر جملوں کے قالب میں ڈھلتے ہیں اور پھر یہ باتیں ذہن سے یوں نکلتی ہیں جیسے کسی خودکار ہتھیار سے گولیاں کسی ہدف کی طرف مسلسل پھینکی جاتی ہیں اور یہ ایسا کام ہے کہ جو انسان کے علاوہ کسی بھی جاندار سے ممکن نہیں ہے۔

اس طرح سے قرآن خدا کی قدرت نمائی کو اس عظیم قوت میں مجسم کرتا ہے کہ جو اس نے پانی کے اس ناچیز قطرے کو دی ہے۔

لیکن دوسری طرف سے انسان ایک فراموش کار اور مغرور ذات ہے۔ ان نعمتوں کو کہ جو اس کے ولیٔ نعمت نے اُسے بخشی ہیں اسی کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے اور لڑنے جھگڑنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے اس بے خبری اور خیرہ سری کو کیا کہیے؟

⁂ ⁂ ⁂

اس کی بے خبری کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ "اس نے ہمارے لیے مثال دی اور اپنے خیال میں اس نے ایک دندان شکن دلیل پیدا کر لی۔ حالانکہ وہ اپنی ابتدائی خلقت کو بھول گیا اور اس نے کہہ دیا کہ ان ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے، جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں (وضرب لنا مثلاً ونسی خلقه قال من یحی العظام وھی رمیم)[1]

---

[1] "رمیم" مادہ "رم" سے ہے۔ مفردات راغب کے مطابق اصل میں "رم" (بروزن "ذم") کہنہ اور بوسیدہ موجود

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہاں ضرب المثل سے مراد عام ضرب المثل اور تشبیہ و کنایہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بیانِ استدلال ہے اور ایک مطلب کلّی کے اثبات کے لیے مصداق کا ذکر کرنا مراد ہے۔

ہاں! (ابی بن خلف یا امیہ بن خلف یا عاص بن وائل) نے بیابان سے بوسیدہ ہڈی کا ایک ٹکڑا تلاش کیا اور وہ ہڈی جس کے بارے میں یہ معلوم نہیں تھا کہ کس کی ہے، کیا وہ طبیعی موت سے مرا تھا؟ یا زمانۂ جاہلیت کی کسی جنگ میں المناک موت کا شکار ہوا تھا؟ یا بھوک کی وجہ سے مرا تھا؟ بہرصورت وہ یہ سوچتا تھا کہ نفی معاد کے لیے اسے ایک دندان شکن دلیل مل گئی ہے۔ غصے اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ، ہڈی کے ٹکڑے کو اٹھا کر کہتا ہے:

لاخصمن محمدًا

"میں اس دلیل کے ساتھ محمد (ص) سے لڑوں گا، اس طرح سے کہ وہ کوئی جواب نہ دے سکے گا۔

وہ تیزی سے پیغمبر اسلامؐ کے پاس آیا اور چیخ کر کہنے لگا:

مجھے بتلاؤ کس میں یہ قدرت ہے کہ اس بوسیدہ ہڈی کو دوبارہ زندہ کر دے۔

اس کے بعد اس نے ہڈی کے کچھ حصے کو پیس کر زمین پر چھڑک دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ اس دلیل کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ قرآن مجید نے ایک ہی مختصر سے جملہ "ونسی خلقه" سے اس کا جواب دے دیا۔ اگرچہ اس کے بعد مزید وضاحت اور اضافی دلائل بھی بیان کیے۔

قرآن کہتا ہے: اگر تُو اپنی خلقت کو بھول نہ گیا ہوتا تو ہرگز ایسا بے ہودہ اور کمزور استدلال اختیار نہ کرتا۔ اے فراموش کار انسان! تُو اپنے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھ اور اپنی خلقت پر نگاہ کر۔ تو کس طرح سے ایک ناچیز نطفہ تھا۔ اس خالق مطلق نے ہر روز ایک نیا لباسِ حیات تیرے بدن پر پہنایا۔ تُو تو ہمیشہ سے موت و معاد کی حالت میں ہے۔ مُردہ جمادات سے تیری بنیاد پڑی پھر مُردہ نباتات سے حیوان نے استفادہ کیا۔ اور مردہ حیوانات سے تیری نشو و نما ہوئی اور تُو انسان ہو گیا۔ لیکن تو ایسا فراموش کار ہے کہ ان تمام چیزوں کو بھول کر اب پوچھتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟

یہ ہڈیاں اگر مکمل طور پر بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو جائیں تو زیادہ سے زیادہ پھر مٹی ہو جائیں گی۔ تو کیا تُو پہلے دن مٹی نہیں تھا؟

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ:- کی اصلاح و ترمیم کے معنی میں ہے۔ "رمة" (بروزن ہمت) خصوصیت کے ساتھ بوسیدہ ہڈی کے معنی میں آتا ہے اور "رمه" (بروزن "قبه") بوسیدہ اور پرانی طناب کو کہا جاتا ہے۔

لہٰذا بلا فاصلہ پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اس خیرہ سر، مغرور اور فراموش کار سے "کہیے کہ اسے وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے دن اسے خلق کیا تھا" (قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ)۔

اگر آج اس کی ایک یادگار ہڈی باقی رہ گئی ہے تو ایک دن ایسا بھی تھا کہ یہ بوسیدہ ہڈی بھی نہیں تھی۔ بلکہ مٹی تک بھی موجود نہیں تھی۔ ہاں! وہی ذات کہ جس نے اُسے عدم سے وجود بخشا ہے اس کے لیے بوسیدہ ہڈی کو نئی زندگی عطا کرنا زیادہ آسان ہے۔

اگر تم یہ سوچتے ہو کہ یہ بوسیدہ ہڈیاں جب مٹی بن جاتی ہیں اور اِدھر اُدھر بکھر جاتی ہیں تو ان کے اجزاء کو کون پہچان سکتا ہے اور کون انہیں مختلف مقامات سے جمع کر سکتا ہے؟ تو اس کا جواب بھی واضح ہے "وہ ہر مخلوق سے آگاہ ہے" اور ان کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے (وھو بکل خلق علیم)۔

جو ہستی اس قسم کا علم اور اس قسم کی قدرت رکھتی ہو اس کے لیے مسئلہ معاد اور مُردوں کو زندہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اگر ہم مٹی کے ڈھیر میں کہ جس میں لوہے کے چھوٹے چھوٹے ذرات بکھرے ہوئے ہیں، مقناطیس کا ایک ٹکڑا گھمائیں تو وہ ان تمام ذرات کو فوراً جمع کرلے گا۔ حالانکہ وہ ایک بے جان موجود سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ خداوند تعالیٰ ہر انسان کے تمام ذراتِ بدن کو خواہ وہ کرۂ زمین کے کسی بھی گوشہ میں ہوں ایک ہی حکم سے آسانی کے ساتھ جمع کردے گا۔

وہ نہ صرف انسان کی بنیادِ خلقت سے آگاہ ہے بلکہ ان کی نیتوں اور اعمال سے بھی آگاہ ہے اور ان کا حساب و کتاب اس کے سامنے واضح و روشن ہے۔

اس بناء پر اعمال و نیات اور اندرونی اعتقادات کا حساب بھی اس کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیہ ۲۸۴ میں ہے:

وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ

"اگر تم اس چیز کو جسے دل میں رکھتے ہو چھپاؤ یا ظاہر کرو، خدا اس کا تم سے حساب لے لے گا"

فرعون مسئلہ معاد میں شک کرتا تھا اور گزشتہ لوگوں کے زندہ ہونے اور ان کے حساب و کتاب سے اظہارِ تعجب کرتا تھا۔ حضرت موسٰیؑ کو حکم ہوا کہ اس سے "یہ کہیں کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں ثبت ہے اور میرا پروردگار نہ تو اشتباہ کرتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔"

قال علمھا عند ربی فی کتٰب لا یضل ربی ولا ینسی (طٰہٰ - ۵۲)

۸۰ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝

ترجمہ

۸۰ وہی ذات کہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی، اور تم اس کے ذریعے آگ روشن کرتے ہو۔

تفسیر

توانائیوں کی بازگشت

گزشتہ آیات میں معاد کے سلسلے میں بحث تھی اور اس میں مسئلہ معاد کے امکان اور ہر قسم کا شک و شبہ رفع کرنے کے لیے معنی خیز اور زندہ اشارے موجود تھے۔ زیر بحث آیات قلب قرآن یعنی سورہ یٰسین کی آخری آیات ہیں۔ ان میں بھی اسی مسئلے کی مزید تشریح و توضیح پیش کی گئی ہے اور تین چار اچھے طریقوں سے اسے بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "وہ خدا کہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی اور تم اسکے ذریعے آگ روشن کرتے ہو۔" وہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے (الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارًا فاذا انتم منه توقدون)۔

کتنی عجیب اور عمدہ تعبیر ہے۔ ہم اس میں جتنا زیادہ غور و فکر کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ عمیق اور گہرے معانی کھلتے چلے جاتے ہیں۔

اصولی طور پر قرآن مجید کی بہت سی آیات کئی کئی معنی دیتی ہیں۔ بعض تو ہر زمانے اور ہر جگہ کے لوگوں کے سمجھنے کے لیے سادہ اور عام ہیں اور بعض دوسری آیات ذرا عمیق ہیں جو خواص کے سمجھنے کے لائق ہیں اور بعض آیات بہت عمیق اور گہری ہیں جو خواص میں سے بھی منتخب افراد کو، یا دوسرے زمانوں اور مستقبل بعید میں سمجھ میں آنے والی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہ معانی آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ایک ہی وقت میں ایک ہی پُر معنی تعبیر میں جمع ہیں۔

زیر بحث آیت یہی مفہوم بیان کرتی ہے۔

پہلی تفسیر بہت سے گزشتہ مفسرین نے بیان کی ہے اس کا ایک سادہ اور واضح مفہوم ہے کہ جو عام لوگوں کے لیے بھی قابل فہم ہے۔ وہ یہ ہے کہ قدیم زمانوں میں عربوں کے اندر یہ بات رائج تھی کہ وہ آگ جلانے کے لیے درختوں کی لکڑی استعمال کرتے تھے خصوصاً "مرخ" اور "عفار" کے درختوں کی لکڑی کہ جو حجاز کے بیابانوں میں عام اُگتی تھی۔

"مرخ" (بروزن "چرخ") اور "عفار" (بروزن "تبار") دو قسم کی "آگ لگانے والی" لکڑیاں ہیں کہ پہلی کو نیچے رکھ کر دوسری کو اس کے اوپر مارتے تھے اور اس سے آگ لگانے والے پتھر (چقماق) کی طرح شعلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ موجودہ زمانے کی ماچس کے بجائے لوگ اسی سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

قرآن کہتا ہے: وہ خدا کہ جو ان سبز درختوں سے آگ نکال سکتا ہے، وہ مُردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

"پانی" اور "آگ" دو متضاد چیزیں ہیں۔ جو ہستی ان دونوں کو ایک ساتھ اکٹھا رکھنے پر قادر ہے، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ "زندگی" کو "موت" کے ساتھ اور "موت" کو "زندگی" کے ساتھ جمع کر دے۔

کیا کہنا ہے اس عالم ہستی کے خالق کا کہ جس نے آگ کو پانی کے اندر اور پانی کو آگ کے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ مسلمہ طور پر اُس کے لیے مُردہ انسانوں کے جسموں پر لباس زندگی پہنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اگر ہم اس معنی سے ذرا اور آگے قدم بڑھائیں تو اس سے زیادہ دقیق تفسیر تک پہنچ جائیں گے۔ وہ یہ ہے کہ آگ جلانے کی خاصیت درختوں کی لکڑیوں کے ذریعہ "مرخ" اور "عفار" کی لکڑیوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ خاصیت تمام درختوں میں اور تمام اجسام عالم میں موجود ہے (اگرچہ مذکورہ دونوں لکڑیاں اپنے مخصوص مواد اور وضع و کیفیت کے لحاظ سے اس کام کے لیے زیادہ کارآمد ہیں)۔

خلاصہ یہ کہ تمام درختوں کی لکڑیاں اگر زور کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو ان سے شعلہ نکلے گا، یہاں تک کہ "سبز درختوں کی لکڑیوں سے بھی"۔

اسی وجہ سے بعض اوقات جنگلوں میں وسیع اور وحشتناک آگ لگ جاتی ہے کہ جس کا عامل کوئی انسان نہیں ہوتا۔ صرف وہ ہوائیں اور طوفان کہ جن کے چلنے سے درختوں کی شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی ہیں اور ان کے ٹکرانے سے چنگاری نکل کر خشک پتوں پر جا گرتی ہے، اس کے بعد ہوا کے چلنے سے آگ پھیل جاتی ہے اور یہ سب چیزیں اس کا اصلی عامل ہوتی ہیں۔

یہ وہی بجلی کا شعلہ ہے کہ جو ٹکرانے اور ایک دوسرے کے ساتھ ملنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہی آگ ہے کہ جو تمام موجودات عالم کے ذرات میں چھپی ہوئی ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے اور لگنے سے ظاہر ہوتی ہے اور "شجر اخضر" (سبز درخت) سے "نار" (آگ) پیدا کر دیتی ہے۔

یہ ایک زیادہ وسیع تفسیر ہے کہ جس میں زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماع اضداد نظر آتا ہے اور "فنا" میں "بقا" کی زیادہ واضح نشاندہی ہوتی ہے۔

لیکن اس سلسلے میں ایک تیسری تفسیر بھی ہے کہ جو اس سے بھی گہری، عمیق تر ہے اور ہم نے دورِ حاضر کے علوم کی مدد سے اس تک دسترس حاصل کی ہے اور اسے ہم نے "توانائیوں کی بازگشت" قرار دیا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ نباتات کا ایک اہم کام ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ لینا اور "نباتاتی خلیے" بنانا ہے (یہ سیل کہ جو درختوں کا بنیادی جزو ہیں ان کے بڑے اجزاء کاربن، آکسیجن اور ہائیڈروجن ہیں)۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خلیے (CELLS) کس طرح بنتے ہیں؟ درختوں اور نباتات کے اجسام ہوا سے "کاربن ڈائی آکسائیڈ" حاصل کرکے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اس کی "آکسیجن" کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور کاربن کو اپنے وجود میں محفوظ کرلیتے ہیں اور اسے پانی کے ساتھ ترکیب دے کر اس سے درختوں کا جسم بناتے ہیں۔

لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ طبیعی علوم کی گواہی کے مطابق جو بھی کیمیائی ترکیب انجام پاتی ہے وہ یا تو توانائی کو جذب کرکے وجود میں آتی ہے یا اُسے آزاد کرنے سے (غور کیجئے گا)[1]

اس بناء پر جس وقت درخت کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرنے کے عمل میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ اس قانون کے مطابق ایک انرجی کے وجود کے محتاج ہیں اور یہاں وہ سورج کی کچھ گرمی اور روشنی سے ایک توانائی کے طور پر استفادہ کرتے ہیں۔

اس طرح سے درختوں کا جسم بنتے وقت سورج کی توانائی کی کچھ مقدار بھی ان کے اندر جمع ہوجاتی ہے اور جس وقت ہم لکڑیوں کو جلاتے ہیں تو وہی سورج کی ذخیرہ شدہ توانائی آزاد ہوجاتی ہے کیونکہ کاربن ہوا کی "آکسیجن" کے ساتھ مل کر دوبارہ کاربن ڈائی آکسائیڈ بنا دیتی ہے اور آکسیجن اور ہائیڈروجن (پانی کی کچھ مقدار) آزاد ہوجاتی ہے۔

ان اصطلاحی تعبیروں کو چھوڑتے ہوئے بہت ہی سادہ اور آسان عبارت میں یہ ایک مطبوع نور اور حرارت کہ جو سردیوں میں کسی دیہاتی کی کٹیا یا کسی شہری کی انگیٹھی کو گرم اور روشن کرتی ہے سورج کا وہی نور و حرارت ہے کہ جو چند سالوں یا دسیوں سالوں میں ان درختوں کی لکڑی میں ذخیرہ ہوئی ہے اور جو کچھ درخت نے اس طویل عمر میں تدریجاً اور آہستہ آہستہ سورج سے لیا ہے اور بے کم و کاست اسے واپس دے رہا ہے۔

---

[1] توانائی جذب کرنے کے عمل کو ENDOTHERMIC کہتے ہیں اور خارج کرنے کا عمل EXOTHERMIC کہلاتا ہے۔ (ش ن)۔

یہ جو کہتے ہیں کہ کرہ زمین کی تمام توانائیاں سورج کی توانائی کی طرف لوٹتی ہیں، اس کی ایک صورت یہی ہے۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ہم توانائیوں کی بازگشت تک پہنچ جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نور و حرارت کہ جو اس فضا میں بکھر جاتی ہے اور درختوں کے پتوں اور ان کی لکڑیوں پر نوازش کرتی اور ان کی پرورش کرتی ہے وہ کبھی بھی نابود نہیں ہوتی بلکہ اس کا چہرہ بدل جاتا ہے اور ہم انسانوں کی آنکھوں سے دور درختوں کے تنوں، شاخوں اور پتوں کے اندر پنہاں ہوگئی ہے اور جس وقت آگ کا ایک شعلہ خشک لکڑی تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی قیامت شروع ہو جاتی ہے اور سورج کی وہ تمام توانائی جو درخت میں پنہاں تھی اسی لیے اس کا حشر و نشر ظاہر ہو جاتا ہے، بغیر اس کے کہ ایک شمع کی روشنی کے برابر بھی اس میں کچھ کمی ہو (پھر غور کیجئے گا)۔

اس میں شک نہیں کہ یہ معنی آیت کے نزول کے زمانہ میں عامۃ الناس پر واضح نہیں تھا، لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ قرآنی آیات کے معانی کے کئی مرحلے ہیں او مختلف سطحوں میں اختلاف استعداد کے لحاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ایک دن لوگ اس آیت سے ایک چیز سمجھتے تھے، آج ہم اس سے کہیں زیادہ چیزیں سمجھ رہے ہیں اور شاید آئندہ آنے والے اس سے بھی کچھ آگے بڑھ جائیں اور زیادہ سمجھ سکیں۔ اس کے باوجود یہ تمام معانی صحیح ہیں اور مکمل طور پر قابل قبول اور آیت کے معنی میں جمع ہیں۔

چند نکات

۱۔ سبز درخت ہی کیوں؟ بعض اوقات ذہن میں آتا ہے کہ قرآن نے یہاں "شجر اخضر" (سبز درخت) کی تعبیر کیوں بیان کی ہے حالانکہ سبز اور گیلی لکڑی سے آگ جلانا بہت ہی مشکل ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کے بجائے "الشجر الیابس" (خشک درخت) کی تعبیر استعمال ہوتی کہ جو زیادہ برمحل تھی۔

لیکن قابل توجہ بات یہی ہے کہ یہ سبز درخت ہی ہیں کہ جو کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرتے ہیں اور سورج کی روشنی ذخیرہ کرنے کا عمل انجام دیتے ہیں۔ خشک درخت اگر سینکڑوں سالوں تک سورج کی حرارت اور روشنی کے سامنے رکھے رہیں تو ان کی حرارت کی توانائی کے ذخیرے میں ذرہ بھر اضافہ نہ ہوگا۔ وہ اسی وقت تک اس کام پر قادر ہیں جب تک کہ وہ سبز اور زندہ ہیں۔

اس بناء پر صرف "شجر اخضر" (سبز درخت) ہی ہے کہ جو اپنی سبز و مرطوب لکڑی میں حرارت اور روشنی کو پُر اسرار طریقے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

لیکن جس وقت وہ خشک ہو جائے تو کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرنے اور سورج کی توانائی کو ذخیرہ

کرنے کا عمل ختم ہو جاتا ہے ۔ اس اصول کی بناء پر یہ تعبیر توانائیوں کی بازگشت کی خوبصورت تصویر کشی بھی کرتی ہے اور قرآن مجید کے ایک جاودانی علمی معجزے کو بھی پیش کرتی ہے ۔

اس کے علاوہ اگر ہم مذکورہ بالا دیگر تفسیروں کی طرف بھی رجوع کریں تو "شجر اخضر" کی تعبیر پھر بھی مناسب و زیبا ہے کیونکہ سبز درختوں کی لکڑیاں جس وقت ایک دوسرے کے ساتھ زور سے ٹکراتی ہیں تو چنگاری پیدا ہوتی ہے ایسی چنگاری کہ جو آگ جلانے کا سبب بن سکتی ہے ۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ہم قدرت خدا کی عظمت جان سکتے ہیں کہ جس نے آگ کو پانی کے اندر اور پانی کو آگ کے اندر محفوظ کر دیا ہے ۔

۲۔ آتش زنہ اور آتش گیر میں فرق: "توقدون" "وقود" کے مادہ سے (بروزن "قبوز") آگ روشن ہونے کے معنی میں ہے اور "ایقاد" آگ لگانے کے معنی میں ہے اور "وقود" (بروزن "شعود") اس ایندھن کے معنی میں ہے کہ جو آگ جلانے کے لیے کام میں لایا جاتا ہے ۔

تو اس بناء پر "فاذا انتم منه توقدون" (تم اس سے آگ روشن کرتے ہو) کا جملہ اس ایندھن کی طرف اشارہ ہے کہ جس سے آگ جلاتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں آگ پکڑنے والے (آتش گیر) کی طرف اشارہ ہے نہ کہ آگ لگانے والے "آتش زنہ" کی طرف ۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم فارسی میں ایندھن کو "آتش گیرہ" (آگ پکڑنے والا) اور ماچس یا لائٹر کو "آتش زنہ" (آگ لگانے والا) کہتے ہیں اور عربی میں ایندھن کو "وقود" اور ماچس یا لائٹر کو "زند" یا "زناد" کہتے ہیں [1]

اس بناء پر قرآن کہتا ہے کہ وہ خدا کہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ فراہم کی ہے اور تم اس سے ایندھن تیار کرتے ہو (آتش زنہ "آگ لگانے والا" نہیں فرماتا) وہ اس پر بھی قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے ، اور یہ تعبیر کاملاً توانائیوں کی بازگشت پر منطبق ہے (غور کیجئے گا) [2]

بہرحال درختوں کی لکڑیوں کے ساتھ آگ روشن کرنے کا مسئلہ اگرچہ ہماری نظر میں ایک سادہ مسئلہ ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عجیب ترین مسائل میں سے ہے کیونکہ وہ مواد کہ جس سے درخت بنتے ہیں اس کا ایک اہم حصہ پانی اور کچھ مقدار زمین کے اجزاء ہیں اور ان میں سے کوئی بھی جل اٹھنے کے قابل نہیں ہے ۔ تو یہ کونسی قدرت ہے کہ جس نے پانی ، مٹی اور ہوا سے توانائی پیدا کرنے والا یہ مادہ پیدا کیا ہے کہ انسانوں کی زندگی ہزارہا سال سے اس سے قریبی تعلق رکھتی ہے ۔

---

[1] "زند" (بروزن "بند") اصل میں اوپر والی لکڑی کے معنی میں ہے کہ جس سے آگ جلاتے ہیں اور نچلی لکڑی کو "زندہ" اور دونوں کو "زندان" کہتے ہیں اور "زند" کی جمع "زناد" ہے ۔

[2] مگر یہ کہ ہم "منه توقدون" کے جملے میں "من" کو "با" کے معنی میں لیں تاکہ دوسری تفسیروں سے ہم آہنگ ہو جائے ۔

(۸۱) اَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ○

(۸۲) اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

(۸۳) فَسُبْحٰنَ الَّذِىْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَىْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

ترجمہ

(۸۱) کیا وہ ذات کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کے مانند (خاک شدہ انسانوں) کو پیدا کر دے۔ ہاں وہ خلّاقِ علیم ہے۔

(۸۲) اس کا امر تو صرف یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے کہتا ہے "ہو جا"، تو وہ بلا فاصلہ ہو جاتی ہے۔

(۸۳) پس منزہ ہے وہ خدا کہ جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز کی مالکیت و حاکمیت ہے اور (سب کے سب) اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

تفسیر

وہ ہر چیز کا مالک وحاکم ہے

گزشتہ آیات میں خلقتِ اوّل اور سبز درخت سے آگ پیدا کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے معلو

کے دلائل کا ذکر ہے۔ اب پہلی زیر بحث آیت میں ایک اور حوالے سے اس مسئلے کو بیان کیا گیا ہے اور وہ خدا کی بے پایاں قدرت کا بیان ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "کیا وہ ہستی کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اس تمام عظمت، عجائبات اور حیرت انگیز نظاموں کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان خاک شدہ انسانوں کے مانند نئی تخلیق کرے (اور انہیں ایک نئی زندگی کی طرف لوٹا دے) ہاں! وہ ایسا کر سکتا ہے اور وہ آگاہ و دانا خلاق ہے" (اولیس الذی خلق السماوات والارض بقادر علٰی ان یخلق مثلھم بلٰی وھو الخلّاق العلیم)۔

یہ جملہ کہ جو استفہام انکاری سے شروع ہوا ہے، حقیقت میں بیدار عقل و وجدان کے سامنے ایک سوال پیش کرتا ہے کہ کیا تم اس عظیم آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ جو عجیب و غریب ثوابت و سیارات اور منظومات اور کہکشاؤں کا حامل ہے۔ جس کا ہر گوشہ ایک وسیع دنیا ہے۔ تو وہ ذات کہ جو ان عظیم اور منظم عوالم کی خلقت پر قادر ہے، کیسے ممکن ہے کہ مُردوں کے زندہ کرنے پر قادر نہ ہو؟

اس سوال کا جواب چونکہ ہر بیدار انسان کے قلب و روح میں موجود ہے، لہٰذا وہ جواب کا انتظار نہیں کرتا بلکہ بلا فاصلہ کہتا ہے: ہاں! وہ اس قسم کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کے بعد خدا کی دو عظیم صفات کا ذکر ہے کہ جو اس مسئلے میں قابل توجہ ہیں، یعنی صفت خلاقیت اور اس کا بے پایاں علم۔ یہ حقیقت میں گزشتہ بات کی ایک دلیل ہے کہ اگر تمہارا شک و شبہ خلقت کے بارے میں اس کی قدرت کی وجہ سے ہے تو وہ خلاق ہے (توجہ رہے کہ خلاق مبالغے کا صیغہ ہے)۔

نیز اگر ان ذرات کو جمع کرنا علم و دانش کا محتاج ہے تو وہ ہر لحاظ سے عالم و آگاہ ہے۔

"مثلھم" کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ ضمیر انسانوں کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین کا خالق اس بات پر قادر ہے کہ وہ انسانوں کی مثل پیدا کر دے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ وہ خود از سر نو پیدا کرنے پر قادر ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ "ان کی مثل" پیدا کر سکتا ہے۔

اس سوال کے بہت سے جواب دیئے گئے ہیں لیکن جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ جب انسان کا بدن مٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کی اپنی شکل و صورت باقی نہیں رہتی اور قیامت کے دن جو کچھ لوٹے گا وہ اس کا پہلا مواد ہی ہوگا کہ جو دہی پہلے کی سی صورت اختیار کرے گا۔ یعنی مادہ تو وہی ہوگا لیکن شکل و صورت گزشتہ صورت کی مثل ہوگی۔ کیونکہ عین اسی صورت کا خصوصاً قید زمانی کے ساتھ لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ ہم جانتے ہیں کہ قیامت میں تمام انسان اپنی تمام گزشتہ کیفیات کے ساتھ محشور نہیں

ہوں گے۔ مثلاً بوڑھے جوان کی شکل میں اور معلول صحیح و سالم صورت میں ہوں گے۔

دوسرے لفظوں میں انسانوں کا بدن اُس اینٹ کے مانند ہے جو ریزہ ریزہ ہو کر پراگندہ ہو جائے اور اس کی مٹی کو جمع کر لیا جائے اور دوبارہ اس کا گارا بنا کر سانچے میں ڈال لیا جائے اور اس سے نئی اینٹ بنالی جائے۔

یہ نئی اینٹ ایک حیثیت سے بعینہ وہی ہے اور ایک لحاظ سے اس کی مثل ہے (اس کا مادہ تو وہی ہے لیکن اس کی شکل و صورت پہلی صورت کی مثل و مانند ہے) (غور کیجئے گا) [1]

بعد والی آیت اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ اس کے ارادہ اور قدرت کے سامنے ہر قسم کی ایجاد سہل و آسان ہے، اس کے لیے عظیم آسمانوں اور کرۂ خاکی کا ایجاد کرنا اور ایک چھوٹے سے کیڑے کی ایجاد برابر و یکساں ہے، فرماتا ہے: "اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز (کے پیدا کرنے) کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے"، جیسا کہ خدا نے چاہا ہے (انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہ کن فیکون)۔

تمام چیزیں اس کے ایک اشارے اور فرمان کے ساتھ وابستہ ہیں تو جو اس قسم کی قدرت کا مالک ہو کیا اس کے بارے میں اس بات کی کوئی گنجائش ہے کہ اس کے مُردوں کو زندہ کرنے کے متعلق اس کی قدرت میں شک کیا جائے؟

یہ بات واضح ہے کہ یہاں امرالٰہی لفظی امر کے معنی میں نہیں ہے اسی طرح لفظ "کُن" (ہو جا) بھی ایسا نہیں کہ جسے خدا لفظ کی صورت میں ادا کرے کیونکہ نہ وہ کوئی لفظ بولتا ہے اور نہ ہی وہ الفاظ کا محتاج ہے بلکہ اس سے مراد اس کا کوئی چیز کے ایجاد و تخلیق کرنے کا ارادہ کرنا ہے نیز لفظ "کُن" اس بنا پر ہے کہ اس سے زیادہ مختصر، زیادہ چھوٹی اور زیادہ سریع تعبیر کا تصور نہیں ہو سکتا۔

---

[1] بعض مفسرین نے "مثلھم" کی ضمیر کو آسمانوں اور زمین کی طرف پلٹایا ہے اور کہا ہے کہ ذوی العقول کی ضمیر جمع کا انتخاب اس بنا پر ہے کہ زمین و آسمان میں بہت سے ذوی العقول موجود ہیں۔ بعض دوسرے مفسرین نے "مثل" کی تعبیر کو اس بات پر شاہد بنایا ہے کہ عین اسی جسم اور اسی مواد کا لوٹنا کہ جو دُنیا میں تھا، ضروری نہیں ہے کیونکہ انسان کی شخصیت اس کی روح کے ساتھ ہے اور یہ روح جس مادہ کے ساتھ بھی تعلق اختیار کرے گی وہ انسان کی مثل ہو گی، لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ یہ بات آیاتِ قرآنی حتّٰی کہ زیرِ بحث آیات کے ساتھ بھی بالکل ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن صراحت کے ساتھ انہیں آیات میں کہتا ہے کہ خدا انہی بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا اور انہیں لباسِ حیات پہنائے گا نہ کہ دوسرے مواد کو۔ (غور کیجئے گا)۔

ہاں! جونہی وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ فوراً موجود ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں جس وقت خدا کسی چیز کا ارادہ کرے، تو وہ بلا فاصلہ وجود پا جاتی ہے اس طرح سے کہ اس کے "ارادہ" اور "اشیاء کے وجود" کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ اس بناء پر "امر"، "قول اور کُن" کے الفاظ سب کے سب خلق و ایجاد کے مسئلے کی ایک توضیح ہیں اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یہاں امر لفظی اور "کاف و نون" کا کوئی لفظ، بات یا قول بیان نہیں ہوا۔ یہ سب کے سب ارادۂ الٰہی کے بعد اشیاء کے تیزی اور سرعت کے ساتھ وجود پانے کو بیان کرتے ہیں۔ ایسے الفاظ و کلمات کی کیا حاجت ہے۔ اصولی طور پر کسی چیز کو ایجاد کرنے کے لیے اس کی مشیت کے بعد الفاظ کی وساطت بے معنی ہے۔

زیادہ واضح تعبیر میں، خدا کے افعال میں دو مرحلوں سے زیادہ کا وجود نہیں ہے، مرحلۂ ارادہ اور مرحلۂ ایجاد مذکورہ بالا آیت میں دوسرا مرحلہ امر و قول اور لفظ "کُن" کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔

بعض قدیم مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں قول اور ایک بات ضرور ہے اور اُسے وہ ایک ناشناختہ اسرار میں سے سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقت میں الفاظ کے پیچ و خم میں الجھ گئے ہیں اور ان کے مفہوم و مطلب سے بے خبر رہے ہیں اور انہوں نے خدائی کاموں کو اپنے اوپر قیاس کر لیا ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں کیا خوب فرمایا ہے:

يقول لما اراد لما كونه كن فيكون[1] لا بصوت يقرع ولا بنداء يسمع و انما كلامه سبحانه فعل منه انشاه و مثله لم يكن من قبل ذالك كائنا، ولو كان قديما لكان ثانيا۔

"وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس سے کہتا ہے، ہو جا تو وہ بلا تاخیر ہو جاتی ہے لیکن اس کا کلام نہ تو ایسی ندا ہے کہ جو کانوں سے ٹکرائے اور نہ ہی ایسی ندا کہ جو سنی جائے بلکہ خدا کی بات وہی اُس کا فعل ہے کہ جسے وہ ایجاد کرتا ہے اور اس سے پہلے کوئی بھی چیز موجود نہیں تھی اور اگر ہوتی تو وہ دوسرا خدا شمار ہوتی"[2]

اس سے قطع نظر اگر کوئی لفظ درمیان میں ہو تو اس کی دو صورتیں ہوں گی:

پہلی صورت یہ ہے کہ یہ لفظ خود مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے اور اس کو ایجاد کرنے کے لیے

---

[1] نہج البلاغہ کے بعض نسخوں میں مثلاً "منہاج البراعۃ" میں "لما اراد" کی تعبیر ہے۔ تفسیر نور الثقلین میں بھی نہج البلاغہ سے اسی طرح نقل ہوا ہے لیکن دوسرے نسخوں میں مثلاً ابن ابی الحدید، ابن میثم اور صبحی صالح کے نسخہ میں "لمن اراد" آیا ہے لیکن مناسب وہی پہلا نسخہ ہے۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۶۔

ایک دوسرے "کُن" کی ضرورت ہوگی اور اس بات کی اس دوسرے "کُن" کے بارے میں بھی تکرار ہوگی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ہر خطاب کے لیے ایک مخاطب کی ضرورت ہوتی ہے اور جب ابھی تک کوئی چیز موجود ہی نہیں تو خدا "کُن" کہہ کر اُسے کس طرح مخاطب کرے گا۔ کیا معدوم سے خطاب ہو سکتا ہے؟

قرآن کی دوسری آیات میں یہی معنی دوسرے الفاظ میں آیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۱۷ میں ہے:

واذا قضٰی امرًا فانّما یقول لہ کن فیکون

"جس وقت اس کی قضا اور حکم کسی چیز کے بارے میں ہوتا ہے تو وہ اُسے صرف یہ کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ بلا فاصلہ ہو جاتی ہے۔"

اسی کی مانند سورہ نحل کی آیہ ۴۰ میں ہے:

انما قولنا لشیء اذا اردناہ ان نقول لہ کن فیکون

"جو چیز ہم ایجاد کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہمارا قول یہی ہے کہ ہم اُسے کہتے ہیں ہو جا تو وہ بلا فاصلہ ہو جاتی ہے۔"[١]

زیر بحث آخری آیت کہ جو سورہ یٰسین کی آخری آیت ہے مبداء و معاد کے بارے میں ایک کُلی نتیجہ نکالنے کے لیے اس بحث کو ایک خوبصورت طریقے سے ختم کرتی ہے ارشاد ہوتا ہے: "پس منزہ ہے وہ خدا کہ جس کے قبضۂ قدرت میں تمام چیزیں ہیں اور تم سب کے سب اُسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے" (فسبحٰن الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون)۔

"ملکوت" "ملك" (بروزن "حکم") کے مادہ سے حکومت و مالکیت کے معنی میں ہے اور اس کے ساتھ "واؤ" اور "ت" کا اضافہ تاکید و مبالغہ کے لیے ہے۔ اس لیے آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ہر چیز کی مالکیت و حاکمیت بلا شرط خدا کے دستِ قدرت میں ہے اور اس قسم کا خدا ہر طرح کے عجز و ناتوانی سے منزہ و مبرا ہے، تو اس صورت میں مُردوں کو زندہ کرنا اور بوسیدہ ہڈیوں اور پراگندہ مٹی کو لباسِ حیات پہنانا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے، جب یہ بات ہے تو یقینی طور پر تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے اور معاد حق ہے۔

چند نکات

اس تفسیر میں ہم نے متعدد بار وعدہ کیا ہے کہ سورۂ یٰسین کے اختتام پر ہم معاد کے مختلف پہلوؤں پر

---

[١] "کن فیکون" کے بارے میں جلد اوّل سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۷ کے ذیل میں بھی بحث کی گئی ہے۔

کچھ تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اس وقت ہم اس عہد کو پورا کرتے ہوئے قارئین محترم کی توجہ ذیل کی چھ بحثوں کی طرف دلانا چاہیں گے۔

۱۔ معاد کا اعتقاد ایک فطری امر ہے: اگر انسان فنا کے لیے پیدا کیا گیا ہوتا تو پھر اُسے "فنا" کا عاشق ہونا چاہیئے اور موت سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ چاہے موت برمحل اور عمر کے آخری حصّہ میں ہو۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ موت (بمعنی نیستی) کا خیال انسان کے لیے کسی زمانے میں بھی خوش آئند نہیں رہا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ موت سے بھاگ رہا ہے۔

مومیا کر مُردوں کے جسموں کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا اور اہرام مصر جیسے دائمی مقبرے بنانا اور آبِ حیات، اکسیر جوانی اور عمر بڑھانے والی چیزوں کے پیچھے بھاگنا۔ بقا کے ساتھ انسان کے عشق کی ایک واضح دلیل ہے۔

اگر ہم فنا کے لیے پیدا ہوئے ہیں، تو بقا سے اس لگاؤ کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ اس صورت میں تو یہ ایک فضول اور بے مصرف لگاؤ ہوگا۔

یہ مت بھولیے کہ ہم حکیم و دانا خدا کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد معاد کی بحث کر رہے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اُس نے جو کچھ ہمارے وجود میں پیدا کیا ہے وہ کسی حساب کے ماتحت ہی ہوگا اور وہ میلِ عالم بقاء کے ساتھ عشق بھی کسی حساب کے ماتحت ہی ہوگا اور وہ اس عالم کے بعد کی خلقت اور جہانِ آخر سے ہم آہنگی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اگر دستگاہِ خلقت نے ہمارے اندر پیاس پیدا کی ہے، تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خارج میں پانی کا وجود ہے۔ اسی طرح اگر جنسی خواہش اور جنسِ مخالف سے انسانوں میں لگاؤ موجود ہے تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ خارج میں جنسِ مخالف کا وجود ہے۔ ورنہ کسی چیز کی عدم موجودگی کی صورت میں اس کی خواہش کا ہونا حکمتِ آفرینش سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

دوسری طرف جب ہم تاریخِ بشر کا قدیم ترین ایام سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں موت کے بعد زندگی کے بارے میں انسان کے راسخ عقیدے کی بہت سی نشانیاں ملتی ہیں۔

وہ آثار کہ جو گزشتہ انسانوں ـــ یہاں تک کہ تاریخ سے پہلے کے انسانوں ـــ کے آج ہماری دسترس میں ہیں اُن سے اس اعتقاد کی شہادت ملتی ہے، خصوصاً مُردوں کے دفن کرنے کا طریقہ، قبریں بنانے کی کیفیت، حتٰی کہ مُردوں کے ساتھ کچھ چیزیں دفن کرنا، اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کے ناآگاہ وجدان میں موت کے بعد کی زندگی کا اعتقاد چھپا ہوا تھا۔

ایک مشہور ماہرِ نفسیات کہتا ہے:

دقیق تحقیقات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ پہلے نوعِ بشر کے قبائل ایک قسم کے

مذہب کے حامل تھے۔کیونکہ وہ اپنے مُردوں کو ایک خاص طریقے سے سپرد خاک کرتے تھے اور ان کے کام کاج کے آلات ان کے ساتھ رکھ دیا کرتے تھے اور اس طریقے سے دوسری دنیا کے لوگوں کو اپنے عقیدے کا ثبوت مہیا کرتے تھے[1]

یہ تمام باتیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ قومیں حیات بعد از موت کو قبول کرتی تھیں۔اگرچہ اس کی تفسیر میں غلط راستے پر چلتی تھیں۔ان کا خیال تھا کہ وہ زندگی بعینہٖ اس زندگی کی طرح ہے۔

بہر حال اس قدیمی بنیادی اعتقاد کو ایک معمولی اور عام خیال یا صرف ایک رواج اور عادت کا نتیجہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

" تیسری طرف ایک اندرونی عدالت کا وجود جسے " وجدان " کہتے ہیں، معاد کے فطری ہونے کا ایک اور گواہ ہے۔

ہر انسان نیک کام انجام دے کر اپنے وجدان کے اندر ایک سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے ایسا سکون کہ جسے قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔

اس کے برعکس انسان گناہوں خصوصاً بڑے بڑے جرائم کرنے کے بعد پریشانی اور بے سکونی محسوس کرتا ہے۔یہاں تک کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خودکشی پر تیار ہوجاتا ہے یا خود کو سزا اور سولی کے حوالے کردیتا ہے اور اسے وجدان کے شکنجے سے رہائی کا سبب سمجھتا ہے۔

اس حالت میں انسان خود سے پوچھتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھ جیسا ایک چھوٹا سا وجود تو اس قسم کی عدالت کا حامل ہو لیکن یہ عظیم عالم اس قسم کے وجدان اور عدالت سے خالی ہو۔

اس طرح مختلف طریقوں سے مرنے کے بعد کی زندگی اور مسئلہ معاد کا فطری ہونا ہم پر واضح ہوجاتا ہے:

★۔ انسانوں کے بقاء سے عمومی عشق کے حوالے سے۔

★۔ پوری انسانی تاریخ میں اس ایمان کے وجود کے حوالے سے اور

★ انسان کی روح کے اندر اس کے ایک چھوٹے سے نمونے کی موجودگی کے حوالے سے۔

۲۔ ایمان بالقیامت کا اثر انسانی زندگی پر: مرنے کے بعد کے عالم، انسان کے اعمال کے آثار کی بقا اور اس کے اچھے بُرے کاموں کی ہمیشگی کا اعتقاد انسانوں کی فکر و نظر اور اعصاب اعمال پر بہت ہی گہرا اثر ڈالتا ہے اور نیکیوں کا شوق پیدا کرنے اور برائیوں سے مبارزہ کرنے کے لیے ایک عامل مؤثر ہو سکتا ہے۔

فاسد و منحرف افراد کی اصلاح اور فداکار و مجاہد اور ایثار کرنے والوں کو شوق دلانے میں حیات

---

[1] جامعہ شناسی ساموئیل کینگ ص ۱۹۲ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)۔

بعد از موت پر ایمان جو اثرات ڈال سکتا ہے وہ عام عدالتوں اور سزاؤں کے اثرات سے کہیں زیادہ ہیں۔ چونکہ قیامت و معاد کی عدالت عام عدالتوں سے بہت ہی مختلف ہے، اس عدالت میں نہ تو تجدید نظر کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی اس کے ارکان پر زر و مال اور زور و قوت اثر ڈال سکتے ہیں نہ وہاں جھوٹی باتوں سے کوئی فائدہ ہوگا اور نہ فیصلے کے لیے طویل مدت درکار ہوگی۔

قرآن مجید کہتا ہے:

واتقوا یومًا لا تجزی نفس عن نفس شیئًا ولا یقبل منها شفاعة ولا یؤخذ منها عدل ولا هم ینصرون

"اس دن سے ڈرو کہ جس میں کسی شخص کو کسی دوسرے کی جگہ بدلہ نہیں دیا جائے گا، اور نہ ہی اس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی کوئی فدیہ یا تاوان ہوگا اور نہ ہی کوئی شخص اس کی مدد کے لیے آئے گا۔" (بقرہ - ۴۸)

اس کے علاوہ قرآنِ حکیم میں ہے:

ولو انّ لکل نفس ظلمت ما فی الارض لافتدت به واسرّوا الندامة لما رأوا العذاب وقضی بینهم بالقسط وهم لا یظلمون

"ان میں سے جو ظالم ہیں، اگر تمام روئے زمین بھی ان کے اختیار میں ہو اور اس دن اپنی نجات کے لیے وہ سب کچھ قربان کر ڈالیں (تو بھی ان کی نجات نہیں ہوگی) اور جس وقت وہ عذابِ الٰہی کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے (کہ کہیں زیادہ رسوا نہ ہوں) اور ان کے درمیان عدالت کے ساتھ فیصلہ ہوگا اور ان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔" (یونس - ۵۴)

اس کے علاوہ قرآن مجید میں یہ بھی بیان ہوا ہے:

لیجزی الله کل نفس ما کسبت ان الله سریع الحساب

"مقصد یہ ہے کہ خدا ہر شخص کو جو کچھ اس نے انجام دیا ہے اس کی جزا دے کیونکہ خدا سریع الحساب ہے۔" (ابراہیم - ۵۱)

اس کا حساب اتنا قطعی اور تیزی کے ساتھ ہوگا کہ بعض روایات کے مطابق:

ان الله تعالیٰ یحاسب الخلائق کلها فی مقدار لمح البصر

خدا چشم زدن میں سب مخلوق کا حساب چکا دے گا[1]

[1] مجمع البیان، سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۰۲ کے ذیل میں۔

اسی بنا پر قرآن مجید میں بہت سے گناہوں کا سرچشمہ روزِ جزاء کو بھول جانا قرار دیا گیا ہے۔ سورہ الم تنزیل سجدہ کی آیہ ۱۴ میں ہے :

فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھٰذا

"جہنم کی آگ کا مزہ چکھو کیونکہ تم نے آج کے دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا۔"

کچھ تعبیرات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان قیامت کے بارے میں کچھ گمان ہی رکھتا ہو تب بھی بہت سے غلط کاموں کو انجام دینے سے رُک جائے گا۔ جیسا کہ کم فروشوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے :

الا یظن اولٰئک انھم مبعوثون لیوم عظیم

"کیا وہ یہ گمان نہیں کرتے کہ ایک عظیم دن وہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔" (مطففین ۴-۵)

گزشتہ زمانے میں بھی اور آج بھی مجاہدینِ اسلام میدانِ جہاد میں رجز خوانی کرتے ہوئے دادِ شجاعت دیتے ہیں اور بہت سے لوگ اسلامی ممالک کے دفاع اور محرومین و مستضعفین کی حمایت کے لیے جو عظیم ایثار و فداکاری دکھاتے ہیں یہ سب دوسرے جاودانی گھر پر اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ علماء کے مطالعات اور مختلف تجربات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس قسم کے مظاہر اس عقیدے کے سوا ممکن نہیں۔

وہ مجاہد کہ جس کی منطق یہ ہو کہ :

قل ھل تربصون بنا الّا احدی الحسنیین

"کہہ دو کہ اے دشمنو! تم ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہو؟ سوائے دو سعادتوں میں سے کسی ایک تک پہنچنے کے (یا تم پر کامیابی یا افتخارِ شہادت)۔" (توبہ۔ ۵۲)

یہ مجاہد یقیناً شکست ناپذیر ہے۔

موت کا چہرہ اس جہان کے بہت سے لوگوں کے لیے وحشت انگیز ہے، یہاں تک کہ اس کے نام اور ہر اس چیز سے کہ جو اس کی داعی ہے، گریز کرتے ہیں۔ لیکن موت کے بعد زندگی کا عقیدہ رکھنے والوں کے لیے نہ صرف یہ کہ وہ ناپسندیدہ نہیں ہے بلکہ ایک عظیم جہان کے لیے ایک دریچہ ہے، قفس کا ٹوٹ جانا ہے، انسانی روح کا آزاد ہونا ہے، زندانِ بدن کے دروازوں کا کھلنا ہے اور آزادیٔ مطلق تک پہنچنا ہے۔

اصولی طور پر مبداء کے بعد مسئلہ معاد خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کے علم کی حدِ فاصل ہے کیونکہ اس مقام پر دو مختلف نظریے پائے جاتے ہیں۔

ایک نظریہ تو وہ ہے کہ موت کو جس میں فنا اور نابودیٔ مطلق سمجھا جاتا ہے اور اپنے پورے وجود کے ساتھ اس سے گریز کرتا ہے کیونکہ اس نظریے کے مطابق سب چیزیں اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ موت ایک خلقت جدید ہے اس سے انسان ایک کشادہ تر اور روشن عالم میں

قدم رکھتا ہے۔ اس پر وسیع و عریض آسمان کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔

یہ فطری بات ہے کہ اس مکتب کے طرفدار نہ صرف یہ کہ ہدف و مقصد کی راہ میں موت و شہادت سے خوف نہیں کھاتے بلکہ امیرالمومنین علی علیہ السلام کے مکتب سے ہدایت حاصل کرکے انہی کی طرح کہتے ہیں:

"واللہ لابن ابی طالب أنس بالموت من الطفل بثدی امہ"

"خدا کی قسم! ابوطالب کے بیٹے کی موت سے محبت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ جو ایک شیرخوار بچے کو اپنی ماں کے پستان سے ہوتی ہے[1]"

ایسے لوگ مقصد کی راہ میں موت کا استقبال کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے جب زمانے کے مجرم عبدالرحمٰن ابن ملجم کی تلوار کی ضرب آپؑ کے سر مبارک پر لگی تو آپؑ نے فرمایا:

"فزت برب الکعبہ"

"کعبہ کے رب کی قسم! میں کامیاب ہوگیا اور مجھے راحت و سکون مل گیا!"

مختصر بات یہ ہے کہ معاد و قیامت پر ایمان، ڈرپوک اور بے مقصد انسان کو شجاع، بہادر اور بامقصد انسان میں تبدیل کر دیتا ہے کہ جس کی زندگی رجز خوانیوں، قربانیوں، پاکیزگی اور تقویٰ سے معمور ہو جاتی ہے۔

۴۔ معاد کے عقلی دلائل: قرآن مجید میں معاد کے بارے میں بہت دلیلیں بیان ہوئی ہیں اور اس سلسلے میں سینکڑوں آیات موجود ہیں۔ ان سے قطع نظر اس امر پر واضح عقلی دلائل بھی موجود ہیں کہ جن میں سے بعض اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ برھانِ حکمت: اگر ہم اس جہان کی زندگی کو دوسرے جہان کے بغیر تصور کریں، تو یہ لغو اور بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی جیسے ہم جنین کی زندگی کو اس دنیا کی زندگی کے بغیر فرض کرلیں۔

اگر قانونِ خلقت یہ ہوتا کہ تمام جنین پیدائش کے وقت گلا گھٹ کر مر جاتے تو جنینی دَور کس قدر بے مفہوم ہو جاتا؟ اسی طرح اگر اس جہان کی زندگی کو دوسرے جہان کی زندگی سے الگ تصور کر لیا جائے تو اس کا وجود بھی مہمل ہو جائے گا کیونکہ کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم ستر سال یا اس سے کم و بیش اس دنیا میں مشکلات میں گھرے رہیں، ایک مدت تک خام اور بے تجربہ رہیں اور جب ناپختگی دور ہو تو عمر تمام ہو جائے۔ ایک مدت تک ہم علم کے حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں اور جس وقت معلومات کے لحاظ سے ہم کسی مقام

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۔

تک پہنچتے ہیں تو بڑھاپے کی برف ہمارے سروں پر بیٹھ چکی ہوتی ہے۔

آخر ہم یہ زندگی کس لیے بسر کر رہے ہیں؟ کچھ مقدار غذا کھانے، چند گز کپڑے پہننے، بار بار سونے اور بیدار ہونے اور اس تھکا دینے والے طرزِ عمل کو سالہا سال تک دہرانے اور جاری رکھنے کے لیے؟

کیا واقعاً یہ وسیع آسمان، یہ پھیلی ہوئی زمین اور یہ تمام آغاز و انجام، یہ تمام استاد و مربی، یہ تمام عظیم کتب خانے اور یہ تمام باریک بینیاں کہ جو ہماری اور تمام موجودات کی خلقت میں کام میں لائی گئی ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور مادی زندگی کے لیے ہیں؟

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر وہ لوگ کہ جو معاد کو قبول نہیں کرتے، اس زندگی کی لغویت اور بیہودگی کا اعتراف کرتے ہیں اور ان میں سے ایک گروہ خودکشی کرنے اور اس فضول اور بے معنی زندگی سے نجات کو جائز یا باعث افتخار سمجھتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جو خدا اور اس کی بے پایاں حکمت پر ایمان رکھتا ہے، اس جہان کی زندگی کو۔۔ دوسرے جہان کی دائمی زندگی کے لیے مقدمہ سمجھے بغیر قابلِ توجہ شمار کرے۔

قرآن کہتا ہے:

افحسبتم انما خلقناکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون

"کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم فضول اور بے کار پیدا ہوئے ہو اور تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے۔" (مومنون - ۱۱۵)

یعنی اگر خدا کی طرف بازگشت نہ ہوتی تو پھر اس جہان کی زندگی عبث اور بیہودہ ہوتی۔

ہاں اس دنیا کی زندگی اسی صورت میں مفہوم رکھتی ہے اور خدا کی حکمت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے جب اس جہان کو دوسرے جہان کے لیے ایک کھیتی (الدنیا مزرعة الاٰخرة) اور اُس وسیع عالم کے لیے ایک گزرگاہ (الدنیا قنطرة) اور تیاری کی ایک کلاس اور دوسرے جہان کے لیے ایک یونیورسٹی اور اُس گھر کے لیے ایک تجارت خانہ سمجھیں۔ جیسا کہ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے اپنے پُر معنی کلمات میں فرمایا ہے:

ان الدنیا دار صدق لمن صدقها، و دار عافیة لمن فهم عنها، و دار غنی لمن تزو منها، و دار موعظة لمن اتعظ بها، مسجد احباء الله و مصلی ملائكة الله، و مهبط وحی الله، و متجر اولیاء الله۔

"یہ دنیا اس شخص کے لیے کہ جو سچائی کے ساتھ اس سے پیش آتے سچائی کی جگہ ہے اور اُس شخص کے لیے کہ جو اس سے کچھ فہم حاصل کرے عافیت کا گھر ہے اور اس شخص کے لیے کہ جو اس سے زادِ راہ حاصل کرے بے نیازی کا گھر ہے اور اس شخص کے لیے کہ جو اس سے

پند و نصیحت حاصل کرے وعظ و نصیحت کا گھر ہے یہ خدا کے دوستوں کی مسجد ہے، پروردگار کے فرشتوں کی جائے نماز ہے، وحیِ الٰہی کے نزول کا مقام ہے اور اولیاء حق کا تجارت خانہ ہے[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس جہان کی کیفیت کا مطالعہ خوب اچھی طرح سے اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس عالم کے بعد ایک اور عالم بھی ہے :

ولقد علمتم النشأۃ الاولیٰ فلولا تذکرون

"تم اس دنیا میں نشأۃ اولیٰ اور خود اپنی پیدائش کو دیکھ چکے ہو تو پھر تم متوجہ کیوں نہیں ہوتے کہ اس کے بعد ایک اور جہان بھی ہے؟" (واقعہ - ۶۲)

(ب) برھانِ عدالت : نظامِ ہستی اور قوانینِ خلقت میں غور سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس کی تمام چیزیں حساب شدہ اور جچی تلی ہیں۔

ہمارے بدن کی ساخت میں اس قسم کا عادلانہ نظام حکم فرما ہے کہ جب بھی کوئی معمولی سی تبدیلی یا غیر موزوں نیت اس میں ظاہر ہوتی ہے تو وہ بیماری یا موت کا سبب بن جاتی ہے۔ ہمارے دل کی حرکت، ہمارے خون کی گردش، ہماری آنکھ کے پردے، ہمارے بدن کے سیل اسی دقیق نظام میں شامل ہیں کہ جو سارے جہان پر حکومت کر رہا ہے :

و بالعدل قامت السماوات والارض

"تمام آسمان اور زمین عدالت ہی کی وجہ سے قائم ہیں"[2]

تو کیا انسان اس وسیع عالم میں ایک نامطلوب چیز ہو سکتا ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ خدا نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی ہے تاکہ وہ اسے آزمائے اور وہ اس کے سائے میں ارتقائی منزلوں کو طے کرے لیکن اگر انسان آزادی سے غلط فائدہ اٹھائے تو پھر کیا ہوگا؟ اگر ظالم اور ستمگر لوگ، گمراہ اور گمراہ کرنے والے اس خدائی انعام سے سوئے استفادہ کرتے ہوئے گمراہی کا راستہ اختیار کیے رہیں تو پھر عدلِ الٰہی کا تقاضا کیا ہوگا؟

یہ ٹھیک ہے کہ بدکاروں کے ایک گروہ کو اس دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے اور وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جاتے ہیں یا کم از کم اُس کا ایک حصہ بھگت لیتے ہیں لیکن مسلمہ طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ تمام کے تمام مجرم اپنی ساری کی ساری سزا بھگت لیتے ہوں اور سب کے سب پاک اور نیک لوگ اپنے اعمال کا

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۱۳۱۔

[2] تفسیر صافی، سورہ رحمٰن کی آیہ ۷ کے ذیل میں۔

بدلہ پورے کا پورا اسی جہان میں پا لیتے ہوں۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ یہ دونوں گروہ پروردگار کی عدالت کے پلڑے میں برابر ہو جائیں؟ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق:

افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون

"کیا ان لوگوں کو کہ جو قانونِ خدا کے پیشِ نظر حق و عدالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوتے ہیں ہم مجرمین کی طرح قرار دے دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے یہ کس طرح کا فیصلہ کرتے ہو؟" (قلم - ۳۵، ۳۶)

دوسری جگہ قرآن کہتا ہے:

ام نجعل المتقین کالفجّار

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کے مانند قرار دے دیں؟" (ص - ۲۸)

بہرحال فرمانِ حق کی اطاعت میں انسانوں کے درمیان تفاوت ہونا کوئی شک کی بات نہیں ہے کیونکہ اس جہان کی مکافات اور عدالتِ وجدان اور گناہوں کے نتائج کا کافی نہ ہونا، عدالت کے قیام کے لیے تنہا کافی نظر نہیں آتا۔ اس بناء پر یہ بات قبول کرنی پڑے گی کہ اجرِ الٰہی کے اجراء کے لیے کوئی عدلِ عام کی عدالت ہو کہ جہاں پر سوئی کی نوک کے برابر نیک اور بد کاموں کا حساب ہو۔ ورنہ حقیقی عدالت قائم نہ ہو گی۔

لہٰذا یہ بات قبول کر لینی چاہیئے کہ عدلِ الٰہی کو قبول کرنا وجود معاد و قیامت کے قبول کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ

"ہم قیامت کے دن عدل کے ترازو قائم کریں گے۔" (انبیاء - ۴۷)

اس کے علاوہ یہ بھی فرماتا ہے:

وقضی بینھم بالقسط وھم لا یظلمون

"قیامت کے دن ان کے درمیان عدالت کے مطابق فیصلہ ہو گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہو گا۔" (یونس - ۵۴)

(ج) **برہانِ ہدف:** مادہ پرستوں کے نظریے کے برخلاف الٰہی نظریۂ کائنات کے مطابق انسان کی خلقت میں ایک ہدف اور مقصد کارفرما ہے کہ جسے فلسفی تعبیر میں "تکامل و ارتقاء" کہتے ہیں قرآن و حدیث کی زبان میں کبھی "قربِ خداوندی" اور کبھی "عبادت و بندگی" کہتے ہیں:

وما خلقت الجن والانس الّا لیعبدون

"میں نے جن و انس کو پیدا نہیں کیا ہے مگر اس مقصد کے لیے کہ وہ میری عبادت

کریں"(اور عبادت و بندگی کے سائے میں کامل ہوں اور میرے حریم قرب کی طرف راہ پائیں)۔ (ذاریات - ۵۶)

اگر موت ہر چیز کا اختتام ہو تو کیا یہ عظیم مقصد پورا ہوگا؟ بلاشک و شبہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ ضروری ہے کہ اس جہان کے بعد ایک اور جہان ہو اور انسان کا سفرِ کمال اس میں جاری رہے اور وہ اس (جہان کی) کھیتی کی فصل وہاں کاٹے اور یہاں تک کہ — جیسے ہم کہہ چکے ہیں دوسرے جہان میں بھی یہ سیرِ تکامل جاری رہنی چاہیئے تاکہ اصلی اور آخری ہدف پورا ہو جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مقصدِ خلقت کی تکمیل معاد کو قبول کیے بغیر ممکن نہیں ہے اور اگر ہم اس زندگی کو موت کے بعد والے جہان سے منقطع کرلیں تو ہر چیز معمہ کی شکل اختیار کرلے اور کئی طرح کے "کیوں" کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ رہے۔

(د)۔ **برهان نفی اختلاف:** بے شک ہمیں ان اختلافات سے — کہ جو اس جہان کے مختلف مکاتب و مذاہب کے درمیان موجود ہیں دُکھ ہوتا ہے، اور ہم سب یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ایک دن یہ تمام اختلافات ختم ہو جائیں جبکہ تمام قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ اختلافات اس دنیا کے مزاج میں پوری طرح اُتر چکے ہیں۔ یہاں تک کچھ دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کہ جو ایک عالمی حکومت قائم کرنے والے ہیں — ان کے قیام کے بعد بھی اگرچہ بہت سے اختلافات ختم ہو جائیں گے، لیکن پھر بھی کچھ مکاتب کا اختلاف کلی طور پر ختم نہیں ہوگا اور قرآن کے ارشاد کے مطابق یہود و نصاریٰ دا من قیامت تک اپنے اختلاف پر باقی رہیں گے:

فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الیٰ یوم القیامۃ (مائدہ - ۱۴)

لیکن وہ خدا کہ جو ہر چیز کو وحدت کی طرف لے جاتا ہے آخر میں اختلافات کو ختم کرائے گا اور چونکہ عالم مادہ کے گہرے پردوں کی موجودگی میں یہ بات اس دنیا میں کلی طور پہ امکان پذیر نہیں ہے لہٰذا ہم جانتے ہیں کہ دوسرے جہان میں — کہ جو عالم بروز و ظہور ہے — آخر کار یہ مسئلہ عملی شکل اختیار کرلے گا اور حقائق اس طرح سے روشن ہو جائیں گے کہ مکتب و عقیدہ کا اختلاف بالکل ختم ہو جائے گا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس مسئلے کا ذکر ہوا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے:

فاللہ یحکم بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون

"خدا ان چیزوں کے بارے میں قیامت کے دن — کہ جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا"۔ (بقرہ - ۱۱۳)

دوسری جگہ فرماتا ہے:

واقسموا باللّٰہ جھد ایمانھم لا یبعث اللّٰہ من یموت بلٰی وعدًا علیہ حقًّا ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون ۝ لیبین لھم الذی یختلفون فیہ ولیعلم الذین کفروا انھم کانوا کاذبین

"انہوں نے زوردار قسم کھا کر کہا کہ خدا ان لوگوں کو کہ جو مر جائیں گے کبھی زندہ نہیں کرے گا لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ خدا کا حتمی وعدہ ہے (کہ ان سب کو زندہ کرے گا) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس چیز میں وہ اختلاف رکھتے تھے اُسے اُن کے لیے واضح کر دے تاکہ جو لوگ منکر ہو گئے تھے وہ یہ جان لیں کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔" (نحل - ۳۸ و ۳۹)

۴۔ قرآن اور مسئلہ معاد: مسئلہ توحید کہ جو انبیاء کی تعلیمات میں سب سے زیادہ بنیادی مسئلہ ہے اس کے بعد معاد کا مسئلہ اپنی خصوصیات اور اپنے تربیتی و تعلیمی آثار کے ساتھ پہلے درجہ میں قرار پاتا ہے۔ لہٰذا قرآنی مباحث میں توحید و خدا شناسی کے بعد بہت سی آیات کو اس نے اپنے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔

معاد کے قرآنی مباحث کبھی تو منطقی استدلال کی صورت میں بیان ہوئے ہیں اور کبھی خطابی مباحث اور مؤثر اور زوردار تلقین کی صورت میں بعض اوقات تو انہیں سُن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کلام کا صادقانہ لب و لہجہ ایسا ہے کہ وہ استدلال کی طرح انسان کی روح اور جان کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔

منطقی استدلال میں قرآن زیادہ تر امکانِ معاد کے موضوع پر بات کرتا ہے۔ کیونکہ منکرین زیادہ تر اُسے محال خیال کرتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ معاد وہ بھی معادِ جسمانی کی صورت میں۔ کہ جس میں بوسیدہ اور خاک شدہ اجسام کا نئی حیات کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ امکان پذیر نہیں۔

اس حصے میں قرآن مختلف طریقوں سے بات کرتا ہے اور یہ سب استدلال جس ایک جگہ جا کر ختم ہو جاتے ہیں وہ "معاد کے امکانِ عقلی" کا مسئلہ ہے۔

کبھی تو وہ پہلی زندگی کو انسان کی نظر میں مجسم کرتا ہے اور ایک مختصر، منہ بولتی اور واضح عبارت میں کہتا ہے:

کما بدأکم تعودون

"جس طرح سے کہ اس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا ہے اسی طرح سے تم واپس لوٹو گے۔" (اعراف - ۲۹)

کبھی نباتات کی زندگی اور موت اور ان کی بازگشت کی تصویر کشی کرتا ہے کہ جسے ہم ہر سال

اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کے آخر میں کہتا ہے۔ کہ تمہاری بازگشت بھی اسی طرح ہوگی:

ونزلنا من السماء ماءً مبارکًا فانبتنا به جنّات وحب الحصید...

واحیینا به بلدة میتًا کذالک الخروج

"ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے سرسبز باغات اُگائے اور کٹے ہوئے دانے.... اور اس کے ذریعے ہم نے مُردہ زمین کو زندہ کیا (تمہاری) بازگشت بھی اسی طرح ہوگی۔" (ق - ۹ تا ۱۱)

دوسری جگہ کہتا ہے:

والله الذی ارسل الریاح فتثیر سحابا فسقناه الی بلد میت فاحیینا به الارض بعد موتها کذالک النشور

"خدا ہی ہے کہ جس نے ہَواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو چلائیں اور ہم نے انہیں مُردہ زمین کی طرف دھکیل دیا اور اس کے ذریعے ہم نے زمین کو اس کی موت کے بعد حیات بخشی۔ قبروں سے اٹھنا بھی اسی طرح ہے۔" (فاطر - ۹)

کبھی آسمانوں اور زمین کی خلقت میں خدا کی قدرت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

اولم یروا ان الله الذی خلق السّماوات والارض ولم یعی بخلقهن بقادر علی ان یحیی الموتٰی بلٰی انه علی کل شیءٍ قدیر

"کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اس تخلیق نے اسے تھکا نہیں دیا، وہ مُردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ہاں! وہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (احقاف - ۳۳)

اور کبھی توانائیوں کی بازگشت اور سبز درخت سے آگ نکلنے کو اس کی قدرت کے نمونے کے طور پر اور آگ کو پانی کے اندر قرار دینے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارًا

"وہ خدا مُردوں کو لباسِ حیات پہناتا ہے کہ جس نے سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کی۔" (یٰس - ۸۰)

کبھی جنین کی زندگی کو انسان کی نظر میں مجسم کرتا ہے اور کہتا ہے۔

یا ایها الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانّا خلقناکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم من مضغة مخلقة وغیر مخلقة لنبین لکم ونقر فی الارحام مانشاء الی اجل مسمًّی ثم نخرجکم

طِفْلًا۔

"اے لوگو! اگر تم قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو تو یہ بات مت بھولو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفہ سے، پھر جمے ہوئے خون سے پھر مضغہ سے (کہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو چبائے ہوئے گوشت کی طرح کا ہے)۔ اس حالت میں پہنچ کر بعض تو شکل وصورت کے حامل ہوتے ہیں اور بعض بے شکل وصورت۔ مقصد یہ ہے کہ ہم تم پر یہ واضح کردیں (کہ ہم ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں) اور جن "جنینوں" کو ہم چاہتے ہیں ایک معین مدت تک ماؤں کے رحم میں روک رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بچے کی شکل میں تمہیں عالم دنیا میں بھیجتے ہیں" (حج - ۵)۔

وہ نیند کہ جو موت کی بہن ہے بلکہ کئی جہات سے خود موت ہے۔ اُس کے لیے اصحاب کہف کی تین سو سالہ نیند کی مثال پیش کرتا ہے اور ان کی نیند اور بیداری کے سلسلے میں ایک عمدہ اور مناسب تشریح کرنے کے بعد فرماتا ہے:

وکذالك اعثرنا علیھم لیعلموا ان وعد الله حق و ان السّاعة لاریب فیھا

"اس طرح سے ہم نے لوگوں کو ان کی حالت کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ جان لیں کہ خدا کا قیامت کا وعدہ حق ہے اور قیامِ قیامت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے" (کہف - ۲۱)

یہ چھ استدلال ہیں کہ جو قرآن کی آیات میں امکانِ معاد کے سلسلہ میں بیان ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ ابراہیمؑ کے چار پرندوں کی داستان (بقرہ - ۲۶۰)، عزیرؑ کی سرگزشت (بقرہ - ۲۵۹)، بنی اسرائیل کے مقتول کا واقعہ (بقرہ - ۷۲) بھی بیان کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک ایک تاریخی نمونہ ہے یہ سب اس مسئلے کے لیے دوسرے شواہد و دلائل ہیں کہ جو قرآن نے اس سلسلے میں بیان کیے ہیں۔

مختصر بات یہ ہے کہ وہ تصویر جو قرآن مجید نے معاد، اس کے مختلف پہلوؤں، مقدمات اور نتائج کی کھینچی ہے اور وہ بولتے ہوئے دلائل کہ جو اس نے اس سلسلے میں بیان کیے ہیں، اس قدر زندہ اور اطمینان بخش ہیں کہ جو شخص تھوڑا سا بھی بیدار وجدان رکھتا ہے وہ ان کی گہری تاثیر سے ضرور متاثر ہوگا۔

بعض کے قول کے مطابق قرآن کی ایک ہزار دو سو آیات معاد کے سلسلے میں بحث کرتی ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جاتے اور ان کی تفسیر کی جائے تو وہ خود ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ اس تفسیر کی تالیف کے اختتام کے بعد، جس وقت ہم انشاء اللہ تفسیر موضوعی شروع کریں گے تو (معاد کے سلسلہ کی آیات کا) یہ مجموعہ بھی خواہش مندوں کی دسترس میں ہوگا۔

۵۔ معادِ جسمانی: معادِ جسمانی سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف جسم دوسرے جہان میں لوٹ آئے گا

بلکہ مقصد یہ ہے کہ روح اور جسم اکٹھے مبعوث ہوں گے ۔ دوسرے لفظوں میں روح کی بازگشت تو مسلّم ہے بحث جسم کی بازگشت کے بارے میں ہے ۔

گزشتہ فلاسفہ کی ایک جماعت صرف معاد روحانی کی معتقد تھی وہ جسم کو ایک سواری سمجھتے تھے کہ جو صرف اسی جہان میں انسان کے ساتھ ہے اور موت کے بعد وہ اس سے بے نیاز ہو جائے گا اور اسے چھوڑ کر عالم ارواح میں چلا جائے گا ۔

لیکن اسلام کے بزرگ علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ معاد روحانی اور جسمانی دونوں صورتوں میں ہوگی یہاں پر بعض علماء خصوصیت کے ساتھ سابق جسم کو ضروری نہیں سمجھتے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کسی بھی جسم کو روح کے اختیار میں دے دے گا اور چونکہ انسان کی شخصیت اس کی روح کے ساتھ ہے تو یہ جسم اسی کا جسم شمار ہوگا ۔ جبکہ صاحبانِ تحقیق کا عقیدہ یہ ہے کہ وہی جسم کہ جو خاک ہو کر بکھر گیا تھا ، خدا کے حکم سے اسی کو جمع کیا جائے گا اور اسی کو نئی زندگی عطا ہوگی اور یہ وہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن مجید کی آیات سے لیا گیا ہے ۔

قرآن مجید میں معادِ جسمانی کے شواہد اس قدر زیادہ ہیں کہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو معاد کو صرف روحانی سمجھتے ہیں انہوں نے معاد والی فراواں آیات کا تھوڑا سا بھی مطالعہ نہیں کیا ہے ، ورنہ معاد کا جسمانی ہونا آیاتِ قرآنی میں اس قدر واضح ہے کہ کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے ۔ یہی آیات کہ جو سورۂ یٰسین کے آخر میں بیان ہوئی ہیں اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں ۔ کیونکہ عرب کے بیابانی لوگوں کو تعجب اسی بات کا تھا کہ یہ بوسیدہ ہڈی جو اُن کے ہاتھ میں ہے اُسے کون زندہ کر سکتا ہے ؟

قرآن صراحت کے ساتھ اس کے جواب میں کہتا ہے ؛

قل یحییها الذی انشأها اوّل مرة

"کہیے کہ وہی خدا اس بوسیدہ ہڈی کو زندہ کرے گا کہ جس نے پہلی دفعہ اسے پیدا کیا تھا"

معاد کے مسئلے میں مشرکین کا سارا تعجب اور اُن کی مخالفت اسی امر پر تھی کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے اور ہماری خاک زمین میں مل جائے گی تو پھر دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے ؟

وقالوا ءاذا ضللنا فی الارض ءانّا لفی خلق جدید (الم سجدہ - ۱۰)

وہ کہتے تھے کہ یہ شخص تم سے کیسے وعدہ کرتا ہے کہ جس وقت تم مر جاؤ گے اور خاک ہو جاؤ گے تو دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے ۔

ایعدکم انکم اذا متم وکنتم ترابا وعظاما انکم مخرجون (مومنون - ۳۵)

وہ اس امر پر اس قدر تعجب کرتے تھے کہ اس کے اظہار کو جنون یا خدا پر جھوٹ خیال کرتے تھے ؛

وقال الذین کفروا هل ندلکم علٰی رجل ینبئکم اذا مزقتم کل ممزق انکم لفی خلق جدید

" کافروں نے کہا کہ ہم تمہیں ایسا شخص دکھاتے ہیں کہ جو تمہیں یہ خبر دیتا ہے کہ جس وقت تم پوری طرح خاک ہو کر بکھر جاؤ گے تو دوبارہ زندگی پاؤ گے"۔ (سبا۔ ۷)

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر امکان معاد کے بارے میں قرآنی استدلال معادِ جسمانی کے گرد ہی گھومتے ہیں اور وہ چھ بیانات کہ جو گزشتہ حصے میں گزرے ہیں سب کے سب اسی مدعا کے گواہ ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن بار بار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تم قیامت میں قبروں سے نکلو گے (یٰسین۔ ۵۱، قمر۔ ۷) تو قبریں معادِ جسمانی کے ساتھ مربوط ہیں۔

ابراہیم کے چاروں پرندوں کی داستان، اسی طرح عزیرؑ کا واقعہ اور موت کے بعد ان کا زندہ ہونا اور بنی اسرائیل کے مقتول کا قصہ کہ جس کی طرف ہم نے گزشتہ مباحث میں اشارہ کیا ہے، سب کے سب صراحت کے ساتھ معادِ جسمانی کی ہی بات کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے جنت کی مادی و روحانی نعمتوں کی جتنی بھی تعریف کی ہے سب کی سب اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ معاد جسمانی طور پر بھی ہوگا اور روحانی طور پر بھی۔ ورنہ روحانی نعمتوں کے ساتھ ساتھ حور و قصور اور انواع و اقسام کی بہشتی غذاؤں اور مادی لذائذ کے کیا معنی ہیں؟

بہرحال یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص قرآنی منطق اور تعلیمات سے تھوڑی سی بھی آگاہی رکھتا ہو اور پھر معادِ جسمانی کا انکار کرے۔ دوسرے لفظوں میں معادِ جسمانی کا انکار قرآن کی نظر میں اصل معاد کے انکار کے مساوی ہے۔

ان دلائل منقولی کے علاوہ اس بارے میں عقلی شواہد بھی موجود ہیں۔ اگر ہم انہیں بیان کرنا شروع کردیں تو گفتگو لمبی ہو جائے گی۔

البتہ معادِ جسمانی کا اعتقاد چند ایک سوالات و اعتراضات کو ابھارتا ہے مثلاً آکل و ماکول کا شبہ کہ جن کا محققین اسلام نے جواب دیا ہے اور ہم اس سلسلے میں ایک مختصر اور جامع تشریح سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۶۰ کے ذیل میں دوسری جلد میں بیان کر آئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

۶۔ بہشت و دوزخ: بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد کا عالم مکمل طور پر اسی جہان کے مشابہ ہے البتہ زیادہ کامل اور زیادہ عمدہ شکل میں۔

لیکن ہمارے پاس بہت سے ایسے قرائن موجود ہیں کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس جہان اور اُس جہان کے درمیان کیفیت و کمیت کے لحاظ سے بہت زیادہ فاصلہ ہے۔

یہاں تک کہ اگر ہم اس فاصلے کو چھوٹے سے جنین کے عالم کی اس وسیع دنیا کے درمیانی فاصلے سے تشبیہ دیں تو پھر بھی کامل موازنہ نہیں ہوگا۔

بعض روایات کی صراحت کے مطابق وہاں ایسی چیزیں ہیں کہ جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سُنا ہے۔ یہاں تک کہ کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ لہٰذا قرآن مجید کہتا ہے:

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین

"کوئی انسان نہیں جانتا کہ کیسی کیسی چیزیں — کہ جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سبب ہیں — اس کے لیے پنہاں رکھی گئی ہیں"۔ (الم سجدہ - ۱۷)

اس جہان پر حاکم نظام اُس عالم پر حاکم نظام سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہاں افراد بطور گواہ عدالت میں جاتے ہیں لیکن وہاں ہاتھ اور پاؤں یہاں تک کہ بدن کی جلد بھی گواہی دے گی:

الیوم نختم علٰی افواههم و تکلمنا ایدیهم و تشهد ارجلهم بما کانوا یکسبون (یٰسٓ - ۶۵)

و قالوا لجلودهم لم شهدتم علینا قالوا انطقنا الله الذی انطق کل شیء (حٰم سجدہ - ۲۱)

بہرحال دوسرے جہان کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ صرف دور کی ایک بات ہے کہ جس قدر ہماری سمجھ میں آتی ہے اور اصولی طور پر ہماری الف بار اور اس جہان میں ہماری فکری صلاحیت اس کی حقیقی تعریف پر قادر نہیں ہے اور اسی سے جنت و دوزخ اور ان کی نعمتوں اور عذابوں کی کیفیت کے بارے میں بھی جواب دیا جا سکے گا۔

ہم تو اسی قدر جانتے ہیں کہ جنت تو انواع و اقسام کی خدائی نعمتوں کا مرکز ہے چاہے وہ مادی ہوں یا روحانی اور دوزخ دونوں جہات کے شدید ترین عذابوں کا مرکز ہے۔

لیکن ان دونوں کی جزئیات کے بارے میں قرآن مجید نے کچھ اشارے بیان کیے ہیں کہ جن پر ہم ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کی تفصیلات جب تک کوئی نہ دیکھے، نہیں جانتا۔

جنت و دوزخ کے وجود کے بارے میں اور یہ کہ وہ کہاں ہیں، ہم نے نسبتاً تفصیلی بحث سورۂ آل عمران کی آیہ ۱۳۳ کے ذیل میں دوسری جلد میں کی ہے۔

اسی طرح عالم قیامت میں جزا و سزا، اور "تجسم اعمال" اور "نامۂ اعمال" کے مسئلے کے بارے میں ہم جلد دوم سورہ آل عمران کی آیہ ۳۰ کے ذیل میں اور جلد ۷ سورہ کہف کی آیہ ۴۹ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

ان تمام باتوں کے علاوہ، دوسری مختلف بحثیں متعلقہ آیات کے ذیل میں خصوصاً قرآن مجید کی آخری سورتوں میں انشاء اللہ قیامت کی خصوصیات کے بارے میں بیان ہوں گی۔

٭ ٭ ٭

پروردگارا! اس پُرخوف وخطر دن میں، اس عظیم قیامت اور عدالت میں ہمیں اپنے لطف وکرم سے امن وسکون بخشنا۔

خداوندا! اگر فیصلہ اعمال کے معیار پر ہو تو ہمارا ہاتھ خالی ہے۔ اپنے فضل وکرم کے ترازو سے ہماری ناچیز نیکیوں کو تولنا اور اپنی رحمت وغفران سے ہماری برائیوں پر پردہ ڈال دینا۔

بار الٰہا! ایسا کرنا کہ انجام کار تو بھی ہم سے خوش ہو اور ہم بھی تیری بارگاہ میں کامیاب و رستگار ہوں، آمین یارب العالمین۔

تفسیر نمونہ کی جلد ۱۰ کا اختتام

۸ رمضان المبارک ۱۴۰۴ ہجری

تفسیر نمونہ کی اٹھارویں جلد کا ترجمہ از قلم سید صفدر حسین نجفی

فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم

بروز اتوار

بوقت دن کے ۱۲ بج کر ۵۱ منٹ

بتاریخ ۲۲ رشوال ۱۴۰۶ھ

بمطابق ۲۹ رجون ۱۹۸۶ء

برمکان ولایت خاں صاحب مانچسٹر، یو۔کے

اختتام پذیر ہوا۔

الحمد للہ اولاً و اٰخراً والصلوٰۃ علی النبی واٰلہ ابداً دائماً۔

سید صفدر حسین نجفی

سورۂ صافات

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اسکی ۱۸۲ آیات ہیں

آغاز

جمعۃ المبارک

یکم رمضان المبارک ۱۴۰۴ ہجری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ صافات کے مطالب

یہ سورہ بھی چونکہ مکی سورتوں میں سے ہے لہٰذا مکی سورتوں کی تمام صفات اس میں موجود ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ مبدأ و معاد کے اسلامی عقائد و معارف کو بیان کیا گیا ہے۔ قاطع تعبیرات اور مختصر و زوردار آیات کے ذریعے مشرکین کو سرزنش کی گئی ہے۔ نیز واضح اور روشن دلائل کے ذریعے ان کے عقائد کا بطلان ظاہر کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اس سورہ کے مطالب کا پانچ حصّوں میں خلاصہ ہوتا ہے:۔

پہلا حصّہ: خدا کے فرشتوں کے مختلف گروہوں کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور ان کے مقابلے میں سرکش شیطانوں کے گروہوں اور ان کے انجام کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا حصّہ: کافروں، نبوّت و معاد کے بارے میں ان کے انکار اور قیامت میں ان کے انجام کو بیان کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ مربوط قیامت میں ان کی آپس کی بحث اور گناہ کو ایک دوسرے کی گردن میں ڈالنے اور ان سب کے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں بہشت کی بڑی بڑی نعمتوں اور بہشتیوں کے لیے خوشیوں، لذّتوں اور زیبائیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا حصّہ: بزرگ انبیاء مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت یونسؑ کی تاریخ کے ایک حصّے کو مختصر اور مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اسی میں بُت شکن بہادر ہیرو ابراہیمؑ کے بارے میں بحث اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اصلی مقصد یہ ہے کہ گزشتہ بیانات اور انبیاء کی تاریخ کے عینی شواہد کچھ محسوس و ملموس صورت میں بیان کیے جائیں اور کلی عقلی حقائق محسوس قالب میں مجسم ہو جائیں۔

چوتھا حصّہ: شرک کی ایک بدترین قسم کا ذکر ہے۔ یعنی جنّوں اور خدا یا فرشتوں اور خدا کے درمیان رشتہ داری کا اعتقاد مختصر جملوں میں اس بے ہودہ عقیدے کی اس طرح دھجیاں بکھیری گئی ہیں کہ اس کی معمولی سی قدر و قیمت بھی باقی نہیں رہتی۔

پانچواں حصّہ: یہ اس سورہ کا آخری حصّہ ہے۔ چند مختصر آیات ہیں، لشکرِ حق کی کفر و شرک و نفاق کے لشکر پر فتح و پیروزی کا ذکر ہے۔ اہلِ شرک و نفاق کے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے کا تذکرہ ہے۔ ان ناروا نسبتوں سے، جو مشرکین پروردگار کے بارے دیتے ہیں، تنزیہ و تقدیس بیان کی گئی ہے اور سورہ پروردگار کی حمد و ستائش کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

سورۂ صافات کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے :

من قرأ سورة صافات اعطی من الاجر عشر حسنات، بعدد کل جن وشیطان، وتباعدت عنه مردة الشیاطین وبرء من الشرك، وشهد له حافظاه یوم القیامة انه کان مؤمناً بالمرسلین

جو شخص سورۂ صافات کو پڑھے اسے تمام جنوں اور شیطانوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں دی جاتی ہیں اور سرکش شیطان اس سے دُور رہتے ہیں اور وہ شرک سے پاک رہتا ہے اور وہ دونوں فرشتے جو اس کی حفاظت پر مامور ہیں قیامت میں اس کے لیے گواہی دیں گے کہ یہ خدا کے رسولوں پر ایمان رکھتا تھا۔[1]

ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے اس طرح منقول ہے :

من قرأ سورة صافات فی کل جمعة لم یزل محفوظاً من کل اٰفة، مدفوعاً عنه کل بلیة فی حیاته الدنیا، مرزوقاً فی الدنیا باوسع مایکون من الرزق ولم یصبه الله فی ماله ولا ولده ولا بدنه بسوء من شیطان رجیم، ولا جبار عنید، وان مات فی یومه او لیلته بعثه الله شهیداً، واماته شهیداً، وادخله الجنة مع الشهداء فی درجة من الجنة

جو شخص سورۂ صافات ہر جمعہ کو پڑھے گا وہ ہر آفت سے محفوظ رہے گا اور دنیا کی زندگی میں ہر بلا اس سے دُور رہے گی ۔ خداوند تعالیٰ اس کے رزق میں کشادگی کرے گا اور اس کے مال و اولاد اور بدن پر شیطانِ رجیم اور جابر دشمن کو مسلّط نہیں ہونے دے گا اور اگر اس دن یا رات کو دنیا سے کوچ کر جائے تو خدا اسے شہید اٹھائے گا اور شہید کی موت دے گا اور اسے بہشت میں شہداء کے درجے میں جگہ عطا فرمائے گا۔[2]

اس سورہ کے مطالب پر توجہ کرتے ہوئے اس کی تلاوت پر ان تمام عظیم ثوابوں کی وجہ واضح و روشن ہوجاتی ہے

---

[1] مجمع البیان ، آغاز سورۂ صافات

[2] تفسیر مجمع البیان ، آغاز سورۂ صافات ۔ تفسیر برھان میں بھی یہ حدیث مختصر فرق کے ساتھ مرحوم صدوق رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوئی ہے ۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تلاوت کا مقصد غور و فکر کرنا ہے۔ اس کے بعد اس پر اعتقاد رکھنا اور پھر اس پر عمل کرنا ہے اور بلا شک و شبہ جو شخص اس سورہ کی اس طریقہ سے تلاوت کرے گا وہ شیاطین کے شر سے بھی محفوظ رہے گا اور شرک سے بھی پاک ہو جائے گا اور صحیح اور محکم اعتقاد رکھنے اور اعمالِ صالح بجالانے اور انبیاء کی سرگزشت اور سابقہ اقوام کے واقعات سے نصیحت حاصل کرنے سے شہیدوں کے زمرے میں بھی قرار پائے گا۔

ضمنی طور پر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اس سورہ کا نام "صافات" اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ

۲۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا ۙ

۳۔ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکۡرًا ۙ

۴۔ اِنَّ اِلٰـہَکُمۡ لَوَاحِدٌ ؕ

۵۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَہُمَا وَرَبُّ الۡمَشَارِقِ ؕ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی (جو اپنی صفوں کو منظم رکھے ہوئے ہیں)

۲۔ پھر قسم ہے اُن کی جو سختی کے ساتھ منع کرتے ہیں (اور روک دیتے ہیں)

۳۔ وہی کہ جو پے درپے ذکر (الٰہی) کی تلاوت کرتے ہیں۔

۴۔ تمھارا معبود یقیناً یکتا ہے۔

۵۔ وہ آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا بھی اور وہ مشارق کا رب ہے۔

تفسیر

وہ فرشتے جو انجامِ اُمور کے لیے آمادہ رہتے ہیں

یہ قرآن مجید کی وہ پہلی سُورہ ہے جس کا آغاز قسم سے ہوتا ہے۔ اس کی پر معنی اور فکر انگیز قسمیں انسان کی فکر کو اپنے ساتھ اس جہان کے مختلف گوشوں کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں اور حقائق قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ 1

یہ ٹھیک ہے کہ خدا سب سے بڑھ کر راست گو ہے اور اُسے قسم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں

اگر قسم مومنین کے لیے ہو تو وہ قسم کے بغیر بھی سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور اگر منکرین کے لیے ہے تو وہ خدا کی قسموں پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔

لیکن قرآن کی تمام آیات میں جن سے اس کے بعد ہمیں کبھی کبھی واسطہ پڑے گا، دو نکات کی طرف توجہ سے قسم کا مسئلہ واضح ہو جائے گا۔

پہلا یہ کہ قسم ہمیشہ قابلِ قدر اور اہم امور کے بارے میں کھائی جاتی ہے۔ اس بناء پر قرآنی قسمیں ان امور کی عظمت اور اہمیت کی دلیل ہیں کہ جن کی قسم کھائی گئی ہے اور یہی امر "مقسم بہ" یعنی وہ چیز جس کی قسم کھائی گئی ہے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کا سبب بنتا ہے۔ ایسا غور و فکر جو انسان کو نئے حقائق سے آشنا کرتا ہے۔

دوسرا یہ کہ قسم ہمیشہ تاکید کے لیے ہوتی ہے اور اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ امور جن کے لیے قسم کھائی جا رہی ہے ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں تاکید شدید ہے۔

اس سے قطع نظر جس وقت کہنے والا اپنی بات کو دو ٹوک طریقے سے بیان کرے تو نفسیاتی طور پر سننے والے کے دل پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن کی ہر قسم مومنین کو زیادہ قوی اور منکرین کو زیادہ نرم کر دیتی ہے۔

بہرحال اس سورہ کی ابتداء میں ہمیں تین نام ملتے ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے[1]

پہلے فرماتا ہے: قسم ہے ان کی جو صف باندھے ہوئے ہیں اور جنھوں نے اپنی صفوں کو منظم کیا ہوا ہے۔ (والصافات صفًّا)۔

وہی جو پوری قوت کے ساتھ روکتے ہیں (فالزاجرات زجرًا)۔

اور وہ جو پے در پے ذکر الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں (فالتالیات ذکرًا)۔

یہ تین گروہ کون ہیں؟ اور یہ کن افراد کی صفات ہیں؟ اور ان کا اصلی ہدف و مقصد کیا ہے؟ مفسرین نے یہاں بہت سی باتیں کی ہیں لیکن معروف و مشہور یہی ہے کہ یہ فرشتوں کے مختلف گروہوں کے اوصاف ہیں۔

ایسے گروہ جو فرمانِ الٰہی کو انجام دینے کے لیے عالمِ ہستی میں صف باندھے ہوئے آمادۂ تعمیل ہیں۔

فرشتوں کے ایسے گروہ جو انسانوں کو گناہ سے روکتے ہیں اور شیطانوں کے وسوسوں کو ان کے دلوں میں بے اثر کرتے ہیں یا آسمان کے بادلوں پر مامور ہیں اور انھیں اِدھر اُدھر دھکیلتے ہیں اور انھیں خشک سرزمینوں کی سیرابی کے لیے لے جاتے ہیں۔

اور آخر میں فرشتوں کے وہ گروہ جو آسمانی کتابوں کی آیات نزولِ وحی کے وقت پیغمبروں کے سامنے پڑھتے ہیں[2]

---

[1] یہ تین جملے ایک معنی کے لحاظ سے تین قسمیں ہیں اور ایک معنی کے لحاظ سے ایک قسم ہے تین اوصاف کے ساتھ۔

[2] مذکورہ بالا آیات کی تفسیر کے بارے میں دوسرے احتمالات بھی بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ میدانِ جہاد میں مجاہدینِ اسلام کی صفوں کی طرف اشارہ ہے اور وہ میدانِ جنگ میں دشمنوں کے سروں پر جھپٹتے ہیں اور وہ انھیں حریم اسلام اور قرآن سے تجاوز کرنے سے روکتے ہیں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "صافات" "صافۃ" کی جمع ہے اور خود صافۃ بھی اپنی جگہ پر جمع کا مفہوم رکھتا ہے اور ایسے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو صف باندھے ہوئے ہے۔ اس بنا پر "صافات" متعدد صفوں کے معنی میں ہے۔[1]

"زاجرات" بنیادی طور پر "زجر" کے مادہ سے کسی چیز کو بلند آواز کے ساتھ ہانکنے کے معنی میں ہے۔ بعدازاں یہ لفظ وسیع معنی میں استعمال ہونے لگا جو ہر طرح سے دھتکارنے روکنے اور منع کرنے کا مفہوم دیتا ہے۔

اس بنا پر "زاجرات" ان گروہوں کے معنی میں ہے جو دوسروں کو روکتے، دھتکارتے اور جھڑکتے ہیں۔

اور "تالیات" "تلاوت" کے مادہ سے "تالی" کی جمع ہے جو ان گروہوں کے معنی میں ہے جو کسی چیز کی تلاوت کرتے ہیں۔[2]

ان الفاظ کے مفاہیم کی وسعت اور پھیلاؤ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کوئی تعجب کی بات نہیں لگتی کہ ان کے لیے مفسرین نے گوناگوں تفاسیر بیان کی ہیں۔ جو مختلف ہونے کے باوجود متضاد نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ سب کی سب ان آیات کے مفہوم میں جمع ہوں۔ مثلاً "صافات" سے فرشتوں کی وہ تمام صفوف مراد ہوں جو عالمِ آفرینش میں اوامر الٰہی کے اجراء کے لیے آمادہ ہیں اور وہ فرشتے بھی مراد ہوں جو عالمِ تشریع میں پیغمبروں پر نزولِ وحی پر مامور ہیں۔ اسی طرح راہِ خدا میں لڑنے والے اور مجاہدین کی صفیں یا نماز گزاروں اور عبادت کرنے والوں کی صفیں۔

اگرچہ قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ تر مراد فرشتے ہی ہیں اور بعض روایات میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔[3]

(بقیہ حاشیہ) اور وہ جو ہمیشہ ذکر تلاوتِ الٰہی کرتے ہیں اور اپنے قلب و روح کو اس کے نور سے روشن کرتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان تین اوصاف کے ایک حصہ کا اشارہ ان فرشتوں کی طرف ہے جو منظم صفوں کی صورت میں ہوتے ہیں اور ایک حصہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ ہے جو لوگوں کو برائیوں سے روکتی ہیں اور ایک حصہ مومنین کی طرف اشارہ ہے جو نماز میں یا نماز کے علاوہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں لیکن ان اوصاف کے درمیان جدائی بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ "فاء" کے ساتھ ان کا عطف اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سب اوصاف ایک ہی گروہ کے ہیں۔

علامہ طباطبائیؒ نے "المیزان" میں یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ تینوں اوصاف ان فرشتوں کے ہوں جو وحی الٰہی کی تبلیغ پر مامور ہیں، وہ منظم صفوں میں وحی کی حفاظت کرتے ہیں اور شیطانوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں اور سرانجام آیات الٰہی کی پیغمبروں کے لیے تلاوت کرتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان اوصاف کا "جمع مؤنث" کی شکل میں ذکر کرنا اس بنا پر ہے کہ ان کا مفرد خود جماعت کا معنی رکھتا ہے جو مؤنث لفظی ہے۔

[2] یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بعض اربابِ لغت کے کہنے کے مطابق "تالی" کی جمع "تالیات" ہے اور "تالیۃ" کی جمع "توالی" ہے۔

[3] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۱۵ الدر المنثور جلد ۵ ص ۲۷۱

اسی طرح اس بات میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ "زاجرات" کے مفہوم میں وہ فرشتے بھی شامل ہوں کہ جو شیطانی وسوسے انسانوں کے دلوں سے دور کرتے ہیں اور ان انسانوں کو بھی جو نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

نیز ہو سکتا ہے "تالیات" تمام فرشتوں اور مومنین کی تمام جماعتوں کی طرف اشارہ ہو جو آیاتِ الٰہی اور ذکر خدا کی پے در پے تلاوت کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان تینوں لفظوں کے ایک دوسرے پر "فاء" کے ساتھ عطف کی وجہ سے آیات کا ظاہر یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ ایک دوسرے کے پیچھے ہیں، تو کیا یہ ترتیب انجام ذمہ داری کے لحاظ سے ہے یا مقام کے لحاظ سے یا دونوں معانی کے لحاظ سے ؟

یہ بات واضح ہے کہ صف باندھنا اور تیار ہونا پہلے مرحلہ میں ہوتا ہے، اس کے بعد رکاوٹوں کو راستے سے ہٹانے کا مرحلہ ہے اور اس کے بعد احکام بیان کرنے اور ان کے اجراء کی نوبت ہے۔

دوسری طرف سے وہ جو فرمان کے اجراء کے لیے تیار ہونے میں ایک مقام رکھتے ہیں اور جو رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں وہ افضل و برتر مقام رکھتے ہیں اور جو فرامین کو پڑھتے ہیں اور انھیں جاری کرتے ہیں وہ سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔

بہرحال پروردگار کا ان سب گروہوں کی قسم کھانا اس کی بارگاہ میں ان کے مقام کی عظمت ظاہر کرتا ہے۔ ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی راہنمائی کرتا ہے کہ راہِ حق کے راہیوں کو مقصود تک پہنچنے کے لیے ان تینوں مراحل سے گزرنا چاہیے۔

پہلے وہ اپنی صفوں کو منظم کریں اور ہر گروہ اپنی صف میں موجود ہو۔ اس کے بعد سب راستے سے رکاوٹوں کو دور کرنے اور بلند آواز کے ساتھ مزاحمتوں کو ہٹانے میں مصروفِ کار ہو جائیں۔ وہی کام جو زجر (جھڑکنے) کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد آیاتِ الٰہی اور پروردگار کے فرامین کی اہل دلوں پر پے در پے تلاوت کریں اور ان کے مضامین و مطالب کو رُو بہ عمل لائیں۔

راہِ حق کے مجاہدین کو ان تینوں مرحلوں سے گزرنے کے سوا چارۂ کار نہیں۔ سچے علماء اور دانش مندوں کو بھی اپنی اجتماعی مساعی اور کوششوں میں اسی انداز سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بعض مفسرین نے ان آیات سے مجاہدین اور بعض نے علماء مراد لیے ہیں لیکن آیات کے مفہوم کو ان دو گروہوں میں محدود کرنا بعید نظر آتا ہے، البتہ آیات کی عمومیت بعید نہیں ہے اور اگر ہم انھیں فرشتوں کے ساتھ ہی مخصوص سمجھیں پھر بھی دوسرے لوگ اپنی زندگی میں ان فرشتوں سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

امیر المومنین علی علیہ السلام بھی نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں جہاں فرشتوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور انھیں مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

وصافون لا یتزایلون، ومسبحون لا یسأمون، لا یغشاھم نوم العیون، ولا سھو العقول، ولا فترۃ الابدان، ولا غفلۃ النسیان، ومنھم امناء علی وحیہ، والسنۃ الی رسلہ

ان میں سے ایک گروہ ایسی صفوں میں موجود ہے جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں وہ ہمیشہ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ ان کی آنکھوں میں کبھی نیند طاری نہیں ہوتی۔ سہو و نسیان میں گرفتار نہیں ہوتے۔ بدن کی سستی انھیں دامن گیر نہیں ہوتی اور نسیان کی غفلت انھیں عارض نہیں ہوتی۔ ان کا ایک گروہ وحی کے اماندار ہیں اور وہ پیغمبروں کے لیے خدا کی زبانیں ہیں [1]

ان تینوں آیات کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ بعض یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ان آیات میں خدا کی پاک ذات کی قسم کھائی گئی ہے اور ان سب میں لفظ "رب" مقدر ہے اور حقیقت میں یہ اس طرح تھا:

وربّ الصافات صفّاً و ربّ الزاجرات زجراً و ربّ التالیات ذکراً

صف باندھ کر کھڑے ہوئے ان گروہوں کے پروردگار کی قسم جنھوں نے اپنی صفوں کو منظم کیا ہوا ہے اور بھڑک کر روک دینے والوں کے پروردگار کی قسم، اور پے درپے ذکر خدا کی تلاوت کرنے والوں کے پروردگار کی قسم۔

جن لوگوں نے آیات کی اس طرح تفسیر کی ہے ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ خدا نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ غیر خدا کی قسم نہ کھائیں۔ پس خدا بھی اپنی ذات کے علاوہ کسی کی قسم نہیں کھاتا، علاوہ ازیں قسم کسی اہم امر کی کھانا چاہیے اور زیادہ اہم اس کی پاک ذات ہے۔

لیکن وہ اس نکتے سے غافل ہیں کہ خدا کا حساب اس کے بندوں سے الگ ہے۔ وہ انسانوں کو متوجہ کرنے کے لیے "آفاقی" اور "انفسی" آیات اور آسمان و زمین میں اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ہمیشہ مختلف موجودات کی قسمیں کھاتا ہے تاکہ وہ انھیں ان آیات میں غور و فکر کرنے پر آمادہ کرے اور وہ اسے اس راستے سے پہچانیں۔

اس سے قطع نظر قرآن مجید کی کئی آیات میں ـــــ جیسے سورۂ الشمس کی آیات میں ـــــ خدا نے موجوداتِ عالم کی اپنی پاک ذات کے ساتھ قسم کھائی ہے اور وہاں کسی چیز کو مقدر کرنا ممکن نہیں ہے، فرماتا ہے:

والسماء وما بناھا والارض و ما طحاھا و نفس و ما سوّاھا

قسم ہے آسمان کی اور جس نے اسے بنایا، قسم ہے زمین کی اور جس نے اسے بچھایا ہے اور قسم ہے انسان کی جان کی اور جس نے اُسے منظم کیا ہے [2]

بہر حال زیر بحث آیات کا ظاہر یہی ہے کہ ان ہی تینوں گروہوں کی قسم کھائی گئی ہے اور کسی چیز کو مقدر ماننا خلافِ ظاہر ہے اور دلیل کے بغیر اُسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱

[2] سورۂ "الشمس" (آیات ۵ تا ۷)

آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ ملائکہ اور انسانوں کی صفوں کی یہ پرمعنی قسمیں کس مقصد کے لیے کھائی گئی ہیں؟
بعد والی آیت اس مقصد کو واضح کرتے ہوئے کہتی ہے:
تمھارا معبود یقیناً یکتا ہے (انّ الٰھکم لواحد)۔
قسم ہے ان مقدسات کی جو بیان کیے گئے ہیں، کہ تمام بت تباہ و برباد ہیں اور پروردگار کا کوئی کسی قسم کا شریک و شبیہ و نظیر نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: وہی جو آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا بھی اور سب مشرقوں کا پروردگار وہی ہے۔ (رب السّماوات والارض و ما بینھما و رب المشارق)۔
یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں:
١۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کا ذکر کرنے کے بعد "مشارق" کے ذکر کی کیا ضرورت تھی، کیونکہ یہ بھی تو انھیں کا ایک جزء ہے۔
اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ "مشارق" چاہے سال کے دنوں میں سورج کے مشارق کی طرف اشارہ ہو یا آسمان کے مختلف ستاروں کے مشارق کی طرف، سب کے سب ایک مخصوص نظم اور پروگرام رکھتے ہیں کہ جو آسمانوں اور زمین کے نظام کے علاوہ ان کے پیدا کرنے والے اور مدبر کی قدرت و علم پر دلالت کرتا ہے۔
آسمان کا سورج سال بھر میں روزانہ ایک نئے نقطے سے طلوع کرتا ہے اور ان نقاط کا ایک دوسرے سے فاصلہ اس قدر منظم اور دقیق ہے کہ ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی کم یا زیادہ نہیں ہوتا اور لاکھوں سال گزر چکے ہیں مگر "سورج کے مشارق" کا نظم و ضبط اسی طرح قائم و برقرار ہے۔
دوسرے ستاروں کے طلوع و غروب میں بھی یہی نظام کار فرما ہے۔
علاوہ ازیں اگر سورج سال بھر کے اندر اس تدریجی راستے کو طے نہ کرتا تو چاروں فصلیں اور مختلف برکتیں جو اس سے ہمیں حاصل ہوتی ہیں نہ ہو سکتیں اور یہ بات خود اس کی عظمت و تدبیر کی ایک اور نشانی ہے۔
اس کے علاوہ "مشارق" کا ایک دوسرا معنی یہ ہے کہ زمین کے گول ہونے کی بنا پر اس کا ہر نقطہ دوسرے نقطے کی نسبت مشرق یا مغرب شمار ہوتا ہے اور اس طرح سے زیر بحث آیت ہمیں زمین کے کروی ہونے اور اس کی مشرقوں اور مغربوں کی طرف توجہ دلاتی ہے۔
(اس آیت سے دونوں معانی مراد ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے)۔
٢۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ "مشارق" کے مقابلے میں یہاں "مغارب" کے بارے میں کیوں گفتگو نہیں ہوئی، جیسا کہ سورۂ معارج کی آیہ ۴٠ میں آیا ہے:-
فلا اقسم برب المشارق والمغارب

مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات کلام کے ایک حصّے کو دوسرے حصّے کے قرینہ کی وجہ سے حذف کر دیتے ہیں، اور کبھی دونوں کو اکٹھا لے آتے ہیں۔ یہاں "مشارق" کا ذکر "مغارب" کے لیے قرینہ ہے اور بیان کا یہ تنوع بھی ایک انداز فصاحت شمار ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "مشارق" کا ذکر طلوعِ وحی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے جو "تالیات ذکرًا" فرشتوں کے ذریعے پیغمبرؐ کے قلب پاک پر نازل ہوئی۔[1]

۶۔ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۣالْكَوَاكِبِ ۙ

۷۔ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ

۸۔ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۖ

۹۔ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ

۱۰۔ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ

ترجمہ

۶۔ ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے ساتھ زینت بخشی۔

۷۔ اور اس کی ہر سرکش شیطانِ خبیث سے حفاظت کی۔

۸۔ وہ عالمِ بالا کے فرشتوں کی (باتوں کو) نہیں سُن سکتے (اور جس وقت وہ سننا چاہتے ہیں) تو ہر طرف سے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں۔

۹۔ وہ شدت کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکیلے جاتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔

۱۰۔ مگر جو مختصر سے لمحے کے لیے اچٹتی سی بات سننے کے لیے آسمان کے نزدیک ہوتے ہیں تو وہ "شہابِ ثاقب" ان کا تعاقب کرتے ہیں۔

تفسیر

شیاطین کے نفوذ سے آسمان کی حفاظت

گزشتہ آیات میں فرشتوں کی مختلف صفوں کے بارے میں گفتگو تھی جن کی بہت بڑی بڑی ذمہ داریاں ہیں اور زیر بحث آیات میں ان کے مدمقابل یعنی شیاطین کے مختلف گروہوں اور ان کے انجام کے بارے میں گفتگو ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مشرکین کی اس جماعت کے اعتقاد کو باطل کرنے کے لیے ایک مقدمہ ہو، جو شیاطین اور جنوں کو اپنا معبود قرار دیتے تھے ضمنی طور پر اس میں توحید کا ایک درس بھی پوشیدہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے نزدیکی آسمان (نچلے آسمان) کو ستاروں سے مزین کیا ہے (انا زینا السماء

الدنیا بزینۃ الکواکب)[1]

سچ مچ تاریک اور ستاروں بھری رات میں صفحۂ آسمان پر ایک نگاہ سے اس قسم کا خوبصورت منظر انسان کے سامنے مجسّم ہوتا ہے کہ وہ مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔

گویا تاروں بھری رات زبان بے زبانی سے ہم سے گفتگو کر رہی ہے اور خلقت کے راز ہم سے بیان کر رہی ہے۔
گویا سب کے سب تارے شاعر ہیں جو پے در پے عشق و عرفان میں ڈوبی ہوئی خوبصورت غزلیں گا رہے ہیں۔
ان کا ٹمٹمانا اور پلکیں جھپکنا ایسے رازوں کو بیان کرتا ہے کہ جو سوائے عاشق و معشوق کے اور کہیں نہیں ہوتے۔

واقعاً آسمان کے ستاروں کا منظر اس قدر خوبصورت ہے کہ ہر گز آنکھ اس کے دیکھنے سے نہیں تھکتی، بلکہ انسانی وجود سے ساری خستگی کو دُور کر دیتا ہے (اگر چہ یہ مسائل، ہمارے زمانے میں شہروں کے رہنے والوں کے لیے کچھ مفہوم نہیں رکھتے کیونکہ وہ کارخانوں کے دھوئیں میں ڈوبے رہتے ہیں اور ان پر ایک سیاہ و تاریک آسمان ہوتا ہے، لیکن دیہاتوں کے رہنے والے اب بھی قرآن کے اس ارشاد کی عملی صورت یعنی آسمان کا درخشاں ستاروں سے مزیّن ہونا دیکھ سکتے ہیں)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ "ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں سے مزیّن کیا ہے"۔ حالانکہ جو مفروضہ اس زمانے کے افکار اور دانش مندوں میں تسلیم کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ صرف اوپر والا آسمان ثوابت ستاروں کا آسمان ہے (بطلیموس کے مفروضہ کے مطابق آٹھواں آسمان)۔

لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اس مفروضہ کا باطل ہونا ثابت ہو چکا ہے اور قرآن کا اس زمانے کے غیر صحیح مفروضہ کی پیروی نہ کرنا اس آسمانی کتاب کا زندہ معجزہ ہے۔

دوسرا قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ موجودہ سائنس کی رُو سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ستاروں کا خوبصورتی کے ساتھ ٹمٹمانا اور پلکیں جھپکنا اس کُرۂ ہوائی کی بنا پر ہے جس نے اطراف زمین کو گھیر رکھا ہے اور اسی کی بنا پر یوں دکھائی دیتا ہے اور یہ بات "السماء الدنیا" (نچلے آسمان) کی تعبیر کے ساتھ بہت ہی مناسب ہے۔ فضائے زمین سے باہر ستارے دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں اور ان میں یہ چمک دمک نہیں ہوتی۔

بعد والی آیت میں آسمان کے منظر کے شیاطین کے نفوذ سے محفوظ رہنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے ہر خبیث اور خیر و نیکی سے عاری شیطان سے محفوظ رکھا ہے (وحفظاً من کل شیطان مارد)[2]

---

[1] ترکیب کے لحاظ سے "الکواکب" "زینت" کا بدل ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ عطف بیان ہو اور زینت بیان پر اسم مصدری کا معنی رکھتا ہو نہ کہ مصدری معنی کا۔ ادبی کتب میں ہے کہ جس وقت نکرہ معرفہ سے بدل جائے تو اس کے ساتھ ایک صفت ہونی چاہیے لیکن اس کے برعکس ضروری نہیں ہے (غور کیجیے گا)

[2] "حفظاً" بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق فعل مقدّر کے لیے "مفعول مطلق" ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

وحفظناھا حفظاً

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

"مارد" "مرد" (بروزن "سرد") کے مادہ سے اصل میں اس بلند سرزمین کے معنی میں ہے جو کسی بھی قسم کے سبزے سے خالی ہو، وہ درخت جس کے پتے جھڑ جائیں اسے "امرد" کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس نوجوان پر جس کے چہرے پر بال نہ اُگے ہوں اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے یہاں "مارد" سے مراد وہ شخص ہے جو ہر قسم کی خیر و برکت سے عاری ہو۔ ہماری تعبیر کے مطابق "جس کے پاس کچھ نہ ہو" ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ شیطانوں کے اوپر چڑھنے سے آسمانوں کو محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ ستاروں کا ایک گروہ ہے اور انھیں "شہب" کہا جاتا ہے۔ جس کی طرف بعد کی آیات میں اشارہ ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ عالم بالا کے فرشتوں کی باتوں کو نہیں سُن سکتے اور غیب کے اسرار ان سے نہیں معلوم کر سکتے اور اگر ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہر طرف سے شہاب کے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں۔ (لا یسمعون الی الملا الاعلی ویقذفون من کل جانب)۔

ہاں انھیں شدت کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے اور انھیں آسمان کے منظر سے نکال دیا جاتا ہے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے (دحورًا ولهم عذاب واصب)۔

"لا یسمعون" (جو لایتسمعون کے معنی میں ہے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ "ملا اعلیٰ" کی خبریں سُن لیں لیکن انھیں اجازت نہیں دی جاتی۔

"ملا اعلی" عالم بالا کے فرشتوں کے معنی میں ہے کیونکہ "ملا" اصل میں اس جماعت اور گروہ کو کہا جاتا ہے جو ایک نظریہ پر اتفاق رکھنے والوں پر مشتمل ہو اور دوسروں کی آنکھ کو اس ہم آہنگی و وحدت سے پُر کردیں اور مسند اقتدار کے گرد موجود افراد اور اشراف و اعیان کو بھی "ملا" کہتے ہیں کیونکہ ان کی ظاہری وضع قطع آنکھ کو پُر کرتی ہے لیکن جب اس کی "اعلیٰ" کے ساتھ توصیف ہو تو پھر حق تعالیٰ کے ملائکہ کرام اور فرشتگان والا مقام کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

"یقذفون" "قذف" کے مادہ سے پھینکنے اور دور کی جگہ پر تیر مارنے کے معنی میں ہے اور یہاں مراد "شہب" کے ذریعے "شیاطین" کو بھگانا اور دور دھکیلنا ہے جس کی تشریح ہم بعد میں بیان کریں گے اور یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ انھیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ملا اعلیٰ کی قلمرو کے قریب جا سکیں۔

"دحورًا" "دحر" (بروزن دہر) کے مادہ سے دھکیلنے اور دور کرنے کے معنی میں ہے اور "واصب" اصل میں پرانی بیماریوں کے معنی میں ہے لیکن کلی طور پر یہ دائم و مسلسل کے معنی میں ہے اور کبھی یہ لفظ خالص کے معنی میں بھی آیا ہے۔[1]

(بقیہ حاشیہ) بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "بزینة" کے محل پر عطف ہو جو "مفعول لہ" ہے اور یہ تقدیر میں اس طرح ہوگا:

انا خلقنا الکواکب زینة للسماء وحفظًا

[1] "واصب" کے معنی کے بارے میں جلد ۹ میں سورۂ نحل کی آیہ ۵۲ کے ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شیاطین نہ صرف آسمان تک پہنچنے سے روک دیئے جاتے اور بھگائے جاتے ہیں بلکہ آخر کار دائمی عذاب میں بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں سرکشی اور جسارت کرنے والے شیطانوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو آسمان کی بلندی کی طرف جانے کا ارادہ کرتے ہیں، قرآن فرماتا ہے: مگر وہ جو مختصر سے لمحے کے لیے چوری چھپے اچٹتی سی بات سننے کے لیے آسمان کے نزدیک ہو جائیں تو شہابِ ثاقب ان کا پیچھا کرتے ہیں اور انھیں جلا دیتے ہیں۔ (الا من خطف الخطفة فاتبعه شهاب ثاقب)۔

"خطفة" یعنی کسی چیز کو جلدی سے اچک لینا۔

"شهاب" اصل میں اس شعلہ کے معنی میں ہے جو جلتی ہوئی آگ سے بلند ہوتا ہے اور وہ آتشیں شعلے جو آسمان میں ایک لمبے خط کی صورت میں ابھرتے ہیں انھیں بھی "شہاب" کہتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ ستارے نہیں ہیں بلکہ ستاروں کے مانند پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ زمین کی کشش کی حدود میں آجاتے ہیں تو پھر زمین کی طرف دوڑتے ہیں اور زمین کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوا کے ساتھ تیزی اور شدت سے ٹکرانے کی وجہ سے شعلہ ور ہو جاتے ہیں۔

"ثاقب" نفوذ کرنے والے اور سوراخ کرنے والے کے معنی میں ہے۔ گویا شدید نور کے زیر اثر آنکھوں میں سوراخ کر کے انسان کی آنکھ کے اندر نفوذ کر جاتا ہے" اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جس چیز سے ٹکراتا ہے اس میں سوراخ کر کے آگ لگا دیتا ہے۔

اس طرح شیاطین کے آسمانوں میں نفوذ کرنے میں دو طرح کی رکاوٹیں موجود ہیں۔

پہلی رکاوٹ تو ہر طرف سے دھتکارا جانا اور بھگایا جانا ہے۔ اور وہ بھی ظاہری طور پر شہب ہی کے ذریعہ صورت پذیر ہوتا ہے۔

دوسری رکاوٹ شہاب کی ایک خاص قسم ہے جس کا نام "شہابِ ثاقب" ہے اور وہ ان کے انتظار میں رہتے ہیں۔ وقت بے وقت جب کبھی وہ چوری چھپے کوئی بات سننے کے لیے آسمان پر ملا اعلیٰ کے نزدیک ہوتے ہیں تو وہ ان سے ٹکرا جاتے ہیں۔

اسی طرح کی بات سورۂ حجر کی آیہ ۱۷ اور ۱۸ میں کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وحفظناها من كل شيطان رجيم الا من استرق السمع فاتبعه شهاب مبين

ہم آسمانی برجوں کی ہر راندۂ درگاہ شیطان سے حفاظت کرتے ہیں، مگر جو چوری چھپے باتیں سننے لگے تو شہابِ مبین اس کے پیچھے لگ جاتا ہے (انھیں بھگا دیتا ہے اور جلا دیتا ہے)۔

اس تعبیر کی نظیر سورۂ ملک کی آیہ ۵ میں بھی آئی ہے۔

ولقد زينا السماء الدنيا بمصابيح وجعلناها رجوما للشياطين

ہم نے نچلے آسمان کو چراغوں کے ساتھ مزین کیا ہے اور ان (میں سے ایک حصہ) کو شیطانوں کو دور کرنے اور بھگانے کے لیے قرار دیا ہے۔

توضیح و تکمیل

ان الفاظ کے ظاہر ہی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے یا ایسے قرائن موجود ہیں کہ جن کی وجہ سے ظاہر کے خلاف تفسیر کرنی چاہیے اور انھیں تمثیل و تشبیہ و کنایہ جاننا چاہیئے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔

بعض نے ان آیات کے ظاہر کو انھیں معانی پر جو پہلی نظر میں دکھائی دیتے ہیں، محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ آسمانوں میں نزدیک اور دور دراز مقامات پر فرشتوں کے کچھ گروہ ساکن ہیں اور وہ اس جہان کے حوادث کی خبریں اس سے پہلے کہ وہ زمین میں صورت پذیر ہوں وہاں منعکس ہوتی ہیں۔

شیاطین کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ آسمانوں پر چڑھ جائے اور چوری چھپے ان خبروں میں سے کوئی بات معلوم کرلے اور کاہنوں یعنی انسانوں میں سے اپنے ساتھ مربوط لوگوں کو منتقل کر دیں۔ اس موقع پر شہاب جو ستاروں کی طرح متحرک ہیں ان کی طرف دوڑتے ہیں اور انھیں پیچھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں یا انھیں نابود کر دیتے ہیں۔

یہ مفسرین کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے ہم موجودہ زمانے میں ان تعبیرات کے مفاہیم کو صحیح طور پر معلوم نہ کرسکیں، لیکن ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ ہم ان ظاہری مطالب کی حفاظت کرتے ہوئے مزید معلومات کو آئندہ پر چھوڑ دیں۔

اس تفسیر کو مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں، آلوسی نے "روح المعانی" میں، سید قطب نے "فی ظلال" میں اور بعض دوسرے مفسرین نے انتخاب کیا ہے۔

جبکہ بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ زیر بحث آیات ان آیات کے مشابہ ہیں جو "لوح" "قلم" "عرش" اور "کرسی" کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور تمثیل و کنایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان کا عقیدہ ہے کہ یہ آیات "معقول" کو "محسوس" سے تشبیہ دینے کے قبیل سے ہیں اور سورۂ عنکبوت کی آیہ ۴۳ کی مصداق ہیں جس میں قرآن فرماتا ہے:

وتلك الامثال نضربها للناس وما يعقلها الا العالمون

یہ وہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور اہلِ علم کے سوا انھیں کوئی نہیں سمجھتا۔

ان مفسرین نے مزید کہا ہے کہ جن آسمانوں میں ملائکہ ساکن ہیں ان سے مراد عوالم ملکوت ہیں جن کا افق اس محسوس عالم سے برتر ہے اور شیاطین کے آسمانوں سے نزدیک ہونے اور "چوری چھپے" سننے اور "شہب" کے ذریعہ انھیں بھگانے سے مراد یہ ہے کہ یہ شیاطین جب اسرارِ خلقت اور آئندہ کے حوادث کی خبریں معلوم کرنے کے لیے فرشتوں کے عالم سے نزدیک ہونا چاہیں، تو

ملکوت کے نور کے ذریعے جسے برداشت کرنے کی ان میں طاقت نہیں ہے، رُک جاتے ہیں اور دُور ہو جاتے ہیں اور حق کے ذریعے ان کے باطل کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ مفسرین اس سورہ کے آغاز میں فرشتوں کے گروہوں کی بحث کے بعد اس قصّہ کے ذکر کو، اس معنی کا مؤید سمجھتے ہیں [1]

یہ احتمال بھی ہے کہ "سماء" یہاں آسمان ایمان اور معنویت وروحانیت کے لیے کنایہ ہو۔ کیونکہ ہمیشہ شیاطین اس تک راہ پانے کی سعی وکوشش کرتے ہیں اور وسوسوں کے ذریعے سچّے مومنین کے دلوں میں نفوذ پیدا کرتے ہیں لیکن خدائی پیغمبر اور ائمہ معصومین اور ان کے فکری وعملی راستے کے پیرو علم وتقوی کے شہابِ ثاقب کے ذریعے ان پر حملہ کرتے ہیں اور انھیں اس آسمان کے قریب ہونے سے روک دیتے ہیں۔

ہم اس تفسیر کو صرف ایک احتمال کے طور پر بیان پیش کر رہے ہیں اور اس کے قرائن وشواہد گیارہویں جلد سورۂ حجر کی آیہ ۱۸ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔ ان قرائن کی مزید وضاحت کے لیے چھٹی جلد ہی کی طرف رجوع فرمائیں۔

قرآن مجید کی ان آیات اور ان سے مشابہ آیات کے معنی کے سلسلہ میں یہ تین مختلف تفاسیر تھیں۔

---

[1] تفسیر "المیزان" (جلد ۱۷، صفحہ ۱۲۰) سے تلخیص

۱۱۔ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ○

۱۲۔ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ○

۱۳۔ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ○

۱۴۔ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ○

۱۵۔ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

ترجمہ

۱۱۔ ان سے پوچھو کیا ان کی خلقت (اور معاد) زیادہ مشکل ہے یا فرشتوں (اور آسمان وزمین) کی خلقت؛ ہم نے انھیں چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا ہے۔

۱۲۔ تو ان کے انکار سے تعجب کرتا ہے لیکن وہ تو ٹھٹھا کرتے ہیں۔

۱۳۔ اور جس وقت انھیں نصیحت کی جائے تو وہ ہرگز متوجہ نہیں ہوتے۔

۱۴۔ اور جب وہ کوئی معجزہ دیکھیں تو دوسروں کو بھی ٹھٹھا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

۱۵۔ اور کہتے ہیں یہ تو نرا کھلا جادو ہے۔

تفسیر

وہ ہرگز حق کو قبول نہیں کریں گے

یہ آیات بھی مسئلہ قیامت اور ہٹ دھرم منکرین کی مخالفت کو بیان کر رہی ہیں۔

گزشتہ بحث کے بعد اب ان آیات میں قرآن ہر چیز پر خداوند تعالیٰ اور آسمان وزمین کے خالق کی قدرت کے متعلق فرماتا ہے: ان سے پوچھو کیا ان کی خلقت اور معاد زیادہ مشکل اور سخت تر ہے یا فرشتوں اور آسمانوں و زمین کی خلقت (فاستفتهم اهم اشد خلقا ام من خلقنا)۔

ہاں ہم نے انھیں ایک معمولی سی چیز، چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا" (انا خلقنا هم من طين لازب)۔

گویا مشرکین جو معاد کے منکر تھے انھوں نے گزشتہ آیات سننے کے بعد یہ اظہار کیا کہ ہماری خلقت آسمان وزمین اور فرشتوں کی خلقت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: انسانوں کی خلقت، وسیع زمین و آسمان اور ان فرشتوں کی خلقت کے مقابلے میں جو ان عوالم میں ہیں کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ انسان کی خلقت کا مبدأ مٹھی بھر چپکنے والی مٹی سے زیادہ نہیں ہے۔

"استفتھم" "استفتاء" کے مادہ سے نئی خبروں کے مطالبہ کے معنی میں ہے اور یہ جو نوجوان کو "فتیٰ" کہا جاتا ہے وہ بھی اس کی روح وجسم کی تروتازگی کی بنا پر ہے۔[1]

یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ حقیقتاً اپنی خلقت کو آسمان اور فرشتوں کی خلقت سے زیادہ اہم اور زیادہ مستحکم سمجھتے ہیں تو یہ بالکل ایک نئی بات ہے جس کی سابق میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

"لازب" کا لفظ بعض کے قول کے مطابق اصل میں "لازم" تھا۔ اس کی "میم" "ب" سے بدل گئی ہے اور اب اسی شکل میں استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ایسی مٹی کے معنی میں ہے جس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ لازم یعنی چپکے ہوئے ہیں۔ کیونکہ انسان کی خلقت کا پہلا مبدأ تو مٹی ہی ہے اس کے بعد اس میں پانی ملایا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے بدبودار گارے کی صورت اختیار کی۔ اس کے بعد وہ چپکنے والا گارا بن گیا۔ (اس بیان کے ساتھ قرآن مجید کی آیات کی گوناگوں تعبیرات جمع ہو جاتی ہیں)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: تو ان کے معاد کے بارے میں انکار سے تعجب کرتا ہے، لیکن وہ تو معاد کا مذاق اڑاتے ہیں (بل عجبت ویسخرون)۔

تُو تو اپنے پاک دل کے باعث اس مسئلے کو اتنا واضح سمجھتا ہے کہ ان کے انکار سے تعجب میں ڈوب جاتا ہے، لیکن یہ ناپاک دل اسے اس قدر محال سمجھتے ہیں کہ اس کا تمسخر اڑانے لگتے ہیں۔

ان برائیوں کا عامل صرف لاعلمی اور جہالت نہیں ہے بلکہ ہٹ دھرمی اور عناد ہے۔ اس لیے جب انھیں یاددہانی کرائی جائے ـــــ معاد کے دلائل اور خدائی عذاب کی یاددہانی ـــــ تو وہ ہرگز متوجہ نہیں ہوتے اور اسی طرح سے اپنی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ (واذا ذکروا لا یذکرون)۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ: جب وہ تیرے معجزات میں سے کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو نہ صرف خود تمسخر اڑاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ٹھٹھا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں (واذا راوا اٰیۃ یستسخرون)۔

---

[1] "روح المعانی" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے اور کچھ نہیں (و قالوا ان ھٰذا الا سحر مبین)۔

ان کا معجزات اور آیات الٰہی کو "ھٰذا" (یہ) کہنا اس لیے تھا تاکہ وہ انھیں حقیر اور بے قدر و قیمت ظاہر کریں اور انھیں "سحر" کہنا اس بنا پر تھا کہ ایک طرف تو پیغمبر اسلامؐ کے خارق العادہ اعمال و افعال قابل انکار نہیں تھے اور دوسری طرف وہ ایک معجزہ کے طور پر ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا نہیں چاہتے تھے صرف ایک لفظ جو ان کی شیطنت کا اظہار اور ان کی ہوائے نفس کو پورا کر سکتا تھا وہ یہی لفظ سحر تھا جو اس حال میں بھی قرآن اور پیغمبر کے عجیب اور انتہائی زیادہ اثر کے بارے میں دشمن کے اعتراف کی نشاندہی کرتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ "یستسخرون" کا مفہوم: مفسرین کی ایک جماعت کے نظریہ کے مطابق لفظ "یستسخرون" "یسخرون" (تمسخر اڑاتے ہیں) کے معنی میں آیا ہے اور ان دونوں تعبیروں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے جبکہ بعض دوسرے ان دونوں کے درمیان مختلف معانی کے قائل ہیں وہ "یستسخرون" کو اس مفہوم کی بنا پر جو باب استفعال میں پوشیدہ ہے، دوسروں کو تمسخر اڑانے کی دعوت دینے کے معنی میں سمجھتے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ صرف خود آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے بھی یہ کام سرانجام دیں تاکہ یہ امر معاشرے میں مذاق ہی بن کر رہ جائے۔

بعض ان دونوں کے فرق کو زیادہ تاکید کے معنی میں سمجھتے ہیں جو لفظ "یستسخرون" سے معلوم ہوتی ہے۔

بعض نے اس لفظ کو "کسی چیز کے مذاق ہونے کا اعتقاد رکھنے کے معنی میں بیان کیا ہے۔ یعنی وہ شدید انحراف کے نتیجے میں حقیقۃً یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ معجزات ایک مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے لیکن دوسرا معنی سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۲۔ اس آیت کی ایک شانِ نزول: بعض مفسرین نے زیر بحث آیت کی ایک شانِ نزول بھی بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی ایک مشرک سے جس کا نام "رکانہ" تھا اطراف مکہ کے ایک پہاڑ پر تنہائی میں ملاقات ہوئی باوجود اس کے کہ رکانہ مکہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ قوی اور طاقتور تھا، پیغمبر اکرمؐ نے اسے زمین پر پٹخ دیا تاکہ اس پر ظاہر کر دیں کہ آپ معجزے کی طاقت رکھتے ہیں کیونکہ عام حیثیت کے لحاظ سے حریف کی کامیابی مسلّم تھی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے کچھ اور معجزات بھی اسے دکھائے کہ جو اس کی ہدایت کے لیے کافی تھے لیکن وہ نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لایا بلکہ مکہ میں آیا اور چلا کر کہا:

> یا بنی ھاشم ساحروا بصاحبکم اھل الارض
>
> اے بنی ہاشم! تمھارا ساتھی جادو میں اتنا قوی ہے کہ تم اس کے ذریعہ روئے زمین کے تمام جادوگروں کا مقابلہ کر سکتے ہو۔

زیر نظر آیات اس کے اور اس جیسے افراد کے بارے میں نازل ہوئیں[1]

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۳ ص ۷۱

۱۶۔ ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ○

۱۷۔ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ○

۱۸۔ قُلۡ نَعَمۡ وَاَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ ○

۱۹۔ فَاِنَّمَا هِىَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ ○

۲۰۔ وَقَالُوۡا يٰوَيۡلَنَا هٰذَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ○

۲۱۔ هٰذَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِىۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ○

۲۲۔ اُحۡشُرُوا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا وَاَزۡوَاجَهُمۡ وَمَا كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ ○

۲۳۔ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَاهۡدُوۡهُمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡجَحِيۡمِ ○

ترجمہ

۱۶۔ وہ کہتے ہیں جب ہم مر گئے اور خاک اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے ؟

۱۷۔ یا ہمارے گزشتہ آباؤ اجداد (لوٹائے جائیں گے) ؟

۱۸۔ کہہ دو : ہاں (تم سب زندہ کیے جاؤ گے) جبکہ تم ذلیل و خوار ہو گے۔

۱۹۔ صرف ایک ہی عظیم صیحہ ہوگی ، اچانک سب کے سب (قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے) اور دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔

۲۰۔ اور کہیں گے : وائے ہو ہم پر یہ جزا کا دن ہے ؟

۲۱۔ (ہاں !) یہ وہی جدائی کا دن ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (حق کی باطل سے جدائی کا دن)۔

۲۲۔ (اس وقت فرشتوں کو حکم دیا جائے گا) ظالموں اور ان کے ساتھیوں اور جن جن کی وہ پرستش کیا کرتے تھے......

۲۳۔ (ہاں جن جن کی بھی وہ) خدا کے سوا پرستش کیا کرتے تھے انھیں جمع کرو اور انھیں جہنم کے راستے پر چلتا کر دو۔

تفسیر

کیا ہم اور ہمارے آباء پھر زندہ ہو جائیں گے ؟

یہ آیات بھی اسی طرح منکرینِ معاد کی گفتگو اور ان کو دیے گئے جواب کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پہلی آیت منکرین کا معاد کو بعید جاننا اس طرح بیان کرتی ہے کہ وہ کہتے ہیں : کیا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے ؟ (ء اذا متنا وکنا ترابا وعظاما ءانا لمبعوثون)[1]

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیا ہمارے گزشتہ آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے ؟ (او اٰباؤنا الاولون)۔

وہی جن کے وجود سے مٹھی بھر بوسیدہ ہڈیوں یا بکھری ہوئی مٹی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ کون ہے ایسا جو ان بکھرے ہوئے اجزاء کو اکٹھا کر سکے اور انھیں لباسِ حیات پہنا سکے ؟

لیکن یہ دل کے اندھے اس بات کو بھولے ہوئے ہیں کہ پہلے دن وہ سب کے سب خاک ہی تو تھے، وہ مٹی ہی سے پیدا کیے گئے تھے اگر انھیں خدا کی قدرت میں شک ہے تو انھیں جاننا چاہیے کہ خدا نے انھیں ایک مرتبہ قدرت دکھا دی اور اگر انھیں مٹی کی قابلیت میں شک ہے تو اس کا ایک مرتبہ ثبوت مل چکا اس کے علاوہ آسمانوں اور زمین کی ایسی عظیم پیدائش، کسی کے لیے حق تعالیٰ کی بے پایاں قدرت میں شک کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑتی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ انکار کے لیے اپنی گفتگو کو طرح طرح کی تاکیدوں کے ساتھ زوردار بناتے ہیں چونکہ جملہ "ءانا لمبعوثون" "جملہ اسمیہ" بھی ہے اور "ان" اور "لام" جو دونوں ہی تاکید کے لیے آتے ہیں اس میں استعمال ہوئے ہیں اور یہ سب ان کی جہالت اور ہٹ دھرمی کی بنا پر تھا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں لفظ "تراب" (خاک)، "عظام" (ہڈیوں) سے پہلے بیان ہوا ہے ممکن ہے یہ امر ان تین نکتوں میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ ہو۔

۱۔ یہ کہ اگرچہ انسان مرنے کے بعد پہلے ہڈیوں کی صورت اختیار کرتا ہے اور پھر خاک کی صورت۔ لیکن چونکہ خاک کا دوبارہ زندہ ہونا زیادہ عجیب ہے لہٰذا پہلے اسے بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ جب مردوں کا جسم بکھرتا ہے تو پہلے گوشت مٹی میں تبدیل ہوتا ہے اور ہڈیوں کے پہلو میں گر پڑتا ہے اس بنا پر وہ خاک بھی ہوتا ہے اور ہڈیاں بھی۔

---

[1] یہ آیت ایک جملہ شرطیہ کی شکل میں ہے کہ جس کی شرط کو (ءاذا متنا) اور اس کی جزا محذوف ہے " ءانا لمبعوثون" اس پر قرینہ ہے کیونکہ یہ جملہ ادبی قواعد کی بنا پر جزا واقع نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ممکن ہے "تراب" تو بہت پہلے کے مرے ہوئے آباؤ اجداد کے جسموں کی طرف اشارہ ہو اور "عظام" ان آباؤ اجداد کے بدنوں کی طرف اشارہ جو ابھی تک کامل طور سے مٹی نہیں ہوئے ہیں۔

اس کے بعد قرآن انھیں ٹھونک بجا کر جواب دیتا ہے اور پیغمبر اکرمؐ سے کہتا ہے، انھیں کہہ دو: ہاں! تم سبھی اور تمھارے سارے آباؤ اجداد بھی پھر زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے، اس حالت میں کہ تم سب کے سب ذلیل و خوار اور حقیر ہو گے (قل نعم وانتم داخرون)[1]

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تمھارا اور تمھارے سارے گزشتہ آباؤ اجداد کا زندہ کرنا قادر و توانا خدا کے لیے کچھ مشکل کام ہے اور کچھ بہت ہی سخت عمل ہے؟

نہیں، صرف ایک ہی صیحہ اور عظیم آواز خدا کے مامور کی طرف سے بلند کی جائے گی تو اچانک سب کے سب قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور زندہ ہو جائیں گے اور خود اپنی آنکھوں سے محشر کا منظر دیکھیں گے جس کی اس دن تک تکذیب کیا کرتے تھے (فانما ھی زجرۃ واحدۃ فاذا ھم ینظرون)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "زجرۃ" "زجر" کے مادہ سے کبھی نکالنے، دھکا دینے اور بھگانے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی بلند آواز کے ساتھ پکارنے کے معنی میں۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے اور یہ اسرافیل کے دوسرے نفخ صور اور دوسری چیخ کے معنی میں ہے جس کی تشریح انشاء اللہ سورہ "زمر" کی آیات کے ذیل میں کی جائے گی۔

لفظ "ینظرون" (وہ دیکھیں گے) ان کے میدان محشر میں حیران و پریشان ہو کر دیکھنے یا عذاب کا انتظار کرتے ہوئے دیکھنے کی طرف اشارہ ہے اور ہر دو صورت میں مطلب یہ ہے کہ نہ صرف وہ زندہ ہی ہوں گے بلکہ اپنے ادراک اور بصارت کو بھی اس ایک صیحہ کے ساتھ ہی واپس پالیں گے۔

"زجرۃ واحدۃ" کی تعبیر ان دونوں الفاظ کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے، قیامت کے تیزی کے ساتھ اچانک آنے اور اس کے خدا کی قدرت کے سامنے بالکل آسان ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ قیامت کے فرشتے کی ایک ہی تحکمانہ تیز چیخ کے ساتھ ہر چیز اپنے راستے پر چل پڑے گی۔

اس موقع پر ان مغرور و سرکش مشرکین کی چیخ و پکار بلند ہو گی جو ان کی بدحالی اور بے چارگی کی نشانی ہے اور وہ کہیں گے: وائے ہو

---

[1] "داخرون"، "دخر" (بروزن "فخر") اور "دخور" دونوں ہی ذلت و حقارت کے معنی میں ہیں۔ درحقیقت زیر بحث آیت کا ایک جملہ مقدر ہے کہ اصلی جواب وہی تھا اور اس پر کچھ اضافہ ہے تاکہ بات میں کچھ زیادہ نعد پیدا ہو جائے، تقدیر اس طرح تھی:۔
نعم انکم مبعوثون حالکونکم داخرین

ہم پر، یہ تو یوم جزا ہے" (وقالوا یاویلنا ھٰذا یوم الدین)۔

ہاں! جس وقت ان کی نگاہیں عدالتِ الٰہی، اس عدالت کے گواہوں اور فیصلہ کرنے والوں اور عذاب کی نشانیوں اور علامات پر پڑیں گی تو بے اختیار نالہ و فریاد کریں گے اور اپنے پورے وجود کے ساتھ قیامت کی حقانیت کا اعتراف کرلیں گے، لیکن ایسا اعتراف ان کی کسی مشکل کو حل نہیں کرسکے گا اور نہ ہی ان کے عذاب و سزا میں معمولی سی بھی کمی ہو سکے گی۔

اس موقع پر خدا یا ملائکہ کی طرف سے خطاب ہوگا: ہاں! آج وہی جدائی کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے، "حق کی باطل سے جدائی، بدکاروں کی صفوں کی نیکوکاروں سے علیحدگی اور پروردگار بزرگ و برتر کے فیصلہ اور عدالت کا دن۔ (ھٰذا یوم الفصل الذی کنتم بہ تکذبون)۔

اس کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے جن میں قیامت کے دن کو یوم الفصل یا جدائی کے دن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کتنی عجیب، منہ بولتی اور وحشت ناک تعبیر ہے؟[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جب کفار قیامت میں اس دن کے بارے میں بات کریں گے تو اسے روزِ جزاء سے تعبیر کریں گے (یاویلنا ھٰذا یوم الدین) لیکن خدا یوم الفصل کے نام کے ساتھ اس کا ذکر کرتا ہے۔ (ھٰذا یوم الفصل)

ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق اس لحاظ سے ہو کہ مجرمین تو صرف اپنی سزا اور عذاب کے بارے میں سوچتے ہیں لیکن خدا ایک زیادہ وسیع معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی اقسام میں سے ایک سزا و عذاب کا مسئلہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ قیامت کا دن جدائیوں کا دن ہے۔ ہاں! بدکاروں کی صفوں کی نیکوکاروں سے جدائی جیسا کہ سورۂ یٰس کی آیہ ۵۹ میں بیان کیا گیا ہے۔

وامتازوا الیوم ایھا المجرمون

اے مجرمو! تم دوسروں سے الگ ہو جاؤ۔

کیونکہ یہ دارِ دنیا نہیں ہے، جس میں بدکار لوگ خود کو بندگانِ خدا کی صف میں قرار دیں اور کتنا دردناک ہے کہ وہ یہ مشاہدہ کریں گے کہ ان کے باایمان دوست و احباب، تعلق والے اور آل و اولاد ان سے جدا ہو کر جنت کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں وہ دن حق کی باطل سے جدائی کا دن ہے۔ اس روز سچے اور جھوٹے طرزِ عمل، مخالف عقیدے اور مختلف مکاتبِ فکر عالم دنیا کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ ملے گی۔

ان سب چیزوں سے قطع نظر وہ دن، روزِ فصل، فیصلے کے دن کے معنی میں ہے یعنی عالم و عادل خدا اپنے بندوں کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت انتہائی منصفانہ حکم صادر فرمائے گا اور یہ وہ موقع ہوگا کہ مشرکین کے لیے ہر طرح کی رسوائی فراہم ہوگی۔

المختصر۔ اس دنیا کی طبیعت و مزاج حق و باطل کی آمیزش ہے جبکہ قیامت کی طبیعت و مزاج ان دونوں کی ایک دوسرے سے جدائی ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں قیامت کا ایک نام۔ جس کا بارہا تکرار ہوا ہے۔ "یوم الفصل" ہے اصولی طور پر وہ دن جس میں

---

[1] دخان ـ ۴۰، مرسلات ۱۳، ۱۴، ۳۸، ۲۰ اور نبأ ۱۷

تمام چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہوجائیں گی۔ وہاں مختلف صفوں میں موجود لوگوں کی جدائی یقینی امر ہے۔
اس کے بعد خدا ان فرشتوں کو جو مجرموں کو دوزخ کی طرف چلانے پر مامور ہیں حکم دے گا: ظالموں اور ان کے مانند کام کرنیوالوں کو اور جن کی وہ پرستش کیا کرتے تھے سب کو جمع کر دو (احشروا الذین ظلموا و ازواجھم و ما کانوا یعبدون)۔

ہاں! جن کی وہ خدا کے سوا پرستش کیا کرتے تھے انھیں چلتا کر دو اور دوزخ کا راستہ دکھاؤ (من دون اللہ فاھدوھم الی صراط الجحیم)۔

"احشروا" "حشر" کے مادہ سے ہے اور مفردات میں راغب کے قول کے مطابق کسی گروہ کو اس کے مقام سے نکالنے اور انھیں میدانِ جنگ یا اسی قسم کی جگہ کی طرف روانہ کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ لفظ بہت سے مقامات پر جمع کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

بہرحال یہ گفتگو یا تو خدا کی طرف سے ہے یا فرشتوں کے ایک گروہ کی دوسرے گروہ سے ہے جو اکٹھا کرنے اور مجرموں کو دوزخ کی طرف چلانے پر مامور ہیں اور نتیجہ ایک ہی ہے۔

"ازواج" یہاں یا تو ان کی مجرم و بت پرست بیویوں کی طرف اشارہ ہے یا ان کے ہم فکر و ہم کار و ہم شکل لوگوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ دونوں معنی کے لیے آیا ہے، جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیہ، میں بیان ہوا ہے:

وکنتم ازواجا ثلاثۃ

تم قیامت کے دن تین گروہوں میں تقسیم ہوجاؤ گے۔

اس بنا پر مشرک مشرکوں کے ساتھ، بدکار و سیاہ دل اپنے جیسے بدکاروں اور سیاہ دلوں کے ساتھ اپنی اپنی صفوں میں جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔

یا اس سے وہ شیاطین مراد ہیں جو ان کے ہم شکل و ہم عمل تھے۔

اس کے باوجود یہ تینوں معانی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہوسکتا ہے کہ آیت کے مفہوم میں تینوں جمع ہوں۔

"ما کانوا یعبدون" مشرکین کے معبودوں کی طرف اشارہ ہے۔ چاہے وہ بت اور شیاطین ہوں یا فرعون و نمرود جیسے ظالم و جابر انسان ہوں اور "ما کانوا یعبدون" (وہ چیزیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے) کی تعبیر ہوسکتا ہے اس بنا پر ہو کہ ان کے معبود زیادہ تر بے جان اور غیر ذوی العقول موجودات ہی تھے اور یہ تعبیر اصطلاح کے مطابق "تغلیب" کے لیے ہے۔

"جحیم" دوزخ کے معنی میں "جحمه" (بروزن "ضربہ") کے مادہ سے "آگ بھڑکنے کی شدت" کے معنی سے لیا گیا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے: انھیں "صراط جحیم" کی طرف ہدایت کرو۔ کتنی عجیب عبارت ہے؟ ایک دن انھیں "صراط مستقیم" کی ہدایت کی گئی۔ لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا تو آج ان کی صراط جحیم کی طرف راہنمائی ہونا چاہیے اور وہ مجبور ہیں کہ اسے قبول کریں، یہ ایک ایسی گراں بار سرزنش ہے جو ان کی روح کی گہرائیوں کو جلا دے گی۔

۲۴۔ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ ○

۲۵۔ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ ○

۲۶۔ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ○

۲۷۔ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ○

۲۸۔ قَالُوا إِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ ○

۲۹۔ قَالُوا بَلْ لَمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ○

۳۰۔ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ ۖ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طَاغِينَ ○

۳۱۔ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا ۖ إِنَّا لَذَائِقُونَ ○

۳۲۔ فَأَغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ ○

ترجمہ

۲۴۔ انھیں روکو، ان سے پوچھ گچھ ہوگی۔

۲۵۔ تم ایک دوسرے سے مدد طلب کیوں نہیں کرتے؟

۲۶۔ لیکن وہ تو اس دن خدا کی قدرت کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوں گے۔

۲۷۔ (اور اس حالت میں) ایک دوسرے کی طرف منہ کرکے ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔

۲۸۔ ایک گروہ کہے گا (اے ہمارے گمراہ پیشواؤ) تم (ہمارے پاس) خیر خواہی اور نیکی کے بہانے سے آتے تھے (حالانکہ مکر و فریب کے سوا تمہارے پاس کچھ نہیں تھا)۔

۲۹۔ (وہ جواب میں) کہیں گے: تم خود ہی اہلِ ایمان نہیں تھے (ہمارا کیا قصور ہے)؟

۳۰۔ ہمارا تم پر کوئی اختیار نہ تھا بلکہ "تم خود ہی سرکش قوم تھے"۔

۳۱۔ اب خدا کا فرمان ہم سب پر مسلّم ہوگیا ہے اب تو ہم بھی اس کے عذاب کا مزہ چکھیں گے۔

۳۲۔ ہاں! ہم نے تمھیں گمراہ کیا ہے جیسا کہ ہم خود گمراہ تھے۔

تفسیر

دوزخ میں گمراہ پیشواؤں اور پیروکاروں کی گفتگو

جیسا کہ ہم گزشتہ آیات میں جان چکے ہیں کہ عذاب کے فرشتے ظالموں اور ان کے ہم خیالوں کو بتوں اور جھوٹے معبودوں کے ہمراہ اکٹھے چلتا کریں گے اور انھیں جہنم کی راہ پر ڈال دیں گے۔

اس بات کو جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس موقع پر خطاب ہوگا، "انھیں روکو" ابھی ان سے پوچھ گچھ ہونا ہے (وقفوهم انهم مسئولون)[1]

ہاں! انھیں رک کر مختلف سوالات کا جواب دینا ہے۔

لیکن ان سے کس چیز کے بارے میں سوال ہوگا؟

بعض نے تو کہا ہے کہ ان بدعتوں کے بارے میں جو انھوں نے قائم کی تھیں۔

بعض نے کہا ہے کہ ان کے بُرے اعمال اور خطاؤں کے بارے میں۔

بعض نے مزید کہا ہے کہ توحید اور لا الٰہ الا اللہ کے بارے میں۔

بعض نے کہا نعمتوں، جوانی، تندرستی، عمر، مال اور اسی قسم کی چیزوں کے بارے میں۔

ایک مشہور و معروف روایت میں جو سُنی شیعہ طرق سے منقول ہے، یہ کہا گیا ہے کہ:

علیؑ کی ولایت کے بارے میں سوال ہوگا[2]

البتہ یہ تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ اس دن ہر چیز کے بارے میں سوال ہوگا۔ عقائد، توحید، ولایت علیؑ گفتار و کردار اور ان نعمتوں کے بارے میں جو خدا نے انسان کو عطا فرمائی ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں پہلے دوزخ کی طرف کیوں چلتا کریں گے اور پھر انھیں پوچھ گچھ کے لیے کیوں ٹھہرائیں گے؟ کیا بازپرس اس کام سے پہلے نہیں ہونی چاہیے؟

اس سوال کا دو طرح سے جواب دیا جا سکتا ہے:

پہلا یہ کہ اس گروہ کا جہنمی ہونا تو سب پر واضح ہے یہاں تک کہ خود ان پر بھی۔ اور پوچھ گچھ اس بنا پر ہوگی تا کہ ان کے جرم کی

---

[1] "وقفوهم" وقف کے مادہ سے کبھی متعدی معنی میں استعمال ہوتا ہے (روک لینا اور بند کرنا) اور کبھی لازم کے معنی میں (رکنا اور کھڑا ہو جانا) پہلے کا مصدر "وقف" اور دوسرے کا "وقوف" ہے۔

[2] اس روایت کو "صواعق" میں ابو سعید خدری کے واسطے سے پیغمبر اکرمؐ سے اور اسی طرح حاکم ابوالقاسم حسکانی نے "شواہد التنزیل" میں آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے۔ عیون اخبار الرضا میں بھی یہ روایت امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے نقل ہوئی ہے۔

کیفیت وکمیت ان پر واضح کر دی جائے۔

دوسرا یہ کہ سوالات فیصلہ اور انصاف کرنے کے لیے نہیں ہوں گے بلکہ یہ ایک طرح کی سرزنش اور روحانی سزا ہے۔

البتہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے، سوالات ان سے مربوط ہوں لیکن اگر وہ بعد والی آیت کے ساتھ مربوط ہوں کہ ان سے یہ سوال ہوگا "تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے؟" تو اس صورت میں اس آیت میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی لیکن یہ تفسیر ان متعدد روایات کے ساتھ جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں، ہم آہنگ نہیں ہے۔ مگر یہ کہ یہ سوال بھی ان مختلف سوالات کا ایک جزء ہو جن سے یہ صورت اختیار کرتا ہے (غور کیجیے گا)۔

بہرحال جس وقت یہ بے بس دوزخی جہنم کی راہ پر چلتا کیے جائیں گے ان کا ہاتھ ہر طرف سے بے بس ہو جائے گا، انھیں کہا جائے گا: دنیا میں تو تم مشکلات کے وقت ایک دوسرے کی پناہ لیتے تھے اور دوسرے سے مدد طلب کرتے تھے "اب یہاں ایک دوسرے سے مدد کیوں نہیں مانگتے۔ (ما لکم لا تناصرون)۔

ہاں! تم دنیا میں جتنے سہارے اپنے لیے خیال کرتے تھے یہاں وہ سب ختم ہو گئے۔ تم ایک دوسرے سے مدد لے سکتے ہو نہ ہی تمھارے معبود تمھاری مدد کو آسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو خود بے بس اور گرفتار ہوں گے۔

کہتے ہیں کہ ابوجہل نے بدر کے دن کہا تھا:

نحن جمیع منتصر

ہم سارے ایک دوسرے کی مدد سے مسلمانوں پر کامیاب ہوں گے۔

قرآن مجید نے اس کی گفتگو سورۂ قمر کی آیہ ۴۴ میں بیان کی ہے۔

ام یقولون نحن جمیع منتصر

لیکن قیامت میں ابوجہل اور اس کے ہم صفت لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ اب تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوگا اور رسوا کن سکوت کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے۔

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے:

بلکہ وہ تو اس دن خضوع وخشوع کے ساتھ سرتسلیم خم کیے ہوں گے اور مخالفت تو کجا ان میں اظہار وجود کی بھی سکت نہ ہوگی (بل ھم الیوم مستسلمون)۔[1]

---

[1] "استسلام" "سلامت" کے مادہ سے باب "استفعال" کے تقاضے کے مطابق سلامتی طلب کرنے کے معنی میں ہے جو عام طور پر ایک عظیم قدرت کے سامنے ہوتے وقت سرتسلیم خم کی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس موقع پر وہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں گے اور ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن میں ڈالنے کے لیے بضد ہوگا۔ پیروی کرنے والے، اپنے پیشواؤں اور سربراہوں کو قصوروار ٹھہرائیں گے اور پیشوا اپنے پیروکاروں کو جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ ایک دوسرے کی طرف رُخ کریں گے اور ایک دوسرے سے سوال کریں گے (واقبل بعضہم علٰی بعض یتساءلون)۔

گمراہ پیروکار اپنے گمراہ کرنے والے پیشواؤں سے "کہیں گے، تم شیطان صفت نصیحت، خیر خواہی اور ہمدردی کے نام پر اور ہدایت و رہنمائی کے بہانے ہمارے پاس آتے تھے" لیکن تمھارے کام میں مکر و فریب کے سوا اور کچھ نہیں تھا (قالوا انکم کنتم تأتوننا عن الیمین)۔

ہم تو فطرت کے تقاضے کے مطابق نیکی، پاکیزگی اور سعادت کے طالب تھے لہٰذا ہم نے تمھاری دعوت پر لبیک کہا، ہمیں خبر نہ تھی کہ اس خیر خواہی کے چہرے کے پیچھے شیطان صفت چہرہ چھپا ہوا ہے، جو ہمیں بدبختی کے گڑھے میں گرا دے گا۔ ہاں! ہمارے سارے کے سارے گناہ تمھاری ہی گردن پر ہیں۔ ہمارا تو حسنِ نیت اور پاک دلی کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا اور تم شیطان صفت جھوٹوں کے پاس بھی مکر و فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔

"یمین" کا لفظ جو "دایاں ہاتھ" یا "دائیں سمت" کے معنی میں ہے، عربوں میں بعض اوقات خیر و برکت اور نصیحت کے لیے کنائے کے طور پر بولا جاتا ہے اور اصولی طور پر عربوں کو جو کچھ دائیں طرف سے آتا تھا اسے "نیک فال" سمجھتے تھے۔ اسی لیے بہت سے مفسرین نے "کنتم تأتوننا عن الیمین" کا معنی خیر خواہی اور نصیحت کا اظہار لیا ہے۔

بہر حال یہ ایک عمومی رواج ہے کہ دائیں عضو اور دائیں طرف کو محترم اور بائیں کو غیر محترم خیال کرتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ "یمین" نیکیوں اور خیرات کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

کچھ مفسرین نے یہاں ایک دوسری تفسیر بھی بیان کی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم طاقت اور اقتدار کے بل بوتے پر ہمارے پاس آتے تھے کیونکہ دائیں سمت عام طور پر زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ اہم کام دائیں ہاتھ سے ہی انجام دیتے ہیں اس لیے یہ تعبیر "طاقت" کے لیے کنائے کے طور پر آئی ہے۔

دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں جو مذکورہ بالا دونوں تفسیروں کی طرف ہی لوٹتی ہیں لیکن بلا شک و شبہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

بہر حال ان کے پیشوا بھی خاموش نہیں رہیں گے اور جواب میں "کہیں گے تم تو خود ہی اہلِ ایمان نہیں تھے" (قالوا بل لم تکونوا مؤمنین)۔

اگر تمھارا مزاج آمادۂ انحراف نہ ہوتا، اگر تم خود ہی شر و شیطنت کے طالب نہ ہوتے تو ہمارے پاس کہاں آتے؟ تم نے انبیاء اور نیک و پاک لوگوں کی دعوت کو قبول کیوں نہ کیا؟ ہمارے ایک ہی اشارے پر تم سر کے بل کیوں دوڑ پڑے؟ پس معلوم ہوتا ہے

کہ خود تمھیں میں عیب تھا۔ جاؤ اور خود اپنے آپ کو ملامت کرو اور جو لعن طعن کرنا چاہتے ہو خود کو کرو۔

ہماری دلیل واضح ہے "ہم کسی قسم کا تسلط تم پر نہیں رکھتے تھے اور ہم نے تم پر کوئی جبر اور زبردستی نہیں کی تھی (وما کان لنا علیکم من سلطان)۔

"بلکہ تم خود ہی ایک سرکش اور حد سے بڑھنے والی قوم تھے اور تمھاری ستم گری کی عادت تمھاری بدبختی کا سبب بنی (بل کنتم قومًا طاغین)۔

کتنی دردناک ہے یہ بات کہ انسان یہ دیکھے کہ اس کا وہ رہبر و پیشوا جس کا وہ ایک عمر تک دل سے عقیدت مند رہا تھا، اس نے اس کی بدبختی کے اسباب فراہم کیے ہیں اس کے بعد اس طرح سے اس سے بیزاری اختیار کر رہا ہے اور تمام گناہ اس کی گردن پر ڈال رہا ہے اور خود کو بالکل بری الذمہ قرار دے رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ ایک جہت سے سچ کہہ رہے ہوں گے نہ تو یہ بے گناہ ہیں اور نہ ہی وہ، ان کی طرف سے گمراہ کرنا اور شیطنت تھی اور ان کی طرف سے گمراہی کو اپنانا اور تسلیم کرنا تھا۔

لہٰذا ان باتوں کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور آخر کار یہ پیشوا اس حقیقت کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے: "اسی بنا پر، ہمارے پروردگار کا فرمان ہم سب پر لاگو ہو گیا ہے اور عذاب کا حکم سبھی کے لیے صادر ہو گیا ہے اور ہم سب اس کے عذاب کا مزہ چکھیں گے" (فحق علینا قول ربنا انا لذائقون)۔

تم سب کے سب سرکش تھے اور سرکشوں کا انجام یہی ہے اور بھی گمراہ اور گمراہ کرنے والے تھے۔

ہم نے تمھیں بھی گمراہ کیا ہے اور ہم تو خود گمراہ تھے ہی" (فاغوینٰکم انا کنا غاوین)۔

اس بنا پر اس میں تعجب کی کون سی بات ہے کہ ہم سب کے سب ان مصیبتوں اور عذاب میں شریک رہیں؟

چند اہم نکات

۱۔ ولایت علیؑ کے بارے میں بھی سوال ہوگا: ۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں آیہ "وقفوھم انھم مسؤلون" کی تفسیر کے بارے میں ایسی متعدد روایات وارد ہوئی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس دن مجرموں سے جو سوال پوچھے جائیں گے ان میں سے ایک (اہم سوال) امیر المومنین علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے میں ہوگا۔

شیخ طوسی اپنی کتاب "امالی" میں انس بن مالک کے واسطے سے پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل کرتے ہیں: ۔

اذا کان یوم القیامة و نصب الصراط علی جهنم لم یجز علیه الا من معه جواز فیه ولایة علی بن ابی طالب و ذٰلك قوله تعالیٰ: وقفوهم

انھم مسئولون یعنی عن ولایۃ علی بن ابی طالب (ع)

جب روز قیامت ہوگا اور صراط جہنم کے اوپر نصب کر دی جائے گی تو اس کے اوپر سے کوئی بھی عبور نہ کر سکے گا سوائے اس شخص کے جس کے ہاتھ میں ایسا پروانہ ہو کہ جس میں ولایت علیؑ ثبت ہو اور یہی وہ چیز ہے جس کے بارے میں خدا نے فرمایا ہے: وقفوھم انھم مسئولون [1]

اہل سنت کی بھی بہت سی کتابوں میں اس آیت کی یہ تفسیر موجود ہے کہ علیؑ بن ابی طالب کی ولایت کے بارے میں سوال ہوگا ابن عباس اور ابو سعید خدری کے واسطے سے پیغمبر گرامی اسلامؐ سے یہ روایات نقل ہوئی ہیں۔ اہلِ سنت کے جن حضرات نے اس حدیث کو نقل کیا ہے ان میں سے کچھ علماء یہ ہیں:۔

ابن حجر ہیثمی، صواعق محرقہ میں۔ (ص ۔ ۱۴۷)

عبدالرزاق حنبلی (کشف الغمہ، ص ۹۲ پر ان کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے)۔

علامہ سبط ابن جوزی، تذکرہ (ص ۲۱) میں۔

آلوسی روح المعانی میں، زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

ابو نعیم اصفہانی (کفایۃ الخصال ص ۱۰۶ کے مطابق) [2]

البتہ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے، اس قسم کی روایات آیات کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتیں بلکہ حقیقت میں آیات کے واضح مصداق کو بیان کرتی ہیں۔ اس بنا پر کوئی امر مانع نہیں ہے کہ سوال تو تمام عقائد کے بارے میں ہی ہو لیکن چونکہ عقائد کی بحث میں ولایت کا مسئلہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لہٰذا اسے خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ولایت ایک عام دوستی یا خشک اعتقاد کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد پیغمبر گرامی اسلامؐ کے بعد اعتقادی، عملی، اخلاقی اور اجتماعی مسائل میں علی علیہ السلام کی رہبری اور امامت کو قبول کرنا ہے۔ وہ مسائل جن کے نمونے نہج البلاغہ کے فصیح و بلیغ خطبوں اور آپؑ سے منقول کلمات و ارشادات میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ ایسے مسائل ہیں جن پر ایمان لانا اور ان کے مطابق عمل کرنا، دوزخیوں کی صف سے نکلنے اور پروردگار کی صراطِ مستقیم میں قرار پانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔

۲۔ **گمراہ پیشوا اور پیروکار:** ان آیات میں اور قرآن مجید کی دوسری آیات میں قیامت کے دن یا جہنم میں گمراہ پیشواؤں اور پیروکاروں کے آپس میں جھگڑنے کے بارے میں کچھ معنی خیز اشارے کیے گئے ہیں۔

یہ ان تمام لوگوں کے لیے جو اپنی عقل اور دین کو گمراہ رہبروں کے اختیار میں دے دیتے ہیں ایک سبق آموز تنبیہ ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۰۱

[2] اس بارے میں مزید معلومات کے لیے، بہترین کتاب "احقاق الحق" جلد ۳ (طبع جدید) ص ۱۴۴ اور المراجعات ص ۵۸ (مراجعہ ۱۲) کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس دن اگرچہ ہر شخص یہی کوشش کرے گا کہ دوسرے سے برات کرے، یہاں تک کہ اپنا گناہ بھی دوسرے ہی کی گردن پر ڈال دے لیکن اس کے باوجود کوئی بھی اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے گا۔

زیر بحث آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ گمراہ کرنے والے پیشوا اپنے تابعین کو صراحت کے ساتھ کہیں گے کہ تم پر ہمارے اثر کا اصل سبب خود تمھاری سرکشی ہی تھی (بل کنتم قوما طاغین)

اس سرکشی ہی نے ہماری طرف سے گمراہ کرنے کا میدان ہموار کیا اور اسی سے وہ انحرافات جو ہم میں پائے جاتے تھے تمھاری طرف منتقل کرنے پر ہم قادر ہوئے۔ (فاغوینا کم انا کنا غاوین)

" اغوا " " غی " کے مادہ سے ہے۔ اس کے دقیق معنی پر غور کیا جائے تو مطلب اور بھی زیادہ واضح و روشن ہو جاتا ہے کیونکہ " غی " " مفردات " میں " راغب " کے قول کے مطابق اس جہالت کے معنی میں ہے، جس کا سرچشمہ فاسد عقیدہ ہو۔ یہ گمراہ پیشوا عالم ہستی اور زندگی کے حقائق سے بے خبر رہ گئے اور اس جہالت اور اعتقاد فاسد کو اپنے ان پیروکاروں میں منتقل کر دیا جو فرمانِ خدا کے مقابلہ میں پہلے ہی سرکش کیے ہوئے تھے۔

اسی بنا پر وہاں یہ اعتراف کریں گے کہ وہ خود بھی عذاب کے مستحق ہیں اور ان کے پیروکار بھی (فحق علینا قول ربنا انا لذائقون) لفظ " رب " کا خاص طور پر ذکر کرنا پر معنی ہے، یعنی انسان کا معاملہ اس حد تک پہنچ جائے گا کہ وہ خدا جو اس کا مالک و مربّی ہے اور جو اس کی بھلائی اور نیکی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا، اسے اپنے دردناک عذاب کا مستحق قرار دے دیگا اور یقیناً یہ بھی اس کی ربوبیت کی ایک شان ہے۔

۳۳۔ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ○

۳۴۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ○

۳۵۔ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ○

۳۶۔ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ○

۳۷۔ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ○

۳۸۔ اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ○

۳۹۔ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۴۰۔ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ○

ترجمہ

۳۳۔ وہ سب کے سب (گمراہ پیشوا اور پیروکار) اس دن عذاب میں مشترک ہوں گے۔

۳۴۔ ہاں! ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں۔

۳۵۔ وہ ایسے تھے کہ جب ان سے "لا الٰہ الا اللہ" کہا جاتا تھا تو وہ تکبر کیا کرتے تھے۔

۳۶۔ اور ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ: کیا ہم اپنے خداؤں کو ایک دیوانے شاعر کی خاطر چھوڑ دیں؟

۳۷۔ (جبکہ) ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ تو حق لے کر آیا ہے اور اس نے گزشتہ پیغمبروں کی تصدیق کی ہے۔

۳۸۔ لیکن تم (دل کے اندھے متکبر) یقینی طور پر (خدا کے) دردناک عذاب کا مزہ چکھو گے۔

۳۹۔ اور جو اعمال تم انجام دیا کرتے تھے بدلہ تو تمھیں صرف اسی کا ملے گا۔

۴۰۔ پروردگار کے مخلص بندوں کے سوا (جو اس تمام عذاب اور سزا سے محفوظ رہیں گے)

تفسیر

گمراہ پیشواؤں اور ان کے پیروکاروں کا انجام

قیامت کے دن جہنم کے پاس گمراہ پیروکاروں اور پیشواؤں کے جھگڑا کرنے کے بیان کے بعد۔ اب زیر بحث آیات میں دونوں گروہوں کا انجام ایک ہی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ نیز ان کی بدبختی کے عوامل کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ ان میں گویا مرض بیان بھی ہے اور علاج کا ذکر بھی۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ سب کے سب، پیرو اور پیشوا، اس دن عذابِ الٰہی میں مشترک ہوں گے (فانّھم یومئذٍ فی العذاب مشترکون)۔

البتہ ان کا عذاب میں مشترک ہونا، دوزخ اور عذابِ الٰہی میں ان کے مختلف درجات میں مانع نہیں ہے۔ کیونکہ یقینی طور پر ایسا شخص جو ہزارہا انسانوں کی گمراہی اور انحراف کا سبب بنا ہے ہرگز سزا اور عذاب میں ایک عام گمراہ فرد کے برابر نہیں ہوگا۔

یہ آیت حقیقت میں سورۂ مومن کی آیہ ۴۸ کے مانند ہے کہ جس کے مطابق متکبرین کمزور عقیدہ لوگوں کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کے بعد کہیں گے:

قال الذین استکبروا انّا کلّ فیھا ان اللّٰہ قد حکم بین العباد

اب تو ہم سب ہی دوزخ میں ہیں کیونکہ خدا نے اپنے بندوں کے درمیان عادلانہ فیصلہ کردیا ہے۔

اور یہ بات سورہ عنکبوت کی آیہ ۱۲ سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی جس میں فرمایا گیا ہے:

ولیحملنّ اثقالھم و اثقالًا مع اثقالھم

وہ قیامت کے دن اپنا سنگین بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے اور ان کے اپنے سنگین بار پر دوسروں کے بار کا بھی اضافہ ہوگا۔

جو دوسروں کو گمراہ کرنے اور گناہ کی طرف مائل کرنے اور بدعت کی بنیاد رکھنے کے نتیجہ میں حاصل ہوا ہے۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے قرآن فرماتا ہے: ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں (انّا کذالك نفعل بالمجرمین)۔

یہ ہماری ہمیشہ کی سنت ہے، وہ سنت جو قانون عدالت سے پیدا ہوئی ہے۔

اس کے بعد ان کی بدبختی کی اصل بنیاد کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ ایسے تھے کہ جب کلمہ توحید اور لا الٰہ الّا اللّٰہ ان سے کہا جاتا تھا تو وہ تکبر و استکبار کرتے تھے (انّھم کانوا اذا قیل لھم لا الٰہ الّا اللّٰہ یستکبرون)۔

ہاں! ان کے تمام انحرافات کی اصل جڑ بنیاد، تکبّر اور خود کو برتر سمجھنا، حق کو قبول نہ کرنا، غلط طریقوں اور باطل کی پیروی پر اصرار اور ہٹ دھرمی کرنا اور اس کے علاوہ تمام چیزوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا تھا۔

روحِ استکبار کا مدّمقابل حق کے سامنے انکساری اور سرِ تسلیم خم کرنا ہی ہے اور حقیقتاً اسلام یہی ہے اور بس۔ وہ استکبار بدبختی کا باعث ہے اور یہ خضوع و تسلیم، سعادت کا موجب ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں، عذابِ الٰہی استکبار کے ساتھ مربوط بیان ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ احقاف کی آیہ ۲۰ میں ہے:۔

فالیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق

آج کے دن ذلیل کرنے والا عذاب تمھاری جزا ہے، کیونکہ تم زمین میں ناحق استکبار کیا کرتے تھے۔

جبکہ وہ اپنے اس عظیم گناہ کے لیے بدتر از گناہ عذر پیش کیا کرتے تھے اور ہمیشہ یہی کہتے تھے: کیا ہم اپنے خداؤں اور بتوں کو ایک دیوانے شاعر کے لیے چھوڑ دیں؟ (و یقولون ائنا لتارکوا الھتنا لشاعر مجنون)۔

وہ رسول اللہؐ کو اس لیے شاعر کہتے تھے کہ آپ کی باتیں اس طرح دلوں پر اثر کرتی تھیں اور انسانوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں کہ جیسے آپ بہترین اشعار پڑھ رہے ہوں، حالانکہ آپ کی باتیں بالکل شعر نہیں تھیں اور انھیں مجنون اس لیے کہتے تھے کہ آپؐ ماحول کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے تھے اور وہ ہٹ دھرم متعصب لوگوں کے بیہودہ عقائد کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ ایسا کام تھا جو گمراہ عوام کی نگاہ میں ایک قسم کی جنون آمیز خودکشی تھی۔ حالانکہ پیغمبرؐ کا عظیم افتخار یہی ہے کہ آپؐ ان حالات کے سامنے نہیں جھکے۔

اس کے بعد قرآن ان بے بنیاد باتوں کی نفی کرنے اور پیغمبر اکرمؐ کی رسالت اور مقامِ وحی کا دفاع کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: ایسا نہیں ہے وہ تو حق لے کر آیا ہے اور اس نے گزشتہ پیغمبروں کی تصدیق کی ہے۔ (بل جاء بالحق و صدّق المرسلین)۔

ایک طرف تو اس کی گفتگو کے مطالب اور دوسری طرف اس کی انبیاء کی دعوت کے ساتھ ہم آہنگی اس کی گفتگو کی صداقت کی دلیل ہے۔

لیکن اے دل کے اندھے مستکبر، اور بدزبان گمراہو! تم یقینی طور پر خدا کا دردناک عذاب چکھو گے (انکم لذائقوا العذاب الالیم)

لیکن کہیں یہ گمان نہ کرلینا کہ خدا بھی انتقام جو ہے اور وہ تم سے اپنے پیغمبر کا انتقام لینا چاہتا ہے ایسا نہیں ہے، بلکہ "جو اعمال تم انجام دیا کرتے تھے بدلہ تو تمھیں صرف اسی کا ملے گا (وما تجزون الّا ما کنتم تعملون)۔
حقیقت میں وہ تمھارے اعمال ہی ہوں گے جو تمھارے سامنے مجسم ہو جائیں گے اور تمھارے ساتھ رہیں گے۔ اور تمھیں آزار پہنچاتے رہیں گے، تمھارا عمل ہی تمھاری سزا ہے، وہی استکبار و کفر و بے ایمانی، وہی آیاتِ الٰہی اور اس کے پیغمبر پر شاعری اور جنون کی تہمت باندھنا، وہی ظلم و زیادتی، بے انصافیاں اور بُرے کام۔

آخری زیر بحث آیت میں آئندہ کے مباحث کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہے۔ اس میں ایک گروہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پروردگار کے مخلص بندوں کے سوا، جو اس تمام تر سزا و عذاب سے دور اور محفوظ رہیں گے (الّا عباد الله المخلصین)۔[1]
لفظ "عباد الله" اکیلا ہی اس گروہ کے خدا سے ربط کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن جب "مخلصین" بھی اس کے ساتھ ہو تو اس میں ایک اور ہی گہرائی اور جان ڈال دیتا ہے۔ وہ لفظ "مخلَص" اسم مفعول کی صورت میں، وہ شخص جسے خدا نے خالص کیا ہے۔ ہر قسم کے شرک و ریا سے خالص، اور ہر قسم کے شیطانی وسوسوں اور ہوائے نفس کی ملاوٹوں سے خالص۔
ہاں! صرف یہی گروہ ہے کہ جسے اس کے اعمال کی ہی جزا نہیں ملے گی بلکہ خدا اس سے اپنے فضل و کرم کے ساتھ پیش آئے گا اور وہ بے حساب اجر حاصل کریں گے۔

نکتہ: مخلصین کا اجر و ثواب

قرآن کریم کی آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "مخلِص" زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوا ہے، جب انسان تربیت و اصلاح اور خود سازی کے مرحلوں میں ہوتا ہے اور ابھی ضروری تکامل و ارتقاء کی منزل تک پہنچا ہوا نہیں ہوتا۔ لیکن "مخلَص" اس مرحلے کے لیے کہا جاتا ہے، جب انسان ایک مدت تک جہاد بالنفس کرنے اور معرفت و ایمان کے مراحل طے کرنے کے بعد اس منزل پر فائز ہو جاتا ہے جہاں شیطان کے وسوسوں کے اثر سے محفوظ ہو جاتا ہے جیسا کہ قرآن ابلیس کے قول کو نقل کرتا ہے۔

فبعزتك لاغوینھم اجمعین الّا عبادك منھم المخلصین

تیری عزت کی قسم! تیرے مخلص بندوں کے سوا۔ میں ان سب کو گمراہ کردوں گا (ص ۸۲، ۸۳)

یہ جملہ جو بارہا قرآن کی آیات میں آیا ہے "مخلصین" کے مقام کی عظمت کو واضح کرتا ہے۔ یہ یوسفؑ جیسے صدیق افراد کا مقام ہے جو عظیم آزمائش کے میدان کو عبور کرتے ہیں:

کذالك لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصین

ہم نے یوسفؑ کو اس طرح سے اپنی برہان دکھائی تاکہ برائی اور بدی کو ہم اس سے دور کردیں،

---

[1] یہ جملہ استثناء منقطع کی شکل میں ہے جو "تجزون" کی ضمیر یا "لذائقوا" کی ضمیر سے استثناء ہے۔

کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا (یوسف۔ ۲۴)

یہ ان لوگوں کا مقام ہے جو جہاد اکبر میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور لطفِ پروردگار کا ہاتھ، تمام غیر خالص باتوں کو ان کے وجود سے پاک کر دیتا ہے اور حوادث کی بھٹی میں وہ اس طرح سے پگھل جاتے ہیں کہ معرفتِ خالص کے سونے کے سوا ان میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ان کا اجر عمل کے معیار پر نہیں ہوتا بلکہ خدا کے فضل و رحمت کے معیار پر ہوتا ہے۔

علامہ طباطبائی نے اس مقام پر ایک بات کہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

خدا زیر بحث آیت میں فرماتا ہے تمام لوگ اپنے اعمال کا اجر پائیں گے ، خدا کے مخلص بندوں کے سوا۔

کیونکہ وہ اپنی عبودیت کی بنا پر خود کو کسی چیز کا مالک نہیں سمجھتے اور جو کچھ خدا چاہتا ہے اس کے سوا کسی اور چیز کا ارادہ نہیں کرتے اور جس چیز کا وہ مطالبہ کرتا ہے اس کے سوا کسی اور چیز کو انجام نہیں دیتے۔

مخلص ہونے کی بنا پر خدا نے انھیں اپنے لیے منتخب کر لیا ہے، وہ اس کی پاک ذات کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے۔ ان کے دل میں اللہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے، نہ زرق و برق دنیا ہے اور نہ ہی آخرت کی نعمتوں کا خیال۔

اب یہ بات واضح ہے کہ جو شخص ان صفات کا حامل ہے اس کی لذت و نعمت اور روزی ایسی چیز ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہے۔ جیسا کہ بعد والی آیات میں بیان ہوا ہے:

اولئك لهم رزق معلوم

ان کی روزی ایسی خاص اور مخصوص ہے کہ جو دوسروں سے جدا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ بھی دوسرے اہلِ بہشت کی طرح بہشت میں زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ان کا حصہ دوسروں کے حصے کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔ (وہ خدا کی پاک ذات کے جلووں سے باطنی لذات سے محظوظ ہوتے ہیں اور ان کا دل اس کے بے پایاں شوق سے لبریز ہوتا ہے اور وہ اس کے عشق و وصال میں غرق ہوتے ہیں) [1]

---

[1] المیزان جلد ۱۷ ص ۱۴۱

۴۱۔ أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ۝

۴۲۔ فَوَاكِهُ ۖ وَهُم مُّكْرَمُونَ ۝

۴۳۔ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝

۴۴۔ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ۝

۴۵۔ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ۝

۴۶۔ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ۝

۴۷۔ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ۝

۴۸۔ وَعِندَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ ۝

۴۹۔ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ۝

ترجمہ

۴۱۔ ان (مخلص بندوں) کے لیے ایک خاص اور معین روزی ہے۔

۴۲۔ (قسم قسم کے عمدہ عمدہ) پھل اور وہ معزز و محترم ہوں گے۔

۴۳۔ (بہشت کے) پُر نعمت باغوں میں۔

۴۴۔ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے (بیٹھے ہوں گے)۔

۴۵۔ ان کے گرد شراب طہور سے لبریز پیالوں کا دور ہوگا۔

۴۶۔ وہ شراب جو سفید چمکدار اور پینے والوں کے لیے لذت بخش ہوگی۔

۴۷۔ وہ شراب جس میں نہ عقل کو فاسد کرنے والی کوئی چیز ہوگی اور نہ ہی وہ مست کرنے والی ہوگی۔

۴۸۔ ان کی ایسی بیویاں ہوں گی جو اپنے شوہر کے سوا کسی اور سے عشق و محبت نہ کریں گی۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی (اور حسین) ہوں گی۔

۴۹۔ گویا وہ (لطافت اور سفیدی میں) پرندے کے ان انڈوں کے مانند ہیں (جو پرندے کے پر و بال کے نیچے) چھپے رہے ہوں۔ (اور کسی انسان کے ہاتھ نے انھیں چھوا تک نہ ہو)۔

تفسیر

بہشت کی نعمتوں کا ایک گوشہ

گزشتہ بحث کی آخری آیت میں "عباد اللہ المخلصین" کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ زیر بحث آیات ان بے شمار نعمتوں کو بیان کر رہی ہیں جو خدا ان کو عطا فرمائے گا۔ ان نعمتوں کا سات حصّوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلے قرآن کہتا ہے: ان کے لیے معلوم و معین روزی ہے (اولئك لهم رزق معلوم)۔

کیا یہ انھی نعمتوں کا خلاصہ ہے جن کی بعد والی آیات میں تشریح ہوئی ہے اور وہ انھی نعمتوں کو بیان کر رہی ہیں جو یہاں سربستہ اور اجمالی طور پر بیان ہوئی ہیں؟

یا یہ ان نامعلوم اور ناقابلِ توصیف نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو نعماتِ بہشت کا سرنامہ بن گئی ہیں؟

بعض مفسّرین نے اس کی پہلی صورت میں تفسیر کی ہے جب کہ بعض دوسروں نے اس کی دوسری صورت میں تفسیر کی ہے۔

بحث کی مناسبت اور نعمتوں کی جامعیت دوسرے معنی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اس طرح سے ان سات نعمتوں میں سے سب سے پہلے زیر بحث آیات میں بیان ہونے والی نعمتیں۔ معنوی نعمتیں، روحانی لذتیں اور حق تعالیٰ کی ذات پاک کے جلوؤں کا دیدار اور اس کے عشق کے بادہ طہور سے سرمست ہونا ہے۔ وہی لذت جسے دیکھے بغیر کوئی نہیں جانتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن کی آیات میں جنت کی نعمات تو تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، لیکن معنوی نعمتوں اور روحانی لذتوں کا بیان سربستہ اور اجمالی صورت میں کیا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی نعمات تو قابلِ توصیف و تعریف ہیں۔ جبکہ دوسری تعریف توصیف میں نہیں آسکتیں۔

"رزق معلوم" کے معنی کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ کیا اس کا وقت معلوم ہے؟ کیا وہ باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں؟ کیا اس کی تمام خصوصیات معلوم ہیں؟ اس ضمن میں ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس کی بنا پر کلمہ "معلوم" ایک سربستہ تعبیر ہے ان نعمات کی جن کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد دوسری نعمتوں کا بیان شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے قرآن بہشت کی نعمتوں کا نام لیتا ہے۔ نعمتیں بھی ایسی جو بہشتیوں کو انتہائی احترام کے ساتھ دی جائیں گی، فرماتا ہے: ان کے لیے طرح طرح کے پھل ہیں (فواکه)۔

اور وہ مکرم و محترم ہیں (و ھم مکرمون)۔
ان حیوانوں کی طرح نہیں جن کے سامنے ان کا چارہ ڈال دیا جاتا ہے، بلکہ معزز مہمانوں کی طرح انتہائی احترام کے ساتھ ان کی پذیرائی ہوگی۔

طرح طرح کے پھلوں کی نعمت اور احترام و اکرام کے بیان کے بعد، ان کی رہائش گاہ کا ذکر ہوتا ہے۔ فرمایا گیا ہے:
ان کے ٹھہرنے کی جگہ بہشت کے سرسبز اور پر نعمت باغات ہیں (فی جنات النعیم)۔
جو نعمت بھی وہ چاہیں گے وہاں موجود ہے اور جو کچھ وہ ارادہ کریں گے ان کے سامنے حاضر ہے۔
چونکہ انسان کے لیے عظیم ترین لذتوں میں سے ایک بے تکلف، مخلص و باصفا دوستوں کی محبت بھری محفل ہے لہٰذا چوتھے مرحلے میں اس نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے ہو تختوں کے اوپر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے اور آنکھوں سے آنکھیں ملی ہوئی ہوں گی (علٰی سرر متقابلین)۔
وہ ہر موضوع پر بات کریں گے۔ کبھی دنیا میں اپنے ماضی کے بارے میں اور کبھی آخرت میں پروردگار کی عظیم نعمتوں کے متعلق، کبھی خدا کے صفات جمال و جلال کی بات کریں گے اور کبھی اولیاء کے مقامات اور ان کی کرامات کی اور دوسرے ایسے مسائل کے بارے میں جن سے ہم اس دنیا کے قیدیوں کے لیے آگاہی ممکن نہیں ہے۔
"سرر" "سریر" کی جمع ہے یہ ایسے تختوں کو کہا جاتا ہے جن پر مجلس سرور و انس میں بیٹھا کرتے تھے۔ بعض اوقات زیادہ وسیع معنی میں بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی میت کے تابوت کو بھی "سریر" کہہ دیا جاتا ہے۔ شاید اس امید پر کہ وہ اس کے لیے خدا کی مغفرت اور بہشت جاوداں کی طرف جانے کے لیے، سرور و خوشی کی سواری بن جائے۔

نعمات جنت کے ذکر کے پانچویں مرحلے میں مشروبات اور شراب طہور کی بات ہو رہی ہے، فرمایا گیا ہے: شراب طہور کے لبریز پیالے ان کے گرد گھوم رہے ہیں اور جب بھی وہ ارادہ کرتے ہیں پیمانے سے سیراب ہوتے ہیں اور نشاط و معنویت کے عالم میں ڈوب جاتے ہیں (یطاف علیھم بکأس من معین)۔
یہ جام کسی گوشے میں پڑے ہوئے نہیں ہوں گے کہ وہ ان میں سے ایک جام کا تقاضا کریں بلکہ "یطاف علیھم" کی تعبیر کے مطابق، ان کے گرد گھمائے جا رہے ہوں گے۔
"کأس" (بروزن رأس) اہل لغت کے نزدیک اس ظرف کو کہا جاتا ہے جو پر اور لبریز ہو اور اگر وہ خالی ہو تو عام طور پر اسے "قدح" کہتے ہیں۔ راغب مفردات میں کہتا ہے:

الکأس الاناء بما فیہ من الشراب

کأس اس ظرف کو کہتے ہیں جو کسی پینے کی چیز سے بھرا ہوا ہو۔

"معین" "معن" (بروزن "صحن") کے مادہ سے، جاری کے معنی میں ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں

شرابِ طہور کے چشمے جاری ہیں۔ جن سے ہر لمحہ پیالے بھر سکتے ہیں اور اہلِ بہشت کے گرد اگر دا نہیں گردش دی جائے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ شرابِ طہور ختم ہو جائے یا اسے مہیا کرنے کے لیے زحمت اٹھانا پڑے یا وہ پرانی، خراب اور فاسد ہو جائے۔

اس کے بعد اس شرابِ طہور کے برتنوں کی تعریف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ سفید چمکدار ہیں اور پینے والوں کے لیے لذت بخش ہیں۔ (بیضاء لذۃ للشاربین)۔

بعض مفسرین نے "بیضاء" کو اس شراب کے "ظروف" کی صفت قرار دیا ہے اور بعض نے خود "شرابِ طہور" کی صفت کہا ہے یعنی یہ شراب دنیا کی خوش رنگ شرابوں کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی شراب ہے جو پاک ہے اور شیطانی رنگوں سے پاک سفید و شفاف ہے۔

البتہ دوسرا معنی "لذۃ للشاربین" کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

چونکہ شراب، پیمانہ اور اس قسم کی چیزوں کا نام ممکن ہے کچھ اور مفاہیم کو ذہنوں کی طرف دعوت دے اس لیے بعد والی آیت میں بلا فاصلہ ایک مختصر اور واضح جملے کے ساتھ ان تمام مفاہیم کو سننے والوں کے اذہان سے ہٹاتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ شرابِ طہور نہ تو فسادِ عقل کا سبب ہے اور نہ ہی مستی کا موجب (لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون)۔

اس میں ہوشیاری و نشاط اور لذتِ روحانی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

"غول" (بروزن "قول") اصل میں اس فساد کے معنی میں ہے جو پنہاں طور پر کسی چیز میں اُتر جائے اور یہ جو عربی ادب میں مخفی اور پوشیدہ قتل کو "غیلۃ" کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہے۔

"ینزفون" اصل میں "نزف" (بروزن "حذف") کے مادہ سے، کسی چیز کو تدریجی صورت میں ختم کرنے کے معنی میں ہے، یہ لفظ جس وقت کنوئیں کے پانی کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ پانی کو تدریجاً کنوئیں سے نکالیں یہاں تک کہ وہ ختم ہو جائے۔ تدریجی طور پر خون نکلنے کے موقع پر بھی جو بدن کے سارے خون کے گرانے پر ختم ہو "نزف الدم" کی تعبیر استعمال ہوتی ہے۔

بہر حال زیرِ بحث آیت میں اس سے مراد عقل کا تدریجاً ختم ہونا اور سکرات کی حد تک پہنچ جانا ہے، جو جنت کی شرابِ طہور میں مطلقاً موجود نہیں ہے۔ اس سے نہ عقل میں کمی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی خرابی پیدا کرتی ہے۔

یہ دونوں تعبیریں "ضمنی طور پر" دنیا کی شرابوں اور مواد الکحل کے بارے میں، بہت ہی عمدہ اور دقیق بیان ہے کہ وہ مخفی طور پر تدریجی صورت میں انسان کے وجود میں اثر کرتی ہیں اور برائی اور خرابی پیدا کرتی ہیں، نہ صرف عقل اور سارے اعصاب کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں بلکہ انسان کے بدن کی تمام مشینری کو دل سے لے کر رگوں تک اور معدے سے لے کر جگر اور گردوں تک ایک ناقابلِ انکار تخریبی اور تباہ کن تاثیر رکھتی ہیں۔ گویا انسان کو اندر ہی اندر خراب کر کے تباہ کر دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ شرابِ دنیا انسان کے عقل و ہوش کو کنوئیں کے پانی کی طرح بتدریج کھینچتی ہے تا کہ اسے خشک اور

خالی کردے۔

لیکن خدائی شراب طہور قیامت میں، ان تمام صفات سے پاک ہے [1]

آخر کار قرآن چھٹے مرحلے میں جنت کی پاک و پاکیزہ بیویوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ان کے پاس ایسی بیویاں ہوں گی جو اپنے شوہروں کے سوا کسی اور سے محبت نہیں کرتیں، ان کے غیر کو نگاہ تک اٹھا کر نہیں دیکھتیں اور ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت ہیں (وعندھم قاصرات الطرف عین)۔

"طرف" اصل میں آنکھوں کی پلکوں کے معنی میں ہے اور چونکہ دیکھتے وقت پلکیں حرکت کرتی ہیں لہٰذا یہ لفظ دیکھنے کے لیے کنایہ ہے۔ اسی بنا پر "قاصرات الطرف" کی تعبیر ان عورتوں کے معنی میں ہے جو نظریں نیچی رکھتی ہیں۔ اس کی تفسیر میں کئی ایک احتمال ذکر کیے گئے ہیں جو علیحدہ علیحدہ ہونے کے باوجود سب مراد ہو سکتے ہیں۔

پہلی تفسیر یہ ہے کہ وہ صرف اپنے شوہروں کی طرف ہی دیکھتی ہیں، اپنی آنکھوں کو ہر طرف سے ہٹا کر، انھیں کو دیکھتی رہتی ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ وہ صرف اپنے شوہروں سے محبت کرتی ہیں اور ان کی محبت کے علاوہ ان کے دل میں کسی دوسرے کی محبت نہیں ہے یہ امر ایک بیوی کے لیے عظیم ترین امتیاز ہے کہ وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کو اپنے وہم و خیال میں بھی نہ لائے اور اس کے علاوہ کسی اور سے اسے پیار نہ ہو۔

ایک اور تفسیر یہ ہے کہ ان کی آنکھیں خمار آلود ہیں، وہی خاص حالت جو شعراء کے اکثر اشعار میں آنکھ کی ایک خوبصورت توصیف کے طور پر بیان ہوئی ہے [2]

البتہ پہلا اور دوسرا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اگرچہ ان معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

لفظ "عین" (بروزن "مین") جمع ہے "عیناء" کی جو بڑی آنکھ والی عورت کے معنی میں ہے۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت، ان جنتی بیویوں کی ایک اور صفت کو بیان کرتے ہوئے ان کی پاکیزگی کو اس عبارت کیساتھ

---

[1] "فیھا" اور "عنھا" کی ضمیریں "خمر" کی طرف لوٹتی ہیں، جو کلام میں مذکور نہیں ہے لیکن سیاق کلام سے معلوم ہو جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ لفظ "خمر" مؤنث مجازی ہے اور "عنھا" میں "عن" کی علت کو بیان کرنے کے لیے ہے یعنی وہ اس "خمر" کی وجہ سے مست اور محروم عقل و ہوش نہیں ہوں گے یہ بات ذہن میں رہے کہ لفظ "خمر" ایک مشترک لفظ ہے جو کبھی تو مفسدہ انگیز اور عقل کو تباہ کرنے والی شراب کے لیے بولا جاتا ہے، مثلاً۔

انما الخمر والمیسر.... (مائدہ: ۹۰)

اور کبھی شراب طہور پر جو خدا کے مخلص بندوں کا حصہ ہے مثلاً

وانھار من خمر لذۃ للشاربین (محمد: ۱۵)

جو جنت کی تعریف میں آئی ہے۔

[2] "روح المعانی" جلد ۲۳ ص ۷۱

بیان کرتی ہے: ان کا بدن بہت زیادہ پاکیزگی، عمدگی، سفیدی اور صفائی میں پرندے کے ان انڈوں کی طرح ہے کہ جسے نہ انسانی ہاتھ نے چھوا ہو اور نہ ہی اس پر گرد و غبار پڑا ہو، بلکہ وہ پرندے کے پر و بال کے نیچے پوشیدہ رہے ہوں (کانھن بیض مکنون)۔

"بیض" جمع ہے "بیضۃ" کی جو پرندے کے انڈے کے معنی میں ہے (ہر قسم کا پرندہ) اور "مکنون" "کن" (بروزن جن) پوشیدہ اور چھپے ہوئے کے معنی میں ہے۔

قرآن کی یہ تشبیہ اس وقت ٹھیک طرح سے واضح ہوگی جب انسان ان لمحات میں، جب انڈہ پرندے سے جدا ہوا اور ابھی انسانی ہاتھ اسے نہ لگا ہو اور وہ ابھی پرندے کے پروں کے نیچے ہی پڑا ہوا سے نزدیک سے دیکھے کہ وہ کیسی عجیب شفافیت مقائی رکھتا ہے۔

بعض مفسرین نے "مکنون" کو پرندے کے انڈے کے اندر موجود مواد کے معنی میں لیا ہے جو اس کے چھلکے کے اندر چھپا ہوا ہے اور حقیقتاً مذکورہ تشبیہ اس موقع کی طرف اشارہ ہے جب انڈے کو پکا کر اس کا چھلکا ایک ہی ساتھ جدا کر دیا جائے تو اس حالت میں سفیدی اور چمک کے علاوہ ایک خاص نرمی اور لطافت بھی اس میں ہوتی ہے۔ بہرحال قرآن کی تعبیرات حقائق بیان کرنے میں اس قدر عمیق، گہری اور معنی خیز ہیں کہ ایک مختصر سی تعبیر کے ساتھ بہت سے مطالب کو ایک لطیف انداز میں پیش کر دیتی ہیں۔

نکتہ: گزشتہ آیات پر ایک نظر

اہلِ بہشت کے لیے جو طرح طرح کی نعمتیں گزشتہ آیات میں بیان ہوئی ہیں وہ مادی و روحانی نعمتوں کا مجموعہ ہیں اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ پہلی نعمت جو "اولئك لهم رزق معلوم" کے سربستہ جملہ سے معلوم ہوتی ہے وہ معنوی و روحانی نعمتوں کے ساتھ مربوط ہے جس کی کسی زبان میں بھی تشریح نہیں کی جا سکتی۔

لیکن کچھ دوسرے حصے جو جنت کے پھل، شراب طہور، خوبصورت بیویاں، بہت احترام، پاکیزہ مسکن اور لائق ہمنشین ہیں، جنت کی نعمتوں کے مختلف جہات کو واضح کرتے ہیں جو غالباً مادی و روحانی نعمتوں کا ایک امتزاج ہے۔

لیکن یہ سب کی سب ایسی باتیں ہیں جو ہماری زبان میں پیش کی گئی ہیں اور یہ جنت کی نعمتوں کی تمام خصوصیات کو منعکس نہیں کر سکتیں۔ اصولی طور پر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کے لیے ایک دوسری زبان، دوسرے کان، دوسرے ادراک اور دوسری نظر کی ضرورت ہے اور اس کے لیے دوسرے ہی الفاظ، جملہ بندیاں اور گفتگو درکار ہے تاکہ اس حقیقت کو تفصیل کے ساتھ بیان کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں جنت کی نعمتوں کی اصل حقیقت دنیا والوں سے وہاں جا کر انھیں دیکھے اور حاصل کیے بغیر پوشیدہ ہے۔

بہرحال "مخلص بندے" اور وہ لوگ جو علم و ایمان میں کمال کے مرحلے تک پہنچے ہوئے ہیں، بارگاہِ خداوندی میں اس قدر عزیز ہیں کہ ان کے لیے خدا کے الطاف بے کراں کی توصیف ہو ہی نہیں سکتی اور ہم جتنا بھی سوچیں اور تصور میں لائیں وہ اس سے برتر و بالا ہیں۔

۵۰۔ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ○

۵۱۔ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ○

۵۲۔ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ○

۵۳۔ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَدِينُونَ ○

۵۴۔ قَالَ هَلْ أَنتُم مُّطَّلِعُونَ ○

۵۵۔ فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي سَوَاءِ الْجَحِيمِ ○

۵۶۔ قَالَ تَاللَّهِ إِن كِدتَّ لَتُرْدِينِ ○

۵۷۔ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ○

۵۸۔ أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ ○

۵۹۔ إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ○

۶۰۔ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○

۶۱۔ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ○

ترجمہ

۵۰۔ (اس حال میں جبکہ وہ اپنی باتوں میں مگن ہوں گے تو) بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں کی طرف رُخ کرکے سوال کریں گے......

۵۱۔ ان میں سے ایک کہے گا: میرا ایک ساتھی تھا۔

۵۲۔ جو ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا: کیا (سچ مچ) تو نے بھی بات کو مان لیا ہے؟......

۵۳۔ کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو (دوبارہ) زندہ کیے جائیں گے اور ہمیں

جزاو سزا دی جائے گی؟

۵۴۔ (اس کے بعد) کہے گا: کیا تم اس کی کوئی خبر لا سکتے ہو؟

۵۵۔ اس موقع پر وہ تلاش کرنے لگے گا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائے گا تو اچانک اسے جہنم کے وسط میں دیکھے گا۔

۵٦۔ اسے دیکھ کر وہ کہے گا: خدا کی قسم کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی کہ تو مجھے بھی جہنم کی طرف کھینچ لے جائے۔

۵٧۔ اور اگر میرے پروردگار کی نعمت اور احسان نہ ہوتا تو میں بھی جہنم میں حاضر کیے جانے والوں میں سے ہوتا۔

۵٨۔ (اے دوستو!) کیا ہم اب کبھی نہیں مریں گے (اور دائمی جنت میں رہیں گے)؟

۵٩۔ اور اس پہلی موت کے سوا اب اور کوئی موت ہمارے پاس نہیں آئے گی اور ہمیں کبھی سزا نہیں دی جائے گی (خدا کی یہ میرے لیے کیسی نعمت ہے)

٦٠۔ سچ مچ یہ تو بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔

٦١۔ ہاں! کوشش کرنے والوں کو ایسی جزا کے لیے کوشش اور عمل کرنا چاہیے۔

تفسیر

جہنمی دوست کی تلاش

گزشتہ آیات میں پروردگار کے مخلص بندوں کا ذکر تھا جو جنت کی طرح طرح کی نعمتوں میں غرق ہوں گے انھیں قسم قسم کے پھل میسر ہوں گے، جنت کی حوریں ان کی خدمت میں ہوں گی۔ شراب طہور کے جام ان کے گرد گردش میں ہوں گے اور وہ جنت کے تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے باصفا دوستوں کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مشغول ہوں گے کہ ایسے میں اچانک ان میں سے بعض اپنے ماضی اور دنیا کے دوستوں کی سوچ میں پڑ جائیں گے وہی دوست جنھوں نے اپنی راہ الگ کر لی تھی اور جنت میں جن کی جگہ خالی پڑی ہوگی وہ ان کا انجام جاننے کی کوشش کریں گے۔

ہاں! اس وقت جبکہ "وہ گفتگو میں محو ہوں گے اور مختلف موضوعات پر بات کر رہے ہوں گے اور بعض دوسرے بعض کی طرف رُخ کر کے سوال کر رہے ہوں گے اور ان کے جواب سن رہے ہوں گے (فاقبل بعضھم علی بعض یتساء لون)۔

اچانک ان میں سے ایک کو کچھ باتیں یاد آئیں گی، وہ دوسروں کی طرف منہ کرکے کہے گا: دنیا میں میرا ایک دوست اور ہمنشین تھا (قال قائل منھم انی کان لی قرین)۔

لیکن افسوس وہ انحراف کی راہ پر چل پڑا اور منکرین قیامت کے ساتھ ہوگیا" وہ ہمیشہ مجھ سے کہا کرتا تھا: کیا سچ مچ تو نے بھی اس بات کو باور کرلیا ہے اور تو بھی اس کی تصدیق کرتا ہے" (یقول ء انک لمن المصدقین)۔

"کہ جس وقت ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو (دوبارہ) زندہ ہوں گے اور حساب و کتاب کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے اور اپنے اعمال و کردار کے جواب میں ہمیں مجازات کردار کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں تو ان باتوں کو باور نہیں کرتا (ء اذا متنا و کنا ترابا و عظاما ء انا لمدینون)[1]

اے دوستو! کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اب وہ کہاں ہے اور کن حالات میں ہے؟! افسوس اس کی جگہ ہمارے درمیان خالی پڑی ہے۔!

اس کے بعد وہ مزید کہے گا: اے دوستو! کیا تم اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر دیکھ سکتے ہو اور اس کا پتہ لگا سکتے ہو؟ (قال ھل انتم مطلعون)[2]

اس موقع پر وہ خود بھی تلاش کے لیے کھڑا ہو جائے گا اور جہنم کی طرف ایک نگاہ ڈالے گا تو اچانک اپنے دوست کو وسط جہنم میں دیکھے گا (فاطلع فراٰہ فی سواء الجحیم)[3]

اسے مخاطب کرتے ہوئے "آوازدے کر کہے گا: خدا کی قسم کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی کہ تو مجھے بھی گمراہ کردے اور ہلاکت کی طرف کھینچ لے جائے" (قال تاللہ ان کدت لتردین)۔[4]

کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی کہ تیرے وسوسے میرے صاف دل پر اثر انداز ہوجائیں اور مجھے بھی اسی کج راستے پر ڈال دیں کہ جس پر تو چل رہا تھا" اگر لطف الٰہی میرا مددگار نہ ہوتا اور میرے پروردگار کی نعمت میری نصرت کو نہ پہنچتی، تو میں بھی آج تیرے ہی ساتھ جہنم کی آگ میں موجود ہوتا" (ولولا نعمۃ ربی لکنت من المحضرین)۔

یہ توفیق الٰہی ہی تھی جو میری رفیق راہ بنی اور اسی کی ہدایت کے لطف و کرم کے ہاتھ نے مجھ پر نوازش کی اور میری رہبری کی۔

---

[1] "مدینون" دین کے مادہ سے جزا کے معنی میں ہے یعنی کیا ہمیں جزا دی جائے گی؟

[2] "مطلعون" اطلاع" کے مادہ سے مراد پیار کرکے جستجو اور تلاش کرنا اور کسی چیز کے لیے جھانکنا اور اس کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ہے۔

[3] "سواء" وسط اور درمیان کے معنی میں ہے۔

[4] "تردین" "ارداء" کے مادہ سے بلندی سے گرنے کے معنی میں ہے جس سے عام طور پر ہلاکت واقع ہوجاتی ہے۔

اس موقع پر وہ اپنے جنتی دوست کی طرف رُخ کرے گا اور یہ بات سرزنش کے طور پر اسے یاد دلاتے ہوئے کہے گا: کیا تو ہی دنیا میں یہ نہیں کہا کرتا تھا کہ "ہم کبھی نہیں مریں گے (افما نحن بمیتین)۔
سوائے اس پہلی دنیاوی موت کے اور اس کے بعد نہ کوئی نئی زندگی ہوگی اور نہ ہی ہمیں عذاب دیا جائے گا (الا موتتنا الاولیٰ و ما نحن بمعذبین)۔

اب تو دیکھ لو اور سوچ کر تجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے؟ موت کے بعد اس قسم کی زندگی تھی اور اس طرح کا ثواب وجزا اور سزا و عذاب تھا۔ اب تمام حقائق تیرے سامنے آشکار ہو گئے ہیں۔ لیکن کیا فائدہ کیوں کہ لوٹنے کی اب کوئی راہ نہیں ہے۔
اس تفسیر کے مطابق آخری دو آیات اس جنتی شخص کی اپنے دوزخی ساتھی کے ساتھ گفتگو ہے۔ وہ قیامت کے انکار کے سلسلے میں اس کی کہی ہوئی باتیں اسے یاد دلا رہا ہے۔

لیکن بعض مفسرین نے ان دونوں آیات کی تفسیر میں ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ بہشتی شخص کی گفتگو دوزخی دوست کے ساتھ ختم ہو گئی ہے اور بہشتی دوست آپس میں باتیں دوبارہ کرنے لگیں گے۔ ان میں سے ایک فرطِ مسرت سے پکار کر کہے گا:
"کیا واقعًا اب ہم نہیں مریں گے" اور یہاں ہماری حیات جاودانی ہے، کیا پہلی موت کے بعد اب کوئی موت نہیں آئے گی اور یہ لطفِ الٰہی ہم پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں ہوگا؟
البتہ یہ باتیں شک وشبہ کی بناء پر نہیں ہوں گی۔ بلکہ فرطِ وجد و سرور سے ہوں گی۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے بعض اوقات انسان طویل آرزو اور انتظار کے بعد کوئی وسیع اور اچھا مکان حاصل کرتا ہے تو تعجب کے ساتھ کہتا ہے کیا یہ میری ملکیت ہے؟ اے میرے خدا! یہ کتنی اچھی نعمت ہے، کیا یہ مجھ سے لے تو نہیں لی جائے گی؟
بہرحال اس گفتگو کو ایک پُرمعنی اور بہت ہی احساس انگیز جملے پر ختم کیا گیا ہے، جس میں بہت سی تاکیدات بھی موجود ہیں ارشاد ہوتا ہے:-

"واقعًا یہ ایک عظیم کامیابی ہے (انّ ھٰذا لھو الفوز العظیم)۔
اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہوگی کہ انسان نعمتِ جاوداں اور حیات ابدی میں مستغرق ہو اور انواع و اقسام کے الطاف الٰہی اس کے شاملِ حال ہوں۔ اس سے برتر و بالا اور کس چیز کا تصور ہو سکتا ہے۔
اس کے بعد خداوندِ عظیم ایک مختصر، بیدار کن اور معنی خیز جملے پر اس بحث کو ختم کرتا ہے۔ اس مثال کے مطابق لوگوں کو عمل کرنا چاہیے (لمثل ھٰذا فلیعمل العاملون)۔
یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ آخری آیت بھی جنتیوں کی ہی گفتگو کا حصہ ہے، بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ اس دن اور کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اس دن عمل کا کوئی محل نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو یہ کہہ کر عمل کرنے کا شوق دلائیں۔ جبکہ آیت کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ یہ کہہ کر تمام گزشتہ آیات سے نتیجہ اخذ کیا جائے اور لوگوں کو ایمان وعمل کی طرف دعوت دی جائے لہٰذا مناسب یہی ہے کہ اس بحث کے آخر میں یہ خدا ہی کی گفتگو ہو۔

چند نکات

۱۔ جنتیوں کا دوزخیوں کے ساتھ ربط :۔ زیر بحث آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض اوقات جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک قسم کا رابطہ قائم ہوجائے گا۔ گویا بہشتی جو اوپر رہتے ہوں گے، دوزخیوں کی طرف نگاہ کریں گے اور ان کی حالت و کیفیت کو دیکھ لیں گے (یہ معنی فاطلع کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے جو اوپر سے جھانکنے کے معنی میں ہے)۔

البتہ یہ اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان فاصلہ تھوڑا ہے۔ بلکہ ان حالات میں انھیں دیکھنے کی بہت زیادہ طاقت دے دی جائے گی، جس کے سامنے فاصلے اور مکان کا مسئلہ پیش ہی نہیں آئے گا۔

مفسرین کے کلمات میں ہے کہ بہشت میں ایک روشندان ہے جس سے جہنم کو دیکھا جاسکتا ہے۔

سورۂ اعراف کی آیات سے بھی اس قسم کا رابطہ اچھی طرح سے واضح ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

ونادی اصحاب الجنة اصحاب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقًا فهل وجدتم ما وعد ربکم حقًا قالوا نعم فاذن مؤذن بینهم ان لعنة الله علی الظالمین (اعراف - ۴۴)

جنتی دوزخیوں کو پکار کر کہیں گے: ہمارے پروردگار نے ہم سے جس چیز کا وعدہ کیا تھا ہم نے اسے برحق پایا، کیا تم نے بھی جس کا تمھارے پروردگار نے تم سے وعدہ کیا تھا اسے برحق پایا ہے؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ تو اس وقت کوئی ان کے درمیان میں سے پکار کر کہے گا کہ ستم گروں پر خدا کی لعنت ہو۔

اسی سورہ کی آیہ ۴۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ "اہل بہشت اور اہل دوزخ کے درمیان ایک حجاب ہے (وبینهما حجاب)۔

"نادٰی" کی تعبیر جو عام طور پر دور سے بات کرنے کے موقعوں پر استعمال ہوتی ہے، یہ ان دونوں گروہوں کی مکانی یا مقامی دوری کی نشانی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن کے حالات و شرائط اس جہان کے حالات سے بہت مختلف ہیں اور ہم اس جہان کے معیاروں پر ان کا ادراک نہیں کرسکتے۔

۲۔ یہ آیات کس شخص کے بارے میں نازل ہوئیں؟ بعض مفسرین نے ان آیات کے بارے میں کئی شان نزول نقل کیے ہیں ان کے مطابق یہ آیات ان دو افراد کی طرف اشارہ کررہی ہیں جن کا ذکر سورۂ کہف میں ایک مثال کے طور پر کیا گیا ہے جہاں قرآن فرماتا ہے:

واضرب لهم مثلًا رجلین جعلنا لاحدهما جنتین من اعناب وحففناهما بنخل وجعلنا بینهما زرعًا....

ان کے لیے ایک مثال بیان کر : ان دو مردوں کی داستان، جن میں سے ایک کے لیے ہم نے انواع و اقسام کے انگوروں کا باغ قرار دیا تھا جس کے گرداگرد کھجور کے درخت تھے اور دونوں کے درمیان پُر برکت زراعت ہوتی تھی .... (کہف ـــــ ۳۲ تا ۴۲)

ان آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک شخص بہت ہی خود خواہ، مغرور، کم ظرف اور منکر معاد تھا۔ دوسرا مومن اور قیامت کا معتقد تھا۔ بالآخرہ وہ بے ایمان مغرور شخص اس جہان میں بھی خدائی عذاب میں گرفتار ہوا اور اس کا سارا مال و سرمایہ تباہ و برباد ہو گیا [1]

لیکن زیر بحث آیات کا لب و لہجہ سورۂ کہف کی ان آیات کے ساتھ ہرگز ہم آہنگ نہیں ہے اور یہ آیات کوئی علیحدہ داستان بیان کر رہی ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین اسے دو شریک کار یا دوستوں سے متعلق جانتے ہیں۔ وہ دونوں ہی دولت مند تھے۔ ایک نے راہِ خدا میں بہت زیادہ خرچ کیا اور دوسرے نے بخل کیا۔ وہ ان باتوں کا معتقد نہیں تھا۔ کچھ مدت کے بعد خرچ کرنے والا آدمی محتاج ہو گیا تو اس کے دوست نے اسے سرزنش کی اور بُرا بھلا کہا اور مذاق کے طور پر کہا:

ء انك لمن المصدقين

کیا تو راہِ خدا میں انفاق کرتا ہے [2]

لیکن یہ شانِ نزول اس بات پر موقوف ہے کہ ہم زیر بحث آیات میں "مصدقین" کے "صاد" کو تشدید کے ساتھ پڑھیں تاکہ اس کا تعلق انفاق اور صدقہ دینے سے ہو جائے۔

جبکہ "مصدقین" کی مشہور قراءت "صاد" کی تشدید کے بغیر ہے۔ اس بنا پر مذکورہ شانِ نزول مشہور قراءت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

۲۔ **اس قسم کی نعمات کے لیے کوشش کرنا چاہیے :** کیا انسان کے لیے یہ بات مناسب ہے کہ انسان عمر کے گراں بہا سرمائے اور خداداد تعمیری صلاحیتوں کو ایسے امور میں صرف کرے جو پانی کے بلبلوں کی طرح ناپائیدار ہوں؟ ایسی متاع ہے جو بے قدر و قیمت اور فنا ہونے والی ہے۔ ایسی متاع ہے جس میں آمیزش ہی آمیزش ہیں اور دردِ سر ہی دردِ سر ہے۔

یا ان قیمتی صلاحیتوں اور وسائل کو ایسی راہ میں استعمال کرے جس کا نتیجہ حیاتِ جاوداں، بے پایاں نعمتیں اور پروردگار کی خوشنودی ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۶ ص ۱۳۹

[2] روح المعانی جلد ۲۳ ص ۸۳

قرآن زیرِ نظر آیات میں کتنی خوب صورت تعبیر پیش کرتا ہے، کہتا ہے: سعی و کوشش کرنے والوں کو اس طرح کے مقصد کے لیے سعی و کوشش کرنی چاہیے۔ لذات روحانی سے معمور جنت کے لیے اور جسمانی نعمتوں سے بھری ہوئی بہشت کے لیے جس کی شراب طہور انسان کو ملکوتی نشے میں غرق کر دے گی اور اس کے باصفا دوستوں کی ہم نشینی دل پر کوئی غم نہ رہنے دے گی۔ جس میں نہ کوئی چیز محدود ہے نہ کسی چیز کی کوئی ممانعت۔ نہ اس میں زوال کا غم ہوگا اور نہ ہی حفاظت نگہداری کا دردِ سر۔

ہاں!

ایسی جنت کے لیے سعی و کوشش کرنا چاہیے۔

۶۲۔ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ○

۶۳۔ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ○

۶۴۔ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ○

۶۵۔ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ○

۶۶۔ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ○

۶۷۔ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ○

۶۸۔ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ○

۶۹۔ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ○

۷۰۔ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ○

ترجمہ

۶۲۔ کیا یہ (جنت کی جاودان نعمتیں) بہتر ہیں یا زقوم کا (نفرت انگیز) درخت۔

۶۳۔ ہم نے اسے ظالموں کے لیے درد و رنج کا سبب قرار دیا ہے۔

۶۴۔ وہ ایسا درخت ہے جو قعرِ جہنم سے اگتا ہے۔

۶۵۔ اس کا شگوفہ شیاطین کے سروں کے مانند ہے۔

۶۶۔ وہ (مجرم) اس میں سے کھائیں گے اور اسی سے اپنا پیٹ بھریں گے۔

۶۷۔ پھر اس کے اوپر گرم بدبودار پانی پئیں گے۔

۶۸۔ پھر ان کی بازگشت جہنم کی طرف ہے۔

۶۹۔ کیونکہ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کو گمراہ پایا۔

۷۰۔ اس کے باوجود وہ تیزی کے ساتھ انھیں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔

تفسیر

اہلِ دوزخ کے لیے کچھ جانکاہ عذاب

جنت کی قیمتی اور روح بخش نعمتوں کے بیان کے بعد زیرِ بحث آیات میں دوزخ کے دردناک اور غم انگیز عذابوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی اس طرح سے تصویر کشی کی گئی ہے جو مذکورہ نعمتوں کا موازنہ کرنے میں بیدار نفوس پر گہرا اثر مرتب کرتی ہیں اور انھیں ہر قسم کی برائی اور ناپاکی سے باز رکھتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا یہ جاودانی اور لذت بخش نعمتیں، جن کے ساتھ جنتیوں کی پذیرائی کی جائے گی بہتر ہیں یا زقوم کا نفرت انگیز درخت۔ (أذالك خير نزلاً ام شجرة الزقوم)۔

"نزل" کی تعبیر اس چیز کے لیے بولی جاتی ہے جو مہمان کی پذیرائی کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہ پہلی چیز ہے کہ جس کے ساتھ تازہ وارد شدہ مہمان کی پذیرائی کرتے ہیں۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہشتی لوگوں کی عزیز و محترم مہمانوں کی طرح پذیرائی کی جائے گی۔

قرآن کہتا ہے: کہ کیا یہ بہتر ہے یا "زقوم" کا درخت۔

"بہتر" کی تعبیر اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ درخت زقوم کوئی اچھی چیز ہے۔ لیکن جنت کی نعمتیں اس سے بہتر ہیں کیونکہ ایسی تعبیریں عربی زبان میں بعض اوقات ایسے موقعوں پر استعمال ہوتی ہیں جہاں ایک طرف اصلاً کسی قسم کی خوبی نہیں ہوتی لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہ ایک قسم کا کنایہ ہو۔ اس کی مثال بالکل اس طرح ہے کہ ایک شخص طرح طرح کے گناہوں سے آلودگی کی بنا پر لوگوں میں بہت زیادہ رسوا ہو گیا ہو اور ہم اس سے یہ کہیں کہ کیا یہ رسوائی بہتر ہے یا عزت و آبرومندی؟

"زقوم" اہلِ لغت کے قول کے مطابق ایک کڑوی بدبودار اور بدذائقہ پودا ہے۔[1]

بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ ایک ایسے پودے کا نام ہے جس کے چھوٹے چھوٹے کڑوے اور بدبودار پتے ہوتے ہیں اور وہ "تہامہ" کے علاقے میں اگتا ہے اور مشرکین اس سے آگاہ تھے۔[2]

تفسیر "روح المعانی" میں یہ اضافہ بھی کیا گیا ہے کہ اس پودے سے ایک شیرہ نکلتا ہے جو انسان کے بدن پر لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔[3]

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "زقوم" دوزخیوں کی ہر قسم کی تنفر آمیز غذا ہے۔

---

[1] مجمع البحرین۔ مادہ "زقم"۔

[2] تفسیر روح البیان جلد ۷، ص ۴۶۴۔

[3] روح المعانی ج ۲۳ ص ۸۵

"لسان العرب" کا مؤلف کہتا ہے:

یہ مادہ اصل میں نگل جانے کے معنی میں ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے:

جس وقت آیہ "زقوم" نازل ہوئی تو ابو جہل نے کہا کہ اس قسم کا درخت ہماری زمین میں نہیں اگتا تم میں سے کون شخص "زقوم" کے معنی جانتا ہے؟

وہاں ایک شخص افریقہ کا رہنے والا موجود تھا اس نے کہا زقوم افریقی زبان میں "مکھن" اور "خرما" کے معنی میں ہے۔

ابو جہل نے تمسخر اڑاتے ہوئے پکار کر کہا:

"اے کنیز! مجھے خرمے اور مکھن لے آ تاکہ ہم زقوم کھائیں"۔

وہ کھاتے جاتے تھے اور تمسخر اڑاتے جاتے تھے اور کہتے تھے:

"محمد (ص) آخرت میں ہمیں اسی سے ڈراتا ہے"۔

اس پر وحی نازل ہوئی اور انھیں یہ دندان شکن جواب دیا جو بعد والی آیات میں آیا ہے۔

بہرحال لفظ "شجرۃ" ہمیشہ درخت کے معنی میں نہیں ہوتا۔ بعض اوقات گھاس پھونس اور پودوں کے معنی میں بھی آتا ہے اور قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہاں اس سے مراد گھاس پھونس ہی ہے۔

اس کے بعد قرآن اس گھاس کی بعض خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے اسے ظالموں کے لیے رنج اور عذاب کا موجب قرار دیا ہے (انا جعلناها فتنة للظالمين)۔

"فتنۃ" ممکن ہے رنج و عذاب کے معنی میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آزمائش کے معنی میں ہو۔ جیسا کہ قرآن میں اکثر موقعوں پر اسی معنی کیلیے آیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے جب "زقوم" کا نام سنا تو تمسخر اور استہزا شروع کر دیا اور اس بنا پر وہ ان ستم گروں کی آزمائش کا ذریعہ ہو گیا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ ایسا درخت ہے جو قعر جہنم سے اگتا ہے۔ (انها شجرة تخرج في اصل الجحيم)۔

لیکن ان ظالموں نے اپنا تمسخر اور استہزاء جاری رکھا اور یہ کہا: کیا یہ ممکن ہے کہ پودے یا کوئی درخت قعر جہنم سے اُگے؟ آگ کہاں اور درخت اور گھاس کہاں؟ اس بنا پر اس گھاس اور اس کے اوصاف کا سننا اس دنیا میں ان کے لیے آزمائش ہے اور وہ خود ان کے لیے آخرت میں درد و رنج کا سبب ہے۔

گویا وہ اس نکتے سے غافل تھے کہ وہ اصول جو اس جہانِ آخرت کی زندگی پر لاگو ہیں، وہ اس جہان سے بہت مختلف ہیں۔ وہ درخت اور پودا جو قعر جہنم سے اگتا ہے، جہنم کے رنگ کا ہے اور اس نے جہنم کے ماحول میں پرورش پائی ہے نہ کہ وہ اس جہان کے

باغوں کی مانند ہے جو اس جہان کے باغوں میں اُگتے ہیں اور شاید وہ اس نکتے سے بے خبر نہیں تھے بلکہ ان کا مقصد توصرف تمسخر اڑانا اور استہزا کرنا تھا۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: اس کا شگوفہ شیاطین کے سروں کی طرح ہے (طلعها کانّه رءوس الشیاطین)۔

" طلع " عام طور پر کھجور کے شگوفے کو کہا جاتا ہے جس کی چھال سبز رنگ کی ہوتی ہے اور اس کے اندر سفید رنگ کے دھاگے سے ہوتے ہیں جو بعد میں کھجور کے خوشے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

لفظ " طلع " " طلوع " کے مادے سے ہے اس کی مناسبت یہ ہے کہ یہ پہلا پھل ہے جو درخت کے اوپر ظاہر ہوتا ہے اور طلوع کرتا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کیا لوگوں نے شیاطین کے سروں کو دیکھا ہوا ہے کہ قرآن " زقوم " کے شگوفوں کو اُن سے تشبیہ دیتا ہے۔

مفسّرین نے اس سوال کے متعدد جواب دیئے ہیں۔

بعض نے تو کہا ہے کہ شیطان کا ایک معنی ایک قسم کا بدمنظر سانپ ہے جس کے ساتھ زقوم کے شگوفے کو تشبیہ دی گئی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ایک بدصورت قسم کی گھاس ہے، جیسا کہ کتاب " منتهی الادب " میں آیا ہے " رأس الشیطان " یا " رؤس الشیاطین " ایک گھاس ہے۔

لیکن جو بات زیادہ صحیح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تشبیہ انتہائی قباحت اور اس کے تنفر آمیز شکل کے اظہار کے لیے ہے۔ کیونکہ انسان جس چیز سے متنفر ہو اس کے لیے اپنے ذہن میں ایک قبیح اور وحشت ناک تصویر کشی کرتا ہے اور جس چیز سے لگاؤ ہو اس کے لیے ایک خوبصورت اور پیارا سا تصور رکھتا ہے۔

اس لیے لوگ جو تصویریں ۔ فرشتوں کی بناتے ہیں، ان میں انتہائی خوب صورت اور زیبا ترین چہروں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اور اس کے برعکس شیطانوں اور دیوؤں کے لیے بدترین چہرے بناتے ہیں حالانکہ نہ تو انھوں نے فرشتوں کو دیکھا ہے اور نہ ہی شیطانوں اور دیوؤں کو۔

روزمرہ کے الفاظ میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کہتے ہیں، فلاں آدمی دیو کے مانند ہے یا دیو کی شکل رکھتا ہے۔
یہ سب تشبیہات، انسانوں کے ذہنی تصورات کی بنیاد پر، مختلف مفاہیم کے اعتبار سے لطیف اور مُنہ بولتی ہیں۔

قرآن مزید کہتا ہے: یہ مغرور ظالم یقیناً یہی گھاس کھائیں گے اور اسی سے شکم پُر کریں گے (فانّهم لاٰکلون منها فمالئون منها البطون)۔

یہ وہی فتنہ وعذاب ہے جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ اس دوزخ کی گھاس جو بہت ہی بدبودار ہے،

جس کا ذائقہ کڑوا ہے اور جس کے شیرہ سے بدن میں ورم پیدا ہو جاتا ہے اور اسے کھانا بھی زیادہ مقدار میں ہو تو اندازہ کیا جائے کہ یہ کس قدر دردناک عذاب ہے [1]

یہ بات ظاہر ہے کہ اس ناگوار اور کڑوی غذا میں سے کھانا پیاس لگائے گا، لیکن جس وقت وہ پیاسے ہوں گے تو کیا پئیں گے،؟ قرآن کہتا ہے: ان دوزخیوں کے لیے اس زقوم کے بعد کھولتا ہوا، کثیف اور گندا پانی ہوگا (ثم ان لھم علیھا لشوبا من حمیم)۔

" شوب " اس چیز کے معنی میں ہے جو کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جائے اور " حمیم " کھولتے ہوئے اور جلانے والے پانی کو کہتے ہیں، اس بنا پر وہ گرم کھولتا ہوا پانی جو وہ پئیں گے، وہ بھی خالص نہیں ہوگا بلکہ آلودہ اور گندہ ہوگا۔

وہ تو دوزخیوں کی غذا ہے اور یہ ان کے پینے کی چیز، لیکن اس پذیرائی کے بعد وہ کہاں جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے: پھر ان کی بازگشت جہنم کی طرف ہے۔ (ثم ان مرجعھم لالی الجحیم)۔

بعض مفسرین نے اس تعبیر سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ گرم اور آلودہ پانی جہنم سے باہر کے ایک چشمہ کا ہے۔ دوزخیوں کو پہلے ان جانوروں کی طرح جنھیں پانی کے گھاٹ پہلے جایا جاتا ہے اسے پینے کے لیے وہاں لایا جائے گا اور اسے پینے کے بعد دوبارہ جہنم کی طرف لوٹ جائیں گے۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ یہ دوزخ کے مختلف مقامات کی طرف اشارہ ہے کہ ظالموں کو ایک علاقہ سے دوسرے علاقے کی طرف لے جایا جائے گا، تاکہ وہ یہ جلانے والا پانی پئیں۔ پھر انھیں اصلی جگہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ جنت کی نعمتوں کی حقیقی تصویر کشی اس دنیا میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی دوزخیوں کے عذاب کی۔ صرف دور سے ایک دھندلی سی تصویر مختصر سی عبارتوں کے ساتھ ہمارے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔

(پروردگارا! ہمیں ان عذابوں سے اپنے لطف و کرم کی پناہ میں محفوظ رکھ)

قرآن زیر بحث آخری آیت میں دوزخیوں کی ان دردناک سزاؤں اور عذاب کے چنگل میں گرفتاری کی اصل وجہ کو دو مختصر اور پر معنی جملوں میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کو گمراہ پایا (انھم الفوا اٰباءھم ضالین)۔

---

[1] " منھا " کی ضمیر " شجرۃ " کی طرف لوٹتی ہے اور یہ خود اس بات کے لیے قرینہ ہے کہ یہاں " شجرۃ " سے مراد گھاس ہے نہ کہ درخت کیونکر گھاس کو تو کھاتے ہیں درخت کو نہیں۔

لیکن اس حال میں بھی وہ بے اختیار تیزی کے ساتھ انھی کے پیچھے دوڑے چلے جاتے ہیں (فھم علی آثارھم یھرعون)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں "یھرعون" "اھراع" کے مادہ سے، صیغہ مجہول کی صورت میں آیا ہے اور سرعت اور تیزی کے ساتھ دوڑنے کے معنی میں ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے اپنے بڑوں کی تقلید پر اپنے دل اور دین کو اس طرح سے لگا دیا ہے کہ وہ انھیں بے اختیار تیزی کے ساتھ اپنے پیچھے دوڑا رہے ہیں۔ گویا وہ خود سے ان کا کوئی ارادہ ہی نہیں یہ ان کے انتہائی تعصب اور اپنے بڑوں کے خرافات کے ساتھ شیفتگی کی طرف اشارہ ہے۔

۷۱۔ وَلَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَهُمۡ اَكۡثَرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝

۷۲۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا فِيۡهِمۡ مُّنۡذِرِيۡنَ ۝

۷۳۔ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ۝

۷۴۔ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝

ترجمہ

۷۱۔ ان سے پہلے اکثر گزشتہ لوگ (بھی) گمراہ تھے۔

۷۲۔ ہم نے ان میں ڈرانے والے بھیجے تھے۔

۷۳۔ دیکھو! جنھیں ڈرایا گیا تھا ان کا انجام کیا ہوا؟

۷۴۔ ہمارے مخلص بندوں کے سوا۔

تفسیر

گزشتہ گمراہ اقوام

کیونکہ مجرموں اور ظالموں سے مربوط گزشتہ مسائل کسی خاص زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں لہٰذا قرآن زیر بحث آیات میں ان کی عمومیت اور وسعت کو بیان کرتا ہے۔

ان چند آیات میں گزشتہ بہت سی اُمتوں کے حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے مطلع ہونا گزشتہ مباحث کے لیے ایک اچھی سند ہے۔ مثلاً قوم نوح وابراہیم، قوم موسیٰ وہارون، قوم لوط، قوم یونس وغیرہ۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ان سے پہلے بہت سے گزشتہ لوگ گمراہ ہو گئے (ولقد ضل قبلهم اكثر الاولين)۔

صرف مشرکین مکہ ہی نہیں جو اپنے بڑوں کی تقلید میں اتھاہ گمراہی میں جا گرے ہیں بلکہ ان سے پہلے بھی اکثر گزشتہ اقوام اس قسم کے انجام سے دوچار ہوئی تھیں اور ان کے مومنین بھی ان کے گمراہوں کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑے سے تھے اور یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اور ان پہلے مومنین کے لیے جو اس زمانے میں مکہ میں تھے اور ہر طرف سے دشمن کے محاصرہ میں تھے، ایک تسلی خاطر ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے : ان کی گمراہی اس لیے نہیں تھی کہ ان کا کوئی رہبر و رہنما نہیں تھا بلکہ ہم نے ان میں ڈرانے والے بھیجے تھے (و لقد ارسلنا فیھم منذ رین)۔

ایسے پیغمبر جو انھیں شرک و کفر، ظلم و ستم اور دوسروں کی اندھی تقلید سے ڈراتے اور انھیں ان کی ذمہ داریوں سے آشنا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انبیاء کے ایک ہاتھ میں انذار اور دوسرے ہاتھ میں بشارت کا پروانہ ہوتا تھا لیکن چونکہ ان کی تبلیغ کا رکنِ اعظم خصوصاً اس قسم کی گمراہ اور سرکش اقوام کے لیے انذار ہی تھا لہذا یہاں صرف اسی کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ایک مختصر اور پُر معنی جملے میں فرمایا گیا ہے : اب دیکھ ڈرائے جانے والوں اور ہٹ دھرم اور گمراہ اقوام کا انجام کیا ہوا؟ (فانظر کیف کان عاقبۃ المنذرین)۔

" فانظر " (اب دیکھ) میں ہو سکتا ہے کہ مخاطب پیغمبر اکرمؐ کی ذات ہو یا ہر عاقل و بیدار فرد ہو۔

حقیقت میں یہ جملہ ان اقوام کے انجام کار کی طرف اشارہ ہے جن کی حالت کی تشریح بعد والی آیات میں آئے گی۔

آخری آیت میں ایک استثناء کے بعد فرمایا گیا ہے : مگر خدا کے مخلص بندے۔ (الا عباد اللہ المخلصین)۔

حقیقت میں یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان اقوام کی عاقبت اور انجام کو دیکھو کہ ہم نے انھیں کیسے دردناک عذاب میں گرفتار کیا ہے اور ہلاک کیا ہے، سوائے صاحبانِ ایمان اور مخلص بندوں کے کہ جو اس ہلاکت سے بچے رہے اور نجات پا گئے[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس سورہ میں مختلف آیات میں پانچ مرتبہ خدا کے مخلص بندوں کا ذکر آیا ہے اور یہ ان کے مرتبہ و مقام کی عظمت کی نشانی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں جو معرفت، ایمان اور جہاد بالنفس میں اس طرح کامیاب ہوئے ہیں کہ خدا نے انھیں منتخب کر کے خالص کر لیا ہے اور اسی وجہ سے وہ انحرافات اور لغزشوں سے بچے رہے۔

شیطان ان میں نفوذ پیدا کرنے سے عاجز اور مایوس ہے اور پہلے دن سے ان کے مقابلے میں سپر ڈال کر اپنی عاجزی کا اظہار کر چکا ہے۔

ماحول کا شور و غوغا، گمراہ کرنے والوں کے وسوسے، آباؤ اجداد کی تقلید، غلط اور طاغوتی تعلیمات انھیں ہرگز

---

[1] یہ جملہ ایک محذوف سے استثناء ہے جو مذکورہ میں سمجھا جاتا ہے اور جو تقدیر میں اس طرح ہے :۔
فانظر کیف کان عاقبۃ المنذرین فانا اھلکناھم جمیعًا الا عباد اللہ المخلصین

اپنے راستے سے منحرف نہیں کر سکتیں ۔

حقیقت ہیں یہ اس زمانے میں مکہ میں پامردی دکھانے والے مومنین کے لیے اور آج کی شور و غوغا سے پُر دنیا میں رہنے والے ہم جیسے مسلمانوں کے لیے ایک الہام بخش پیام ہے کہ ہم دشمنوں کی کثرت سے نہ ڈریں اور کوشش کریں کہ خدا کے مخلص بندوں کی صف میں جگہ پالیں ۔

۷۵۔ وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ○

۷۶۔ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ○

۷۷۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ○

۷۸۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ○

۷۹۔ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ ○

۸۰۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ○

۸۱۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ○

۸۲۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ○

ترجمہ

۷۵۔ نوح نے ہمیں پکارا (اور ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا) اور ہم کیسے اچھے قبول کرنے والے ہیں۔

۷۶۔ اور ہم نے اسے اور اس کے اہل خاندان کو اندوہ عظیم سے نجات بخشی۔

۷۷۔ اور اس کی اولاد کو (روئے زمین پر) باقی رہنے والا قرار دیا۔

۷۸۔ اور ہم نے اس کا نیک نام بعد کی امتوں میں باقی رکھا۔

۷۹۔ سارے جہان کے لوگوں میں نوح پر سلام ہو۔

۸۰۔ ہم نیک لوگوں کو اسی طرح سے اجر دیتے ہیں۔

۸۱۔ بے شک وہ ہمارے صاحب ایمان بندوں میں سے تھا۔

۸۲۔ پھر دوسروں (اس کے دشمنوں) کو ہم نے غرق کر دیا۔

تفسیر

نوحؑ کی داستان کا ایک گوشہ

یہاں سے خدا کے نو عظیم پیغمبروں کی داستان کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس کی طرف گزشتہ آیات میں اجمالی طور پر ذکر ہوا تھا۔

سب سے پہلے شیخ الانبیاء اور پہلے اولوالعزم پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے، پہلے ان کی اس پرسوز دعا کی طرف ـــــ جو انھوں نے اس وقت کی تھی جب وہ اپنی قوم سے مایوس ہوگئے تھے ـــــ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نوحؑ نے ہمیں پکارا تو ہم نے بھی ان کی دعا قبول کرلی اور ہم کیسے اچھے قبول کرنے والے ہیں (و لقد نادانا نوح فلنعم المجیبون)[1]

یہ دعا ممکن ہے اسی دعا کی طرف اشارہ ہو جو سورۂ نوح میں آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

و قال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا○ انك ان تذرھم یضلوا عبادك و لا یلدوا الا فاجرا کفارا○

نوحؑ نے کہا: پروردگارا! کافروں میں سے کسی کو زمین پر نہ رہنے دے کیونکہ اگر تو انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کردیں گے اور ان سے فاجروں اور کافروں کے سوا اور کوئی پیدا نہیں ہوگا۔ (وہ خود بھی فاسد ہیں اور ان کی آئندہ نسل بھی فاسد ہوگی)

(نوح ـــــ ۲۶، ۲۷)

یا وہ دعا جو آپؑ نے کشتی پر سوار ہوتے وقت بارگاہ خدا میں کی تھی۔

رب انزلنی منزلا مبارکا و انت خیر المنزلین

پروردگارا! تو ہمیں کسی پُر برکت منزل پر اتارنا اور تو بہترین منزل عطا کرنے والا ہے

(مؤمنون ـــــ ۲۹)

یا وہ دعا جو سورۂ قمر کی آیہ ۱۰ میں آئی ہے۔

فدعا ربه انی مغلوب فانتصر

نوحؑ نے اپنے پروردگار سے اس طرح دعا کی: (پروردگارا) ! میں اس قوم کے چنگل میں

---

[1] "مجیبون" صیغہ جمع ہے حالانکہ اس سے مراد خدا ہے کہ جس نے نوح کی دعا قبول کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات جمع کا صیغہ اظہارِ عظمت کے لیے آتا ہے۔ جیسا کہ "نادانا" میں جمع متکلم کی ضمیر بھی اسی مقصد کے لیے ہے۔

مغلوب ہوں، میری مدد فرما۔

البتہ اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ زیر بحث آیہ ان تمام دعاؤں کی طرف اشارہ ہو اور مراد یہ ہو کہ خدا نے بہترین طریقے سے ان سب کو قبول فرمایا۔

لہذا بعد والی آیت میں بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے اور اس کے خاندان کو عظیم غم سے نجات بخشی (ونجینٰہ واھلہ من الکرب العظیم)[1]۔

یہ غم و اندوہ کیا تھا، جس نے حضرت نوحؑ کو ستا رکھا تھا؟

ممکن ہے یہ کافر و مغرور قوم کی طرف سے مذاق اڑانے اور زبانی آزار پہنچانے اور آپ کی اور آپ کے پیروکاروں کی توہین کرنے کی طرف اشارہ ہو یا اس ہٹ دھرم قوم کی طرف سے پے در پے جھٹلانے کی طرف اشارہ ہو۔

کبھی وہ کہتے تھے:

وما نراك اتبعك الا الذين هم اراذلنا

ہم نہیں دیکھتے کہ کسی نے تیری پیروی کی ہو سوائے ہمارے چند حقیر لوگوں کے۔ (ہود ــــ ۲۷)

کبھی کہتے تھے:

یانوح قد جادلتنا فاكثرت جدالنا فأتنا بما تعدنا ان كنت من الصادقين

اے نوح! تو نے ہم سے بہت باتیں کریں (اور تو خوب جھگڑ چکا ہے) اگر تو سچ کہتا ہے تو وہ عذاب جس کا تو وعدہ کیا کرتا ہے اسے لے آ۔ (ہود ــــ ۳۲)

اور کبھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ويصنع الفلك وكلما مر عليه ملأ من قومه سخروا منه

وہ تو کشتی کے بنانے میں مشغول تھا مگر جس وقت اس کی قوم کا کوئی گروہ اس کے قریب سے گزرتا تو اس کا مذاق اڑاتا (وہ کہتے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے)۔ (ہود ــــ ۳۸)

حضرت نوحؑ جیسے باحوصلہ پیغمبر کو انھوں نے اس قدر پریشان کیا اور آپؑ کی اتنی بے ادبی کی کہ آپؑ کو دیوانہ تک کہا۔ آپؑ نے عرض کیا:

رب انصرني بما كذبون

پروردگارا! ان کی تکذیب کے مقابلے میں میری مدد فرما۔ (مؤمنون ــــ ۲۶)

---

[1] "کرب" "مفردات" میں راغب کے قول کے مطابق "اندوہ شدید" کے معنی میں ہے اور "عظیم" اس معنی پر مزید تاکید کے لیے ہے۔

بہرحال مجموعی طور پر ان سب ناگوار حوادث اور زبان کے شدید زخموں نے ان کے پاکیزہ دل کو سخت پریشان کر دیا تھا۔
یہاں تک کہ طوفان آ پہنچا اور خدا نے انھیں اس ستمگر قوم کے چنگل سے اس کربِ عظیم اور اندوہ کبیر سے نجات بخشی۔
بعض مفسّرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ "کربِ عظیم" سے مراد وہی طوفان تھا، جس سے حضرت نوحؑ اور ان کے انصار و اصحاب کے علاوہ کسی نے نجات نہیں پائی، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم نے نوح کی اولاد کو (زمین پر) باقی رہ جانے والا قرار دیا۔ (و جعلنا ذریته هم الباقين)۔
کیا واقعاً تمام انسان جو اس وقت روئے زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں حضرت نوحؑ کی اولاد ہیں؟ اور کیا مذکورہ بالا آیت یہی کچھ کہتی ہے یا انبیاء و اولیاء و صلحاء کا ایک عظیم گروہ ان کی اولاد میں سے باقی رہا۔ اگرچہ تمام لوگ ان کی اولاد میں سے نہیں ہیں؟ ہم اس سلسلے میں ان آیات کی تفسیر کے بعد ایک بحث پیش کریں گے۔

اس کے علاوہ ہم نے بعد میں آنے والی امتوں میں نوح کے لیے ذکرِ خیر، ثناءِ جمیل اور نیک نام جاری رکھا (و تركنا عليه في الآخرين)۔
وہ انھیں ایک ثابت قدم قیام کرنے والا، شجاع، بہت زیادہ صبر کرنے والا، دلسوز و مہربان پیغمبر کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور انھیں شیخ الانبیاء کہتے ہیں۔
ان کی تاریخ ثبات قدم، پامردی اور استقامت کا ایک نمونہ ہے اور دشمنوں اور بے عقلوں کی سختیوں کے مقابلے میں ان کا طرزِ عمل راہِ حق کے تمام راہیوں کے لیے الہام بخش ہے۔
عالمین کے لوگوں میں نوح پر سلام (سلام على نوح في العالمين)۔
اس سے برتر و بالاتر اور کون سا اعزاز و افتخار ہوگا کہ خداوندِ عالم ان پر سلام بھیجتا ہے۔ ایسا سلام جو جہان اور جہان والوں کے درمیان باقی رہتا ہے اور دامنِ قیامت تک پھیلا دیا جاتا ہے۔ خدا کا سلام جو اس کے بندوں کی طرف سے ثناءِ جمیل اور ذکرِ خیر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔
قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں اس وسعت کے ساتھ بہت کم سلام کس کے لیے نظر آتا ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ "العالمین" (اس بناء پر کہ جمع ہے اور الف لام اس کے ساتھ ہے)۔ ایسا وسیع معنی رکھتا ہے، جو نہ صرف انسانوں بلکہ ممکن ہے کہ فرشتوں اور ملکوت کے عوالم پر بھی محیط ہو۔

اور اس غرض سے کہ یہ دوسروں کے لیے الہام بخش ہو، مزید فرمایا گیا ہے: ہم اسی قسم کی جزا نیکو کاروں کو دیتے ہیں۔ (انا كذالك نجزي المحسنين)۔

چونکہ وہ ہمارے صاحبِ ایمان بندوں میں سے تھا (انه من عبادنا المؤمنين)۔
درحقیقت مقامِ بندگی اور اسی طرح ایمان جو احسان و نیکی کے ساتھ ہو، جس کا بیان آخری دو آیات میں ہے حضرت نوحؑ کے لیے خدا کے لطف اور اندوہِ عظیم سے ان کی نجات اور ان پر خدا کے درود و سلام کی اصل وجہ تھی کیونکہ اگر یہی طرزِ عمل دوسروں کا بھی ہو تو وہ بھی اسی رحمت اور لطف کے حق دار ہوں گے کہ جن کے نوح تھے، کیونکہ پروردگار کے الطاف کا معیار تخلف ناپذیر ہے اور وہ کسی خاص شخص کے لیے نہیں ہوتا۔

آخری زیرِ بحث آیت میں ایک مختصر اور تیز جملے کے ساتھ اس ظالم شریر اور کینہ پرور قوم کا انجام بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا (ثم اغرقنا الاخرين)۔
آسمان سے بارش کا طوفان ٹوٹ پڑا اور زمین سے پانی ابلنے لگا اور سارے کا سارا کرۂ ارض تھپیڑیں مارتے ہوئے سمندر میں بدل گیا، اس نے ظالموں کے محل درہم برہم کر دیئے اور ان کے بے جان جسم صفحۂ آب پر باقی رہ گئے
قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کے ساتھ اپنے الطاف و اکرام کی بات تو اللہ تعالیٰ نے کئی آیات میں بیان کی ہے لیکن اس سرکش قوم کے عذاب کا بیان تحقیر و بے اعتنائی کے ساتھ ایک مختصر سے جملے میں تمام کر دیا ہے، کیونکہ مومنین کے افتخارات اور کامیابیوں اور ان کے لیے خدا کی مدد و نصرت کا بیان توضیح کا حق دار ہے اور سرکشوں کی حالت بے اعتنائی و بے پرواہی سے بیان ہونا چاہیے۔

ایک نکتہ

<u>کیا روئے زمین کے تمام لوگ نوحؑ کی اولاد ہیں؟</u>
بزرگ مفسرین کی ایک جماعت نے "وجعلنا ذريته هم الباقين" "ہم نے نوح کی اولاد کو زمین میں باقی رہ جانے والا قرار دیا" سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نوح کے بعد تمام نسلِ بشر انھی کی اولاد میں سے وجود میں آئی ہے اور اس وقت کے تمام انسان انھی کی اولاد ہیں۔
اس بات کو بہت سے مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ نوح کے تین بیٹے باقی رہ گئے تھے۔ سام، حام اور یافث۔ اور اس وقت کرۂ زمین پر موجود تمام نسلیں انھی پر منتہی ہوتی ہیں۔ یہ حضرات عرب، فارس اور روم کے لوگوں کو سام کی نسل سمجھتے ہیں اور ترکی نسل اور کچھ دوسرے گروہوں کو "یافث" کی اولاد سے اور سوڈان، سندھ، ہند، نوبہ، حبشہ، قبط اور بربر کے لوگوں کو حام کی اولاد میں سے شمار کرتے ہیں۔
اب بحث اس مسئلہ میں نہیں ہے کہ فلاں نسل نوحؑ کے کس بیٹے کی اولاد ہے کیونکہ اس مسئلے میں مؤرخین و مفسرین کے درمیان مختلف نظریات ہیں۔ بحث اس بارے میں ہے کہ کیا یہ سب انسانی نسلیں انھی تینوں کی طرف لوٹتی ہیں؟

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا دوسرے مؤمنین حضرت نوحؑ کے ساتھ سوار نہیں ہوئے ؟ (اگر ہوئے) تو پھر ان کا انجام کیا ہوا ؟ کیا وہ سب کے سب اس حالت میں رخصت ہوگئے کہ ان کے کوئی اولاد باقی نہ رہی ۔ یا اگر کوئی اولاد باقی رہی ہو تو وہ لڑکیاں تھیں جنھوں نے نوح کی اولاد سے شادیاں کرلیں ؟ یہ مسئلہ تاریخی لحاظ سے چنداں روشن و واضح نہیں ہے بلکہ بعض روایات اور قرآنی آیات کے کچھ اشارات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کی بھی روئے زمین پر کچھ اولاد باقی رہ گئی تھی اور کچھ قومیں ان کی اولاد میں سے ہیں ۔

ایک حدیث تفسیر علی بن ابراہیم میں امام باقر علیہ السلام سے مذکورہ بالا آیت کی وضاحت میں نقل ہوئی ہے ۔ اس میں اس طرح بیان ہوا ہے ۔

الحق والنبوۃ والکتاب والایمان فی عقبہ ، ولیس کل من فی الارض من بنی آدم من ولد نوح (ع) قال اللہ عزوجل فی کتابہ ، احمل فیھا من کل زوجین اثنین واھلک الا من سبق علیہ القول منھم ومن اٰمن وما اٰمن معہ الا قلیل ، وقال اللہ عزوجل ایضاً ذریۃ من حملنا مع نوح ۔

خدا کی اس آیہ (وجعلنا ذریتہ ھم الباقین) سے مراد یہ ہے کہ حق ، نبوت ، کتاب آسمانی اور ایمان اولادِ نوح میں باقی رہا ۔ لیکن آدم کی اولاد میں سے تمام وہ لوگ جو روئے زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں سب کے سب نوح کی اولاد میں سے نہیں ہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ اپنی کتاب میں کہتا ہے : ہم نے نوح کو حکم دیا کہ جانوروں کے جوڑوں میں سے ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلے اور اسی طرح اپنے اہلِ خانہ کو ، سوائے ان کے جنکی ہلاکت کا وعدہ کیا جا چکا ہے (نوح کی بیوی اور ایک بیٹے کی طرف اشارہ ہے) اور اسی طرح مؤمنین کو (بھی سوار کرلو) اور نوح پر تو ایک چھوٹے سے گروہ کے سوا کوئی ایمان ہی نہیں لایا تھا ۔ علاوہ ازیں (بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے) اے ان لوگوں کی اولاد کہ جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا[1]

اور اس طرح سے روئے زمین کی تمام نسلوں کا نوح کی اولاد تک منتہی ہونے کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے وہ ثابت نہیں ہے ۔

---

[1] یہ حدیث نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۴۰۵ پر آئی ہے ۔ اسی طرح تفسیر صافی میں زیرِ بحث آیات کے ذیل میں بھی ہے ۔

۸۳۔ وَ اِنَّ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ لَاِبۡرٰہِیۡمَ ۘ

۸۴۔ اِذۡ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ

۸۵۔ اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡہِ وَ قَوۡمِہٖ مَاذَا تَعۡبُدُوۡنَ ۚ

۸۶۔ اَئِفۡکًا اٰلِـہَۃً دُوۡنَ اللّٰہِ تُرِیۡدُوۡنَ ؕ

۸۷۔ فَمَا ظَنُّکُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

۸۸۔ فَنَظَرَ نَظۡرَۃً فِی النُّجُوۡمِ ۙ

۸۹۔ فَقَالَ اِنِّیۡ سَقِیۡمٌ

۹۰۔ فَتَوَلَّوۡا عَنۡہُ مُدۡبِرِیۡنَ

۹۱۔ فَرَاغَ اِلٰۤی اٰلِہَتِہِمۡ فَقَالَ اَلَا تَاۡکُلُوۡنَ ۚ

۹۲۔ مَا لَکُمۡ لَا تَنۡطِقُوۡنَ

۹۳۔ فَرَاغَ عَلَیۡہِمۡ ضَرۡبًۢا بِالۡیَمِیۡنِ

۹۴۔ فَاَقۡبَلُوۡۤا اِلَیۡہِ یَزِفُّوۡنَ

ترجمہ

۸۳۔ اور ابراہیم اس (نوح) کے پیروکاروں میں سے تھا۔

۸۴۔ یاد کرو اس وقت کو جبکہ وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں آیا۔

۸۵۔ جس وقت اس نے اپنے باپ (یعنی چچا) اور اپنی قوم سے کہا: کہ یہ کیا چیزیں ہیں جنھیں تم پوجتے ہو؟

۸۶۔ کیا خدا کو چھوڑ کر ان جھوٹے معبودوں کی طرف جاتے ہو؟

۸۷۔ تم پروردگارِ عالمین کے بارے میں کیا گمان کرتے ہو؟

۸۸۔ (پھر) اس نے ستاروں کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔
۸۹۔ اور کہا میں تو بیمار ہوں (اور تمھارے ساتھ جشن میں نہیں جا سکتا)۔
۹۰۔ انھوں نے اس سے منہ پھیر لیا (اور تیزی کے ساتھ اس سے دُور ہو گئے)۔
۹۱۔ (وہ بُت خانہ میں داخل ہوا) چپکے سے ان کے معبودوں پر ایک نظر ڈالی اور تمسخر کے طور پر کہا: ان غذاؤں میں سے کھاتے کیوں نہیں ہو؟
۹۲۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم بولتے کیوں نہیں؟
۹۳۔ اس کے بعد اپنے دائیں ہاتھ سے ایک پوری توجّہ کے ساتھ ان کے جسم پر ایک زوردار ضرب لگائی (اور بڑے بُت کے سوا سب کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا)۔
۹۴۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آئے۔

تفسیر

ابراہیم کی بُت شکنی کا زبردست منظر

حضرت نوحؑ کی بھرپور تاریخ کے کئی گوشوں کو بیان کرنے کے بعد اب ان آیات میں بُت شکنی کے ہیرو حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے ایک اہم حصّے کو بیان کیا گیا ہے۔

یہاں پر پہلے حضرت ابراہیمؑ کی بُت شکنی کے واقعے اور ان سے بُت پرستوں کی شدید مدھ بھیڑ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے حصّے میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی عظیم فداکاری اور ان کے فرزند کی قربانی کے مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا یہ حصّہ قرآن مجید میں صرف اسی مقام پر بیان کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں قصّۂ ابراہیمؑ کو قصّۂ نوحؑ کے ساتھ اس طرح سے منسلک کیا گیا ہے: اور ابراہیم نوح کے پیروکاروں میں سے تھا (وان من شیعته لابراهیم)۔

وہ اسی راہِ توحید و عدل اور اسی راہِ تقویٰ و اخلاص پر گامزن تھا جو نوح کی سُنّت تھی، کیونکہ انبیاء سارے کے سارے ایک ہی مکتب کے مبلغ اور ایک ہی یونیورسٹی کے استاد ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے پروگرام کو دوام بخشتا، اسے آگے بڑھاتا اور اس کی تکمیل کرتا ہے۔

کیسی عمدہ تعبیر ہے کہ ابراہیم نوح کے شیعوں میں سے تھے حالانکہ ان دونوں کے زمانے میں بہت فاصلہ تھا (بعض مفسّرین کے قول کے مطابق تقریباً ۲۶۰۰ سال)

لیکن ہم جانتے ہیں کہ مکتبی رشتے میں زمانے کی کوئی حیثیت نہیں ہے [۱]

اس اجمالی بیان کے بعد اس کی تفصیل پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : یاد کرو اس وقت کو جبکہ ابراہیم قلب سلیم کے ساتھ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں آیا (اذ جاء ربه بقلب سليم) ۔

مفسرین نے "قلب سلیم" کی متعدد تفسیریں بیان کی ہیں ، جن میں سے ہر ایک اس مسئلے کی جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ مثلاً

وہ دل جو شرک سے پاک ہو ۔

وہ دل جو گناہوں، کینہ اور نفاق سے پاک ہو ۔

وہ دل جو عشق دنیا سے خالی ہو ۔

وہ دل جس میں خدا کے سوا اور کچھ نہ ہو ۔

حقیقت یہ ہے کہ "سلیم" سلامت کے مادہ سے ہے اور جب مطلق طور سے سلامت کہا جائے تو اس سے مراد ہر قسم کی اخلاقی و اعتقادی بیماری سے سلامتی ہوگی ۔

قرآن مجید منافقین کے بارے میں کہتا ہے :۔

في قلوبهم مرض فزادهم الله مرضا

ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور خدا بھی (ان کی ہٹ دھرمی اور گناہ کی وجہ سے) اس بیماری میں اضافہ کر دیتا ہے ۔ (بقرہ ـــــ ۱۰)

"قلب سلیم" کی عمدہ ترین تفسیر امام صادق نے فرمائی ہے ۔ آپ فرماتے ہیں :۔

القلب السليم الذي يلقى ربه وليس فيه احد سواه

قلب سلیم ایک ایسا دل ہوتا ہے جو خدا سے اس حالت میں ملاقات کرے کہ اس میں

---

[۱] بعض مفسرین نے "شیعتہ" کی ضمیر پیغمبر اسلام کی طرف پلٹائی ہے حالانکہ قرآن کی آیات یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر اسلام، دین ابراہیم کے پیرو تھے ۔ اس کے علاوہ اس قسم کی ضمیر کا مرجع قبل و بعد کی آیات میں موجود نہیں ہے ۔ شاید انھوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ شیعہ کی تعبیر حضرت نوح کی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضلیت کی دلیل ہے جبکہ قرآن ابراہیم کے لیے دلاثر شخصیت کا قائل ہے لیکن یہ تعبیر اس مسئلے پر کوئی دلیل نہیں رکھتی بلکہ اس سے مراد راہ فکری و مکتبی کا دوام ہے ، جیساکہ پیغمبر اسلام کا تمام انبیاء سے افضل ہونا، ابراہیم کے مکتب توحیدی کی پیروی کے منافی نہیں ۔ قرآن کہتا ہے :۔

فبهداهم اقتده

اے پیغمبر! گزشتہ انبیاء کی ہدایت کی پیروی کر ۔ (انعام ۔ ۹۰)

خدا کے سوا اور کچھ نہ ہو[1]

یہ تعبیر تمام مذکورہ بالا اوصاف کی جامع ہے۔

اس کے علاوہ ایک دوسری روایت میں امام صادق علیہ السلام سے ہی مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:۔

صاحب النیة الصادقة صاحب القلب السلیم، لان سلامة القلب من ھو اجس المذکورات تخلص النیة لله فی الامور کلھا

جو شخص نیت صادق رکھتا ہے وہ صاحب قلب سلیم ہے کیونکہ شرک و شک سے دل کی سلامتی نیت کو ہر چیز میں خالص کر دیتی ہے[2]

قلب سلیم کی اہمیت کے بارے میں یہی کافی ہے کہ قرآن مجید اسے روز قیامت کے لیے اکیلا ہی سرمایۂ نجات شمار کرتا ہے چنانچہ سورۂ شعراء کی آیہ ۸۸ - ۸۹ میں اسی عظیم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کی زبانی یہ بیان کیا گیا ہے:۔

یوم لا ینفع مال و لا بنون الا من اتی الله بقلب سلیم

اس دن مال و اولاد انسان کو کوئی فائدہ نہ دیں گے، البتہ جو قلب سلیم کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوگا[3]

ہاں! ابراہیمؑ قلب سلیم، روح پاک، قوی ارادہ اور عزم راسخ کے ساتھ بت پرستوں کے خلاف جہاد کے لیے مامور ہوئے اور اپنے باپ (یعنی چچا) اور اپنی قوم سے اس کا آغاز کیا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

یاد کرو اس وقت کو جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: یہ کیا چیزیں ہیں کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو۔ (اذ قال لابیه و قومه ماذا تعبدون)۔

کیا یہ بات قابلِ افسوس نہیں ہے کہ انسان باوجود اس مقام ذاتی اور عقل و خرد کے، بے قدر و قیمت اور حقیر مٹی اور لکڑیوں کی تعظیم کرے؟ تمھاری عقل کہاں کھو گئی؟

اس تعبیر میں بتوں کی کھلی تحقیر موجود تھی پھر اس بات کی ایک دوسرے جملے سے تکمیل کی اور کہا: کیا تم خدا کو چھوڑ کر جو برحق ہے جھوٹے خداؤں کے پیچھے جاتے ہو (ائفکا آلهة دون الله تریدون)۔[4]

---

[1] تفسیر صافی، سورۂ شعراء کی آیہ ۸۹ کے ذیل میں۔ بحوالہ کافی

[2] ایضاً

[3] قلب سلیم کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۸ میں سورۂ شعراء کی آیہ ۸۸، ۸۹ کے ذیل میں ہم نے تفصیلی بحث کی ہے۔

[4] اس جملے کی تفسیر میں مفسرین نے دو احتمال ذکر کیے ہیں۔ پہلا یہ کہ "افکا" مفعول ہے "تریدون" کا اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

" افك " بڑے جھوٹ کے معنی میں ہے یا قبیح ترین جھوٹ کے معنی میں ہے۔ ایسے الفاظ کے استعمال سے حضرت ابراہیم کی قاطعیت اور بتوں کے بارے میں ان کا دو ٹوک فیصلہ زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

آخر میں ایک اور تیکھے جملے کے ساتھ اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا: تمھارا عالمین کے پروردگار کے بارے میں کیا گمان ہے؟ (فما ظنکم برب العالمین)۔

روزی تم اس کی کھاتے ہو، اس کی نعمتوں نے تمھارے سارے وجود کا احاطہ کیا ہوا ہے، اس کے باوجود تم نے حقیر اور بے قدر و قیمت موجودات کو اس کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ اس حالت میں بھی تم یہ امید رکھتے ہو کہ وہ تم پر رحم کرے اور تمھیں زیادہ سخت عذاب کے ساتھ سزا نہ دے؟ کتنی بڑی غلطی ہے یہ؟ اور کتنی خطرناک گمراہی ہے یہ؟

"رب العالمین" کی تعبیر میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سارے عالم کا نظام اس کے سایہ ربوبیت میں چلتا ہے تم اسے چھوڑ کر معمولی سی خیالی اور وہمی چیز کے پیچھے لگ گئے ہو، جس سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

تواریخ و تفاسیر میں آیا ہے کہ بابل کے بت پرست ہر سال ایک مخصوص عید کے دن کچھ رسومات ادا کیا کرتے تھے۔ بت خانہ میں کھانے تیار کرتے ہیں اور وہیں انھیں دستر خوان پر چن دیتے تھے اس خیال سے کہ یہ کھانے متبرک ہو جائیں گے۔ اس کے بعد سب کے سب مل کر اکٹھے شہر سے باہر چلے جاتے تھے اور دن کے آخر میں واپس لوٹتے تھے اور عبادت کرنے اور کھانا کھانے کے لیے بتخانہ میں آجاتے تھے۔ ایک روز اسی طرح شہر خالی ہو گیا اور بتوں کو توڑنے اور انھیں درہم برہم کرنے کے لیے ایک اچھا موقع حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ آگیا۔ یہ ایسا موقع تھا جس کا ابراہیمؑ عرصے سے انتظار کر رہے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ہاتھ سے نکل جائے۔

لہٰذا جب انھوں نے ابراہیمؑ کو جشن میں شرکت کی دعوت دی تو " اس نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی" (فنظر نظرة فی النجوم)۔

" اور کہا میں تو بیمار ہوں" (فقال انی سقیم)

اور اس طرح سے اپنی طرف سے عذر خواہی کی۔

بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا۔ " اٰلھة" اس سے بدل ہے، دوسرا یہ کہ " اٰلھة" مفعول بہ ہے اور " افکا" مفعول لاجلہ ہے کہ جسے اہمیت کی بنا پر مقدم رکھا گیا ہے۔

"انھوں نے رُخ پھیرا اور جلدی سے اس سے دور ہو گئے" اور اپنے رسم و رواج کی طرف روانہ ہو گئے (فتولوا عنه مدبرين)۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں :۔

پہلا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی طرف کیوں دیکھا ۔ اس دیکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا ؟

دوسرا یہ کہ کیا واقعاً وہ بیمار تھے کہ انھوں نے کہا میں بیمار ہوں ؟ انھیں کیا بیماری تھی ؟

پہلے سوال کا جواب بابل کے لوگوں کے اعتقادات اور رسوم و عادات کو دیکھتے ہوئے واضح و روشن ہے۔ وہ علم نجوم میں بہت ماہر تھے۔ یہاں تک کہتے ہیں کہ ان کے بُت بھی ستاروں کے ہیکلوں اور شکلوں میں تھے اور اسی بنا پر ان کا احترام کرتے تھے کہ وہ ستاروں کے سمبل تھے۔

البتہ علم نجوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ بہت سی خرافات بھی ان کے درمیان موجود تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ستاروں کو اپنی سرنوشت میں مؤثر سمجھتے تھے اور ان سے خیر و برکت طلب کرتے تھے اور ان کی وضع و کیفیت سے آنے والے واقعات پر استدلال کرتے تھے۔

ابراہیمؑ نے اس غرض سے کہ انھیں مطمئن کر دیں، ان کی رسوم کے مطابق آسمان کے ستاروں پر ایک نظر ڈالی تاکہ وہ یہ تصور کریں کہ انھوں نے اپنی بیماری کی پیش گوئی ستاروں کے اوضاع کے مطالعے سے کی ہے اور وہ مطمئن ہو جائیں۔

بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ستاروں کی حرکت سے اپنی بیماری کا وقت ٹھیک طور سے معلوم کریں کیونکہ ایک قسم کی بیماری انھیں تھی وہ یہ کہ بخار انھیں ایک خاص وقفے کے ساتھ آتا تھا لیکن بابل کے لوگوں کے افکار و نظریات کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ان کا آسمان کی طرف دیکھنا درحقیقت اسرار آفرینش میں مطالعہ کے لیے تھا اگرچہ وہ آپ کی نگاہ کو ایک منجم کی نگاہ سمجھ رہے تھے جو یہ چاہتا ہے کہ ستاروں کے اوضاع سے آئندہ کے واقعات کی پیش بینی کرے۔

دوسرے سوال کے مفسرین نے متعدد جواب دیئے ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ واقعاً بیمار تھے ، اگرچہ وہ صحیح و سالم بھی ہوتے تب بھی بتوں کے جشن کے پروگرام میں ہرگز شرکت نہ کرتے ، لیکن ان کی بیماری ان مراسم میں شرکت نہ کرنے اور بتوں کو توڑنے کے لیے ایک سنہری موقع اور اچھا بہانہ بھی تھا، اور اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ انھوں نے یہاں "توریہ" کیا تھا ، کیونکہ انبیاء کے لیے "توریہ" کرنا مناسب نہیں ہے۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ ابراہیمؑ کو واقعی طور پر کوئی جسمانی بیماری نہیں تھی لیکن ان کی روح ان لوگوں کے غیر موزوں اعمال اور ان کے کفر و شرک اور ظلم و گناہ کی بنا پر بیمار تھی۔ اس بنا پر انھوں نے حقیقت کو بیان کیا اگرچہ انھوں نے دوسری طرح سوچا اور حضرت ابراہیمؑ کو جسمانی طور پر بیمار سمجھا۔

یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس گفتگو میں توریہ کیا ہوگا۔

مثلاً یہ کہ کوئی شخص گھر کے دروازے پر آکر سوال کرتا ہے کہ فلاں شخص گھر میں ہے، وہ جواب میں کہتے ہیں: یہاں نہیں ہے اور "یہاں" سے ان کی مراد گھر کے دروازے کے پیچھے ہوتی ہے نہ کہ سارا گھر۔ جبکہ سننے والا اس طرح نہیں سمجھتا (ایسی تعبیرات کو جو جھوٹ نہیں ہیں لیکن ان کا ظاہر کچھ اور ہوتا ہے، فقہ میں "توریہ" کہتے ہیں)۔

اس بات سے حضرت ابراہیمؑ کی مراد یہ تھی کہ ہو سکتا ہے میں آئندہ بیمار ہو جاؤں، تاکہ وہ ان سے الگ ہو کر اپنا کام کریں۔

لیکن پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس طرح ابراہیمؑ اکیلے شہر میں رہ گئے اور بت پرست شہر خالی کر کے باہر چلے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ادھر ادھر دیکھا، شوق کی بجلی ان کی آنکھوں میں چمکی، وہ لمحات جن کا وہ ایک مدت سے انتظار کر رہے تھے آن پہنچے۔ انھوں نے اپنے آپ سے کہا، بتوں سے جنگ کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور سخت ضرب ان کے پیکروں پر لگا۔ ایسی ضرب جو بت پرستوں کے سوئے ہوئے دماغوں کو ہلا کر رکھ دے اور انھیں بیدار کر دے۔

قرآن کہتا ہے: وہ ان کے خداؤں کے پاس آیا، ایک نگاہ ان پر اور کھانے کے ان برتنوں پر جو ان کے اطراف میں موجود تھے، ڈالی اور تمسخر کے طور پر کہا: تم یہ کھانے کھاتے کیوں نہیں؟ (فراغ الی الٰھتھم فقال الا تأکلون)[1]

یہ کھانے تو تمھاری عبادت کرنے والوں نے فراہم کیے ہیں، مرغن و شیریں، طرح طرح کی رنگین غذائیں ہیں، کھاتے کیوں نہیں ہو؟

اس کے بعد مزید کہتا ہے: تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم بات کیوں نہیں کرتے؟ تم گونگے کیوں بن گئے ہو؟ تمھارا منہ کیوں بند ہے؟ (مالکم لا تنطقون)۔

اس طرح ان کے تمام بیہودہ اور گمراہ عقائد کا مذاق اڑایا۔ بلاشک وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ نہ کھانا کھاتے ہیں اور نہ ہی بات کرتے ہیں اور بے جان موجودات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن حقیقت میں وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی بت شکنی کے اقدام کی دلیل اس عمدہ اور خوبصورت طریقہ سے پیش کریں۔

پھر انھوں نے اپنی آستین چڑھالی، کلھاڑا ہاتھ میں اٹھایا اور پوری طاقت کے ساتھ اسے گھمایا اور بھرپور "توجہ" کے ساتھ ایک زبردست ضرب ان کے پیکر پر لگائی (فراغ علیھم ضربا بالیمین)۔

"یمین" سے مراد یا تو واقعی دایاں ہاتھ ہے جس سے انسان اپنے زیادہ تر کام کرتا ہے اور یا یہ قدرت و قوت کیلیے

---

[1] "راغ" "روغ" کے مادہ سے کسی چیز کی طرف توجہ اور میلان کے معنی میں ہے، جو پوشیدہ اور مخفی طور سے ہو یا سازش اور تخریب کی صورت میں۔

کنایہ ہے (دونوں معنی بھی ہو سکتے ہیں)۔

بہر حال تھوڑی سی دیر میں وہ آباد اور خوبصورت بت خانہ ایک وحشت ناک ویرانہ بن گیا۔ تمام بت ٹوٹ پھوٹ گئے، ہر ایک ہاتھ پاؤں تڑوائے ہوئے ایک کونے میں پڑا تھا اور یہ چیز بت پرستوں کے لیے ایک دلخراش، افسوسناک اور غم انگیز منظر تھا۔

ابراہیمؑ اپنا کام کر چکے اور پورے اطمینان و سکون کے ساتھ بتکدے سے باہر آئے اور اپنے گھر چلے گئے۔ اب وہ اپنے آپ کو آئندہ کے حوادث کے لیے تیار کر رہے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ انھوں نے شہر میں بلکہ پورے ملک بابل میں ایک بہت بڑا دھماکہ کیا ہے جس کی صدا بعد میں بلند ہوگی۔ غصّہ اور غضب کا ایک ایسا طوفان اٹھے گا اور وہ اس طوفان میں اکیلے ہوں گے۔ لیکن ان کا خدا موجود ہے اور وہی ان کے لیے کافی ہے۔

بُت پرست شہر میں واپس لوٹے اور بُت خانے کی طرف آئے، کتنا وحشت ناک اور مبہوت کن منظر تھا؟ جہاں کے تہاں بے حس و حرکت ہوگئے؟ کافی دیر تک ان کے اوساں خطا رہے۔ انتہائی حیرانی اور پریشانی کے عالم میں اس ویرانے پر نگاہ ڈالی اور ان بتوں کو جنھیں وہ اپنی بے پناہی کے دن کے لیے پناہ گاہ خیال کیا کرتے تھے وہاں بے پناہ دیکھا۔

اس کے بعد سکوت ٹوٹا اور چیخ و پکار اور نالہ و فریاد کی صدا بلند ہوئی ——— کس نے کیا ہے یہ کام؟ کون تھا وہ ستمگر؟

دیر نہ گزری تھی کہ انھیں یاد آگیا۔ اس شہر میں ایک خدا پرست جوان رہتا ہے۔ اس کا نام ابراہیم ہے۔ وہ بتوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اور اس نے یہ دھمکی دی تھی کہ میں نے تمھارے بتوں کے لیے ایک خطرناک منصوبہ بنالیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اسی نے کیا ہے۔

پھر وہ اس کی طرف چل پڑے۔ وہ بڑی تیزی سے (اور غصّہ کے عالم میں) چل رہے تھے "(فاقبلوا الیہ یزفون)۔

"یزفون" "زف" (بروزن "کف") کے مادہ سے دراصل ہوا کے چلنے اور شتر مرغ کے تیز دوڑنے کے معنی میں ہے جبکہ شتر مرغ دوڑتے ہوئے پھڑ پھڑا بھی رہا ہوتا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ بطور کنایہ "زفاف عروس" یعنی دلہن کو دولہا کے گھر لے جانے کے موقع پر استعمال ہونے لگا۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ بُت پرست تیزی کے ساتھ ابراہیم کی طرف آئے اس قصّے کا باقی حصّہ بعد کی آیات میں بیان ہوگا۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا انبیاء بھی توریہ کرتے ہیں؟: پہلے ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ "توریہ" کیا ہوتا ہے؟

"توریہ" (بروزن "توصیہ") کو بعض اوقات "معاریض" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد ہے ایسی بات کہنا جس کا ایک ظاہری مفہوم ہو لیکن کہنے والے کی مراد کچھ اور ہو، اگرچہ سامع کی نظر ظاہری مفہوم کی طرف ہی جاتی ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی آدمی سے سوال کرتا ہے: تم سفر سے کب آئے ہو؟ وہ کہتا ہے: غروب سے پہلے۔ حالانکہ وہ ظہر سے پہلے آیا ہے سننے والا اس کلام سے غروب سے تھوڑا سا پہلے سمجھتا ہے، جبکہ کہنے والے کا ارادہ زوال سے پہلے ہے، کیونکہ وہ بھی غروب سے پہلے ہے۔

یا کوئی شخص دوسرے سے سوال کرتا ہے: "کیا تو نے کھانا کھایا ہے"؟ وہ کہتا ہے: ہاں! سامع اس بات سے یہ سمجھا ہے کہ اس نے آج کھا لیا ہے جبکہ اس کی مراد یہ ہے کہ اس نے کل کھانا کھایا ہے۔

یہ نکتہ فقہ کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ کیا توریہ جھوٹ شمار ہوتا ہے یا نہیں؟ بعض بزرگ فقہاء جن میں شیخ انصاری (رضوان اللہ علیہ) بھی شامل ہیں کا نظریہ ہے کہ توریہ جھوٹ میں داخل نہیں ہے نہ عرفاً اس پر جھوٹ صادق آتا ہے اور نہ ہی اسلامی روایات سے اس کا جھوٹ سے تعلق معلوم ہوتا ہے، بلکہ چند روایات میں باقاعدہ اس کے جھوٹ ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

امام صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے۔

الرجل یستأذن علیه فیقول للجاریة قولی لیس هو هیهنا، فقال (ع) لا بأس لیس بکذب

کوئی شخص دروازے پر آتا ہے اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہتا ہے، صاحب خانہ (کو اس کی پذیرائی میں کوئی امر مانع ہے) اپنی کنیز سے کہتا ہے کہہ دے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ (اور اس نے مراد مثلاً گھر کے دروازے کے پیچھے ہے)۔ امام نے فرمایا: یہ جھوٹ نہیں ہے [1]

حق یہ ہے کہ یہاں کچھ تفصیل کی ضرورت ہے اور ایک ضابطۂ کلی کے طور پر کہنا چاہیے کہ جہاں لفظ لغوی و عرفی مفہوم کے لحاظ سے دو معانی کی قابلیت رکھتا ہے لیکن مخاطب کا ذہن اس سے ایک معنی مراد لیتا ہے جبکہ کہنے والے کی نظر میں دوسرا معنی ہے، اس قسم کا توریہ جھوٹ نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ مشترک لفظ استعمال کریں۔ سننے والے کا ذہن ایک معنی کی طرف متوجہ ہو جبکہ کہنے والے کی نظر دوسرے معنی کی طرف ہو۔

مثلاً سعید بن جبیر کے حالات میں منقول ہے کہ حجاج نے ان سے پوچھا کہ تمھارا نظریہ میرے متعلق کیسا ہے؟ انھوں نے کہا: میرے نظریہ کے مطابق "تو عادل ہے"۔ حجاج کے مصاحبین اور حامی خوش ہو گئے۔ حجاج نے کہا: اس نے اس بات سے میرے کفر کا حکم صادر کیا ہے۔ کیونکہ عادل کا ایک معنی حق کے باطل کی طرف عدول کرنے والا اور منہ پھیر لینے والا ہے۔

لیکن اگر لفظ لغوی اور عرفی مفہوم کے لحاظ سے ایک ہی معنی رکھتا ہے اور کہنے والا اسے چھوڑ کر، قرینہ مجاز ذکر کیے بغیر مجازی معنی مراد لے تو اس قسم کا توریہ بلاشک و شبہ حرام ہے اور ممکن ہے۔ اس تفصیل کے ذریعے فقہاء کے مختلف نظریات کیجا اور جمع کیے

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۸ ص ۵۸۰ (باب ۱۴۱ از ابواب العشرہ حدیث ۸)

جاسکیں۔

البتہ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ ایسے مواقع پر بھی، جہاں توریہ جھوٹ کا مصداق نہیں ہے بعض اوقات اس کے مفاسد کا حامل ہوتا ہے اور جہالت میں پڑنے اور لوگوں کو غلطی میں ڈالنے کا سبب بنتا ہے اور اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ بعض اوقات حرام کے مرحلہ تک پہنچ جائے لیکن جب اس میں نہ تو اس قسم کا کوئی مفسدہ ہو اور نہ ہی وہ جھوٹ کا مصداق ہو تو اس کی حرمت پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور امام صادقؑ کی روایت اسی پہلو سے ہے۔ اس بنا پر صرف جھوٹ نہ ہونا توریہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ دوسرے مفاسد بھی اس میں نہ ہوں۔

البتہ وہ مواقع جہاں ضرورت کا تقاضا ہو کہ انسان جھوٹ بولے وہاں یقیناً جب تک توریہ ممکن ہے اسے توریہ کرنا چاہیے تاکہ اس کی بات جھوٹ کا مصداق نہ بنے۔

باقی رہی یہ بات کہ انبیاء کے لیے توریہ جائز ہے یا نہیں؟ تو کہنا چاہیے کہ وہ صورت جس میں توریہ عام لوگوں کے اعتماد کے تزلزل کا موجب بنتا ہے، وہاں جائز نہیں ہے کیونکہ تبلیغ کی راہ میں انبیاء کا سرمایہ عام لوگوں کا اعتماد ہی تو ہے۔ لیکن ایسے مواقع جس کی مثال مذکورہ بالا آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی داستان ہے میں کوئی اشکال نہیں۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ نے بیماری کا اظہار کیا، منجمین کی طرح آسمان کی طرف دیکھا۔ البتہ خیال ہے کہ ایسے کام میں ایک اہم مقصد پیش نظر ہو اور اس سے حق طلب لوگوں کا اعتماد بھی ڈانواں ڈول نہ ہوتا ہو۔

۲۔ ابراہیمؑ اور "قلب سلیم": ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی اصطلاح میں "قلب" روح اور عقل کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "قلب سلیم" اس پاک اور سالم روح کے لیے بولا جاتا ہے جو ہر قسم کے شرک، شک اور گناہ سے پاک ہو۔

قرآن مجید نے بعض قلوب کو "قاسیة" (قساوت مند) قرار دیا ہے۔ (مائدہ ــــ ۱۳)

بعض قلوب کا "ناپاک" کے عنوان سے تعارف کروایا ہے۔ (مائدہ ــــ ۴۱)

کچھ دلوں کو "بیمار" کہا ہے۔ (بقرہ ــــ ۱۰)

بعض دلوں کو "مہرزدہ" اور بند کہا ہے۔ (توبہ ــــ ۸۷)

ان کے مقابل میں قرآن "قلب سلیم" کو پیش کرتا ہے کہ جس میں ان عیوب میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ پاک بھی ہے اور نرم و مہربان بھی، سالم بھی ہے اور حق کو قبول کرنے والا بھی۔

یہ وہی قلب ہے کہ روایات میں جس کی "حرم خدا" کہہ کر تعریف کی گئی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے

القلب حرم الله فلا تسکن حرم الله غیر الله

قلب حرم خدا ہے، خدا کے حرم میں خدا کے غیر کو نہ بساؤ۔[1]

---

[1] بحار جلد ۷۰، صفحہ ۲۵ "باب حب اللہ حدیث ۲۷"۔

یہی وہ قلب ہے جو غیب کے حقائق دیکھ سکتا ہے اور عالمِ بالا کے ملکوت کا نظارہ کر سکتا ہے، جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں منقول ہے:

لولا ان الشیاطین یحومون علی قلوب بنی اٰدم لنظروا الی الملکوت

اگر شیاطین اولادِ آدم کے دلوں کو گھیر نہ لیں تو وہ عالمِ ملکوت کو دیکھ سکتے ہیں۔[1]

بہرحال قیامت میں نجات کے لیے بہترین سرمایہ قلبِ سلیم ہے اور یہی قلبِ سلیم تھا جس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پروردگار کی بارگاہ کی طرف چلے اور فرمانِ رسالت حاصل کیا۔

یہ بیان ہم ایک اور حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، ایک روایت میں آیا ہے:

ان اللہ فی عبادہ اٰنیة وھو القلب فاحبھا الیہ "اصفاھا" و "اصلبھا" و "ارقھا": اصلبھا فی دین اللہ، واصفاھا من الذنوب، وارقھا علی الاخوان

خدا کا اس کے بندوں میں ایک ظرف اور پیمانہ ہے۔ جس کا نام "دل" ہے۔ ان میں سے سب سے بہتر وہی ہے جو زیادہ صاف و شفاف، زیادہ محکم اور زیادہ لطیف ہو۔ خدا کے دین میں سب سے زیادہ محکم ہو، گناہوں سے سب سے زیادہ پاک ہو اور دینی بھائیوں کے لیے زیادہ لطیف اور مہربان ہو۔[2]

---

[1] بحار جلد ۷۰، ص ۵۹ "باب القلب وصلاحہ" حدیث ۲۹

[2] بحار جلد ۷۰، ص ۵۶ "باب القلب وصلاحہ" حدیث ۲۰

۹۵۔ قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ۝

۹۶۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝

۹۷۔ قَالُوا ابۡنُوۡا لَهٗ بُنۡيَانًا فَاَلۡقُوۡهُ فِى الۡجَحِيۡمِ ۝

۹۸۔ فَاَرَادُوۡا بِهٖ كَيۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَسۡفَلِيۡنَ ۝

۹۹۔ وَقَالَ اِنِّىۡ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ ۝

۱۰۰۔ رَبِّ هَبۡ لِىۡ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝

ترجمہ

۹۵۔ اس (ابراہیم) نے کہا: کیا تم ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جسے اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو۔؟

۹۶۔ حالانکہ خدا نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور (ان بتوں کو بھی) جنھیں تم بناتے ہو۔

۹۷۔ انھوں نے کہا: اس کے لیے ایک اونچی سی جگہ بناؤ اور اسے آگ کے جہنم میں پھینک دو۔

۹۸۔ انھوں نے تو ابراہیم کو ختم کرنے کی تدبیر کر لی تھی لیکن ہم نے ان سب کو پست اور مغلوب کر دیا۔

۹۹۔ (وہ اس ہلاکت خیزی میں سے سلامتی کے ساتھ نکل آیا) اور اس نے کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہ میری راہنمائی کرے گا۔

۱۰۰۔ پروردگارا! مجھے صالح (اولاد) عطا فرما۔

تفسیر

مشرکین کے منصوبے خاک میں مل گئے

آخر بُت شکنی کے واقعے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو اسی الزام میں عدالت میں لے گئے۔

وہ انھیں ملزم ٹھہراتے ہوئے ان سے پوچھنے لگے کہ:

"اس بات کی وضاحت کرو کہ بُت خانے کا دہشت ناک حادثہ کس کے ہاتھ سے انجام پایا ہے؟"

قرآن نے اس واقعے کی تفصیل سورۂ انبیاء میں بیان کی ہے اور زیر بحث آیات میں اس کے صرف ایک حساس حصے کا ذکر کیا ہے اور وہ ہے بت پرستی کے باطل ہونے کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی ان سے آخری گفتگو ۔ ابراہیم نے کہا : کیا تم ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جسے تم اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو (قال اتعبدون ما تنحتون) ۔

کیا کوئی بھی عقل مند انسان اپنی بنائی ہوئی چیز کی عبادت کرتا ہے ؟ کیا کوئی ذی شعور اپنی مخلوق کے سامنے زمین پر زانو جھکاتا ہے ؟ کون سی عقل و منطق تمھیں ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے ؟

معبود تو وہ ہونا چاہیے جو انسان کا خالق ہو نہ وہ کہ جو خود انسان کا تراشیدہ ہو ۔ اب اچھی طرح سے غور کرو اور معبودِ حقیقی کو تلاش کرو ۔ " خدا نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور ان بتوں کو بھی جنھیں تم بناتے ہو " (واللہ خلقکم و ما تعملون) ۔

آسمان و زمین سب اسی کی مخلوق ہیں اور زمان و مکان سب اسی کے بنائے ہوئے ہیں ایسے خالق کے آستانے پر سر رکھنا چاہیے اور اس کی پرستش و عبادت کرنا چاہیے ۔

یہ ایک بہت ہی قوی اور دندان شکن دلیل ہے ، جس کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا ۔

" ماتعملون " میں " ما " اصطلاح کے مطابق " ماموصولہ " ہے (نہ کہ مامصدریہ) حضرت ابراہیمؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خدا نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور تمھاری مصنوعات کو بھی ۔ اگر بتوں پر انسان کے " مصنوع " یا " معمول " کے لفظ کا اطلاق ہو تو یہ اس صورت کی بنا پر ہے جو انسان اسے دیتا ہے ، ورنہ اس کا مادہ تو خدا ہی نے پیدا کیا ہے ۔ یہ بات بالکل اس طرح ہے کہ کہتے ہیں یہ فرش ، یہ گھر اور یہ گاڑی اور بس انسان کی بنائی ہوئی ہے ۔ یقیناً اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان نے اس کے مواد کو بنایا ہے بلکہ ان کی شکل و صورت انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے ۔

لیکن اگر " ما " کو مصدری معنی میں لیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور تمھارے اعمال کو بھی ۔ البتہ یہ معنی بھی غلط نہیں ہے اور بعض کے نظریہ کے برخلاف جبر پر بھی دلالت نہیں کرتا ، کیونکہ ہمارے اعمال اگرچہ ہمارے ارادہ و اختیار سے انجام پاتے ہیں لیکن کسی کام کے کرنے کے لیے ارادہ و قدرت اور دوسری قوتیں جن کے ساتھ انسان اپنے افعال انجام دیتا ہے سب خدا کی طرف سے ہیں لیکن اس کے باوجود آیت اس معنی پر دلالت نہیں کرتی بلکہ یہ بتوں پر دلالت کرتی ہے ۔ آیت یہ کہتی ہے کہ " خدا تمھارا بھی خالق ہے اور ان بتوں کا بھی جنھیں تم نے تراشا ہے " اور بات کا لطف بھی اسی میں ہے ، کیونکہ بحث بتوں کے بارے میں تھی نہ کہ انسانی اعمال کے بارے میں ۔

درحقیقت یہ آیت اس بات کے مشابہ ہے جو حضرت موسیٰؑ اور جادوگروں کی داستان میں آئی ہے ، جہاں قرآن بیان کرتا ہے ۔

فاذا ھی تلقف ما یأفکون

موسیٰ نے عصا پھینکا ، تو وہ بہت بڑا اژدہا بن گیا اور جو کچھ انھوں نے جھوٹ موٹ بنا رکھا تھا انھیں نگل گیا ۔ (اس سے مراد جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپ ہیں) ۔ (اعراف ـــــ ۱۱۷)

لیکن ہم جانتے ہیں کہ جھوٹے اور سرکش لوگ کبھی بھی منطق و استدلال سے آشنا نہیں رہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کی طاقتور اور عمدہ دلیل کا بابل کے جابر نظام کے سرداروں کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہوسکتا ہے مستضعف عوام کے ایک گروہ کو اس نے بیدار بھی کیا ہو۔ لیکن وہ مستکبرین جو اس توحیدی منطق کو اپنے مفادات کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے، طاقت، نیزے کی نوک اور آگ کی منطق کے ساتھ میدان میں آگئے۔ یہ وہ منطق جس کے سوا اور کوئی بات انھیں سجھائی نہ دیتی تھی۔ انھوں نے اپنی طاقت کا سہارا لیا اور چلا کر کہا: اس کے لیے ایک اونچی سی جگہ بناؤ اور اس کے اندر آگ روشن کرو اور اسے اس جلانے والی جہنم میں پھینک دو۔ (قالوا ابنوا لہ بنیانا فالقوہ فی الجحیم)۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ حکم دیا گیا کہ ایک بہت بڑی چار دیواری بنائی جائے اور پھر اس کے اندر آگ جلائی جائے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک تو آگ کو پھیلنے اور احتمالی خطرات سے روکا جائے۔ دوسرے وہ دوزخ جس کی ابراہیم بت پرستوں کو دھمکی دیتے تھے عملی طور پر تیار کر دی جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ابراہیمؑ جیسے ایک انسان کو جلانے کے لیے لکڑیوں کا ایک چھوٹا سا گٹھا ہی کافی تھا۔ لیکن بتوں کے ٹوٹنے سے ان کے دل میں جو آگ بھڑک رہی تھی وہ اسے ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے اور جہاں تک انتقام لیا جاسکتا تھا لینا چاہتے تھے اور ضمنی طور پر وہ بتوں کی شوکت و عظمت بھی ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ شاید ان کی برباد ہونے والی آبرو پلٹ آئے۔ نیز اپنے تمام مخالفین کو وہ درسِ عبرت دینا چاہتے تھے تاکہ یہ حادثہ پھر بابل کی تاریخ میں نہ دہرایا جائے۔ اس لیے وہ آگ کا ٹیلا تیار کرنا چاہتے تھے (اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ "جحیم" لغت میں اس آگ کے معنی میں ہے جو ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ رکھی گئی ہو)۔

بعض نے "بنیان" سے "منجنیق" مراد لی ہے جس سے دور سے بھاری چیزیں پھینکی جاتی تھیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے پہلی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ "بنیان" سے مراد عمارت اور بڑی چار دیواری ہے۔

یہاں قرآن اس مسئلے کے جزئیات کی طرف جو سورۂ انبیاء میں آچکے ہیں، اشارہ نہیں کرتا۔ صرف یکجائی طور پر ایک مختصر اور عمدہ پیرائے میں اس قصے کے آخری حصے کو اس طرح بیان کرتا ہے: انھوں نے ابراہیم کو ختم کرنے کے لیے ایک زبردست منصوبہ تیار کیا تھا لیکن ہم نے انھیں پست اور مغلوب کر دیا (فارادوا بہ کیدا فجعلناھم الاسفلین)۔

"کید" اصل میں ہر قسم کی "تدبیر سوچنے" کے معنی میں ہے۔ چاہے وہ صحیح راستے کے لیے ہو یا غلط کے لیے، اگرچہ عام طور پر یہ لفظ مذموم موقعوں کے بارے ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ لفظ نکرہ کی صورت میں آیا ہے۔ جبکہ نکرہ عظمت و اہمیت پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا یہ ایک وسیع و عریض منصوبے کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ختم کرنے اور ان کی قولی و عملی تبلیغ کے اثرات ختم کرنے کے لیے بنایا تھا۔

ہاں خدا نے انھیں اسفل اور نچلے درجے میں قرار دیا اور ابراہیم کو اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ جیسا کہ ان کی منطق میں بھی برتری تھی، نیز آگ میں جلانے کے واقعے میں بھی خدا نے انھیں برتر رکھا اور ان کے طاقتور دشمنوں کو پست کر دیا۔ آگ کو ابراہیمؑ کے لیے سرد اور سلامتی والا بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بال تک بھی نہ جلا سکی اور وہ اس آگ کے دریا سے صحیح و سالم باہر نکل آئے۔

ایک دن میں تو وہ نوحؑ کو "غرق" ہونے سے نجات دیتا ہے اور دوسرے دن ابراہیمؑ کو "حرق" (جلنے) سے تاکہ سب پر

واضح کردے کہ پانی اور آگ اس کے تابع فرمان ہیں اور جو کچھ خدا حکم دیتا ہے وہ وہی کرتے ہیں۔

ابراہیمؑ اس ہولناک حادثہ اور خطرناک سازش سے جو دشمن نے ان کے خلاف کی تھی صحیح و سالم اور سربلند باہر نکل آئے، اور چونکہ بابل میں آپ نے اپنی پیغام رسانی کی ذمہ داری کو ادا کر دیا تھا لہٰذا شام کی مقدس سرزمین کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا اور کہا "میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہ مجھے ہدایت کرے گا" (و قال انی ذاهب الی ربی سیهدین)۔

یہ بات واضح ہے کہ خدا کوئی مکان نہیں رکھتا، لیکن آلودہ اور گندے ماحول سے پاک ماحول کی طرف ہجرت کرنا، خدا کی طرف ہجرت کرنا ہے۔

سرزمین انبیاء و اولیاء کی طرف ہجرت اور وحی الٰہی کے مراکز کی طرف ہجرت خدا کی طرف ہجرت ہے۔ جیسا کہ مکہ کی طرف سفر کرنے کو "سفر الی اللہ" کہا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں انجام فریضۂ الٰہی کی طرف ہجرت دوست کی طرف سفر کرنا ہے اور اس سفر میں ہر جگہ ہادی و رہنما خدا ہے

یہاں خدا سے ان کا پہلا تقاضا اور درخواست جو مذکورہ بالا آیات میں مذکور ہے، صالح اور نیک فرزند کی درخواست ہے۔ ایسا فرزند جوان کے راستے کو دوام بخشے اور ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کرے۔ یہ وہ منزل تھی کہ انھوں نے عرض کیا: "پروردگارا! مجھے ایک فرزند صالح عطا فرما"۔ (رب هب لی من الصالحین)۔

کتنی عمدہ تعبیر ہے "صالح اور نیک فرزند" اعتقاد و ایمان کے لحاظ سے صالح، گفتار و عمل کے لحاظ سے صالح اور تمام جہات سے صالح۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک جگہ تو ابراہیمؑ اپنے لیے درخواست کرتے ہیں کہ وہ صالحین میں سے ہوں، جیسا کہ قرآن ان کے قول کو نقل کرتا ہے:

رب هب لی حکمًا والحقنی بالصالحین

پروردگارا! مجھے علم و دانش مرحمت فرما اور مجھے صالحین سے ملحق کردے۔ (شعراء ــــــ ۸۳)

جبکہ یہاں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ مجھے اولادِ صالح مرحمت فرما کیونکہ صالح ایک جامع صفت ہے جس میں ایک کامل انسان کی تمام خوبیاں جمع ہوتی ہیں۔

خدا نے بھی اس دعا کو قبول کر لیا اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے صالح بیٹے انھیں مرحمت فرمائے۔ چنانچہ اسی سورہ کی بعد والی آیات میں یہ بیان ہوا ہے۔

وبشرناه باسحاق نبیًا من الصالحین

ہم نے اسے اسحٰق کی پیدائش کی بشارت دی جو صالحین میں سے نبی ہے۔

نیز اسماعیل کے بارے میں کہتا ہے:

واسمٰعیل وادریس وذاالکفل کل من الصابرین وادخلناھم فی رحمتنا انھم من الصالحین

اور اسماعیل، ادریس اور ذاالکفل کو یاد کرو، وہ سب صابرین میں سے تھے اور ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے۔ (انبیاء ــــــ ۸۵، ۸۶)

چند اہم نکات

۱۔ ہر چیز کا خالق وہی ہے: زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے واللہ خلقکم وما تعملون ابراہیمؑ بُت پرستوں سے کہتے ہیں: "تم بھی خدا کی مخلوق ہو اور تمھارے بنائے ہوئے بُت بھی"۔

بعض نے اس آیت کو اپنے فاسد مذہب جبر کے لیے توجیہ خیال کیا ہے (اس طرح سے کہ "ماتعملون" میں "ما" کو انھوں نے "ما مصدریہ" لیا ہے اور کہا ہے کہ جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے تمھیں اور تمھارے اعمال کو خلق کیا ہے اور جب ہمارے اعمال مخلوقِ خدا ہیں تو پھر اپنی طرف سے ہمیں کچھ اختیار نہیں۔

یہ بات کئی جہات سے بے بنیاد ہے۔

اولاً جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ "ماتعملون" سے مراد یہاں بُت ہیں، جنھیں انھوں نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا نہ کہ اعمالِ انسانی، اور اس میں شک نہیں کہ وہ ان کے مادے کو عالمِ خلقت سے لے کر ایک شکل دیتے تھے (اس بنا پر ماء موصولہ ہے)

ثانیاً: اگر آیت کا مفہوم وہ ہو جو انھوں نے خیال کیا ہے تو یہ تو بُت پرستوں کے فائدے میں ایک دلیل ہے نہ کہ ان کے برخلاف۔ کیونکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ ہماری بُت سازی اور بُت پرستی کا عمل چونکہ خدا نے خلق کیا ہے لہٰذا ہم تو اس معاملے میں بالکل بے قصور ہیں۔

ثالثاً: اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ آیت کا مفہوم اور معنی اسی طرح ہو (جس طرح وہ کہتے ہیں) تو پھر بھی یہ جبر کی دلیل نہیں ہے کیونکہ ارادہ و اختیار کی آزادی کی صورت میں ایک معنی کے لحاظ سے خدا ہی ہمارے اعمال کا خالق ہے، کیونکہ خدا کے سوا ارادے کی یہ آزادی اور ارادہ کرنے کی طاقت اور جسمانی، فکری، مادی اور روحانی توتیں ہمیں کس نے دی ہیں؟ پس خالق وہی ہے باوجودیکہ فعل ہمارا اختیاری ہے۔

۲۔ ابراہیمؑ کی ہجرت: بہت سے پیغمبروں نے اپنی زندگی میں اپنے فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے ہجرت کی ہے ان میں سے ایک ابراہیمؑ ہیں۔ ان کی ہجرت کے بارے میں قرآن کی مختلف آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔

سورۂ عنکبوت کی آیہ ۲۶ میں بیان ہے:۔

وقال انی مهاجر الی ربی انه هو العزیز الحکیم

اس نے کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں بیشک وہ عزیز وحکیم ہے۔

اس مقام پر قرآن نے یہ بات ابراہیم کے آگ میں ڈالے جانے کے مسئلے کے بعد بیان کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائی رہبر جب اپنا فریضۂ رسالت ایک جگہ مکمل کر لیتے تھے یا ماحول کو اپنی دعوت کے پھیلنے کے لیے سازگار نہیں پاتے تھے تو اس غرض سے کہ کہیں ان کی ذمہ داری اور پیام رسانی میں رکاوٹ نہ پڑ جائے ہجرت کر جاتے تھے۔ ادیان کی تاریخ میں یہ ہجرتیں بہت زیادہ برکتوں کا سرچشمہ بنیں۔ یہاں تک کہ تاریخ اسلام ظاہری ومعنوی لحاظ سے پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کے محور کے گرد ہی گھومتی ہے اور اگر ہجرت نہ ہوتی تو اسلام مکہ کے بت پرستوں کی چالبازیوں کے سامنے ہمیشہ کے لیے دب جاتا۔ یہ ہجرت ہی تھی جس نے اسلام اور مسلمانوں کو نئی روح عطا کی اور ہر چیز کو ان کے فائدے میں بدل کر رکھ دیا اور انسانیت کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔

بلکہ ایک لحاظ سے ہجرت ہر فردِ مومن کے لیے ایک عمومی حکمتِ عملی ہے کہ وہ جب بھی اپنی زندگی کے دوران میں ماحول کو اپنے مقدس مقاصد کے لیے غیر مناسب دیکھے اور اسے ایسی متعفن صورت میں پائے جس میں ہر چیز خراب ہوجاتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہجرت کر جائے۔ اسے چاہیے کہ سامانِ سفر باندھ کر زیادہ مناسب سرزمین کی طرف کوچ کر جائے کیونکہ خدا کا ملک محدود نہیں ہے لیکن اس سے پہلے کہ ذات سے باہر کی طرف ہجرت کرے، اپنی ذات کے اندر ہجرت کا اہتمام کرے۔ پہلے داخلی ہجرت کی ضرورت ہے۔ آلودگیوں سے پاکیزگی کی طرف ہجرت، شرک سے ایمان کی طرف ہجرت، گناہ سے پروردگار بزرگ کی اطاعت کی طرف ہجرت۔

یہ اندرونی ہجرت فرد اور معاشرہ کے لیے تبدیلی اور انقلاب کی ابتدا ہوگی اور بیرونی ہجرت کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید بنے گی۔ ہم تفسیر نمونہ کی دوسری جلد سورہ نساء کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں "اسلام و مہاجرت" کے عنوان کے تحت اس ضمن میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔

۱۰۱۔ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○

۱۰۲۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○

۱۰۳۔ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ○

۱۰۴۔ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○

۱۰۵۔ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○

۱۰۶۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗؤُا الْمُبِيْنُ ○

۱۰۷۔ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ○

۱۰۸۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ○

۱۰۹۔ سَلٰمٌ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ ○

۱۱۰۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○

ترجمہ

۱۰۱۔ ہم نے اسے (ابراہیم کو) ایک بردبار اور با استقامت لڑکے کی بشارت دی۔

۱۰۲۔ جس وقت وہ اس کے ساتھ سعی و کوشش کے قابل ہوگیا تو اس نے کہا: بیٹا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ تم دیکھو، تمھاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجیے، انشاء اللہ آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔

۱۰۳۔ جب دونوں آمادہ و تیار ہوگئے اور ابراہیم نے اسے پیشانی کے بل لٹایا۔

۱۰۴۔ تو ہم نے اسے ندا دی کہ اے ابراہیم!

۱۰۵۔ جو حکم تجھے خواب میں دیا گیا تھا تو نے اسے پورا کر دیا، ہم اسی طرح سے نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں۔

۱۰۶۔ بے شک یہ ایک کھلی آزمائش ہے۔

۱۰۷۔ ہم نے ذبح عظیم کو اس کا فدیہ بنایا۔

۱۰۸۔ اور اس کے نیک نام کو بعد والی اُمتوں میں باقی رکھا۔

۱۰۹۔ ابراہیم پر سلام ہو۔

۱۱۰۔ ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں۔

تفسیر

ابراہیم قربان گاہ میں

گزشتہ آیات میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ابراہیم نے بابل میں اپنی رسالت کی ادائیگی کے بعد وہاں سے ہجرت کی اور اپنے پروردگار سے ان کا پہلا تقاضا یہ تھا کہ انھیں فرزند صالح عطا فرمائے کیونکہ ابھی تک وہ صاحب اولاد نہ تھے۔

زیر بحث پہلی آیت حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کی قبولیت کو بیان کر رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اسے ایک حلیم و بردبار اور با استقامت نوجوان کی بشارت دی (فبشرناہ بغلام حلیم)۔

حقیقت میں اس جملے میں تین بشارتیں جمع ہیں، ایک بیٹے کی، دوسری اس کے نوجوانی کے سن تک پہنچنے کی اور تیسری اس کے حلم جیسی صفت کا حامل ہونے کی۔

"حلیم" کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو توانائی ہوتے ہوئے کسی کام میں اس کے وقت سے پہلے جلدی نہیں کرتا اور مجرموں کو سزا دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا، جو ایک عظیم روح کا مالک ہوتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات پر کنٹرول رکھتا ہے۔

"راغب"، "مفردات" میں کہتا ہے:

حلم زیادہ غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھنے کے معنی میں ہے اور چونکہ ایسی حالت عقل و خرد سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا بعض اوقات یہ لفظ عقل و خرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

البتہ "حلم" کا حقیقی معنی وہ ہے جو پہلے بتایا گیا ہے۔ ضمنی طور پر اس توصیف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس فرزند کے بقا کی بشارت اس زمانہ تک کے لیے دی ہے جب وہ ایسے سن تک پہنچ جائے کہ حلم کے ساتھ متصف ہو جائے اور جیسا کہ ہم

پیدو الی آیات میں دیکھیں گے، اس نے اپنے حلیم ہونے کا " ذبح " کے موقع پر مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنے حلیم ہونے کا مظاہرہ اس وقت بھی اور آگ میں ڈالے جانے کے موقع پر بھی کیا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ لفظ " حلیم " قرآن مجید میں پندرہ بار آیا ہے یہ لفظ زیادہ تر خدا کی صفت کے طور پر آیا ہے سوائے دو موقعوں کے، جن میں یہ ابراہیمؑ اوران کے فرزند کی صفت کے طور پر کلامِ خدا کے طور پر آیا ہے اور ایک موقع پر دوسروں کی زبان سے حضرت شعیب کی صفت میں بیان ہوا ہے۔

لفظ " غلام " بعض کے نظریہ کے مطابق سنِ جوانی تک پہنچنے سے پہلے ہر بچے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض نے اس بچہ پر اس کا اطلاق کیا ہے جو دس سال سے اوپر ہو لیکن ابھی سنِ بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔

عربی لغت میں جو مختلف تعبیریں بیان ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ " غلام " دراصل " طفل " (بچہ) اور " شاب " (جوان) کے درمیان حدِ فاصل ہے، جسے ہم فارسی زبان میں " نوجوان " سے تعبیر کرتے ہیں۔

آخر حضرت ابراہیمؑ کا فرزندِ موعود خدائی بشارت کے مطابق پیدا ہوا اور باپ کا دل تو سالہا سال سے فرزندِ صالح کی انتظار میں تھا۔ فرزند کی پیدائش سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملی پھر وہ فرزند بچپن کے دور کو گزار کر جوانی کے سن میں داخل ہوا۔

قرآن اس موقع پر کہتا ہے ، جس وقت وہ اس کے ساتھ سعی و کوشش کے قابل ہوا (فلمّا بلغ معہ السعی)۔

یعنی وہ ایسے مرحلہ میں پہنچ گیا کہ زندگی کے مختلف مسائل میں باپ کے ہمراہ سعی و کوشش کر سکے اور اس کی مدد کر سکے۔

بعض نے یہاں " سعی " کو عبادت اور خدا کے لیے کام کرنے کے معنی میں سمجھا ہے۔ البتہ " سعی " ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں یہ معنی بھی شامل ہے لیکن اس میں منحصر نہیں ہے اور " معہ " باپ کے ساتھ کا معنی دیتا ہے۔ اس سے مراد امورِ زندگی میں باپ کی معاونت و مدد ہے۔

بہر حال مفسرین کے قول کے مطابق بیٹا ۱۳ سال کا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک عجیب اور حیرت انگیز خواب دیکھا۔ یہ خواب اس عظیم الشان پیغمبر کے لیے ایک اور آزمائش شروع ہونے کو بیان کرتا تھا۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ انھیں خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے قربانی کریں اور اسے ذبح کر دیں۔

ابراہیم دہشت زدہ خواب سے بیدار ہوئے، وہ جانتے تھے کہ پیغمبروں کے خواب حقیقت ہوتے ہیں اور شیطانی وسوسوں سے دور ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود دو اور راتوں میں بھی یہی خواب دیکھا جو اس امر کے لازم ہونے اور اسے جلد انجام دینے کے لیے تاکید تھی۔

کہتے ہیں کہ پہلی مرتبہ " شب ترویہ " (آٹھ ذی الحجہ کی رات) یہ خواب دیکھا اور " عرفہ " اور " عید قربان " (نویں اور دسویں ذی الحجہ) کی راتوں میں خواب کا تکرار ہوا۔ لہٰذا اب ان کے لیے ذرا سا بھی شک باقی نہ رہا کہ یہ خدا کا قطعی فرمان ہے۔

ابراہیم جو بارہا امتحانِ خداوندی کی گرم بھٹی سے سرفراز ہو کر باہر آئے تھے اس دفعہ بھی چاہیے کہ بحرِ عشق میں کود پڑیں اور حق تعالیٰ کے فرمان کے سامنے سر جھکا دیں اور اس فرزند کو جس کے انتظار میں عمر کا ایک حصہ گزار دیا تھا اور اب وہ ایک آبرومند نوجوان تھا

اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کردیں۔

لیکن ضروری ہے کہ ہر چیز سے پہلے اپنے فرزند کو اس کام کے لیے آمادہ کریں، لہٰذا اس کی طرف رخ کر کے فرمایا: میرے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کررہا ہوں، اب تم دیکھو! تمھاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ (قال یا بنیّ انی اریٰ فی المنام انی اذبحك فانظر ماذا تریٰ)۔

بیٹا بھی تو ایثار پیشہ باپ کے وجود کا ایک حصّہ تھا اور جس نے صبر و استقامت اور ایمان کا درس اپنی چھوٹی سی عمر میں اسی کے مکتب میں پڑھا تھا، اس نے خوشی خوشی خلوصِ دل کے ساتھ اس فرمانِ الٰہی کا استقبال کیا اور صراحت اور قاطعیت کے ساتھ کہا: اباجان! جو حکم آپ کو دیا گیا ہے اس کی تعمیل کیجیے (قال یا ابت افعل ما تؤمر)۔

میری طرف سے بالکل مطمئن رہیے۔" انشاءاللہ آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے (ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین)۔

باپ اور بیٹے کی یہ باتیں کس قدر معنی خیز ہیں اور کتنی باریکیاں ان میں چھپی ہوئی ہیں۔

ایک طرف تو باپ ۱۳ سالہ بیٹے کے سامنے اسے ذبح کرنے کی بات بڑی صراحت کے ساتھ کرتا ہے اور اس سے اس کی رائے معلوم کرتا ہے۔ اس کے لیے مستقل شخصیت اور ارادے کی آزادی کا قائل ہوتا ہے، وہ ہرگز اپنے بیٹے کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا اور اسے اندھیرے میں رکھتے ہوئے امتحان کے اس عظیم میدان میں آنے کی دعوت نہیں دیتا۔ وہ چاہتا ہے کہ بیٹا بھی اس عظیم امتحان میں پورے دل کے ساتھ شرکت کرے اور باپ کی طرح تسلیم و رضا کا مزہ چکھے۔

دوسری طرف بیٹا بھی یہ چاہتا ہے کہ باپ اپنے عزم و ارادہ میں پکا اور مضبوط رہے۔ یہ نہیں کہتا کہ مجھے ذبح کردیں۔ بلکہ کہتا ہے: جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے بجالائیں میں اس کے امر و فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم ہوں، خصوصاً باپ کو "یا ابت" (اباجان!) کہہ کر مخاطب کرتا ہے، تاکہ اس بات کی نشاندہی کردے کہ اس مسئلے پر جذبات فرزند و پدر کا سوئی کی نوک کے برابر بھی اثر نہیں، کیونکہ فرمانِ خدا ہر چیز پر حاکم ہے۔

اور تیسری طرف سے پروردگار کی بارگاہ میں مراتب ادب کی اعلیٰ ترین طریقے سے پاسداری کرتا ہے، ہرگز اپنے ایمان اور عزم و ارادہ کی قوت پر بھروسہ نہیں کرتا، بلکہ خدا کی مشیت اور اس کے ارادے پر تکیہ کرتا ہے اور اس عبارت کے ساتھ اس سے پامردی اور استقامت کی توفیق چاہتا ہے۔

اس طرح سے باپ بھی اور بیٹا بھی اس عظیم آزمائش کے پہلے مرحلے کو مکمل کامیابی کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔

اس دوران کیا کیا حالات پیش آئے، قرآن نے انھیں تشریح کے ساتھ بیان نہیں کیا اور صرف اس عجیب ماجرے کے نہایت حسّاس پہلو ذکر کیے ہیں۔

بعض نے لکھا ہے کہ خدا کار بیٹے نے اس بنا پر کہ باپ کی اس ماموریت کی انجام دہی میں مدد کرے اور ماں کے رنج و اندوہ میں کمی کرے۔ جس وقت وہ اسے سرزمین "منیٰ" کے خشک اور جلا ڈالنے والے گرم پہاڑوں کے درمیان، قربان گاہ میں لائے سے کہا: اباجان! رسی کو مضبوطی کے ساتھ باندھ دیجیے، تاکہ میں فرمانِ خداوندی کے اجراء کے وقت ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکوں

مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس سے میرے اجر میں کمی واقع نہ ہو جائے۔

ابا جان! چھری تیز کر لیجیے اور تیزی کے ساتھ میرے گلے پر چلائیے تاکہ اسے برداشت کرنا مجھ پر بھی (اور آپ پر بھی) زیادہ آسان ہو جائے۔

ابا جان! میرا کرتا پہلے ہی میرے بدن سے اتار لیجیے تاکہ وہ خون آلود نہ ہو، کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میری ماں اسے دیکھے تو دامن صبر اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔

پھر مزید کہا، میرا سلام میری ماں کو پہنچا دیجیے گا اور اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو میرا کرتا اس کے لیے لے جائیے گا جو اس کی تسلی خاطر اور تسکین کا باعث بنے گا کیونکہ وہ اس سے بیٹے کی خوشبو سونگھے گی اور جس وقت دل بے قرار ہوگا تو اسے اپنی آغوش میں لے لے گی اس طرح یہ اس کے درد دل میں تخفیف کا باعث ہوگا۔

آخر وہ حساس لمحے آن پہنچے جب فرمان الٰہی کی تعمیل ہونا تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب بیٹے کے مقام تسلیم کو دیکھا اسے اپنی آغوش میں لے لیا، اس کے رخساروں کے بوسے لیے اور اس گھڑی دونوں رونے لگے۔ ایسا گریہ تھا کہ ان کے جذبات اور لقائے خدا کے لیے ان کا شوق ظاہر ہوتا تھا۔

قرآن مختصر اور معنی خیز عبارت میں صرف اتنی سی بات کہتا ہے: جب دونوں آمادہ و تیار ہو گئے اور (باپ) ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا۔ (فلما اسلما و تلہ للجبین)[1]

قرآن یہاں پھر اختصار کے ساتھ گزر گیا ہے اور سننے والے کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے احساسات کی موجوں کے ساتھ قصے کو سمجھے۔

بعض نے کہا ہے کہ "تلہ للجبین" سے مراد یہ تھی کہ بیٹے کی پیشانی خود اس کی فرمائش پر زمین پر رکھی کہ مبادا ان کی نگاہ بیٹے کے چہرے پر پڑے اور پدری جذبات جوش میں آجائیں اور فرمان خدا کے اجراء میں مانع ہو جائیں۔

بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کے چہرے کو خاک پر رکھا اور چھری کو حرکت دی اور تیزی اور طاقت کے ساتھ اسے بیٹے کے گلے پر پھیر دیا جب کہ ان کی روح ہیجان میں تھی اور صرف عشق خدا ہی انھیں اپنی راہ میں کسی شک کے بغیر آگے بڑھا رہا تھا۔ لیکن تیز دھار چھری نے بیٹے کے لطیف و نازک گلے پر معمولی سا بھی اثر نہ کیا۔

حضرت ابراہیمؑ حیرت میں ڈوب گئے، دوبارہ چھری کو چلایا لیکن پھر بھی وہ کارگر ثابت نہ ہوئی۔ ہاں! خلیل تو کہتے ہیں کہ "کاٹ" لیکن خداوند جلیل یہ حکم دے رہا ہے کہ "نہ کاٹ" اور چھری تو صرف اسی کی فرمانبردار ہے۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں قرآن ایک مختصر اور معنی خیز جملے کے ساتھ انتظار کو ختم کرتے ہوئے کہتا ہے: اس وقت ہم نے ندا دی

---

[1] "تلہ"، "تل" کے مادے سے اصل میں اونچی جگہ کے معنی میں ہے اور "تلہ للجبین" کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو ایک اونچی جگہ پر چہرے کی ایک طرف زمین پر لٹایا۔ "جبین" چہرے کی طرف کے معنی میں ہے اور اس کی دونوں طرفوں کو "جبینان" کہتے ہیں۔

(اور پکار کر کہا) کہ اے ابراہیم! (و ناديناه ان يا ابراهيم)۔

خواب میں جو حکم تمہیں دیا گیا تھا وہ تم نے پورا کر دیا (قد صدقت الرءيا)۔

ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں (انا كذالك نجزى المحسنين)۔

ہم ہی انھیں امتحان میں کامیابی کی توفیق دیتے ہیں اور ہم ایسا بھی نہیں ہونے دیں گے کہ ان کا فرزند دل بند ان کے ہاتھ ہی سے چلا جائے۔ ہاں! جو شخص سرتاپا ہمارے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے اور اس نے نیکی کو اعلیٰ حد تک پہنچا دیا ہے، اس کی اس کے سوا اور کوئی جزا نہیں ہوگی۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: بے شک یہ اہم اور آشکار امتحان ہے (ان هذا لهو البلاء المبين)۔

بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا، وہ بھی نیک اور لائق بیٹا، اس باپ کے لیے جس نے ایک عمر ایسے فرزند کے انتظار میں گزاری ہو سادہ اور آسان کام نہیں ہے۔ ایسے فرزند کی یاد کس طرح دل سے نکال سکتا تھا؟ اس سے بھی بالاتر یہ کہ وہ انتہائی تسلیم و رضا کے ساتھ ماتھے پر شکن لائے بغیر ایسے فرمان کی تعمیل کے لیے آگے بڑھے اور اس کے تمام مقدمات کو آخری مرحلے تک انجام دے، اس طور پر کہ روحانی اور عملی آمادگی کے لحاظ سے کوئی کسر باقی نہ چھوڑے۔

اس سے بھی بڑھ کر عجیب، اس فرمان کے آگے اس نوجوان کی اطاعت شعاری کی انتہا۔ وہ خوشی خوشی، اطمینان قلب کے ساتھ، پروردگار کے لطف سے، اس کے ارادہ کے سامنے، سر تسلیم خم کرتے ہوئے، ذبح کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

اسی لیے بعض روایات میں ہے کہ جس وقت یہ کام انجام پا چکا تو جبرئیل نے (تعجب کرتے ہوئے) پکار کر کہا "اللہ اکبر، اللہ اکبر" ابراہیمؑ کے فرزند نے کہا: "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ" اور عظیم فدا کار باپ نے بھی کہا "اللہ اکبر و للہ الحمد"[1]

اور یہ ان تکبیروں کے مشابہ ہے جو ہم عید قربان کے دن پڑھتے ہیں۔

لیکن اس غرض سے کہ ابراہیم کا پروگرام بھی نامکمل نہ رہ جائے اور خدا کی بارگاہ میں ان کی طرف سے قربانی بھی ہو جائے اور ابراہیم کی آرزو پوری ہو جائے، خدا نے ایک بہت بڑا مینڈھا بھیج دیا تاکہ بیٹے کی جگہ اس کی قربانی کریں اور مراسم "حج" اور سرزمین "منیٰ" میں آنے والوں کے لیے اپنی سنت چھوڑ جائیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: ہم نے ذبح عظیم کو اس کا فدیہ قرار دیا (وفديناه بذبح عظيم)۔

اس بارے میں کہ اس ذبح کی عظمت کس لحاظ سے تھی، جسمانی اور ظاہری لحاظ سے یا اس جہت سے کہ فرزند ابراہیمؑ کا فدیہ تھی

---

[1] تفسیر قرطبی اور تفسیر روح المعانی

یا اس لحاظ سے کہ خدا کی راہ میں اور خدا کے لیے تھی یا اس لحاظ سے کہ یہ قربانی خدا کی طرف سے ابراہیمؑ کے لیے بھیجی گئی تھی [1]
مفسرین نے اس سلسلے میں بہت کچھ کہا، لیکن کوئی مانع نہیں کہ یہ تمام جہات ذبحِ عظیم میں جمع ہوں اور وہ مختلف جہات سے عظمت کی حامل ہو۔

اس ذبح کی عظمت کی ایک نشانی یہ ہے کہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ہر سال زیادہ وسعت پا رہی ہے۔

اس وقت ہر سال اس ذبحِ عظیم کی یاد میں دس لاکھ سے زیادہ جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور اس یاد کو زندہ کیا جاتا ہے۔

"فدینا" "فدا" کے مادہ سے اصل میں کسی شخص یا چیز کی بلا دور کرنے یا دفعِ ضرر کے لیے کسی دوسری چیز کو صدقہ قرار دینے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے وہ مال جو قیدی کو آزاد کرنے کے لیے دیتے ہیں اسے "فدیہ" کہتے ہیں۔ نیز اس کفارہ کو بھی فدیہ کہتے ہیں جو بعض بیمار روزہ کے بجائے دیتے ہیں۔

وہ بہت بڑا مینڈھا ابراہیمؑ کو کس طرح دیا گیا اس بارے میں زیادہ تر اس بات کے معتقد ہیں کہ اسے جبرئیل لائے تھے، بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ "منیٰ" کے پہاڑوں کے دامن سے نیچے اترا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا خدا کے حکم اور اس کے ارادے سے تھا۔

خدا نے نہ صرف اس دن کے عظیم امتحان میں حضرت ابراہیمؑ کی کامیابی کی تعریف و توصیف کی۔ بلکہ اس کی یاد کو جاودانی بنا دیا ہے جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ابراہیم کے نیک نام کو بعد کی امتوں میں باقی رہنے والا بنایا (وترکنا علیہ فی الآخرین)۔

وہ آنے والی سب نسلوں اور لوگوں کے لیے نمونہ اور تمام پاکباز اور کوئے دوست کے دلدادہ عاشقوں کے لیے راہنما بن گئے اور ہم نے ان کے طرزِ عمل کو رہتی دنیا تک کے لیے حج کی سنت کے طور پر جاودانی بنا دیا وہ عظیم پیغمبروں کے باپ تھے وہ امتِ اسلامی اور پیغمبرِ اسلامؐ کے باپ تھے۔

ابراہیم پر سلام (جو مخلص اور پاکباز تھا)۔ (سلام علی ابراھیم)۔

ہاں ہم اسی طرح سے نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں (کذٰلک نجزی المحسنین)۔

عظمتِ دنیا کا صلہ، تمام زمانوں میں ہمیشگی کا صلہ، خدائے بزرگ کے لائق درود و سلام کا صلہ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "کذٰلک نجزی المحسنین" کا جملہ ایک دفعہ تو یہاں آیا ہے اور اس سے پہلے کی چند

---

[1] ظاہر ہے کہ جانور کتنا ہی باعظمت کیوں نہ ہو وہ کسی عام انسان کے مقابلے میں بھی عظیم نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وہ ایک نبی و رسول اور وہ بھی ذبیح اللہ جیسے نبی کے مقابلے میں۔ لہٰذا ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، وہ مسئلہ واضح ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ نہیں تو پھر ذبحِ عظیم سے کون مراد ہے؟ اس سلسلے میں شاعرِ مشرق کہتے ہیں:

شعر: اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنیٔ "ذبحِ عظیم" آمد پسر

جبکہ شیعہ و سنی طرق سے کئی ایک روایات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ذبحِ عظیم سے مراد امام حسینؑ کی قربانی ہے (مترجم)

آیات میں بھی آیا ہے۔ اس تکرار میں حتماً کوئی نکتہ ہے۔
ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے مرحلے میں تو خدا تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کی ان کے عظیم امتحان میں کامیابی کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی کامیابی پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ یہ خود ایک عظیم جزا ہے، یہ ایک اہم خوشخبری تھی جو خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو دی تھی اس کے بعد ذبح عظیم کے فدیہ کرنے، ان کے نام اور سنت کے جاوداں رہنے اور ان پر خدا کے سلام بھیجنے کا ذکر ہے جو تین دوسری بڑی نعمتیں ہیں اور اسے نیکوکاروں کے اجر کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ذبیح اللہ کون ہے؟: اس بارے میں کہ حضرت ابراہیمؑ کے دونوں فرزندوں (اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ) میں سے کون قربان گاہ میں لایا گیا اور کس نے ذبیح اللہ کا لقب پایا؟ مفسّرین کے درمیان شدید بحث ہے۔ ایک گروہ حضرت اسحاقؑ کو "ذبیح" جانتا ہے اور ایک جماعت حضرت اسماعیلؑ کو۔ پہلے نظریئے کو بہت سے مفسّرین اہل سنت اور دوسرے نظریہ کو مفسّرین شیعہ نے اختیار کیا ہے۔

لیکن جو کچھ قرآن کی مختلف آیات کے ظاہر سے ہم آہنگ ہے وہ یہی ہے کہ "ذبیح"، "اسماعیلؑ" تھے کیونکہ:۔

اولاً: ایک جگہ بیان ہوا ہے:۔

و بشرناہ باسحاق نبیًا من الصالحین

ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی جو صالحین میں سے ایک پیغمبر تھا۔ (صافات ــــــ ۱۱۲)

یہ تعبیر بخوبی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا نے اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت اس واقعے کے بعد دی ہے اور حضرت ابراہیمؑ کی قربانیوں کی وجہ سے انھیں یہ بشارت دی گئی۔ اس بنا پر ذبح کا واقعہ ان کے ساتھ مربوط نہیں تھا۔

علاوہ ازیں جب خدا کسی کی نبوت کی بشارت دیتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ زندہ رہے گا اور یہ بات بچپن میں ذبح کے مسئلے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

ثانیاً سورۂ ہود کی آیہ ۷۱ میں بیان ہوا ہے:۔

فبشرناھا باسحاق و من وراء اسحاق یعقوب

ہم نے اسے اسحٰق کے پیدا ہونے کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کے پیدا ہونے کی بھی۔

یہ آیت اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مطمئن تھے کہ اسحاقؑ زندہ رہیں گے اور ان سے یعقوبؑ جیسا فرزند پیدا ہوگا اس بنا پر ان کے ذبح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ حضرت اسحاقؑ کو ذبیح جانتے ہیں، حقیقت میں انھوں نے ان آیات کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ثالثاً: منابع اسلامی میں بہت سی روایات ایسی آئی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ "ذبیح"، "اسماعیلؑ" تھے

نمونہ کے طور پر :

ایک معتبر حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے :

انا ابن الذبیحین

میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں

اور دو ذبیحوں سے مراد ایک آپؐ کے والد گرامی حضرت عبداللہ ہیں، کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کے جد امجد حضرت عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ وہ انھیں خدا کے لیے قربان کریں گے۔ اس کے بعد حکم خدا سے ایک سو اونٹ ان کے فدیہ کے طور پر دیئے گئے اور ان کی داستان مشہور ہے۔ دوسرے حضرت اسماعیلؑ تھے کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر اسلامؐ جناب اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے نہ کہ حضرت اسحاقؑ کی [1]

اس دعا میں جو علی علیہ السلام نے پیغمبر گرامیؐ سے نقل کی ہے، یہ بیان ہوا ہے :

یامن فدا اسماعیل من الذبح

اے وہ جس نے اسماعیل کے لیے فدیہ قرار دیا [2]

ان احادیث میں جو امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت لوگوں نے سوال کیا کہ "ذبیح" کون تھا؟ تو آپؑ نے فرمایا: "اسماعیلؑ"۔

اس حدیث میں جو امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، یہ بیان ہوا ہے۔

لو علم الله عزوجل شیئا اکرم من الضأن لفدا به اسماعیل

اگر کوئی جانور (خدا کے نزدیک) دنبے سے بہتر ہوتا تو اسے اسماعیل کا فدیہ قرار دیتا [3]

خلاصہ یہ کہ اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں اگر ہم ان سب کو نقل کرنا چاہیں تو گفتگو لمبی ہو جائے گی [4]

ان فراواں روایات کے مقابلے میں جو قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم سے بھی ہم آہنگ ہیں ایک شاذ روایت بھی ہے، جو حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے پر دلالت کرتی ہے جو پہلی روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی ظاہر آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ مسئلہ مسلم ہے کہ وہ بچہ جسے ابراہیمؑ حکم خدا سے اس کی ماں کے ساتھ مکہ لائے اور وہاں پر

---

[1] تفسیر "مجمع البیان" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۱

[3] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۲

[4] ان روایات کے بارے میں مزید اطلاع کے لیے تفسیر "برہان" (جلد ۴، ص ۲۸) اور تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۰ اس کے بعد کی طرف رجوع کریں۔

اسے چھوڑا۔

پھر خانہ کعبہ اس کی مدد کے ساتھ بنایا اور اس کے ساتھ طواف و سعی بجالائے وہ اسماعیل تھے۔ یہ امور اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ذبیح بھی اسماعیلؑ ہی تھے کیونکہ ذبح کا عمل مذکورہ بالا پروگرام کی تکمیل کرتا ہے۔

البتہ جو کچھ کتب عہد عتیق (موجودہ تورات) سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ذبیح اسحاقؑ تھے[1]

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں بعض غیر معروف روایات جن میں حضرت اسحاقؑ کو ذبیح قرار دیا گیا ہے، اسرائیلی روایات سے متاثر ہیں اور احتمالاً یہودیوں کے جعولات میں سے ہیں۔ یہودی چونکہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں سے تھے لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ یہ افتخار و اعزاز اپنے لیے ثبت کرلیں اور مسلمانوں کہ جن کے رسولؐ نسلِ اسماعیلؑ سے ہیں ان سے یہ اعزاز چھین لیں، چاہے اس کے لیے حقائق کا انکار ہی کیوں نہ ہو۔

بہر حال ہمارے لیے جو کچھ سب سے زیادہ محکم ہے وہ آیاتِ قرآن کے ظواہر ہیں جو بخوبی نشاندہی کرتے ہیں کہ ذبیح اسماعیلؑ تھے اگرچہ ہمارے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ذبیح اسماعیلؑ ہوں یا اسحاقؑ، دونوں ابراہیمؑ کے فرزند تھے اور دونوں ہی خدا کے عظیم پیغمبر تھے۔ مقصد تو اس تاریخی واقعے کا واضح و روشن ہونا ہے۔

۲۔ کیا ابراہیمؑ فرزند کو ذبح کرنے پر مامور تھے؟ ایک اور سوال جو یہاں مفسرین کو درپیش ہے یہ ہے کہ کیا ابراہیمؑ واقعتاً بیٹے کو ذبح کرنے پر مامور تھے یا انھیں اس کے مقدمات کا حکم تھا؟ اگر وہ ذبح پر مامور تھے تو پھر یہ حکمِ الٰہی انجام پانے سے پہلے ہی کس طرح منسوخ ہوگیا؟ جبکہ عمل سے پہلے منسوخ ہونا جائز نہیں ہے اور یہ معنی علم اصولِ فقہ میں ثابت ہوچکا ہے۔

اگر وہ ذبح کے لیے اقدامات کرنے پر مامور تھے تو یہ افتخار کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس مسئلے کی اہمیت اس امر سے پیدا ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا خیال تھا کہ مقدمات فراہم کرنے اور ابتدائی امور انجام دینے کے بعد شاید ذبح کا اصل حکم دیا جائے اور یہی ان کا عظیم امتحان تھا۔ ہمارے نزدیک اس نظریے میں کوئی خاص جاذب نظریات نہیں ہے ہماری رائے میں یہ سب باتیں اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ امتحانی اور غیر امتحانی اوامر میں فرق نہیں رکھا گیا۔ ابراہیمؑ کو جو امر ہوا تھا وہ ایک امتحانی امر تھا اور ہم یہ جانتے ہیں کہ امتحانی اوامر میں حتمی ارادہ اور چیز ہے اور اصل عمل کچھ اور شے۔ ایسے اوامر میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ واضح ہوجائے کہ موردِ آزمائش شخص کہاں تک فرمان کی اطاعت پر آمادگی رکھتا ہے اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ موردِ آزمائش شخص پشت پردہ اسرار سے آگاہ نہیں ہوتا۔

لہٰذا یہاں نسخ واقع نہیں ہوا کہ عمل سے پہلے اس کی صحت کے بارے میں بحث و گفتگو ہو۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس واقعے کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے کہتا ہے:

قد صدّقت الرءیا

اے ابراہیم! تم نے جو خواب دیکھا تھا سچ کر دکھایا۔

---

[1] تورات، سفر تکوین فصل ۲۲

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرزند دلبند کو ذبح کرنے کے سلسلے میں جو کچھ ان کے بس میں تھا انھوں نے انجام دیا اور اس سلسلے میں اپنی روحانی اور دلی آمادگی ہر جہت سے درجۂ ثبوت تک پہنچا دی اور آزمائش کی اس ذمہ داری کو خوب اچھی طرح سے پورا کر دکھایا۔

۲۔ **حضرت ابراہیمؑ کا خواب کس طرح حجت ہو سکتا ہے؟** خواب اور خواب دیکھنے کے بارے میں بہت سی باتیں ہیں، جس کی ایک مبسوط تفصیل ہم سورۂ یوسف کی آیہ ۴ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں[1]

یہاں پر جو بات ضروری ہے کہ جس کی طرف توجہ کی جائے یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب کو کس طرح حجت سمجھا اور اسے کیوں اپنے عمل کا معیار قرار دیا؟ اس سوال کے جواب میں کبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء کے خواب ہرگز شیطانی خواب نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ قوتِ واہمہ کی فعالیت کی پیداوار ہوتے ہیں، بلکہ وہ ان کی نبوت اور وحی کا ایک گوشہ ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں انبیاء کا مصدرِ وحی کے ساتھ ارتباط کبھی تو دل میں القاء کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی فرشتۂ وحی کو دیکھنے کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی صوتی امواج کی راہ سے جو خدا کے فرمان سے پیدا ہوتی ہیں اور کبھی خواب کے طریقے سے۔ لہٰذا ان کے خوابوں میں کسی قسم کی خطا یا غلطی پیدا نہیں ہوتی، اور جو چیز وہ خواب میں دیکھتے ہیں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ بیداری میں دیکھتے ہیں۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیداری کی حالت میں وحی کے ذریعے آگاہی حاصل کی تھی کہ وہ "ذبح" کے بارے میں جو خواب دیکھیں اس پر عمل کریں۔

نیز کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس خواب میں مختلف قرائن تھے، ایک یہ کہ تین شب پے در پے بعینہٖ اس کا تکرار ہوا کہ جس نے آپ کے لیے یہ علم و یقین پیدا کر دیا کہ یہ ایک خدائی ماموریت ہے کوئی اور چیز نہیں ہے۔

بہرحال ممکن ہے کہ یہ تمام ہی تفاسیر صحیح ہوں اور آپس میں کوئی تضاد بھی نہیں رکھتیں اور ظواہر آیات کے خلاف بھی نہیں ہیں۔

۳۔ **شیطانی وسوسے ابراہیمؑ کی عظیم روح پر اثر نہ کر سکے:** ابراہیمؑ کا امتحان پوری تاریخ میں ایک عظیم امتحان تھا۔ ایسا امتحان جس کا مقصد یہ تھا کہ ان کے دل کو غیر خدا کی مہر و محبت اور عشق سے پاک رکھنا اور عشق الٰہی کو ان کے سارے کے سارے دل پر سایہ فگن کرنا تھا۔ بعض روایات کے مطابق شیطان نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ کوئی ایسا کام کرے کہ حضرت ابراہیمؑ اس میدان سے کامیاب ہو کر نہ نکلیں، کبھی وہ (اسمٰعیل کی) ماں ہاجرہ کے پاس آیا اور ان سے کہا تمھیں معلوم ہے کہ ابراہیم نے کیا ارادہ کیا ہے؟ وہ چاہتا ہے کہ آج اپنے بیٹے کو ذبح کر دے۔

ہاجرہ نے کہا: دور ہو جا، محال اور نہ ہونے والی بات نہ کر، کیونکہ وہ تو بہت مہربان ہے اپنے بیٹے کو کیسے ذبح کر سکتا ہے؟ اصولاً کیا دنیا میں کوئی ایسا انسان پیدا ہو سکتا ہے جو اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دے؟

---

[1] جلد ۵ میں ملاحظہ کیجیے۔

شیطان نے اپنے وسوسہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا: اس کا دعویٰ ہے کہ خدا نے اسے حکم دیا ہے۔
ہاجرہ نے کہا: اگر خدا نے اسے حکم دیا ہے تو پھر اسے اطاعت کرنا چاہیے، اور سوائے رضا و تسلیم کے کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔

پھر شیطان ان کے بیٹے اسماعیلؑ کے پاس آیا، اور انھیں ورغلانے لگا۔ ان سے بھی اسے کچھ حاصل نہ ہوسکا، کیونکہ اس نے اسماعیلؑ کو تسلیم و رضا کا پیکر پایا۔

آخر میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس آیا اور ان سے کہا: ابراہیم! جو خواب تم نے دیکھا ہے وہ شیطانی خواب ہے، تم شیطان کی اطاعت نہ کرو۔

ابراہیمؑ نے نورِ ایمان اور نبوت کے پرتو میں اسے پہچان لیا؛ چلا کر کہا: "دور ہوجا اے دشمنِ خدا"[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پہلے مشعر الحرام میں آئے تاکہ بیٹے کی قربانی دیں، تو شیطان ان کے پیچھے دوڑا۔ وہ جمرہ اولیٰ کے پاس آئے۔ شیطان وہاں بھی ان کے پیچھے لگ گیا۔ ابراہیمؑ نے سات پتھر اٹھا کر اسے مارے۔ جس وقت دوسرے جمرہ کے پاس پہنچے تو پھر شیطان کو دیکھا، دوبارہ سات پتھر اسے مارے یہاں تک کہ "جمرہ عقبہ" میں آئے تو سات اور پتھر اسے مارے۔ (اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنے سے مایوس کردیا)[2]

یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ شیطانی وسوسے امتحان کے عظیم میدانوں میں ایک طرف سے ہی نہیں بلکہ مختلف سمتوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ہر زمانے میں ایک نئے رنگ میں اور ایک نئے طریقہ سے۔ مردانِ خدا کو چاہیے کہ وہ ابراہیمؑ کی طرح شیاطین کو تمام چہروں میں پہچانیں اور وہ جس طریقے سے بھی وارد ہوں، ان کے راستے بند کردیں اور انھیں سنگسار کریں اور کیا ہی عظیم درس ہے یہ۔

۵۔ "منیٰ" میں تکبیرات کا فلسفہ: ہم جانتے ہیں کہ اسلامی روایات میں عید الاضحیٰ کے بارے میں جو احکام آئے ہیں ان میں کچھ مخصوص تکبیریں ہیں۔ جو تمام مسلمان پڑھتے ہیں چاہے وہ مراسم حج میں شریک ہوں اور منیٰ میں موجود ہوں اور چاہے دوسرے مقامات پر ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ جو منیٰ میں ہیں وہ ۱۵ نمازوں کے بعد پڑھتے ہیں جن میں سے پہلی عید کے دن کی نماز ظہر ہے اور جو منیٰ میں نہیں ہوتے وہ ۱۰ نمازوں کے بعد تکرار کرتے ہیں اور ان تکبیرات کی صورت اس طرح ہے:

اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ، و اللہ اکبر، اللہ اکبر، و للہ الحمد،
اللہ اکبر علیٰ ما ھدانا

جس وقت ہم اس حکم کا اس حدیث کے ساتھ موازنہ کرکے دیکھتے ہیں۔ جسے ہم پہلے نقل کرچکے

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۹ ص ۳۲۹، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔
[2] ایضاً

ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تکبیریں حقیقت میں جبرئیلؑ اور اسماعیلؑ اور ان کے باپ ابراہیمؑ کی تکبیروں کا مجموعہ ہیں اور کچھ اس پر اضافہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ الفاظ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اس عظیم آزمائش میں کامیابی کی یاد لوگوں کی نظروں میں زندہ کرتے ہیں، اور تمام مسلمانوں کو ایک پیغام الٰہی دیتے ہیں۔ چاہے وہ منیٰ میں ہوں یا منیٰ کے علاوہ دوسرے مقامات پر۔

ضمنی طور پر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "منیٰ" کا نام اس بنا پر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب اس زمین پر پہنچے اور اپنے امتحان سے گزر چکے تو جبرئیلؑ نے ان سے کہا: جو کچھ آپ چاہتے ہیں، اپنے پروردگار سے کہیں انھوں نے خدا سے تمنا کی کہ خدا یہ حکم دے کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل کے فدیہ کے طور پر دنبہ ذبح کریں اور ان کی یہ تمنا پوری ہوگئی[1]

۶۔ حج ایک اہم انسان ساز عبادت ہے: سفرِ حج حقیقت میں ایک عظیم ہجرت ہے، ایک خدائی سفر ہے، خودسازی اور جہادِ اکبر کا ایک وسیع میدان ہے۔

مراسمِ حج حقیقت میں ایک ایسی عبادت کی نشاندہی کرتے ہیں جو ابراہیمؑ، ان کے فرزند اسمٰعیلؑ اور ان کی زوجہ ہاجرہ کی جدوجہد اور جہاد کی گہری یاد کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہم اگر اسرارِ حج کے مطالعے میں اس نکتہ سے غفلت برتیں تو اس کے بہت سے مراسم معمّا دکھائی دیں۔ ہاں اس معمّا کے حل کی چابی اس گہرے تعلق کی طرف توجہ کرنے میں ہے۔

جب ہم منیٰ کی قربان گاہ میں آتے ہیں تو ہم تعجب کرتے ہیں کہ یہ سب قربانیاں کس لیے ہیں؟ اصولی طور پر کیا جانور ذبح کرنا بھی عبادتوں میں سے ایک عبادت ہوسکتی ہے؟

لیکن جب ہم حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کو یاد کرتے ہیں، جنھوں نے اپنے عزیزترین اور اپنی عمر کے شیریں ترین ثمر کو راہِ خدا میں قربان کیا تھا اور اس کے بعد ایک سنت قربانی کے عنوان سے منیٰ میں وجود میں آگئی، تو ہمیں اس کام کا فلسفہ معلوم ہوجاتا ہے۔

یہ قربانی معبود کی راہ میں ہر چیز کو چھوڑ دینے کی دلیل ہے۔ یہ قربانی غیرِ خدا کی یاد سے دل کو خالی کرنے کا مظہر ہے۔ ان مناسک سے اسی وقت پورا پورا تربیتی فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے جبکہ حضرت اسماعیلؑ کے ذبح ہونے کا منظر اور قربانی کے وقت اس باپ اور بیٹے کی روحانی حالت اور جذبات کا منظر آنکھوں میں پھر جائے، اور وہ حالت وجذبات انسان کے وجود پر اپنا پرتو ڈالیں[2]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۰ (حدیث ۶۸)

[2] افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دورِ حاضر میں قربانی کے مراسم نے غیر مطلوب شکل اختیار کرلی ہے جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے علماءِ اسلام کو کوشش کرنی چاہیے ہم اس سلسلے میں اور حج کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جلد ۷ سورہ حج کی آیات ۲۶ تا ۳۰ کے ذیل میں تفصیلی بحث کرچکے ہیں۔

جس وقت جمرات (پتھر کے تین مخصوص ستون جنھیں حجاج کرام مراسم حج میں سنگسار کرتے ہیں اور ہر دفعہ سات پتھر مراسم مخصوص کے ساتھ انھیں مارتے ہیں) کے پاس جائیں تو یہ معمّا ہماری نظر میں واضح ہوتا ہے کہ یہ سب پتھر ایک بے روح ستون کی طرف پھینکنے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے اور اس سے کون سا مسئلہ حل ہوتا ہے؟ لیکن اس وقت اس کا مفہوم کھل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے جب ہم دل میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تو مکتب توحید کے ہیرو ابراہیمؑ کے شیطان کے وسوسوں سے مقابلے اور جہاد کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہے کہ جب شیطان تین مرتبہ ان کے راستے میں حائل ہونے کے لیے آیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ انھیں اس "جہاد اکبر" کے میدان میں سستی اور شک و شبہ میں مبتلا کر دے لیکن ابراہیمؑ جیسے بہادر ہیرو نے تینوں مرتبہ پتھر مار کر اسے اپنے سے دور کر دیا۔

ان مراسم کا مفہوم یہ ہے کہ تم سب کو بھی اپنی پوری زندگی میں جہادِ اکبر کے میدان میں شیاطین کے وسوسوں کا سامنا ہے اور جب تک تم انھیں سنگسار نہ کرو گے اور اپنے سے دُور نہ بھگاؤ گے، کامیاب نہ ہو گے۔

اگر تم یہ چاہتے ہو کہ جس طرح خداوند تعالیٰ نے ابراہیمؑ پر سلام بھیجا ہے اور ان کے مکتب اور یاد کو جاودانی بنا دیا ہے۔ تم پر بھی لطف و رحمت کی نظر کرے، تو ضروری ہے کہ ان کے راستے پر ہمیشہ چلو۔

یا جس وقت ہم صفا اور مروہ کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ گروہ در گروہ ایک چھوٹی سی پہاڑی سے اس سے بھی زیادہ چھوٹی پہاڑی کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے پھر اسی کی طرف پلٹ آتے ہیں اور بلا کچھ حاصل کیے اس عمل کو دہراتے ہیں کبھی دوڑتے ہیں اور کبھی چلتے ہیں، یقیناً ہم تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیا کام ہے اور اس کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟

لیکن پھر ہم پیچھے کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس باایمان خاتون (ہاجرہؑ) کی اپنے شیر خوار بچے اسماعیلؑ کی جان بچانے کے لیے، اس خشک اور گرمی سے جلتے ہوئے بیابان میں سعی و کوشش کو یاد کرتے ہیں کہ کس طرح اس سعی و کوشش کے بعد خدا نے اسے اس کے مقصد تک پہنچایا۔ زمزم کا چشمہ اس کے نوزائیدہ بچے کے پاؤں کے نیچے سے پھوٹا۔ اچانک زمانے کی گردش پیچھے کی طرف لوٹتی ہے، پردے ہٹ جاتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو اس لمحے ہاجرہ کے پاس پاتے ہیں اور اس کے ساتھ سعی و تلاش میں ہمگام ہو جاتے ہیں کیونکہ راہِ خدا میں کوئی بھی شخص سعی و تلاش کے بغیر منزل تک نہیں پہنچتا۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، اس سے انسان آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ حاصل کر سکتا ہے کہ حج کے ان رموز کی تعلیم دینا چاہیے۔ اور ابراہیمؑ، ان کے فرزند اور ان کی زوجہ کی یادوں کی قدم بہ قدم پیروی کرنی چاہیے تاکہ حج کے فلسفے کا بھی ادراک ہو اور حج کے اخلاقی عمیق اور گہرے اثرات بھی حجاج کے دلوں پر سایہ فگن ہوں کیونکہ ان آثار کے بغیر ظاہری چھلکے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۱۱۱- إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ○

۱۱۲- وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ○

۱۱۳- وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ ۚ وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ ○

ترجمہ

۱۱۱- بیشک وہ (ابراہیم) ہمارے باایمان بندوں میں سے ہے۔

۱۱۲- ہم نے اسے صالح پیغمبر اسحاق کی بشارت دی۔

۱۱۳- ہم نے اسے اور اسحاق کو برکت دی اور ان دونوں کی اولاد میں کچھ تو نیک ہیں اور کچھ کھلم کھلا اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔

تفسیر

ابراہیمؑ خدا کا مومن بندہ

زیر نظر تین آیات حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزندوں کے بارے میں جاری گفتگو کے اعتبار سے آخری آیات ہیں۔ ان میں درحقیقت جو کچھ گذر چکا ہے اس کی ایک دلیل بھی بیان کی گئی ہے اور ایک نتیجہ بھی۔ پہلے فرمایا گیا ہے: وہ (ابراہیم) ہمارے باایمان بندوں میں سے ہے (انه من عبادنا المؤمنین)۔

دراصل یہ جملہ ایک دلیل ہے اس چیز کی جو گزر چکی ہے۔ اس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اگر ابراہیمؑ نے اپنی ساری ہستی اور وجود کو یہاں تک کہ اپنے عزیز فرزند کو بھی پورے اخلاص کے ساتھ اپنے معبود کی راہ میں قربان کر دیا، تو یہ اپنے عمیق اور طاقت ور ایمان کی وجہ سے کیا تھا۔

ہاں! یہ تمام چیزیں ایمان کے جلوے ہیں اور یہ ایمان کے کیا ہی عجیب و غریب جلوے ہوتے ہیں۔

یہ تعبیر لاکر قرآن ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے کے واقعے کو وسعت اور ہمہ گیری دے رہا ہے اور اسے ایک شخصی اور انفرادی واقعے سے ممتاز کر رہا ہے گویا قرآن اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ جہاں کہیں ایمان ہے وہاں ایثار، عشق، فداکاری اور قربانی ہے۔ ابراہیمؑ اسی چیز کو پسند کرتے تھے جسے خدا پسند کرتا تھا اور وہی چاہتے تھے جو خدا چاہتا تھا اور ہر

ہو ایسا ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے لیے خدا کی ایک اور نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، جس کے مقدر میں تھا کہ پیغمبر ہو اور صالحین میں سے ہو (و بشرناہ باسحاق نبیًا من الصالحین)۔

" فبشرناہ بغلام حلیم" کی آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو اس واقعے کے آغاز میں ذکر ہوئی ہے، بخوبی واضح و روشن ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں بشارتیں دو بیٹوں کے ساتھ مربوط ہیں۔ اگر آخری بشارت زیر بحث آیت کی صراحت کے مطابق "اسحاقؑ" سے مربوط ہے تو پھر "غلام حلیم" (بردبار و صابر) کی بشارت یقیناً "اسماعیلؑ" سے ربط رکھتی ہے اور جن لوگوں کا یہ اصرار ہے کہ اسحاقؑ ہی ذبیح ہیں انھوں نے دونوں آیات کا ایک ہی مطلب کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلی آیت کو خود بیٹے کی اصل بشارت کہا ہے اور دوسری آیت کو نبوت کی بشارت۔ لیکن یہ معنی بہت بعید ہے۔

زیر بحث آیات وضاحت کے ساتھ کہتی ہیں کہ یہ دونوں بشارتیں دو الگ الگ بیٹوں کے ساتھ مربوط ہیں۔

(غور کیجیے گا)

اس سے قطع نظر بشارتِ نبوت بتاتی ہے کہ اسحاقؑ زندہ رہیں گے اور فرائض نبوت انجام دیں گے، لیکن یہ بات ذبح کے مسئلے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں ہم ایک مرتبہ پھر صالحین کے مقام و مرتبہ کی عظمت ملاحظہ کر رہے ہیں۔ حضرت اسحاقؑ کی توصیف و تعریف میں فرمایا گیا ہے، کہ وہ پیغمبر ہوں گے اور صالحین میں سے ہوں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں صالحین کا مقام کتنا بلند و بالا ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں اس برکت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو خدا نے ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسحاقؑ کو عطا فرمائی، فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے اور اسحاق کو برکت سے نوازا (و بارکنا علیہ و علی اسحاق)۔

لیکن کس چیز میں برکت دی گئی؟ اس کی وضاحت نہیں کی گئی اور ہم جانتے ہیں کہ عام طور پر جس وقت کوئی فعل مطلق آئے اور اس میں کوئی قید و شرط نہ ہو تو وہ ہمہ گیری کے معنی دیتا ہے اس بنا پر برکت سب چیزوں پر محیط ہو گی یعنی عمر اور زندگی میں آئندہ کی نسلوں میں تاریخ و مکتب میں گویا ہر ایک چیز میں اصولی طور پر "برکت" اصل میں "برک" (بروزنِ "ورک") اونٹ کے سینے کے معنی میں ہے۔ جس وقت اونٹ اپنا سینہ زمین پر رکھتا ہے تو یہی مادہ اس کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

"برك البعير"

رفتہ رفتہ یہ مادہ کسی چیز کے ثبات و دوام کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ "برکۂ آب" کو بھی اسی بنا پر "برکہ" کہتے ہیں کہ اس میں پانی ثابت و برقرار رہتا ہے اور مبارک کو بھی اس لحاظ سے مبارک کہتے ہیں کہ اس کی خیر و خوبی باقی اور برقرار رہتی ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیت ابراہیمؑ و اسحاقؑ (اور ان کے خاندان پر) نعمات الٰہی کے ثابت و برقرار رہنے اور

دوام کی طرف اشارہ ہے اور ایک برکت جو خدا نے ابراہیمؑ کو دی، یہ تھی کہ بنی اسرائیل کے تمام انبیاء حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں سے ہوئے، جبکہ اسلام کے عظیم پیغمبرؐ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ہیں۔

لیکن اس بنا پر کہ یہ توہم نہ ہو کہ یہ برکت ابراہیمؑ کے خاندان میں نسب اور قبیلے کے طور پر ہے بلکہ یہ تو مذہب و مکتب اور ایمان کے ساتھ ربط رکھنے کی بنا پر ہے۔ آیت کے آخر میں مزید ارشاد ہوتا ہے: ان دونوں کی اولاد میں سے نیک بھی تھے اور ایسے افراد بھی جنھوں نے عدم ایمان کی بنا پر اپنے اوپر ظلم کیا (و من ذریتھما محسن و ظالم لنفسہ مبین)۔

"محسن" یہاں مومن اور فرمانِ خدا کے مطیع کے معنی میں ہے اور کون سا احسان اور نیکی اس سے برتر و افضل تصور ہو سکتی ہے؟ جبکہ "ظالم" کافر گنہگار کے معنی میں ہے اور "لنفسہ" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کفر و گناہ پہلے درجے میں خود اپنے اوپر ظلم ہے اور وہ بھی واضح و آشکار ظلم۔

اس طرح سے مذکورہ بالا آیت یہود و نصاریٰ کے ان لوگوں کو جو اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں جواب دیتی ہے کہ صرف رشتہ باعثِ افتخار نہیں ہے جبکہ اس کے ساتھ فکری و مکتبی رشتہ برقرار نہ ہو۔

اس بات پر شاہد پیغمبر اکرمؐ کی وہ حدیث ہے جو پیغمبر گرامیٔ اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے بنی ہاشم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

لا یأتینی الناس باعمالھم و تأتونی بانسابکم

اے بنی ہاشم! کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن باقی لوگ تو میرے پاس اپنے اعمال کے ساتھ آئیں اور تم اپنے نسب اور رشتہ داری کا تعلق جتاتے ہوئے آؤ[1]

---

[1] روح البیان، جلد ۷، ص ۴۷۹

۱۱۴۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝

۱۱۵۔ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝

۱۱۶۔ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝

۱۱۷۔ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ۝

۱۱۸۔ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

۱۱۹۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِى الْاٰخِرِيْنَ ۝

۱۲۰۔ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝

۱۲۱۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

۱۲۲۔ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۴۔ ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا

۱۱۵۔ ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم کو عظیم کرب سے نجات بخشی۔

۱۱۶۔ اور ہم نے ان کی مدد کی یہاں تک کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آ گئے۔

۱۱۷۔ ہم نے انھیں آسمانی کتاب عطا کی۔

۱۱۸۔ ہم نے انھیں راہ راست کی ہدایت کی۔

۱۱۹۔ اور ان کا ذکر خیر ہم نے بعد والی اقوام میں باقی رکھا۔

۱۲۰۔ موسیٰ اور ہارون پر سلام۔

۱۲۱۔ ہم اسی طرح سے نیکو کاروں کو جزا دیا کرتے ہیں۔

۱۲۲۔ وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

تفسیر

موسیٰ وہارون پر خدائی نعمتیں

ان آیات میں "موسیٰ" اور ان کے بھائی "ہارون" کے بارے میں الطافِ الٰہی کے ایک گوشے کی طرف اشارہ ہوا ہے، اور جو کچھ گزشتہ آیات میں حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں بیان ہوا ہے اس سے ہم آہنگ بخشیں آئی ہیں۔ آیات کے مضامین بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور کئی لحاظ سے الفاظ بھی مشابہت رکھتے ہیں، تاکہ مومنین کے لیے ایک منظم تربیتی پروگرام پیش کیا جائے۔

ان آیات میں پھر بیانِ واقعات کے متعلق اجمال وتفصیل کی مخصوص قرآنی روش سے استفادہ کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "ہم نے موسیٰ پر اور ہارون پر احسان کیا اور انھیں اپنی نعمتوں کا مرہونِ منت بنایا (ولقد مننا علیٰ موسیٰ وھارون)۔

"منت" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے، اصل میں "من" سے ہے جو اس پتھر کے معنی میں ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے، رفتہ رفتہ بڑی اور بھاری نعمتوں کے لیے بولا جانے لگا۔ اگر وہ عملی پہلو رکھتی ہوں تو زیبا اور پسندیدہ ہیں اور اگر الفاظ اور باتیں ہی ہوں تو قبیح اور بدنما ہیں۔ اگرچہ "منت" روزمرہ کے استعمال میں زیادہ تر دوسرے معنی میں بولا جاتا ہے اور یہی امر زیرِ بحث آیات جیسی آیات کے مطالعے کے وقت نامطلوب امور کی طرف توجہ مبذول کرنے کا سبب بنتا ہے، لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ لفظ "منت" لغت اور قرآنی استعمال کے اعتبار سے ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو مذکورہ پہلے مفہوم (بڑی بڑی نعمتیں بخشنے) کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

بہرحال خدا اس آیت میں سربستہ اور اجمالی طور پر ان بڑی اور گراں قدر نعمتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ان دونوں بھائیوں کو عطا کی گئیں اور بعد والی آیات میں ان نعمتوں کے سات مواقع بیان کرتا ہے۔ ان نعمتوں میں سے ہر ایک دوسری سے زیادہ گراں قدر ہے۔

پہلے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ان دونوں بھائیوں اور ان کی قوم کو عظیم کرب سے نجات بخشی (ونجینا ھما وقومھما من الکرب العظیم)۔

اس سے بڑا کرب اور کیا ہوگا کہ بنی اسرائیل جابر اور خونخوار فرعونیوں کے چنگل میں گرفتار تھے وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے، ان کی عورتوں کو خدمت گاری اور مردوں کو غلامی اور بیگار کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔

ہاں! حریت وآزادی کھو بیٹھنا اور ایسے بے رحم بادشاہ کے چنگل میں گرفتار ہونا کہ جو نہ چھوٹوں پر رحم کرتا تھا اور نہ بڑوں پر۔ یہاں تک کہ وہ قوم وملت کی آبرو اور نسل کو پامال کرتا تھا جو ایک بہت ہی بڑا دکھ اور عظیم کرب تھا اور یہ پہلا احسان تھا جو

خدا نے بنی اسرائیل پر کیا۔

دوسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے ان (موسیٰ، ہارون اور بنی اسرائیل) کی مدد کی یہاں تک کہ وہ اپنے طاقتور دشمن پر غالب آگئے۔" (ونصرناھم فکانوا ھم الغالبین)۔

جس دن فرعونی خونخوار لشکر عظیم طاقت کے ساتھ حرکت میں آیا، جس کے آگے آگے خود فرعون تھا۔ بنی اسرائیل ایک ضعیف اور ناتوان قوم تھی۔ ان کے پاس نہ جنگجو سپاہی تھے اور نہ ہی ہتھیار۔ لیکن خدا نے اپنے لطف وکرم سے ان کی مدد کی۔ فرعونیوں کو پانی کی لہروں میں غرق کر دیا اور ان (بنی اسرائیل) کو ڈوبنے سے بچا لیا اور فرعونیوں کے محلات، مال و دولت، باغات اور تمام خزانے ان کے سپرد کر دیئے۔

تیسرے مرحلے میں اس نعمت کی طرف جو خدا نے قید غلامی سے رہائی پانے والی اس قوم کو عنایت فرمائی، اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے ان دونوں کو آشکار و واضح کتاب دی (و اٰتیناھما الکتاب المستبین)۔

ہاں! تورات کتاب "مستبین" یعنی واضح و روشن کرنے والی کتاب تھی اور اس زمانے میں بنی اسرائیل کی تمام دینی و دنیاوی ضروریات کی کفیل تھی۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۴۴ میں بھی بیان ہوا ہے۔

انّا انزلنا التوراة فیھا ھدًی و نور

ہم نے تورات کو نازل کیا جس میں ہدایت بھی ہے اور نور و روشنی بھی۔

چوتھے مرحلے میں پھر ایک اور روحانی نعمت ۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ان دونوں کو راہِ راست کی ہدایت کی (وھدیناھما الصراط المستقیم)۔

وہی راہِ راست جو ہر قسم کی کجی سے خالی، انبیاء و اولیاء کی راہ ہے اور اس میں انحراف، گمراہی اور تباہی کا خطرہ موجود نہیں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سورۂ حمد میں، جسے ہم تمام نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ ہم خدا سے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کی درخواست کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے نعمتیں نازل کی ہیں نہ کہ مغضوبین اور گمراہوں کی راہ۔ تو یہ دراصل انبیاء و اولیاء ہی کی راہ ہے۔

پانچویں مرحلے میں مکتب کی ہمیشگی اور نیک نامی کی بقاء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان دونوں کا ذکر خیر بعد والی اقوام میں باقی اور برقرار رکھا (تاکہ وہ دو نمونوں کے عنوان سے پہچانے جائیں اور پورے جہاں کے لوگ ان کی روش اور تاریخ سے ہدایت اور راہنمائی حاصل کریں) (وترکنا علیھما فی الاٰخرین)۔

یہی تعبیر گزشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کے بارے میں آئی تھی، اصولی طور پر سب ہی مردانِ خدا اور راہِ حق کے عظیم راہیوں کی تاریخ اور نام ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ یہ لوگ کسی خاص قوم و ملت کے ساتھ

متعلق نہیں، بلکہ تمام عالم انسانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

چھٹے مرحلے میں موسیٰؑ اور ہارونؑ پر خدا کے سلام کا ذکر ہے، فرمایا گیا ہے: موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو (سلام علیٰ موسیٰ و ہارون)۔

ایسا سلام جو بزرگ و مہربان خدا کی طرف سے ہے۔

ایسا سلام، جو دین، ایمان، اعتقاد، مکتب اور مذہب میں سلامتی کی طرف اشارہ ہے۔

ایسا سلام، جو اس جہان اور اس جہان کی سزاؤں اور عذاب سے نجات بیان کرنے والا ہے۔

ساتویں اور آخری مرحلے میں ان کے لیے اپنی عظیم جزا کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ہم نیکو کاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں (انا کذالک نجزی المحسنین)۔

اگر انہوں نے یہ افتخارات اور اعزازات حاصل کیے ہیں تو یہ بلا وجہ نہیں تھے وہ محسن تھے وہ مومن، مخلص، فداکار اور نیکوکار تھے اور اس قسم کے لوگوں کو ایسا ہی صلہ اور بدلہ ملنا چاہیے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعینہٖ یہی عبادت "انا کذالک نجزی المحسنین"

اسی سورہ میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور حضرت ایلیاسؑ کے بارے میں آئی ہے۔

نیز اسی سے ملتی جلتی ایک تعبیر سورۂ یوسف کی آیہ ۲۲ میں حضرت یوسفؑ کے بارے میں اور سورۂ انعام کی آیہ ۸۴ میں بعض انبیاء کے بارے میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ سب تعبیریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ الطاف الٰہی سے بہرہ مند ہونے کے لیے پہلے محسنین کے زمرے میں قرار پانا چاہیے، جس کے بعد برکات الٰہی کا ہونا قطعی ہے (غور کیجیے گا)

انجام کار آخری زیر بحث آیت میں اسی دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس سے پہلے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کی داستان میں آچکی ہے، ارشاد ہوتا ہے: وہ دونوں (موسیٰ و ہارون) ہمارے مومن بندوں میں سے تھے (انهما من عبادنا المؤمنين)۔

یہ ایمان ہی ہے جو انسان کی روح کو اس طرح سے روشن اور قوی کر دیتا ہے کہ وہ احسان، نیکی، پاکیزگی اور تقویٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ایسا احسان جو رحمتِ الٰہی کے دروازے انسان کے سامنے کھول دیتا ہے اور پھر اس کی انواع و اقسام کی نعمتیں انسان پر نازل ہوتی ہیں۔

۱۲۳۔ وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ؕ

۱۲۴۔ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

۱۲۵۔ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ۝ۙ

۱۲۶۔ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

۱۲۷۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ۙ

۱۲۸۔ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

۱۲۹۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ۙ

۱۳۰۔ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ۝

۱۳۱۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝

۱۳۲۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۲۳۔ اور بے شک الیاس ہمارے رسولوں میں سے تھا۔

۱۲۴۔ اس وقت کو یاد کرو، جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟

۱۲۵۔ کیا تم بعل بت کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑے ہوئے ہو؟

۱۲۶۔ وہ خدا جو تمھارا بھی پروردگار ہے اور تمھارے گزشتہ آباؤ اجداد کا بھی پروردگار ہے۔

۱۲۷۔ لیکن انھوں نے اسے جھٹلایا، مگر یقینی طور پر وہ سب کے سب خدائی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔

۱۲۸۔ سوائے خدا کے مخلص بندوں کے۔

۱۲۹۔ ہم نے اس (الیاس) کا نیک نام بعد کی امتوں میں باقی و برقرار رکھا۔

۱۳۰۔ الیاسین پر سلام ہو۔

۱۳۱۔ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔

۱۳۲۔ وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے ہے۔

تفسیر

پیغمبرِ خدا الیاسؑ مشرکین کے مقابلے میں

زیرِ نظر آیات میں گزشتہ انبیاء میں سے ایک اور نبی کی سرگزشت بیان کی جارہی ہے یہ اس سورہ میں آنے والی چوتھی سرگزشت ہے۔ یہ حضرت الیاس کی ایک مختصر سی سرگزشت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، الیاس خدا کے رسولوں میں سے تھا (وان الیاس لمن المرسلین)۔

حضرت الیاسؑ ان کے نسب اور ان کی زندگی کی خصوصیات کے بارے میں انشاء اللہ کچھ گفتگو ان آیات کے آخر میں نکات کے ضمن میں آئے گی۔

اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب اس نے اپنی قوم کو خبردار کیا اور کہا: "کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (اذ قال لقومه الا تتقون)۔

تقوائے الٰہی۔ شرک و بت پرستی سے پرہیز، ظلم و گناہ سے پرہیز اور انسانیت کے لیے تباہ کن سب باتوں سے پرہیز۔

بعد والی آیت میں اس مسئلہ کے بارے میں، اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بات کی گئی ہے، کیا تم بعل بُت کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑ رہے ہو (اتدعون بعلًا و تذرون احسن الخالقین)۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا ایک معروف بُت تھا، جس کا نام "بعل" تھا اور وہ اس کے سامنے سجدہ کیا کرتے تھے۔ حضرت الیاسؑ نے انھیں اس قبیح عمل سے روکا اور عظیم آفریدگارِ عالم اور توحیدِ خالص کی طرف دعوت دی۔

اسی وجہ سے ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ حضرت الیاسؑ کی فعالیت کا مرکز شامات کے شہروں میں سے شہر "بعلبک" تھا[1]

کیونکہ "بعل" اس مخصوص بُت کا نام تھا اور "بک" کا معنی ہے شہر۔ ان دونوں کی آپس میں ترکیب سے "بعلبک" ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ سونے کا اتنا بڑا بُت تھا کہ اس کا طول بیس ہاتھ تھا۔ اس کے چار چہرے تھے اور اس بُت کے چار سو سے

---

[1] بعلبک موجودہ زمانے میں لبنان کا حصہ ہے اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔

زیادہ خادم بتے ہیں[1]

البتہ بعض کسی معین بُت کو "بعل" نہیں سمجھتے بلکہ بت کے مطلق معنی میں لیتے ہیں مگر بعض دوسرے اسے "رب اور معبود" کے معنی میں سمجھتے ہیں۔

راغب، مفردات میں کہتا ہے "بعل" اصل میں شوہر کے معنی میں ہے لیکن عرب اپنے ان معبودوں کو جن کے ذریعے وہ خدا کا تقرب چاہتے تھے "بعل" کا نام دیتے تھے۔

احسن الخالقین، بہترین خالق کی تعبیر، حالانکہ عالم میں خالق حقیقی خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ظاہراً ان مصنوعات کیطرف اشارہ ہے جنھیں انسان موادِ طبیعی سے شکل بدل کر بناتا ہے اور اس لحاظ سے اس پر خالق کا اطلاق ہوتا ہے، اگرچہ انسان مجازی خالق ہے۔

بہرحال الیاسؑ نے اس بُت پرست قوم کی سخت مذمت کی اور مزید کہا: اس خدا کو چھوڑ رہے ہو جو تمھارا اور تمھارے گزشتہ آباؤ اجداد کا پروردگار ہے (اللہ ربکم و رب اٰبائکم الاولین)۔

تم سب کا مالک و مربی وہی تھا اور ہے۔ جو نعمت بھی تمھارے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے اور ہر مشکل کا حل اسی کے دستِ قدرت سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو خیر و برکت کا کوئی اور سرچشمہ موجود ہے اور نہ ہی شر و آفت کا کوئی اور دفع کرنے والا ہے۔

گویا حضرت الیاسؑ کے زمانے کے بُت پرست بھی پیغمبر اسلامؐ کے زمانے کے بُت پرستوں کی طرح اپنے کام کی توجیہ کے لیے اپنے آباؤ اجداد اور بڑوں کے طریقے ہی کا سہارا لیتے تھے کیونکہ حضرت الیاسؑ ان کے جواب میں کہتے ہیں: اللہ ہی تمھارا اور تمھارے آباؤ اجداد کا رب ہے۔

"رب" (مالک و مربی) کی تعبیر غور و فکر کے لیے بہترین محرک ہے کیونکہ انسانی زندگی میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ یہ جانے کہ اسے کس نے پیدا کیا ہے، اور آج اس کا مربی، ولی نعمت اور صاحبِ اختیار کون ہے؟

لیکن اس سرپھری اور خود پسند قوم نے خدا کے اس عظیم پیغمبر کے استدلالی پند و نصائح اور واضح ہدایات پر کان نہ دھرے اور "اس کی تکذیب کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے" (فکذبوہ)۔

خدا نے بھی ان کی سزا کو ایک مختصر سے جملے میں بیان کرتے ہوئے کہہ دیا: وہ بارگاہِ عدلِ الٰہی اور اس کی دوزخ کے عذاب میں حاضر کیے جائیں گے (فانھم لمحضرون)۔

اور اپنے قبیح اور بداعمال کی سزا کا مزہ چکھیں گے۔

---

[1] روح المعانی، زیر بحث آیت کے ذیل میں

لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹا سا نیک، پاک اور مخلص گروہ حضرت الیاسؑ پر ایمان لے آیا تھا لہٰذا ان کا حق فراموش نہ کرتے ہوئے بلافاصلہ فرمایا گیا ہے: مگر خدا کے مخلص بندے (الّا عباد الله المخلصین)[1]

اس داستان کی آخری آیات میں وہی چار مسائل جو دوسرے انبیاء (موسیٰؑ و ہارونؑ اور ابراہیمؑ و نوحؑ) کے واقعات میں آئے تھے، ان کی اہمیت کے پیشِ نظر پھر دہرائے گئے ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے الیاس کا نیک نام بعد والی امتوں میں جاوداں کر دیا (و ترکنا علیه فی الاٰخرین)۔

دوسری امتیں ان بزرگ انبیاء کی انتہائی زحمتوں کو جو انھوں نے راہِ توحید کی پاسداری اور تخمِ ایمان کی آبیاری کے لیے اٹھائی ہیں، کبھی فراموش نہیں کریں گی اور جب تک دنیا قائم ہے ان مردانِ بزرگ اور فداکاروں کا مکتب اور یاد زندہ و جاوید رہے گی۔

دوسرے مرحلے میں قرآن مزید کہتا ہے: الیاسین پر سلام و درود ہو (سلام علی الیاسین)۔

"الیاس" کی بجائے "الیاسین" کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ "الیاسین"، لفظِ "الیاس" کی ایک لغت ہے اور دونوں ایک ہی معنی میں ہیں اور یا "الیاسؑ" اور ان کے پیروکاروں کی طرف اشارہ ہے اور جمع کی شکل میں آیا ہے[2]

تیسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں (انا کذالك نجزی المحسنین)۔

نیکی اور احسان سے اس لفظ کا وسیع معنی مراد ہے، جس میں دین اور اس کے تمام احکام پر عمل کرنا شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شرک، انحراف، گناہ اور فساد سے مقابلہ کرنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

چوتھے مرحلے میں ان تمام باتوں کی اصل بنیاد یعنی ایمان کا ذکر ہے: یقیناً وہ (الیاس) ہمارے مؤمن بندوں میں سے ہے (انه من عبادنا المؤمنین)۔

"ایمان" و "عبودیت" "احسان" کا سرچشمہ ہے اور احسان مخلصین کی صف میں شامل ہونے اور خدا کے سلام کا حقدار ہونے کا سبب ہے۔

---

[1] جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے مطابق یہ استثناء "استثناء متصل" ہے "کذبوہ" کی داوسے یعنی تمام قوم نے تو تکذیب کی اور وہ سب عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے سوائے خدا کے مخلص بندوں کے۔

[2] پہلے "الیاس" منسوب ہوا اور "الیاسی" ہوا پھر جمع کی شکل میں آکر "الیاسیین" ہو گیا اور اس کے بعد مخفف ہو کر "الیاسین" ہو گیا۔

چند اہم نکات

۱۔ الیاسؑ کون ہیں؟ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرت الیاسؑ خدا کے عظیم انبیاء میں سے ایک ہیں اور زیر بحث آیات نے یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ "ان الیاس لمن المرسلین"

اس پیغمبر کا نام قرآن مجید کی دو آیات میں آیا ہے ایک تو اسی سورۂ صافات میں اور دوسرا سورۂ انعام میں چند انبیاء کے ساتھ، جہاں فرمایا گیا ہے :۔

وزکریا و یحیٰی وعیسٰی والیاس کل من الصالحین (انعام : ۸۵)

لیکن اس بارے میں کہ قرآن میں جن انبیاء کا نام آیا ہے انہی میں سے ایک پیغمبر کا نام الیاس ہے یا یہ کسی پیغمبر کا مستقل نام ہے نیز اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس ضمن میں مفسرین میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے :۔

الف :۔ بعض کہتے ہیں کہ "الیاس"، "ادریس" کا دوسرا نام ہے کیونکہ ادریس کا ادراس بھی تلفظ ہوا ہے اور وہ مختصر سی تبدیلی کے ساتھ الیاس ہو گیا۔

ب :۔ بعض کا کہنا ہے کہ الیاس بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے ہیں۔ "یاسین" کے فرزند ہیں اور موسیٰ کے بھائی ہارون کے نواسوں میں سے ہیں۔

ج :۔ کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ الیاس خضر کا دوسرا نام ہے جبکہ بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ الیاس خضر کے دوستوں میں سے ہیں اور دونوں زندہ ہیں اس فرق کے ساتھ کہ الیاس تو خشکی پر مامور ہیں لیکن خضر جزیروں اور دریاؤں پر مامور ہیں، بعض دوسرے الیاس کی ماموریت بیابانوں میں اور خضر کی ماموریت پہاڑوں پر خیال کرتے ہیں اور دونوں کے لیے عمر جاودانی کے قائل ہیں بعض الیاس کو "الیسع" کا فرزند سمجھتے ہیں۔

د :۔ بعض کہتے ہیں کہ الیاس بنی اسرائیل کے وہی "ایلیا" پیغمبر ہیں جو "آجاب" بادشاہ بنی اسرائیل کے ہمعصر تھے جنھیں خدا نے اس ظالم بادشاہ کو ڈرانے اور ہدایت کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

بعض نے انھیں "یحیٰی" بھی جانا ہے جو مسیح کے تمہید دہندہ تھے۔

لیکن قرآن کی آیات کے ظاہر کے ساتھ جو بات ہم آہنگ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ مستقلاً ایک پیغمبر کا نام ہے اور قرآن میں جن دیگر پیغمبروں کے نام آئے ہیں یہ ان کے علاوہ ہیں جو ایک بت پرست قوم کی ہدایت کے لیے مامور ہوئے تھے اور اس قوم کی اکثریت ان کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن مخلص مومنین کے ایک گروہ نے ان کی پیروی کی۔

اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور بعض اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ اس قوم کے بڑے بت کا نام "بعل" تھا یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ پیغمبر سرزمین شامات میں مبعوث ہوئے تھے اور ان کی فعالیت کا مرکز شہر "بعلبک" تھا جو اس وقت لبنان کا حصہ ہے اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔

بہر حال اس پیغمبر کے بارے میں مختلف داستانیں کتابوں میں بیان کی گئی ہیں اور چونکہ وہ قابل اعتماد و اطمینان نہیں لہٰذا

ہم نے انھیں نقل نہیں کیا[1]

۲۔ "الیاسین" کون ہیں؟ مفسرین اور مورخین کے "الیاسین" کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔

الف:۔ بعض اسے الیاس کی ایک لغت سمجھتے ہیں یعنی جس طرح "میکال" و "میکائیل" ایک مخصوص فرشتے کے لیے دو لفظ ہیں، اور "سینا" اور "سینین" دونوں ایک معروف سرزمین کے نام ہیں۔ اسی طرح "الیاس" اور "الیاسین" بھی اس عظیم پیغمبر کے نام ہیں[2]

ب:۔ بعض دوسرے اسے جمع سمجھتے ہیں۔ اس طرح سے کہ "الیاس" کے ساتھ یاء نسبتی کا اضافہ ہوا تو "الیاسی" ہوگیا اور اس کے بعد یاء اور نون کے ساتھ اس کی جمع بنائی گئی اور "الیاسیین" ہوگیا اور تخفیف کے بعد "الیاسین" رہ گیا۔ اس بنا پر اس کا مفہوم وہ تمام اشخاص ہیں جو الیاس کے ساتھ مربوط تھے اور ان کے مکتب کے پیرو کار بن گئے تھے[3]

ج:۔ بعض کا خیال ہے کہ "آلیاسین" الف ممدودہ کے ساتھ ہے جو لفظ "آل" اور "یاسین" کا مرکب ہے۔ ایک روایت کے مطابق "یاسین" حضرت الیاس کے باپ کا نام ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق پیغمبر گرامی اسلامؐ کا نام ہے۔ اس بنا پر "آل یاسین" پیغمبر گرامی اسلامؐ کی آل و اولاد کے معنی میں ہے یا الیاس کے باپ یاسین کا خاندان مراد ہے۔

واضح قرائن خود قرآن میں موجود ہیں جو اسی پہلے معنی کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی "الیاسین" سے مراد الیاس ہی ہیں کیونکہ "سلام علیٰ الیاسین" کی آیت سے ایک آیت کے فاصلے کے بعد فرمایا گیا ہے:۔

انه من عبادنا المؤمنين

وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

ضمیر مفرد کا "الیاسین" کی طرف لوٹنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک شخص سے زیادہ نہیں یعنی وہی جناب الیاسؑ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ چار آیات جو حضرت الیاسؑ کی داستان کے آخر میں ہیں بعینہٖ وہی آیات ہیں جو نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کی داستان کے آخر میں آئی ہیں اور جب ہم ان آیات کو ایک دوسرے کے پہلو میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جو سلام خدا کی طرف سے ان آیات میں آیا ہے وہ اسی پیغمبر کے لیے ہے جس کا بیان ابتدائے گفتگو میں ہے (سلام علیٰ نوح فی العالمین۔ سلام علیٰ ابراهیم۔ سلام علیٰ موسٰی وهارون) اس بنا پر یہاں بھی سلام علیٰ الیاسین؛ الیاس پر سلام ہوگا۔ (غور کیجیے گا)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر المیزان، روح المعانی، تفسیر فخر رازی، فی ظلال، اعلام القرآن اور دائرۃ المعارف دھخدا

[2] "البیان" فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۳۰۸

[3] ایضاً

وہ نکتہ جس پر یہاں خاص طور پر توجہ کی ضرورت ہے یہ ہے کہ بہت سی تفاسیر میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ جس کی سند ابن عباس کی طرف لوٹتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "آل یاسین" سے مراد آلِ محمدؐ ہیں۔ کیونکہ "یاسین" پیغمبر اسلامؐ کے اسماء میں سے ایک ہے۔

معانی الاخبار میں صدوق نے ایک باب جو "آل یاسین" کی تفسیر کے لیے ذکر کیا ہے، اس میں پانچ احادیث اس ضمن میں نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث کے سوا کوئی بھی ائمہ اہلِ بیت تک نہیں پہنچتی اور اس حدیث کا راوی ایک شخص "کادح" یا "قادح" نامی ہے[1] جس کے بارے میں کتب رجال میں کوئی خبر نہیں ہے۔

چونکہ یہ اخبار اس مفروضہ کی بنا پر ہیں کہ ہم اوپر والی آیت کی قرات کو سلام علیٰ آل یاسین کی صورت میں پڑھیں اور آیات کی ہم آہنگی کو نظرانداز کردیں اور ان روایات کی اسناد بھی جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے قابلِ بحث ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان روایات کے بارے میں فیصلہ کرنے سے باز رہیں اور ان کا علم ان کے اہل کے سپرد کردیں۔

---

[1] معانی الاخبار ص ۱۲۲ (جامعۃ المدرسین قم کی شائع کردہ)

۱۳۳۔ وَاِنَّ لُوۡطًا لَّمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ؕ

۱۳۴۔ اِذۡ نَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اَجۡمَعِيۡنَ ۙ

۱۳۵۔ اِلَّا عَجُوۡزًا فِى الۡغٰبِرِيۡنَ

۱۳۶۔ ثُمَّ دَمَّرۡنَا الۡاٰخَرِيۡنَ

۱۳۷۔ وَاِنَّكُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مُّصۡبِحِيۡنَ ۙ

۱۳۸۔ وَبِالَّيۡلِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ

ترجمہ

۱۳۳۔ لوط ہمارے رسولوں میں سے تھا۔

۱۳۴۔ وہ وقت یاد کرو جب ہم نے اسے اور اس کے سارے خاندان کو نجات دی۔

۱۳۵۔ سوائے ایک بڑھیا کے جو اس قوم کے درمیان باقی رہ گئی (اور ان کے سے انجام میں گرفتار ہوئی)

۱۳۶۔ پھر باقی لوگوں کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔

۱۳۷۔ اور تم ہمیشہ (ان کے شہروں کے ویرانوں کے قریب سے) صبح کے وقت بھی عبور کرتے ہو...

۱۳۸۔ اور رات کے وقت بھی، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

تفسیر

اس قوم کی تباہ سرزمین تمہارے سامنے ہے

پانچویں پیغمبر جن کا اس سورہ میں اور آیات کے اس سلسلے میں نام آیا ہے اور ان کی تاریخ کا ایک مختصر حصہ، تربیتی اور اصلاحی درس کے طور پر بیان ہوا ہے وہ حضرت لوطؑ ہیں۔ قرآن کی صراحت کے مطابق وہ حضرت ابراہیمؑ کے ہمعصر تھے۔ وہ خدا کے عظیم پیغمبروں میں سے ہیں (عنکبوت ۲۶، ہود ۷۴)۔

حضرت لوطؑ کا نام قرآن میں بہت سی آیات میں آیا ہے اور بارہا ان کے اور ان کی قوم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

خاص طور پر اس منحرف قوم کا انجام، ایک واضح اور روشن صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ (شعراء ۱۶۰ تا ۱۷۴، اور ہود ۷۰ تا ۸۳، نمل ۵۴ تا ۵۸، اور دوسرے مقامات)

ارشاد ہوتا ہے: لوط ہمارے رسولوں میں سے تھا (وان لوطا لمن المرسلین)۔

اس اجمال کو بیان کرنے کے بعد قرآن اجمال و تفصیل کی اپنی روش کے مطابق، اس ماجرے کے ایک حصے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب ہم نے لوطؑ اور اس کے سارے خاندان کو نجات دی۔ (اذ نجیناہ و اھلہ اجمعین)۔

سوائے اس کی بڑھیا بیوی کے جو اس قوم کے درمیان باقی رہ گئی (الا عجوزا فی الغابرین)[1]۔

پھر باقی لوگوں کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا (ثم دمرنا الاخرین)۔

یہ مختصر جملے اس قوم کی عجیب تاریخ کی طرف اشارے ہیں۔ اس کی تفصیل سورۂ ہود، شعراء اور عنکبوت میں گزر چکی ہے۔

حضرت لوطؑ نے تمام انبیاء کی طرح سب سے پہلے اپنی دعوت توحید سے شروع کی۔ اس کے بعد ماحول کے مفاسد اور خرابیوں کے خلاف شدید جنگ میں مصروف ہو گئے، خصوصاً وہ لوگ معروف اخلاقی انحراف یعنی ہم جنس بازی کا شکار تھے جس کی رسوائی تمام تواریخ میں منعکس ہے۔

اس عظیم پیغمبرؑ نے بہت سی سختیاں جھیلیں، خون جگر پیا اور ان سے جتنا ہو سکا اس قبیح سیرت اور قبیح صورت منحرف قوم کی اصلاح اور انھیں شرمناک اعمال سے روکنے کی کوشش کی، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور اگر کچھ تھوڑے سے افراد ان پر ایمان لائے بھی تو بہت جلد وہ اس گندے ماحول سے نجات پا گئے۔

آخر کار حضرت لوطؑ ان سے ناامید ہو گئے اور دعا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے خدا سے اپنی اور اپنے خاندان کی نجات کے لیے درخواست کی، خدا نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور اس چھوٹے سے گروہ کو نجات بخشی، سوائے ان کی بیوی کے، وہی بڑھیا جو نہ صرف آپ کی تعلیمات کی پیروی نہیں کرتی تھی بلکہ بعض اوقات آپ کے دشمنوں کی مدد بھی کیا کرتی تھی۔

خدا نے بھی اس قوم پر نہایت سخت عذاب نازل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ سب سے پہلے ان کے شہروں کو تہ و بالا کیا۔ پھر مسلسل اور پے در پے پتھروں کی بارش ان پر برسائی۔ یہاں تک کہ سب کے سب نابود ہو گئے اور ان کے جسموں کا بھی نام و نشان

---

[1] "غابر" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں "غبور" کے مادہ سے ("عبور" کے وزن پر) کسی چیز کے باقی ماندہ حصّہ کے معنی میں ہے اور جس وقت کوئی جمعیت کسی جگہ سے حرکت کرے اور کوئی اس جگہ سے رہ جائے تو اس کو "غابر" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر باقی ماندہ خاک کو "غبار" کہتے ہیں اور پستان میں باقی رہ جانے والے دودھ کو "غبرۃ" (بروزن "لقمۃ") کہتے ہیں۔

باقی نہ رہا۔

چونکہ یہ سب ذکر غافل اور مغرور لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید کے طور پر ہے لہذا اس گفتگو کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: تم ہمیشہ صبح کے وقت ان کے شہروں کے ویرانوں کے قریب سے گزرتے ہو (و انکم لتمرون علیهم مصبحین)۔

اور رات کو بھی وہاں سے گزرتے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ (و باللیل افلا تعقلون)۔

یہ تعبیر اس وجہ سے بیان ہوئی ہے کیونکہ قوم لوط کے شہر حجاز کے لوگوں کے قافلوں کو شام کی طرف راستے میں پڑتے تھے اور وہ اپنے دنوں اور راتوں کے سفر میں ان کے قریب سے گزرتے تھے۔ اگر وہ دل وجان کے کان رکھتے تو اس گنہ گار تباہ شدہ قوم کی دلخراش اور جانکاہ آواز سنتے، کیونکہ ان کے شہروں کے ویرانے اپنی زبانِ بے زبانی سے تمام گزرنے والوں کو درسِ عبرت دیتے ہیں اور ان جیسے حوادث کے چنگل میں گرفتار ہونے سے ڈراتے ہیں۔

ہاں :۔

ما اکثر العبر و اقل الاعتبار[1]

عبرت کے درس تو بہت ہیں لیکن عبرت حاصل کرنے والے تھوڑے ہیں۔

اسی معنی ومفہوم کی نظیر سورۂ حجر کی آیہ ۷۶ میں قوم لوط کی داستان کے بیان کے بعد آئی ہے :۔

و انها لبسبیل مقیم

یہ آثار پاس سے گزرنے والوں کے راستہ میں پڑتے ہیں۔

ایک روایت میں امام صادقؑ سے اس جملے کی ایک اور طرح سے تفسیر کی گئی ہے۔ ایک صحابی نے "و انکم لتمرون علیهم مصبحین و باللیل افلا تعقلون" کی آیات کی تفسیر کے بارے میں آپؑ سے سوال کیا تو فرمایا:۔

تمرون علیهم فی القرآن اذا قرأتم فی القرآن فاقرءوا ما قص الله علیکم من خبرهم

تم قرآن میں جب قرآن کی آیات کی تلاوت کرتے ہو تو ان کے پاس سے گزرتے ہو، قرآن ان اخبار کو جو خدا نے بیان کی ہیں تمہارے لیے واضح کرتا ہے[2]

ممکن ہے یہ تفسیر آیت کے دوسرے معنی اور اس کے بطون کی طرف اشارہ ہو بہر حال دونوں تفسیروں کے جمع ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔ کیونکہ قوم لوط کے آثار بھی خارج میں ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھے اور قرآن مجید میں ان کے اخبار بھی سامنے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار، کلمہ ۲۹۷

[2] یہ روایت روضہ کافی سے نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۲ پر نقل کی گئی ہے۔

۱۳۹۔ وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

۱۴۰۔ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝

۱۴۱۔ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ۝

۱۴۲۔ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝

۱۴۳۔ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝

۱۴۴۔ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ النصف

۱۴۵۔ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝

۱۴۶۔ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۝

۱۴۷۔ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝

۱۴۸۔ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝

ترجمہ

۱۳۹۔ اور یونس ہمارے رسولوں میں سے تھا۔

۱۴۰۔ وہ وقت یاد کرو جب وہ (لوگوں اور وزن سے) لدی کشتی کی طرف نکل گیا۔

۱۴۱۔ اور ان کے ساتھ قرعہ ڈالا اور (قرعہ انھیں کے نام کا نکلا اور وہ) مغلوب ہوگیا۔

۱۴۲۔ (انھوں نے اسے دریا میں پھینک دیا) اور ایک بہت بڑی مچھلی نے اسے نگل لیا، اس حال میں کہ وہ ملامت کا مستحق تھا۔

۱۴۳۔ اور اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا......

۱۴۴۔ تو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا۔

۱۴۵۔ (بہرحال ہم نے اسے رہائی بخشی اور) اسے ایک خشک زمین میں جو گھاس اور سبزے سے خالی تھی پھینک دیا

اس حالت میں کہ وہ بیمار تھا۔

۱۴۶۔ اور ہم نے کدو کی بیل اس کے اوپر اگا دی (تاکہ وہ اس کے چوڑے اور مرطوب پتوں کے سایے میں آرام پائے)۔

۱۴۷۔ اور ہم نے اسے ایک لاکھ افراد یا اس سے زیادہ جمعیت کی طرف بھیجا۔

۱۴۸۔ تو وہ ایمان لے آئے اور ہم نے انھیں ایک مدت معلوم تک زندگی کی نعمات سے بہرہ مند کیا۔

تفسیر

یونس امتحان کی بھٹی میں

اس سورہ میں یہ گذشتہ انبیاء اور اقوام کی چھٹی اور آخری سرگزشت ہے۔ ان آیات میں یونسؑ اور ان کی توبہ کرنے والی قوم کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ پانچ سرگزشتیں جن نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ و ہارونؑ، الیاسؑ اور لوطؑ کا ذکر تھا وہ سب کی سب یہاں آکر ختم ہوئیں کہ وہ قومیں ہرگز بیدار نہ ہوئیں اور عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوگئیں اور خدا نے ان میں سے ان عظیم انبیاء کو نجات بخشی۔

لیکن اس داستان میں معاملے کا اختتام ان کے برعکس ہے۔ یونسؑ کی کافر قوم عذابِ الٰہی کی ایک نشانی کو دیکھتے ہی بیدار ہوگئی اور اس نے توبہ کرلی اور خدا نے اس پر اپنا لطف و کرم فرمایا۔ اور اسے مادی و روحانی برکات سے بہرہ مند کیا۔ یہاں تک کہ یونسؑ کو اس ترکِ اولیٰ کی بناء پر جو اس قوم کے درمیان سے ہجرت کرنے میں جلدی کرنے کی وجہ سے ان سے سرزد ہوا تھا مصائبُ مشکلات میں پھنسا دیا، یہاں تک کہ ان کے بارے میں لفظ " ابق " استعمال کیا کہ جو عام طور پر بھاگ جانے والے غلاموں کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ داستانیں اس بات کی طرف اشارہ کررہی ہیں کہ اے مشرکینِ عرب اور اے دیگر انسانو! کیا تم ان پانچ قوموں کی طرح بننا چاہتے ہو یا قوم یونسؑ کی طرح؟ کیا تم اس بُری اور دردناک عاقبت اور انجام کے طالب ہو یا اس خیر و سعادت کے؟ یہ بات خود تمھارے اپنے ارادے کے ساتھ وابستہ ہے۔

بہرحال قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں (منجملہ سورۂ انبیاء، یونس، قلم اور زیرِ بحث سورۂ صافات میں) اس عظیم پیغمبر کی داستان بیان ہوئی ہے اور ہر ایک میں ان کے حالات کا ایک حصہ ذکر ہوا ہے۔ سورۂ صافات میں زیادہ تر یونسؑ کے فرار، ان کی گرفتاری اور پھر نجات کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔

پہلے گزشتہ داستانوں کی طرح ان کے مقامِ رسالت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے: یونس خدا کے رسولوں میں سے تھا (و انّ یونس لمن المرسلین)۔

یونسؑ نے بھی دیگر انبیاء کی طرح اپنی دعوت کی ابتداء توحید اور بت پرستی کے خلاف قیام سے شروع کی ۔اس کے بعد ان برائیوں کے خلاف نبرد آزمائی کی جو اس ماحول میں رائج تھے ۔

لیکن وہ متعصب قوم، جو آنکھیں اور کان بند کرکے، اپنے بڑے بوڑھوں کی تقلید کررہی تھی، ان کی دعوت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

حضرت یونسؑ اسی طرح ایک مہربان باپ کے مانند دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس گمراہ قوم کو وعظ و نصیحت کرتے رہے، لیکن اس حکیمانہ منطق کے مقابلے میں دشمنوں کے پاس مغالطے اور ڈھٹائی کے سوا کوئی چیز نہ تھی ۔

صرف ایک چھوٹا سا گروہ جو شاید دو افراد (ایک عابد اور ایک عالم) پر مشتمل تھا ان پر ایمان لایا ۔

حضرت یونسؑ نے اس قدر تبلیغ کی کہ ان سے تقریباً مایوس ہوگئے ۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ عابد کے کہنے پر (اور گمراہ قوم کی کیفیت اور حالات کو دیکھتے ہوئے) آپ نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ان کے خلاف بددعا کریں [1]

یہ پروگرام پورا ہوگیا اور حضرت یونسؑ نے ان پر نفرین کی اور انھیں بددعا دی۔ جو آپ پر وحی آئی کہ فلاں وقت عذاب الٰہی نازل ہوگا۔ جب عذاب کے وعدے کا وقت قریب آیا تو حضرت یونسؑ اس عابد کے ساتھ اس قوم کے درمیان سے باہر چلے گئے ایسی حالت میں کہ آپ نہایت غصے میں تھے یہاں تک کہ دریا کے کنارے پر پہنچ گئے وہاں لوگوں اور وزن سے بھری ایک کشتی دیکھی ۔ آپ نے ان سے خواہش کی کہ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلیں ۔

اسی واقعے کی طرف قرآن بعد والی آیت میں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب اس نے وزن اور لوگوں سے بھری ہوئی کشتی کی طرف فرار کیا (اذ ابق الی الفلک المشحون)۔

" ابق " "اباق" کے مادہ سے غلام کے اپنے آقا و مولا کے پاس سے بھاگ جانے کے معنی میں ہے اس مقام پر یہ ایک عجیب و غریب تعبیر ہے ۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہت ہی چھوٹا سا ترکِ اولیٰ کہ جو عالی مقام پیغمبروں سے سرزد ہوجائے، خدا کی طرف سے کس قدر سخت گیری اور عتاب کا باعث بنتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے پیغمبر کو بھاگ جانے والے غلام کا نام دیتا ہے ۔

بلاشک و شبہ یونس معصوم پیغمبر تھے اور وہ کبھی بھی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے، لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ وہ تحمل سے کام لیتے اور نزولِ عذاب سے قبل کے آخری لمحات تک اپنی قوم میں رہتے کہ شاید وہ بیدار ہوجائے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات کے مطابق آپ نے چالیس سال تک تبلیغ کی تھی، لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ چند روز یا چند گھنٹے اور ٹھہر جاتے ۔ آپ نے چونکہ ایسا نہیں کیا لہٰذا آپ کو بھاگ جانے والے غلام سے تشبیہ دی گئی ہے ۔

بہر حال یونس کشتی پر سوار ہوگئے ۔ روایات کے مطابق ایک بہت بڑی مچھلی نے کشتی کی [illegible] لی اور منہ کھول دیا گویا وہ

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۵

کچھ کھانے کو مانگ رہی ہو۔ کشتی میں بیٹھنے والوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گنہ گار ہمارے درمیان ہے (کہ جسے اس مچھلی کا لقمہ بنا چاہیے اور قرعہ اندازی سے کام لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے)۔ اس موقع پر انھوں نے قرعہ ڈالا تو قرعہ حضرت یونس کے نام نکل آیا۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے تین مرتبہ قرعہ ڈالا اور ہر دفعہ حضرت یونسؑ ہی کا نام نکلا۔ ناچار انھوں نے یونسؑ کو پکڑ کر اس بہت بڑی مچھلی کے منہ میں پھینک دیا۔

قرآن زیر بحث آیات میں ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس ماجرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: یونس نے ان کے ساتھ قرعہ ڈالا اور مغلوب ہوگیا (فساھم فکان من المدحضین)۔

"ساھم" "سھم" کے مادہ سے دراصل تیر کے معنی میں ہے اور "ماھمہ" قرعہ اندازی کے معنی میں ہے، کیونکہ گزشتہ زمانے میں قرعہ اندازی کے وقت تیر کی لکڑیوں پر نام لکھا کرتے تھے اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیتے تھے، پھر ان میں سے ایک تیر کی لکڑی باہر نکالتے تھے، جس کے نام کا ہوتا اسی کا قرعہ کہلاتا۔

"مدحض" "ادحاض" کے مادہ سے باطل کرنے، زائل کرنے اور مغلوب کرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ قرعہ ان کے نام نکلا۔

یہ تفسیر بھی بیان کی جاتی ہے کہ دریا میں طوفان آگیا تھا اور کشتی پر وزن بہت زیادہ تھا اور کشتی میں بیٹھنے والوں کو ہر لمحے غرق ہونے کا خطرہ ہونے لگا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ کشتی کو ہلکا کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو دریا میں پھینک دیا جائے اور قرعہ یونسؑ کے نام نکل آیا۔ انھوں نے آپ کو دریا میں پھینک دیا اور ٹھیک اسی وقت ایک مگرمچھ وہاں آن پہنچا اور اس نے آپ کو نگل لیا۔

بہرحال قرآن کہتا ہے کہ ایک بہت بڑی مچھلی نے اسے نگل لیا جب کہ وہ مستحق ملامت تھا (فالتقمہ الحوت وھو ملیم)۔

"التقمہ" "التقام" کے مادہ سے نگل جانے کے معنی میں ہے۔

"ملیم" دراصل "لوم" کے مادہ سے ہے جو ملامت کے معنی میں ہے (اور جب یہ باب افعال میں چلا جائے تو استحقاق ملامت کے معنی دیتا ہے)۔

یہ بات مسلّم ہے کہ یہ ملامت و سرزنش کسی کبیرہ یا صغیرہ گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس کا سبب صرف ترکِ اولیٰ تھا جو ان سے سرزد ہوا اور وہ تھا اپنی قوم کو چھوڑ جانے اور ان سے ہجرت کرنے میں جلدی کرنا۔

لیکن وہ خدا جو آگ کو پانی کے اندر اور شیشے کو پتھر کی آغوش میں محفوظ رکھتا ہے، اس نے اس عظیم جانور کو حکم تکوینی دیا کہ اس کے بندے یونسؑ کو معمولی سی تکلیف بھی نہ پہنچائے۔ حضرت یونسؑ کو ایک بے نظیر اور عجیب قید میں رہنا تھا تاکہ وہ اپنے ترکِ اولیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی تلافی کریں۔

ایک روایت میں آیا ہے:۔

اوحی اللہ الی الحوت لا تکسر منه عظمًا ولا تقطع له وصلًا
خدا نے اس مچھلی کی طرف وحی کی کہ اس کی کوئی ہڈی نہ توڑنا اور اس کے کسی جوڑ کو نہ کاٹنا [1]

یونس بہت ہی جلد اصل قضیے کی طرف متوجہ ہو گئے، آپ نے پوری توجہ کے ساتھ بارگاہِ خداوندی کی طرف رُخ کیا اور اپنے ترکِ اولیٰ پر استغفار کی اور اس کی مقدس بارگاہ سے عفو کا تقاضا کیا۔

اس مقام پر ایک نہایت پر معانی اور معروف ذکر حضرت یونسؑ کی زبانی نقل ہوا ہے جو سورۂ انبیاء کی آیہ ۸۷ میں آیا ہے اور اہلِ عرفان کے درمیان "ورد یونسیہ" کے نام سے مشہور ہے۔

فنادٰی فی الظلمات ان لا الٰه الّا انت سبحانك انی کنت من الظالمین
اس نے تہ بہ تہ تاریکیوں میں پکارا کہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو پاک و منزہ ہے میں ہی ظالموں میں سے تھا۔

میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور تیری بارگاہ سے دور ہو گیا ہوں اور تیرے عتاب و سرزنش میں، جو میرے لیے جہنم سوزاں کے مانند ہے، گرفتار ہو گیا ہوں۔

اس مخلصانہ اعتراف اور ندامت سے ملی ہوئی تسبیح نے اپنا کام کیا اور جیسا کہ سورۂ انبیاء میں بیان ہوا ہے:۔

فاستجبنا له و نجّیناه من الغم وکذالك ننجی المؤمنین
ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اسے غم و اندوہ سے نجات دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح سے نجات دیا کرتے ہیں۔ (انبیاء — ۸۸)

اب دیکھیں زیرِ بحث آیات اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں، ایک مختصر سے جملے میں فرمایا گیا ہے: اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا...... (فلولا انه کان من المسبّحین)۔

تو یقیناً وہ قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا (للبث فی بطنه الٰی یوم یبعثون)۔

اور یہ وقتی قید خانہ دائمی زنداں میں بدل جاتا اور وہ دائمی زنداں اس کے لیے قبرستان میں بدل جاتا۔

حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں قیامت تک رہنا (بالفرض اگر وہ درگاہِ الٰہی میں تسبیح اور توبہ نہ کرتے) زندہ صورت میں ہوتا یا مُردہ صورت میں، اس ضمن میں بعض مفسرین نے کئی احتمال بیان کیے ہیں۔

پہلا احتمال تو یہ ہے کہ وہ دونوں ہی زندہ رہتے اور یونسؑ ایک قیدی کی صورت میں قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں قید رہتے۔

---

[1] تفسیر رازی جلد ۲۶ ص ۱۶۵ - نیز یہی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۲۷ پر بیان کی گئی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یونسؑ تو مرجاتے اور مچھلی جیتی پھرتی قبر کی صورت میں زندہ رہتی۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ یونسؑ اور مچھلی دونوں ہی مرجاتے اور مچھلی کا پیٹ یونسؑ کی قبر بن جاتا اور زمین مچھلی کی قبر۔ وہ مچھلی کے اندر اور مچھلی زمین کے اندر قیامت کے دن تک دفن ہوجاتے۔

زیر بحث آیت ان اقوال میں سے کسی کے لیے بھی دلیل نہیں بن سکتی۔ لیکن متعدد آیات جو یہ کہتی ہیں کہ اختتام دنیا پر سب مرجائیں گے اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قیامت کے دن تک یونس کا زندہ رہنا یا مچھلی کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے اس لیے ان تینوں تفاسیر میں سے تیسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے [1]

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تعبیر طولانی مدت کے لیے کنایہ ہو یعنی وہ ایک طولانی مدت تک اسی زنداں میں رہتے۔ جیسا کہ یہ تعبیر اس سے ملتے جلتے موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے کہ مجھے فلاں کام کے انتظار میں قیامت تک رہنا ہوگا۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہوتا جب وہ تسبیح اور توبہ نہ کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ انھوں نے تسبیح پروردگار کی اور اس کی خاص بخشش اور عفو ان کے شامل حال ہوئی۔

پھر جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے ایک خشک اور درخت اور سبزے سے خالی سرزمین میں پھینک دیا، اس حالت میں کہ وہ بیمار تھا (فنبذناہ بالعراء وھو سقیم)

وہ بہت بڑی مچھلی خشک و بے گیاہ ساحل کے نزدیک آئی اور حکم خدا سے اس لقمے کو جو اس سے زائد تھا باہر پھینک دیا۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس عجیب و غریب زنداں نے یونسؑ کے جسم کی سلامتی کو درہم برہم کردیا تھا۔ لہٰذا وہ بیمار و ناتواں اس زنداں سے آزاد ہوئے۔

ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں ہے کہ حضرت یونسؑ کتنی مدت تک مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ لیکن یقینی طور پر جتنا عرصہ بھی ہے اس کے عوارض سے بچ نہیں سکتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فرمان الٰہی صادر ہوا تھا کہ یونسؑ مچھلی کے بدن میں ہضم اور جذب نہ ہوں، لیکن یہ اس معنی میں نہیں تھا کہ اس زنداں کے کچھ آثار بھی وہ اپنے ساتھ نہ لائیں لہٰذا مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ وہ ایک نومولود، ضعیف و ناتواں اور بے پر و بال، پرندے کے بچے کی طرح مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے۔ اس طرح سے کہ ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔

---

[1] قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مفسر عظیم طبرسی مرحوم جو عام طور پر مختلف اقوال آیات کے ذیل میں جمع کرتے ہیں۔ یہاں انھوں نے صرف اسی احتمال پر قناعت کی ہے اور کہتے ہیں:۔

لصار بطن الحوت قبراً لہ الی یوم القیامة

مچھلی کا پیٹ قیامت تک کے لیے ان کی قبر بن جاتا۔

پھر لطفِ الٰہی ان کے شاملِ حال ہوا، کیونکہ ان کا بدن بیمار اور خستہ حال تھا اور ان کا جسم کمزور و ناتواں تھا، ساحل کی دھوپ انھیں تکلیف پہنچاتی تھی۔ لہٰذا ان کے لیے ایک نرم و گداز اور لطیف قسم کے لباس کی ضرورت تھی تاکہ ان کے بدن کو اس کے پیچھے آرام حاصل ہو۔ اس مقام پر قرآن کہتا ہے: "ہم نے ایک کدو کی بیل اس کے اوپر اگا دی" تاکہ وہ اس کے چوڑے اور مرطوب پتوں کے پیچھے آرام کرے۔ (و انبتنا علیه شجرة من یقطین)۔

"یقطین" کا معنی بہت سے اربابِ لغت اور مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ یہ اس پودے کو کہتے ہیں جس کی شاخ اور تنا نہ ہو، اور جس کے پتے چوڑے ہوں۔ مثلاً خربوزہ، کدو، کھیرا اور تربوز وغیرہ۔ البتہ بہت سے مفسرین اور راویانِ حدیث نے تصریح کی ہے کہ اس مقام پر اس سے مراد کدو کی بیل ہے۔ توجہ رہے کہ "شجرۃ" عربی زبان میں ان نباتات کو بھی کہا جاتا ہے جن کا تنا اور شاخ ہو اور ان کو بھی جو تنا اور شاخ نہ رکھتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ درخت اور پودے کے لیے عام ہے۔ یہاں تک کہ اس ضمن میں پیغمبر گرامی اسلام سے ایک حدیث بھی نقل کی گئی ہے کہ ایک شخص نے آپؐ سے عرض کیا:۔

انك تحب القرع

آپ کدو کو پسند کرتے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا:۔

اجل هی شجرة اخی یونس

ہاں یہ میرے بھائی یونسؑ کی سبزی ہے[1]

کہتے ہیں کہ کدو کی بیل میں اس کے علاوہ کہ اس کے پتے چوڑے اور پانی سے پُر ہوتے ہیں اور اس سے اچھا خاصا سائبان بنایا جا سکتا ہے، مکھی بھی اس کے پتوں پر نہیں بیٹھتی اور یونسؑ کے بدن کی جلد مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے اس قدر نازک اور حساس ہو گئی تھی کہ اس پر حشرات کے بیٹھنے سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے بدن کو اس کدو کی بیل کے ساتھ چھپا لیا تاکہ سورج کی تپش سے بھی مامون رہیں اور حشرات الارض سے بھی۔

شاید خدا کو یہ مطلوب ہے کہ وہ سبق جو حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں دیا تھا اس کی اس مرحلہ میں تکمیل کرے۔ وہ سورج کی تپش اور اس کی حرارت کو اپنے بدن کی نازک جلد پر محسوس کریں۔ تاکہ آئندہ رہبر ہوتے ہوئے اپنی امت کی جہنم کی جلانے والی آگ سے نجات کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ یہی مضمون بعض روایات میں بھی آیا ہے[2]

اب ہم حضرت یونسؑ کا ذکر چھوڑتے ہیں اور ان کی قوم کا حال بیان کرتے ہیں۔

جب حضرت یونسؑ نے غیض و غضب کی حالت میں اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور خدا کے غضب کے آثار بھی اس پر ظاہر ہو گئے،

---

[1] روح البیان جلد ۸، ص ۴۸۹

[2] نور الثقلین جلد ۴، ص ۴۲۶ حدیث ۱۱۶

تو وہ لوگ شدت کے ساتھ لرز اُٹھے۔ اب انھیں ہوش آیا۔ ایک عالم کہ جو ان کے درمیان رہتا تھا وہ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی رہبری اور ہدایت سے توبہ پر آمادہ ہو گئے۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ سب مل کر بیابان کی طرف چل پڑے اور عورتوں اور بچوں نیز جانوروں اور ان کے بچوں کے درمیان جدائی ڈال دی۔ پھر گریہ وزاری میں مشغول ہو گئے اور نالہ وفریاد کی صدا بلند کی۔ اور خلوص کے ساتھ اپنے گناہوں اور ان کوتاہیوں پر توبہ کی کہ جو انھوں نے خدا کے پیغمبر حضرت یونسؑ کے ساتھ روا رکھی تھیں۔

اس موقع پر عذاب کے پردے ہٹ گئے اور وہ حادثہ پہاڑوں پر جا گرا۔ اور توبہ کرنے والے اہلِ ایمان نے لطفِ الٰہی کے باعث نجات پائی۔[1]

حضرت یونس اس ماجرے کے بعد اپنی قوم کے پاس آئے تاکہ دیکھیں کہ عذاب سے ان پر کیا گزری؟

جب وہ آئے تو بہت متعجب ہوئے کہ گویا وہ بدل گئی۔ وہ تو ان کی ہجرت کے وقت سب کے سب بت پرست تھے لیکن اب وہ سب کے سب خدا پرست موحد بن گئے ہیں۔

قرآن اس موقع پر کہتا ہے: ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ افراد کی طرف بھیجا (وارسلناہ الیٰ مِائۃ الف او یزیدون)۔

وہ ایمان لے آئے اور ہم نے انھیں ایک معیّن مدت تک دنیاوی نعمتوں اور زندگی سے بہرہ مند کیا (فاٰمنوا فمتعناھم الیٰ حین)۔

البتہ ان کا اجمالی ایمان اور توبہ تو پہلے ہو چکی تھی لیکن خدا اور اس کے پیغمبر حضرت یونسؑ اور ان کی تعلیمات و احکام پر تفصیلی ایمان اس وقت صورت پذیر ہوا جب جناب یونسؑ ان کے درمیان پلٹ کر آئے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماموریت نئے سرے سے اسی قوم کی طرف ہوئی تھی اور یہ جو بعض نے ان کی جدید ماموریت کو ایک نئی قوم کے لیے سمجھا ہے وہ ظاہر آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ ایک طرف تو یہ بیان ہوا ہے کہ:

فاٰمنوا فمتّعناھم الیٰ حین

یعنی یہ قوم جس کی ہدایت کے لیے یونسؑ مامور ہوئے تھے وہ ایمان لے آئی اور ہم نے انھیں ایک معین زمانے تک بہرہ مند کیا۔

اور دوسری طرف یہی تعبیر سورۂ یونس میں اسی سابق قوم کے بارے میں آئی ہے۔

فلولا کانت قریۃ اٰمنت فنفعھا ایمانھا الّا قوم یونس لمّا اٰمنوا

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۵ پر یہ حدیث امام صادقؑ سے منقول ہے۔

کشفنا عنهم عذاب الخزی فی الحیٰوة الدنیا ومتّعناهم الی حین

(دوسری) قوموں میں سے کوئی قوم بروقت ایمان کیوں نہ لائی تاکہ وہ ان کے حال کے لیے مفید ہوتا، سوائے قوم یونس کے کہ جس وقت وہ ایمان لے آئی تو ہم نے دنیاوی زندگی میں خوار کرنے والا عذاب ان سے برطرف کر دیا اور ہم نے انھیں ایک مدت معین تک بہرہ مند کیا۔

(یونس ــــــ ۹۸)

ضمنی طور پر یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ "الی حین" (معین مدت تک) سے مراد وہی ان کی زندگی اور اجل طبیعی کا اختتام ہے۔

زیر بحث آیات میں "ایک لاکھ یا اس سے زیادہ" کیوں فرمایا گیا ہے اور زیادہ سے مراد کتنی تعداد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے طرح طرح کی تفسیریں بیان کی ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ اس قسم کی تعبیریں کسی چیز کی عظمت اور تاکید کے لیے ہوتی ہیں نہ کہ گننے والے کے شک و شبہ کے لیے[1]

چند اہم نکات

۱۔ **حضرت یونس کی زندگی کی مختصر تاریخ:** "یونس" "متی" کے فرزند ہیں "ذوالنون" (مچھلی والا) آپ کا لقب ہے اور یہ لقب اس بنا پر ہے کہ چونکہ ان کی سرگزشت۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ ایک مچھلی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ آپ ان مشہور پیغمبروں میں سے ہیں جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے بعد اس دنیا میں آئے۔

بعض نے انھیں حضرت ہودؑ کی اولاد میں سے قرار دیا ہے اور ان کی ماموریت قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگوں کی ہدایت قرار دیا ہے۔

ان کے ظہور کا مقام عراق کا ایک علاقہ تھا جس کا نام نینوا تھا[2]

بعض نے ان کا ظہور ۸۲۵ قبل مسیح لکھا ہے اور اب بھی کوفہ کے نزدیک شطِ فرات کے کنارے "یونس" کے نام کی ایک معروف قبر موجود ہے۔

بعض کتابوں نے لکھا ہے کہ آپ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر تھے جو حضرت سلیمانؑ کے بعد اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے۔

---

[1] اس بنا پر یہاں "او" "بل" (بلکہ) کے معنی میں ہے۔

[2] "نینوا" کئی مقامات کا نام ہے پہلا موصل کے نزدیک شہر ہے (یا قصبہ موصل) اور دوسرا اطرافِ کوفہ میں کربلا کی سمت کا ایک علاقہ ہے اور ایشیائے کوچک میں ایک شہر ہے جو دجلہ کے کنارے واقع مملکت آشور کا پایۂ تخت ہے (دائرۃ المعارف دھخدا) بعض دوسروں نے لکھا ہے کہ "نینوا" ملک آشور کا ایک بہت بڑا شہر ہے جو موصل کے بالکل سامنے دجلہ کے مشرقی کنارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ (فرہنگ قصص قرآن)

کتاب "یوناہ" میں جو عہدِ عتیق (تورات) کی کتابوں میں سے ہے ۔ "یونس" کے بارے میں تفصیلی ذکر "یوناہ بن متی" کے نام سے کیا گیا ہے ۔

اس کے مطابق وہ اس بات کے لیے مامور ہوئے تھے کہ عظیم شہر نینوا جائیں اور لوگوں کی شرارت کے خلاف قیام کریں ۔ اس کے بعد کچھ اور واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں جو قرآن کے بیان سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلامی روایات کے مطابق تو حضرت یونسؑ نے اپنی قوم کو دعوت دینے کے لیے قیام کیا اور اس سلسلے میں اپنے فریضے اور ذمہ داری کو انجام دیا اور جب انکی قوم نے ان کی دعوت کو رد کردیا تو انھوں نے انھیں نفرین کی اور بددعا دی ۔ پھر ان کے درمیان سے چلے گئے اور کشتی اور مچھلی کا واقعہ انھیں پیش آیا ۔ لیکن تورات کی عبارت بہت ناموزوں سی ہے اور تصریح کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ انجام ذمہ داری سے پہلے ہی یہ چاہتے تھے کہ استعفیٰ دے دیں ۔ لہٰذا وہ جہاں کھڑے ہوئے اور کشتی اور مچھلی والا واقعہ پیش آیا ۔

اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ "تورات" کہتی ہے ۔

> جب خدا نے اس قوم سے ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب اٹھا لیا ، تو یونسؑ کو بہت دُکھ ہوا اور وہ بھڑک اُٹھے [1]

تورات کی فصول سے معلوم ہوتا ہے کہ یونسؑ کو دو مرتبہ مامور کیا گیا پہلی ماموریت کے موقع پر انکار کردیا اور اس دردناک انجام میں مبتلا ہوئے ۔ دوبارہ انھیں مامور کیا گیا کہ اسی شہر "نینوا" کی طرف جائیں کہ نینوا کے لوگ بیدار ہو چکے ہیں اور خدا پر ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے ۔ اور وہ عفوِ الٰہی ان کے شاملِ حال ہو گیا ہے ، لیکن یہ عفو و بخشش یونس کو اچھی نہیں لگی ۔

قرآن اور اسلامی روایات کے بیانات کا موجودہ تورات کے بیانات سے موازنہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ "تورات" میں کتنی تحریف ہو گئی ہے کہ اس نے اس عظیم پیغمبرؑ کے مقام کو اس قدر گرا دیا ہے ۔ کبھی ان کی طرف ماموریت اور ذمہ داری قبول نہ کرنے کی نسبت دیتی ہے اور کبھی ایک توبہ کرنے والی قوم پر پروردگار کے عفو و رحمت کو دیکھ کر غضبناک ہونے کی نسبت دیتی ہے ۔ یہی چیزیں ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ موجودہ تورات کسی لحاظ سے بھی قابلِ اعتماد کتاب نہیں ہے بہرحال وہ ایک عظیم پیغمبر ہیں جن کو قرآن نے عظمت کے ساتھ یاد کیا ہے ۔

۲۔ یونس مچھلی کے پیٹ میں کیسے زندہ رہے ؟ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے کہ یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں کتنی مدت رہے ؟ چند گھنٹے یا چند دن یا چند ہفتے ؟ بعض روایات میں نو گھنٹے ، بعض میں تین دن اور بعض میں اس سے زیادہ ، یہاں تک کہ چالیس دن تک کی مدت بیان کی گئی ہے ، لیکن ان اقوال کا کوئی یقینی ثبوت موجود نہیں ہے ۔ صرف تفسیر علی بن ابراہیم میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں

---

[1] تورات کتاب یوناہ پیغمبر فصل اول و دوم و سوم و چہارم

توقف ۹ گھنٹے بیان ہوا ہے [1]

بعض مفسرین اہلِ سنت نے اس کی مدت ایک گھنٹہ بھی بیان کی ہے [2]

لیکن جو کچھ بھی ہو بلاشک وشبہ یہ توقف ایک غیر معمولی امر ہے انسان ایسے ماحول میں جہاں ہوا نہ ہو چند منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ ماں کے پیٹ میں کئی ماہ تک زندہ رہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اس کے تنفس کی مشینری نے اپنا کام کرنا شروع نہیں کیا ہوتا اور وہ ضروری آکسیجن صرف ماں کے خون کے راستے سے حاصل کرتا ہے۔

اس بنا پر حضرت یونسؑ کا ماجرا بلاشبہ ایک اعجاز ہے اور یہ پہلا اعجاز نہیں ہے جو ہمیں قرآن سے معلوم ہوا ہے۔ وہی خدا جس نے ابراہیمؑ کو آگ کے درمیان صحیح وسالم رکھا اور موسیٰ و بنی اسرائیل کو دریا کے وسط میں خشک راستے بنا کر غرق ہونے سے بچایا اور نوحؑ کو ایک سادہ اور عام کشتی کے ذریعے اس عظیم اور وسیع طوفان سے نجات بخشی اور صحیح وسالم زمین پر اتارا۔ وہی خدا یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ اپنے مخصوص بندوں میں سے ایک بندے کو ایک بہت بڑی مچھلی کے پیٹ میں صحیح وسالم رکھے۔

البتہ گزشتہ اور موجودہ زمانے میں اس قسم کی بڑی مچھلیوں کا موجود ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اس وقت بھی بڑی بڑی مچھلیاں "وھیل" نام کی موجود ہیں۔ جن کی لمبائی ۲۰ میٹر سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور یہ اس زمین کا سب سے بڑا جانور ہے اور اس کا جگر ایک ٹن تک ہوتا ہے۔

ہم نے اسی سورہ میں گزشتہ انبیاء کی داستانیں پڑھی ہیں جنھوں نے اعجاز آمیز طریقے سے بلاؤں اور مصائب کے پنجے سے نجات پائی اور حضرت یونسؑ اس سلسلہ بیان کے آخری نبی ہیں۔

۲۔ چھوٹی سی داستان میں بہت سے سبق: ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں ان قصوں کا بیان تربیتی مقاصد کے لیے ہے کیونکہ قرآن کوئی قصے کہانیوں کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ انسان سازی اور تربیت کی کتاب ہے۔

اس عجیب داستان سے بہت سے پند ونصائح حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

الف: تخلف، چاہے ایک بزرگ پیغمبر سے، ایک "ترک اولیٰ" کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو خدا کی بارگاہ میں بہت اہم ہے اور موجب سزا ہے۔

البتہ چونکہ پیغمبروں کا مقام بہت اونچا ہوتا ہے لہٰذا ان کی ایک چھوٹی سی غفلت بھی کبھی دوسروں کے گناہ کبیرہ کے برابر بھی جاتی ہے۔ اسی بنا پر ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اس داستان میں خدا نے انھیں بھاگ جانے والا غلام کہا ہے۔ روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ کشتی میں بیٹھنے والوں نے کہا تھا کہ کوئی گنہ گار آدمی ہمارے درمیان ہے اور انجام کار خدا نے انھیں ایک وحشت ناک زندان میں گرفتار کیا۔ اور توبہ اور خدا کی طرف بازگشت کے بعد اس زندان سے خستہ حال اور بیمار بدن کے ساتھ آزاد ہوئے تھے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۶ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم

[2] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۵۶۷

تاکہ سب لوگ جان لیں کہ تخلف اور گناہ کسی شخص سے بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ انبیاء و اولیاءِ خدا کے مقام کی عظمت بھی اسی میں سے ہے کہ وہ اس کے فرمان کے مطیع ہوتے ہیں۔ ورنہ کوئی بھی خدا کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں رکھتا۔ البتہ یہ اس عظیم پیغمبر کی عظمت کی نشانی ہے کہ خدا اس کے بارے میں اس قسم کی سخت گیری کر رہا ہے۔

ب: اسی داستان (کے اس حصے میں جو سورۂ انبیاء کی آیت ۸۰ میں آیا ہے) میں مومنین کے غم و اندوہ اور مشکلات سے نجات کا بھی وہی راستہ بتایا گیا ہے جو خود حضرت یونسؑ نے طے کیا تھا اور وہ ہے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں خطا اور غلطی کا اعتراف، تسبیح و تنزیہ اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت و بازگشت۔

ج: یہ واقعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ایک گنہ گار اور مستحقِ عذاب قوم، کس طرح سے آخری لمحات میں اپنی تاریخ کا راستہ بدل سکتی ہے اور خدا کی رحمت و محبت بھری آغوش کی طرف پلٹ کر نجات پا سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ موقع ہاتھ سے نکلنے سے پہلے متوجہ ہو جائے اور اگر ہو سکے تو کسی عالم کو اپنی رہبری کے لیے منتخب کرے۔

د: یہ ماجرا اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ خدا پر ایمان اور گناہ سے توبہ آثار و برکات کے علاوہ، دنیا کی ظاہری نعمتوں کا رخ بھی انسان کی طرف موڑ دیتی ہے، آبادی بڑھاتی ہے نیز طولِ عمر اور زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا سبب بنتی ہے، اس مطلب کی نظیر حضرت نوحؑ کی داستان میں بھی آئی ہے۔ اس کی تفصیل و تشریح انشاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں بیان کی جائے گی۔

ھ: خدا کی قدرت اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اس کے سامنے کوئی بھی چیز مشکل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک انسان کو ایک عظیم اور وحشت ناک جانور کے منہ اور پیٹ میں سالم و محفوظ رکھ سکتا ہے اور سالم ہی باہر نکال سکتا ہے یہ امور اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس عالم کے تمام اسباب اس کے ارادے کے تحت اور اس کے فرمان کے سامنے سرنگوں ہیں۔

۴۔ ایک سوال کا جواب: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسری اقوام کی سرگزشتوں کے بیان میں آیاتِ قرآنی میں آیا ہے کہ نزولِ عذاب کے وقت (عذابِ استیصال جو سرکش اقوام کی نابودی کے لیے نازل ہوتا ہے) توبہ و انابت بے اثر ہوتی ہے تو پھر قومِ یونس کے لیے اس مسئلے میں استثناء کیسے ہوا۔

اس سوال کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں:

پہلا جواب تو یہ ہے کہ عذاب ابھی نازل نہیں ہوا تھا ابھی کچھ علامات ہی جو تنبیہ اور خبردار کرنے کے لیے تھیں نظر آئی تھیں کہ انھوں نے ان تنبیہوں سے برمحل استفادہ کیا اور نزولِ عذاب سے پہلے ہی توبہ کر لی اور ایمان لے آئے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ عذاب "عذابِ استیصال" نہیں تھا بلکہ گوشمالی کے طور پر تھا۔ ایسی گوشمالی قوموں پر عذاب نازل کرنے سے پہلے کی جاتی تھی، تاکہ وہ موقع ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جائیں اور تقویٰ کا راستہ اختیار کریں۔ جیسا کہ غرق ہونے سے پہلے فرعون کی قوم پر مختلف عذاب بھیجے گئے تھے۔

۵۔ اسلام میں قرعہ اندازی کی مشروعیت: قرعہ اور اس کی مشروعیت سے مربوط روایات میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

ای قضیۃ اعدل من القرعۃ اذا فوض الامر الی اللہ عز وجل، یقول:
فساھم فکان من المدحضین

قرعہ سے بڑھ کر عادلانہ فیصلہ اور کون سا ہو سکتا ہے (کہ جب معاملہ مشکل ہو جائے) تو موضوع کو خدا کے سپرد کر دیا جائے، کیا خدا (قرآن مجید میں یونسؑ کے بارے میں) نہیں کہتا: "فساھم فکان من المدحضین" (یونس نے کشتی میں بیٹھنے والوں کے ساتھ قرعہ اندازی کی اور قرعہ یونس کے نام نکلا اور وہ مغلوب ہو گئے)[1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب معاملہ مشکل ہو جائے اور اس کے حل کی اور کوئی دوسری راہ موجود نہ ہو اور کام کو خدا کے سپرد کر دیا جائے تو اتفاقاً قرعہ راہ کشا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یونسؑ کی داستان میں حقیقت پر ٹھیک منطبق ہوا۔

یہی مطلب ایک دوسری حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:

لیس من قوم تنازعوا (تقارعوا) ثم فوضوا امرھم الی اللہ الا خرج سھم المحق

کسی قوم نے (جب مسئلہ کے حل کی تمام راہیں مسدود ہو گئی ہوں) قرعہ پر اقدام نہیں کیا جبکہ انھوں نے اپنے کام کو خدا کے سپرد کر دیا ہو، مگر یہ کہ قرعہ حقیقت کے مطابق نکلا اور حق آشکار و واضح ہو گیا[2]

اس مسئلے کی مزید تشریح و تفصیل ہم نے کتاب "القواعد الفقہیہ" میں بیان کی ہے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۲۷ (حدیث ۶)

[2] وسائل، کتاب القضاء جلد ۱۸ باب الحکم بالقرعۃ فی القضایا المشکلۃ از ابواب کیفیۃ الحکم واحکام الدعوی (باب ۱۳) حدیث ۵

۱۴۹۔ فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ○

۱۵۰۔ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ○

۱۵۱۔ أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ○

۱۵۲۔ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ○

۱۵۳۔ أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ○

۱۵۴۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ○

۱۵۵۔ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○

۱۵۶۔ أَمْ لَكُمْ سُلْطَانٌ مُبِينٌ ○

۱۵۷۔ فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

۱۵۸۔ وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ○

۱۵۹۔ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ ○

۱۶۰۔ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ○

ترجمہ

۱۴۹۔ ان سے پوچھ: کیا تیرے پروردگار کیلئے تو لڑکیاں ہیں اور ان کے لیے لڑکے؟

۱۵۰۔ کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیوں کی صورت میں پیدا کیا ہے اور وہ مشاہدہ کر رہے تھے؟

۱۵۱۔ جان لو کہ وہ اپنی بڑی تہمت باندھتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۵۲۔ خدا صاحب اولاد ہے، لیکن یقیناً وہ قطعی جھوٹ بولتے ہیں۔

۱۵۳۔ کیا اس نے بیٹیوں کو بیٹوں پر ترجیح دی ہے ؟

۱۵۴۔ تمھیں کیا ہوگیا، تم یہ کیسا فیصلہ کر رہے ہو (کچھ سمجھتے بھی ہو کہ یہ کیا کہہ رہے ہو) ؟۔

۱۵۵۔ کیا تم متوجّہ نہیں ہوتے ؟

۱۵۶۔ کیا تمھارے پاس اس بارے میں کوئی واضح دلیل ہے ؟

۱۵۷۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو اپنی کتاب لے آؤ !

۱۵۸۔ وہ اس کے اور جنّوں کے درمیان (رشتہ داری اور) نسبت کے قائل ہوگئے ہیں، حالانکہ جن اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ بت پرست عدالتِ الٰہی میں حاضر کیے جائیں گے۔

۱۵۹۔ خدا اس توصیف سے جو وہ کرتے ہیں، منزہ ہے۔

۱۶۰۔ مگر خدا کے مخلص بندے۔

تفسیر

قبیح تہمتیں

گذشتہ انبیاء کی چھ داستانوں اور ان میں سے ہر ایک میں جو اصلاحی و تربیتی درس پوشیدہ تھا، اسے ذکر کرنے کے بعد موضوعِ سخن تبدیل کرتے ہوئے ایک اور مطلب شروع کیا جا رہا ہے کہ جو مشرکین عرب کے ساتھ شدید ارتباط رکھتا ہے، ان کے شرک کی مختلف شکلوں کو پیش کر کے ان سے سخت اور شدید باز پرس کی جا رہی ہے۔ اور مختلف دلائل کے ذریعے ان کے بے ہودہ اور خرافاتی افکار کی سرکوبی کی جارہی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ مشرکین عرب کی ایک جماعت انحطاط فکری اور کسی قسم کا علم و دانش نہ ہونے کی بنا پر خدا کو اپنے جیسا قیاس کرتے تھے اور اس کے لیے اولاد اور کبھی بیوی کے بھی قائل تھے۔

ان میں سے جہینہ، سلیم، خزاعہ اور بنی ملیح وغیرہ قبیلے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور بہت سارے مشرکین عرب جنّوں کو بھی خدا کی اولاد سمجھتے تھے یا بعض پروردگار کے لیے جنّات میں سے بیوی کے قائل تھے۔

اس قسم کے بے بنیاد، بے ہودہ اور خرافاتی خیالات و تصورات نے انھیں بالکل راہِ حق سے منحرف کر دیا تھا۔ اس طرح سے کہ توحید اور خدا کی یگانگی کے آثار ان کے ہاں سے ختم ہوگئے تھے۔

حدیث میں آیا ہے کہ چیونٹی یہ خیال کرتی ہے کہ اس کا پروردگار اس کی طرح دو ڈنگ رکھتا ہے۔

ہاں، کوتاہ نظری، انسان کو موازنہ کرنے کی طرف کھینچ لے جاتی ہے، خالق کا مخلوق کے ساتھ موازنہ اور خدا کی شناخت اور معرفت کے

سلسلے میں یہ قیاس گمراہی کا بدترین سبب ہے۔

بہر حال قرآن پہلے ان کی طرف توجہ کرتا ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے اور انھیں تجرباتی، عقلی اور منقول تینوں طریقوں سے جواب دیتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ان سے پوچھ، کیا تیرے پروردگار کی تو بیٹیاں ہیں اور ان کے بیٹے ہیں (فاستفتھم الربك البنات ولھم البنون)[1]

جس چیز کو تم خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہو، اسے خدا کے لیے قرار دیتے ہو (یہ گفتگو ان کے باطل عقیدہ کے مطابق ہے کیونکہ وہ لڑکی سے سخت متنفر تھے اور لڑکے سے شدید لگاؤ رکھتے تھے کیونکہ لڑکے ان کی جنگوں اور غارت گریوں میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے جبکہ لڑکیاں ان کی کچھ مدد نہیں کر پاتی تھیں۔

بلاشک لڑکے اور لڑکیاں انسانی نکتہ نظر سے اور خدا کی بارگاہ میں قدر و قیمت کے لحاظ سے، یکساں اور برابر ہیں، دونوں کی شخصیت کا معیار پاکیزگی اور تقویٰ ہے لیکن یہاں پر قرآن کا استدلال اصطلاح کے مطابق "مسلمات خصم"[2] کو بیان کرنے کے طور پر ہے کہ طرف مقابل کے مطالب کو لے کر خود اسی کی طرف پلٹائے جائیں۔

اس معنی کی نظیر قرآن کی دوسری صورتوں میں بھی آئی ہے مثلاً سورۂ نجم کی آیہ ۲۱، ۲۲ میں بیان ہوا ہے:

الکم الذکر و له الانثی تلك اذاً قسمة ضیزیٰ

کیا تمھارے لیے تو بیٹا ہے اور اس کے لیے بیٹی، یہ تو ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے۔

اس کے بعد اس مسئلے کی حسی دلیل پیش کی گئی ہے۔ پھر استفہام انکاری کی صورت میں قرآن کہتا ہے، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیوں کی صورت میں پیدا کیا ہے اور وہ اس کے شاہد و ناظر تھے؟ (ام خلقنا الملائکة اناثاً وھم شاھدون)۔

بلاشک و شبہ اس سلسلے میں ان کا جواب منفی تھا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی خلقتِ ملائکہ کے وقت اپنے حضور و شہود کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

بالآخر دلیل عقلی کے جوان کے مسلمات ذہنی سے لی گئی ہے کی طرف رجوع کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، جان لو کہ وہ اپنی اس قبیح اور بہت بڑی تہمت کے ساتھ کہتے ہیں...... (الا انھم من افکھم لیقولون)۔

خدا صاحب اولاد ہے (جبکہ) وہ قطعاً جھوٹے ہیں (ولد الله و انھم لکاذبون)۔

---

[1] "استفتھم" مادہ "استفتاء" سے اصل میں "فتویٰ" سے لیا گیا ہے جو مشکل مسائل کا جواب دینے کے معنی میں ہے۔

[2] مخالف کی تسلیم شدہ بات سے استدلال کرنا مراد ہے۔

کیا اس نے بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دی ہے؟ (اصطفی البنات علی البنین)۔

تمھیں کیا ہوگیا ہے ؟ یہ کیسے فیصلے کر رہے ہو؟ ! کچھ سمجھتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو ؟ (مالکم کیف تحکمون)۔

کیا ابھی اس بات کا وقت نہیں آیا کہ تم ان مہمل، فضول اور قبیح و رسوا خرافات سے دستبردار ہو جاؤ ؟ کیا تم متوجہ نہیں ہوتے؟ (افلا تذکرون)۔

یہ باتیں اس قدر باطل اور بے بنیاد ہیں کہ اگر انسان تھوڑی سی بھی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتا ہو اور اس بارے میں غور کرے تو ان کے باطل ہونے کا ادراک کرے گا۔

ایک حسی اور ایک عقلی دلیل کے ساتھ ان کے بیہودہ اور خرافاتی دعوے کو باطل کرنے کے بعد قرآن تیسری دلیل پیش کرتا ہے جو منقولات سے متعلق ہے۔ کہتا ہے: اگر اس قسم کی کوئی بات جو تم کہتے ہو صحیح ہوتی تو اس کا کوئی اثر و نشان گزشتہ کتابوں میں ہونا چاہیے کیا تمھارے پاس اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود ہے؟ (ام لکم سلطان مبین)۔

"اگر تمھارے پاس کوئی ایسی دلیل موجود ہے تو اپنی کتاب لے آؤ، اگر تم سچ کہتے ہو" (فأتوا بکتابکم ان کنتم صادقین)۔

کس کتاب میں ؟ کس تحریر میں ؟ اور کس وحی آسمانی میں اس قسم کی چیز آئی ہے اور کس پیغمبر پر نازل ہوئی ہے ؟

ایسی ہی بات قرآن میں بت پرستوں کے لیے موجود ہے۔ اس ضمن میں قرآن کہتا ہے کہ انھوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں بیٹیاں قرار دے دیا ہے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔ قرآن مزید کہتا ہے :

ام اٰتینٰھم کتابًا من قبلہ فھم بہ مستمسکون

کیا ہم نے اس سے پہلے ان کے پاس کوئی ایسی کتاب بھیجی ہے جس سے وہ اپنے دعوے میں سہارا لیتے ہیں۔ (زخرف ـــــــ ۲۱)

نہیں ! یہ باتیں کتبِ آسمانی سے اخذ نہیں کی گئیں۔ یہ تو وہ خرافات ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف اور کچھ جاہلوں سے دوسرے جاہلوں کی طرف منتقل ہوئی ہیں اور اس کی عقل کے اعتبار سے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۂ زخرف کی اسی آیہ کے ذیل میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں مشرکینِ عرب کی خرافات میں سے ایک اور بے ہودگی بیان کی گئی ہے اور وہ وہ نسبت ہے جو وہ "خدا" اور "جن" کے درمیان سمجھتے تھے۔ اس موقع پر گفتگو خطاب کی صورت سے نکل کر غائب کی صورت میں آگئی ہے۔ گویا وہ اس قدر

بے قدر و قیمت ہیں کہ آمنے سامنے بات کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ فرمایا گیا ہے: وہ اس کے اور جن کے درمیان رشتہ داری اور نسبت کے قائل ہو گئے ہیں (و جعلوا بینه و بین الجنة نسبًا)۔

یہ کون سی نسبت تھی جس کے وہ خدا اور جن کے درمیان قائل تھے؟ اس سوال کے جواب میں کئی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ وہ دوگانہ پرست تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ (نعوذ باللہ) خدا اور شیطان بھائی بھائی ہیں۔ خدا تو نیکیوں کا خالق ہے اور شیطان برائیوں کا خالق ہے۔

یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے کیونکہ دوگانہ پرست اور ثنوئین دنیائے عرب میں مشہور نہیں تھے۔ البتہ ساسانیوں کے دور میں ایران کے مانند کچھ علاقوں میں یہ بے ہودہ عقیدہ موجود تھا۔

بعض دوسرے مفسرین نے جن اور ملک کو ایک ہی معنی میں سمجھا ہے۔ کیونکہ جن اصل میں اس موجود کے معنی میں ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ فرشتے چونکہ آنکھ سے نظر نہیں آتے لہٰذا یہ لفظ انہی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ یہ کہتے ہیں کہ نسب سے مراد وہی نسبت ہے جس کی زمانہ جاہلیت کے عرب ان کے لیے قائل تھے اور انھیں خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

مشکل ہے کہ یہ تفسیر بھی صحیح ہو چونکہ زیر بحث آیات ظاہری اعتبار سے دو الگ الگ مطالب بیان کر رہی ہیں۔ علاوہ ازیں لفظ "جن" کا "ملائکہ" پر اطلاق معمول و مانوس نہیں ہے، خصوصاً قرآن مجید میں۔

تیسری تفسیر جو بعض نے اس آیہ کے بارے میں بیان کی ہے یہ ہے کہ وہ جنوں کو خدا کی بیویاں خیال کرتے تھے اور ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں۔

یہ تفسیر بھی بعید نظر آتی ہے چونکہ لفظ "نسب" کا "زوجیت" پر اطلاق بھی بعید ہے۔

وہ تفسیر جو سب سے زیادہ مناسب ہے یہ ہے کہ "نسب" سے مراد ہر قسم کی نسبت و رابطہ ہے، چاہے رشتہ داری کا کوئی پہلو اس میں نہ ہو اور ہم جانتے ہیں کہ بعض مشرکین عرب جنوں کی پرستش کرتے تھے اور انھیں خدا کا شریک سمجھتے تھے اور اس طرح سے وہ ان کے اور خدا کے درمیان ایک نسبت اور رابطے کے قائل تھے۔

بہر حال قرآن مجید اس بے ہودہ اور خرافاتی عقیدے کا شدت کے ساتھ انکار کرتا ہے اور کہتا ہے: وہ جن جنھیں خرافاتی بت پرست اپنا معبود خیال کرتے تھے یا انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھتے تھے۔ ہاں! وہی جن اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بے ہودہ بت پرست خدا کی عدالت میں حساب و کتاب اور عذاب و سزا کے لیے ضرور حاضر ہوں گے (و لقد علمت الجنة انهم لمحضرون)۔

بعض نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے وہ یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ گمراہ کرنے والے جنات جانتے ہیں کہ وہ خود عدالتِ خداوندی میں حساب و کتاب اور عذاب کے لیے حاضر کیے جائیں گے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہے [1]

---

[1] پہلی صورت میں "هم" کی ضمیر مشرکین کی طرف لوٹتی ہے اور دوسری صورت میں "جن" کی طرف۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: خدا اس تعریف و توصیف سے جو یہ (جاہل و گمراہ) گروہ کرتا ہے، پاک و منزہ ہے (سبحان اللہ عما یصفون)۔

اس توصیف کے سوا جو خدا کے مخلص بندے (از روئے آگاہی و معرفت اس کے بارے میں کرتے ہیں) کوئی توصیف اس مقدس ذات کے لیے شایاں نہیں ہے (الا عباد اللہ المخلصین)۔

اس طرح ہر قسم کی توصیف جو لوگ خدا کے بارے میں کرتے ہیں درست نہیں ہے اور خدا اس سے پاک و منزہ ہے، سوائے اس توصیف کے جو مخلص بندے اس کی کرتے ہیں۔ وہ بندے ہر قسم کے شرک، ہوائے نفس، جہالت اور گمراہی سے مبرا ہیں اور خدا کی اس کے سوا جس کی اس نے خود اجازت دی ہے توصیف نہیں کرتے [1]

"عباد اللہ المخلصین" کے بارے میں ہم نے اسی سورہ کی آیہ ۱۲۸ کے ذیل میں بحث کی ہے۔

ہاں! خدا کی شناخت اور معرفت کے لیے ان خرافات کے پیچھے نہیں جانا چاہیے جو زمانۂ جاہلیت کی اقوام سے باقی رہ گئی ہیں اور انسان کو انھیں بیان کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے بلکہ مخلص بندوں کی پیروی کرنا چاہیے۔ جن کی گفتار انسان کی روح کو آسمانوں کی بلندی کی طرف لے جاتی ہے اور اس کے نورِ وحدانیت میں محو کر دیتی ہے۔ شرک کے ہر طرح کے شک و شبہات کو اس کے دل سے دھو دیتی ہے اور ہر قسم کے تجسم و تشبیہ کو ذہن سے مٹا دیتی ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات علی علیہ السلام کے نہج البلاغہ کے خطبات اور صحیفہ سجادیہ میں امام سجاد علیہ السلام کی پُر مغز دعاؤں کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان بندگانِ خدا کی توصیفوں سے خدا کو پہچاننا چاہیے۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک مقام پر فرماتے ہیں:۔

لم یطلع العقول علی تحدید صفتہ، ولم یحجبھا عن واجب معرفتہ، فھو الذی تشھد لہ اعلام الوجود علی اقرار قلب ذی الجحود تعالی اللہ عما یقولہ المشبھون بہ والجاحدون لہ علوًا کبیرًا

نہ تو اس نے عقلوں کو اپنی صفات کی کنہ و حقیقت سے آگاہ کیا ہے اور نہ ہی انھیں اپنی معرفت و شناخت سے باز رکھا ہے۔ وہ وہی تو ہے جس کے وجود کے اقرار پر عالمِ ہستی کی نشانیاں منکرین کے دلوں کو ابھارتی ہیں اور وہ ان لوگوں کی بات سے برتر و بالا ہے جو اسے اس کی مخلوقات کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں یا اس کے انکار کا راستہ اختیار کرتے ہیں [2]

ایک دوسری جگہ پروردگار کی تعریف و توصیف میں اس طرح فرماتے ہیں:۔

---

[1] اس تفسیر کی بنا پر (الا عباد اللہ) کا جملہ (یصفون) کی ضمیر سے استثناء ہے لیکن بعض اسے "محضرون" کی ضمیر سے استثناء سمجھتے ہیں اور اس کی مختلف تفسیریں کرتے ہیں۔ البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور ہر حالت میں استثناء "منقطع" ہے۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۴۹

لا تناله الاوهام فتقدره، ولا تتوهمه الفطن فتصوره، ولا تدركه الحواس فتحسه، ولا تلمسه الايدى فتمسه، ولا يتغير بحال، ولا يتبدل فی الاحوال، ولا تبليه الليالی والايام ولا يغيره الضياء والظلام، ولا يوصف بشیء من الاجزاء ولا بالجوارح والاعضاء ولا بعرض من الاعراض، ولا بالغيرية والابعاض ولا يقال له حد ولا نهاية ولا انقطاع ولا غاية

بلند اوہام اور اندیشوں کے ہاتھ اس کی دامنِ کبریائی تک نہیں پہنچ سکتے کہ اسے کسی حد میں محدود کر دیں اور صاحبانِ ہوش و خرد اس کے نقش کی اپنے خیال میں تصویر کشی نہیں کر سکتے۔ حواس اس کے ادراک سے عاجز ہیں اور ہاتھ اسے چھونے سے قاصر ہیں۔ تغیّر و تبدّل اس کے لیے نہیں ہے۔ زمانہ گزرنے سے اس کے وجود میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ راتوں اور دنوں کا آنا جانا اسے کہنہ اور پرانا نہیں کرتا۔ روشنی اور تاریکی اس میں تغیّر پیدا نہیں کرتے۔ اس کی نہ تو اجزاء اور اعضاء و جوارح کے ساتھ توصیف ہو سکتی ہے اور نہ ہی عوارض و ابعاض کے ساتھ۔ اور اس کے لیے کوئی حد بندی اور انتہا نہیں ہے۔ اور وہ کوئی انقطاع و انتہا نہیں رکھتا[1]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

ومن قال فيم؟ فقد ضمنه، ومن قال علام؟ فقد اخلی منه، كائن لا عن حدث، موجود لا عن عدم مع كل شیء لا بمقارنه وغير كل شیء لا بمزايله

جو شخص یہ کہے کہ خدا کہاں ہے؟ اس نے اس کا کسی چیز میں تصور کیا ہے اور جو کوئی یہ پوچھے کہ وہ کس چیز پر برقرار ہے، اس نے کسی جگہ کو اس سے خالی سمجھا ہے، وہ ہمیشہ سے تھا اور کسی چیز سے وجود میں نہیں آیا۔ وہ ایسا وجود ہے کہ جس سے پہلے عدم ہے ہی نہیں، اور وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن اس کا قرین ہو کر نہیں اور ہر چیز سے الگ اور غیر ہے، لیکن اس سے بیگانہ اور جدا ہو کر نہیں[2]

امام علی بن الحسین سید الساجدین علیہ السلام صحیفہ سجادیہ میں فرماتے ہیں :۔

الحمد لله الاول بلا اول كان قبله، والآخر بلا آخر يكون بعده الذی قصرت عن رؤيته ابصار الناظرين وعجزت عن نعته اوهام الواصفين

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۶

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱

حمد و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے جس کی ہستی مبدأ آفرینش ہے بغیر اس کے کہ اس کی ذاتِ ازلی کی کوئی ابتدا ہو اور وجود میں آخری ہے بغیر اس کے کہ اس حقیقتِ ابدی کے لیے آخر و انتہا کا کوئی تصور ہو سکے۔ کوئی موجود اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسی ذات ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں اسے دیکھنے سے قاصر ہیں اور توصیف کرنے والوں کی عقل و فہم اس کی حمد و ثنا سے عاجز ہے [1]

ہاں خدا کی معرفت اور شناخت ان "عباد اللہ الصالحین" کے مکتب سے حاصل کرنا چاہیے۔ اور اس مدرسے سے خداشناسی کا سبق پڑھنا چاہیے۔

---

[1] صحیفہ سجادیہ، پہلی دعا

۱۶۱- فَإِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ ۙ

۱۶۲- مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَاتِنِينَ ۙ

۱۶۳- إِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيمِ ۝

۱۶۴- وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَعْلُومٌ ۙ

۱۶۵- وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ ۚ

۱۶۶- وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ ۝

۱۶۷- وَإِنْ كَانُوا لَيَقُولُونَ ۙ

۱۶۸- لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِنَ الْأَوَّلِينَ ۙ

۱۶۹- لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝

۱۷۰- فَكَفَرُوا بِهِ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ

۱۶۱۔ تم اور جن کی تم پرستش کرتے ہو۔

۱۶۲۔ تم ہرگز کسی کو (اس سے) دھوکا نہیں دے سکتے۔

۱۶۳۔ مگر وہ، جو خود ہی یہ چاہتے ہیں کہ جہنم کی آگ میں جلیں۔

۱۶۴۔ ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معلوم مقام ہے۔

۱۶۵۔ اور ہم سب کے سب (خدا کے حکم کی اطاعت کے لیے) صف باندھے کھڑے ہیں۔

۱۶۶۔ اور ہم سب کے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

۱۶۷۔ اور وہ تو ہمیشہ یہی کہتے تھے۔

۱۶۸۔ اگر پہلے لوگوں کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ہمارے پاس ہوتی۔

۱۶۹۔ تو ہم خدا کے مخلص بندوں میں سے ہوتے۔

۱۷۰۔ (لیکن جس وقت یہ عظیم آسمانی کتاب ان کے لیے نازل ہوئی) تو وہ اس سے کافر ہو گئے، لیکن عنقریب وہ اپنے کام کا نتیجہ دیکھ لیں گے۔

تفسیر

جھوٹے دعوے

گزشتہ آیات میں مشرکین کے مختلف معبودوں کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں بھی وہی مسئلہ جاری ہے اور اس سلسلے میں چند آیات میں ایک ایک مطلب بیان ہو رہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ تم بت پرستوں کے وسوسے کا نیک اور پاک لوگوں کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا، صرف آلودہ دل اور تمہاری برائی کی طرف مائل ہونے والی دوزخی روحیں ہی ان وسوسوں کو قبول کرتی ہیں۔ فرمایا گیا ہے، تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو.....

(فانکم وما تعبدون)۔

"تم ہرگز کسی کو (اس سے) فریب نہیں دے سکتے، اور فتنہ و فساد کے ذریعے خدا سے منحرف نہیں کر سکتے (ما انتم علیه بفاتنین)[1]

مگر وہی جو خود یہ چاہتے ہیں کہ جہنم کی آگ میں جلیں (الا من ھو صال الجحیم)۔

مسلک جبر کے طرفداروں نے ان آیات سے جو کچھ سمجھا ہے اس کے برخلاف یہ آیات اس مکتب کے برخلاف ایک دلیل ہے اور اس حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے کہ کوئی بھی شخص انحرافات کے مقابلے میں اپنے آپ کو معذور نہیں جان سکتا اور یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مجھے دھوکہ دے کر بت پرستی کی طرف لے جایا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے، تم بت پرست لوگوں کو فتنہ اور فریب دینے کی طاقت

---

[1] یہ آیت اور اس سے پہلی آیت اور بعد والی آیت مشہور علماء کے قول کے مطابق ترکیب نحوی کے لحاظ سے اس طرح ہے "ما" "ماتعبدون" کے جملہ میں "ما" موصولہ ہے اور اس کا عطف "ان" کے اسم پر ہے اور "ما انتم علیه بفاتنین" اس کی خبر ہے اس قید کے ساتھ کہ "ما انتم علیه" کا "ما" نافیہ ہے اور "علیه" کی ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے اور اس کا مجموعی نتیجہ یہ بنتا ہے۔

انکم والھتکم التی تعبدونھا لا تقدرون علی اضلال احد علی الله بسببھا الا من یحترق بنار الجحیم بسوء اختیاره

بعض دوسرے علماء نے "انکم وما تعبدون" کی آیت کو مستقل جملہ جانا ہے جس کا مفہوم یہ ہو گا کہ تم اپنے معبودوں کے ساتھ دور ہو۔ اس کے بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ تم اس کے ذریعے کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے مگر انھی کو جو خود دوزخی ہونا چاہیں۔

نہیں رکھتے، مگر انھی کو جو خود اپنے ارادے کے ساتھ دوزخ کی راہ اختیار کر لیں۔

اس بات کا شاہد "صال الجحیم" کی تعبیر ہے، کیونکہ دراصل "صالی" اسم فاعل کی شکل میں تھا اور عام طور پر جس وقت اسم فاعل کے صیغے کو کسی موجود عاقل کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم کسی کام کو ارادہ و اختیار سے انجام دینا ہے۔ مثلاً "قاتل" و "جالس" و "ضارب" اس بنا پر "صال الجحیم" یعنی وہ شخص جو اپنے آپ کو جہنم کی آگ میں جلانے کے لیے آمادہ ہو اور اس طرح سے تمام انحراف کرنے والوں کے لیے عذر کی راہ بند ہو جاتی ہے۔

بعض مشہور مفسرین کے بارے میں تعجب ہے کہ انھوں نے آیہ کا اس طرح معنی کیا ہے: "تم کسی کو دھوکا اور فریب نہیں دے سکتے سوائے ان لوگوں کے جن کا جہنمی ہونا مقدر ہو چکا ہے۔

واقعاً اگر آیت کا معنی یہ ہے تو پھر پیغمبر کس لیے آتے ہیں؟ آسمانی کتابیں کس مقصد کے لیے نازل ہوتی ہیں؟ حساب و کتاب اور قرآن کی آیات میں بت پرستوں کو لعنت و ملامت کا کیا مفہوم ہے؟ اور خدا کی عدالت کہاں جائے گی؟

ہاں! مکتب جبر کا اعتراف کرنے سے اس حقیقت کو قبول کر لینا چاہیے کہ یہ مکتب انبیاء کی اصالت کو کلی طور پر مخدوش کر دیتا ہے، اس کے تمام مفاہیم کو مسخ کر دیتا ہے اور تمام الٰہی اور انسانی قدروں کو برباد کر دیتا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ "صالی" "صلی" (بروزن "سرو") کے مادہ سے آگ جلانے، آگ میں داخل ہونے یا آگ میں بھونے جانے کے معنی میں ہے اور "فاتن" "فتنہ" کے مادہ سے "اسم فاعل" فتنہ گر اور گمراہ کرنے والے کے معنی میں ہے۔

یہ تین آیات جو بت پرستوں کی فتنہ جوئی اور گمراہ کن حرکتوں کے مقابلہ میں انسانوں کے مسئلہ اختیار کو واضح کرتی ہیں، ان کے بعد تین آیات میں فرشتوں کے بلند و بالا مقام کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، وہی فرشتے جنھیں بت پرست خدا کی بیٹیاں خیال کرتے ہیں اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ گفتگو کو خود انھی کے زبان سے بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم میں سے ہر ایک کا ایک معلوم مقام ہے (وما منا الا له مقام معلوم)۔[1]

اور ہم سب فرمانِ خدا کی اطاعت کے لیے صف بستہ کھڑے ہیں اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار رہتے ہیں (و انا لنحن الصافّون)۔

اور ہم سب کے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کو ان چیزوں سے جو اس کی پاک ذات کے لائق نہیں ہیں، منزہ شمار کرتے ہیں (و انا لنحن المسبحون)۔

ہاں! ہم تو وہ بندے ہیں جو دل و جان کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔ ہماری آنکھیں اور کان اس کے فرمان پر لگے ہوئے ہیں۔

---

[1] بعض روایات جو اہل بیتؑ کے طریقے سے وارد ہوئی ہیں، میں یہ تفسیر بیان کی گئی ہے کہ اس سے مراد ائمہ معصومینؑ ہیں۔ ممکن ہے یہ تفسیر ائمہ کے مقام کی فرشتوں کے ساتھ تشبیہ کے عنوان سے ہو یعنی جس طرح وہ معین و معلوم مقامات اور فرائض اور ذمہ داریاں رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم بھی ہیں۔

ہم کہاں اور خدا کا بیٹا ہونا کہاں ؟ ہم اسے ان قبیح اور جھوٹی نسبتوں سے پاک اور منزہ سمجھتے ہیں اور ہم مشرکین کے ان خرافات اور اوہام سے متنفر اور بیزار ہیں ۔

حقیقت میں یہ تین آیات فرشتوں کی صفات کے تین حصوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔

پہلا یہ کہ ان میں سے ہرایک ، ایک مرتبہ و منزلت رکھتا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتا ۔

دوسرا یہ کہ فرشتے عرصۂ آفرینش میں اور وسیع عالم ہستی میں اوامر خداوندی کے اجراء کے سلسلے میں ہمیشہ فرمان خدا کی اطاعت کے لیے آمادہ و تیار رہتے ہیں ۔ یہ بات اس چیز سے مشابہ ہے جو سورۂ انبیاء کی آیہ ۲۶ ، ۲۷ میں آئی ہے کہ :

بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول و ھم بامرہ یعملون

وہ خدا کے اچھے بندے ہیں جو بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان پر عمل کرتے ہیں ۔

تیسرا یہ کہ وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کو اس چیز سے جو اس کے مقام کے لائق نہیں ہے ، منزہ شمار کرتے ہیں ۔

چونکہ ان دونوں جملوں (انا لنحن الصافون و انا لنحن المسبحون) کا عربی ادب کے لحاظ سے مفہوم "حصر" ہے ، لہٰذا بعض مفسرین نے اس سے یہ مطلب لیا ہے کہ فرشتے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صرف ہم خدا کے حکم کے مطیع ہیں اور اس کی حقیقی تسبیح کرنے والے بھی ہم ہی ہیں ۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بنی آدم کی اطاعت و تسبیح فرشتوں کے کام کے مقابلے میں کوئی اہم چیز نہیں ہے ۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے ان آیات کے ذیل میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا :

مافی السماوات موضع شبر الا وعلیہ ملک یصلی ویسبح

تمام آسمانوں میں ایک بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں پر کوئی فرشتہ نماز اور خدا کی تسبیح میں مصروف نہ ہو۔[1]

ایک دوسری روایت میں یہی معنی ایک دوسری صورت میں بیان ہوا ہے :

مافی السماء موضع قدم الا علیہ ملک ساجد او قائم

تمام آسمانوں میں ایک قدم رکھنے کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے کہ جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ حالتِ سجدہ یا قیام میں نہ ہے۔[2]

ایک اور روایت میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے ایک دن اپنے اصحاب سے جو آپ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے ، فرمایا :

---

[1] ، [2] تفسیر قرطبی جلد ۸ ، ص ۵۵۸۱

اطت السماء وحق لها ان تأط ! ليس فيها موضع قدم الا عليه ملك راكع او ساجد، ثم قرأ وانا لنحن الصافون وانا لنحن المسبّحون

آسمان نے (اپنے بار کی سنگینی سے) فریاد کی، اور وہ حق رکھتا ہے کہ نالہ و فریاد کرے کیونکہ اس میں ایک قدم رکھنے کی بھی جگہ ایسی نہیں جس پر کوئی نہ کوئی فرشتہ حالتِ رکوع میں یا حالت سجود میں نہ ہو۔ پھر آپ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی و انا لنحن الصافون....[1]

یہ گوناگوں تعبیریں اس بات کی طرف ایک لطیف کنایہ ہیں کہ عالمِ ہستی پروردگار کے فرماں برداروں اور اس کی تسبیح کرنے والوں سے معمور ہے۔

اس کے بعد زیر بحث آخری چار آیتوں میں اسی بت پرستی سے مربوط اور کچھ دوسرے مطالب کے لیے ان مشرکین کے ایک عذر لنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن جواب دیتا ہے اور فرماتا ہے: وہ ہمیشہ کہتے تھے....... (و ان کانوا لیقولون)۔[2]

اگر ہمارے پاس پہلے لوگوں کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ہوتی .... (لو ان عندنا ذکرا من الاوّلین)۔

توہم خدا کے مخلص بندوں میں سے ہوتے (لکنّا عباد اللہ المخلصین)۔

ان سب مخلص بندوں اور جنھیں خدا نے خالص کیا ہے، ان کے بارے میں گفتگو نہ کر۔ نوحؑ، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ جیسے بزرگ پیغمبروں کو ہمارے سامنے پیش نہ کر۔ اگر ہمارے اوپر بھی لطفِ خدا ہوتا اور ہم پر بھی کوئی آسمانی کتاب نازل ہوئی ہوتی، توہم بھی ان ہی مخلص بندوں کے زمرے میں ہوتے۔

یہ بعینہ پیچھے رہ جانے والے اور فیل ہوجانے والے طالب علموں کی مانند گفتگو ہے، جو اپنی سستی پر پردہ ڈالنے کے لیے کہا کرتے ہیں کہ اگر ہمارا بھی کوئی اچھا استاد ہوتا توہم بھی اول آنے والے طالب علموں میں سے ہوتے۔

بعد والی آیت کہتی ہے کہ ان کی یہ آرزو بھی اب عملی جامہ پہن چکی ہے اور خدا کی عظیم ترین آسمانی کتاب قرآن مجید ان کے لیے نازل ہوئی ہے، لیکن یہ غلط دعوے کرنے والے جھوٹے اس سے کافر ہوگئے ہیں اور اس کی مخالفت انکار اور دشمنی پر

---

[1] درالمنثور سے المیزان جلد ۱۷ ص ۱۸۸ پر نقل کیا گیا ہے۔

[2] "ان" یہاں پر مثقلہ سے مخففہ ہے یہ تقدیر میں اس طرح تھا "وانھم کانوا لیقولون"

تل گئے ہیں لیکن وہ جلد ہی اپنے کام کا نتیجہ جان لیں گے (فکفروا به فسوف یعلمون)[1]۔

یہ لاف و گزاف کی باتیں نہ کرو اور اپنے آپ کو خدا کے مخلص بندوں کی صف میں شامل ہونے کے لائق شمار نہ کرو، تمھارا جھوٹ واضح ہو چکا ہے اور تمھارے دعوے کھوکھلے نکلے ہیں۔ قرآن سے بہتر کسی کتاب کا تصور نہیں ہو سکتا اور کوئی مکتب اسلام جیسے تربیتی مکتب سے بہتر نہیں ہے۔ لیکن اب تم خود ہی دیکھ لو کہ تم نے اس آسمانی کتاب کا کس طرح استقبال کیا ہے۔ لہذا اپنے کفر و بے ایمانی کے دردناک انجام کے منتظر رہو۔

---

[1] یہ جملہ حقیقت میں ایک محذوف رکھتا ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: "فلما اتاهم الکتاب و هو القرآن کفروا به فسوف یعلمون عاقبة کفرهم" جب قرآن ایسی کتاب ان کے پاس آگئی تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا اور کافر ہو گئے۔ عنقریب انھیں اپنے کفر کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

۱۷۱۔ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝

۱۷۲۔ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ۝

۱۷۳۔ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُونَ ۝

۱۷۴۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِينٍ ۝

۱۷۵۔ وَّأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ۝

۱۷۶۔ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ۝

۱۷۷۔ فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ ۝

ترجمہ

۱۷۱۔ ہمارے مرسل بندوں کے لیے ہمارا قطعی وعدہ پہلے سے مسلّم ہو چکا ہے۔

۱۷۲۔ کہ ان کی مدد کی جائے گی۔

۱۷۳۔ اور ہمارا لشکر (تمام میدانوں میں) کامیاب ہوگا۔

۱۷۴۔ ان سے ایک معین وقت تک منہ پھیر لے (جب تک جہاد کا فرمان صادر نہیں ہوتا)۔

۱۷۵۔ اور ان کی حالت کی طرف دیکھ (کتنی بے معنی ہے) لیکن وہ عنقریب (اپنے کیے کا نتیجہ) دیکھ لیں گے۔

۱۷۶۔ کیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں؟

۱۷۷۔ لیکن جب ہمارا عذاب ان کے گھروں کے صحن میں نازل ہوگا تو (ان لوگوں کے لیے جنھیں ڈرایا گیا ہے) وہ بری صبح ہوگی۔

تفسیر

اللہ کا گروہ کامیاب ہے

عظیم انبیاء کی جدوجہد اور بے ایمان مشرکین کی کارشکنیوں کے سلسلے میں ان گوناگوں مباحث کے بعد، جو اس سورہ کی آیات میں

بیان ہوئی ہیں۔ اب جبکہ ہم اس سورہ کی آخری آیات کے قریب ہو رہے ہیں تو اس سے مربوط اہم ترین سنو بیان کیا جارہا ہے اور خاتمہ بالخیر کو اعلیٰ ترین صورت میں پیش کیا جارہا ہے اور وہ خدا کے لشکر کی شیطان اور دشمنانِ حق کے لشکر پر مکمل فتح کی خبر ہے تاکہ وہ تھوڑے سے مومنین جو ان آیات کے نزول کے وقت مکہ میں دشمنانِ اسلام کی سختی اور دباؤ کا شکار تھے اور اسی طرح ہر عصر اور ہر زمانہ کے تمام محروم مومنین، خدا کے اس عظیم وعدے سے مطمئن ہو جائیں اور یاس و ناامیدی کا گرد و غبار اپنے قلب و روح سے دھو ڈالیں اور باطل کے لشکر کے ساتھ مقابلہ جاری رکھنے کے لیے آمادہ رہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: ہمارے مرسل بندوں کے ساتھ ہمارا قطعی وعدہ پہلے سے مسلّم ہو چکا ہے (ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین)۔

کہ ان کی مدد و نصرت کی جائے گی (انھم لھم المنصورون)۔

اور ہمارے لشکر تمام میدانوں میں کامیاب ہوں گے (وان جندنا لھم الغالبون)۔

کتنی صریح اور منہ بولتی عبارت ہے اور کتنا روح پرور اور امید بخش وعدہ ہے۔

ہاں! حق کے لشکر کی باطل پر کامیابی اور اللہ کے لشکر کا غلبہ اور مرسل اور مخلص بندوں کے لیے خدا کی مدد و نصرت اس کے مسلم اور یقینی وعدوں اور قطعی سنتوں میں سے ہے، جو ان آیات میں "سبقت کلمتنا" (ہمارا یہ وعدہ اور یہ سنت ابتدا سے تھی) کے انداز میں پیش ہوئی ہے۔

قرآن مجید کی دوسری بہت سی آیات میں بھی ان مطالب کی نظیر موجود ہے۔ سورۂ روم کی آیہ ۴۷ میں بیان ہوا ہے۔

وکان حقًا علینا نصر المؤمنین

مؤمنین کی مدد کرنا ایسا حق ہے جو ہم پر مسلم ہے۔

نیز سورۂ حج کی آیہ ۴۰ میں بیان ہوا ہے۔

ولینصرنّ اللہ من ینصرہ

خدا ہر اس شخص کی ضرور مدد کرے گا جو اس کے دین و آئین کے لیے اُٹھے گا۔

اور سورۂ مؤمن کی آیہ ۵۱ میں یہ بیان ہوا ہے:۔

انّا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد

ہم اپنے رسولوں کی اور صاحبِ ایمان کی، دنیا کی زندگی میں بھی مدد کریں گے اور (قیامت کے دن) جب حق کی گواہی دینے والے قیام کریں گے اس دن بھی مدد و نصرت کریں گے۔

سورۂ مجادلہ کی آیہ ۲۱ میں تو پوری قاطعیت اور دو ٹوک فیصلے کے طور پر اس غلبے اور کامیابی کے بارے میں ایک قطعی سنت کے طور پر گفتگو کی گئی ہے۔

کتب اللہ لاغلبنّ انا ورسلی

خدا نے مقرر کر دیا ہے اور لکھ دیا ہے) کہ میں اور میرے رسول قطعی طور پر غالب ہو کے رہیں گے۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ خدا جو ہر چیز پر قادر ہے اور جس کے وعدوں میں نہ تخلف تھا اور نہ ہے، وہ اپنے اس عظیم وعدے کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے اور عالم ہستی کی دوسری تخلف ناپذیر سنتوں کی طرح مردان حق کو بے کم وکاست کامیاب کر سکتا ہے۔

یہ خدائی وعدہ ان اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے راہ حق کے راہ روطمئن اور دل گرم رہتے ہیں۔ اور اس سے روح تازہ حاصل کرتے ہیں، جس وقت تھک جاتے ہیں تو اس کے ذریعے تازہ دم ہو جاتے ہیں اور نیا خون ان کی رگوں میں جاری ہونے لگتا ہے۔

ایک اہم سوال

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا کی مشیت وارادہ میں پیغمبروں کی مدد ونصرت اور مومنین کی کامیابی مقرر ہو چکی ہے تو ہم بشر کی بھرپور تاریخ میں کئی پیغمبروں کو بشارت پر فائز ہوتے ہوئے مشاہدہ کیوں کرتے ہیں اور مومنین کے کئی گروہ شکست سے دوچار کیوں ہوئے؟ اگر یہ تخلف ناپذیر سنت الٰہی ہے تو پھر یہ استثناءات کس بنا پر ہیں؟

ہمارا جواب

اولاً: کامیابی ایک وسیع معنی رکھتی ہے اور ہمیشہ دشمن پر ظاہری اور جسمانی غلبہ کے معنی میں نہیں ہوتی۔ بعض اوقات مکتب اور نظریے کی کامیابی کو بھی کامیابی ہی کہتے ہیں اور اہم ترین کامیابی یہی ہے۔ فرض کریں کہ پیغمبر اسلام کسی جنگ میں شہید ہو جاتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا دین ساری دنیا میں پھیل گیا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس شہادت کو شکست سے تعبیر کریں؟

اس سے بھی واضح روشن مثال یہ ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے انصار نے کربلا کے میدان میں واقعاً شربت شہادت نوش کیا، لیکن ان کا ہدف ومقصد یہ تھا کہ بنی امیہ کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کر دیں کہ جو ظاہر میں تو پیغمبر اکرمؐ کی خلافت کے مدعی تھے لیکن حقیقت میں اسلامی معاشرے کو زمانہ جاہلیت کی طرف واپس لوٹانا چاہتے تھے اور وہ اس عظیم ہدف ومقصد میں کامیاب ہو گئے۔ آپ نے مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا اور اسلام کو مٹنے سے بچا لیا۔ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کربلا میں مغلوب ہو گئے؟

اہم بات یہ ہے کہ انبیاء اور جنود الٰہی یعنی مومنین، حق کے دشمنوں کی تمام متواتر ومنظم کوششوں کے باوجود، اس بات پر قادر ہو سکے کہ اپنے اہداف ومقاصد کو دنیا میں آگے بڑھائیں اور زیادہ سے زیادہ پیروکار پیدا کر سکیں اور اپنے مکتبی راستے کو دوام دے سکیں اور ان تمام طوفانوں کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں، یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں دنیا کے اکثر لوگوں کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کر لیں۔

کامیابی کی ایک اور قسم بھی ہے جو دشمن کے مقابلہ میں صدیوں کے دوران میں تدریجی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ کبھی ایک نسل میدان میں آتی ہے اور کامیاب نہیں ہوتی لیکن آئندہ آنے والی نسلیں ان کے کام کو آگے بڑھاتی ہیں اور کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی ہیں (مثلاً دو سو سال کے بعد لشکرِ اسلام کی صلیبیوں کے لشکر پر کامیابی) یہ کامیابی بھی سب کی کامیابی سمجھی جائے گی۔

ثانیاً اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خدا کا مومنین کے لیے غلبہ کا وعدہ ایک مشروط وعدہ ہے نہ کہ مطلق اور اس حقیقت کی طرف توجہ نہ کرنے سے ہی بہت سے اشتباہات پیدا ہوتے ہیں۔

کیونکہ زیر بحث آیات میں لفظ "عبادنا" (ہمارے بندے) اور "جندنا" (ہمارا لشکر) یا اسی قسم کی دوسری تعبیریں جو اس سلسلے میں قرآن کی دوسری آیات میں آئی ہیں مثلاً "حزب اللہ" "والذین جاھدوا فینا" "ولینصرن اللہ من ینصرہ" اور اسی قسم کی دوسری تعبیریں سب کی سب کامیابی کی شرائط کے لیے ایک واضح دلیل ہیں۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ نہ تو ہم مجاہد مومن نہیں اور نہ ہی مخلص لشکر، اور اس حال میں حق و عدالت کے دشمنوں پر غالب آجائیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ خدا کی راہ میں شیطانی افکار اور پروگراموں کے ساتھ پیش رفت کریں۔ اس کے بعد تعجب کرتے ہیں کہ ہم دشمنوں سے مغلوب کیوں ہو گئے۔ تو کیا ہم نے اپنے وعدوں پر عمل کیا ہے کہ خدا سے اس کے وعدوں کے ایفا کا مطالبہ کر رہے ہیں؟

جنگِ اُحد میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں سے کامیابی کا وعدہ کیا تھا اور جنگ کے پہلے مرحلے میں کامیاب ہوئے بھی لیکن ایک گروہ جنگ کا مالِ غنیمت جمع کرنے، تفرقہ و نفاق پیدا کرنے اور فرمانِ رسولؐ کو چھوڑ دینے کی فکر میں پڑ گیا اور جنگ کے آغاز میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس کی اور درۂ احد کی حفاظت میں کوتاہی کی اور یہی امر اس جنگ میں انکی شکست کا سبب بن گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گروہ جو اپنے آپ کو کامیابی کا طلب گار سمجھتا تھا، پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آیا اور مخصوص لب ولہجہ میں عرض کی کہ کامیابی کا وہ وعدہ کیا ہوا؟

قرآن نے انھیں بہت ہی عمدہ جواب دیا جو ہماری گفتگو کا گواہ ہے۔ فرمایا:۔

> ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم باذنہ حتّٰی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الاٰخرۃ ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم ولقد عفا عنکم واللہ ذو فضل علی المؤمنین

> خدا نے (اُحد میں دشمن پر کامیابی کا) تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔ اس وقت (جب ابتداء جنگ میں) تم دشمنوں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے اور یہ کامیابی اسی طرح برقرار رہی، یہاں تک کہ تم سُست پڑ گئے اور اپنے کام میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ اور جب (تم نے اپنے مطلوب کو پالیا اور) جو کچھ تم پسند کرتے تھے وہ خدا نے تمھیں دکھا دیا، تو تم نے نافرمانی کی۔ تم میں سے بعض تو دنیا کے طالب تھے اور بعض آخرت کے چاہنے والے تھے (اس کے باوجود اس نے تمھیں مکمل شکست سے

نجات دی) اور انھیں تم سے منصرف کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے اور تمھیں اپنے عفو سے نوازا اور
خدا مومنین کے لیے صاحب فضل بخشش ہے۔ (آل عمران ـــــــ ۱۵۲)

"فشلتم" (تم کمزور پڑ گئے)

"تنازعتم" (ایک دوسرے سے جھگڑنے اور نزاع و اختلاف کرنے لگے)

"عصیتم" (تم نے نافرمانی کی)

یہ ایسی تعبیریں ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انھوں نے خدا کی مدد اور دشمن پر کامیابی کی شرائط کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔

ہاں! خدا نے ہرگز یہ وعدہ نہیں کیا کہ جس شخص نے اپنا نام مسلمان اور مجاہدِ اسلام رکھ لیا اور "جند اللہ" اور "حزب اللہ" کا دم بھرنے لگا وہ ہر میدان میں دشمن پر غلبہ حاصل کرے گا۔ بلکہ یہ خدائی وعدہ تو ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو دل و جان سے رضائے خدا کے خواہاں ہیں اور عملی لحاظ سے اس کے فرمان پر چلتے ہیں اور تقویٰ و امانت کو نہیں بھولتے۔

اس سوال و جواب کی نظیر، ہم نے "دعا" اور "خدا" کے وعدہ "اجابت" کے بارے میں بھی بیان کی ہے[1]

اس کے بعد ان آیات کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کی دلجوئی اور کامیابی کی تاکید کے لیے بھی اور بے خبر مشرکین کی تنبیہ و تہدید کے لیے بھی فرمایا گیا ہے: ان سے منہ پھیر لے، اور انھیں ایک معین وقت تک کے لیے ان کی حالت پر چھوڑ دے (فتولّ عنهم حتّٰى حين)۔

یہ ایک پُرمعنی اور ہول انگیز تہدید ہے جس کا سرچشمہ مکمل کامیابی کا اطمینان ہے، خصوصاً "حتّٰى حين" (ایک مدت تک) کی تعبیر اجمالی اور سربستہ صورت میں ادا ہوئی ہے۔ لیکن کتنی مدت تک؟ ہجرت کے زمانے تک؟ جنگِ بدر کے موقع تک؟ فتح مکہ تک؟ یا اس زمانے تک کہ ان دل کے اندھوں کے خلاف، مسلمانوں کے لیے مکمل اور عمومی قیام کے حالات فراہم ہوں۔ یہ بات دقیقاً معلوم نہیں ہے۔

اس تعبیر کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے، کبھی کہتا ہے:

فأعرض عنهم و توكّل على الله

ان سے رُخ پھیر لے اور خدا پر توکل کر (نساء ـــــــ ۸۱)

دوسری جگہ کہتا ہے:

قل الله ثم ذرهم في خوضهم يلعبون

کہو اللہ، پھر انھیں چھوڑ دو کہ اپنے جھوٹ کے ساتھ کھیلتے رہیں (انعام ـــــــ ۹۱)

اس کے بعد اس جملے کی ایک دوسری تہدید کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کی حالت کی طرف دیکھ (ان کی

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ آیہ ۱۸۶ کے ذیل میں رجوع کریں۔

ہٹ دھرمیاں، ان کے جھوٹ، ان کی خرافات اور سرکشیاں کتنی بے کار اور فضول ہیں لیکن وہ جلد ہی اپنے کارِ بد کا انجام دیکھ لیں گے (وابصرھم فسوف یبصرون)۔

وہ بہت جلد اسی دنیا میں تیری اور مومنین کی کامیابی اور اپنی ذلت آمیز شکست اور دوسرے جہان میں خدا کا عذاب دیکھیں گے۔

اور چونکہ یہ بے شرم سرکش یہی کہتے رہتے تھے، کہ عذابِ الٰہی کا وہ وعدہ کیا ہوا، اور اگر تو سچ کہتا ہے تو پھر دیر کیوں کر رہا ہے؟ تو قرآن تہدید آمیز لہجے میں ان کے جواب میں کہتا ہے: کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں؟ کبھی کہتے ہیں "متٰی ھٰذا الوعد (یہ وعدہ الٰہی کب پورا ہوگا) اور کبھی یہ کہتے ہیں" متٰی ھٰذا الفتح " (یہ کامیابی کب حاصل ہوگی) - افبعذابنا یستعجلون)۔

لیکن جب ہمارا عذاب ان کے گھر کے صحن میں اُترے گا اور ان کے دن تیرہ و تاریک ہو جائیں گے تو اس دن انھیں سمجھ آئے گی کہ جنھیں ڈرایا گیا تھا ان کی صبح کتنی بُری اور خطرناک ہے (فاذا نزل بساحتھم فساء صباح المنذرین)[1]۔

"ساحۃ" (گھر کا صحن اور گھروں کے اندر کی فضا) کی تعبیر اس لیے ہے تاکہ نزولِ عذاب کو ان کی زندگی کے اندر مجسم کر دیا جائے اور ان کے آرام و سکون کے مرکز کے وحشت و اضطراب کے مرکز میں بدل جانے کی نشان دہی کر دی جائے۔

"صباح المنذرین" (ڈرائے گئے لوگوں کی صبح) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس ہٹ دھرم اور ستم گر قوم پر خدا کا عذاب ـــــ بہت سی گزشتہ اقوام کی طرح ـــــ صبح کے وقت نازل ہوگا۔

یا یہ اس معنی میں ہے کہ سارے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی صبح خیر و خوبی کے ساتھ شروع ہو، لیکن ان کے سامنے بُری اور تیرہ و تار صبح ہے۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح بیداری کا وقت ہوتا ہے یہ بھی اس وقت بیدار ہوں گے کہ جب نجات کی کوئی راہ باقی نہیں رہے گی اور پانی سر سے اونچا ہو گیا ہوگا۔

---

[1] اس جملے میں کچھ محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے "فساء الصباح صباح المنذرین" (منذرین کی صبح بُری صبح ہے)

۱۷۸۔ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۙ

۱۷۹۔ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ○

۱۸۰۔ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ

۱۸۱۔ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ

۱۸۲۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۧ

ترجمہ

۱۷۸۔ ایک معین وقت تک ان سے منہ پھیرلے۔

۱۷۹۔ اور ان کے کام کی حالت کو دیکھ، وہ بھی جلد ہی (اپنے اعمال کا نتیجہ) دیکھ لیں گے۔

۱۸۰۔ تیرا پروردگار، پروردگارِ عزت وقدرت ان توصیفوں سے جو وہ کرتے ہیں، پاک ومنزہ ہے۔

۱۸۱۔ اور سلام ہے رسولوں پر

۱۸۲۔ اور حمد وستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے جو عالمین کا پروردگار ہے

تفسیر

ان کا اعتناء نہ کر!

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آخری آیات پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کی دلجوئی کے لیے ایک وسیلہ وذریعہ میں اور ہٹ دھرم کفار کے لیے ایک تہدید ہیں۔

زیر بحث دو آیتیں تو وہی ہیں جو پہلے بھی آچکی ہیں اور یہاں پر تاکید کے لیے دہرائی گئی ہیں۔ تہدید آمیز لہجے میں فرمایا گیا ہے: ان سے منہ پھیرلے اور انھیں ایک مدت معین تک ان کی حالت پر چھوڑ دے (و تولّ عنھم حتّٰی حین)۔

ان کی ہٹ دھرمی، انحراف اور تکذیب وانکار کو دیکھ، وہ بھی جلد ہی اپنے کام کے نتیجہ کو دیکھ لیں گے (و ابصر فسوف یبصرون)۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ تکرار تاکید کے لیے ہے تاکہ وہ یہ بات جان لیں کہ یہ ایک قطعی مسئلہ ہے کہ وہ جلد ہی

اپنی سزا، شکست اور ناکامی کو دیکھ لیں گے اور اپنے اعمال کے تلخ نتائج میں گرفتار ہوں گے اور مومنین کی کامیابی قطعی اور مسلّم ہے۔

یا یہ اس بنا پر ہے کہ پہلے تو انھیں دنیاوی سزا اور عذاب کی تہدید کی گئی ہے اور دوسری مرتبہ آخرت میں خدائی سزا و عذاب کی دھمکی ہے۔

اس کے بعد سورہ کو "خداوند تعالیٰ"، "پیغمبروں" اور "عالمین" کے بارے میں تین پُرمعنی جملوں کے ساتھ ختم کیا گیا ہے۔

فرمایا گیا ہے: تیرا پروردگار، پروردگارِ عزت وقدرت ان بے بنیاد توصیفوں سے، جو جاہل و مشرک لوگ کرتے ہیں، پاک و منزہ ہے (سبحان ربك رب العزة عما یصفون)۔

کبھی فرشتوں کو اس کی بیٹیاں کہتے ہیں، کبھی اس کے اور جنوں کے درمیان رشتہ داری جوڑتے ہیں اور کبھی پتھروں اور لکڑی جیسی بے قدر و قیمت موجودات کو اس کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔

عزت (مطلق و شکست ناپذیر قدرت) حقیقت میں ان تمام خیالی معبودوں پر خطِ بُطلان کھینچنے کے معنی میں ہے۔

اس سورہ کی آیات میں کبھی "عباد الله المخلصین" کی تسبیح و تنزیہ کا ذکر ہے اور کبھی فرشتوں کی تسبیح کا تذکرہ اور یہاں خود خدا کی ذاتِ پاک کے بارے میں خدا کی تسبیح و تنزیہ کا ذکر ہے۔

دوسرے جملے میں اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کے لیے اپنے بے پایاں لطف و کرم کا اظہار فرماتے ہوئے کہتا ہے، تمام رسولوں پر سلام ہو (وسلام علی المرسلین)۔

وہ سلام جو قیامت کے دن ہر قسم کے عذاب و سزا سے سلامتی و عافیت کی نشانی ہے۔ وہ سلام جو شکستوں کے مقابلہ میں امان اور دشمنوں پر کامیابی کی دلیل ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس سورہ کی آیات میں بہت سے پیغمبروں پر الگ الگ سلام بھیجا گیا ہے۔ آیہ ۷۹ میں فرمایا گیا ہے:۔

سلام علی نوح فی العالمین

اور آیہ ۱۰۹ میں فرمایا گیا ہے:

سلام علی ابراهیم

اور آیہ ۱۲۰ میں ہے:۔

سلام علی موسٰی وهارون

اور آیہ ۱۳۰ میں ہے:۔

سلام علیٰ ال یاسین

لیکن یہاں پر ان تمام سلاموں اور ان کے علاوہ دوسروں کو ایک ہی جملے میں خلاصہ کرکے اور یکجا طور پر فرمایا گیا ہے: سب رسولوں پر سلام۔

اور بالآخر گفتگو کے آخری جملے کو حمد الٰہی پر ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: حمد وستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے جو عالمین کا پروردگار ہے (والحمد للّٰہ رب العالمین)۔

آخری تین آیات ہوسکتا ہے اس سُورہ کے تمام مسائل پر ایک اجمالی نظر اور اشارہ ہو۔ کیونکہ اس سورہ کا اہم حصّہ توحید اور شرک کی مختلف اقسام سے مقابلے کے سلسلہ میں تھا اور پہلی آیت سب مشرکین کی تمام توصیفوں سے خدا کی تسبیح وتنزیہ کر رہی ہے۔

اس سورہ کا دوسرا حصّہ سات عظیم پیغمبروں کے حالات کے کچھ گوشوں کا بیان تھا، دوسری آیہ انھیں کی طرف اشارہ ہے۔

اور آخر میں تیسرا حصّہ خدا کی نعتوں خصوصاً بہشت کی طرح طرح کی نعتوں اور خدا کے لشکروں کی کفر کے لشکر پر کامیابی کے بارے میں تھا۔ لہٰذا آخر میں خدا کی حمد وستائش ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔

بعض مفسّرین نے اس سورہ کی ان آخری تین آیات کی ایک اور تحلیل کی ہے، جو یہ ہے:۔

اہم ترین مسائل جو انسان کو اپنی طرف متوجہ رکھتے ہیں، وہ تین چیزوں کی معرفت ہے۔ پہلی چیز بشر کی طاقت کے مطابق خداوند عالم کی معرفت اور آخری کام جو انسان اس سلسلے میں انجام دے سکتا ہے، وہ تین امر ہیں:۔

۱۔ ان چیزوں سے پاک ومنزہ جاننا جو اس کے مقام کے لائق نہیں ہیں۔ یہ مفہوم "سُبحان" کے لفظ میں موجود ہے اور اس کی تمام صفاتِ کمال کے ساتھ توصیف جس کی طرف لفظِ "رب" میں اشارہ ہوا ہے جو خدا کی حکمت ورحمت اور موجودات کی مالکیت وپرورش کی دلیل ہے۔

اور ہر قسم کے شریک ونظیر سے منزہ ہونا، اس کا مفہوم "عمّا یصفون" کے جملہ میں آیا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ انسانوں کی زندگی میں نقائص کو دور کرنا ہے جو خدائی رہبروں اور آسمانی ہادیوں کے بغیر ممکن نہیں ہے اور "سلام علی المرسلین" کا جملہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

تیسرا اہم مسئلہ انسانی زندگی کا یہ ہے کہ وہ یہ جانے کہ مرنے کے بعد اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہاں پر "رب العالمین" کی نعتوں کی طرف توجہ اور اس کا مقام غنا اور رحمت ولطف، انسان کو آرام وسکون بخشتا ہے۔ والحمد للّٰہ رب العالمین [1]

---

[1] تفسیر کبیر، فخر رازی، جلد ۲۶ ص ۱۷۳

ہر کام کے آخر میں سوچنے کی بات

متعدد روایات میں جو پیغمبر گرامی اسلامؐ، امیرالمومنینؑ اور امام باقرؑ سے منقول ہوئی ہیں، یہ آیا ہے:

من اراد ان یکتال بالمکیال الاوفی (من الاجر یوم القیامة) فلیکن اٰخر کلامه فی مجلسه سبحان ربك رب العزة عمّا یصفون وسلام علی المرسلین والحمد لله رب العالمین

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ قیامت کے دن اس کو اجر بڑے اور کامل پیمانہ سے دیا جائے گا تو وہ جس مجلس میں بھی بیٹھے اس کی آخری گفتگو یہ ہونی چاہیے "سبحان ربك رب العزة عمّا یصفون وسلام علی المرسلین والحمد لله رب العالمین"[1]

ہاں! اپنی مجلس کو ذاتِ خدا کی تنزیہ اور اس کے پیغمبروں پر درود بھیجنے اور پروردگار کی نعمتوں پر حمد و شکر کے ساتھ ختم کرنا چاہیے، تاکہ اگر اس مجلس میں اس سے کوئی غلط کام یا ناروا گفتگو سرزد ہوگئی ہو تو اس کی تلافی ہوجائے۔

کتاب توحید صدوق میں اس طرح آیا ہے کہ:

شام کا ایک عالم امام باقرؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں سوال کرنے آیا ہوں، جس کے متعلق اب تک کسی نے میرے لیے درست وضاحت نہیں کی۔ میں نے تین گروہوں سے سوال کیا ہے اور ہر کسی نے دوسرے کے برخلاف جواب دیا ہے۔"

امام باقرؑ نے فرمایا: "تیرا مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے عرض کیا: میرا سوال یہ ہے کہ پہلی چیز جو خداوند تعالیٰ نے خلق فرمائی تھی وہ کیا تھی؟ بعض نے تو مجھے یہ جواب دیا ہے کہ وہ "قدرت" تھی اور بعض نے کہا "علم" تھا اور بعض نے کہا "روح" تھی۔

آپؑ نے فرمایا:۔

کسی نے بھی تجھے صحیح جواب نہیں دیا۔ اب میں تجھے بتاتا ہوں کہ ابتداء میں خدا تھا اور اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ قادر و عزیز تھا اور ابھی عزت پیدا نہیں ہوئی تھی (وہ اپنی ذات پاک میں قدرت بھی رکھتا تھا اور علم بھی بغیر اس کے کہ علم و قدرت کی آفرینش کا محتاج ہو) پھر مزید فرمایا: یہ وہی چیز ہے کہ جو خدا فرماتا ہے "سبحان ربك رب العزة عمّا یصفون"[2]

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں، اصول کافی اور "من لا یحضره الفقیه" (تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۰ کے مطابق)

[2] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۴۴۰

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ادھر ادھر لوگوں نے جو تجھ سے باتیں کی ہیں وہ شرک آلود باتیں ہیں کہ جن کا جواب اس آیت میں موجود ہے۔ یعنی خدا ازل سے ہی قادر و عالم و عزیز ہے۔

پروردگارا! تو نے خود وعدہ کیا ہے کہ اپنے رسولوں کی مدد اور اپنے لشکروں کو کامیاب کرے گا۔ ہمیں رسولوں کا پیرو اور اپنے لشکروں میں قرار دے اور ہمیں ان خونخوار دشمنوں پر کامیاب فرما کہ جو عالم کے مشرق و مغرب سے قرآن کے نور کو خاموش کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

بارِ الٰہا! ہمیں ہر قسم کے شرک میں آلودہ ہونے سے اور توحید کے راستے سے انحراف کرنے سے محفوظ فرما۔

خداوندا! جو مشکلات انبیاء مرسل کو تاریخ میں شرک و کفر کے لشکر کے مقابلے میں در پیش تھیں وہی اس وقت ہمارے اسلامی معاشرے کے سامنے پیدا ہو چکی ہیں۔ وہی سلام جو پیغمبران مرسل کی سلامتی کا باعث تھا ان معرکوں میں ہمارے شاملِ حال فرما۔

آمین یا رب العالمین

سورۂ صافات کا اختتام

جمعہ ۲۲ ماہ مبارک رمضان ۱۴۰۴ھ

(اول تیر ماہ ۱۳۶۲ھ)

سورۂ صٓ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اس کی ۸۸ آیات ہیں

سورۂ "صٓ" کے مضامین

یہ سورہ حقیقت میں سورہ "صافات" کے مضامین ہی کا تسلسل اور تتمہ ہے اور اس کے مطالب کی بندش سورہ صافات کی جملہ بندی سے بہت زیادہ مشابہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ سورہ مکی ہے۔ اس لیے ان سورتوں کی تمام خصوصیات یعنی مبدأ و معاد اور پیغمبر اسلامؐ کی رسالت کے بارے میں بحث کی حامل ہے۔ بعض دیگر مطالب کا اضافہ کرکے راہِ حق کے تمام متلاشیوں کے لیے یہ سورہ راہنمائی مہیا کرتی ہے۔

اس سورہ کے مطالب و مضامین کا پانچ حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ: اس میں مسئلہ توحید کے لیے اور شرک کے خلاف جدوجہد کا ذکر ہے اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے اور ان دونوں امور کے مقابلے میں مشرک دشمنوں کی سختی اور ہٹ دھرمی سے متعلق گفتگو ہے۔

دوسرا حصہ: اس میں خدا کے نو پیغمبروں کی تاریخ کے کچھ گوشوں کو منعکس کیا گیا ہے۔ خصوصیت سے حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت ایوبؑ کے بارے میں زیادہ گفتگو ہے۔ ان کی زندگی اور خدا کی طرف دعوت کے سلسلہ میں ان کی مشکلات کو بیان کیا گیا ہے تاکہ شروع شروع میں ایمان لانے والے لوگوں کے لیے ایک اصلاحی اور تربیتی درس ہو جو اس وقت انتہائی شدید دباؤ میں تھے۔

تیسرا حصہ: اس میں قیامت میں سرکش کفار کی سرنوشت اور دوزخ میں ان کے آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے بارے میں گفتگو ہے اور مشرکین اور بے ایمان افراد کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا؟

چوتھا حصہ: اس میں انسان کی خلقت، اس کے بلند مقام اور آدمؑ کے لیے ملائکہ کے سجدے کے بارے میں گفتگو ہے اور اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ انسان کی بلندی اور پستی کے درمیان کتنا عظیم فاصلہ ہے تاکہ یہ بے خبر دل کے اندھے، اپنی حقیقت اور قدر و قیمت کو پہچانیں اور اپنے انحرافی طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کریں اور شیاطین کے زمرے سے باہر نکل آئیں۔

پانچواں حصہ: اس میں تمام ہٹ دھرم دشمنوں کے لیے ایک تہدید ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے لیے تسلی خاطر ہے۔ نیز اس میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ آپؐ اپنی دعوت میں کسی قسم کی اُجرت اور مزدوری طلب نہیں کرتے، اور کسی کے لیے کوئی درد و رنج نہیں چاہتے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

یہ سورہ جو اپنی ابتداء کی وجہ سے سورہ "ص" کے نام سے موسوم ہے، پیغمبر گرامی اسلامؐ سے اس کی فضیلت کے بارے میں ایک روایت میں آیا ہے:۔

من قرء سورة "ص" اعطى من الاجر بوزن كل جبل سخره الله لداؤد حسنات وعصمه الله ان يصر على ذنب صغيرًا او كبيرًا

جو شخص سورہ "ص" پڑھے گا، ہر اس پہاڑ کے مطابق کہ جو خدا نے داؤدؑ کے لیے مسخر کیا تھا، اسے نیکی عطا کرے گا اور صغیرہ و کبیرہ گناہ سے آلودہ ہونے اور اس پر اصرار کرنے سے اسے محفوظ رکھیگا[1]

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے مروی ہے:۔

من قرء سورة "ص" فى ليلة الجمعة اعطى من خير الدنيا و الأخرة مالم يعط احد من الناس الا نبى مرسل او ملك مقرب، و ادخله الله الجنة و كل من احب من اهل بيته حتى خادمه الذى يخدمه

جو شخص سورہ "ص" شب جمعہ میں پڑھے گا (خدا کی طرف سے) خیر دنیا و آخرت میں سے اس قدر اسے دیا جائے گا کہ پیغمبران مرسل اور مقرب فرشتوں کے سوا اور کسی کو نہیں دیا جائے گا اور خدا اسے اور ان تمام افراد کو جو اس کے گھر والوں میں سے اس سے تعلق رکھتے تھے، جنت میں داخل کرے گا۔ یہاں تک کہ اس خدمت گار کو بھی جو اس کی خدمت کرتا تھا[2]

جس وقت ہم اس سورہ کے مضامین و مطالب کو اس اجر کے ساتھ رکھتے ہیں تو اس اجر کا ان تعلیمات کے ساتھ ربط و تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ پھر اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ اس سے مراد خشک و بے روح تلاوت نہیں ہے بلکہ وہ تلاوت ہے جو فکر انگیز ہو۔ ایسی فکر جو عمل پر اُبھارے اور سورہ کے مضامین و مطالب کو انسان کی زندگی میں عملی شکل دے۔

---

[1] مجمع البیان، آغاز سورۂ ص جلد ۸ ص ۴۶۲

[2] ایضاً

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ صٓ وَالۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ○

۲۔ بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ ○

۳۔ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوۡا وَّ لَاتَ حِیۡنَ مَنَاصٍ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ ص۔ قسم ہے اس قرآن کی جس میں ذکر ہے (کہ یہ کتاب خدائی معجزہ ہے)۔

۲۔ لیکن کافر غرور اور اختلاف میں گرفتار ہیں۔

۳۔ ہم نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے وہ (لوگ) نزولِ عذاب کے وقت داد و فریاد کرتے تھے لیکن نجات کا وقت گزر چکا تھا۔

شانِ نزول

تفسیر و حدیث کی کتابوں میں اس سورہ کی ابتدائی آیات کے بارے میں کئی ایک ملتی جلتی شانِ نزول بیان ہوئی ہیں۔ ہم ان میں سے ایک جو زیادہ مشرح اور جامع ہے، یہاں پر پیش کرتے ہیں اور یہ وہ حدیث ہے جو مرحوم کلینی نے امام باقرؑ سے نقل کی ہے۔

ابوجہل اور قریش کی ایک جماعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابوطالب کے پاس آئی اور کہا: تمھارے بھتیجے نے ہمیں بہت تکلیف پہنچائی ہے اور ہمارے خداؤں کو بھی ناراض کیا ہے۔ اسے بلاؤ اور حکم دو کہ وہ ہمارے خداؤں کو کچھ نہ کہا کرے تاکہ ہم بھی اس کے خدا کو برا نہ کہیں۔

جناب ابوطالب نے کسی کو پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں بھیجا۔ جب پیغمبر گرامیؐ گھر میں داخل ہوئے اور کمرے کے اطراف میں نگاہ کی تو دیکھا کہ مشرکین کے علاوہ ابوطالب کے پاس اور کوئی نہیں ہے، تو آپؐ نے فرمایا: "السلام علی من اتبع الھدیٰ" (سلام ان پر جو ہدایت کے پیرو ہیں)۔

پھر آپؐ بیٹھ گئے تو پیغمبر اکرمؐ سے حضرت ابوطالب نے ان کی باتیں بیان کیں، پیغمبر اکرمؐ نے جواب میں فرمایا:

او ھل لھم فی کلمۃ خیر لھم یسودون بھا العرب و یطاؤن اعناقھم

کیا یہ اس بات کے لیے تیار ہیں کہ ایک جملے میں مجھ سے موافقت کریں اور اس کے سائے میں تمام

عرب پر سبقت حاصل کریں اور ان پر حکومت کریں۔

ابوجہل (اس بات سے وجد میں آگیا، اس نے سوچا کہ عربوں پر حکومت کرنے کی چابی پیغمبر کے ہاتھ سے لے لے): کہنے لگا ہاں ہم موافق ہیں، آپ کی مراد کون سا جملہ ہے؟

جناب پیغمبرؐ نے فرمایا:

تقولون لا الٰه الا الله

تم یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے (اور ان بتوں کو جو تمھاری بدبختی، ننگ و عار اور پس ماندگی کا سبب ہیں دور پھینک دو)۔

جس وقت حاضرین نے یہ جملہ سنا تو اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں، اور تیزی کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے یہ کہتے جاتے تھے، ایسی بات تو ہم نے اب تک نہیں سنی تھی، یہ تو ایک جھوٹ ہے۔

اس موقع پر سورہ "ص" کے آغاز کی آیات نازل ہوئیں[1]

تفسیر

تمھاری نجات کا وقت گزر چکا ہے

اس سورہ کی پہلی آیت میں پھر ایک مرتبہ حروفِ مقطعات میں سے ایک حرف "ص" سے ہمارا سامنا ہے اور یہاں بھی وہی گزشتہ باتیں پیش آئیں گی کہ کیا یہ قرآن مجید کی عظمت کی طرف اشارہ ہے کہ جو "الف" "و" "با" جیسے سادہ حروف سے تشکیل پایا ہے مگر اس کے مضامین و مطالب ایسے ہیں جو عالم انسانیت کو منقلب کر دیتے ہیں اور یہ خدا کی عجیب و غریب قدرت نمائی ہے کہ اس نے اس سادہ سے مواد سے ایسی عجیب و غریب ترکیب کو وجود بخشا۔

یا یہ ان کے اسرار و رموز کی طرف اشارہ ہے جو خدا اور اس کے پیغمبر گرامیؐ کے درمیان ہے اور ایک آشنا اور دوست کا دوسرے آشنا کی طرف کوئی پیغام ہے۔

یا پھر دوسری تفاسیر۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں خصوصیت کے ساتھ "ص" کو "اسماء الٰہی" یا دوسری باتوں کے لیے ایک اختصاری علامت قرار دیا ہے۔ کیونکہ بہت سے اسماء الٰہی "ص" سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً صادق، صمد، صانع یا یہ "صدق اللہ" کے جملہ کی طرف اشارہ ہے جسے ایک ہی حرف میں بطور خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

حروفِ مقطعات کی تفسیر کے سلسلے میں مزید تشریح سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور اعراف کی ابتداء میں (پہلی، دوسری اور چوتھی

---

[1] اصولِ کافی۔ (نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۱ کی نقل کے مطابق)

جلدمیں) ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: قسم ہے اس قرآن کی جو ذکر کا حامل ہے کہ تو حق پر ہے اور یہ کتاب خدائی معجزہ ہے۔
(والقرآن ذی الذکر)[1]

قرآن خود بھی ذکر ہے اور ذکر کا حامل بھی ہے۔ ذکر کا معنی ہے یاد آوری اور صفحۂ دل سے غفلت کے زنگ کو دور کرنا، خدا کی یاد، اس کی نعمتوں کی یاد، قیامت کی عظیم عدالت کی یاد، اور خلقتِ انسان کے مقصد کی یاد۔

ہاں! انسانوں کی بدبختی کا اہم سبب غفلت ہے اور قرآن مجید اسے زائل کرتا ہے۔

قرآن منافقین کے بارے میں کہتا ہے:

نسوا اللّٰہ فنسیھم

انھوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے بھی انھیں فراموش کردیا۔ (اور اپنی رحمت ان سے منقطع کرلی)

(توبہ ـــــ ۶۷)

اسی سورہ (صٓ) کی آیہ ۲۶ میں گمراہوں کے بارے میں بیان ہوا ہے۔

ان الذین یضلون عن سبیل اللّٰہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب

جو لوگ خدا کی راہ سے گمراہ ہوجاتے ہیں چونکہ انھوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے لہٰذا وہ عذابِ شدید میں مبتلا ہوں گے۔

ہاں! گمراہوں اور گنہ گاروں کے لیے سب سے بڑی مصیبت فراموشی ہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود کو اور اپنی ہستی کی قدر و قیمت کو بھی بھول جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ولا تکونوا کالذین نسوا اللّٰہ فانساھم انفسھم اولٰئک ھم الفاسقون

تم ان لوگوں کے مانند نہ ہوجانا جنھوں نے خدا کو بھلا دیا ہے، خدا نے انھیں خود اپنے آپ کو بھی بھلا دیا ہے۔ وہ فاسق ہیں۔ (حشر ـــــ ۱۹)

اور قرآن انھی نسیان کے پردوں کو چاک کرنے کا وسیلہ اور غفلت کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے نور اور روشنی ہے۔ اس کی آیات انسان کو خدا اور قیامت کی یاد دلاتی ہیں۔ اور اس کے جملے انسان کو اپنے وجود کی قدر و منزلت سے آشنا کرتے ہیں۔

---

[1] "والقرآن ذی الذکر" کا جملہ قسمیہ ہے جس کا جواب محذوف ہے اور اس کی تقدیر انھوں نے اس طرح ذکر کی ہے۔
والقرآن ذی الذکر انک صادق و ان ھٰذا الکلام معجز
تو سچا ہے اور یہ کلام معجزہ ہے

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: اگر تو یہ دیکھتا ہے کہ وہ ان شفا بخش آیات اور بیدار کرنے والے قرآن کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کلام حق پر کوئی پردہ پڑا ہوا ہے بلکہ یہ کفار تکبر و غرور میں گرفتار ہیں۔ جس نے انھیں حق کو قبول کرنے سے باز رکھا ہوا ہے اور عداوت وعصیان انھیں تیری دعوت قبول کرنے سے روکے ہوئے ہے (بل الذین کفروا فی عزّة و شقاق)۔

"عزّة" "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق ایک حالت ہے جو انسان کو مغلوب ہونے سے روکتی ہے، (شکست ناپذیری کی حالت) اور اصل میں یہ لفظ "عزاز" سے لیا گیا ہے جو سخت محکم اور نفوذ ناپذیر سرزمین کے معنی میں ہے اور یہ دو قسم کی ہوتی ہے کبھی "عزت ممدوح" اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم ذات پاک الٰہی کی "عزیز" کے ساتھ توصیف کرتے ہیں اور کبھی "عزت مذموم" ہوتی ہے، اور وہ حق کے مقابلے میں نفوذ ناپذیری اور حقیقتوں کو قبول کرنے سے تکبر کرنا ہوتا ہے اور یہ عزت درحقیقت ذلت ہے۔

"شقاق" دراصل "شق" کے مادہ سے "شگاف" کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں اختلاف کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا کیونکہ اختلاف اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ ہر گروہ ایک "شق" میں قرار پائے۔

قرآن نے یہاں نفوذ پذیری، کبر و غرور، جدائی اور اختلاف و تفرقہ کو کفار کی بدبختی کا عامل شمار کیا ہے۔ ہاں یہ قبیح صفات ہی ہیں جو انسان کی آنکھ اور کان پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور حسِ تشخیص انسان سے چھین لیتی ہیں اور کتنی دردناک بات ہے کہ انسان کی آنکھیں بھی کھلی ہوں اور کان بھی کھلے ہوں لیکن پھر بھی وہ اندھا اور بہرہ ہو۔

سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۰۶ میں ہے:

> و اذا قیل له اتق الله اخذته العزّة بالاثم فحسبه جهنم و لبئس المهاد
>
> جس وقت اس (منافق) کو کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو تو ہٹ دھرمی، غضب اور غرور اس کو پکڑ لیتے ہیں اور گناہ کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ جہنم کی آگ اس کے لیے کافی ہے اور کتنی بری جگہ ہے وہ؟

اس کے بعد قرآن ان غافل مغروروں کو بیدار کرنے کے لیے ان کا ہاتھ پکڑ کر بشر کی گزشتہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے اور مغرور و متکبر اور ہٹ دھرم اقوام کا انجام انھیں دکھاتا ہے کہ شاید وہ عبرت حاصل کر لیں۔ کہتا ہے: ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنھیں ہم نے (پیغمبروں کو جھٹلانے، آیاتِ الٰہی کا انکار کرنے اور ظلم و گناہ کی بنا پر) ہلاک کر دیا (کم اهلکنا من قبلهم من قرن)۔ اور نزولِ عذاب کے وقت ان کی فریاد بلند ہوئی لیکن کیا فائدہ؟ کیونکہ اب دیر ہو چکی تھی اور نجات کا وقت گزر چکا تھا

(فنادوا و لات حین مناص)۔

وہ دن جس کے لیے خدا کے پیغمبروں اور اولیاء حق نے انھیں وعظ و نصیحت کی تھی اور ان کے اعمال کے برے انجام سے انھیں ڈرایا تھا، نہ صرف یہ کہ وہ سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے بلکہ مومنین کا مذاق اڑاتے، انھیں آزار پہنچاتے، یہاں تک کہ انھیں قتل

کر دیتے تھے ۔ مہلت ہاتھ سے نکل گئی اور واپسی کے راستے تباہ ہو گئے اور عذاب استیصال ان کی نابودی کے لیے نازل ہو گیا ۔ کیونکہ توبہ و بازگشت کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے لہٰذا ان کی فریادیں کسی جگہ تک نہ پہنچیں ۔

لفظ " لات " نفی کے لیے ہے اور اصل میں " لا " نافیہ تھا اور " تاء تانیث " بڑھایا گیا ہے[1]

" مناص " " نوص " کے مادہ سے پناہ گاہ اور فریاد رس کے معنی میں ہے ۔ کہتے ہیں کہ جب کبھی عربوں کو کوئی سخت وحشتناک حادثہ پیش آ جاتا تھا ، خصوصاً جنگوں میں تو وہ بار بار یہ کلمہ دہراتے تھے " مناص ، مناص " یعنی پناہ گاہ کہاں ہے ، پناہ گاہ کہاں ہے ؟ اور چونکہ یہ مفہوم فرار کے ہم معنی ہے لہٰذا کبھی جائے فرار کے معنی میں آتا ہے[2]

بہرحال ان مغرور غافلوں کے پاس جب تک مہلت تھی کہ لطف خدا کی محبت بھری آغوش میں پناہ لیں ، اس وقت تک انھوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا لیکن جب ساری مہلتیں ہاتھ سے نکل گئیں اور عذاب استیصال نازل ہو گیا تو پھر یہ فریادیں اور راہِ فرار اور پناہ گاہ ڈھونڈنے کی کوشش کوئی فائدہ نہیں دیتی ۔

گزشتہ تمام اقوام کے لیے پروردگار کی یہی سنت رہی ہے اور آئندہ بھی یہی سنت جاری رہے گی کیونکہ اس کی سنت کے لیے کوئی تغیر نہیں ہے ۔

افسوس کہ بہت سے لوگ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے وہ تلخ تجربوں کو پھر آزمانا چاہتے ہیں ۔ وہ تجربات جو انسان کی تمام عمر میں صرف ایک ہی بار پیش آتے ہیں اور دوسری مرتبہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ، یعنی جن کا اول و آخر ایک ہی ہوتا ہے ۔

---

[1] بعض نے " تاء " کو " زائدہ " اور مبالغہ کے لیے بھی جانا ہے (مثلاً علامہ طباطبائی) جیسا کہ بعض نے یہاں " لا " کو " نفی جنس " کے لیے سمجھا ہے اور بعض نے " مشبہ بہ لیس " بہرحال " تاء " کے اس کے ساتھ اضافہ کی وجہ سے مخصوص احکام پیدا کر لیتا ہے ۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ حتمی طور پر زمانے کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ ہمیشہ اس کا اسم یا خبر محذوف ہوتی ہے اور ان میں سے صرف ایک کا کلام میں ذکر ہوتا ہے ۔ اس بنا پر " ولات حین مناص " کا جملہ تقدیر میں " ولات الحین حین مناص " تھا ۔

[2] مفردات راغب ، تفسیر فخر رازی ، روح المعانی اور کتاب مجمع البحرین مادہ " نوص " ۔

۴۔ وَعَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ٘ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝

۵۔ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝

۶۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤی اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝

۷۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝

ترجمہ

۴۔ وہ تعجب کرنے لگے کہ ان میں سے ایک ڈرانے والا پیغمبر کیسے آگیا اور کافروں نے کہا یہ تو جھوٹا جادوگر ہے۔

۵۔ کیا اس نے اتنے خداؤں کے بجائے ایک ہی خدا قرار دے لیا ہے، یہ تو واقعًا ایک عجیب چیز ہے۔

۶۔ ان کے سردار باہر آئے اور کہا: جاؤ اور اپنے خداؤں کے ساتھ مضبوطی سے جم جاؤ۔ یہ تو ہمیں بدبختی کی طرف کھینچ لے جانا چاہتے ہیں۔

۷۔ ہم نے ہرگز ایسی کوئی چیز اپنے آباؤ اجداد سے نہیں سُنی ہے، یہ تو بس جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔

شانِ نزول

ان آیات کے بارے میں بھی، گزشتہ آیات کے لیے بیان کردہ شانِ نزول سے ملتی جلتی ایک شانِ نزول بیان کی گئی ہے۔ یہ بھی بعید نہیں ہے کہ ان ساری آیات کے لیے مجموعی طور پر ایک ہی شانِ نزول ہو۔

لیکن چونکہ اس شانِ نزول میں کچھ نئے مطالب بیان ہوئے ہیں لہٰذا ہم اسے تفسیر علی بن ابراہیم سے یہاں پر پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ:

جس وقت رسولِ خدا نے اپنی دعوت کو آشکار فرمایا تو قریش کے سردار حضرت ابوطالب کے پاس آئے اور کہا: اے ابوطالب! آپ کا بھتیجا ہمیں بے عقل کہتا ہے اور ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے۔ اس نے ہمارے جوانوں کو خراب کر دیا ہے اور ہماری اجتماعیت میں

تفرقہ ڈال دیا ہے اگر یہ کام مال کی کمی کی وجہ سے کر رہا ہے تو ہم اس کے لیے اس قدر مال اکٹھا کر دیتے ہیں کہ وہ قریش میں سب سے زیادہ مالدار بن جائے۔ یہاں تک کہ ہم اسے اپنا سردار و حاکم بنانے کے لیے بھی تیار ہیں۔

ابو طالب نے یہ پیغام پیغمبر خدا کی خدمت میں پہنچایا۔ پیغمبر گرامیؐ نے فرمایا:

لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری ما اردته، ولکن کلمة یعطونی یملکون بها العرب و تدین بها العجم ویکونون ملوکًا فی الجنة

"اگر وہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو بھی میں اس کی طرف مائل نہیں ہوں گا۔ لیکن (ان تمام وعدوں کے بجائے) ایک جملہ میں میری موافقت کریں تو وہ اس کے سایے میں عرب پر بھی حکومت کریں گے اور غیر عرب بھی ان کے دین میں داخل ہو جائیں گے اور وہ جنت کے بادشاہ بن جائیں گے۔

ابو طالب نے یہ پیغام انھیں پہنچایا تو انھوں نے کہا:

اُس کے لیے تو ہم ایک جملے کی بجائے دس جملے قبول کرنے کو تیار ہیں۔ (تم کون سا جملہ کہلوانا چاہتے ہو؟"

پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا:

تشهدون ان لا اله الا الله و انی رسول الله

تم یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں خدا کا رسول ہوں۔

(وہ اس گفتگو سے بہت دہشت زدہ ہو گئے اور) انھوں نے کہا:

"کیا ہم ۳۶۰ خداؤں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کو مان لیں، یہ کتنی عجیب بات ہے؟ (وہ بھی ایسا خدا جو دکھائی نہیں دیتا)"

اس موقع پر ذیل کی آیات نازل ہوئیں:

وعجبوا ان جاءهم منذر منهم وقال الکافرون هٰذا ساحر کذّاب...
.... ان هٰذا الّا اختلاق[1]

یہی معنی مجمع البیان میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل ہوا ہے اور اس کے آخر میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے روتے ہوئے فرمایا:

اے چچا! اگر یہ سورج میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تاکہ میں اپنی اس بات سے

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۲ (حدیث ۷) کے مطابق

دست بردار ہو جاؤں، تو بھی میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ میں اس بات کو معاشرے میں نافذ و رائج کر کے رہوں گا یا اس کی راہ میں قتل ہو جاؤں گا۔

جس وقت حضرت ابوطالب نے یہ بات سنی تو فرمایا:

"آپ اپنے پروگرام کو جاری رکھیں، خدا کی قسم میں ہرگز آپ کی نصرت سے دستبردار نہیں ہوں گا"[1]

تفسیر

بہت سے خداؤں کے بجائے ایک خدا

مغرور و سرکش لوگ نہ تو کوئی اثر قبول کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے مؤقف سے ہٹتے ہیں۔ جس چیز کو انھوں نے اپنے محدود اور ناقص افکار کے ذریعے اپنا لیا ہے، اس کے سوا کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتے، اور تمام قدروں کے ناپ تول کا معیار اسی کو قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا جب پیغمبر اسلامؐ نے مکہ میں توحید کا پرچم بلند کیا اور چھوٹے بڑے سارے بتوں کے خلاف کہ جن کی تعداد ۳۶۰ تھی، قیام کیا تو کبھی تو وہ اس بات پر تعجب کرتے کہ انھیں کے درمیان سے ایک انذار کرنے والا پیغمبر کیوں مبعوث کیا گیا؟" (وعجبوا ان جاءھم منذر منھم)۔

ان کا تعجب اس بات پر تھا کہ محمدؐ انھی میں سے ایک فرد ہیں۔

کوئی فرشتہ آسمان سے کیوں نازل نہیں ہوا؟ وہ اس عظیم نقطۂ قوت کو، نقطۂ ضعف خیال کرتے تھے۔ جو شخص عوام الناس میں سے مبعوث کیا گیا ہے وہ ان کی حاجات، ضروریات اور دکھ درد سے واقف تھا اور ان کی مشکلات اور مسائل سے آشنا تھا۔ وہ تمام باتوں میں نمونہ اور مثال بن سکتا تھا۔ وہ اس عظیم امتیاز کو پیغمبر کی دعوت میں ایک تاریک نقطہ خیال کرتے تھے اور اس پر تعجب کرتے تھے۔

کبھی اس مرحلے سے بھی آگے بڑھ جاتے، یہاں تک کہ کافروں نے کہا، یہ تو ایک جھوٹا جادوگر ہے (وقال الکافرون ھٰذا ساحر کذّاب)۔

ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی طرف جادو کی نسبت دینا اس وجہ سے تھا کیونکہ وہ آپ کے ناقابلِ انکار معجزات اور افکار میں غیر معمولی نفوذ کا مشاہدہ کرتے تھے اور آپؐ کی طرف جھوٹ کی نسبت اس بنا پر دیتے تھے کیونکہ آپؐ نے اس ماحول میں مسلّمہ شمار ہونے والی بے ہودہ رسوم اور پست افکار کے خلاف قیام کیا تھا اور اس کے خلاف بات کرتے تھے۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۸ ص ۶۵

اور خدا کی طرف سے رسالت کا دعویٰ رکھتے تھے۔

جس وقت پیغمبر اکرمؐ نے اپنی توحیدی دعوت کو آشکار کیا تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہتے تھے: آؤ! ان نئی باتیں سنو: "کیا اس نے ان سب خداؤں کے بجائے ایک ہی خدا قرار دے لیا ہے؟ واقعاً یہ تو ایک عجیب بات ہے (اجعل الألهة الٰهاً واحداً ان ھذا لشیء عجاب)"[1]۔

ہاں! بعض اوقات غرور، خود خواہی، مطلق العنانی اور ماحول کی خرابی انسان کی عقل اور قوت فیصلہ کو اتنا بدل دیتی ہے کہ وہ واضح و روشن حقیقتوں پر تعجب کرنے لگتا ہے، جبکہ وہ خرافات اور بے ہودہ خیالات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتا ہے۔

لفظ "عجاب" ... طوال " (بروزن" تراب") کی طرح مبالغہ کا معنی دیتا ہے اور بہت زیادہ عجیب باتوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ کم عقل خیال کرتے تھے کہ ان کے معبودوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، ان کے نفوذ کی قدرت واعتبار بھی زیادہ ہوگی۔ اسی بنا پر ایک اکیلا خدا ان کی نگاہ میں حقیر دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ فلسفی نقطہ نظر سے متعدد چیزیں محدود ہوتی ہیں اور غیر محدود وجود ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ اسی بنا پر خداشناسی کے سلسلے میں تمام تحقیقات راہ توحید پر آکر تمام ہوتی ہیں۔

ان کے سردار جب حضرت ابوطالب کی طرف رجوع کرنے اور ان کی وساطت سے مایوس ہو گئے تو ان کے پاس سے آگئے اور کہا: جاؤ اور اپنے خداؤں کے ساتھ مضبوطی سے جم جاؤ، اور استقامت اور پائیداری سے کام لو کیونکہ محمدؐ کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کو تباہی اور بربادی کی طرف کھینچ لے جائے اور بتوں کی طرف پشت کرنے کی وجہ سے خدا کی نعمتوں کو ہم سے منقطع کرا دے اور وہ خود ہم پر حکومت کرے (وانطلق الملأ منھم ان امشوا واصبروا علی اٰلھتکم ان ھٰذا لشیء یراد)۔

"انطلق"، "انطلاق" کے مادہ سے، تیزی سے باہر نکلنے اور پہلے کام کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔ یہاں غصہ کی حالت میں ابوطالب کی مجلس کو چھوڑ کر چلے جانے کے معنی میں ہے۔

"ملأ" قریش کے اشراف اور سرداروں کی طرف اشارہ ہے، جو ابوطالب کے پاس آئے تھے اور ان کی مجلس سے باہر آنے کے بعد ایک دوسرے سے یا اپنے پیروکاروں سے کہتے تھے کہ اپنے بتوں سے دست بردار نہ ہونا اور اپنے معبودوں کے ساتھ مضبوطی سے چمٹے رہنا۔

"لشیء یراد" کا مفہوم یہ ہے کہ "یہ مسئلہ ایک ایسی چیز ہے جو چاہی گئی ہے" اور چونکہ یہ جملہ سربستہ ہے، لہٰذا مفسرین نے اس کی بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہیں:

---

[1] یہاں "جعل" سے مراد تکوینی طور پر قرار دینا نہیں، بلکہ اعتقاد کے مطابق قرار دینا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ پیغمبر گرامی اسلام کی طرف اشارہ ہے اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ دعوت ایک سازش ہے جس کا ہدف و مقصد ہم ہیں۔ اس کا ظاہر تو اللہ کی طرف دعوت دینا ہے لیکن اس کا باطن ہم پر حکومت کرنا اور عربوں کی سیادت و ریاست ہے۔ اور یہ سب اسی مطلب کے حصول کے لیے بہانے ہیں۔ تم لوگ جاؤ اور اپنے دین پر مضبوطی سے ڈٹ جاؤ اور اس سازش کا کھوج لگانا ہم سردارانِ قوم پر چھوڑ دو۔

یہ وہی چیز ہے جسے سردارانِ باطل ہمیشہ راہِ حق کے راہبر و افراد کی آواز خاموش کرنے کے لیے پیش کیا کرتے تھے۔ اسے سازش کا نام دیتے تھے، ایسی سازش جس کا ان کے نزدیک سیاست دان افراد کو ہی بڑے غور کے ساتھ پتہ لگانا ہوتا ہے اور اس سے مبارزہ کے لیے پروگرام بنانا ہوتا ہے اور عام لوگوں کو بے اعتنائی کے ساتھ اس کے قریب سے گزر جانا چاہیے اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس سے سختی کے ساتھ چپٹے رہنا چاہیے۔

اس گفتگو کی نظیر حضرت نوحؑ کی داستان میں بھی آئی ہے۔ جس میں اشراف اور بڑے لوگوں نے عوام الناس سے کہا تھا۔

ما ھذا الا بشر مثلکم یرید ان یتفضل علیکم

یہ شخص صرف تمہاری مانند ہی ایک انسان ہے۔ یہ تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔

(مومنون ــــــ ۲۴)

بعض دوسروں نے اس جملہ کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم بت پرست اپنے خداؤں کے بارے میں مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہو۔ یہی وہ چیز ہے جو تم سے چاہی گئی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ محمدؐ کا ہدف و مقصد ہم ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمارے معاشرے کو خرابی کی طرف کھینچ لے جائے۔ اور ہم اپنے خداؤں کی طرف پشت کریں۔ جس کے نتیجے میں ہم سے نعمتیں منقطع ہو جائیں اور ہم پر عذاب نازل ہو۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ محمدؐ اپنے کام سے دست بردار ہونے والا نہیں ہے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا ہے اور اس کا ارادہ تخلف ناپذیر ہے لہٰذا اس سے مذاکرات کرنا فضول سی بات ہے۔ اس لیے جاؤ اور اپنے عقائد کی مضبوطی سے حفاظت کرو۔

نیز یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی مراد یہ تھی کہ یہ ایک مصیبت ہے جو ہمیں پیش آئی ہے لہٰذا اسی حالت کے ساتھ گزارا کریں اور دکھ جھیلیں اور اپنے دین کی محکم طریقہ سے حفاظت کریں۔

البتہ اس جملہ کے مفہوم کے کلی ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے ممکن ہے ان میں سے اکثر تفسیریں اس میں جمع ہوں، اگرچہ پہلا معنی مناسب تر نظر آتا ہے۔

بہرحال بت پرستوں کے سردار یہ چاہتے تھے کہ اس گفتگو کے ذریعے اپنے پیروکاروں کے متزلزل ایمان اور جذبے کو تقویت پہنچائیں اور زیادہ سے زیادہ ان کے اعتقادات کو بدلنے سے روکیں، لیکن یہ کتنی فضول کوشش تھی؟

اس کے بعد لوگوں کو قائل رکھنے یا اپنے آپ کو قانع کرنے کے لیے انھوں نے کہا: "ہم نے تو ایسی چیز اپنے آباؤ اجداد میں کبھی نہیں سُنی۔ یہ تو نرا جھوٹ ہی جھوٹ ہے (ماسمعنا بھذا فی الملۃ الاٰخرۃ ان ھٰذا الا اختلاق)۔

اگر توحید اور بتوں کی نفی کا دعویٰ کوئی حقیقت رکھتا ہوتا تو ہمارے آباؤ اجداد کو اپنی عظمت کی وجہ سے اسے درک کر لینا چاہیے تھا۔ اور ہمیں بھی ان سے سُنے ہوئے ہونا چاہیے تھا لیکن یہ ایک جھوٹی بات ہے جس کا سابق میں کوئی نشان نہیں ملتا "الملۃ الاٰخرۃ" کی تعبیر ممکن ہے ان کے آباؤ اجداد کی جمعیت کی طرف اشارہ ہو جو ان کی نسبت آخری ملت تھے جیسا کہ ہم سطور بالا میں بیان کر آئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اہلِ کتاب خصوصاً نصاریٰ کی طرف اشارہ ہو جو پیغمبر اسلامؐ کے ظہور سے پہلے آخری دین و ملت شمار ہوتے تھے یعنی نصاریٰ کی کتابوں میں بھی محمدؐ کی باتوں کا کوئی نام و نشان نہیں کیونکہ وہ "تثلیث" (تین خداؤں) کے قائل ہیں۔ محمدؐ کی توحید تو ایک نئی ظاہر ہونے والی بات ہے۔

لیکن جیسا کہ قرآن کا لب و لہجہ دوسری مختلف آیات میں نشان دہی کرتا ہے، زمانہ جاہلیت کے عرب یہود و نصاریٰ کی کتب پر اعتقاد نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کا سب کچھ ان کے بڑوں اور آباؤ اجداد کا طریقہ اور دین تھا اور پہلی تفسیر کے لیے یہ ایک اچھا شاہد ہے۔

"اختلاق" "خلق" کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کو سابقہ کے بغیر ابداع و اظہار کرتا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ "جھوٹ" کے معنی میں بھی بولا گیا ہے، کیونکہ جھوٹ بولنے والا بہت سے مواقع پر بے سابقہ مطالب بیان کرتا ہے۔ اس بنا پر زیر بحث آیت میں "اختلاق" سے مراد یہ ہے کہ توحید کا دعویٰ ایک نئی چیز اور بے سابقہ دعویٰ ہے جو محمدؐ نے پیش کیا ہے اور یہ ہمارے اور ہم سے پہلے لوگوں کے درمیان ناشناختہ ہے اور یہ خود اس کے بطلان کی دلیل ہے۔

آئینِ نو سے ڈرنا: تاریخ میں گمراہ اقوام کے اپنے انحرافات پر اصرار کرنے اور خدا کے پیغمبروں کی دعوت کے سامنے سر نہ جھکانے کے علل و اسباب میں سے ایک تازہ اور نئے ظاہر ہونے والے مسائل کا خوف ہی رہا ہے۔ وہ ہر نئی چیز سے وحشت رکھتے تھے اور اسی بنا پر انبیاء کے دین کو بہت بُری نظر سے دیکھتے تھے۔ اب بھی بہت سی قوموں میں ایسی جاہلانہ سوچ کے اثرات پائے جاتے ہیں حالانکہ نہ تو پیغمبروں کی توحید کی طرف کوئی نئی چیز تھی اور نہ ہی اس کا نئی چیز ہونا اس کے باطل ہونے کی دلیل ہوتا۔ منطق اور دلیل کی پیروی کرنی چاہیے اور حق بات کو تسلیم کرنا چاہیے وہ جہاں کہیں بھی ہو اور جس کی طرف سے بھی ہو۔

تأسف و تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات نئی بات اور نئی تحقیق سے بعض علماء بھی وحشت کرنے لگتے ہیں اور نئے علمی نظریات کے مقابلے میں مخالفت کا علم بلند کر دیتے ہیں اور "ان ھٰذا الا اختلاق" کہنے لگتے ہیں۔

خصوصاً اربابِ کلیسا (عیسائی پادریوں) کی تاریخ میں یہ مسئلہ بہت زیادہ نظر آتا ہے کہ وہ علماء علوم طبیعی کے سائنسی انکشافات کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے تھے اور گلیلیو جیسے (علماء طبیعیات) کو زمین کے سورج کے گرد چکر لگانے اور خود اپنے گرد گردش کرنے کے انکشاف کرنے کی وجہ سے سخت ترین حملوں کا نشانہ بناتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ باتیں بدعت ہیں بے سابقہ ہیں اور جھوٹ ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض بڑے علماء بھی جب نئی علمی تحقیقات پر دسترس حاصل کرتے ہیں تو اس خوف سے کہ کہیں ان لوگوں کے حملوں کا نشانہ نہ بن جائیں جوان کے ہم عصر ہیں اور وہ اس نئی تحقیق پر تنقید کرنے لگیں، وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں کہ قدماء اور گزشتہ لوگوں میں سے چند افراد کو اپنے نئے نظریات سے ہم آہنگ ظاہر کریں اور اس طریقے سے اپنے نظریے کو ایک پرانا اور قدیمی عقیدہ بیان کریں تاکہ امن و امان میں رہ سکیں اور یہ بات بہت ہی المناک ہے۔

اس بات کا ایک نمونہ معروف "حرکت جوہری" کے نظریے کے بارے میں صدرالمتألہین شیرازی کے اسفار میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال نئے مسائل اور جدید تحقیقات کے ساتھ یہ طرزِ سلوک، انسانی معاشروں اور جہانِ علم و دانش کے لیے پہلے بھی نقصان دہ تھا اور آج بھی ہے اور ہمدردی اور خلوص رکھنے والوں کو اس کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا چاہیے اور زمانہ جاہلیت کی ان رسومات کو افکار انسانی سے دور کر دینا چاہیے۔

لیکن یہ گفتگو اس معنی میں بھی نہیں ہے کہ ہر نئے مطلب کو اس کے تازہ اور نیا ہونے کی وجہ سے قبول کر لیں۔ چاہے وہ بالکل بے بنیاد اور بے اساس کیوں نہ ہو، کیونکہ تازہ پسندی بھی قدامت پرستی کی طرح ہی خود ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔

اعتدالِ اسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ نہ اس معاملے میں افراط ہو اور نہ ہی تفریط۔

۸۔ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝

۹۔ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝

۱۰۔ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۟ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝

۱۱۔ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝

ترجمہ

۸۔ کیا ہم سب میں سے صرف اس (محمدؐ) پر قرآن نازل ہوا ہے؟ وہ درحقیقت میری اصل وحی کے بارے میں ہی شک کررہے ہیں، بلکہ انھوں نے ابھی تک عذابِ الٰہی نہیں چکھا (جبھی اس طرح کی گستاخانہ باتیں کررہے ہیں)

۹۔ کیا تیرے قادر اور عطا کرنے والے پروردگار کی رحمت کے خزانے ان کے پاس ہیں (کہ جسے ان کا دل چاہے دے دیں)؟

۱۰۔ یا یہ بات ہے کہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کی مالکیت ان ہی کے لیے ہے (اگر ایسا ہے) تو آسمان پر چڑھ جائیں (اور محمدؐ کے پاک دل پر وحی کے نزول کو روک دیں)۔

۱۱۔ ہاں! یہ شکست خوردہ احزاب کا ایک چھوٹا سا لشکر ہیں۔

تفسیر

یہ چھوٹا سا شکست خوردہ لشکر

گزشتہ آیات میں راہِ توحید اور پیغمبر اسلامؐ کی رسالت کی مخالفت میں مخالفین کی منفی تنقید اور نکتہ چینی کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ بحث آیات میں بھی اسی گفتگو کو جاری رکھا گیا ہے۔

مشرکین مکہ نے جب اپنے ناجائز مفادات خطرے میں دیکھے اور کینہ وحسد کی آگ ان کے دل میں بھڑکنے لگی تو پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت کے سلسلے میں خود کو قانع کرنے اور لوگوں کو غافل رکھنے کے لیے طرح طرح کی کمزور دلیلوں کا سہارا لینے لگے منجملہ ان کے تعجب اور انکار کے طور پر کہتے: کیا ہم سب میں سے صرف محمدؐ پر قرآن نازل ہوا ہے؟ (ءانزل علیہ الذکر من بیننا)۔

کیا ان تمام بڑے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں اور ان تمام مالدار، ثروت مند سرداروں میں سے کوئی نہ مل سکا کہ خدا اپنا قرآن اس پر نازل کرتا، سوائے تہی دست محمدؐ کے؟!

یہ منطق اس زمانے کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھی بلکہ ہر زمانے میں جب کوئی اہم ذمہ داری کسی کو سپرد کی جاتی ہے، تو حسد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، آنکھیں خیرہ اور کان تیز ہو جاتے ہیں۔ بڑبڑاہٹ اور عذر تراشیاں شروع ہو جاتی ہیں کہ کیا کوئی اور آدمی نہیں مل سکتا تھا کہ یہ کام فلاں شخص کو جو گمنام اور فقیر خاندان سے ہے سپرد کر دیا گیا ہے؟

ہاں! ایک طرف تو دنیا پرستی اور دوسری طرف سے حسد اس بات کا سبب ہوا کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) جو مشرکین کے ساتھ ایک قدر مشترک کے باعث اسلام اور قرآن سے دُور ہو گئے اور بت پرستوں کے پاس چلے گئے اور یہ کہنے لگے کہ تمھاری راہ ان کی راہ سے بہتر ہے۔

الم تر الی الذین اوتوا نصیبًا من الکتاب یؤمنون بالجبت والطاغوت و یقولون للذین کفروا ھٰؤلاء اھدٰی من الذین اٰمنوا سبیلًا

کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا کہ جنھیں کتابِ خدا سے کچھ حصّہ ملا تھا۔ جبت و طاغوت (بت اور بت پرستوں) پر ایمان لاتے ہیں اور مشرکین سے کہتے ہیں کہ وہ محمدؐ پر ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ (نساء ــــــ ۵۱)

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ سب تعجب اور انکار میں حسد اور حُبِّ دنیا کے علاوہ ایک اور سرچشمہ یعنی قدر وقیمت کی پہچان کا غلط معیار بھی شامل تھا جو فیصلہ کیلیے ہرگز منطقی معیار نہیں بن سکتا۔ کیا انسان کی شخصیت نام و نمود، شہرت، مال و دولت، ثروت، مقام اور سن و سال میں ہے؟ کیا خدا کی رحمت ان معیاروں پر تقسیم ہوتی ہے؟

اسی لیے اس آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ان کا مسئلہ کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ: وہ حقیقت میں میری اصل وحی اور میرے ذکر میں شک رکھتے ہیں۔ (بل ھم فی شك من ذکری)۔

محمدؐ کی ذات پر اعتراض کرنا تو بہانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور ان کا یہ شک کسی مسئلے میں اس بنا پر نہیں ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ابہام ہے بلکہ اس کا سرچشمہ ہوا و ہوس، حبِ دنیا اور حسد وکینہ ہے۔

اور آخر میں انھیں اس جملے کے ساتھ تہدید کی گئی ہے: انھوں نے ابھی تک عذابِ الٰہی کو نہیں چکھا جو اس طرح سے دلیری کے ساتھ خدا کے بھیجے ہوئے کے سامنے اکڑے ہوئے ہیں اور ان فضول باتوں کے ساتھ وحی الٰہی کے مقابلے میں جنگ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں (بل لما یذوقوا عذاب)۔

ہاں ہمیشہ ایسا گروہ موجود رہا ہے کہ جن کے کان منطقی اور درست بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور انھیں عذاب کے تازیانوں کے

سوا کوئی چیز غرور کے گھوڑے سے نیچے نہیں اتارتی، ان پر عذاب ہونا چاہیے چونکہ ان کا علاج عذاب الٰہی ہی ہے۔

اس کے بعد ان کے جواب میں مزید فرمایا گیا ہے: واقعاً! کیا تیرے قادر اور بخشنے والے پروردگار کی رحمت کے خزانے انھی کے پاس ہیں کہ جس کسی کو وہ چاہیں نبوت کا پروانہ دے دیں اور جس کو نہ چاہیں محروم کردیں (ام عندھم خزائن رحمة ربك العزیز الوھّاب)۔

خدا اس بنا پر کہ وہ "رب" ہے (اور عالم ہستی اور جہان انسانیت کا مالک و مربی اور پروردگار ہے) اپنی رسالت کے لیے ایسے شخص کو منتخب کرتا ہے جو لوگوں کو ارتقاء و تکامل کی راہ اور پرورش و تربیت میں رہبری کرسکے اور اس کے "عزیز" ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کی خواہش کا مغلوب نہیں ہے کہ وہ مقام رسالت کو کسی نالائق آدمی کے سپرد کردے اور اصولی طور پر مقام نبوت اتنا عظیم مقام ہے کہ صرف خدا ہی اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ کس کو دے اور اس کے "وھاب" ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جو کچھ چاہے اور جس کو چاہے بخش دے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "وھّاب" مبالغے کا صیغہ ہے اور بہت بخشنے والے کے معنی میں ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبوت ایک اکیلی نعمت نہیں ہے بلکہ متعدد نعمتوں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اکٹھی ہوتی ہیں، پھر کہیں وہ اس منصب کا عہدہ دار ہوسکتا ہے۔ یعنی علم، تقویٰ، عصمت، شجاعت اور شہامت ہیں۔

اس گفتگو کی نظیر سورۂ زخرف کی آیہ ۳۲ میں بھی ہے:

اھم یقسمون رحمة ربك

وہ تجھ پر قرآن نازل ہونے کی وجہ سے اعتراض کررہے ہیں تو کیا تیرے پروردگار کی رحمت ان کے ہاتھوں سے تقسیم ہوتی ہے؟

ضمناً "رحمت" کی تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ نبوت جہان انسانیت پر خدا کی رحمت اور لطف ہے اور واقعتاً ایسا ہی ہے کیونکہ اگر انبیاء نہ ہوتے تو انسان آخرت اور روحانیت کی راہ بھی گم کربیٹھتے اور دنیا کی راہ بھی۔ جیسا کہ مکتب انبیاء سے دور لوگ دونوں راستے گم کیے ہوئے ہیں۔

پھر بعد والی آیت میں اسی مطلب کو ایک دوسرے طریقے سے بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کی مالکیت و حاکمیت ان کے لیے ہے؟ اگر ایسا ہے تو آسمانوں پر چڑھ جائیں اور وحی الٰہی کو محمدؐ کے پاک قلب پر نازل ہونے سے روک دیں (ام لھم ملك السمٰوات و الارض و ما بینھما فلیرتقوا فی الاسباب)۔

یہ گفتگو حقیقت میں گزشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے۔ وہاں پر یہ کہا گیا ہے کہ "پروردگار کی رحمت کے خزانے تمھارے ہاتھ میں نہیں ہیں کہ تمھاری ہوس اور خواہشات جس شخص کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اسے بخش دو"۔ اب فرمایا گیا ہے کہ اب جب کہ

یہ خزانے تمھارے ہاتھ میں نہیں ہیں اور صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں تو صرف ایک ہی راہ ہے جو تمھارے لیے کھلی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم آسمانوں پر چڑھ جاؤ اور وحی کو نازل ہونے سے روک دو ۔ اور تم خود جانتے ہو کہ تم اس کام سے بھی بالکل عاجز ہو۔

اس بنا پر نہ تو "جس بات کا اقتضاء ہو" وہ تمھارے اختیار میں ہے اور نہ ہی تم کسی کام کو روکنے کی قدرت رکھتے ہو۔ ان حالات میں تم سے کیا ہو سکتا ہے؟ حسد سے مرجاؤ اور جو کام تم کر سکتے ہو کر لو۔

اس ترتیب سے یہ دونوں آیتیں ایک ہی مطلب کا تکرار نہیں کرتیں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک مسئلے کی ایک جہت کو بیان کر رہی ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں ان کم عقل مغروروں سے تحقیر کے طور پر ارشاد ہوتا ہے: یہ شکست خوردہ احزاب کا ایک چھوٹا سا لشکر ہیں (جند ما هنالك مهزوم من الاحزاب)۔[1]

"هنالك" کا معنی ہے "اس جگہ" اور یہ بعید کے لیے اسم اشارہ ہے۔ اس بنا پر کچھ لوگ اسے جنگ بدر میں مشرکین کی شکست کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو مکہ سے کافی دور واقع ہوئی تھی۔

"احزاب" کی تعبیر ظاہراً ان تمام گروہوں کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبروں کی مخالفت کیا کرتے تھے اور خدا نے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ مشرکین کی یہ چھوٹی سی جمعیت ان ہی گروہوں میں سے ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو انھیں کے سے انجام میں گرفتار ہوگا (اس بات کی گواہ آئندہ والی آیات ہیں جو اس مسئلے کی تصریح کرتی ہیں)۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے اور قرآن یہ گفتگو اس وقت کر رہا ہے جب مسلمان شدید اقلیت میں تھے۔

تخافون ان يتخطفكم الناس

اس طرح سے کہ ممکن تھا مشرکین انھیں ایک لقمہ کی طرح اچک لیں (انفال ــــ ۲۶)

اس وقت مسلمانوں کی کامیابی کی کوئی نشانی نظر نہیں آتی تھی، اس وقت بدر، احزاب اور حنین کی کامیابیاں سامنے نہیں آئی تھیں لیکن قرآن قاطعیت اور دو ٹوک فیصلے کے طور پر کہہ رہا ہے کہ "یہ سخت دشمن ایک چھوٹا سا ایسا لشکر ہیں جو شکست سے دوچار ہو کر رہے گا۔"

آج بھی قرآن دنیا کے سارے مسلمانوں کو جو ہر طرف سے متجاوز اور ظالم طاقتوں کے محاصرے میں ہیں، یہی بشارت دے رہا ہے کہ اگر وہ بھی پہلے مسلمانوں کی طرح خدا کے عہد و پیمان پر ڈٹ جائیں تو خدا بھی جنود احزاب کی شکست کے بارے میں اپنے وعدے کو پورا کرے گا۔

---

[1] "ما" اوپر والے جملے میں زائدہ ہے جو تقلیل کے لیے آیا ہے اور "جند" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور "مهزوم" خبر کے بعد خبر ہے اور اصل میں "هم جند ما مهزوم من الاحزاب" تھا۔ بعض کا نظریہ ہے کہ اس جملے میں کوئی چیز محذوف نہیں ہے اور "جند" مبتدا اور "مهزوم" خبر ہے۔ لیکن پہلا نظریہ زیادہ مناسب ہے۔

۱۲۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ ۝

۱۳۔ وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَّأَصْحَابُ لْئَيْكَةِ ۚ أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ ۝

۱۴۔ إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ۝

۱۵۔ وَمَا يَنظُرُ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً مَّا لَهَا مِن فَوَاقٍ ۝

۱۶۔ وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّل لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ

۱۲۔ اُن سے پہلے قوم نوح وعاد اور صاحب اقتدار فرعون نے (ہمارے انبیاء کی) تکذیب کی۔

۱۳۔ نیز ثمود، قوم لوط اور اصحاب ایکہ (قوم شعیب) یہ وہ جماعتیں تھیں (کہ جو انبیاء کی تکذیب کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں)

۱۴۔ ان جماعتوں میں سے ہر ایک نے رسولوں کی تکذیب کی اور ان کے لیے عذاب الٰہی رُوبہ عمل آیا۔

۱۵۔ (اپنے ان اعمال کے سبب) ان لوگوں کو اس کے علاوہ کوئی توقع نہ تھی کہ ایک آسمانی صیحہ نازل ہو۔ ایسی صیحہ کہ جس کے باعث لوٹنے کا کوئی راستہ نہ رہے (اور وہ سب کو نابود کر دے)

۱۶۔ انھوں نے (سرکشی کی بنا پر) کہا: پروردگارا! اپنے عذاب میں سے روز حساب سے پہلے ہی ہمارا حصّہ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں دے دے۔

تفسیر

صرف ایک آسمانی صیحہ کافی ہے

گزشتہ آیات میں سے آخری میں مشرکین کی شکست کی خبر دی گئی تھی۔ اس میں انھیں احزاب میں سے چھوٹا سا مغلوب لشکر قرار دیا گیا ہے۔ اب زیر بحث آیات میں چند ایسے گروہوں کا ذکر ہے جو انبیاءؑ کی تکذیب کرتے تھے اور ان میں ان کے بُرے انجام کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان سے پہلے قوم نوح وعاد اور صاحب اقتدار فرعون نے اللہ کی آیات اور اس کے رسولوں کو جھٹلایا (كذبت قبلهم قوم نوح وعاد وفرعون ذو الاوتاد)۔

اسی طرح قوم ثمود، قوم لوط اور اصحاب ایکہ (قوم شعیب بھی ایسے گروہ تھے جو اللہ کے رسولوں کی تکذیب کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے (وثمود وقوم لوط واصحاب الأیکة اولئك الأحزاب)۔[1]

جی ہاں! یہ چھ گروہ زمانۂ جاہلیت کی جماعتوں اور بُت پرستوں کے سے تھے انھوں نے اپنے عظیم انبیاء کے خلاف قیام کیا۔

قوم نوح نے حضرت نوحؑ جیسے عظیم پیغمبر کے خلاف قیام کیا۔

قوم عاد نے حضرت ہودؑ کے خلاف قیام کیا۔

فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے مقابلے میں قیام کیا۔

قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے خلاف قیام کیا۔

قوم لوط نے حضرت لوطؑ کے مقابلے میں قیام کیا۔

اور اصحاب الایکہ نے حضرت شعیبؑ کے خلاف قیام کیا۔

ان قوموں نے جو کچھ ان کے بس میں تھا انبیاء اور اہل ایمان کے خلاف کیا ان کی تکذیب کی اور انھیں اذیتیں دیں لیکن انجام کار عذاب الٰہی انھیں دامن گیر ہوا اور خشک فصلوں کی طرح انھیں کاٹ کر رکھ دیا۔

قوم نوح طوفان اور تباہ کن بارشوں سے نابود ہوئی۔

قوم عاد زبردست اور ہولناک آندھی سے تباہ ہوئی۔

فرعون اور اس کے ساتھی نیل کی موجوں میں غرق ہوئے۔

قوم ثمود آسمانی بجلی کا شکار ہوئی۔

قوم لوط پر دہشت ناک زلزلہ آیا اور آسمانوں سے پتھروں کی بارش نازل ہوئی۔

قوم شعیب بھی موت آفرین بجلی کا شکار ہوئی کہ جو بادل سے ان کے سروں پر آپڑی۔

گویا وہ لوگ پانی، ہوا، مٹی اور آگ جیسی چیزوں سے تباہ ہوئے کہ جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ ان سرکش باغیوں کا دفتر حیات یوں لپیٹ دیا گیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ لہٰذا ان مشرکین مکہ کو بھی سوچ بچار کر لینا چاہیے کیونکہ ان قوموں کے مقابلے میں تو یہ ایک چھوٹے سے گروہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے لہٰذا یہ خواب غفلت سے بیدار کیوں نہیں ہوتے؟

فرعون کے لیے " ذوالاوتاد " (مضبوط کِلّے والا) کا لفظ آیا ہے۔ یہ ان آیات میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے مضبوط اقتدار کے لیے ایک طرح کی صراحت ہے۔ اسی طرح سورۂ فجر کی آیہ ۱۰ میں بھی اس امر کا ذکر کنایتاً موجود ہے۔ مذہر نظر تعبیر روزمرہ میں بھی استحکام اور مضبوطی کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: فلاں شخص کے کِلّے مضبوط ہیں کیونکہ خیمہ وغیرہ کی مضبوطی

---

[1] " اولئك الأحزاب مبتدا اور خبر ہے " او لئك " ان چھ قوموں کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا ذکر ان دو آیتوں میں مذکور ہے۔ " احزاب " انھی دو قبل کی آیتوں میں مذکور احزاب کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے مشرکین مکہ کو چھوٹا سا گروہ شمار کیا گیا ہے۔

کے لیے مختلف طرح کے کلوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

بعض نے اسے فرعون کی عظیم افواج کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ فوج عام طور پر خیموں سے کام لیتی ہے اور خیموں کی مضبوطی کے لیے کلوں اور میخوں وغیرہ سے استفادہ کرتی ہے۔

بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ فرعونی لوگ اپنے مخالفوں کے خلاف بہت وحشتناک ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں انھیں چار میخوں سے قتل کرتے تھے۔ تختۂ دار یا دیوار پر ان کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھونک دیتے تھے اور اسی عالم میں انھیں چھوڑ دیتے تھے یہاں تک کہ ان کی جان نکل جائے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "اوتاد" سے مراد "اہرام" مصر ہی ہیں کہ جو میخ کی طرح زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور چونکہ اہرام فرعونوں کی خصوصیات میں سے ہیں اس لیے یہ صفت قرآن میں صرف انھی کے لیے آئی ہے۔

البتہ یہ تمام احتمالات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں سب معنی جمع ہوں۔

اصحاب الایکہ میں "ایکہ" کا معنی ہے درخت اور "اصحاب الایکہ" سے مراد حضرت شعیبؑ کی قوم ہے۔ ان کا علاقہ حجاز و شام کے درمیان تھا اور اس میں پانی اور درختوں کی فراوانی تھی۔ اس ضمن میں ہم سورۂ حجر کی آیت ۸ کی تفسیر میں حسب ضرورت تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں (اس سلسلے میں قارئین جلد ۱۱ کی طرف رجوع کریں)۔

جی ہاں! ان میں سے ہر گروہ نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور اللہ کا عذاب ان کے لیے رُو بہ عمل آگیا (ان کل الا کذب الرسل فحق عقاب)۔[1]

تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ کس طرح ان میں سے ہر گروہ گرفتار بلا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے شہر ویرانوں اور کھنڈروں میں تبدیل ہوگئے اور ان شہر کے باسی بے روح جسم ہوگئے۔

مشرکین مکہ جو کام انجام دیتے ہیں ان کے ہوتے ہوئے کیا ان کا ان لوگوں سے بہتر انجام ہوسکتا ہے جبکہ ان کے اعمال بھی ویسے ہی ہیں اور اللہ کی سنت بھی وہی ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں قرآن ایک قاطع اور تہدید آمیز انداز میں کہتا ہے: یہ لوگ ان اعمال کے ہوتے ہوئے اس کے سوا کوئی توقع نہیں رکھ سکتے کہ ایک آسمانی صیحہ آپہنچے، ایسا صیحہ کہ پھر لوٹنے کی گنجائش نہ رہے (وما ینظر ھؤلاء الا صیحۃ واحدۃ مالھا من فواق)۔

ممکن ہے یہ صیحہ ویسی ہی ہو جیسی گزشتہ اقوام پر نازل ہوتی رہی یعنی وحشتناک صاعقہ یا زبردست آواز کے ساتھ زمین پر آنیوالا زلزلہ ہو کہ جس کے ذریعے ان کی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

نیز ممکن ہے یہ اس دنیا کے اختتام پر جو عظیم صیحہ ہوگی اس کی طرف اشارہ ہو کہ جس کے لیے پہلا صور پھونکے جانے کی

---

[1] "فحق عقاب" دراصل معمول کے مطابق "فحق عقابی" تھا۔ یاء حذف ہوگئی اور اس پر دلالت کرنے والی زیر باقی رہ گئی۔ "حق" فعل ہے اور "عقاب" اس کا فاعل ہے۔ یعنی "میرا عقاب ان کے بارے میں ثابت ہوگیا ہے"۔

تعبیر استعمال ہوئی ہے۔

بعض مفسرین نے پہلی تفسیر پر تنقید کی ہے اور اسے سورۂ انفال کی آیت ۳۳ کے مخالف قرار دیا ہے کہ جس میں فرمایا گیا ہے:

وما کان اللہ لیعذبھم و انت فیھم

جب تک کہ تو ان کے درمیان ہے اللہ ان پر عذاب نہیں کرے گا۔

لیکن اس امر کی طرف توجہ کی جائے تو یہ تفسیر درست معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ اعتقاد نہ تھا اور ان کے اعمال بھی ماضی قوموں کے سے تھے کہ جو صیحہ آسمانی کا شکار ہوئے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ ہر لحظہ اسی قسم کے انجام کے انتظار میں رہیں کیونکہ آیت میں انتظار کے بارے میں گفتگو ہے (غور کیجیے گا)۔

بعض نے دوسری تفسیر پر بھی اعتراض کیا ہے کہ مشرکینِ عرب اس جہان کے اختتام کے وقت زندہ نہیں ہوں گے کہ وہ عظیم صیحہ ان کے دامن گیر ہو۔

لیکن یہ اعتراض بھی درست نہیں، اسی دلیل کے مطابق کہ جو بیان ہو چکی ہے کیونکہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ دنیا کب ختم ہو جائے گی اور قیامت کب آئے گی؟ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ مشرکین ہر لحظہ اس عظیم صیحہ کے انتظار میں ہوں کہ جس کے لوٹ جانے کا امکان نہیں[1]

بہرحال یہ جاہل لوگ آیاتِ الٰہی کی تکذیب و انکار کے باعث، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ناروا تہمتیں لگانے کی وجہ سے اور بت پرستی پر اپنی ہٹ دھرمی اور اصرار کے سبب اور ظلم و فساد کی وجہ سے گویا عذابِ الٰہی کے انتظار میں ہیں۔ ایسا عذاب کہ جو ان کے خرمنِ حیات کو جلا کر رکھ دے گا یا ایسے صیحہ کے انتظار میں ہیں کہ جو اس دنیا ہی کو ختم کر دے گی اور انھیں ایسے راستے پر لے جائے گی کہ جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔

"فواق" (بروزن "رواق") بہت سے اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر کے نزدیک پستان سے دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیانی فاصلے کو کہتے ہیں کیونکہ ایک مرتبہ اگر دودھ دوہ لیا جائے تو پھر دودھ دوہنے کے لیے کچھ صبر کرنا ہوگا تاکہ پھر سے دودھ پستان میں جمع ہو جائے۔

بعض اسے دودھ دوہتے وقت انگلیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے ان میں جو فاصلہ پیدا ہوتا ہے اس کے معنی میں لیتے ہیں۔

نیز دودھ جب دوہ لیا جاتا ہے تو پستان کو ایک طرح سے آرام آجاتا ہے۔ لہٰذا یہ لفظ آرام و راحت کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔

نیز چونکہ یہ فاصلہ پستان میں دودھ پھر سے آجانے کا باعث بنتا ہے، لہٰذا یہ لفظ بازگشت، واپسی اور رجوع کے معنی میں بھی

---

[1] رہی یہ بات کہ مفسرین نے اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ اس سے مراد صیحہ ثانی کہ جو مردوں کے زندہ ہونے اور عدالتِ الٰہی میں ان کے پیش ہونے کے لیے ہوگی، تو یہ بہت بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ بات نہ تو بعد والی آیت سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی قبل کی آیات سے (غور کیجیے گا)۔

استعمال ہوتا ہے۔ اسی بنا پر بیمار کی صحت اور تحفیف ہو جانے کو " افاقہ " کہتے ہیں۔ کیونکہ سلامتی اور تندرستی اس کی طرف لوٹ آتی ہے۔ نیز بے ہوش کے ہوش میں آجانے اور دیوانے کے عاقل ہو جانے کو بھی " افاقہ " کہتے ہیں۔ کیونکہ ہوش اور عقل ان کی طرف لوٹ آتی ہے[1]

بہرحال اس وحشت ناک صیحہ میں کسی قسم کی بازگشت، راحت و آرام اور سکون نہیں ہے اور جب وہ رُوبہ عمل آئی تو پھر انسان کے لیے سب دروازے بند ہو جائیں گے۔ پھر نہ پشیمانی فائدہ دے گی، نہ تلافی کا کوئی امکان ہوگا اور نہ ہی داد و فریاد کی کہیں رسائی ہوگی۔

آخری زیر بحث آیت میں کافروں اور منکروں کی کچھ اور باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو وہ تمسخر کے طور پر کرتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: انھوں نے کہا پروردگارا! روزِ حساب سے پہلے ہی اپنے عذاب میں سے ہمارا حصہ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں دے دے (و قالوا ربنا عجل لنا قطنا قبل یوم الحساب)۔

یہ دل کے اندھے مغرور اسی طرح بادۂ غرور میں بدمست تھے حتیٰ کہ عذابِ الٰہی اور اس کی عدالت کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ عذاب کے ہمارے حصے میں کیوں تاخیر ہوگئی ہے؟ کیوں خدا ہمارے حصے میں جلدی نہیں کرتا؟

گزشتہ قوموں میں بھی ایسے ہلکے ذہن والے اور خود غرض کم نہ تھے لیکن جب وہ عذابِ الٰہی میں پھنستے تو جانوروں کی طرح چلاتے اور بلبلاتے مگر پھر کوئی ان کی فریاد کو نہ پہنچتا۔

" قِط " (بروزن " جن ") دراصل ایسی چیز کے معنی میں ہے جو عرض میں کاٹی جائے جبکہ قِد (اسی وزن پر) اس چیز کے معنی میں ہے جو طول میں کاٹی جائے۔ چونکہ ہر شخص کا معین حصہ گویا قطع شدہ اور کاٹی ہوئی چیز ہے للذا یہ لفظ حصے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

کبھی یہ لفظ اس کاغذ کے معنی میں بھی آتا ہے جس پر کچھ لکھتے ہیں یا اس میں لوگوں کے نام اور ان کے انعامات لکھتے ہیں۔

اسی لیے زیرِ بحث آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے:

" خداوندا! ہمارا نامۂ اعمال روزِ جزا سے پہلے ہمارے ہاتھ میں دے دے "

یہ بات انھوں نے اس وقت کی جب آیاتِ قرآنی نے خبر دی کہ قیامت کے دن ایک گروہ کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور دوسرے گروہ کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں ہوگا۔

---

[1] بعض اہلِ لغت نے " فَواق " اور " فُواق " میں فرق کیا ہے۔ جب کہ بعض دونوں کا ایک ہی معنی سمجھتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے مفرداتِ راغب، تفسیر روح المعانی، تفسیر فخرالدین رازی، تفسیر ابوالفتوح اور تفسیر قرطبی اور دیگر منابع لغت کی طرف رجوع کریں۔

انھوں نے گویا تمسخر کے طور پر کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اسی وقت ہمارا نامۂ اعمال ہمیں دے دیا جاتا تاکہ ہم پڑھ کر دیکھتے کہ ہم کس کھاتے میں ہیں ؟

بہر حال جہالت اور غرور دونوں ہی نہایت قبیح اور مذموم صفات ہیں کہ جو عام طور پر ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوتیں ۔ جاہل مغرور ہوتے ہیں اور مغرور جاہل ہوتے ہیں اور ان دونوں صفات کے آثار زمانۂ جاہلیت کے مشرکین میں بہت زیادہ نظر آتے ہیں ۔

۱۷۔ اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ○

۱۸۔ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ○

۱۹۔ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ○

۲۰۔ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ○

ترجمہ

۱۷۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور ہمارے بااقتدار بندے داؤد کو یاد کر کہ جو توبہ کرنے والا ہے۔

۱۸۔ ہم نے پہاڑ اس کے لیے مسخر کر دیئے کہ جو صبح و شام اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔

۱۹۔ تمام پرندے بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیئے (تاکہ وہ اس کے ہمراہ خدا کی تسبیح کریں) اور یہ سب اس کی طرف بازگشت کرنے والے ہیں۔

۲۰۔ اور اس کی حکومت کو ہم نے استحکام بخشا اسے ہم نے علم عطا کیا اور عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا بھی۔

تفسیر

داؤدؑ کی زندگی سے درس حاصل کریں

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے بزرگ انبیاءؑ میں سے تھے انھیں اللہ نے ایک عظیم حکومت عطا کی تھی۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں ان کے بلند مقام کی تعریف کی گئی ہے۔ گزشتہ آیات میں مشرکین اور بت پرستوں کی زیادتیوں کا ذکر تھا۔ نیز ان ناروا تہمتوں کا بیان تھا جن کی نسبت وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد اب قرآن رسول اکرمؐ اور آپؐ کے زمانے کے مومنین کی دل جوئی کے لیے حضرت داؤدؑ کی داستان بیان کر رہا ہے۔ وہ داؤدؑ کہ جنھیں اللہ نے اس قدر اقتدار بخشا یہاں تک کہ پہاڑوں اور پرندوں کو ان کے لیے مسخر کر دیا تاکہ اس امر کی نشاندہی کرے کہ جب اس کا لطف و کرم کسی شخص کے شاملِ حال ہو تو پھر دشمنوں کی کثرت کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عظیم نبی بھی اس ظاہری اقتدار کے باوجود لوگوں کی زبان کے چرکوں سے محفوظ نہ تھے لہٰذا یہ صورتِ حال رسولِ اسلامؐ کے لیے تسلی و تشفی کا باعث ہونا چاہیے کہ جس کیفیت سے وہ دوچار ہیں یہ انھی میں منحصر نہیں ہے

بلکہ اس دنیا کے عظیم لوگ اس امر میں ان کے شریک رہے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر اختیار کر اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر کہ جو با اقتدار بھی تھا اور بہت زیادہ توبہ کرنے والا بھی (اصبر علیٰ مایقولون واذکر عبدنا داود ذاالاید انہ اواب)۔

"اید" قدرت کے معنی میں بھی آیا ہے اور نعمت کے معنی میں بھی اور حضرت داؤدؑ دونوں معانی کے لحاظ سے "ذاالاید" تھے۔ ان کی جسمانی طاقت کا یہ عالم تھا کہ جب بنی اسرائیل کا ایک ظالم حکمران جالوت میدان جنگ میں آپؑ کے مدمقابل آیا تو آپؑ نے آلہ سنگ اندازی سے اس قوت سے پتھر پھینکا کہ جالوت گھوڑے کی پشت سے زمین پر آرہا اور اپنے خون میں لوٹنے لگا۔ بعض نے لکھا ہے کہ پتھر نے اس کا سینہ چیر دیا اور دوسری طرف نکل گیا۔

دوسری طرف آپؑ کے سیاسی اقتدار کا یہ حال تھا کہ ایک طاقتور حکومت آپؑ کے ہاتھ میں تھی اور آپؑ پوری طاقت سے دشمنوں کے مقابلے میں کھڑے ہوتے تھے۔ علماء نے یہاں تک کہا ہے کہ آپؑ کے محراب عبادت کے چاروں طرف ہزار افراد شام سے صبح تک تیار کھڑے رہتے تھے۔

نیز آپؑ کی روحانی، اخلاقی اور عبادی طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کا ایک بڑا حصہ بیدار رہتے اور پروردگار کی عبادت میں مشغول رہتے اور سال بھر کے آدھے ایام روزے میں گزارتے۔

نعمتوں کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو طرح طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا کر رکھی تھیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت داؤدؑ ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنگ میں، عبادت میں، علم میں اور حکومت میں بہت قوی تھے اور انھیں فراواں نعمتیں حاصل تھیں [1]

"اوّاب" "اوب" (بروزن "قول") کے مادہ سے کسی چیز کی طرف اختیاری طور پر لوٹنے کے معنی میں ہے "اواب" چونکہ مبالغے کا صیغہ ہے لہٰذا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ پروردگار کی طرف بہت زیادہ لوٹنے والے اور بازگشت کرنے والے تھے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی غفلت اور ترکِ اولیٰ پر توبہ کرتے تھے۔

قرآن مجید اجمال کے بعد تفصیل کی اپنی خاص روش کے مطابق اب حضرت داؤدؑ پر نعماتِ الٰہی کی کچھ تفصیل بیان کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس کے لیے پہاڑ مسخر کر دیئے، اس طرح سے کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح خدا کرتے تھے (انا سخرنا الجبال معہ یسبحن بالعشیّ والاشراق) [2]

---

[1] "اید" "ید" کی جمع ہے کہ جو "ہاتھ" کے معنی میں ہے۔ ہاتھ چونکہ طاقت، عطائے نعمت اور اقتدار و حکومت کا مظہر ہے اس لیے یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

[2] "معہ" ہو سکتا ہے "یسبحن" کے متعلق ہو۔ اس لحاظ سے یہ لفظ حضرت داؤد کے ساتھ پہاڑوں کے ہم آواز ہونے کو بیان کرتا ہے۔

سورہ سبا کی آیہ ١٠ میں بھی ہے۔

یا جبال اوّبی معہ

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ "سخرنا" سے متعلق ہو اس صورت میں جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کیا۔ لیکن "لہ" کے بجائے "معہ" کا آنا یہ نکتہ بیان کرنے کے لیے ہے کہ یہ تسخیر تسبیح میں ہم آواز ہونے کے بارے میں تھی۔

نہ صرف پہاڑ بلکہ سب پرندے بھی اس کے لیے مسخر کردیئے تاکہ ہمیشہ اس کے ہمراہ اللہ کی تسبیح کریں (والطیر محشورۃ)۔
یہ سب پرندے اور پہاڑ حکم داؤدؑ کے مطیع تھے، اس کے ساتھ ہم آواز تھے اور اس کی طرف بازگشت کرنے والے تھے (کل لہ اوّاب)۔

" لہ " کی ضمیر ممکن ہے داؤدؑ کی طرف لوٹتی ہو۔ اگر یوں ہو تو جملے کا مفہوم وہی ہوگا جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ البتہ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ ضمیر اللہ کی ذات پاک کی طرف لوٹتی ہو یعنی تمام ذرات عالم اس کی طرف لوٹتے ہیں اور اس کے حکم کے سامنے سرنگوں ہیں۔

مفسّرین کی اس سلسلے میں مختلف آراء ہیں کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤدؑ کے ساتھ کس طرح ہم آواز تھے اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ ان آراء کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی دلکش، جاذب اور دل گداز آواز تھی کہ جو پہاڑوں پر اثر انداز ہوتی تھی اور پرندوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی (لیکن یہ کوئی ایسی اہم فضیلت نہیں کہ قرآن اسے اس اہمیت کے ساتھ ذکر کرے)

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تسبیح ظاہری آواز کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے ادراک و شعور کے ہمراہ تھی کہ جو ذرات عالم کے باطن میں ہے۔ اس نظریے کے مطابق تمام موجودات عالم ایک قسم کی عقل اور شعور کے حامل ہیں اور جب یہ موجودات اس عظیم پیغمبر کی مناجات کے وقت دل انگیز آواز سنتے تھے تو ان کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے اور یوں سب باہم مل کر تسبیح کرتے۔

۳۔ بعض نے اس احتمال کا ذکر بھی کیا ہے کہ یہ تسبیح تکوینی ہے کہ جو تمام موجودات زبان حال سے کرتے ہیں اور ان کا نظام خلقت اس امر کی بخوبی حکایت کرتا ہے کہ اللہ ہر عیب سے پاک و منزہ ہے اور علم و قدرت اور ہر قسم کی صفات کمال کا حامل ہے۔

لیکن یہ بات حضرت داؤدؑ کے ساتھ مخصوص نہیں کہ اسے ان کی خصوصیات میں سے شمار کیا جائے۔ اس لحاظ سے مناسب تر دوسری تفسیر ہے اور یہ امر قدرت الٰہی سے بعید نہیں ہے۔ یہ ایک زمزمہ تھا کہ جو ان موجودات عالم کے اندر اور ان کے باطن میں ہمیشہ سے جاری تھا لیکن خدا نے قوت اعجاز سے اسے حضرت داؤدؑ کے لیے ظاہر کیا جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتھیلی پر سنگریزوں کا تسبیح کرنا مشہور ہے۔

اگلی آیت میں بھی حضرت داؤدؑ پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر جاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس کے نظام حکومت کو استحکام بخشا (وشددنا ملکہ)۔ اس طرح سے کہ وہ سرباغی و سرکش دشمن کا حساب چکا تے۔ اس کے علاوہ "ہم نے اسے علم و حکمت عطا کی (و اٰتیناہ الحکمۃ)۔

وہی حکمت کہ جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا کثیرًا

جس شخص کو حکمت مل گئی اُسے خیر کثیر مل گئی۔ (البقرہ ــــ ۲۶۹)

اس مقام پر "حکمت" "علم و دانش" امور حکومت چلانے کی صلاحیت یا مقام نبوت کے معنی میں ہے یا پھر ان تمام مفاہیم کی جامع ہے "حکمت" کبھی علمی پہلو کی حامل ہوتی ہے کہ جب اسے "معارف عالیہ" کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ عملی پہلو کی حامل ہوتی ہے کہ

اس صورت میں اسے " اخلاق اور عملِ صالح " سے تعبیر کرتے ہیں اور حضرت داؤد علیہ السلام ان سب سے خوب بہرہ مند تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی آخری عظیم نعمت کے بارے میں فرمایا گیا ہے : ہم نے اسے علم قضاوت اور صحیح ومدلل فیصلہ کرنے کا علم عطا کیا (وفصل الخطاب)۔

قضاوت وعدالت کو " فصل الخطاب " سے اس بنا پر تعبیر کیا گیا ہے کہ " خطاب " سے مراد طرفین مقدمہ کی گفتگو ہے اور " فصل " قطع کرنے اور جدائی کے معنی میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فریقین کی گفتگو تبھی منقطع ہوگی جب ان کے درمیان صحیح فیصلہ ہو جائے لہٰذا یہ تعبیر عادلانہ فیصلے کے معنی میں آئی ہے۔

احتمالاً اس سے یہ مراد بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے حضرت داؤدؑ کو قوی منطق عطا فرمائی ہو کہ جو بلند فکر اور گہری فکر کی ترجمان تھی ، لہٰذا نہ صرف یہ کہ فیصلہ کرتے ہوئے بلکہ ہر مقام پر آپؑ کی بات آخری اور حتمی ہوتی تھی۔

واقعاً جب اللہ تعالیٰ یہ قدرت رکھتا ہے کہ ایک اہل انسان کو اس قدر قوت وتوانائی عطا فرمادے تو پھر اس بات کی گنجائش نہیں کہ کوئی شخص اس کے لطف وکرم سے مایوس ہو جائے۔ لہٰذا یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے ان مومنین ہی کے لیے تسلی اور دل جوئی کا باعث نہیں کہ جو مکہ میں سخت دباؤ میں تھے بلکہ ان تمام مومنین کے لیے تسلی خاطر کا پیغام ہے کہ جو مختلف زمانوں میں سختیوں اور مشکلات کا شکار ہوں۔

حضرت داؤدؑ کی اہم صفات

بعض مفسرین نے مذکورہ بالا چند آیات سے حضرت داؤدؑ کو حاصل دس عظیم نعمتیں اخذ کی ہیں کہ جو اللہ کے اس نبی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے حاصل تھیں۔ یہ نعمات آپؑ کے بلند مرتبے کی ترجمان ہیں۔ یہ دراصل ایک کامل انسان کی خصوصیات کو بھی واضح کرتی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلامؐ کہ جو اس قدر عظیم مقام رکھتے تھے اس کے باوجود آپؐ کو حکم دیا جارہا ہے کہ صبر وشکیبائی میں حضرت داؤدؑ کی اقتداء کریں اور ان کی تاریخ حیات سے کمک حاصل کریں (اصبر علی ما یقولون واذکر)۔

۲۔ حضرت داؤدؑ کے مقام عبودیت کی توصیف کی گئی ہے۔ دراصل یہ ان کی پہلی خصوصیت کے طور پر شمار کی گئی ہے (عبدنا داؤد)۔

پیغمبر اسلامؐ کے واقعہ معراج کے ذکر میں آپؐ کے لیے بھی یہ تعبیر آئی ہے۔

سبحان الذی اسرٰی بعبدہ ۔۔۔۔۔

پاک ومنزہ ہے وہ ذات کہ جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا۔ (بنی اسرائیل ــــــ ۱)

۳۔ (اطاعت الٰہی ، گناہ سے پرہیز اور امورِ مملکت چلانے میں) وہ بہت قوی تھے (ذا الاید)۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی ہے :۔

ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمؤمنین

وہ وہی جس نے اپنی مدد اور مومنین کے ذریعے تیری تقویت کی۔ (انفال ـــــــ ۶۲)

۴۔ انھیں "اوّاب" کہہ کر ان کی توصیف کی گئی ہے۔ جس کا معنی ہے بار بار لوٹنے والا اور پے در پے رجوع کرنے والا یعنی خداوند عالم کی ساحتِ قدس کی طرف رجوع کرنے والا (انہ اوّاب)۔

۵۔ صبح و شام تسبیح کرنے میں پہاڑ بھی ان کے لیے مسخر ہیں۔ اس بات کو بھی قرآن ان کا اعزاز و افتخار شمار کرتا ہے (انا سخرنا الجبال معہ یسبحن بالعشی والاشراق)۔

۶۔ پرندے بھی اللہ کی عبادت و تسبیح میں ان کے ہم آواز ہیں اور یہ بھی ان کے لیے خداداد نعمتوں میں سے ہے۔ (والطیر محشورۃ)۔

۷۔ آغاز ہی میں ان کے ہم آواز نہ تھے بلکہ جب بھی وہ تسبیح خدا کی طرف پلٹتے وہ ان کے ساتھ ہم صدا ہو جاتے (کل لہ اوّاب)۔

۸۔ اللہ نے انھیں ایک حکومت دی کہ جس کی بنیاد اس نے مستحکم کی ہوئی تھی اور اس مقصد کے لیے مادی و روحانی وسائل ان کے اختیار میں دے رکھے تھے (وشددنا ملکہ)۔

۹۔ ایک اور اہم خداداد سرمایہ ان کے پاس بہت زیادہ علم و دانش کی صورت میں تھا۔ ایسا علم و دانش کہ جہاں بھی ہو خیر کثیر کا سرچشمہ ہوتا ہے اور ہر نیکی و برکت کا منبع ہوتا ہے (و اٰتیناہ الحکمۃ)۔

۱۰۔ قوی منطق، اثر آفرین کلام اور قاطع و عادلانہ فیصلے کی طاقت بھی انھیں عطا کی گئی تھی (وفصل الخطاب)[1]۔
واقعاً کسی حکومت کی بنیادیں علم، طاقت، منطق، تقوائے الٰہی، ضبطِ نفس اور عبودیتِ پروردگار کے بغیر مضبوط نہیں ہو سکتیں۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں، ج ۲۶، ص ۱۸۴

۲۱- وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝

۲۲- إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُودَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ ۝

۲۳- إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ۝

۲۴- قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَا هُمْ ۗ وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ۩ ۝ (السجدة)

۲۵- فَغَفَرْنَا لَهُ ذَٰلِكَ ۖ وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ ۝

ترجمہ

۲۱۔ کیا تجھ تک شکایت کرنے والوں کی داستان پہنچی ہے کہ جو (داؤد کے) محراب سے اوپر گئے تھے؟

۲۲۔ جس وقت (بغیر کسی اطلاع کے) وہ اس کے پاس آپہنچے اور وہ انھیں دیکھ کر گھبرا گیا تو انھوں نے کہا: ڈرنہیں ہم دونوں شکایت لے کر آئے ہیں کہ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ اب تو ہمارے درمیان حق فیصلہ کر دے اور کوئی زیادتی نہ ہونے دے اور راہ راست کی طرف ہماری ہدایت کر۔

۲۳۔ یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس کا اصرار ہے کہ وہ بھی مجھے دے ڈال اور گفتگو میں مجھے دباتا ہے۔

۲۴۔ (داؤد نے) کہا: تیری ایک بھیڑ کا تقاضا کرکے اپنی بھیڑوں میں اضافہ کرنے کے لیے اس نے مسلمًا تجھ پر ظلم کیا ہے اور بہت سے دوست ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں سوائے ان کے کہ جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں مگر ان کی تعداد تھوڑی ہے۔ داؤد نے خیال کیا کہ ہم نے اسے (اس واقعے سے) آزمایا ہے۔ پس اس نے اپنے رب سے بخشش چاہی اور سجدے میں گر پڑا اور اس نے توبہ کی۔

۲۵۔ ہم نے اس کا یہ کام بخش دیا اور وہ ہمارے ہاں مقام بلند اور نیک انجام کا حامل ہے۔

تفسیر

حضرت داؤدؑ کی ایک آزمائش

ان آیات میں حضرت داؤدؑ کے فیصلہ کرنے کے بارے میں سادہ اور واضح گفتگو کی گئی ہے۔ اس ضمن میں جو تحریفات اور غلط تعبیرات کی گئی ہیں ان کے باعث لاشعوری طور پر مفسرین کے درمیان ایک بڑا نزاع پیدا ہوا ہے اس پر اس قدر شور و غوغا ہوا ہے کہ بعض مسلمان مفسرین بھی اس کی زد میں آ گئے ہیں اور انھوں نے اس عظیم نبی کے بارے میں غلط اور کہیں کہیں بہت ہی ناروا فیصلے کیے ہیں۔

ہم سب سے پہلے بغیر کسی تشریح کے آیاتِ قرآنی کا متن پیش کرتے ہیں۔ تاکہ قارئین خالی ذہن کے ساتھ آیات کا مفہوم سمجھ سکیں۔

گزشتہ آیات میں حضرت داؤد علیہ السلام کی خاص صفات بیان کی گئی تھیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر تھا۔ اس کے بعد اب دادرسی اور قضاوت کے سلسلے میں حضرت داؤدؑ کو پیش آنے والے ایک واقعے کا تذکرہ ہے۔

پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: کیا داؤد کی دیوارِ محراب سے اوپر جانے والے شکایت کنندگان کا واقعہ تجھ تک پہنچا ہے (و ھل اتاك نبؤا الخصم اذ تسوروا المحراب)۔

"خصم" کا دراصل مصدری معنی ہے اس کا معنی ہے نزاع اور جھگڑا کرنا لیکن ایسا بہت ہوتا ہے کہ جھگڑے کے طرفین کو "خصم" کہتے ہیں۔ یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں مفاہیم کے لیے بولا جاتا ہے اور کبھی اس کی جمع "خصوم" بھی آتی ہے۔

"تسوروا" "سور" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے ایسی دیوار جو گھر یا شہر کے اطراف پر محیط ہو۔ لیکن توجہ رہے کہ یہ مادہ دراصل پھلانگ لگانے اور اوپر جانے کے معنی میں ہے۔

"محراب" "صدرِ مجلس" (مجلس کے نمایاں ترین مقام) یا اوپر والی منزل کے کمروں کے معنی میں ہے اور چونکہ "مقامِ عبادت" اس میں بنایا جاتا تھا۔ لہٰذا آہستہ آہستہ یہ لفظ "معبد" (عبادت خانہ) کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ روزمرہ میں یہ لفظ خصوصیت سے اس مقام کے لیے استعمال ہونے لگا جہاں امامِ جماعت قیامِ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ مفردات میں منقول ہے کہ "محرابِ مسجد" کو

اس لیے "محراب" کہا جاتا ہے چونکہ یہ شیطان اور ہوائے نفس سے جنگ کی جگہ ہے۔

بہر حال حضرت داؤد علیہ السلام کے اردگرد اگرچہ بہت سے محافظین موجود تھے تاہم وہ آدمی ایک جھگڑے کے سلسلے میں عام راستے سے ہٹ کر محراب اور دیوارِ قصر سے اُوپر آئے اور اچانک آپؑ کے سامنے آدھمکے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: وہ اچانک داؤد کے سامنے آنکلے (بغیر کسی اطلاع کے اور بغیر کسی اجازت کے) لہٰذا ان پر نظر پڑی تو داؤد وحشت زدہ ہوئے اور گھبرائے کیونکہ انھیں خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کا ان کے بارے میں غلط ارادہ ہو (اذ دخلوا علیٰ داؤد ففزع منھم)۔

لیکن انھوں نے بہت جلد آپ کی پریشانی دُور کرتے ہوئے کہا، ڈریں نہیں، ہم دونوں ایک شکایت لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے اور ہم آپ کے پاس داد رسی کے لیے آئے ہیں (قالوا لا تخف خصمان بغٰی بعضنا علیٰ بعض)۔

اب آپ ہمارے بارے میں حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور ظلم روا نہ رکھیں اور راہِ راست کی طرف ہماری ہدایت کریں (فاحکم بیننا بالحق ولا تشطط واھدنا الیٰ سواء الصراط)۔

"تشطط" "شطط" (بروزن "فقط") کے مادے سے دراصل زیادہ دوری کے معنی میں ہے۔ ظلم چونکہ انسان کو حق سے بہت دُور کر دیتا ہے اس لیے لفظ "شطط" اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح جو بات حقیقت سے دُور ہو یہ لفظ اس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اس مقام پر حضرت داؤد کی پریشانی اور دہشت کم ہو گئی لیکن شاید ایک سوال ان کے ذہن میں ابھی باقی تھا، بہت اچھا، تمھارا کوئی غلط ارادہ نہیں ہے، تم صرف قاضی کے پاس شکایت لے کر آئے ہو لیکن اس خلافِ معمول راستے سے آنے کا مقصد؟

لیکن انھوں نے حضرت داؤدؑ کو زیادہ موقع نہ دیا۔ ایک نے شکایت کرنے میں پہل کی، کہنے لگا: یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں، لیکن یہ اصرار کرتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دے، گفتگو میں یہ مجھ پر بھاری ہے اور مجھ سے زیادہ باتونی ہے (ان ھٰذا اخی لہ تسع وتسعون نعجۃ ولی نعجۃ واحدۃ فقال اکفلنیھا وعزنی فی الخطاب)۔

"نعجۃ" "بھیڑ" کے معنی میں ہے۔ جنگلی گائے اور پہاڑی بھیڑ کو بھی "نعجۃ" کہتے ہیں۔

"اکفلنیھا" "کفالت" کے مادے سے ہے۔ یہاں دے دینے کے مفہوم میں ہے (معنی یہ ہے کہ اس کی کفالت میرے سپرد کر دے)

"عزّنی" "عزّت" کے مادہ سے "غلبہ" کے معنی میں ہے۔ یہاں اس لفظ کا معنی ہے "اس نے مجھ پر غلبہ کیا ہے"۔

آیاتِ قرآنی سے ظاہری طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے دوسرے فریق کی بات سُنے بغیر شکایت کرنے والے سے کہا، "اپنی بھیڑوں میں تیری بھیڑ کا اضافہ کرنے کے لیے اس نے تقاضا کر کے ظلم روا رکھا ہے" (قال لقد ظلمک بسؤال نعجتک الیٰ نعاجہ)۔

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں "بہت سے دوست اور ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں" (وان کثیرًا من الخلطاء لیبغی بعضھم علی بعض) [1] سوائے ان کے کہ جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک عمل کیے ہیں" (الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات) "لیکن وہ بہت تھوڑے ہیں" (وقلیل ما ھم) [2]

جی ہاں! معاشرت اور دوستی میں دوسروں کے حق کا لحاظ رکھنے والے اور اپنے دوستوں پر ذرہ بھر بھی زیادتی نہ کرنے والے افراد بہت کم ہیں۔ اپنے دوستوں اور جاننے والوں کا حق پورے عدل و انصاف سے وہی ادا کرسکتے ہیں جو ایمان اور عمل صالح سے خوب بہرہ مند ہیں۔

بہرحال یوں لگتا ہے کہ طرفین یہ بات سن کر مطمئن ہوگئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاں سے چلے گئے۔ لیکن داؤد سوچ میں پڑ گئے۔ انھوں نے فیصلہ تو عدل کی بنیاد پر کیا تھا کیونکہ اگر فریقِ ثانی کو مدعی کا دعویٰ قبول نہ ہوتا تو یقیناً وہ اعتراض کرتا۔ اس کا سکوت اس امر کے لیے بہترین دلیل تھا کہ معاملہ وہی ہے جو شکایت کرنے والے نے پیش کیا ہے لیکن ان سب امور کے باوجود ملتی اقدار کا تقاضا تھا کہ داؤد اپنی بات میں جلدی نہ کرتے بلکہ فریقِ ثانی سے بھی شخصاً سوال کرتے اور پھر فیصلہ سناتے۔ لہٰذا اس کام پر وہ خود پشیمان ہوئے اور داؤد نے گمان کیا کہ اس واقعے کے ذریعے ہم نے اس کا امتحان لیا ہے (وظن داؤد انما فتنٰہ)۔

اس نے استغفار کی، اپنے رب سے طلبِ بخشش کی، سجدے میں گر گیا اور توبہ کی (فاستغفر ربہ وخرّ راکعًا واناب)۔

"خرّ"، "خریر" کے مادے سے آواز کے ساتھ بلندی سے گرنے کے معنی میں ہے جیسے آبشار کی آواز ہوتی ہے۔ سجدہ کرنے والے افراد چونکہ بلندی سے نیچے آتے ہیں اور سجدہ کرتے ہوئے تسبیح کرتے ہیں لہٰذا یہ تعبیر سجدہ کرنے کے لیے کنائے کے طور پر آئی ہے۔

"راکعًا" اس آیت میں یا تو اس بنا پر ہے کہ "رکوع" بھی لغت میں سجدے کے معنی میں آیا ہے یا پھر اس لیے کہ رکوع سجدے کے لیے مقدمہ ہے۔

بہرحال اللہ نے ان پر اپنا لطف و کرم کیا اور اس ترکِ اولیٰ میں ان کی لغزش کو معاف کردیا۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے: ہم نے اس کے عمل کو بخش دیا (فغفرنا لہ ذالک)۔

اور وہ ہمارے نزدیک عالی مقام اور نیک مستقبل کا حامل ہے (وان لہ عندنا لزلفی وحسن مآب)۔

"زلفیٰ" کا معنی ہے "مقام" (اور بارگاہِ الٰہی میں قرب) اور "حسن مآب" بہشت کی اور اُخروی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] "خلطاء" "خلیط" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ایسے اشخاص یا ایسے امور جو ایک دوسرے سے مخلوط ہیں۔ نیز دوست، شریک اور ہمسایے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ظلم و زیادتی اگرچہ صرف ان ہی سے نہیں ہوتی لیکن ان کا خصوصی ذکر یا اس بنا پر ہے کہ ایک دوسرے سے میل جول رکھنے سے لین دین کے بہت سے معاملات پیش آتے رہتے ہیں یا اس بنا پر ہے کہ اپنوں، دوستوں، عزیزوں اور ہمسایوں سے ظلم کی توقع نہیں ہوتی۔

[2] جملہ کی ترکیب یوں ہے "ھم" "مبتدا" "قلیل" اس کی خبر ہے اور "ما" "زائدہ" ہے کہ جو یہاں کمی اور قلت کے جتانے کے لیے آیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **داؤدؑ کو پیش آمدہ واقعے کی حقیقت**: قرآن مجید سے جو کچھ معلوم ہوتا وہ اس سے زیادہ نہیں کہ کچھ افراد دادخواہی کے لیے حضرت داؤد کی محراب سے اوپر چڑھ کر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ پہلے تو آپ گھبرا گئے۔ پھر شکایت کرنے والے کی بات سنی۔ ان میں سے ایک کے پاس ننانوے بھیڑیں تھیں، دوسرے کے پاس صرف ایک بھیڑ تھی۔ ننانوے بھیڑوں والا اپنے بھائی پر زور دے رہا تھا کہ وہ ایک بھیڑ بھی اسے دے دے۔ آپ نے شکایت کرنے والے کو سچا قرار دیا اور دوسرے کے اصرار کو ظلم قرار دیا۔ پھر اپنے کام پر پشیمان ہوئے اور اللہ سے معافی کا تقاضا کیا۔ خدا نے آپ کو بخش دیا۔

یہاں دو تعبیر زیادہ غور طلب ہیں۔ ایک آزمائش اور دوسری استغفار اور توبہ۔ اس سلسلے میں قرآن نے کسی واضح امر کی نشاندہی نہیں کی۔ لیکن زیر نظر آیات اور ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں منقول روایات میں موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ قضاوت میں بہت زیادہ علم و مہارت رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ آپ کو آزمائے لہٰذا آپ کو ایسے غیر معمولی حالات پیش آئے (مثلاً اُن آدمیوں کا عام راستے سے ہٹ کر محراب کے اوپر سے آپ کے پاس آپہنچنا) آپ نے جلد بازی کی اور اس سے پہلے کہ فریق ثانی سے وضاحت طلب کرتے آپؑ نے فیصلہ سُنا دیا اگرچہ فیصلہ عادلانہ تھا۔

اگرچہ آپ بہت جلد اپنی اس لغزش کی طرف متوجہ ہوگئے اور وقت گزرنے سے پہلے اس کی تلافی کی۔ لیکن بہرحال جو کام آپؑ سے سرزد ہوا تھا وہ نبوت کے مقام بلند کے شایان نہ تھا۔ اس لیے آپؑ نے اس ترکِ اولیٰ پر استغفار کی اور اللہ نے بھی انھیں عفو و بخشش سے نوازا۔

مذکورہ تفسیر کی شاہد وہ آیت ہے جو زیر بحث آیات کے فوراً بعد آئی ہے۔ اس میں حضرت داؤدؑ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تجھے زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے، لہٰذا لوگوں کے درمیان حق و عدالت کے مطابق فیصلہ کر اور ہوا و ہوس کی پیروی نہ کر۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی لغزش فیصلے کے طریقے میں تھی۔ لہٰذا مذکورہ بالا آیات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس عظیم نبی کی شان اور مقام کے خلاف ہو۔

۲۔ **موجودہ تورات کی خرافاتی داستان**: اب ہم تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتی ہے؛ نیز بعض ناآگاہ اور بے خبر افراد نے جو تفسیریں کی ہیں، ان کی اصل خبر بھی تلاش کرتے ہیں۔

تورات کی دوسری کتاب اشموئیل کی فصل ۱۱ میں جملہ ۲ تا ۲۷ میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

> ہُوا یہ کہ وقتِ غروب داؤد اپنے بستر سے اٹھا اور بادشاہ کے گھر کی چھت پر گردش کی۔ پشتِ بام سے ایک عورت کو دیکھا کہ جو غسل کر رہی ہے۔ وہ عورت بہت ہی خوبصورت اور جاذبِ نظر تھی۔ داؤد نے کسی کو بھیجا اور اس عورت کے بارے میں استفسار کیا۔ کسی نے کہا کہ کیا وہ اوریّاہ[۱] حتّی کی بیوی

---

[۱] "اوریّاہ" حضرت داؤد کی فوج کے اہم افسروں میں سے تھے۔ اور "حتّی" "حت بن کنعان" کی طرف نسبت ہے کہ جس کے قبیلے کو بنی حت کہتے ہیں۔

بت شبع بنت الیعام[1] تو نہیں۔

داؤد نے ایلچی بھیج کر اسے منگوالیا۔ وہ اس کے پاس آئی۔ داؤد اس کے ساتھ سویا۔ وہ اس کی نجاست سے پاک ہونے کے بعد اپنے گھر واپس چلی گئی۔ وہ عورت حاملہ ہوگئی۔ اس نے کسی کو بھیج کر داؤد کو خبر کی کہ میں حاملہ ہوں۔ داؤد نے یوآب[2] کو کہلا بھیجا کہ اوریاہ حتّی کو میرے پاس بھیج دے۔ یوآب نے اوریاہ حتّی کو اس کے پاس بھیجا۔ اوریاہ حتّی اس کے پاس آیا۔ داؤد نے یوآب کی سلامتی اور جنگ میں اچھا وقت گذارنے کے بارے میں پوچھا۔ پھر داؤد نے اوریاہ سے کہا: اپنے گھر میں جا اور اپنے پاؤں دھو۔ اوریاہ بادشاہ کے گھر سے باہر آیا۔ اس کے پیچھے بادشاہ کی طرف سے کچھ کھانا باہر گیا لیکن اوریاہ بادشاہ کے گھر کے آگے اپنے آقا کے سارے بندوں کے ہمراہ سوگیا اور اپنے گھر میں نہ گیا۔ جب داؤد کو خبر دی گئی کہ اوریاہ اپنے گھر میں نہیں گیا تو داؤد نے اوریاہ سے کہا: کیا تو سفر سے نہیں لوٹا؟ اپنے گھر میں کیوں نہیں گیا؟

اوریاہ نے داؤد سے عرض کی: صندوق، اسرائیل اور یہودا سائبانوں میں قیام پذیر ہیں۔ میرا آقا یوآب اور میرے آقا کے غلام صحرا میں خیمہ نشین ہیں، کیا ہوسکتا ہے کہ میں کھانے پینے اور اپنی بیوی کے ساتھ سونے کے لیے اپنے گھر جاؤں؟ آپ کی جان کی قسم میں یہ کام نہیں کروں گا......

ہوا یہ کہ داؤد نے صبح ایک خط یوآب کو لکھا اور اوریاہ کے ہاتھ بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ اوریاہ کو شدید جنگ میں دھکیل دو اور خود اس کے پیچھے سے ہٹ جاؤ تاکہ یہ مارا جائے اور مر جائے۔

اسی طرح ہوا۔ یوآب نے شہر کا جائزہ لینے کے بعد اوریاہ کو ایسی جگہ پر رکھا جہاں اسے علم تھا کہ بہادروں کی ضرورت ہے۔

شہر کے مردوں نے باہر آکر یوآب سے جنگ کی۔ داؤد کے غلاموں کی قوم میں سے بعض گرے۔ اوریاہ حتّی بھی مرگیا ــــــــ اوریاہ کی بیوی نے اپنے شوہر کی موت کا سنا تو خصوصیت سے اپنے شوہر کا سوگ منایا۔ جب یہ سوگ ختم ہوا تو داؤد نے اسے بلوا بھیجا اور اسے اپنے گھر لایا کہ وہ اس کی بیوی ہوگئی......

لیکن جو کام داؤد نے کیا تھا خدا کو پسند نہیں آیا۔[3]

---

[1] "بت شبع" اس عورت کا نام ہے (توریت کے بقول) حضرت داؤد نے چھت سے اسے برہنہ دیکھا اور اس کے عشق کی آگ آپ کے دل میں بھڑک اٹھی۔ یہ عورت ایک صاحب منصب عبرانی شخص "الیعام" کی بیٹی تھی۔

[2] "یوآب" حضرت داؤد کی فوج کا کمانڈر تھا۔

[3] کتاب اشموئیل، فصل ۱۱ جملہ ۲ تا ۲۷

اس داستان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز داؤد اپنے محل کی چھت پر جاتے ہیں۔ ساتھ والے گھر میں ان کی نظر پڑتی ہے تو انھیں ایک عورت غسل کرتے ہوئے برہنہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ پھر جیسے بن پڑتا ہے اسے اپنے گھر لے آتے ہیں اور وہ داؤد سے حاملہ ہوجاتی ہے۔ اس عورت کا شوہر لشکرِ داؤد کا ایک اہم افسر تھا۔ وہ ایک پاک طینت اور باصفا شخص تھا۔ داؤد (نعوذ باللہ) ایک بزدلانہ سازش کے ذریعے اسے ایک خطرناک جنگ میں بھجوا کر قتل کروا دیتے ہیں اور پھر اس کی بیوی کو قانونی طور پر اپنے نکاح میں لے آتے ہیں۔

اب آپ داستان کا باقی حصّہ موجودہ تورات کی زبانی سنیں۔ اسی کتاب دوم اشموئیل کی ۱۲ ویں فصل میں ہے۔

خداوند نے ناثان[1] کو داؤد کے پاس بھیجا اور کہا:

ایک شہر میں دو آدمی رہتے تھے۔ ایک امیر تھا دوسرا غریب۔ امیر آدمی کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں۔ غریب کے پاس بھیڑ کے ایک بچے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک روز ایک مسافر امیر آدمی کے ہاں آیا۔ اس نے اپنی بھیڑوں میں سے مہمان کے لیے غذا تیار کرنے میں پس وپیش کیا۔ غریب کا بھیڑ کا بچہ لے کر اسے ذبح کر دیا۔

اب کیا ہونا تھا، داؤد انتہائی غصّے ہوئے۔ ناثان سے کہنے لگے: بخدا جس نے یہ کام کیا وہ قتل کا مستحق ہے۔ اسے ایک بھیڑ کی جگہ پر چار بھیڑیں دینی چاہییں۔ لیکن ناثان نے داؤد سے کہا: "وہ شخص تو ہے۔"

داؤد اپنے غلط کام کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی لیکن اس کے باوجود ان پر بھاری مصیبتیں آئیں۔

اس مقام پر تورات میں ایسی عبارت ہے جس کے ذکر سے قلم کو شرم آتی ہے لہٰذا ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ تورات کی داستان کے اس حصے میں بعض نکات خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں، مثلاً:

۱۔ حضرت داؤد کے پاس کوئی شخص قضاوت کے لیے نہیں آیا، بلکہ ان کے ایک مشیر جو نبی تھے انھوں نے نصیحت کے طور پر ان سے ایک داستان بیان کی۔ اس میں دو بھائیوں کا واقعہ اور ان میں سے ایک کا دوسرے سے تقاضا کرنا مذکور نہیں ہے بلکہ ایک امیر اور ایک غریب آدمی کا ذکر ہے جن میں سے ایک کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں جبکہ دوسرے کے پاس بھیڑ کا صرف ایک بچہ تھا لیکن امیر آدمی نے اپنے مہمان کے لیے غریب آدمی کا بھیڑ کا بچہ ذبح کر دیا۔ اس واقعے میں محراب کی دیوار سے اوپر جانے کا ذکر ہے، نہ آپ کے دہشت زدہ ہوجانے کی بات ہے، نہ دو بھائیوں کے دعوے کا معاملہ ہے اور نہ ہی توبہ و بخشش کی درخواست کا بیان ہے۔

۲۔ داؤد نے اس ظالم امیر شخص کو قتل کا مستحق سمجھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ کے لیے آخر قتل کیوں؟

---

[1] بنی اسرائیل کے ایک نبی اور حضرت داؤد کے مشیر

۳۔ ساتھ ہی انھوں نے اس حکم کے خلاف حکم صادر کیا اور کہا کہ ایک بھیڑ کے بدلے اُسے چار بھیڑیں دینی چاہییں۔ آخر کس بناء پر؟

۴۔ داؤد نے اوریاہ کی بیوی کے بارے میں خیانت سے متعلق اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔

۵۔ خدا نے انھیں معاف کر دیا (اتنی آسانی سے، کس بناء پر؟)۔

۶۔ اللہ نے داؤد کے بارے میں عجیب و غریب سزا کا فیصلہ کیا کہ جسے نقل نہ کرنا بہتر ہے۔

۷۔ یہی عورت ایسے "روشن ماضی" کے باوجود سلیمان کی ماں بنی۔

ان داستانوں کا ذکر واقعتاً تکلیف دہ ہے لیکن کیا کیا جا سکتا ہے کہ بعض جاہل افراد نے نادانی سے ان اسرائیلی روایات کے زیرِ اثر قرآن مجید کی پاک و پاکیزہ آیات کا چہرہ بھی سیاہ کر دیا ہے اور ایسی باتیں کہی ہیں کہ حق کو واضح کرنے کے لیے اس رُسوا داستان کا کچھ حصہ ذکر کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

اب ہم سوال کرتے ہیں:

۱۔ وہ نبی کہ گزشتہ آیات میں اللہ نے جس کے دس عظیم اوصاف بیان کیے ہیں اور پیغمبر اسلام کو جس کی سرگزشت سے ہدایت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے، کیا ممکن ہے کہ ان تہمتوں کے ہزارویں حصے کی بھی اس کی طرف نسبت دی جا سکے؟

۲۔ قرآن مجید بعد کی آیات میں کہتا ہے:

یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض

اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں اپنا خلیفہ اور نمائندہ بنایا

کیا یہ آیت مذکورہ خرافات سے ہم آہنگ ہے؟

۳۔ اگر کوئی عام شخص ہو، خدا کا نبی نہ ہو اور وہ اس قسم کے جرم کا مرتکب ہو، اپنے وفادار پاک طینت با ایمان افسر کی بیوی کو ایسے گھٹیا طریقے سے اس کے ہاتھوں سے کھسکا لے تو لوگ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گے اور اس کی سزا کیا ہو گی؟ یہاں تک کہ اگر یہ کام افسق الفاسقین سے سرزد ہو تب بھی جائے تعجب ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تورات نے حضرت داؤد کو پیغمبر قرار نہیں دیا تاہم ان کا ذکر ایک بلند مرتبہ عادل حکمران کے طور پر کیا ہے، کہ جو بنی اسرائیل کے عظیم عبادت خانے کا مؤسس تھا۔

۴۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تورات کی مشہور کتب میں سے ایک "مزامیر داؤد" ہے جس میں حضرت داؤد کی مناجات ہیں۔ کیا ایسے شخص کی مناجات اور باتیں کتبِ آسمانی کا حصہ قرار دی جا سکتی ہیں؟

۵۔ جو شخص تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ موجودہ تحریف شدہ تورات کی داستانیں خرافات کا ایسا مجموعہ ہیں جو مکتبِ انبیاء کے دشمنوں یا بہت ہی بے شعور اور جاہل افراد کی ساختہ و پرداختہ ہیں۔ لہٰذا انھیں کس طرح بحث کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے؟

جی ہاں! قرآن کی یہ عظمت ہے کہ وہ ایسی خرافات سے بالکل پاک ہے۔

۲۔ **اسلامی روایات اور قصۂ داؤدؑ:** اسلامی روایات میں تورات کی بیان کردہ قبیح اور بے ہودہ داستان کی نہایت سختی سے تکذیب کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

لا اوتی برجل یزعم ان داؤد تزوج امرئة اوریا الا جلدته حدین حدًا للنبوة وحدًا للاسلام

اگر کسی ایسے شخص کو میرے پاس لایا جائے کہ جو یہ کہے کہ داؤدؑ نے اوریاہ کی بیوی سے شادی کی، تو میں اس پر دو حدیں جاری کروں گا ایک حد نبوت کے لیے اور دوسری اسلام کے لیے[1]

کیونکہ اس میں ایک طرف تو ایک مرد مومن کی طرف ایک غیر شرعی امر کی نسبت ہے اور دوسری طرف مقام نبوت کی ہتک حرمت ہے۔ لہٰذا ایسی بات کرنے والے پر دو مرتبہ حدِ قذف جاری ہونی چاہیے اور اسے دو مرتبہ اسّی کوڑے لگائے جانے چاہییں۔

امام بزرگوار حضرت علیؑ ہی سے یہی مفہوم ایک اور انداز سے منقول ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

من حدثکم بحدیث داؤد علی ما یرویه القصاص جلدته مائة وستین

جو شخص تم سے قصۂ داؤدؑ اس طرح بیان کرے کہ جیسے افسانہ گو کہتے ہیں تو میں اسے ایک سو ساٹھ کوڑے لگاؤں گا[2]

ایک اور حدیث شیخ صدوق نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے امالی میں درج کی ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

ان رضا الناس لا یملك، والسنتهم لا تضبط، الم ینسبوا داؤد الی انه تبع الطیر حتی نظر الی امرئة اوریا فهواها، و انه قدم زوجها امام التابوت حتی قتل تزوج بها

سب لوگوں کو راضی نہیں کیا جا سکتا اور نہ سب کی زبانیں بند کی جا سکتی ہیں۔ کیا انھوں نے یہ (انتہائی قبیح) تہمت داؤدؑ پر نہیں باندھی کہ وہ ایک پرندے کے پیچھے اپنے محل کی چھت پر گئے تو ان کی نظر اوریاہ کی بیوی پر پڑی اور وہ اس پر فریفتہ ہو گئے۔ پھر اس کے شوہر کو میدان جنگ میں تابوت کے آگے آگے بھیج دیا (جس میں انبیاء بنی اسرائیل کی یادگاریں رکھی جاتی تھیں اور برکت کے طور پر اسے فوج کے آگے آگے رکھا جاتا تھا)۔ یہاں تک کہ وہ مارا گیا اور پھر انھوں نے اس کی بیوی سے شادی کر لی (جب اللہ کا عظیم نبی لوگوں کی زبان سے مامون نہ رہا ہو تو دوسروں کو ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے)[3]

ایک حدیث عیون الاخبار میں امام علی بن موسیٰ الرضا علیہم السلام سے منقول ہے۔ آپؑ مختلف مذاہب کے اربابِ مذہب سے

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخرالدین رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[3] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۶، بحوالہ امام صدوق۔

عصمتِ انبیاء کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس دوران میں آپؑ نے حاضرین میں سے علی بن جہم سے فرمایا: "تم داؤدؑ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

اس نے کہا: کہتے ہیں کہ داؤد اپنی محراب میں مشغولِ عبادت تھے کہ شیطان ایک خوبصورت پرندے کی صورت میں ان کے سامنے آیا۔ داؤد نے نماز توڑ دی اور اس پرندے کے پیچھے ہو لیے .... پھر انھوں نے اوریاہ کی بیوی کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو اس پر عاشق ہو گئے۔ پھر انھوں نے اس کے شوہر کو تابوت کے آگے آگے میدانِ جنگ میں بھجوا دیا، وہ مارا گیا تو داؤد نے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔

اس نے یہ افسانہ بیان کیا تو امام علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ بہت ناراض ہوئے، آپؑ کو بہت دکھ ہوا، آپؑ نے اپنا ہاتھ پیشانی پر ملا اور فرمایا:۔

انا لله و انا الیه راجعون،
لقد نسبتم نبیاً من انبیاء الله الی التهاون بصلاته حتی خرج
فی اثر الطیر، ثم بالفاحشة ثم بالقتل
انا لله و انا الیه راجعون،

تم نے انبیاءِ الٰہی میں سے ایک نبی کی طرف اپنی نماز میں سُستی کرنے اور اسے معمولی سمجھنے کی نسبت دی۔ یہاں تک کہ (تمھاری نسبت کے مطابق وہ بچوں کی طرح) پرندے کے پیچھے گیا۔ پھر تم نے اس کی طرف فحشاء اور بُرائی کی نسبت دی اور اس کے بعد ایک بے گناہ انسان کے قتل سے متہم کیا۔

علی بن جہم نے پوچھا: پھر داؤد کی لغزش کیا تھی کہ جس پر انھوں نے استغفار کی اور قرآن میں جس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔
امامؑ نے مسئلہ قضاوت میں حضرت داؤدؑ کی جلد بازی کا ذکر کیا اور بعد والی آیت کو بطور شاہد پیش فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

یا داؤد انا جعلناك خلیفة فی الارض
اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے

امامؑ فرماتے ہیں:۔

حضرت داؤدؑ کے زمانے میں جن عورتوں کے شوہر مر جاتے یا قتل ہو جاتے وہ پھر کبھی شادی نہ کرتی تھیں (اور یہ امر بہت سی برائیوں اور قباحتوں کی بنیاد تھا) حضرت داؤدؑ وہ پہلے شخص تھے جن پر اللہ نے اس کام کو مباح قرار دیا (تاکہ یہ رسم ختم ہو جائے اور بیوہ عورتیں اس مصیبت سے نجات پائیں) للہٰذا جب اوریا اتفاق سے ایک جنگ میں) مارے گئے تو داؤدؑ نے ان کی بیوی سے شادی کر لی، اور یہ امر اس زمانے کے لوگوں پر بہت گراں گزرا (اور بعد ازاں اس پر انھوں نے افسانے گھڑ لیے) [1]

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۴۵ بحوالہ عیون الاخبار

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ اوریاہ کی ایک سادہ سی حقیقت پر بنیاد تھی۔ حضرت داؤدؑ نے ایک کام الٰہی ذمہ داری کے طور پر انجام دیا تھا۔ لیکن دانا دشمنوں، نادان دوستوں اور افسانہ طرازوں نے کہ جنھیں عجیب و غریب باتیں بنانے اور جھوٹ گھڑنے کی عادت تھی اس واقعے پر خوب حاشیہ آرائی کی اور ایسی ایسی باتیں بنائیں کہ انسان کو وحشت ہوتی ہے۔

کسی نے کہا: اس شادی کی کچھ نہ کچھ بنیاد تو ضرور ہے۔

دوسرے نے کہا: ضروری بات ہے کہ اوریا کا گھر داؤدؑ کی ہمسائیگی میں ہوگا۔

آخر کسی نے داؤدؑ کی نظریں اوریا کی بیوی پر ڈلوائیں، پرندے کا قصّہ گھڑا۔

آخر کار اس عظیم پیغمبرؑ کو طرح طرح کے شرمناک گناہانِ کبیرہ سے متہم کیا گیا۔ پھر بے وقوف جاہلوں نے ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچایا اور اگر اس افسانے کا ذکر مشہور کتب میں نہ ہوتا تو ہم بھی اسے نقل کرنا غلط سمجھتے۔

البتہ حضرت امام رضا علیہ السلام کی مذکورہ روایت امیرالمومنین علی علیہ السلام کی روایت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول حدیث میں اس مشہور جھوٹی داستان کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں (نعوذ باللہ) اس عظیم نبی کی طرف زنا وغیرہ کی نسبت دی گئی ہے۔

مفسّرین کی توجیہات

بعض مفسّرین نے قصّۂ داؤدؑ سے متعلق کچھ اور توجیہات کی ہیں۔ وہ توجیہات اگرچہ آیات کے ظاہری مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہیں تاہم تکمیلِ بحث کے لیے ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرنا ہم غیر مناسب نہیں سمجھتے۔

۱۔ ایک یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے اوقات کو ایک پروگرام کے تحت منظم کیا ہوا تھا اور مخصوص اوقات کے علاوہ آنے والوں سے نہیں ملتے تھے۔ ایک روز دو افراد کہ جو آپ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے وہ محراب کی دیوار سے اوپر چڑھ آئے۔ جبکہ آپ محراب میں عبادتِ الٰہی میں مشغول تھے۔ جب انھوں نے آپ کے گرد محافظین کو دیکھا تو ڈر گئے لہٰذا انھوں نے فوراً ایک جھوٹ گھڑا۔ کہنے لگے ہم دونوں ایک شکایت لے کر آپ کے پاس فیصلے کے لیے آئے ہیں اور پھر وہ ماجرا بیان کیا کہ جو قرآن میں آیا ہے۔ حضرت داؤدؑ نے ان کے درمیان فیصلہ تو کر دیا لیکن چونکہ جانتے تھے کہ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہیں لہٰذا غصّے ہوئے اور ان سے انتقام لینے کا ارادہ کیا لیکن زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ آپ اپنے اس ارادے پر پشیمان ہوئے اور استغفار کی۔[1]

۲۔ المیزان کے عظیم مفسّر نے اس سلسلے میں جو بات کہی ہے وہ بنیادی طور پر اس سے ہم آہنگ ہے جو دیگر عظیم مفسرینِ اسلام نے قصّۂ داؤدؑ کی تفسیر میں کہی ہے۔ ہم بھی سطورِ بالا میں اسے بیان کر آئے ہیں۔ لیکن صاحب المیزان کا بیان چند ایک جہات سے مختلف ہے۔ لہٰذا ہم اسے یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

بہت سے مفسّرین کا نظریہ ہے کہ حضرت داؤدؑ کے پاس شکایت کے لیے آنے والے دو فرشتے تھے

---

[1] "فخر رازی" اور "روح المعانی" کی تفسیر میں یہ بحث ایک ہی مضمون کے تحت ذکر کی گئی ہے۔ اور "مراغی" نے بھی اپنی تفسیر میں اسی بات کو قبول و تسلیم کیا ہے۔

جنھیں اللہ نے داؤدؑ کی آزمائش کی غرض سے بھیجا تھا لیکن داستان کی خصوصیات مثلاً محراب سے اوپر جانا اور خلاف معمول طریقے سے داؤدؑ کے پاس جانا اور ان کا گھبرا جانا، نیز یہ کہ یہ واقعہ ایک الٰہی آزمائش تھا یہ سب چیزیں نشاندہی کرتی ہیں کہ فرشتوں کے تمثل کی صورت میں دو آدمیوں کے لباس میں رونما ہوا تھا (تمثل سے مراد یہ ہے کہ خارجی وجود میں کوئی بھی نہیں آیا تھا بلکہ حضرت داؤدؑ کی قوتِ ادراک میں یوں ہوا کہ دو فرشتے تھے جو انسانوں کی صورت میں آئے تھے)۔

لہٰذا اس دعویٰ میں انھوں نے جو حکم صادر کیا وہ ظرفِ تمثل میں تھا جیسے انھوں نے خواب دیکھا ہو، تو جیسے عالمِ خواب میں رونما ہونے والے واقعات میں انسان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، ظرفِ تمثل میں بھی اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، ذمہ داری کا تعلق تو عالمِ شہود سے ہے یعنی عالمِ مادہ سے، اور اگر کوئی خطاء حضرت داؤد سے سرزد ہوئی بھی ہے تو اس کا تعلق اسی ظرفِ تمثل سے ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو مقامِ عصمت کے منافی ہو، بہشت میں آدمؑ کی خطاء کی طرح، زمین پر اترنے سے پہلے کہ جو تکلیفِ شرعی اور ذمہ داری کا مقام ہے، اس لحاظ سے حضرت داؤدؑ نے جو استغفار کی وہ ایک حقیقی گناہ سے استغفار نہ تھی۔[1]

لیکن آیات کا ظاہری مفہوم یقیناً یہ ہے کہ شکایت اور دعویٰ دائر کرنے والے افراد خارجی وجود رکھتے ہیں، تاہم مذکورہ فیصلہ گناہ نہ تھا، کیونکہ یہ فیصلہ شکایت کنندہ کی گفتگو سن کر علم و یقین حاصل کرنے کے بعد تھا۔ اگرچہ قضاوت کے مستحب آداب کا تقاضا تھا کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیا جاتا اور ان کی استغفار بھی اسی ترکِ اولیٰ پر تھی۔

بہر حال اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس واقعے کو ہم ظرفِ تمثل سے متعلق سمجھیں یا اسے بعض کے بقول خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت داؤد کو متنبہ کرنے کے لیے ایک آزمائش قرار دیں، بہتر یہی ہے کہ آیات کے ظاہری مفہوم کی حفاظت کی جائے اور جیسا کہ کہا گیا ہے ایسی تفسیر کی جائے کہ جس سے آیت کے الفاظ کا ظہور بھی محفوظ رہتا ہو اور انبیاء کے مقامِ عصمت پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔

---

[1] المیزان، جلد ۱۷ ص ۲۰۲

۲۶۔ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝

۲۷۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاۗءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝

۲۸۔ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝

۲۹۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں (اپنا) خلیفہ (اور نمائندہ) قرار دیا ہے۔ لوگوں کے درمیان کے حق کے مطابق فیصلہ کر اور ہوائے نفس کی پیروی نہ کر کیونکہ یہ تجھے راہِ حق سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ راہِ خدا سے منحرف ہوجائیں، روزِ حساب کو فراموش کرنے کی بنا پر ان کے لیے شدید عذاب ہے۔

۲۷۔ ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے فضول پیدا نہیں کیا، یہ کافروں کا گمان ہے، وائے ہے کافروں کے لیے، (جہنم کی) آگ سے۔

۲۸۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انھوں نے عملِ صالح انجام دیئے ہیں، کیا ہم انھیں زمین میں فساد برپا کرنے والوں کی طرح قرار دے دیں یا پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح قرار دے لیں؟

۲۹۔ یہ بابرکت کتاب ہے کہ جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور اہلِ فکر و نظر متوجہ ہوں۔

تفسیر

عدل کرو اور ہوائے نفس سے بچو

گزشتہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اب آخر میں حضرت داؤد سے خطاب فرماتے ہوئے ان کے بلند کردار کا ذکر کیا جارہا ہے اور ساتھ ساتھ ان کی سنگین ذمہ داریوں کا ذکر دوٹوک انداز میں اور معنی خیز عبارت کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں (اپنا) خلیفہ (اور نمائندہ) قرار دیا ہے۔ لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کر اور ہوائے نفس کی پیروی نہ کر کیونکہ وہ تجھے راہِ خدا سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے منحرف ہو جائیں ان کے لیے روزِ حساب کو فراموش کرنے کی وجہ سے شدید عذاب ہے (یاداؤد انا جعلناك خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق و لا تتبع الهوٰی فیضلك عن سبیل الله ان الذین یضلون عن سبیل الله لهم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب)۔

اس آیت میں حضرت داؤد کے بلند مرتبے کا ذکر ہے اور ان کے اہم منصب کی بات کی گئی ہے۔ اس آیت کا مضمون نشاندہی کرتا ہے کہ زوجۂ اوریا کے ساتھ ان کی شادی کے لوگوں نے جو جھوٹے افسانے تراشے ہیں وہ کس قدر بے بنیاد ہیں۔

کیسے ممکن ہے کہ اللہ ایسے شخص کو زمین کی خلافت سونپ دے اور مقامِ قضاوت اس کے سپرد کر دے جو مومنین اور اپنے یار و انصار کی ناموس پر خیانت بھری نظریں گاڑے ہوئے ہو اور اس کا ہاتھ بے گناہوں کے خون سے آلودہ ہو؟

اس آیت میں پانچ جملے ہیں اور ہر جملہ ایک حقیقت کا ترجمان ہے۔

پہلی حقیقت زمین میں داؤد کا مقامِ خلافت ہے۔ اس سے مراد گزشتہ انبیاء کی خلافت و جانشینی ہے یا خلافتِ الٰہی؟ ہماری نظر میں دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے اور یہی معنی سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰ سے ہم آہنگ ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے:

و اذ قال ربك للملائکة انی جاعل فی الارض خلیفة

اس وقت کو یاد کر جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں۔

البتہ لفظ خلافت کے حقیقی معنی کے لحاظ سے تو اللہ کی خلافت کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ یہ تو ان کے لیے ہوتی ہے جن کے لیے وفات یا غیبت کا معنی صادق آتا ہو۔ یہاں اس سے مراد بندوں میں اس کی نمائندگی اور زمین میں اس کے فرامین کا اجراء ہے۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ زمین میں حکومت کا منشاء و مصدر حکومتِ الٰہی ہونا چاہیے اور جو حکومت اس راستے کے علاوہ ہو وہ ظالمانہ اور غاصبانہ حکومت ہے۔

دوسرے جملے میں حکم دیا جارہا ہے کہ اب جبکہ تجھے یہ عظیم نعمت دی جاچکی ہے، تیری ذمہ داری ہے کہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کر۔ درحقیقت خلافت الٰہیہ کا نتیجہ حق کی حکومت ہے۔ اس جملے سے یہ استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ حق حکومت بھی صرف خلافتِ الٰہیہ سے پیدا ہوتا ہے اور براہِ راست اسی کا نتیجہ ہے۔

تیسرے جملے میں ایک حاکم عادل کو درپیش اہم ترین خطرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہوائے نفس کی

ہرگز پیروی نہ کرنا۔

جی ہاں! ہوائے نفس حقیقت بین انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک ضخیم پردہ ڈال دیتی ہے اور اس کے اور عدالت کے درمیان جدائی ڈال دیتی ہے۔

لہٰذا چوتھے جملے میں فرمایا گیا ہے: اگر تو نے ہوائے نفس کی پیروی کی تو وہ تجھے راہِ خدا سے کہ جو راہِ حق ہے بھٹکا دے گی۔

لہٰذا جہاں کہیں بھی گمراہی ہے اس میں ہوائے نفس کا ہاتھ ہے اور جہاں بھی ہوائے نفس ہے اس کا نتیجہ گمراہی ہے، جو حاکم ہوائے نفس کا پیرو ہو وہ لوگوں کے مفادات و حقوق کو اپنی اغراض پر قربان کر دے گا۔ اسی لیے اس کی حکومت ناپائیدار ہوگی اور شکست کا سامنا کرے گی۔

ہو سکتا ہے اس مقام پر ہوائے نفس کا ایک وسیع معنی ہو کہ جس میں انسان کی اپنی خواہشِ نفس بھی شامل ہے اور لوگوں کی خواہشات بھی۔ اس طرح قرآن ان تمام مکاتب کی نفی کرتا ہے کہ جو عوامی افکار کی پیروی کو حکومتوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کا نتیجہ طریقِ الٰہی اور صراطِ حق سے گمراہی ہے۔

موجودہ زمانے میں ہم اس طرزِ فکر کے ذلت بار نتائج کے شاہد ہیں جو بزعمِ خود متمدن دنیا میں رُونما ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات لوگوں کی خواہشات کے باعث قبیح ترین اعمال بھی قانونی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل نے ذلت و رسوائی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ قلم کو بیان کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہے۔

یہ درست ہے کہ حکومت کی اساس و بنیاد عوام ہی کو ہونا چاہیے اور ان کی شرکت ہی سے حکومت تشکیل پانا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حق و باطل کا معیار ہر جگہ اور مسئلے میں اکثریت کی خواہشات قرار پا جائیں۔ حکومت کے ستون حق پر استوار ہونے چاہئیں اور ان کی تعمیر و استحکام کے لیے عوامی قوت سے مدد لینا چاہیے اور "اسلامی جمہوریہ" کا یہی معنی ہے۔ یہ اصطلاح "اسلامی" اور "جمہوریہ" دو لفظوں سے مرکب ہے اور اسی کے ہم قائل ہیں۔ بالفاظِ دیگر اصول مکتبِ دین سے لیے جائیں اور ان کے اجراء کے لیے لوگوں کو شریک کیا جائے (غور کیجیے گا)۔

آخر میں پانچویں جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ راہِ حق سے گمراہی کا سرچشمہ "یوم الحساب" کی فراموشی ہے اور اس کا نتیجہ شدید عذابِ الٰہی ہے۔

اصولی طور پر روزِ قیامت کی فراموشی ہمیشہ گمراہیوں کا سرچشمہ ہے اور ہر گمراہی میں اس فراموشی کا حصہ ہے اور یہ اصولِ معاد کی طرف توجہ، انسانی زندگی میں اس کے تربیتی اثر کو واضح کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی کتب میں منقول روایات بہت غور طلب ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور حدیث پیغمبرِ گرامیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ انھوں نے فرمایا:

ایھا الناس ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان اتباع الھوٰی وطول الامل فاما اتباع الھوٰی فیصد عن الحق واما طول الامل فینسی الاٰخرۃ

اے لوگو! دہشت ناک ترین چیزیں دو ہیں کہ جن کی جانب سے میں تمھارے بارے میں ڈرتا ہوں،

ایک ہے ہوا و ہوس کی پیروی اور دوسری ہے لمبی چوڑی امیدیں۔ ہوا و ہوس کی پیروی تو تمھیں حق سے منحرف کر دے گی اور لمبی چوڑی امیدیں تمھیں قیامت بھلا دیں گی۔[1]

حق ہے کہ اس جملے کو آبِ زر سے لکھا جائے اور یہ ہر دیکھنے والے بالخصوص حکمرانوں، قاضیوں اور اہلِ منصب کے سامنے رہے

ایک اور روایت کہ جو امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے، اس میں آپؑ فرماتے ہیں:

ثلاث موبقات: شح مطاع وھوی متبع واعجاب المرء بنفسہ

تین چیزیں آدمی کو ہلاک کر دیتی ہیں:

۱۔ اطاعت کے موقع پر بخل،

۲۔ ہوائے نفس کہ جس کی پیروی کی جائے اور

۳۔ انسان کا اپنے آپ سے خوش ہونا[2]

حضرت داؤدؑ کی زندگی اور زمین میں ان کے لیے خلافتِ الٰہی کا ذکر کرنے کے بعد جہانِ ہستی کے باہدف و بامقصد ہونے کا ذکر آیا ہے تاکہ زمین پر حکومت کی جہت واضح ہو جائے کہ جو اس تمام نظامِ ہستی کا ایک حصہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آسمان و زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اسے ہم نے باطل اور فضول پیدا نہیں کیا، یہ تو کافروں کا گمان ہے، افسوس کافروں پر آتشِ دوزخ سے (وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلاً ذٰلك ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار)۔

اہم ترین مسئلہ کہ جو تمام حقوق کا سرچشمہ ہے وہ خلقت کا باہدف و بامقصد ہونا ہے۔ جب ہم نے تخلیقِ کائنات کے بارے میں اپنے عقیدے میں یہ بات قبول کر لی کہ یہ عالمِ وسیع خداوندِ بزرگ نے فضول پیدا نہیں کیا تو فوراً ہمیں اس کے ہدف کی تلاش ہوتی ہے۔ اس ہدف کو مختصر الفاظ میں "تکامل"، "تعلیم" اور "تربیت" کے معنی خیز الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حکومتوں کو بھی اسی راستے پر گامزن ہونا چاہیے۔ انھیں تعلیم و تربیت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہئیں اور انھیں انسانوں کے روحانی کمال کا ذریعہ ہونا چاہیے۔

دوسرے الفاظ میں عالمِ ہستی حق و عدالت کی بنیاد پر قائم ہے اور حکومتوں کو بھی پوری کائنات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے یعنی انھیں حق و عدالت کے اصولوں پر استوار ہونا چاہیے۔

ضمنی طور پر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ گزشتہ آیت کا آخری جملہ کہ جس میں روزِ جزا کی فراموشی کا ذکر ہے: زیرِ بحث آیت کے مضمون سے پوری طرح ہم آہنگ ہے کیونکہ مقصدِ تخلیقِ کائنات کا تقاضا ہے کہ روزِ جزا موجود ہے اور جیسا کہ ہم سورۂ یٰس کی تفسیر کے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲

[2] نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۵۲، بحوالہ کتاب خصال

سام پر معاد سے متعلق بحث میں کہہ چکے ہیں اگر روزِ حساب موجود نہ ہو تو اس جہان کی تخلیق بے معنی، بے مقصد، فضول اور مہمل ہو گی۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ اس آیت کے اختتام پر ایک واضح خطا کی جانب اشارہ موجود ہے جو مکتبِ ایمان کو کفر سے جدا کرتا ہے اور وہ ہے الحادی مکاتب میں عالم کا بے مقصد ہونا کہ جس کے بعض نمونوں میں ہم آج بھی گرفتار ہیں۔ وہ صراحت سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ جہان بے مقصد اور بے ہدف ہے ایسے تصورِ کائنات کی موجودگی میں وہ لوگ اپنی حکومتوں میں حق و عدالت کو کیسے جاری کر سکتے ہیں یہ فقط الٰہی نظریہ کائنات ہے کہ جس کی بنیاد پر وجود میں آنے والی حکومت حق و عدالت کو جاری کر سکتی ہے کیونکہ اس نظریئے کے مطابق تخلیقِ عالم کا کوئی ہدف و مقصد ہے لہٰذا اس جہان کا کوئی حساب شدہ نظام موجود ہے کہ حکومت کو بھی اس کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ الحادی حکومتیں آج جنگ و صلح اور اقتصاد و ثقافت کے جن مسائل میں پھنس چکی ہیں ان کی اصلی وجہ اسی میں تلاش کرنا چاہیے۔ ان کے اسی نظریئے کی وجہ سے ان کی کارگزاری کی اصل بنیاد زور، زبردستی، اور اقتدار ہے اور ہر کسی کے لیے وہ اسی کے قائل ہیں کہ جو وہ طاقت اور ظلم سے حاصل کر لیتا ہے اور ایسی دنیا کس قدر وحشت ناک ہے کہ جو اس طرزِ فکر کی بنیاد پر عمل پیرا ہو اور جس کا نظام اس نظریئے کے مطابق چلے۔

بہر حال خدا تعالیٰ حکیم ہے اور ممکن نہیں کہ وہ اس عظیم کائنات کو بے ہدف پیدا کرے اور یہ ہدف جبھی پورا ہو گا کہ یہ عالم ایک وسیع تر اور اہم تر جہان کے لیے مقدمہ ہو وہ جہان کہ جو ابدیت سے وابستہ ہو اور جو عالم دنیا کا جواز فراہم کرے۔

بعد کی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے، کیا ممکن ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک کام انجام دیئے ہیں، انھیں ہم ان جیسا قرار دے دیں کہ جو زمین میں فساد برپا کرنے والے ہیں (ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت کالمفسدین فی الارض)۔[1] اور کیا ممکن ہے کہ ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح قرار دیں (ام نجعل المتقین کالفجار)۔

نہ تخلیق بے ہدف ممکن ہے اور نہ نیک اور بد میں مساوات ممکن ہے کیونکہ نیک لوگ اہدافِ تخلیق کے مطابق قدم اٹھاتے ہیں اور مقصد کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں جب کہ بُرے لوگ مخالف سمت پر گامزن ہیں۔

درحقیقت معاد کی بحث اس آیت میں اور قبل کی آیت میں مستدل طور پر تمام پہلوؤں کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

ایک طرف تو یہ فرمایا گیا ہے کہ حکمتِ خالق کا تقاضا ہے کہ تخلیقِ کائنات کا کوئی ہدف ہو (اور یہ ہدف دوسرے جہان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی اتنی اہم نہیں ہے کہ اس عظیم کائنات کا ہدف ہو سکے)۔

دوسری طرف حکمت و عدل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد اور عادل و ظالم یکساں نہ ہوں اور یہی امر قیامت، جزا و سزا اور جنت و جہنم کا مقتضی ہے۔

اس انسانی معاشرے میں فاجر، مومنین کے برابر اور بُرے نیکوں کے ساتھ نظر آتے ہیں بلکہ بہت سے مواقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ

---

[1] بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہاں "ام" "بل" کے معنی میں اضراب کے لیے ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "ام" استفہام محذوف پر عطف ہو اور تقدیر میں اس طرح ہے:

اخلقنا السمٰوات والارض باطلا ام نجعل المتقین کالفجار

بدکار مفسد لوگ زیادہ عیش و آرام میں ہیں سو اگر اس جہان کے بعد کوئی جہان نہ ہو کہ جس میں عدالت حکم فرما ہو تو اس جہان کی وضع خلافِ حکمت بھی ہے اور خلافِ عدل بھی اور یہ خود مسئلہ معاد کے لیے ایک دلیل ہے۔

دوسرے الفاظ کبھی اثباتِ معاد کے لیے برہانِ حکمت سے استدلال کیا جاتا ہے اور کبھی برہانِ عدالت سے۔ گزشتہ آیت میں پہلی طرح کا استدلال ہے اور دوسری آیت میں دوسری طرح کا۔

زیر بحث آخری آیت میں ایسے مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ جو درحقیقت ہدف کائنات کو پورا کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ بابرکت کتاب ہے کہ جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و فکر کریں اور صاحبانِ عقل متوجہ ہوں (کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا اٰیاتہ و لیتذکر اولوا الالباب)۔

اس کی تعلیمات جاودان ہیں اور اس کے احکام گہرے اور عمیق ہیں اور اس کے پروگرام حیات بخش اور ہدایت کنندہ ہیں کہ جو انسان کو ہدفِ تخلیق کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس عظیم کتاب کے نزول کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ اس کی تلاوت کی جائے اور اسے زبان پر جاری کر لیا جائے اور بس۔ بلکہ مقصد یہ تھا کہ اس کی آیات فکر و نظر اور سوچ بچار کا سرچشمہ بنیں۔ اور ضمیر و وجدان کی بیداری کا سبب بنیں اور پھر یہ بیداری حرکتِ عمل کا باعث بنے۔

"مبارک" جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایسی چیز کے معنی میں ہے کہ جو دائمی خیر کی حامل ہو اور قرآن کے بارے میں یہ تعبیر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی معاشرہ اس کی تعلیمات سے دائماً استفادہ کر سکتا ہے اور چونکہ یہ لفظ بطور مطلق استعمال ہوا ہے اس لیے دنیا و آخرت کی ہر طرح کی خیر و سعادت پر محیط ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر تم خیر و برکت کے طلب گار ہو تو تمہاری خواہش اس میں موجود ہے بشرطیکہ تم اس میں تدبر کرو اور اس سے ہدایت حاصل کرو اور حرکت میں آؤ۔

چند اہم نکات

۱۔ تقویٰ اور فجور ایک دوسرے کی ضد: زیر بحث آیات میں "فساد فی الارض" کو "ایمان و عمل صالح" کے مدمقابل قرار دیا گیا ہے نیز "فجور" (دین کا پردہ چاک کرنا) تقویٰ و پرہیزگاری کی ضد قرار دیا گیا ہے کیا ان دونوں عبارتوں میں ایک ہی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے یا دو مطالب کو بیان کیا گیا ہے؟

بعید نہیں ہے کہ دونوں عبارتوں میں ایک ہی حقیقت کو بیان کیا گیا ہو۔ کیونکہ "متقین" "نیک عمل کرنے والے مومنین" ہی ہیں اور "فجار" "مفسدین فی الارض" ہی ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا جملہ اعتقادی اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو اور صحیح عقیدے کے ساتھ نیک عمل کرنے والوں کا موازنہ فاسد العقیدہ اور فاسد العمل لوگوں سے کیا جا رہا ہو، جبکہ دوسرا جملہ صرف عملی پہلو کی طرف اشارہ ہو۔

یہ فرق بھی ممکن ہے کہ "تقویٰ" انسان کے انفرادی کمال اور "فجور" انسان کے انفرادی تنزل کی طرف اشارہ ہو جبکہ عمل صالح اور

فساد فی الارض معاشرتی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو۔

لیکن ان میں سے تاکید والی پہلی تفسیر ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ یہ آیات کس کے بارے میں ہیں؟ ایک روایت میں ان آیات کی تفسیر کے بارے میں ہے کہ "الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات" سے امیر المؤمنین حضرت علیؑ اور ان کے یار و انصار کی طرف اشارہ ہے جبکہ "المفسدین فی الارض" کا اشارہ ان کے مخالفین کی طرف ہے۔[1]

ایک اور حدیث جو ابنِ عساکر نے ابنِ عباس سے نقل کی ہے اس میں ہے کہ "الذین اٰمنوا" سے مراد حضرت علیؑ حضرت حمزہ اور جناب عبیدہ ہیں کہ جو میدان بدر میں عتبہ، ولید اور شیبہ کے مقابلے میں نکلے تھے کہ جو لشکر شرک میں سے تھے اور ان سے دست بدست لڑائی کی اور ان پر غالب آئے۔ "المفسدین فی الارض" سے مراد تین مذکورہ افراد ہیں کہ جو لشکر کفر و شرک میں سے ہیں۔[2]

واضح ہے کہ ان روایات کا مفہوم یہ نہیں کہ آیت کو خاص افراد میں منحصر کر دیا جائے بلکہ اس سے شانِ نزول مراد ہے یا روشن و واضح مصداق۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۴۵۲ (حدیث ۲۰)

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۳ ص ۱۷۱

۳۰۔ وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمٰنَ ۚ نِعْمَ الْعَبْدُ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝

۳۱۔ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝

۳۲۔ فَقَالَ اِنِّيۡۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝

۳۳۔ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۚ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ۝

ترجمہ

۳۰۔ ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، کیا ہی اچھا بندہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ کی طرف بازگشت کرتا تھا۔ (اور اس کی یاد میں رہتا تھا)۔

۳۱۔ وہ وقت یاد کر جب وقتِ عصر انھوں نے چابک اور تیز رفتار گھوڑے اس کے سامنے پیش کیے۔

۳۲۔ تو اس نے کہا، ان گھوڑوں کو میں اپنے رب کی خاطر پسند کرتا ہوں (میں چاہتا ہوں کہ جہاد میں ان سے کام لوں اور وہ اسی طرح انھیں دیکھتا رہا)۔ یہاں تک کہ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

۳۳۔ (وہ اس قدر جاذبِ نظر تھے کہ اس نے کہا کہ) انھیں دوبارہ لاؤ اور پھر اس نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرا (اور ان پر نوازش کی)۔

تفسیر

سلیمانؑ اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں

ان آیات میں بھی حضرت داؤدؑ کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔ پہلی آیت میں انھیں سلیمان جیسا باشرف بیٹا عطا فرمانے کی خبر دی گئی ہے کہ جو ان کی حکومت و رسالت کو باقی و جاری رکھنے والے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، کیا ہی اچھا بندہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ دامنِ خدا کی طرف اور آغوشِ حق کی طرف لوٹتا تھا (و وھبنا لداؤد سلیمان نعم العبد انه اوّاب)۔

یہ تعبیر حضرت سلیمانؑ کے عظیم مرتبے کی ترجمان ہے۔ شاید یہ ان بے بنیاد اور قبیح تہمتوں کی تردید کے لیے ہے کہ جو زوجہ اوریا سے

حضرت سلیمانؑ کے تولد کے بارے میں تحریف شدہ تورات میں آئی ہیں اور نزولِ قرآن کے زمانے میں وہ تمثیلیں اسی طرح عام تھیں۔

ایک تو "و ھبنا" (ہم نے بخشا) فرمایا پھر" نعم العبد" (کیا ہی اچھا بندہ ہے) کہہ کر تعریف کی نیز" انہ اوّاب" (وہ شخص جو ہمیشہ فرمان و اطاعتِ الٰہی کی طرف پلٹتا ہے اور ذرہ بھر بھی لغزش ہو جائے تو توبہ کرتا ہے) کہہ کر ستائش کی گئی۔ یہ سب باتیں اس عظیم نبی کے بلند مرتبے کی غماض ہیں۔

" انہ اوّاب " بالکل وہی تعبیر ہے جو اسی سورہ کی آیت ۱۷ میں ان کے باپ حضرت داؤدؑ کے لیے آئی ہے۔

" اوّاب " مبالغے کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے" بہت زیادہ بازگشت کرنے والا" اور اس میں کوئی شرط بھی نہیں ہے اگر اس مفہوم کی طرف توجہ کی جائے تو اطاعت فرمانِ الٰہی کی طرف بازگشت، حق و عدالت کی طرف بازگشت اور غفلت و ترکِ اولیٰ سے بازگشت سب معانی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اگلی آیت میں حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔ بعض جاہل اور بے خبر لوگوں کی طرف سے بھی ہیں کہ جو نہایت تکلیف دہ ہیں اور عقلی معیار کے خلاف ہیں۔ ان لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کی ہیں کہ جو ایک عام انسان کے بھی شایانِ شان نہیں ہیں چہ جائیکہ ان کی نسبت حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم المرتبت نبیؑ کی طرف دی جائے تاہم محققین نے عقلی و نقلی دلائل سے ایسی تفسیروں کا راستہ بند کر دیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم مختلف احتمالات کا جائزہ لیں آیات کی تفسیر اس کے ظاہر کے مطابق یا ظاہر ترین احتمالات کے مطابق پیش کرتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ جو ناروا نسبتیں دی جاتی ہیں ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ لوگوں نے پہلے فیصلے کیے پھر لا کر انھیں قرآن پر ٹھونس دیا۔

قرآن کہتا ہے: وہ وقت یاد کر جب وقتِ عصر چابک اور تیز رفتار گھوڑے اس (سلیمان) کے حضور پیش کیے گئے (اذ عرض علیہ بالعشیّ الصافنات الجیاد)۔

" صافنات " " صافنۃ " کی جمع ہے۔ جیسا کہ بہت سے مفسرین اور اربابِ لغت نے کہا ہے" صافنات " ایسے گھوڑوں کو کہا جاتا ہے کہ جو کھڑے ہوتے وقت دو اگلے اور ایک پچھلے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک پچھلا پاؤں کچھ بلند کیے رہتے ہیں اور صرف سُم کی نوک زمین پر رکھتے ہیں اور یہ چابک اور تیز رفتار گھوڑوں کی خاص حالت ہے کہ جو ہر وقت چلنے کو تیار ہوتے ہیں[1]

" جیاد " " جواد " کی جمع ہے یہاں یہ لفظ سریع الحرکت اور تیز رفتار گھوڑوں کے معنی میں ہے۔ دراصل یہ لفظ " جود " (بخشش) کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ البتہ یہ لفظ انسان کے لیے ہو تو مال بخشنے کے معنی میں ہے اور گھوڑے کے لیے ہو تو تیز رفتاری کے معنی میں ہے۔ گویا مذکورہ گھوڑے جب کھڑے بھی ہوتے تھے تو چلنے کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کرتے تھے اور جب چلتے تھے تو تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے تھے۔

اس آیت میں موجود مختلف قرائن سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک روز حضرت سلیمانؑ اپنے تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ "صافنات" مذکر اور مؤنث دونوں معانی رکھتا ہے لہٰذا یہ گھوڑیوں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

کر رہے تھے کہ جنھیں میدانِ جہاد کے لیے تیار کیا گیا تھا ۔ عصر کا وقت تھا ۔ مامورین مذکورہ گھوڑوں کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے ان کے سامنے سے گزر رہے تھے ۔

ایک عادل اور بااثر حکمران کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس طاقتور فوج ہو اور اس زمانے میں لشکر کے اہم ترین وسائل میں سے تیز رفتار گھوڑے تھے لہٰذا حضرت سلیمانؑ کا نام ذکر کرنے کے بعد نمونے کے طور پر گھوڑوں کا ذکر آیا ہے ۔

اس موقع پر یہ واضح کرنے کیلیے کہ طاقتور گھوڑوں سے ان کا لگاؤ دنیا پرستی کی وجہ سے نہیں جناب سلیمان نے کہا: "ان گھوڑوں کو میں اپنے رب کی یاد اور اس کے حکم کی بنا پر پسند کرتا ہوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سے دشمنوں کے خلاف جہاد میں کام لوں (فقال انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی) ۔

عربوں کا معمول ہے کہ وہ "خیل" (گھوڑا) کو "خیر" سے تعبیر کرتے ہیں ۔ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے :

الخیر معقود بنواصی الخیل الی یوم القیامۃ

خیر اور بھلائی قیامت تک کے لیے گھوڑے کی پیشانی کے ساتھ باندھ دی گئی ہے [1]

سلیمانؑ کہ جو دشمن کے خلاف جہاد کے لیے آمادہ ان تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے بہت خوش ہوئے ۔ آپؑ انھیں یوں دیکھ رہے تھے کہ نظریں ان پر جم کر رہ گئیں "یہاں تک کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے" (حتی توارت بالحجاب) ۔

یہ منظر نہایت دلکش اور عمدہ تھا اور حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم فرماں روا کے لیے نشاط انگیز تھا ۔ آپ نے حکم دیا "ان گھوڑوں کو واپس میرے پاس لاؤ" (ردوھا علی) ۔

جب مامورین نے اس حکم کی اطاعت کی اور گھوڑوں کو واپس لائے تو سلیمانؑ نے خود ذاتی طور پر ان پر نوازش اور ان کی پنڈلیوں اور گردنوں کو تھپتھپایا اور ہاتھ پھیرا "(فطفق مسحا بالسوق والاعناق) ۔

یوں آپ نے ان کی پرورش کرنے والوں کی بھی تشویق اور قدردانی کی ۔ معمول ہے کہ جب کسی سواری کی قدردانی کی جاتی ہے تو اس کے سر، چہرے، گردن یا اس کی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے اور یہ دلچسپی اور پسندیدگی کے اظہار کا اہم ذریعہ ہے کہ جس سے انسان اپنے بلند مقاصد میں مدد لیتا ہے لہٰذا حضرت سلیمانؑ جیسے حلیم نبی کا ایسا کرنا کوئی تعجب انگیز نہیں ۔

"طفق" (کہ جو نحویوں کی اصطلاح کے مطابق افعالِ مقاربہ میں سے ہے) کسی کام کو شروع کرنے کے معنی میں ہے ۔

"سوق" جمع ہے "ساق" کی (پنڈلی کے معنی میں) اور "اعناق" جمع ہے "عنق" کی (گردن کے معنی میں) پورے جملے کا معنی یہ ہے :

سلیمان نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرا اور ان سے نوازش کرنا شروع کیا ۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں

بعض نے زیر بحث آیت میں "خیر" سے مال یا مال کثیر مراد لیا ہے ۔ ممکن ہے یہ سابقہ تفسیر پر منطبق ہو سکے کیونکہ یہاں مال کا مصداق گھوڑے ہی ہیں ۔

ان آیات کی تفسیر کے بارے میں جو کچھ سطور بالا میں کہا گیا ہے یہ بعض مفسرین سے ہم آہنگ ہے۔ بزرگان شیعہ میں سے عالم نامدار و بزرگوار سید مرتضیٰ کے کلمات سے بھی اس تفسیر کے ایک حصّے کا استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "تنزیہ الانبیاء" میں بعض مفسرین اور ارباب حدیث کی جانب سے حضرت سلیمانؑ کی طرف دی جانے والی ناروا نسبتوں کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> کیسے ممکن ہے کہ اللہ پہلے تو اس پیغمبر کی مدح و ثنا کرے اور پھر ساتھ ہی اس کی طرف اس بُرے کام کی نسبت دے کہ وہ گھوڑوں کا نظارہ کرنے میں یوں محو ہوئے کہ نماز بھول گئے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ گھوڑوں سے بھی ان کا لگاؤ حکمِ پروردگار سے تھا کیونکہ اللہ ہمیں بھی حکم دیتا ہے کہ گھوڑے پالیں اور دشمنوں کے خلاف جنگ کے لیے انھیں آمادہ رکھیں۔ لہٰذا کیا مانع ہے کہ اللہ کا نبی بھی ایسا ہی ہو[1]

علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی کتاب نبوت میں مذکورہ بالا آیات کی تفسیر کے بارے میں مختلف باتیں کی ہیں جن میں بعض ہماری مرقومہ بالا تفسیر کے نزدیک ہیں[2]

بہر حال اس تفسیر کے مطابق سلیمان سے نہ تو کوئی گناہ سرزد ہوا ہے اور نہ ہی آیات میں عدم ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی ایسی مشکل پیش آتی ہے کہ جس کی توجیہ کرنا پڑے[3]

بعض مفسرین نے ایک اور تفسیر کی ہے اب ہم اسے پیش کرتے ہیں۔

زیادہ مشہور یہ ہے کہ "توارت" اور "ردوھا" کی ضمیریں "شمس" (سورج) کی طرف لوٹتی ہیں کہ جو عبارت میں مذکور نہیں ہے لیکن زیر بحث آیات میں لفظ "عشی" (وقتِ عصر) آیا ہے اس سے یہ استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ سلیمانؑ گھوڑوں کو دیکھنے میں منہمک تھے کہ سورج نے اپنا سر افقِ مغرب میں رکھ دیا اور حجابِ مغرب میں پنہاں ہوگیا۔ سلیمانؑ اپنی نمازِ عصر کھو جانے سے بہت پریشان ہوگئے۔ وہ پکارے: اے پروردگار کے فرشتو! سورج کو میرے لیے لوٹا دو۔ سلیمانؑ کا یہ تقاضا پورا ہوا اور سورج پلٹ آیا۔ حضرت سلیمانؑ نے وضو کیا (پنڈلی اور گردن پر ہاتھ پھیرنے سے مراد وضو کے دوران میں مسح کرنا ہے کہ جو حضرت سلیمانؑ کے مذہب میں تھا، البتہ کبھی لفظ مسح عربی زبان میں دھونے کے معنی میں بھی آتا ہے) پھر انھوں نے اپنی نماز ادا کی۔

بعض ناآگاہ اور بے شعور اس سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔ انھوں نے ایک اور قبیح تہمت اس عظیم نبی پر لگائی ہے وہ کہتے ہیں کہ "طفق مسحًا بالسوق والاعناق" سے مراد یہ ہے کہ سلیمان نے حکم دیا کہ تلوار کے ساتھ گھوڑوں کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹ دی جائیں یا خود یہ کام انجام دیا کیونکہ وہ گھوڑے یادِ خدا سے غفلت اور نماز کی فراموشی کا سبب بنے تھے۔

---

[1] تنزیہ الانبیاء، ص ۹۲

[2] بحار الانوار، ج ۱۴ ص ۱۰۴

[3] [illegible] "ردوھا" کی ضمیر [illegible] "الصافنات الجیاد" کی طرف لوٹتی ہیں۔

اس آخری گفتگو کا بطلان تو کسی سے مخفی نہیں کیونکہ اس میں گھوڑوں کا تو کوئی قصور نہ تھا کہ انھیں تہ تیغ کیا جاتا اگر گناہ تھا تو خود سلیمانؑ کا تھا جو گھوڑوں کا نظارہ کرتے کرتے ان میں منہمک ہو گئے اور باقی سب کچھ بھول گئے۔ علاوہ ازیں گھوڑوں کو مار ڈالنا ظلم بھی ہے اور اسراف بھی۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ ایسا نارو اعمل ایک نبی سے سرزد ہو۔ لہٰذا اسلامی کتب میں اس ضمن میں آنے والی روایات میں حضرت سلیمانؑ کی طرف اس نسبت کی شدت سے نفی کی گئی ہے۔

رہی دوسری تفسیر کہ جس میں نماز عصر سے غفلت کی بات کی گئی ہے اس سے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک معصوم نبی اپنی واجب ذمہ داری کو بھول جائے، اگرچہ گھوڑوں کا معائنہ بھی ان کی ایک ذمہ داری تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ مستحب نماز تھی کہ جسے چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہ تھا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ نماز نافلہ کے لیے سورج پلٹانے کی ضرورت نہ تھی۔

علاوہ ازیں اس تفسیر میں کچھ دیگر اشکالات اور اعتراضات بھی ہیں، مثلاً:

۱۔ لفظ "شمس" آیات میں صراحت کے ساتھ نہیں آیا جبکہ "الصافنات الجیاد" (تیز رفتار گھوڑے) صراحت کے ساتھ مذکور ہے لہٰذا زیادہ مناسب یہی ہے کہ ضمیر اسی چیز کی طرف لوٹیں جو صراحت کے ساتھ آیات میں موجود ہے۔

۲۔ "عن ذکر ربی" کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ان گھوڑوں کی محبت یادِ خدا اور اس کے فرمان کے باعث ہے جبکہ آخری تفسیر کے مطابق لفظ "عن"، "علیٰ" کے معنی میں ہے۔ یعنی میں نے گھوڑوں کی محبت کو اپنے رب کی محبت پر ترجیح دی اور یہ معنی خلافِ ظاہر ہے (غور کیجیے گا)

۳۔ سب سے زیادہ تعجب خیز یہ ہے کہ "ردّوھا علیّ" (انھیں میری طرف لوٹا دو) اس میں تحکمانہ لب ولہجہ ہے۔ کیا ممکن ہے کہ سلیمانؑ اللہ تعالیٰ یا اس کے فرشتوں سے اس لہجے میں خطاب کرتے ہوئے کہیں کہ سورج میری طرف پلٹا دیں۔

۴۔ سورج پلٹنے کا مسئلہ اگرچہ قدرتِ خدا کے لیے محال نہیں ہے تاہم واضح طور پر بہت سے مسائل اس سے وابستہ ہیں اور جب تک واضح دلیل موجود نہ ہو اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ زیر بحث آیات کا آغاز حضرت سلیمانؑ کی مدح وتمجید سے ہوتا ہے جبکہ زیرِ نظر تفسیر کے مطابق ان آیات کا اختتام آپ کی مذمت پر ہوتا ہے۔

۶۔ اگر واجب نماز ترک ہوئی ہے تو اس کی توجیہ مشکل ہے اور اگر نافلہ نماز ترک ہوئی ہے تو پھر سورج پلٹانے کی کیا ضرورت تھی؟

یہاں ایک سوال باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ تفسیر کتب احادیث میں متعدد روایات میں نظر آتی ہے لیکن اگر ان روایات کی اسناد کا ہم بغور جائزہ لیں اور ان کی تحقیق کریں گے تو ہم تصدیق کریں گے کہ ان میں سے کسی ایک کی سند بھی معتبر نہیں۔ زیادہ تر روایات مرسلہ ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان غیر معتبر روایات سے صرفِ نظر کیا جائے اور اس کا علم ہم اس کے اہل کے ذمہ رہنے دیں اور پہلے سے فیصلہ کیے بغیر آیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اسی کو انتخاب کریں اور یوں مختلف اشکالات سے آسودہ خاطر بھی رہیں۔

۳۴۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ○

۳۵۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○

۳۶۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ○

۳۷۔ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ○

۳۸۔ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ○

۳۹۔ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

۴۰۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ○

ترجمہ

۳۴۔ ہم نے سلیمان کا امتحان لیا اور ایک دھڑ ان کے تخت پر پھینک دیا پھر اس نے بارگاہِ خدا کی طرف رجوع کیا۔

۳۵۔ اس نے کہا، پروردگارا! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا کر کہ جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو، کیونکہ تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔

۳۶۔ ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کے حکم کے مطابق آرام کے ساتھ چلے اور وہ جہاں چاہے جائے۔

۳۷۔ اور شیطانوں کو بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیا اور ان میں سے ہر معمار اور غوطہ خور کو۔

۳۸۔ (اور شیطانوں میں سے) ایک اور گروہ کو بھی جو (اس کے اختیار میں تھے اور) زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

۳۹۔ (اور ہم نے اس سے کہا) یہ ہماری عطا ہے جسے بھی تو چاہتا ہے (اور مصلحت دیکھتا ہے) اُسے بخش دے اور جس سے تو چاہتا ہے روک لے اور تیرے کوئی حساب نہیں ہے۔

۴۰۔ اور اس (سلیمان) کے لیے ہمارے پاس بلند مقام اور نیک سرانجام ہے۔

تفسیر

سلیمانؑ کا سخت امتحان اور وسیع حکومت

یہ آیات حضرت سلیمانؑ کی زندگی کے واقعات کا کچھ حصہ بیان کرتی ہیں۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان قدرت کے جس بلند پائے تک بھی جا پہنچے اس کے پاس کچھ بھی خود اس کی طرف سے نہیں ہوتا اور جو کچھ بھی ہو خدا کی طرف سے ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ اگر اس کی طرف توجہ ہو تو غرور و غفلت کے پردے انسان کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور کائنات میں وہ اپنی حیثیت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

ان آیات کا پہلا حصہ ایک آزمائش کے بارے میں ہے۔ اللہ نے حضرت سلیمانؑ کو آزمایا۔ اس میں ایک "ترکِ اولیٰ" پیش آیا۔ اس کے بعد جناب سلیمان نے بارگاہِ خداوندی کا رخ کیا اور اس ترکِ اولیٰ پر توبہ کی۔ یہ آیات بھی چونکہ اجمالی ہیں لہٰذا افسانہ طرازوں اور خیال پردازوں نے فائدہ اٹھایا اور بے بنیاد خیالی داستانیں بنا ڈالیں۔ انھوں نے اس عظیم نبی کی طرف بعض ایسی چیزیں منسوب کیں جو یا تو اساسِ نبوت کے خلاف ہیں یا مقامِ عصمت کے منافی ہیں یا اصولاً عقل و منطق ہی کے خلاف ہیں۔ یہ باتیں تمام محققینِ قرآن کے لیے خود ایک آزمائش ہیں حالانکہ قرآن کے متن میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر اسی پر قناعت کر لی جاتی تو ان بے ہودہ افسانوں کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

پہلی زیرِ بحث آیت میں قرآن کہتا ہے: ہم نے سلیمان کا امتحان لیا اور اس کی کرسی پر ایک دھڑ ڈال دیا، پھر اس نے بارگاہِ خداوندی کی طرف رجوع کیا اور اس کی طرف لوٹا (ولقد فتنا سلیمان والقینا علیٰ کرسیه جسدًا ثم اناب)۔

"کرسی" کا معنی ہے "چھوٹے پاؤں والا تخت"۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے پاس دو طرح کے تخت ہوتے تھے۔ ایک تخت عام استعمال کے لیے ہوتا تھا جس کے پاؤں چھوٹے ہوتے تھے اور دوسرا تخت خصوصی پروگراموں کے لیے ہوتا تھا کہ جس کے پائے بلند ہوتے تھے۔ پہلی قسم کے تخت کو "کرسی" کہا جاتا تھا اور دوسری قسم کے تخت کو "عرش" کہتے تھے۔

"جسد" کا معنی ہے "بے جان دھڑ"۔ مفردات میں راغب کے بقول اس کا مفہوم "جسم" کے مفہوم سے محدود تر ہے کیونکہ "جسد" کا اطلاق غیرِ انسان پر نہیں ہوتا (سوائے شاذ و نادر مواقع کے) لیکن جسم کا مفہوم عام ہے۔

اس آیت سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سلیمانؑ کی آزمائش بے جان دھڑ کے ذریعے ہوئی تھی وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے تخت پر رکھ دیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں قرآن میں کوئی وضاحت نہیں ہے۔ محدثین و مفسرین نے اس سلسلے میں روایات و تفاسیر بیان کی ہیں ان میں سے زیادہ قابلِ توجہ اور واضح یہ ہے کہ:

سلیمانؑ کی آرزو تھی کہ انھیں باشرف اور شجاع اولاد نصیب ہو جو ملک کا نظام چلانے اور خاص طور پر دشمنوں کے خلاف جہاد میں ان کی مدد کرے۔ حضرت سلیمانؑ کی متعدد بیویاں تھیں۔ انھوں نے دل میں ارادہ کیا کہ میں ان سے ہم بستر ہوتا ہوں تاکہ مجھے متعدد بیٹے نصیب ہوں کہ جو میرے مقاصد میں میری مدد کریں لیکن اس مقام پر ان سے غفلت ہوئی اور آپ نے "انشاءاللہ" نہ کہا کہ جو انسان کے ہر حالت میں اللہ پر تکیہ کا غماز ہے لہٰذا اس زمانے میں ان کی بیویوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی سوائے ایک ناقص الخلقت بچے کے۔ وہ بے جان دھڑ کے مانند تھا کہ جو لا کر ان کے تخت پر ڈال دیا گیا۔

سلیمانؑ سخت پریشان اور فکر مند ہوئے کہ انھوں نے ایک لمحے کے لیے اللہ سے غفلت کیوں کی اور کیوں اپنی طاقت پر بھروسہ کیا اس لیے انھوں نے توبہ کی اور بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کیا۔

ایک اور تفسیر بھی لائقِ توجہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ:

اللہ نے حضرت سلیمانؑ کو ایک شدید بیماری کے ذریعے آزمایا۔ آپؑ کی یہ حالت ہوگئی کہ گویا ایک بے جان دھڑ کے مانند اپنے تخت پر پڑے تھے اور عربی زبان میں معمول ہے کہ بہت کمزور اور نہایت بیمار انسان کو جسد بلا روح کہا جاتا ہے۔ آخر کار انھوں نے توبہ کی اور اللہ نے انھیں پہلی کی سی حالت میں لوٹا دیا ("اناب" کا معنی ہے سلامتی کے ساتھ لوٹنا اور واپسی)۔

البتہ اس تفسیر پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس صورت میں "والقیناہ" ہونا چاہیے تھا۔ یعنی ہم نے سلیمان کو اس کے تخت پر بے روح جسم کے مانند ڈال دیا جبکہ آیت میں یوں نہیں ہے اور اسے تقدیراً قرار دینا بھی خلافِ ظاہر ہے۔

اس تفسیر کے مطابق لفظ "اناب" "صحت کے ساتھ لوٹنا" کے معنی میں ہے اور یہ بھی خلافِ ظاہر ہے لیکن اگر "اناب" کو خدا کی طرف توبہ اور رجوع کے معنی میں لیں تو اس تفسیر کو کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس صورت میں خلافِ ظاہر بات صرف یہ رہ جائے گی کہ "القیناہ" کی ضمیر حذف کردی گئی ہے۔

باقی رہے جھوٹے اور قبیح افسانے کہ جن کا ذکر بعض کتب میں بڑی آب و تاب سے کیا گیا ہے۔ ظاہراً ان کی جڑ تمود کے یہودیوں کی طرف جاتی ہے اور یہ سب اسرائیلیات اور خرافات ہیں کوئی عقل و منطق انھیں قبول نہیں کرتی۔ ان قبیح افسانوں میں کہا گیا ہے سلیمان کی انگوٹھی کھو گئی تھی یا وہ کسی شیطان نے چھین لی تھی اور خود ان کی جگہ تخت پر آبیٹھا تھا وغیرہ وغیرہ۔

یہ افسانے ہر چیز سے قبل انھیں گھڑنے والوں کے انحطاطِ فکری کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین اسلام نے جہاں کہیں ان کا نام لیا ہے ان کے بے بنیاد ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ نہ تو مقامِ نبوت اور حکومتِ الٰہی انگوٹھی سے وابستہ ہے اور نہ کبھی یہ مقام اللہ اپنے کسی نبی سے چھینتا ہے اور نہ کبھی وہ شیطان کو نبی کی شکل میں لاتا ہے، چہ جائیکہ افسانہ طرازوں کے مطابق وہ چالیس دن تک نبی کی جگہ پر بیٹھے اور لوگوں کے درمیان حکومت و قضاوت کرے۔[1]

اگلی آیت میں حضرت سلیمانؑ کی توبہ کا مسئلہ گزشتہ آیت کی نسبت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس نے کہا: پروردگارا مجھے بخش دے (قال رب اغفر لی) اور مجھے ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو کیونکہ تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے (وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی انک انت الوھاب)۔

دو سوال اور اُن کے جواب

۱۔ کیا سلیمانؑ کے اس تقاضے سے بخل کی بو نہیں آتی؟ اس سوال کے جواب میں مفسرین نے بہت سی باتیں کی ہیں جن کا زیادہ حصہ ظاہرِ آیات سے ہم آہنگ نہیں ہے جو جواب زیادہ مناسب اور زیادہ منطقی نظر آتا ہے وہ یہ ہے:

---

[1] اس کی مزید وضاحت کے لیے کہ ان خرافات کی جڑ یہودی کتب ہیں، کتاب "اعلام قرآن" میں حضرت سلیمانؑ سے متعلق افسانوں کی بحث کی طرف رجوع کریں۔ ص ۳۹۲

حضرت سلیمانؑ اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی حکومت چاہتے تھے جس میں خاص معجزات ہوں اور وہ ان کی حکومت کو باقی حکومتوں سے ممتاز کریں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر نبی کا ایک خاص معجزہ تھا، حضرت موسیٰؑ کے لیے عصا اور ید بیضا کا معجزہ تھا، حضرت ابراہیمؑ کے لیے آگ سرد ہو گئی تھی، حضرت صالحؑ کے لیے ایک خاص قسم کی اونٹنی کا معجزہ تھا اور پیغمبر اسلامؐ کا معجزہ قرآن مجید ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی ایک حکومت تھی جو الٰہی معجزات سے بہرہ ور تھی۔ مثلاً ہواؤں پر حکومت، شیطانوں پر حکومت اور اسی طرح دیگر بہت سی خصوصیات۔

یہ چیز انبیاء کے لیے کوئی نقص شمار نہیں ہوتی کہ وہ اپنے لیے کسی مخصوص معجزے کا تقاضا کریں کہ جو ان کی کیفیت کو پوری طرح واضح کرے، لہٰذا اس میں کوئی مانع نہیں کہ دوسرے لوگوں کی سلیمان سے وسیع تر حکومت ہو لیکن اس میں حضرت سلیمانؑ کی حکومت کے امتیازات نہیں ہوں گے۔

اس بات کی شاہد بعد والی آیت ہے کہ جس میں درحقیقت جناب سلیمانؑ کی اس دُعا کی اجابت ظاہر ہوتی ہے اس میں ہواؤں اور شیطانوں کے مسخر ہونے کا ذکر ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ بات حضرت سلیمانؑ کی حکومت کے امتیازات میں سے تھی۔

۲۔ کیا امام مہدیؑ کی حکومت وسیع تر نہ ہوگی؟ گزشتہ عبارت ہی سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام (ارواحنا لہ الفداء) کی حکومت ایک عالمی حکومت ہوگی جو یقیناً حکومتِ سلیمانؑ سے بہت وسیع ہوگی۔ البتہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت اپنی تمام تر وسعت اور دیگر حکومتوں سے اپنی خصوصیات و امتیازات سے باوجود جناب سلیمانؑ کی حکومت سے مختلف ہوگی اور حضرت سلیمانؑ کی حکومت انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت سلیمانؑ کی گفتگو کمی بیشی، افزوں طلبی اور انحصار جوئی کے لیے نہ تھی گفتگو تو نبوت کے اس کمال کے بارے میں تھی کہ وہ معجزات کے لحاظ سے ایسی خصوصیات رکھتی ہو جو کسی نبی کو دیگر انبیاء سے مشخص کرے اور حضرت سلیمانؑ اسی کے طالب تھے۔

بعض روایات جو اہلِ بیت علیہم السلام کے طرق سے حضرت امام موسیٰ بن جعفرؑ سے منقول ہیں میں بخل کے بارے میں سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ جو بہت جاذبِ توجہ ہے۔ حدیث اس طرح ہے:

آپؑ کے ایک محب علی بن یقطین نے امامؑ سے سوال کیا: کیا جائز ہے کہ اللہ کا نبی بخیل ہو؟

امامؑ نے فرمایا: نہیں

علی بن یقطین نے عرض کی: پھر حضرت سلیمانؑ نے یہ کیوں کہا

رب اغفرلی و ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی

پروردگارا! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت عطا کر کہ جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو۔

اس آیت کا مفہوم اور تفسیر کیا ہے؟

امامؑ نے فرمایا:

حکومت دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو ظلم، تسلط اور لوگوں کو مجبور کر کے حاصل کی جائے اور دوسری حکومت وہ کہ جو اللہ کی طرف سے ہو، جیسے ابراہیمؑ کے خاندان کی، طالوت کی اور ذوالقرنین کی حکومت۔ سلیمان خدا سے چاہتے تھے کہ وہ انھیں ایسی حکومت دے کہ ان کے بعد کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ یہ حکومت لوگوں پر ظلم اور قہر و جبر سے حاصل کی گئی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہوا کو ان کے تابع فرمان کر دیا تاکہ جدھر وہ جائیں وہ آرام سے چل پڑے

وہ ہوا صبح کے وقت بھی ایک ماہ کا فاصلہ طے کرتی اور عصر کے وقت بھی ایک ماہ کا فاصلہ طے کرتی نیز اللہ تعالٰی نے شیطانوں کو ان کے تابع فرمان کر دیا ان کے لیے مکانات تعمیر کرتے اور غواصی و پیراکی کا کام کرتے علاوہ ازیں انھیں پرندوں کی زبان سکھائی گئی اور اللہ نے زمین پر ان کی حکومت قائم کی۔ لہٰذا اس زمانے کے اور بعد کے لوگ سمجھ گئے کہ سلیمان کی حکومت نہ لوگوں کی بنائی گئی تھی اور نہ قہر و غلبہ اور ظلم و ستم سے حاصل ہوئی تھی۔

علی بن یقطین کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: پھر پیغمبر اسلامؐ سے منقول اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ آپ نے فرمایا:

رحم اللہ اخی سلیمان ابن داؤد ما کان ابخلہ

اللہ رحم کرے میرے بھائی سلیمان بن داؤد پر وہ کیسے بخیل تھے؟

امامؑ نے فرمایا:

اس کے دو معانی ہیں،

پہلا یہ کہ وہ اپنی ناموس اور عزت کے بارے میں بخیل تھے کہ کوئی ان کے بارے میں غیر مناسب بات کرے۔

دوسرا یہ کہ رسول اللہؐ کی مراد یہ تھی کہ اگر آیت قرآن کی یوں تفسیر کی جائے کہ جیسے بعض جاہل کرتے ہیں کہ سلیمان نے اپنے لیے بے غلبہ اور منصرِ حکومت کا تقاضا کیا تو پھر انھیں ایک بخیل شخص ماننا پڑے گا (اور یہ دراصل ان لوگوں کے لیے طنز ہے)[1]

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بعد والی آیات میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ نے سلیمانؑ کی درخواست قبول کر لی اور انھیں خصوصی امتیازات اور عظیم نعمات والی حکومت عطا کی۔ ان امتیازات و نعمات کا پانچ حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ہواؤں کا ایک رہوار اور سواری کی طرح تابع ہونا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ہم نے ہوا کو اس کے تابع کر دیا تاکہ اس کے حکم کے مطابق آرام سے چلے اور جہاں کا وہ ارادہ کرے جا سکے (فسخرنا لہ الریح تجری بامرہ رخاء حیث اصاب)۔

واضح ہے کہ ایک وسیع و عریض حکومت میں تیز رفتار رابطوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بوقتِ ضرورت سربراہِ حکومت تیزی کے ساتھ ملک کے تمام علاقوں میں آجا سکے۔ اللہ نے یہ امتیاز حضرت سلیمانؑ کو دے رکھا تھا۔

ہوا کیسے ان کے تابع فرمان تھی؟ کتنی تیزی سے چلتی تھی؟ حضرت سلیمانؑ اور ان کے ساتھ ہوا کے ذریعے سفر کرتے ہوئے کس چیز پر سوار ہوتے تھے؟ اور کون سے عوامل انھیں گرنے سے بچاتے تھے اور ہوا کے دباؤ کی کمی بیشی اور دیگر مشکلات کے موقع پر ان کی حفاظت کرتے تھے؟ خلاصہ یہ کہ وہ کیسا اسرار آمیز وسیلہ تھا کہ جو اس زمانے میں حضرت سلیمانؑ کے قبضے میں تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کی جزئیات اور خصوصیات کے بارے میں جواب ہمارے سامنے واضح نہیں ہے ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ ایک معجزہ تھا کہ جیسے معجزے نبی کے اختیار میں دیئے

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۴۵۹، بحوالہ کتاب علل الشرائع

جاتے تھے۔ یہ ایک عام اور معمول کے مطابق بات نہ تھی۔ یہ ایک عظیم نعمت اور اعجاز تھا اور ایسا کرنا قدرتِ الٰہی کے لیے سادہ اور آسان سا کام ہے۔ نیز ایسے بہت سے مسائل ہیں کہ اصولی طور پر تو ہم انھیں جانتے ہیں لیکن ان کی جزئیات سے ہم واقف نہیں ہیں۔

اس موقع پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ لفظ" رخاء " (نرم اور ملائم) جو اس آیت میں آیا ہے وہ سورۂ انبیاء کی آیہ ۸۱ میں آنے والے لفظ" عاصفۃ "(آندھی) سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے:

ولسلیمان الریح عاصفۃ تجری بامرہ الی الارض التی بارکنا فیھا

ہم نے تیز ہوا کو سلیمان کے لیے مسخر کر دیا کہ جو اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جسے ہم نے برکت دے رکھی تھی۔

اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔

پہلا یہ کہ" عاصفۃ " (تیز ہوا) اس کی سرعت رفتار کے لیے ہے اور" رخاء " اس کے منظم اور آرام دہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، یعنی ہوا کے تیز رفتار ہونے کے باوجود انھیں چلنے میں پریشانی کا احساس نہیں ہوتا تھا، بالکل ہمارے زمانے کے ترقی یافتہ تیز رفتار ذرائع آمدورفت کی طرح۔ ان میں بھی بعض وسائل ایسے ہیں کہ انسان جب ان کے ذریعے سفر کرتا ہے تو یوں محسوس کرتا ہے جیسے اپنے گھر کے کمرے میں بیٹھا ہے حالانکہ وہ چیز انتہائی تیز رفتاری سے چل رہی ہوتی ہے۔

دوسرا یہ کہ بعض مفسرین نے ان دو آیات کو دو قسم کی ہواؤں کا ذکر سمجھا ہے اور دونوں کو اللہ نے حضرت سلیمانؑ کے اختیار میں دے رکھا تھا۔ ایک تیز رفتار ہوا تھی اور دوسری آہستہ رو۔

۲۔ دوسری نعمت اللہ تعالٰی نے جناب سلیمانؑ کو یہ عطا کی تھی کہ سرکش موجودات ان کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے اور ان کے اختیار میں دے دیئے گئے تھے تاکہ آپ ان سے مثبت کام لے سکیں۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے، " اور ہم نے شیطانوں کو اس کے لیے مسخر کر دیا اور ان میں سے ہر معمار اور غوّاص کو اس کا تابع فرمان بنا دیا" تاکہ ان میں سے کچھ خشکی میں اس کے کہنے کے مطابق تعمیرات کریں اور کچھ دریا میں غوّاصی اور غوطہ زنی کے کام آئیں (والشیاطین کل بناء وغواص)[1]

اس طرح سے اللہ تعالٰی نے مثبت کاموں کے لیے موجود قوتیں ان کے اختیار میں دے دی۔ شیطان کہ جن کے مزاج ہی میں سرکشی ہے وہ ان کے لیے اس طرح سے مسخر ہو گئے کہ ان سے تعمیری اور اصلاحی کام لیا جانے لگا اور گراں بہا منابع سے استفادہ کے لیے وہ استعمال ہونے لگے۔

صرف اس آیت میں نہیں بلکہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ شیطان حضرت سلیمانؑ کے تابع فرمان تھے اور ان کے حکم کے مطابق مثبت کام کرتے تھے۔ البتہ بعض آیات مثلاً زیر بحث آیت اور سورۂ انبیاء کی آیت ۸۲ میں" شیاطین" کا لفظ ہے جبکہ سورۂ سبا کی آیت ۱۲ میں" جن" کا لفظ ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ" جن" ایک ایسا موجود ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن عقل و شعور اور طاقت کا حامل ہے۔ نیز جنوں میں

---

[1] " شیاطین " کا " الریح " پر عطف ہے کہ جو " سخرنا " کا مفعول ہے اور" کل بناء و غواص " " شیاطین " کا بدل ہے۔

مؤمن بھی ہیں اور کافر بھی اور اس میں کوئی مانع نہیں کہ حکم خدا سے وہ ایک نبی کے تابع فرمان ہو جائیں اور مفید کام انجام دیں۔
یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ "شیاطین" کا ایک وسیع تر معنی ہو کہ جس میں سرکش انسان بھی شامل ہوں اور ان کے علاوہ بھی۔ لفظ "شیطان" کا اطلاق قرآن مجید میں اس وسیع مفہوم پر ہوا ہے (مثلاً سورۂ انعام کی آیت ۱۱۲)۔
بہرحال اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو یہ طاقت دی تھی کہ وہ تمام سرکشوں کو اپنے سامنے جھکا سکیں۔
۳۔ تیسری نعمت اللہ نے حضرت سلیمانؑ کو یہ عنایت کی تھی کہ انھوں نے تخریب کار اور فسادی قوتوں پر قابو پا رکھا تھا، کیونکہ بہرحال بعض شیطان ایسے بھی تھے کہ جن سے ایک مفید اور اصلاحی قوت کے طور پر کام نہیں لیا جاسکتا تھا اور اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ قید و بند میں رہیں تاکہ معاشرہ ان کی مزاحمت سے پیدا ہونے والے شر سے محفوظ رہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں قرآن کہتا ہے: اور شیطانوں کا ایک اور گروہ اس کے قابو میں زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا (و اٰخرین مقرنین فی الاصفاد)۔[1]
"مقرنین" "قرن" کے مادے سے مقارنت اور نزدیکی کے معنی میں ہے۔ یہاں یہ لفظ ہاتھ پاؤں یا گردن کو زنجیر میں جمع کرنے کے معنی میں ہے۔
"اصفاد" "صفد" (بروزن "نمد") کی جمع ہے جو قید و بند کے وسیلے کے معنی میں ہے مثلاً ہتھکڑیاں اور بیڑیاں جو قیدیوں کو پہنائی جاتی ہیں۔ بعض نے مقرنین فی الاصفاد سے ایسی زنجیر مراد لی ہے کہ جس سے ہاتھوں کو گردن کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا اور یہ مفہوم "مقرنین" کے معنی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔
یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ ان کے الگ الگ گروپ تھے اور ہر گروپ کے لیے الگ قید اور بندش تھی۔
البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر "شیاطین" سے مراد شیاطین جن ہیں کہ جو فطری طور پر جسم لطیف رکھتے ہیں تو پھر زنجیر اور ہتھکڑیاں ان کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتیں۔ اس لیے بعض نے کہا ہے کہ یہ تعبیر انھیں تخریبی کارروائیوں سے باز رکھنے کے معنی کے لیے کنایہ ہے۔
۴۔ چوتھی نعمت اللہ تعالیٰ نے جناب سلیمان کو یہ دی تھی کہ انھیں بہت سے اختیارات دے رکھے تھے کہ جن کی وجہ سے کسی کو کچھ عطا کرنے اور روکنے میں وہ صاحب اختیار تھے۔ جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے: ہم نے اس سے کہا: یہ ہماری عطاء و بخشش ہے جسے تو (مصلحت کے مطابق) چاہتا ہے عطا کر اور جس سے تو (مصلحت کے مطابق) روکنا چاہتا ہے روک لے تجھ پر کوئی حساب نہیں ہے (هٰذا عطاؤنا فامنن او امسك بغير حساب)۔
"بغیر حساب" یا تو اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے تیرے مقام عدالت کی بنا پر تجھے وسیع اختیارات دیئے ہیں اور تجھ سے پوچھ گچھ نہ ہوگی، یا اس کا معنی یہ ہے کہ عطائے الٰہی تجھ پر اس قدر ہے کہ جس قدر بھی تو بخش دے اس میں حساب نہیں ہوگا۔
بعض مفسرین نے اس تعبیر کو صرف گرفتار شیاطین سے مربوط جانا ہے کہ جسے تو چاہے (اور مصلحت دیکھے) آزاد کردے اور جس کے لیے قید میں مصلحت سمجھے اسے قید کردے۔

---

[1] "اٰخرین" کا عطف "کل بنّاء" پر ہے اور "سخّرنا" کے مفعول کے حکم میں ہے اور "مقرّنین" "اٰخرین" کی صفت ہے۔

لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے کیونکہ یہ "عطاؤنا" کے ظاہری مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

۵۔ پانچویں نعمت جو اللہ نے حضرت سلیمان کو دی وہ ان کا روحانی مقام تھا کہ جو اللہ نے ان کی اہلیت وقابلیت کی بنا پر انھیں مرحمت فرمایا تھا۔ جیسا کہ زیر بحث آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: اس کے لیے ہمارے پاس بلند مقام اور نیک انجام ہے (وان لہ عندنا لزلفی وحسن ماٰب)۔

یہ جملہ درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جنھوں نے اس عظیم نبی کے مقام مقدس پر طرح طرح کی ناروا اور بے ہودہ تہمتیں لگانے میں موجودہ تورات کی پیروی کی۔ اس آیت میں قرآن حضرت سلیمانؑ کو تمام تہمتوں سے مبرا قرار دے رہا ہے اور خدا کے ہاں ان کے معزز مقام کی خبر دے رہا ہے۔ یہاں تک کہ "حسن ماٰب" کہہ کر ان کے انجام بخیر کی خبر بھی دی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ تورات میں آنے والی اس ناروا نسبت کی نفی ہو کہ حضرت سلیمانؑ نے بت پرستوں میں شادی کی تھی، جس وجہ سے ان کا میلان بت پرستی کی طرف ہوگیا تھا۔ موجودہ تورات یہاں تک کہتی ہے کہ انھوں نے بت خانہ بنایا تھا، لیکن قرآن "حسن ماٰب" کہہ کر ان تمام اوہام وخرافات پر خطِ بطلان کھینچ رہا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **داستانِ سلیمانؑ سے حاصل ہونے والا درس:** شک نہیں کہ تاریخ انبیاء ذکر کرنے سے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ ان زندہ واقعات میں سے مبنی حقائق منعکس کیے جائیں تاکہ تربیتی پروگرام کی تکمیل ہوسکے۔ حضرت سلیمانؑ کی داستان سے جو حقائق سامنے آتے ہیں ان میں یہ امور بھی شامل ہیں:

الف۔ ایک طاقتور حکومت، فراواں مادی وسائل اور وسیع اقتصادی وسائل وخوشحالی اور درخشاں تمدن ان سب کی موجودگی روحانی مقامات اور الٰہی وانسانی اقدار کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ زیر بحث آیات میں حضرت سلیمانؑ کے پاس موجود تمام مادی نعمات کے ذکر کے بعد آخر میں بارگاہِ الٰہی میں ان کے بلند مقام اور نیک انجام کا ذکر کرتی ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

ارءیتم ما اعطی سلیمان بن داؤد من ملکہ، فان ذٰلک لم یزدہ الا تخشعا، ماکان یرفع بصرہ الی السماء تخشعا لربہ

تم نے دیکھا کہ اللہ نے سلیمان کو کیسی عظیم حکومت دی اس کے باوجود ان میں خشوع وخضوع کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا یہاں تک کہ شدتِ خشوع کے باعث وہ آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف نہیں دیکھتے تھے۔[1]

ب۔ ایک آباد ملک کا نظام چلانے کے لیے تیز رفتار رابطے کی بھی ضرورت ہے۔ مختلف قوتوں سے کام لینے کی بھی اور

---

[1] روح البیان، جلد ۸ ص ۲۹

تخریب کار اور فسادی قوتوں کو روکنے کی بھی ضرورت ہے، نیز انسانی و سماجی مسائل کی طرف توجہ بھی درکار ہے۔ مختلف وسائل و ذرائع سے کام لے کر سرمایہ تولید کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ لائق اور اہل مدبروں اور افسروں کو وسیع اختیارات بھی دینا ضروری ہیں یہ تمام امور واضح طور پر اس داستان سے واضح ہوتے ہیں۔

ج ۔ تمام قوتوں اور طاقتوں سے استفادہ کرنا چاہیے حتیٰ کہ شیطانوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان میں سے بھی جو توجیہ اور ہدایت کے قابل ہیں انھیں صحیح استعمال میں لانا چاہیے اور صرف انھیں قید اور بندش میں ہونا چاہیے جو بالکل قابل استفادہ نہیں ہیں۔

۲۔ سلیمانؑ ـــــ قرآن اور تورات میں: قرآن نے اس عظیم نبی کی جو تصویر پیش کی ہے، اس کے مطابق ایک پاک و پاکیزہ، عالی رتبہ، مدبر اور عدالت پیشہ انسان تھے جبکہ موجودہ تحریف شدہ تورات انھیں (نعوذ باللہ) ایک عیاش، ہوس پرست اور بہت سی کمزوریوں کے حامل شخص کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اسی کتاب میں حضرت سلیمانؑ کی مناجات، مذہبی اشعار اور حکیمانہ باتیں بھی شامل ہیں کہ جو نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ ایک حکیم و دانا، مجاہد اور جوانمرد تھے یہ موجودہ تورات میں عجیب تضاد ہے۔

مزید وضاحت کے لیے اس تفصیلی بحث کی طرف رجوع کریں جو تفسیر نمونہ جلد ۱۸ میں سورۂ سبا کی آیت ۱۲ تا ۱۴ کی تفسیر کے ذیل میں اس ضمن میں کی گئی ہے۔

۴۱۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ۝

۴۲۔ ارْكُضْ بِرِجْلِكَ ۖ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ۝

۴۳۔ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝

۴۴۔ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ ۗ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝

ترجمہ

۴۱۔ ہمارے بندے ایوب کو یاد کر، جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے رنج اور اذیت دی ہے

۴۲۔ (ہم نے اس سے کہا) اپنے پاؤں سے زمین پر ٹھوکر مار، یہ ٹھنڈے پانی کا چشمہ نہانے اور پینے کے لیے ہے۔

۴۳۔ اور ہم نے اسے اس کا خاندان عطا کیا اور ان کی طرح اور بھی ان کے ساتھ قرار دیئے تاکہ ہماری طرف سے رحمت ہو اور صاحبانِ فکر کے لیے ایک نصیحت ہے۔

۴۴۔ (اور ہم نے اس سے کہا) مٹھی بھر گندم کی (یا اس جیسی) سینکیں لے اور اسے (اپنی بیوی کو) مار اور اپنی قسم نہ توڑ، ہم نے اسے صابر پایا، کیا اچھا بندہ تھا کہ خدا کی طرف بہت رجوع کرنے والا تھا۔

تفسیر

حضرت ایوبؑ کی حیران کن زندگی اور ان کا صبر

گزشتہ آیات میں حضرت سلیمانؑ کی حشمت اور دبدبے کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو خداداد قدرت کی مظہر تھی اور حضرت سلیمانؑ کی داستان رسولِ اکرمؐ اور مکہ میں موجود ان مسلمانوں کے لیے ایک نوید کے مانند تھی کہ جو سخت دباؤ میں تھے۔

زیرِ بحث آیات حضرت ایوبؑ کے بارے میں ہیں کہ جو صبر و استقامت کا نمونہ تھے، ان کا ذکر اس لیے ہے تاکہ اس وقت کے

اور پھر آج کے اور آئندہ کے مسلمانوں کے لیے مشکلوں اور پریشانیوں میں استقامت، قیام اور جدوجہد کا درس ہو اور انھیں پامردی کی دعوت دی جائے اور اس صبر و استقامت کا حسنِ انجام واضح کیا جائے۔

ایوبؑ تیسرے نبی ہیں کہ جن کی زندگی کا کچھ حصہ اس سورہ میں بیان کیا گیا ہے اور ہمارے عظیم نبیؐ پر فرض کیا گیا ہے کہ ان کی سرگزشت کو یاد رکھیں اور اپنے مسلمانوں کے سامنے بیان کریں تاکہ وہ طاقت فرسا مشکلات سے ہراساں نہ ہوں اور اللہ کے لطف و رحمت سے کبھی بھی مایوس نہ ہوں۔

حضرت ایوبؑ کا نام اور ان کی زندگی کا ذکر قرآن کریم کی کئی ایک سورتوں میں آیا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۶۳ اور سورۂ انعام کی آیت ۸۴ میں دیگر انبیاء کے ساتھ ان کے صرف نام پر اکتفا کیا گیا ہے کہ جس سے ان کا مقامِ نبوت ثابت اور واضح ہوتا ہے برخلاف موجودہ تورات کے کہ جو انھیں انبیاء کے زمرے میں شمار نہیں کرتی بلکہ انھیں ایک نیک اور صالح انسان سمجھتی ہے کہ جن کی بہت سی اولاد تھی اور جو صاحبِ مال شخص تھے۔

سورۂ انبیاء کی آیت ۸۳ اور ۸۴ میں ان کی زندگی کے کچھ حالات بیان ہوئے ہیں اور سورۂ ص کی زیرِ بحث آیات میں دیگر مقامات سے مفصل تر حالات بیان ہوئے ہیں اور یہاں اس ضمن میں چار آیتیں آئی ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہمارے بندے ایوب کو یاد کر جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کی: شیطان نے مجھے بہت تکلیف اور اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے (واذکر عبدنا ایوب اذ نادٰی ربہ انی مسنی الشیطان بنصب وعذاب)۔

"نصب" ("عسر" کے وزن پر) اور "نصب" ("حسد" کے وزن پر) دونوں بلا و مصیبت کے معنی میں ہیں۔ اس آیت میں۔

اولاً: بارگاہِ الٰہی میں حضرت ایوبؑ کا بلند مقام "عبدنا" (ہمارا بندہ) سے معلوم ہوتا ہے۔

ثانیاً: اشارتاً حضرت ایوب کی شدید اور طاقت فرسا تکلیف اور فراواں مصیبت کا ذکر ہے، اس ماجرے کی تفصیل قرآن میں نہیں آئی لیکن حدیث و تفسیر کی مشہور کتب میں اس کی تفصیل نقل ہوئی ہے۔

کسی شخص نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا:

وہ مصیبت جو حضرت ایوبؑ کو دامن گیر ہوئی، کس بنا پر تھی؟ (شاید سائل کا خیال تھا کہ ان سے کوئی غلط کام سرزد ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے انھیں مصیبت میں مبتلا کر دیا)۔

امامؑ نے اس سوال کا تفصیلی جواب دیا جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

ایوب کفرانِ نعمت کی وجہ سے ان عظیم مصائب میں گرفتار نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس شکرِ نعمت کی وجہ سے ہوئے کیونکہ شیطان نے بارگاہِ خدا میں عرض کی کہ یہ جو ایوب تیرا شکر گزار ہے وہ فراواں نعمتوں کی وجہ سے ہے کہ جو تو نے اسے دی ہیں، اگر یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو یقیناً وہ کبھی شکر گزار بندہ نہیں ہوگا۔

اس بنا پر کہ ساری دنیا پر ایوب کا خلوص واضح ہو جائے اور انھیں عالمین کے لیے نمونہ قرار دیا جائے تاکہ

لوگ نعمت اور مصیبت ہر دو عالم میں شاکر و صابر ہیں۔ اللہ نے شیطان کو اجازت دی کہ وہ حضرت ایوب کی دنیا پر قبضہ کرے۔ شیطان نے اللہ سے خواہش کی ایوب کا فراواں مال و دولت، ان کی کھیتیاں، بھیڑ بکریاں اور آل اولاد، ختم ہو جائے۔ آفتیں اور مصیبتیں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا لیکن۔ مگر یہ کہ ایوب کے شکر میں کمی نہیں آئی بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ خدا سے شیطان نے خواہش کی کہ اب اسے ایوب کے بدن پر بھی مسلط کر دے اور وہ اس طرح بیمار ہو جائے کہ ان کا بدن شدت درد کی لپیٹ میں آ جائے اور وہ بیماری کے بستر کا اسیر ہو جائے لیکن اس چیز نے بھی ان کے مقام شکر میں کمی نہ کی۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے ایوب کا دل توڑ دیا اور ان کی روح کو سخت مجروح کیا۔ وہ یہ کہ بنی اسرائیل کے راہبوں کی ایک جماعت انھیں دیکھنے آئی اور انھوں نے کہا کہ تو نے کون سا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے اس دردناک عذاب میں مبتلا ہے؟ ایوب نے جواباً کہا: میرے پروردگار کی قسم کہ مجھ سے کوئی غلط کام نہیں ہوا میں ہمیشہ اللہ کی اطاعت میں کوشاں رہا ہوں اور میں نے جب بھی کوئی لقمۂ غذا کا کھایا ہے کوئی نہ کوئی یتیم و بے نوا میرے دسترخوان پر ہوتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایوب دوستوں کی اس شماتت پر ہر دوسری مصیبت سے زیادہ دکھی ہوئے پھر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا اور شکر کے صاف و شیریں پانی کو کفران سے آلودہ نہ کیا، صرف بارگاہ خدا کی طرف رخ کیا اور مذکورہ جملہ عرض کیا اور چونکہ آپ اللہ کے امتحانوں سے خوب عہدہ برآ ہوئے لہٰذا اللہ نے اپنے اس شاکر و صابر بندے پر پھر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے اور کھوئی ہوئی نعمتیں یکے بعد دیگرے پہلے سے بھی زیادہ انھیں عطا کیں تاکہ سب لوگ صبر و شکر کا نیک انجام دیکھ لیں [1]

بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ شیطان نے حضرت ایوبؑ کو مختلف وسوسوں کے ذریعے اذیت دی تھی۔
کبھی کہتا تھا: تمھاری بیماری بہت طویل ہو گئی ہے اللہ نے تمھیں بھلا دیا ہے۔
کبھی کہتا تھا: تمھارے پاس کیا عظیم نعمتیں تھیں؟ کیسی صحت و طاقت تھی؟ سب خدا نے تم سے چھین لی ہیں اور تم پھر بھی اس کا شکر ادا کر رہے ہو؟
شاید یہ تفسیر اس بنا پر ہو کہ ان مفسرین نے ایوبؑ جیسے پیغمبر، ان کی جان، مال اور اولاد پر شیطان کا تسلط بعید سمجھا ہے،

---

[1] یہ روایت تفسیر نور الثقلین میں تفسیر علی بن ابراہیم کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ یہی مضمون تفسیر قرطبی، تفسیر فخر رازی اور تفسیر صافی وغیرہ میں اور اعلام القرآن میں کچھ فرق کے ساتھ آیا ہے۔ عہد عتیق کی کتب میں کتاب ایوب میں اس سے ملتے جلتے مطالب نظر آتے ہیں اگرچہ یہ مطالب اسلامی کتب میں آنے والی تفصیلات سے مختلف ہیں۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اولاً تو یہ تسلط فرمانِ خدا سے تھا، ثانیاً وقتی طور پر تھا اور ثالثاً اس عظیم نبی کی آزمائش اور بلندیٔ مقام کے لیے تھا، اس لیے اس سے کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔

بہرحال کہتے ہیں کہ ان کی بیماری اور ناراحتی سات سال تک رہی اور ایک روایت کے مطابق سترہ برس تک رہی، یہاں تک کہ آپ کے نزدیک ترین ساتھی بھی ساتھ چھوڑ گئے، صرف ایک بیوی نے وفا میں استقامت کی اور یہ چیز خود ایک شاہد ہے بعض بیویوں کی وفاداری پر۔ لیکن ایوب کو جس چیز سے زیادہ دکھ ہوتا تھا وہ دشمنوں کی شماتت تھی۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت ایوب کو کھوئی ہوئی صحت و سلامتی پھر مل گئی اور رحمتِ الٰہی کے دروازے ان کے لیے کھل گئے تو لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ سب سے شدید درد آپ کو کون سا تھا، تو آپ نے کہا: دشمنوں کی شماتت۔

انجام کار حضرت ایوبؑ آزمائش الٰہی کی اس گرم بھٹی سے صحیح و سالم باہر نکل آئے اور پھر رحمتِ خدا کا آغاز ہوا۔ انھیں حکم دیا گیا کہ "اپنا پاؤں زمین پر مارو" تو پانی کا چشمہ ابل پڑے گا کہ جو تیرے نہانے کے لیے ٹھنڈا بھی ہوگا اور تیرے پینے کے لیے عمدہ بھی (ارکض برجلك هٰذا مغتسل بارد وشراب)۔

"ارکض" "رکض" (بروزن "نکث") کے مادہ سے زمین پر پاؤں مارنے کے معنی میں ہے اور کبھی یہ لفظ دوڑنے کے معنی میں بھی آتا ہے، لیکن یہاں پہلے والا معنی ہے۔

وہی خدا جس نے خشک اور تپتے بیابان میں شیر خوار اسماعیل کی ایڑیوں کے نیچے چشمہ پیدا کر دیا، وہی خدا کہ ہر حرکت و سکون اور ہر نعمت و عنایت جس کی طرف سے ہے، اس نے یہ فرمان ایوب کے لیے بھی صادر فرمایا، پانی کا چشمہ ابلنے لگا، ٹھنڈا اور میٹھا چشمہ جو اندرونی و بیرونی سب بیماریوں کے لیے شفا بخش تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ اس چشمے میں ایک طرح کا معدنی پانی تھا جو پینے کے لیے بھی اچھا تھا اور بیماریوں کو دور کرنے کے لیے بھی مؤثر تھا۔ بہرحال کچھ بھی تھا ایک صابر و شاکر نبی کے لیے اللہ کا لطف و کرم تھا۔

"مغتسل" نہانے والے پانی کو کہتے ہیں۔ بعض نے اسے نہانے کی جگہ کے معنی میں سمجھا ہے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ٹھنڈا ہونے کے لحاظ سے پانی کی تعریف شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ٹھنڈے پانی سے نہانا بدن کی صحت و سلامتی کے لیے خصوصی تاثیر رکھتا ہے جیسا کہ موجودہ طب میں بھی ثابت ہو گیا ہے۔

نیز یہ اس امر کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ نہانے کے لیے بہترین پانی وہ ہے جو پاکیزگی اور لطافت کے لحاظ سے پینے کے پانی جیسا ہو۔ اس امر کا شاہد یہ ہے کہ اسلامی احکام میں بھی آیا ہے کہ:

اس سے پہلے کہ پانی سے غسل کرو اس میں سے ایک گھونٹ پی لو۔[1]

پہلی اور اہم ترین خدائی نعمت صحت تھی، جب وہ ایوب کی طرف لوٹ آئی تو دوسری نعمتوں کے لوٹنے کی نوبت آئی، اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے اس کے گھر والے بخش دیئے (و وهبنا له اهله) اور ان کے ساتھ ان کے

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱ باب ۱۴ از ابواب آداب الحمام، حدیث ۱

مانند بھی قرار دیئے (و مثلہم معہم)، تاکہ ہماری طرف سے رحمت ہو اور صاحبانِ فکر و نظر کے لیے نصیحت بھی (رحمة منّا و ذکریٰ لاولی الالباب)۔

ان کا گھرانہ ان کے پاس کیسے واپس آیا، اس سلسلے میں مختلف تفسیریں موجود ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ وہ مر چکے تھے اور اللہ نے انھیں پھر زندگی دی۔

لیکن بعض نے لکھا ہے کہ حضرت ایوبؑ کی طویل بیماری کے باعث وہ ادھر ادھر بکھر چکے تھے جب حضرت ایوبؑ صحت یاب ہو گئے تو وہ پھر آپ کے گرد اگرد جمع ہو گئے۔

کچھ لوگوں نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ سب یا ان میں سے بعض افراد بھی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے رحمتِ الٰہی ان کے شاملِ حال ہوئی وہ سب روبصحت ہو گئے اور پروانوں کی طرح وجود پدر کی شمع کے گرد جمع ہو گئے۔

"اور ان کے ساتھ ان کے مانند بھی قرار دیئے" یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے ان کے گھر کو پہلے سے بھی زیادہ آباد اور پُر رونق کیا اور ایوب کو مزید بیٹے عطا کیے۔

ان آیات میں اگرچہ حضرت ایوبؑ کی مال و دولت کے بارے میں بات نہیں کی گئی لیکن موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے پھر آپ کو مال و دولت بھی فراواں تر عطا فرمایا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں حضرت ایوبؑ کی طرف نعماتِ الٰہی کے لوٹ آنے کا مقصد دو چیزیں شمار کی گئی ہیں: ایک ان پر اللہ کی رحمت کہ جو انفرادی پہلو رکھتی ہے اور درحقیقت صابر و شاکر بندے کے لیے اجر و انعام ہے اور دوسری تمام تاریخِ انسانی میں صاحبانِ عقل و خرد کے لیے درسِ ہدایت، تاکہ وہ مشکلوں اور سختیوں میں صبر و شکیبائی کا راستہ نہ چھوڑیں اور ہمیشہ رحمتِ الٰہی کے امیدوار رہیں۔

اب صرف ایک مشکل ایوبؑ کے لیے باقی تھی وہ تھی وہ قسم جو انھوں نے اپنی بیوی کے بارے میں کھائی تھی اور وہ یہ تھی کہ انھوں نے ان سے کوئی خلافِ مرضی کام دیکھا تھا لہٰذا انھوں نے اس بیماری کی حالت میں قسم کھائی کہ جس وقت ان میں طاقت پیدا ہوگی تو وہ اسے ایک سو یا اس سے کچھ کم کوڑے ماریں گے، لیکن صحت یابی کے بعد وہ چاہتے تھے کہ اس کی خدمات اور وفاداریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے معاف کر دیں لیکن قسم اور خدا کے نام کا مسئلہ درمیان میں تھا۔ خدا نے یہ مشکل بھی ان کے لیے حل کر دی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ ان سے فرمایا گیا: گندم کی شاخوں (یا اسی قسم کی کسی چیز) کی ایک مٹھی بھر لو اور اس کے ساتھ مارو اور اپنی قسم نہ توڑو (وخذ بیدك ضغثاً فاضرب به ولا تحنث)۔

"ضغث" (بروزن "حرص") گندم یا جو کی نرم و نازک شاخوں کی ایک مٹھی یا خرما کے خوشے کے تار یا پھولوں کی طرح کی چیزوں کی ایک مٹھی کے معنی میں ہے۔

حضرت ایوبؑ کی بیوی کا نام ایک روایت کے مطابق لیا بنت یعقوب تھا۔ اس بارے میں کہ اس سے کون سی غلطی ہوئی تھی مفسرین کے درمیان بحث ہے۔

مشہور مفسر ابنِ عباس سے نقل ہوا ہے کہ شیطان یا (کوئی شیطان صفت) ایک طبیب کی صورت میں ایوب کی بیوی کے پاس آیا

اس نے کہا: میں تیرے شوہر کا علاج کرتا ہوں صرف اس شرط پر کہ جس وقت وہ ٹھیک ہو جائے تو وہ مجھ سے یہ کہہ دے کہ صرف میں نے اسے شفایاب کیا ہے، اس کے علاوہ میں اور کوئی اُجرت نہیں چاہتا۔

ان کی بیوی نے جوان کی مسلسل بیماری کی وجہ سے سخت پریشان تھی اس شرط کو قبول کر لیا اور حضرت ایوبؑ کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔ حضرت ایوبؑ جو شیطان کے جال کو سمجھتے تھے، بہت ناراض ہوئے اور قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی کو سزا دیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ جناب ایوبؑ نے اسے کسی کام کے لیے بھیجا تھا تو اس نے دیر کر دی، حضرت ایوب چونکہ بیماری سے تکلیف میں تھے، بہت پریشان ہوئے اور اس طرح کی قسم کھائی۔

بہرحال اگر وہ ایک طرف سے اس قسم کی سزا کی مستحق تھی تو دوسری طرف اس طویل بیماری میں اس کی وفاداری، خدمت اور تیمارداری اس قسم کے عفو و درگزر کا استحقاق بھی رکھتی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ گندم کی شاخوں کے ایک دستہ یا خوشہ خرما کی لکڑیوں سے مارنا ان کی قسم کا واقعی مصداق نہیں تھا لیکن خدا کے نام کے احترام کی حفاظت اور قانون شکنی پھیلنے سے روکنے کے لیے انھوں نے یہ کام کیا اور یہ بات صرف اس صورت میں ہے کہ کوئی مستحق عفو و درگزر ہو، اور انسان چاہے کہ عفو و درگزر کے باوجود قانون کے ظاہر کو بھی محفوظ رکھے ورنہ ایسے مواقع پر جہاں استحقاق عفو و بخشش نہ ہو وہاں ہرگز اس کام کی اجازت نہیں ہے[1]

آخر میں زیرِ بحث آیات کے آخری جملے میں جو اس داستان کی ابتدا و انتہا کا نچوڑ ہے، فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے صابر و شکیبا پایا، ایوب کتنا اچھا بندہ تھا جو ہماری طرف بہت زیادہ بازگشت کرنے والا تھا (انا وجدناہ صابرا نعم العبد انہ اواب)۔

یہ بات کہے بغیر ہی ظاہر ہے کہ ان کا خدا کی بارگاہ میں دعا کرنا اور شیطان کے وسوسوں اور درد، تکلیف اور بیماری کے دُور ہونے کا تقاضا کرنا، مقامِ صبر و شکیبائی کے منافی نہیں اور وہ بھی سات سال اور ایک روایت کے مطابق اٹھارہ سال تک بیماری اور فقر و فاقہ کے ساتھ نبھانے اور شاکر رہنے کے بعد۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس جملے میں حضرت ایوبؑ کی تین اہم صفات کے ساتھ توصیف کی گئی ہے کہ جو جس کسی میں بھی پائی جائیں وہ ایک انسان کامل ہوتا ہے۔

۱۔ مقامِ عبودیت ۲۔ صبر و استقامت ۳۔ پے در پے خدا کی طرف بازگشت

چند اہم نکات

ایوبؑ کی داستان کے اہم درس: اس کے باوجود کہ اس صابر پیغمبر کی ساری سرگزشت اس سورہ کی صرف چار آیتوں میں آئی ہے لیکن یہی مقدار جو قرآن نے بیان کی ہے بہت سے اہم حقائق کے لیے ہدایت بخش ہے۔

---

[1] اس معنی کی نظیر حدود اسلامی اور ان کے اجراء کے باب میں خطاکار بیماروں کے بارے میں بھی آئی ہے (کتاب الحدود، ابواب حد الزنا)

الف: خدا کی طرف سے آزمائش کا میدان اتنا وسیع اور کشادہ ہے کہ عظیم پیغمبر تک بھی شدید ترین اور سخت ترین آزمائشوں سے گزارے جاتے ہیں کیونکہ اس جہان کی زندگی کا مزاج اسی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ اصولی طور پر انسانوں کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں سخت قسم کی آزمائشوں کے بغیر ظاہر نہیں ہوتیں۔

ب: شدت اور سختی کے بعد فرج و کشائش، یہ وہ سرانکتہ ہے جو اس داستان میں چھپا ہوا ہے۔ جب امواج مشکلات و بلا ہر طرف سے انسان کو دباتی ہیں تو اسے نہ صرف مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے رحمتِ الٰہی کے دروازے کھلنے کی نشانی اور ایک تمہید سمجھنا چاہیے جیسا کہ امیرالمومنین علیؑ فرماتے ہیں:۔

عند تناهی الشدة تکون الفرجة، وعند تضایق حلق البلاء یکون الرخاء

جب سختیاں اپنی بلندی کو پہنچ جاتی ہیں تو فرج و کشائش نزدیک ہو جاتی ہے اور جس وقت بلا و مصیبت کے حلقے زیادہ تنگ ہو جاتے ہیں تو راحت و آسودگی آن پہنچتی ہے۔[1]

ج: اس داستان سے زندگی کی سخت مشکلات اور مصائب کے بعض فلسفے اچھی طرح سے واضح ہو جاتے ہیں، جو لوگ توحید کی بحث میں آفات اور بلاؤں کو برہانِ نظم کے برخلاف مادہ نقض سمجھتے ہیں انھیں یہ داستان یہ جواب دیتی ہے کہ ان سخت حوادث کا وجود بعض اوقات انسانوں کی زندگی میں عظیم انبیاء سے لے کر عام انسانوں تک ایک ضرورت ہوتا ہے، امتحان و آزمائش کی ضرورت، چھپی ہوئی صلاحیتوں کے ظاہر ہونے کی ضرورت اور انسان کے وجود کے ارتقاء و تکامل کی ضرورت۔

لہٰذا بعض روایات میں حضرت صادقؑ سے منقول ہوا ہے:

ان اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الذی یلونهم الامثل فالامثل

سب لوگوں سے زیادہ خدا کے پیغمبر سخت آفتوں اور مشکلات میں گرفتار ہوتے ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے پیچھے قرار پاتے ہیں اپنی شخصیت و مقام کے لحاظ اور مناسبت سے۔[2]

اسی امام بزرگوار سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ان فی الجنة منزلة لا یبلغها عبدٌ الّا بالابتلاء

جنت میں ایک مقام ایسا ہے جس تک کوئی شخص نہیں پہنچ سکتا مگر ابتلاءات اور مشکلات سے گزر کر۔[3]

د: یہ داستان تمام سچے مومنین کو تمام زندگی میں صبر و شکیبائی کا درس دیتی ہے، وہی صبر جس کا انجام ہر میدان میں کامیابی و کامرانی ہے اور جس کا نتیجہ پروردگار کی بارگاہ میں "مقامِ محمود" اور "بلند منزلت" کا حصول ہے۔

ھ: جو آزمائش کسی انسان کو پیش آتی ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں اور ساتھیوں کی بھی آزمائش ہوتی ہے تاکہ ان کی صداقت اور دوستی کا وزن بھی جانچ لیا جائے کہ وہ کس حد تک وفادار ہیں۔ حضرت ایوبؑ جس وقت اپنا مال و ثروت اور صحت و سلامتی

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۳۵۱

[2] و [3] سفینۃ البحار مادہ "بلا" جلد ۱ ص ۱۰۵

کھو بیٹھے، ان کے دوست و احباب بھی تھک کر منتشر ہوگئے اور دوستوں اور دشمنوں نے مل کر شماتت و ملامت کے لیے زبان کھولی، اور ہر زمانے سے بہتر انھوں نے اپنی اصلیت ظاہر کردی اور ہم نے دیکھ لیا کہ ان کی زبان سے ایوب کو جو دکھ پہنچا تھا وہ دوسرے ہر رنج سے زیادہ تھا۔ کیونکہ مشہور ضرب المثل کے مطابق نیزہ و تلوار کے زخم تو مل جاتے ہیں لیکن جو زخم زبان دل پر لگاتی ہے وہ بھرنے والا نہیں ہوتا۔

و : خدا کے دوست وہ نہیں ہوتے جو صرف نعمتوں کے ان کی طرف رُخ کرنے کے وقت اس کی یاد میں رہتے ہوں، بلکہ واقعی دوست وہ ہوتے ہیں جو فراخی، تنگی، مصیبت و نعمت، بیماری و صحت اور فقر و غنا ہر حالت میں اس کی یاد میں رہیں اور مادی زندگی کی دگرگونیاں ان کے ایمان و افکار میں دگرگونی پیدا نہ کریں۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام نے اس غرّا و پرشور خطبہ میں جو آپ نے اپنے باصفا دوست "ہمام" کے لیے پرہیزگاروں کے اوصاف میں بیان فرمایا تھا اور ایک سو سے زیادہ صفات متقین کی بیان کی تھیں، اس کے اہم اوصاف میں سے ایک یہ تھی:۔

نزلت انفسھم منھم فی البلاء کالتی نزلت فی الرخاء

ان کی روح بلا و مصیبت کے وقت ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ راحت و آرام کی حالت میں (اور زندگی کی تبدیلیاں انھیں دگرگوں نہیں کرتیں)۔

ز : یہ ماجرا ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ نہ تو امکانات و وسائل مادی کا ہاتھ سے نکل جانا اور مصائب و مشکلات اور فقر و فاقہ کا رُخ کرنا، انسان کے پیغمبر کی بے لطفی کی دلیل ہے اور نہ ہی امکانات مادی کا فراہم ہونا، پروردگار کے قرب سے دوری کی دلیل ہے، بلکہ انسان ان تمام وسائل و امکانات کے ہوتے ہوئے خدا کا خاص بندہ ہو سکتا ہے اگر شرط یہ ہے کہ وہ مال و مقام فرزند کا اسیر نہ ہو جائے، اور ان کے ہاتھ سے نکل جانے سے صبر کی زمام ہاتھ سے نہ چھوڑ دے۔

۲۔ ایوبؑ ــــــ قرآن و تورات میں: اس عظیم پیغمبر کا پاک چہرہ ــــــ جو صبر و شکیبائی کا مظہر ہے، یہاں تک کہ صبر ایوبؑ سب کے لیے ضرب المثل ہوگیا ہے، قرآن مجید میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ خدا نے کس طرح سے اس داستان کی ابتدا اور انتہا میں ان کی تعریف کی ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی سرگزشت بھی جاہلوں یا دانا دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہی اور ایسے ایسے خرافات ان پر باندھے گئے جن سے ان کی مقدس و پاک شخصیت منزہ ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیماری کے وقت حضرت ایوبؑ کے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے اور ان میں اتنی بدبو پیدا ہو گئی تھی کہ بستی والوں نے انھیں آبادی سے باہر نکال دیا۔

بلاشک و شبہ اس قسم کی روایت جعلی اور من گھڑت ہے، چاہے وہ حدیث کی کتابوں کے اندر ہی کیوں نہ ذکر ہوئی ہو۔ کیونکہ پیغمبروں کی رسالت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ ہر وقت اور ہر زمانے میں میل و رغبت کے ساتھ ان سے مل سکیں اور جو بات لوگوں کے تنفر و بے زاری ور افراد کے ان سے دور رہنے کا موجب بنے، چاہے وہ تنفر آمیز بیماریاں ہوں یا عیوب جسمانی یا اخلاقی خشونت و سختی، ان میں نہیں ہوں گی، کیونکہ یہ چیزیں ان کے فلسفہ رسالت سے تضاد رکھتی ہیں۔

قرآن مجید پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں کہتا ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظاً غليظ القلب لانفضوا من حولك

رحمتِ الٰہی کے سایے میں تو ان کے لیے نرم و مہربان ہو گیا کیونکہ اگر تو سخت اور سنگ دل ہوتا تو وہ تیرے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے۔

(آلِ عمران ـــــــ ۱۵۹)

یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ پیغمبر کو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اس کے اطراف سے منتشر ہو جائیں۔

لیکن تورات میں ایک مفصل قصہ "ایوب" کے بارے میں نظر آتا ہے جو "مزامیر داؤد" سے پہلے موجود ہے۔ یہ کتاب ۴۲ فصل پر مشتمل ہے اور ہر فصل میں تفصیلی بحث موجود ہے۔ بعض فصول میں تو انتہائی تکلیف دہ مطالب نظر آتے ہیں، ان میں سے تیسری فصل میں ہے کہ:

"ایوب نے شکایت کے لیے زبان کھولی اور بہت زیادہ شکوہ کیا، جب کہ قرآن نے انکی صبر و شکیبائی کی تعریف کی ہے۔

۳۔ عظیم پیغمبروں کی "اوّاب" کہہ کر توصیف: اسی سورہ "ص" میں تین پیغمبروں کی "اوّاب" کے لفظ کے ساتھ توصیف کی گئی ہے اور وہ ہیں: داؤدؑ، سلیمانؑ اور ایوبؑ۔ سورۂ ق کی آیہ ۳۲ میں یہ صفت تمام جنتیوں کے لیے بیان کی گئی ہے۔

هٰذا ما توعدون لكل اوّاب حفيظ

یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ "اوّابین" کا ایک بلند و بالا مقام ہے۔ جب ہم لغت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ "اوّاب" "اوب" (بروزنِ "قول") کے مادہ سے رجوع کرنے اور بازگشت کے معنی میں ہے۔ یہ رجوع اور بازگشت ـــــــ خصوصاً اوّاب کے صیغۂ مبالغہ کی طرف دیکھیں تو تکرار اور کثرت پر دلالت کرتا ہے۔

گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "اوّابین" ان عوامل کے مقابلے میں بہت حساس ہیں جو انھیں خدا سے دُور کرتے ہیں، خواہ وہ عالمِ مادہ کی دل فریبیاں ہوں یا نفس اور شیاطین کے وسوسے، اگر وہ ایک لمحے کے لیے دُور ہو جاتے ہیں تو فوراً متوجہ ہو کر اس کی طرف لوٹتے ہیں اور اگر ایک لحظے کے لیے غافل ہو جاتے ہیں تو اس کی یاد کر کے تلافی کرتے ہیں۔

یہ بازگشت ممکن ہے خدائی اوامر و نواہی کی طرف بازگشت ہو، یعنی ان کا نگاہ ہر جگہ اس کے فرمان ہی سے ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

سورۂ سبا کی آیہ ۱۰ میں ہے:

یاجبال اوّبی معه والطیر

یہ حضرت داؤدؑ کے بارے میں ہے۔ اس سے اوّاب کا ایک اور معنی بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ ہم آواز ہونا ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے۔

اے پہاڑو اور اے پرندو! داؤد کے ساتھ ہم صدا ہو جاؤ۔

اس بنا پر "اوّاب" وہ شخص ہے جو قوانین، خلقت، اوامر الٰہی اور موجوداتِ عالم کی عمومی حمد و تسبیح کے ساتھ ہم صدا اور ہم آہنگ ہو اور اتفاق کی بات ہے کہ "ایوب" کے معانی میں سے ایک "اوّاب" بھی ہے۔

ہاں وہ ہمیشہ دوسرے جہان کی یاد میں رہتے تھے۔ ان کی نگاہ اس دنیا کی چندروزہ زندگی اور اس کی لذات تک محدود نہیں تھی۔ وہ اس زودگزر زندگی کے علاوہ بے پایاں نعمتوں سے معمور ایک جاودانی گھر کو دیکھتے تھے اور ہمیشہ اس کے لیے سعی و کوشش کرتے رہتے تھے۔

اس بنا پر "الدار" (گھر) جو مطلق طور پر ذکر ہوا ہے سے مراد آخرت کا گھر ہے۔ گویا اس کے علاوہ کوئی اور گھر وجود ہی نہیں رکھتا اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کی طرف جانے والی ایک گذرگاہ ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں "دار" سے مراد دارِ دنیا ہے اور "ذکری الدار" کی تعبیر اس نیک نامی کی طرف اشارہ ہے جو ان پیغمبروں کے لیے اس دنیا میں باقی رہ گئی ہے لیکن یہ احتمال ـــــ خصوصاً "الدار" کے مطلق ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے ـــــ بہت ہی بعید نظر آتا ہے اور لفظ "ذکری" کے ساتھ بھی چنداں ہم آہنگ نہیں ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد دارِ آخرت میں نیک نامی اور ذکرِ جمیل ہے، جب کہ یہ بھی بعید نظر آتا ہے۔

بہر حال دوسرے لوگوں کے لیے بھی ممکن ہے کہ کبھی کبھی آخرت کے گھر کو یاد کرلیں۔ خصوصاً جب ان کے دوستوں میں سے کوئی دنیا سے چلا جاتا ہے یا جب کسی عزیز کے جنازے کے ساتھ یا اس کی یاد منانے کے لیے وہ حاضر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ یاد خالص نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی یاد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے لیکن مردانِ خدا خالص، عمیق، دائمی اور مسلسل توجہ دوسرے جہان کی طرف رکھتے ہیں۔ گویا وہ ہمیشہ ان کی آنکھوں کے سامنے حاضر ہے اور آیت میں "خالصۃ" کی تعبیر اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

ان کی پانچویں اور چھٹی صفت بعد والی آیت میں آئی ہے، فرمایا گیا ہے: وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک افراد میں سے ہیں (وانھم عندنا لمن المصطفین الاخیار)[1]

ان کا ایمان اور عملِ صالح اس بات کا سبب بنا کہ خدا انھیں اپنے بندوں میں سے چن لے اور منصبِ نبوت و رسالت کے ساتھ مفتخر و معزز بنائے اور ان کی نیکوکاری اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ بطورِ مطلق "اخیار" (نیکوکار) کہلانے کے حق دار ہوگئے۔

ان کے افکار نیک، ان کے اخلاق نیک، ان کے اعمال اور ساری کی ساری زندگی نیک ہے اور "آنچہ خوباں ہمہ دارند آنہا تنہا دارند"۔

اسی بنا پر بعض مفسرین نے اس تعبیر سے کہ خدا بغیر کسی شرط کے انھیں "اخیار" کے لفظ سے پکار رہا ہے، انبیاء کے لیے مقامِ عصمت کا مفہوم لیا ہے[2]

"عندنا" (ہمارے نزدیک) کی تعبیر بہت ہی معنی خیز ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا برگزیدہ اور نیک ہونا

---

[1] "مصطفین" (فا کی زبر کے ساتھ) "مصطفیٰ" کی جمع ہے اور اصل میں "مصطفیین" تھا "یا" حذف ہوگئی تو "مصطفین" ہوگیا۔

[2] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۶ ص ۲۱۷

لوگوں کے نزدیک نہیں ہے، جو بعض اوقات اپنی ذاتی جانچ کے لیے چشم پوشی کو جائز سمجھ لیتے ہیں، بلکہ ان کا ان دو صفات سے متصف ہونا ہمارے نزدیک ثابت شدہ ہے، جو دیکھ بھال کر اور ان کے ظاہر و باطن کو جانچ کر انجام پایا ہے۔

مذکورہ تین پیغمبروں کے اہم مقام کی طرف اشارہ کرنے کے بعد دیگر تین انبیاء کی باری آتی ہے۔ فرمایا گیا ہے: اور یاد کر اسماعیل، الیسع اور ذاالکفل کو، جو سب کے سب اخیار اور نیک لوگوں میں سے تھے (واذکر اسماعیل و الیسع و ذا الکفل کل من الاخیار)۔

ان میں سے ہر ایک صبر و استقامت اور فرمانِ خدا کی اطاعت میں ایک اسوہ اور نمونہ تھا خصوصاً اسماعیلؑ جو اپنی جان کو اس کی راہ میں فدا کرنے پر تیار ہو گئے اور اسی بنا پر ان کا نام ذبیح اللہ ہو گیا۔ اپنے باپ کے ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر میں اور اس عظیم مرکز کو رونق بخشنے اور بہت سی دوسری ذمہ داریوں میں بہت زیادہ ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کی زندگی کی طرف توجہ کرنا پیغمبر اسلامؐ اور تمام مسلمانوں کے لیے تقویت بخش ہے۔ ایسے عظیم مردانِ خدا کی زندگی کا مطالعہ انسانوں کی زندگی میں راہنمائی کرتا ہے اور ان میں تقویٰ، فداکاری اور ایثار و قربانی کی روح زندہ کرتا ہے، اور سخت مشکلات میں انھیں ثابت قدم رکھتا ہے۔

"کل من الاخیار" کی تعبیر، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہی توصیف (الاخیار) بعینہٖ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے بارے میں آخری صفت کے طور پر آئی ہے، ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ تین پیغمبر بھی گزشتہ تین پیغمبروں کی تمام صفات کے حامل ہیں۔ کیونکہ خیر مطلق کا ایک وسیع معنی ہے جس میں نبوت بھی آخرت کے گھر کی طرف توجہ بھی اور مقام عبودیت و علم و قدرت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

ان تینوں پیغمبروں میں سے حضرت اسماعیلؑ سب سے زیادہ مشہور اور زیادہ جانے پہچانے ہیں لیکن "الیسع" جن کا نام صرف دو مرتبہ قرآن میں آیا ہے (یہاں اور سورۂ انعام کی آیہ ۸۶ میں) کے بارے میں قرآن کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بھی خدا کے بزرگ پیغمبروں میں سے تھے اور ان بزرگوں میں سے تھے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

و کلاً فضلنا علی العالمین

ہم نے ان میں سے ہر ایک کو عالمین پر برتری و فضیلت بخشی۔ (انعام ـــــ ۸۶)

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر یوشع بن نون ہیں جن پر "الف و لام" داخل ہوا ہے اور اس کی "شین" "سین" سے بدل گئی ہے اور کسی غیر عربی کے نام پر (جبکہ یہ عبرانی ہے) الف و لام کا داخل ہونا کوئی نئی چیز نہیں ہے، جس طرح سے کہ عرب "اسکندر" کو "الاسکندر" کے نام سے پہچانتے ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے اسے ایک عربی لفظ سمجھتے ہیں جو "یسع" (مادہ "وسعت" فعل مضارع) سے لیا گیا ہے اور اسمی پہلو اختیار کرنے کے بعد الف و لام جو مشخصات اسم میں سے ہے اس پر آگیا ہے۔

سورۂ انعام کی آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اولادِ ابراہیمؑ میں سے تھے لیکن یہ واضح نہیں کرتی کہ آیا وہ بنی اسرائیل میں سے تھے یا نہیں؟

تورات کی کتاب "بادشاہان" میں ان کا نام "الیشع" "بن" "شافات" لکھا ہوا ہے اور عبرانی زبان میں الیشع کا معنی "ناجی" اور "شافات" کا معنی "قاضی" ہے۔

بعض اسے اور "خضر" کو ایک ہی سمجھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور یہ جو بعض اسے "ذاالکفل" ہی سمجھتے ہیں تو یہ زیر بحث آیت کے صریح برخلاف ہے کیونکہ آیت نے ذاالکفل کا "الیسع" پر عطف کیا ہے۔ بہرحال وہ ایک بلند مقام اور پُر استقامت پیغمبر ہیں اور ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کے لیے ہمارے لیے یہی کافی ہے۔

باقی رہے "ذاالکفل" تو مشہور یہی ہے کہ وہ پیغمبروں میں سے تھے اور ان کے نام کا سورۂ انبیاء کی آیہ ۸۵ میں پیغمبروں کے ناموں کے ساتھ اسماعیلؑ اور ادریسؑ کے بعد ذکر اس معنی پر گواہ ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے، وہ انھیں ایوبؑ کا فرزند سمجھتے ہیں جس کا اصلی نام "بشر" یا "بشیر" یا "شرف" تھا۔ بعض انھیں "حزقیل" سمجھتے ہیں کہ ذاالکفل ان کے لقب کے طور پر مشہور ہو گیا ہے۔[1]

انھیں ذاالکفل کا نام کیوں دیا گیا؟ اس بارے میں اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "کفل" نصیب اور حصّہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور کفالت و عہدہ داری کے معنی میں بھی علماء نے مختلف احتمال ذکر کیے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا ہے کہ چونکہ خدا نے اپنے ثواب و رحمت کا وافر حصّہ انھیں مرحمت فرمایا ہے۔ لہٰذا "ذاالکفل" یعنی (صاحب بہرۂ وافی) کے نام سے موسوم ہوئے۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ انھوں نے یہ عہد کیا ہوا تھا کہ راتوں کو عبادت کے لیے اٹھیں گے اور دن میں روزہ رکھا کریں گے اور قضاوت اور فیصلہ کرتے وقت ہرگز غصے میں نہ آئیں گے اور وہ اپنے اس عہد و پیمان پر قائم رہے لہٰذا انھیں یہ لقب دیا گیا۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ انھوں نے بنی اسرائیل کے انبیاء کے ایک گروہ کی کفالت کی تھی اور وقت کے ظالم بادشاہ سے انکی جان بچائی تھی اس لیے انھیں یہ نام دیا گیا ہے۔

بہرحال ان کی زندگی کے حالات کی اتنی ہی مقدار جو آج ہماری دسترس میں ہے، خدا کی اطاعت و بندگی اور ظالموں کے مقابلے میں ان کی استقامت پامردی کی دلیل ہے اور ہمارے آج اور کل کے لیے ایک سبق ہے۔ اگرچہ ان کی زندگی کی تفصیلات کے بارے میں زمانے کی دوری کے سبب دقیق طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] اعلام القرآن، تفسیر قرطبی، تفسیر روح البیان اور تفسیر المیزان میں سے ہر ایک نے مذکورہ بالا مطالب کے ایک حصّے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۴۹۔ هٰذَا ذِكْرٌ ۚ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ۝

۵۰۔ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ ۝

۵۱۔ مُتَّكِـِٔيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ۝

۵۲۔ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ أَتْرَابٌ ۝

۵۳۔ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝

۵۴۔ إِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ۝

ترجمہ

۴۹۔ یہ تو ایک یاد آوری ہے اور پرہیز گاروں کے لیے اچھا مقام ہے۔

۵۰۔ بہشت کے جاودانی باغات، جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

۵۱۔ وہ اس میں تختوں پر تکیہ کیے ہوئے (بیٹھے ہوں گے) اور انواع واقسام کے پھل اور طرح طرح کے مشروبات ان کی دسترس میں ہوں گے۔

۵۲۔ اور ان کے پاس ایسی بیویاں ہوں گی جو اپنے شوہروں کی طرف ہی دیکھتی رہتی ہیں اور وہ سب کی سب ہم عمر ہوں گی۔

۵۳۔ یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے قیامت کے دن کے لیے وعدہ کیا جاتا ہے (ناقابلِ شکن وعدہ)۔

۵۴۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

تفسیر

پرہیز گاروں کے لیے وعدہ

یہاں سے اس سورہ کی آیات کا دوسرا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں پرہیزگاروں کا سرکش باغیوں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے قیامت میں دونوں گروہوں کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے اور مجموعی حیثیت سے گزشتہ آیات کے مباحث کی تکمیل ہو رہی ہے۔

پہلے تو گزشتہ انبیاء کی سرگزشت اور ان کی زندگی کے اصلاحی و تربیتی نکات کے بارے میں کلی طور پر فرمایا گیا ہے: یہ ایک تذکر اور یادآوری ہے (ھٰذا ذکر)۔[1]

ہاں! ان کی پرشکوہ تاریخ کے نشیب و فراز کو بیان کرنے کا مقصد داستان سرائی نہیں بلکہ ذکر و تذکر تھا۔ جیسا کہ اس سورہ کی ابتداء ہی اسی مسئلے سے کی گئی ہے "صٓ والقراٰن ذی الذکر"

اصل مقصد ان مسلمانوں میں جن کے لیے یہ آیات نازل ہوئی ہیں، فکر و نظر کو بیدار کرنا، معرفت و آگاہی کی سطح بلند کرنا اور استقامت و پامردی کی قوت و طاقت کا اضافہ کرنا ہے۔[2]

اس کے بعد اس امر کو انفرادی اور انبیاء کی زندگی سے نکال کر کلی شکل دی گئی ہے۔ متقین کی سرنوشت کو عمومی طور پر محل بحث قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پرہیزگاروں کے لیے اچھا مقام اور جائے بازگشت ہے (وان للمتقین لحسن مآب)۔[3]

اس مختصر سے سربستہ جملے کے بعد جو ان کے حال کی خوبی اور اچھائی کی اجمالی طور پر تصویر کشی کرتا ہے، اجمال سے تفصیل کی قرآنی روش سے استفادہ کرتے ہوئے اس کی تشریح و تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کی بازگشت اس جنت کے جاودانی باغات کی طرف ہے جس کے دروازے ان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں (جنّٰت عدن مفتحة لھم الابواب)۔[4]

"جنّٰت" بہشت کے باغات کی طرف اشارہ ہے اور "عدن" (بروزن "عدل") استقرار و ثبات کے معنی میں ہے اور "معدن" کو اس بنا پر "معدن" کہا گیا ہے کیونکہ مختلف جواہر اور گراں قیمت مواد وہاں مستقر ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تعبیر یہاں جنت کے باغوں کے جاودانی اور ابدی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

"مفتحة لھم الابواب" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشتیوں کے لیے دروازے کھولنے تک کی بھی زحمت نہیں ہوگی، گویا بہشت ان کے انتظار میں ہے اور جس وقت اس کی نگاہ ان پر پڑے گی تو آغوش پھیلا دے گی اور انھیں اندر آنے کی دعوت دے گی۔

اس کے بعد بہشتیوں کے خصوصی احترام اور ان کے آرام و سکون کو اس صورت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کی حالت یہ ہوگی کہ وہاں میں تختوں پر تکیہ لگائے (بیٹھے) ہوں گے اور انواع و اقسام کے فراواں پھل اور مشروبات ان کی رسائی میں ہوں گے۔ جس وقت وہ طلب کریں گے

---

[1] بعض مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد گزشتہ انبیاء کا ذکر جمیل ہے۔

[2] مفسرین کی ایک جماعت نے "ھٰذا ذکر" کو اس بات کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو کچھ گزشتہ انبیاء کے بارے میں بیان ہوا ہے وہ تو ان کا ذکر خیر اور شناء جمیل تھی اور بعد والی آیات آخرت میں ان کے مقامات کو بیان کر رہی ہیں لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے، بلکہ آیات کا ظاہر وہی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

[3] "مآب" کا معنی ہے مقام بازگشت اور "حسن" کی "مآب" کی طرف اضافت صفت کی موصوف کی طرف اضافت ہے۔

[4] "جنّٰت عدن" "مآب" سے بدل یا عطف بیان ہے۔

فوراً ان کے پاس پہنچ جائیں گے (متکئین فیھا یدعون فیھا بفاکھة کثیرة و شراب)[1]۔
کیا یہ سب کچھ جنت کے خدمت گاروں کے ذریعے فوراً ان کے سامنے حاضر ہو جائے گا یا ان کے حاضر ہونے کے لیے ان کا ارادہ ہی کافی ہوگا، اس کے لیے دونوں احتمال موجود ہیں۔
"فاکھة" اور "شراب" ("پھل" اور "مشروبات") کا ذکر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ بہشتیوں کی زیادہ تر غذا پھل ہوگی، اگرچہ قرآنی آیات کی صراحت کے مطابق دوسری غذائیں اور کھانے بھی وہاں موجود ہوں گے۔
جیسا کہ اس دنیا میں بھی انسان کے لیے بہترین اور مکمل ترین غذا پھل ہی ہے۔
"کثیرة" کی تعبیر مختلف بہشتی پھلوں کی انواع و اقسام کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ اس کے مشروبات اور شراب طہور بھی کئی قسم کی ہوگی جس کی طرف قرآن کی مختلف آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد بہشت کی پاکیزہ بیویوں کے بارے میں بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: بہشتیوں کے پاس ایسی بیویاں ہوں گی کہ جن کی آنکھیں فقط اپنے شوہروں پر جمی ہوں گی وہ سب کی سب جوان اور اپنے شوہروں کی ہم عمر و ہم سن ہوں گی (وعندھم قاصرات الطرف اتراب)۔
"طرف" (بروزن "برف") پلک کے معنی میں ہے اور کبھی نگاہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جنت کی عورتوں کی "قاصرات الطرف" (جو تنگ نگاہ رکھتی ہیں) سے توصیف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے صرف اپنے شوہروں پر نظریں جمائی ہوئی ہیں۔ صرف انھیں سے عشق و محبت کرتی ہیں اور ان کے علاوہ کسی کو بھی تصور میں نہیں لاتیں۔ یہ بات بیویوں کی خوبی میں سے عظیم ترین خوبی ہے۔ بعض مفسرین نے اسے آنکھوں کے مخمور ہونے کے معنی میں سمجھا ہے جو ایک نہایت جاذب و پرکشش حالت ہے۔ ان دونوں معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔
"اتراب" ہم سن و سال اور ہم عمر ہونے کے معنی میں ہے یہ جنت کی عورتوں کی اپنے شوہروں کے لیے ایک اور صفت کا بیان ہے، کیونکہ شوہر اور بیوی کے درمیان عمر کی موافقت کشش کو بڑھاتی ہے یا یہ خود انھیں عورتوں کی صفت ہے کہ وہ سب کی سب ہم سن و سال اور جوان ہیں[2]۔
آخری زیر بحث آیت میں بہشت کی ان تمام ساتوں کی ساتوں مذکورہ نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے روزِ حساب کے لیے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (ھٰذا ما توعدون لیوم الحساب)۔ ناقابل شکن اور

---

[1] دونوں جگہ "فیھا" کی ضمیر "جنات عدن" کی طرف لوٹتی ہے اور "فاکھة" کی توصیف "کثیرة" کے ساتھ اس وصف سے "شراب" کی توصیف کی بھی دلیل ہے اور "متکئین" "لھم" کی ضمیر کے لیے حال ہے۔ یعنی وہ بہشتِ جاوداں میں جس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے اور وہ مسندوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے اور مختلف پھلوں اور انواع و اقسام کے مشروبات لانے کا حکم دے رہے ہوں گے۔

[2] "اتراب" جمع ہے "ترب" (بروزن "شعر") کی۔

نشاط انگیز وعدہ، خداوندِ عظیم کی طرف سے وعدہ۔

ان نعمات کے جاودانی اور ابدی ہونے کی تاکید کے طور پر مزید ارشاد ہوتا ہے: یہ ہمارا رزق اور ہماری دی ہوئی روزی ہے یہ ایک ایسی عطا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی اور اس کے لیے فنا کا تصوّر ہی نہیں ہے (ان ھذا لرزقنا مالہ من نفاد)۔[1]

اس بنا پر زوال و نابودی کا غم، جو ایک منحوس سائے کی طرح اس جہان کی نعمتوں پر پڑا ہے۔ وہاں موجود نہیں اور وہ خدا کے پُر بار خزانوں کی برکت سے ہمیشہ مدد لیتا رہتا ہے اور اس کے لیے محدودیت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کسی قسم کی کمی اس میں ظاہر نہیں ہوگی کیونکہ خدا کا ارادہ یہی ہے۔

---

[1] "نفاد" فنا اور نابودی کے معنی میں ہے اور "لرزقنا" کی لام تاکید کے لیے ہے۔

۵۵۔ هٰذَا ۚ وَإِنَّ لِلطّٰغِينَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ۝

۵۶۔ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

۵۷۔ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَغَسَّاقٌ ۝

۵۸۔ وَاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ۝

۵۹۔ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۚ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ۝

۶۰۔ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ۚ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝

۶۱۔ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ۝

ترجمہ

۵۵۔ یہ (تو پرہیزگاروں کا اجر ہے) اور طغیان گروں کے لیے بدترین جائے بازگشت ہے۔

۵۶۔ دوزخ ہے، جس میں وہ داخل ہوں گے اور کیا ہی بُرا بستر ہے؟

۵۷۔ یہ حمیم و غساق (جلانے والے اور سیاہ رنگ کے مشروبات) ہیں جن کا مزہ چکھنا ہوگا۔

۵۸۔ اور ان کے علاوہ ان کے لیے ان کی ہم شکل دوسری سزائیں ہوں گی۔

۵۹۔ (ان سے کہا جائے گا) یہ وہ فوج ہے جو تمہارے ساتھ جہنم میں داخل ہوگی (یہ وہی گمراہ سردار ہیں) ان کے لیے مرحبا اور خوش آمدید نہیں ہے۔ وہ سب کے سب آگ میں جلیں گے۔

۶۰۔ وہ (اپنے سرداروں سے) کہیں گے، بلکہ خوش آمدید تمہارے لیے نہ ہو کیونکہ تم نے یہ عذاب ہمارے لیے فراہم کیا ہے، یہ کتنا بُرا ٹھکانا ہے؟

۶۱۔ (اس کے بعد) وہ کہیں گے: پروردگارا! جس نے یہ عذاب ہمارے لیے فراہم کیا ہے، اس کے لیے آگ میں کئی گنا عذاب کا اضافہ فرما۔

تفسیر

سرکشوں کی سزا

گزشتہ آیات میں پرہیزگاروں کے لیے سات نعمتوں اور بے بہا عنایات کو شمار کیا گیا تھا اور زیر بحث آیات میں قرآن کی موازنے کی روش کے مطابق خدا کے سرکشوں اور طاغیوں کی منحوس سرنوشت اور مختلف سزاؤں کو شمار کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ اب تک بیان کیا گیا ہے وہ تو متقیوں کی جزا ہے اور طغیان گروں کے لیے بدترین جائے بازگشت ہے (ھٰذا وان للطاغین لشر مآب)۔[1]

متقین "حسن مآب" رکھتے تھے اور یہ "شر مآب" بری جائے بازگشت اور برا انجام۔

اس کے بعد اجمال کی تفصیل کے انداز سے سربستہ جملے کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ منحوس جائے بازگشت اور برا ٹھکانا وہی دوزخ ہے جس میں وہ داخل ہوں گے اور اس کی آگ میں جلیں گے اور کیا ہی برا بستر ہے جہنم کی آگ! (جھنم یصلونھا فبئس المھاد)۔[2]

گویا "یصلونھا" (جہنم میں داخل ہوں گے اور اس کی آگ میں جلیں گے) اس چیز کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ وہ صرف جہنم کو دور سے دیکھیں گے یا اس کے کہیں آس پاس ہوں گے۔ نہیں: بلکہ وہ اس کے اندر داخل ہوں گے اور کوئی شخص یہ وہم بھی نہ کرے کہ وہ جہنم کی آگ کے عادی ہو جائیں گے اور اس سے مانوس ہو جائیں گے نہیں: بلکہ وہ ہمیشہ اس میں جلا کریں گے۔

"مھاد" ۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ۔ اس بستر کے معنی میں ہے جو سونے اور آرام کرنے کے لیے بچھایا جاتا ہے، بچے کے گہوارے کو بھی "مھاد" کہا جاتا ہے۔

بستر چونکہ آرام کرنے کی جگہ ہوتا ہے اس لیے اسے ہر لحاظ سے مناسب حال اور نرم ہونا چاہیے لیکن کیا حال ہوگا ان لوگوں کا جن کا بستر جہنم کی آگ ہوگی؟

اس کے بعد ان کے لیے دوسرے عذاب بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ حمیم و غساق مشروب ہے جسے انھیں چکھنا ہوگا (ھٰذا فلیذوقوہ حمیم و غساق)۔[3]

---

[1] "ھٰذا" مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔

ھٰذا الذی ذکرناہ للمتقین

[2] "جھنم" عطف بیان ہے یا "شر مآب" سے بدل ہے اور "یصلونھا" اس کا حال ہوگا۔

[3] یہ جملہ اصل میں "ھٰذا حمیم و غساق فلیذوقوہ" تھا۔ لیکن تاکید کے لیے فلیذوقوہ کا جملہ مبتدا و خبر کے درمیان بطور فاصلہ آگیا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"حمیم" گرم اور جلا ڈالنے والے پانی کے معنی میں ہے جو دوزخیوں کے مشروبات میں سے ایک ہے۔ یہ کئی قسم کی شراب طہور کے مقابلے میں ہے جو گزشتہ آیات میں بہشتیوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔

"غساق" "غسق" (بروزن "رمق") کے مادہ سے، رات کی تاریکی کی شدت کے معنی میں ہے۔ ابنِ عباس نے اسے ایک بہت ہی سرد مشروب سے (جو ٹھنڈک کی شدت سے انسان کے اندر کو جلا کر زخمی کر دے گا) تفسیر کی ہے۔ لیکن اس لفظ کے مفہوم کی اصل بنیاد میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اس معنی پر دلالت کرے، سوائے اس کے کہ اس کا مقابلہ "حمیم" سے کیا جائے جو گرم اور جلانے والا پانی ہے۔ ممکن ہے یہی امر اس قسم کے استنباط کا سبب بنا ہو۔

راغب نے مفردات میں اس کی ان قطرات اور پیپ سے تفسیر کی ہے جو دوزخیوں کی جلد سے اور ان کے بدن کے زخموں سے باہر آئیں گے۔

ضروری طور پر اس کا سیاہ رنگ ہونا، اس لفظ کے اس پر اطلاق ہونے کا سبب بنا ہے۔ چونکہ اس جلا ڈالنے والی آگ کا نتیجہ ایک مٹھی بھر جلے ہوئے بدن سے سیاہ راکھ کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

بہرحال کچھ کلمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "غساق" کی بو اتنی بری اور تکلیف دہ ہوگی کہ سب کو پریشان کر دے گی۔

بعض دوسرے مفسرین نے اسے عذاب کی ایک ایسی قسم قرار دیا ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کیونکہ وہ ایسے گناہوں اور سخت مظالم کے مرتکب ہوئے ہیں جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں تھا لہٰذا ان کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیئے۔

جیسا کہ پرہیزگار جنتی ایسے نیک اعمال بجالاتے تھے جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا اس لیے ان سے ایسی جزاء کا وعدہ کیا گیا جس سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین

(الم سجدہ — ۱۷)

پھر ان کے دوسری قسم کے دردناک عذابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اور ان کے علاوہ انہی کی ہم شکل دوسری سزائیں بھی ان کے لیے ہیں (و اٰخر من شکله ازواج) [1]

"شکل" (شین کی فتح کے ساتھ) مثل و مانند کے معنی میں ہے اور "ازواج" انواع و اقسام کے معنی میں ہے اور یہ گزشتہ عذابوں کے مانند

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "هذا" مبتدائے محذوف کی خبر ہے جیسا کہ "حمیم و غساق" بھی اسی طرح ہیں اور تقدیر میں اس طرح تھا "العذاب هذا فلیذوقوه، هذا حمیم و غساق" لیکن پہلا احتمال زیادہ بہتر ہے۔

[1] " " ایک محذوف موصوف کی صفت ہے، جو مبتدا ہے اور "ازواج" دوسرا مبتدا ہے، اور "من شکله" اس کی خبر ہے، اور مجموعی طور پر پہلے مبتدا کا جزو ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا۔

"و عذاب اٰخر ازواج من شکله"

دوسری قسم کے عذابوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے جو یہاں پر سربستہ طور پر بیان ہوئے ہیں اور شاید اس جہانِ مادہ کے اسیروں کے لیے قابلِ توصیف وادراک نہ ہوں۔

یہ حقیقت میں گزشتہ آیات میں ذکر شدہ "فاکھۃ کثیرۃ" کے مقابلے میں ہیں، جو جنت کی مختلف قسم کی نعمتوں اور پھلوں کی طرف اشارہ تھا۔

بہرحال ممکن ہے یہ مشابہت شدت اور ناراحتی کے اعتبار سے ہو یا تمام جہات کے لحاظ سے ہو۔

اس کے بعد ان کی آخری سزا بیان کی گئی ہے اور وہ ہے بُرے ہم نشین اور یہ بھی ایک طرح کی سرزنش ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت گمراہ سردار وارد جہنم ہوں گے اور اپنی آنکھ سے دیکھیں گے کہ ان کے پیروکاروں کو بھی دوزخ کی طرف لایا جارہا ہے تو ایک دوسرے سے کہیں گے: یہ وہ فوج ہے جو تمہارے ساتھ دوزخ میں داخل ہوگی (ھٰذا فوج مقتحم معکم)[1]

ان کے لیے خوش آمدید نہیں ہے (لا مرحبًا بھم)۔

وہ سب کے سب آگ میں جلیں گے (انھم صالوا النار)۔

بعد کے جملوں اور آیات کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے "ھٰذا فوج مقتحم معکم" کا جملہ گمراہی کے پیشواؤں کی گفتگو ہے، جس وقت وہ اپنے پیروکاروں کو جہنم میں داخل ہونے کے لیے تیار دیکھیں گے تو ایک دوسرے سے کہیں گے کہ یہ بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ بعض مفسرین اسے فرعیان کے سرداروں سے ملائکہ کا خطاب سمجھتے ہیں لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

"مرحبا" وہ لفظ ہے جو مہمان کو خوش آمدید کہتے وقت کہا جاتا ہے اور "لا مرحبًا" اس کی ضد ہے۔ یہ لفظ مصدر ہے "رحب" (بروزن "محو") کے مادہ سے وسعت مکان کے معنی میں۔ یعنی آیئے، تشریف لائیے، آپ ایک مناسب اور وسیع مکان میں وارد ہو رہے ہیں اور فارسی میں اس کا متبادل خوش آمدید ہے۔

"مقتحم" "اقتحام" کے مادہ سے شدید اور سخت خوفناک کام میں داخل ہونے کے معنی میں ہے اور اکثر پہلے سے غور و فکر اور مطالعہ کیے بغیر کاموں میں وارد ہونے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ تعبیر اس کام کی نشاندہی کرتی ہے کہ گمراہی کے پیروکار مطالعہ اور غور و فکر کے بغیر صرف ہوا و ہوس اور اندھی تقلید کی بنا پر جہنم کی شدید اور خوفناک آگ میں داخل ہوں گے۔

بہرحال یہ آواز پیروکاروں کے کانوں تک پہنچے گی اور وہ سردارانِ ضلالت کے ناخوش آمدید کہنے سے سخت ناراض ہوں گے۔ ان کی طرف رخ کرکے وہ کہیں گے: بلکہ تمہارے لیے مرحبا نہ ہو کیونکہ تم نے ہمارے لیے اس دردناک عذاب کی راہ ہموار کی تھی اور ہمارے لیے اسے فراہم کیا تھا کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے جہنم (قالوا بل انتم لا مرحبًا بکم انتم قدمتموہ لنا فبئس القرار)۔

---

[1] اس جملہ میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (یقول رؤساء الضلال بعضھم لبعض ھٰذا فوج مقتحم معکم) گمراہوں کے سردار ایک دوسرے سے کہیں گے یہ فوج بھی تمہارے ساتھ داخل ہونے والی ہے۔

"فبئس القرار" حقیقت میں "جنات عدن" کا لفظ مقابل ہے، جو پرہیزگاروں کے لیے آیا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دوزخ ایک عارضی اور وقتی جگہ نہیں ہے بلکہ دائمی اور ثابت ٹھکانا ہے۔

اس تعبیر سے پیروکاروں کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں یہ خوبی تو ہے کہ تم سرداران ضلالت بھی اس امر میں ہمارے ساتھ شریک ہو اور یہ چیز ہماری دلی تسلی کا باعث ہے یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم پیشواؤں کا جرم ہمارے نزدیک بہت ہی عظیم ہے کیونکہ جہنم کوئی وقتی ٹھکانا نہیں ہے بلکہ ہمارا دائمی ٹھکانا ہے۔

لیکن اس کے باوجود پیروکار صرف اسی بات پر راضی نہیں ہوں گے چونکہ وہ گمراہی کے سرداروں کو جو اس جرم کے اصلی عامل تھے اپنے سے زیادہ مستحق جانتے ہیں لہٰذا بارگاہ خداوندی کی طرف رُخ کرکے "کہیں گے: پروردگارا! جس شخص نے ہمارے لیے یہ عذاب فراہم کیا ہے جہنم کی آگ میں اس کے لیے کئی گنا اضافہ فرما" (قالوا ربنا من قدم لنا هذا فزده عذابا ضعفا في النار)۔

ایک عذاب خود ان کی اپنی گمراہی کی بنا پر اور ایک عذاب ہمیں گمراہ کرنے کی وجہ سے۔

یہ آیت اسی مطلب کے مشابہ ہے جو سورۂ اعراف کی آیہ ۳۸ میں آیا ہے:

ربنا هؤلاء اضلونا فاتهم عذابا ضعفا من النار

پروردگارا! انھوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے لہٰذا آگ کا کئی گنا عذاب ان کے لیے قرار دے۔

اگرچہ سورۂ اعراف کی اس آیت کا آخری حصہ یہ بتاتا ہے کہ دونوں کے لیے کئی گنا عذاب ہے (کیونکہ پیروکار بھی تو پیشواؤں کے لیے اجرائی قوت تھے اور گمراہی و فساد کی راہ انھیں کے ذریعے ہموار ہوئی کیونکہ اگر عوام الناس ظالموں کے ظلم کی بھٹی گرم نہ کریں تو ان میں کسی کام کو انجام دینے کی ہمت نہیں ہوتی) لیکن بہرحال اس میں شک نہیں ہے کہ پیشواؤں کا عذاب کئی درجے زیادہ سخت ہے اگرچہ دونوں کا عذاب دوگنا ہے۔

ہاں یہ ہے انجام ان لوگوں کا، جنھوں نے آپس میں دوستی کا عہد و پیمان باندھا اور راہِ انحراف و ضلالت میں بیعت کی جس وقت وہ اپنے اعمال کے بُرے نتائج دیکھیں گے تو ایک دوسرے کے خلاف دشمنی اور نفرین کا اظہار کریں گے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان آیات میں پرہیزگاروں کی نعمتوں کا ذکر طغیان گروں کی سزاؤں اور عذابوں سے زیادہ تنوع رکھتا ہے (پہلے حصے میں سات نعمتوں اور دوسرے حصے میں پانچ عذابوں کی طرف اشارہ ہوا ہے) اور یہ شاید خدا کی رحمت کے اس کے غضب پر سبقت کرنے اور زیادہ ہونے کی بنا پر ہے۔

یا من سبقت رحمته غضبه

اے وہ کہ جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

۶۲۔ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ؁

۶۳۔ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ؁

۶۴۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ؏

ترجمہ

۶۲۔ وہ کہیں گے ، ہم ان لوگوں کو جنھیں ہم اشرار میں شمار کرتے تھے (یہاں جہنم کی آگ میں) کیوں نہیں دیکھتے ؟

۶۳۔ کیا ہم نے ان کے ساتھ تمسخر کیا تھا یا (وہ اس قدر حقیر تھے کہ) آنکھیں انھیں دیکھتی ہی نہیں ؟

۶۴۔ بے شک یہ بات حق اور ایک واقعیت ہے کہ دوزخی مخاصمانہ باتیں کریں گے ۔

تفسیر

اصحابِ دوزخ کی دشمنی

یہ آیات دوزخیوں کی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے ان کی ایک گفتگو بیان کرتی ہیں جس سے ان کے گہرے اور جانکاہ تأسف اور ایک روحانی و جان فرسا حالت کی ترجمانی ہوتی ہے ۔

قرآن کہتا ہے ، ضلالت کے سردار جب دوزخ میں اپنے اطراف میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ہم ان لوگوں کو جنھیں ہم اشرار میں شمار کرتے تھے یہاں کیوں نہیں دیکھتے (وقالوا مالنا لا نریٰ رجالاً کنا نعدھم من الاشرار) ۔

ہاں ! ابوجہل اور ابولہب جیسے افراد جب یہ دیکھیں گے کہ دوزخ میں عمار یاسر ، خباب ، صہیب اور بلال جیسے افراد کا کوئی نام و نشان نہیں ہے ، تو وہ اپنے دل میں سوچیں گے اور ایک دوسرے سے سوال کریں گے کہ یہ لوگ کہاں چلے گئے ؟

ہم تو ان لوگوں کو غلغل ڈالنے والے ، زمین میں فساد کرنے والے ، اشرار و اوباش سمجھتے تھے جو معاشرے کے آرام و سکون کو تباہ و برباد کرنے اور ہمارے بزرگوں کے افتخارات کو ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن دکھائی دیتا ہے کہ ہماری راہ ہی بالکل غلط تھی ۔

کیا ہم نے ان کا مذاق اڑایا تھا یا وہ اس قدر حقیر تھے کہ ہماری آنکھیں انھیں نہیں دیکھتیں (اتخذناھم سخریًا ام زاغت عنھم الابصار) ۔[1]

---

[1] یہ ہے کہ "زاغت" "زیغ" کے مادہ سے ہے اور حق و صداقت سے انحراف کے معنی میں آتا ہے یہاں اس کی آنکھ کی طرف نسبت (حاشیہ الگلے صفحہ پر)

ہاں ! ہم ان عظیم المرتبہ انسانوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے اور اشرار ہونے کا لیبل ان پر لگاتے تھے اور بعض اوقات تو ہم انھیں اس سے بھی پست تر سمجھتے تھے ۔ انھیں ایسے حقیر اور ذلیل جانتے تھے جو بالکل آنکھوں میں جچتے ہی نہیں تھے لیکن اب معلوم ہوا کہ ہوا و ہوس اور جہالت و غرور نے ہماری آنکھ پر پردہ ڈال رکھا تھا ، وہ تو مقربانِ بارگاہِ خدا تھے اور اس وقت بہشت بریں ان کا مسکن ہے ۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمسخر تو دنیا کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور " ام زاغت عنھم الابصار " کا جملہ دوزخ کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے یعنی یہاں ہماری نزدیک بین آنکھ اس دھوئیں اور آگ کے شعلوں کے درمیان انھیں نہیں دیکھ سکتی ، البتہ پہلا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے ۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ حقائق کا ادراک نہ کرنے کے عوامل میں سے ایک مسائل کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لینا اور حقائق کا مذاق اڑانا ہے ۔ ہمیشہ سنجیدہ ارادے کے ساتھ مسائل کی تحقیق کرنا چاہیے تاکہ حقیقت واضح اور روشن ہوجائے ۔

اس کے بعد دوزخیوں کے درمیان جو باتیں ہوں گی انھیں خلاصے کے طور پر اور جو کچھ گزر چکا ہے اس پر تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے : بے شک یہ بات حق اور ایک حقیقت ہے کہ دوزخی مخاصمانہ گفتگو کریں گے (ان ذالك لحق تخاصم اھل النار)[1]

دوزخی اس جہان میں بھی دشمنی اور نزاع میں گرفتار ہیں اور پُرخاش ، نزاع اور جدال کی روح ان پر حاکم ہے ، اور ہر روز کسی نہ کسی سے دست و گریباں اور گلوگیر ہوتے رہتے ہیں ، اور قیامت میں جو چھپی ہوئی چیزوں کے ظاہر ہوجانے کا دن ہے جو کچھ ان کے اندر ہوگا وہ ظاہر ہوجائے گا اور جہنم میں ایک دوسرے کی جان کے درپے ہوجائیں گے ، کل کے دوست آج کے دشمن ہوجائیں گے اور کل کے مرید آج کے مخالف ہوجائیں گے ، صرف ایمان و توحید کا راستہ اس جہان میں بھی اور اس جہان میں بھی وحدت و پاکیزگی کا راستہ ہے ۔

لطف کی بات یہ ہے کہ بہشتی تو تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے دوستانہ گفتگو میں مشغول ہوں گے ـــــ جیسا کہ قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوا ہے ـــــ جب کہ دوزخی جنگ و جدال میں مشغول ہوں گے جبکہ وہ تو خود ایک نعمت اور عظیم انعام ہے اور یہ ایک دردناک عذاب ہے ۔

ایک نکتہ

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا :

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) دی گئی ہے ، نہ کہ آنکھ والوں کی طرف اور یہ مطالب میں مبالغہ کے لیے ہے ۔

[1] (حاشیہ صفحہ ھذا) "تخاصم اھل النار" ذالک " کا بیان ہے ۔

"خدا نے تم مکتب اہل بیت کے پیروکاروں کو قرآن میں یاد کیا ہے جبکہ تمھارے دشمن جہنم کی آگ میں پھنس گئے کہ ہم یہاں ان لوگوں کو جنھیں ہم اشرار میں شمار کرتے تھے کیوں نہیں دیکھتے؟ کیا ہم نے ان کا مذاق اڑایا تھا یا سخت حقارت کی وجہ سے ہماری آنکھ میں نہیں جچتے تھے، خدا کی قسم ان افراد سے مراد تم ہو جنھیں ایک گروہ اشرار سمجھتا ہے۔ لیکن خدا کی قسم! جنت میں تم شادمان اور مسرور ہوگے جبکہ دوزخی جہنم میں تمھارے خیال میں سرگرداں ہوں گے۔"[1]

[1] یہ روایت روضۂ کافی سے نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۶۷ پر نقل کی گئی ہے۔

۶۵۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝
۶۶۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝
۶۷۔ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۝
۶۸۔ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ۝
۶۹۔ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝
۷۰۔ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

ترجمہ

۶۵۔ کہہ دو میں تو صرف ایک ڈرانے والا ہوں اور خدائے یگانہ و قہار کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔
۶۶۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کا پروردگار عزیز و غفار ہے۔
۶۷۔ کہہ دو! یہ ایک بہت بڑی خبر ہے۔
۶۸۔ کہ جس سے تم رُوگرداں ہو۔
۶۹۔ مجھے ملأ اعلیٰ (اور عالم بالا کے فرشتوں) کے بارے میں۔ جبکہ وہ (آدم کی خلقت کے بارے میں جھگڑ رہے تھے) کچھ خبر نہیں ہے۔
۷۰۔ مجھے تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ میں ایک واضح انذار کنندہ ہوں۔

تفسیر

میں ایک نذیر ہوں

چونکہ تمام گزشتہ بحث، چاہے ان میں دوزخیوں کے دردناک عذاب سے متعلق گفتگو تھی یا گزشتہ گنہگار اقوام کے دنیاوی عذاب سے متعلق بحث تھی، سب کی سب مشرکین، سرکشوں اور ظالموں کے لیے انذار و تہدید کا پہلو رکھتی تھی۔ زیر بحث آیات میں اسی مسئلے کو جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کہہ دے کہ میں تو صرف ایک انذار کنندہ (ڈرانے والا) ہوں۔ (قل انما انا منذر)۔

یہ ٹھیک ہے کہ پیغمبر بشارت دینے والا بھی ہوتا ہے اور قرآن مجید کی آیات دونوں معانی پر ناطق ہیں لیکن چونکہ بشارت تو مومنین کے لیے ہوتی ہے اور انذار مشرکین و مفسدین کے لیے اور یہاں روئے سخن دوسرے گروہ کی طرف ہے ، لہذا صرف انذار کا ذکر ہوا ہے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : کوئی معبود خدا وند یگانہ و قہار کے علاوہ نہیں ہے ۔ (و ما من الٰہ الّا اللہ الواحد القہار)۔

اس کے قہر کا ذکر بھی اسی بنا پر ہے تاکہ کوئی اس کے لطف و کرم سے مغرور نہ ہو جائے اور خود کو اس کے قہر سے مامون نہ سمجھ لے اور کفر و گناہ کے گرداب میں غوطہ زن نہ ہو جائے ۔

اور بلافاصلہ پروردگار کی توحیدِ الوہیت و عبادت کی دلیل کے طور پر مزید فرمایا گیا ہے : وہی تو ہے جو آسمانوں ، زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کا پروردگار ہے ۔ وہی خدا جو عزیز و غفار ہے (رب السّماوات والارض و ما بینھما العزیز الغفار)۔

درحقیقت اس آیہ میں خدا کی صفات میں سے تین اوصاف کو بیان کیا گیا ہے ۔ جن میں سے ہر ایک ، ایک مقصد کو ثابت کرنے کے لیے ہے ۔

پہلا مسئلہ تمام عالمِ ہستی کے لیے اس کی "ربوبیّت" کا مسئلہ ہے وہ اس سارے جہان کا مالک ہے ۔ ایسا مالک جو اس کی تدبیر و تربیت کرتا ہے ۔ ایسی ہستی ہی عبادت کے لائق ہے نہ کہ وہ بت جن کے پاس سوئی کی نوک کے برابر بھی اپنا کچھ نہیں ۔

دوسرا مسئلہ اس کی "عزت" کا مسئلہ ہے ۔ ہم جانتے ہیں کہ "عزیز" لغوی معنی کے لحاظ سے اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جس پر کوئی غالب نہ آسکے اور جس چیز کا وہ ارادہ کرے وہ ہو جائے ، دوسرے لفظوں میں وہ ہمیشہ غالب ہے اور کبھی بھی مغلوب نہیں ہوتا ۔

جو ایسا ہو اس کی قدرت کے پنجے سے نکل بھاگنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے ؟ اور اس کے عذاب سے کیسے نجات مل سکتی ہے ؟

تیسری صفت مقامِ "غفّاریت" اور اس کی بکثرت بخشش ہے جو بازگشت اور اس کی طرف لوٹنے کے دروازے گنہگاروں کے سامنے کھولے رکھتا ہے اور اپنی رحمت کی بارش ان پر برساتا رہتا ہے تاکہ وہ یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ اگر وہ قہار و عزیز ہے تو پھر اس کا مفہوم بندوں کے سامنے رحمت و توبہ کے دروازے بند کرتا ہے ۔

حقیقت میں ایک صفت بیانِ خوف ہے اور دوسری صفت بیان رجاء ہے کیونکہ ان دونوں حالتوں کے موازنے کے بغیر انسان کا ارتقاء و تکامل ممکن نہیں ۔ یا انسان غرور و غفلت میں گرفتار ہو جاتا ہے یا ناامیدی کے گرداب میں غرق ہو جاتا ہے ۔

دوسرے لفظوں میں اس کی عزیز و غفار کے ساتھ توصیف اس کی الوہیت کی ایک اور دلیل ہے کیونکہ صرف وہی ہستی پرستش و عبادت کے لائق ہے جو ربوبیّت کے علاوہ سزا دینے پر بھی قدرت رکھتا ہو اور سزا دینے پر قدرت کے علاوہ اس کی رحمت و مغفرت کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہوں ۔

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہے اور ایک مختصر مگر ہلا دینے والے انداز میں فرمایا گیا ہے : کہہ دے کہ یہ ایک بہت بڑی

خبر ہے۔ (قل ھو نبؤا عظیم)۔

کہ جس سے تم منہ پھیرے ہوئے ہو (انتم عنه معرضون)۔

یہ کون سی خبر ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اسے عظیم قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید؟ پیغبر کی رسالت؟ قیامت اور مومنین وکفار کا انجام؟ توحید ویگانگی خدا؟ یا یہ سب کی سب؟

چونکہ قرآن ان سب امور پر مشتمل ہے اور ان سب کا جامع ہے اور مشرکین کی روگردانی بھی اسی سے تھی، اس لیے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی یعنی قرآن سب ہے۔

ہاں یہ عظیم آسمانی کتاب ایک بڑی خبر ہے جو تمام عالم ہستی جتنی عظمت رکھتی ہے، کیونکہ یہ اس جہان کے خالق، خالق عزیز وغفار اور واحد وقہار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ وہ خبر جس کی عظمت کو ایک بہت بڑے گروہ نے اس کے نزول کے وقت نہیں سمجھا، بعض نے اس کا مذاق اُڑایا اور بعض نے اسے جادو کہا اور ایک گروہ نے اسے شاعری قرار دیا۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزری کہ اس "نبأ عظیم" نے اپنے باطن کو ظاہر کیا اور تاریخ بشریت کی راہ کو بدل کر رکھ دیا۔ وسیع عالم ہستی پر اپنا سایہ فگن ہو گئی اور اس نے اپنے عظیم اور درخشاں تمدن کو ہر ہر میدان میں پھیلا دیا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس "نبأ عظیم" کا اعلان اس مکی سورہ میں ہوا ہے، ایسے زمانے میں جبکہ مسلمان بظاہر انتہائی ضعف وناتوانی میں تھے اور کامیابی ونجات کے راستے ان کے سامنے بند تھے۔

یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں بھی یہ عظیم خبر دنیا والوں پر ——— بلکہ خود مسلمانوں پر بھی ——— کامل طور پر واضح نہیں ہے، اور مستقبل ہی اس کی نشاندہی کرے گا۔

قرآن کی یہ گفتگو کہ "تم اس سے منہ پھیرے ہوئے ہو" ابھی تک صادق اور سچی ہے اور مسلمانوں کا یہی اعراض اس بات کا سبب بنا ہے کہ فیض الٰہی کے اس جوش مارنے والے چشمے سے پورے طور پر سیراب نہیں ہو سکے اور صحیح طور پر اس کے انوار کے پرتو میں آگے نہیں بڑھ سکے اور فخر وشرف کی چوٹیوں کو سر نہیں کر سکے۔

اس کے بعد حضرت آدمؑ کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں انسان کے مرتبے کی اس حد تک بلندی کا ذکر ہے کہ فرشتوں نے اس کے سامنے سجدہ کیا ——— تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے: مجھے ملأ اعلیٰ اور عالم بالا کے فرشتوں کے بارے میں کچھ خبر نہیں (جب کہ وہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے) (ما کان لی من علم بالملأ الاعلیٰ اذ یختصمون)۔

میری آگاہی صرف وحی کے ذریعے سے ہے اور مجھے تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ میں ایک واضح انذار کنندہ ہوں (ان یوحیٰ الیّ الّا انما انا نذیر مبین)۔

اگرچہ فرشتے پروردگار کے ساتھ کوئی جھگڑا اور نزاع نہیں کر رہے تھے، صرف اتنی سی بات تھی کہ جب خدا نے ان سے یہ کہا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانا چاہتا ہوں" تو انھوں نے باتیں شروع کر دیں اور عرض کیا: "کیا تو ایسے کو بنانا چاہتا ہے جو

فساد و خونریزی کرے گا ہے تو ان کے جواب میں فرمایا: "جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے"۔ (بقرہ ــــــ ۳۰)۔ تو ان کی انھیں باتوں پر "مخاصمہ" کا اطلاق ہوا ہے، جو ایک مجازی اطلاق ہے اور جیسا کہ ہم نے اشارتاً بیان کیا ہے کہ یہ حقیقت میں بعد والی آیات کے لیے جو آدم کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں ایک مقدمہ اور تمہید ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "ملأ اعلیٰ" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں شیطان تک بھی شامل ہے، کیونکہ اس وقت شیطان بھی فرشتوں کے زمرے میں تھا اور خدا کے ساتھ مخاصمت کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا، اور اعتراض کرنے لگا اور اس بنا پر ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ خداوندی ہو گیا، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

متعدد روایات میں جو شیعہ اور اہلِ سنت کے ذرائع سے نقل ہوئی ہیں، یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے اصحاب میں سے ایک سے پوچھا:

اتدری فیما یختصم الملأ الاعلی؟

کیا تو جانتا ہے کہ عالم بالا کے فرشتے کس چیز کے بارے میں بحث و گفتگو کرتے ہیں؟

اس نے عرض کیا: نہیں۔

تو آپؐ نے فرمایا:

اختصموا فی الکفارات والدرجات، فاما الکفارات فاصباغ الوضوء فی السبرات، و نقل الاقدام الی الجماعات، و انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ، و اما الدرجات فافشاء السلام، و اطعام الطعام، والصلوٰۃ فی اللیل والناس نیام

وہ کفارات (وہ کام جو گناہوں کی تلافی کرتے ہیں) اور درجات (وہ چیزیں جو انسان کے درجات میں اضافے کا باعث بنتی ہیں) کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ رہے کفارات تو وہ موسم سرما کی سردی میں بھرے پانی کے ساتھ وضو کرنا اور نماز با جماعت کے لیے قدم بڑھانا، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے اور "درجات" بہت زیادہ سلام کرنا، دوسروں کو کھانا کھلانا اور رات کو اس وقت نماز پڑھنا جبکہ لوگ سو رہے ہوں[1]

لیکن اس حدیث میں صراحت کے ساتھ یہ بیان نہیں ہوا ہے کہ یہ زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں وارد ہوئی ہے، اگرچہ اس کی تعبیرات زیر بحث آیت کی تعبیروں کی طرح ہیں۔ بہرحال اس حدیث سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "مخاصمہ" سے مراد صرف گفتگو ہے نہ کہ جدال و کش مکش۔ گفتگو آدمیوں کے اعمال کے بارے میں ہے اور ان کاموں کے بارے میں جو گناہوں کا

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ یہی حدیث تفسیر در المنثور میں کئی ایک حوالوں سے متعدد اصحاب رسولؐ سے کچھ اختلاف کے ساتھ منقول ہوئی ہے۔

کفارہ بنتے ہیں اور انسان کے درجات میں اضافہ کرتے ہیں۔ شاید ان کی گفتگو ان اعمال کی تعداد کے بارے میں ہے جو ان فضائل کا سرچشمہ بنتے ہیں یا ان درجات کی حد اور معیار کا تعین کرتے ہیں جو ان اعمال سے حاصل ہوتے ہیں اور اس طرح سے آیت کی ایک تیسری تفسیر سامنے آتی ہے جو کئی لحاظ سے مناسب ہے لیکن یہ آیندہ والی آیات کے ساتھ کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ ممکن ہے یہ حدیث فرشتوں کی کسی دوسری گفتگو کے بارے میں ہو نہ کہ اس گفتگو کے بارے میں جو ان آیات کے ساتھ مربوط ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا عدم علم اس معنی میں ہے کہ میں اس سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں جانتا، صرف وہی کچھ جانتا ہوں جو وحی کے ذریعے مجھ پر نازل ہوتا ہے۔

۷۱۔ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي خَٰلِقٌۢ بَشَرًا مِّن طِينٍ ○

۷۲۔ فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُۥ سَٰجِدِينَ ○

۷۳۔ فَسَجَدَ الْمَلَٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ○

۷۴۔ إِلَّآ إِبْلِيسَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَٰفِرِينَ ○

۷۵۔ قَالَ يَٰٓإِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْعَالِينَ ○

۷۶۔ قَالَ أَنَا۠ خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُۥ مِن طِينٍ ○

۷۷۔ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ○

۷۸۔ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيٓ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ○

۷۹۔ قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِيٓ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ○

۸۰۔ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ○

۸۱۔ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ○

۸۲۔ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ○

۸۳۔ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ○

ترجمہ

۷۱۔ اس وقت کو یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا : میں گیلی مٹی سے ایک بشر پیدا کروں گا۔

۷۲۔ جس وقت میں اسے درست اور منظم کرلوں اور اپنی روح میں سے اس میں پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کے لیے سجدہ کرنا۔

۷۳۔ پس اس وقت تمام فرشتوں نے تو سجدہ کیا۔

۷۴۔ مگر ابلیس نے (سجدہ نہ کیا اس نے) تکبّر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

۷۵۔ کہا اے ابلیس! تجھے کس نے اس مخلوق کو سجدہ کرنے سے روکا، جسے میں نے اپنی قدرت سے خلق کیا ہے؟ کیا تو نے تکبّر کیا ہے یا تو عالین میں سے تھا؟ (اس سے بالا تر کہ تجھے سجدے کا حکم دیا جائے)

۷۶۔ اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے گیلی مٹی سے۔

۷۷۔ فرمایا: آسمانوں (اور ملائکہ کی صفوں) سے نکل جا تو میرا راندۂ درگاہ ہے۔

۷۸۔ اور یقیناً تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت ہوگی۔

۷۹۔ کہنے لگا: میرے پروردگار! مجھے اس دن تک کی مہلت دے دے، جس دن انسان قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

۸۰۔ فرمایا: تجھے مہلت دے دی گئی ہے۔

۸۱۔ لیکن ایک معیّن دن تک کے لیے۔

۸۲۔ اس نے کہا: تیری عزّت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔

۸۳۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں سے تیرے مخلص ہوں گے۔

تفسیر

تکبّر کیا اور راندۂ درگاہ ہوگیا

یہ آیات جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ملأ اعلیٰ کے بارے میں اور ابلیس کی گفتگو سے متعلق ہے۔ اور مجموعی طور پر اس واقعے کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پہلے تو انسانوں کو یاد دلایا جائے کہ ان کا وجود کتنا قیمتی ہے کہ تمام فرشتے ان کے جدّ امجد آدم کے لیے سجدہ میں گر پڑے۔ ایسی بڑی حیثیت کا مالک انسان کس طرح شیطان اور ہوائے نفس کے جنگل میں اسیر ہوجاتا ہے؟ کس طرح اپنی قدر و قیمت کو نظر انداز کرکے پتھر اور لکڑی کے سامنے سجدہ کرنے لگتا ہے؟

اصولی طور پر تربیت کے موثر طریقوں میں سے ایک، زیر تربیت افراد کو ان کی عظمت کا احساس دلانا ہے یا بالفاظ صحیح لفظوں میں اس طرح سے ان کی بلند حیثیت اور ان کے وجود کی قدر وقیمت انھیں یاد دلانا کہ انسان خود بخود محسوس کرنے لگے کہ انحطاط اور پستی اس کی شان کے لائق نہیں اور خود بخود ان سے کنارہ کشی کر لے۔

ثانیاً شیطان کی ہٹ دھرمی اور اس کا تکبر اور حسد سب ہٹ دھرم اور مغرور افراد کے لیے ایک تنبیہ اور عبرت ہے کیونکہ یہی اس بات کا سبب بن گیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے افتخار کی بلندی سے نیچے گر جائے اور لعنت کی گندگی میں جا گرے۔

ثالثاً ایک ایسے بڑے دشمن کی خبر دی گئی ہے جس نے تمام انسانوں کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی ہے تاکہ سب ہوش میں رہیں اور اس کے دام فریب میں نہ پھنسیں۔

یہ امور مجموعی طور پر گزشتہ بحث کا تسلسل ہیں۔

بہر حال زیر بحث پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کر جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں گیلی مٹی سے ایک بشر پیدا کروں گا۔ (اذ قال ربك للملٰئكة انی خالق بشرًا من طین)۔

لیکن اس بنا پر کہ یہ تصور نہ ہو کہ انسانی وجود کا صرف وہی خاکی پہلو ہے۔ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جس وقت میں اسے منظم کر لوں اور درست بنا لوں اور اپنی روح میں سے (باشرف اور ممتاز روح جسے میں نے خلق کیا ہے) اس میں پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کے لیے سجدہ میں گر پڑنا (فاذا سویته و نفخت فیه من روحی فقعوا له ساجدین)۔

اس طرح سے انسان کی خلقت مکمل ہو گئی اور خدا کی خاص روح اور سیاہ گیلی مٹی آپس میں مل گئے اور ایک عجیب و غریب بالکل نیا وجود جس کی بلندی و پستی دونوں بے انتہائیں پیدا ہو گیا اور ایک انتہائی زیادہ استعداد رکھنے والا وجود جو "خلیفۃ اللہ" ہونے کے لائق ہو عرصہ وجود میں وارد ہوا۔" اور اس وقت بغیر کسی استثناء کے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا" (فسجد الملٰئكة كلهم اجمعون)۔

اور اس خالق کو حمد و ستائش کے لائق جانا۔ ؎

کارد چنیں دل آویز نقشی زماء و طینی

جس نے اس قسم کا دل آویز نقش پانی اور مٹی سے بنایا ہے

لیکن "صرف ایک جس نے سجدہ نہیں کیا ابلیس تھا، اس نے تکبر کیا اور سرکشی کی اور اسی بنا پر اپنے باعظمت مقام سے نیچے گر گیا اور وہ کافروں میں سے تھا (الا ابلیس استکبر وكان من الكافرین)۔

ہاں! انسان کے لیے بدترین بلائے جان بھی یہی کبر و غرور ہے جو جہالت کے تاریک پردے اس کی چشم بینا پر ڈال دیتا ہے اور اسے حقائق کے ادراک سے محروم کر دیتا ہے اسے سرکشی پر ابھارتا ہے اور مومنین کی صف سے نکال دیتا ہے کہ جو خدا کے مطیع بندوں کی صف ہے اور اسے کافروں کی صف میں پہنچا دیتا ہے کہ جو باغیوں اور سرکشوں کی صف ہے جیسا کہ ابلیس کے ساتھ ہوا۔ اس موقع پر

خدا نے ابلیس سے مؤاخذہ کیا اور باز پرس کی۔ " فرمایا اے ابلیس! اس مخلوق کو سجدہ کرنے سے تجھیں کس نے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا تھا (قال یا ابلیس ما منعك ان تسجد لما خلقت بیدی)۔

یہ بات ظاہر ہے کہ " یدی " (دونوں ہاتھ) کی تعبیر حسّی ہاتھوں کے معنوں میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے جسم و جسمانیت سے پاک و منزہ ہے، بلکہ یہاں پر ہاتھ قدرت کے معنی کے لیے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر انسان اپنی طاقت کو ہاتھ سے عمل میں لاتا ہے۔ اس لیے روزمرہ کی گفتگو میں یہ لفظ قدرت کے معنی میں فراوانی سے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک فلاں گروہ کے ہاتھ میں ہے، یا فلاں عبادت خانہ یا عمارت فلاں شخص کے ہاتھ سے بنی ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچتا یا تیرا ہاتھ پُر ہے تو ان میں کہیں بھی لفظ ہاتھ مخصوص عضو کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ سب کے سب قدرت و تسلّط کے مفہوم کے لیے کنایہ ہیں۔

چونکہ انسان اہم کاموں کو دونوں ہاتھوں سے انجام دیتا ہے اور دونوں ہاتھوں کو کام میں لگانا انسان کی کسی چیز کے لیے انتہائی توجہ اور لگاؤ کی نشانی ہے، لہٰذا زیر بحث آیت میں اس تعبیر کا بیان، انسان کی خلقت میں پروردگار کی خصوصی عنایت اور اس کی قدرتِ مطلقہ کو عمل میں لانے کے لیے کنایہ ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: کیا تو نے تکبر کیا، یا تو اس سے بالاتر تھا کہ تجھے سجدے کا حکم دیا جائے (استکبرت ام کنت من العالین)۔

بلاشک و شبہ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی قدر و منزلت اس سے بالاتر ہے کہ وہ خدا کے لیے سجدہ کرے (یا خدا کے حکم سے آدم کے لیے سجدہ کرے) اس بنا پر آخری راہ جو باقی رہ جاتی ہے وہی دوسرا احتمال یعنی تکبر ہے۔

بعض مفسرین " عالین " کو یہاں ایسے افراد کے معنی میں سمجھتے ہیں جو ہمیشہ کبر و غرور میں رہیں۔ اس بنا پر اس جملے کا معنی یہ ہوگا: کیا تو نے اب اس وقت ہی تکبر کیا ہے یا تو ہمیشہ سے ہی ایسا تھا؟

لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

البتہ انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ابلیس نے دوسری شق کو انتخاب کیا اور وہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ اس سے برتر ہے کہ اسے اس قسم کا حکم دیا جائے لہٰذا انتہائی جسارت کے ساتھ فرمانِ خدا کی مخالفت کرنے کے لیے دلیلیں دینے لگا اور کہا: میں اس (آدم) سے بہتر ہوں، کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو گیلی مٹی سے (قال انا خیر منه خلقتنی من نار و خلقته من طین)۔

وہ حقیقت میں اپنے خیال کے مطابق تین حوالوں سے فرمانِ خدا کی نفی کرنا چاہتا تھا۔

پہلا یہ کہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور وہ مٹی سے جو ایک حقیقت بھی تھی، جیسا کہ قرآن مجید نے خود کہا ہے۔

خلق الانسان من صلصال کالفخار و خلق الجان من مارج من نار

خدا نے انسان کو خشک شدہ (کھنکتی) مٹی سے پیدا کیا جو اینٹ یا پیالے کی مانند تھی اور جنوں کو (جن میں سے ابلیس بھی تھا) آگ کے شعلے سے خلق کیا۔

(الرحمٰن ـــــــ ۱۴، ۱۵)

دوسرا یہ کہ جو آگ سے پیدا کیا گیا ہے وہ اس سے برتر و افضل ہے جسے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے ۔ کیونکہ آگ مٹی سے افضل و برتر ہے ۔

تیسرا یہ کہ اشرف و افضل موجود کو ہرگز یہ حکم نہیں دینا چاہیے کہ وہ غیر اشرف کے سامنے سجدہ کرے ۔

ابلیس کا سارا اشتباہ اور غلطی ان دو آخری پہلوؤں میں تھی ۔

کیونکہ اول تو آدم صرف مٹی سے پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی عظمت اس روحِ الٰہی کی وجہ سے تھی جو ان میں پھونکی گئی تھی ۔ ورنہ مٹی کہاں اور یہ سارے افتخار، استعداد اور تکامل کہاں ؟

دوسرے مٹی نہ صرف یہ کہ آگ سے کمتر نہیں ہے بلکہ اس سے کئی درجے برتر ہے، کیونکہ ساری زندگی اور منابع حیاتی مٹی سے ہی پیدا ہوتے ہیں ۔ تمام تر نباتات، پھول، پھل اور تمام زندہ موجودات مٹی سے ہی وجود پاتے ہیں ۔ تمام گراں بہا معدنیات مٹی کے اندر چھپی ہوئی ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ مٹی انواع و اقسام کی برکات کا منبع ہے ۔ جبکہ آگ اپنی پوری اہمیت کے باوجود جو اسے زندگی میں حاصل ہے ہرگز اس کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتی، اور وہ صرف مٹی کے منابع سے استفادہ کرنے کا ایک آلہ ہے اور وہ بھی خطرناک آلہ، اور پھر آگ پیدا کرنے والے مواد بھی زیادہ تر زمین کی برکت سے وجود میں آتے ہیں (ایندھن، کوئلہ، تیل اور پٹرول وغیرہ) ۔

تیسرا مسئلہ اطاعتِ حکمِ الٰہی کا ہے ۔ سب کے سب اسی کی مخلوق اور بندے ہیں، لہٰذا انھیں اس کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے ۔

بہرحال اگر ہم ابلیس کے استدلال کا تجزیہ و تحلیل کریں تو وہ ایک عجیب و غریب کفر اس کی بنیاد ہے ۔ وہ اپنی اس گفتگو سے چاہتا تھا کہ خدا کی حکمت کی بھی نفی کرے اور اس کے امر کو بھی (نعوذ باللہ) بے مأخذ و بے مدرک شمار کرے اور اس کا یہ اعتراض اس کی انتہائی جہالت کی دلیل ہے، کیونکہ اگر وہ یہ کہتا کہ میری ہوائے نفس مانع ہوئی ہے یا پروردگار نے مجھے اجازت نہیں دی اور اسی طرح کا کوئی اور عذر تو اس نے صرف ایک گناہ کا اظہار کیا ہوتا ، لیکن اب جبکہ اس نے اپنے عصیان کی توجیہ کے لیے پروردگار کی حکمت اور اس کے علم کی نفی کی ، تو یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس نے کفر کے پست ترین مرحلے کی طرف سقوط کیا ۔

علاوہ ازیں مخلوق اپنے خالق کے مقابلے میں اپنی طرف سے کوئی استقلال نہیں رکھتی، جو کچھ اس کے پاس ہے وہ سب اسی کی طرف سے ہے اور شیطان کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے لیے پروردگار کی حاکمیت کے مقابلے میں حاکمیت و استقلال کا قائل تھا، اور یہ کفر کا ایک اور سرچشمہ ہے ۔

بہرحال شیطان کی گمراہی کا عامل خود پرستی ، غرور ، جہل اور حسد کا مرکب تھا ۔

یہ سب کی سب شیطانی صفات اکٹھی ہو گئیں اور اسے جو سال ہا سال سے ملائکہ کا ہم نشین بلکہ ان کا معلم تھا، اس بلندی اور افتخار سے پیچھے کھینچ لائیں اور یہ بری صفات جہاں کہیں بھی پیدا ہو جائیں ——— کس قدر خطرناک ہیں ؟

نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں علی علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ۔

اس نے ہزار ہا سال تک پروردگار کی عبادت کی تھی ، لیکن گھڑی بھر کا تکبر اس سب کو جہنم کی طرف

کھینچ کرلے گیا اور سب کچھ برباد کر دیا[1]

ہاں ! ایک اہم اور عظیم عمارت کو تعمیر تو سال ہا سال میں کیا جاتا ہے لیکن اسے ایک طاقت ور بم کے ساتھ ایک ہی لمحہ میں تباہ کیا جاسکتا ہے۔

یہی موقع تھا جبکہ اس پلید وجود کو ملأ اعلیٰ اور عالم بالا کے فرشتوں کی صفوں سے نکال دیا جانا چاہیے تھا۔ لہٰذا خدا نے اسے خطاب کرتے ہوئے فرمایا : آسمان بریں سے فرشتوں کی صفوں سے نکل جا، کیونکہ تو میرا راندۂ درگاہ ہے (قال فاخرج منها فانك رجيم)۔

"فاخرج منها" میں ضمیر ممکن ہے صفوف ملائکہ یا عوالم بالا یا بہشت یا خدا کی رحمت کی طرف اشارہ ہو۔

ہاں اس نامحرم کو یہاں سے چلے جانا چاہیے، کیونکہ یہ اس جگہ کے لائق نہیں ہے۔ یہ تو پاکیزہ اور مقرب لوگوں کی جگہ ہے، بیہودہ سرکش اور تاریک دلوں کی جگہ نہیں ہے۔

"رجیم" "رجم" کے مادہ سے سنگسار کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ اس کا لازمہ طرد دینا (نکالنا، بھگانا اور دھتکارنا) ہے لہٰذا کبھی یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، یقیناً میری لعنت قیامت کے دن تک تجھ پر پڑتی رہے گی اور تو ہمیشہ میری رحمت سے دور رہے گا (وان عليك لعنتى الى يوم الدين)۔

اہم بات یہ ہے کہ جس وقت انسان اپنے اعمال بد کا برا نتیجہ دیکھے تو بیدار ہو جائے اور اس کی تلافی کی فکر کرے۔ لیکن اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز خطرناک نہیں ہے کہ وہ اس طرح سے غرور اور ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر سوار رہے اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف چلتا ہی چلا جائے، یہی وہ مقام ہے جبکہ اس کا فاصلہ لحظہ بہ لحظہ صراط مستقیم سے بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہی وہ بدبختی تھی جس نے

---

[1] امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

فاعتبروا بما كان من فعل الله بابليس اذ احبط عمله الطويل وجهده الجهيد وكان قد عبد الله ستة آلاف سنة ... عن كبر ساعة واحدة فمن ذا بعد ابليس يسلم على الله بمثل معصيته

خدا کے بندو! عبرت حاصل کرو اس سے جو خدا نے ابلیس کے بارے میں انجام دیا، کہ اس کے طولانی اعمال اور فراواں کوششوں کو ــــ جبکہ اس نے چھ ہزار سال تک عبادت کی تھی ــــ ایک گھڑی بھر کے تکبر سے برباد کر دیا تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص وہی ابلیس والا کام انجام دے اور خدا کے غضب سے امان میں رہے (نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲ ۔ خطبہ قاصعہ)

ابلیس کا دامن پکڑ لیا۔

یہ وہ مقام تھا جہاں "حسد" کینہ میں بدل گیا، ایسا کینہ جو سخت اور جڑیں پیدا کر لینے والا تھا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

اس نے کہا: میرے پروردگار! مجھے قیامت کے دن تک جب انسان قبروں سے اٹھائے جائیں گے، مہلت دے (قال رب فانظرنی الی یوم یبعثون)۔

کیا ایسی مہلت جس میں، میں اپنے ماضی پر اشکِ حسرت وندامت بہاؤں؟ کیا ایسی مہلت جس میں میں اپنے قبیح اور بڑے گناہوں کی تلافی کروں؟ نہیں! نہیں! مجھے تو ایسی مہلت درکار ہے جس میں میں آدم کی اولاد سے انتقام لوں اور سب کو گمراہی کی طرف کھینچ کر لے جاؤں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کی گمراہی، گناہ کا ایک نیا بھاری بوجھ میرے دوش پر رکھ دے گی اور مجھے کفر وعصیان کے منجدھار میں زیادہ سے زیادہ نیچے لے جائے گی۔ ہائے افسوس! وہ کون سی مصیبت ہے جو ہٹ دھرمی، کبر وغرور اور حسد کے ہاتھوں لوگوں کے سروں پر وارد نہیں ہوتی؟

حقیقت میں وہ یہ چاہتا تھا کہ آخری حد تک ممکن وقت تک آدم کی اولاد کو گمراہ کرتا رہے اور چونکہ قیامت کا دن ذمہ داری کے ختم ہونے کا دن ہے اور اس کے بعد وسوسہ اور اغوا کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس درخواست کے ذریعے موت کو اپنے آپ سے دور کر دے اور قیامت تک زندہ رہے، اگرچہ ساری دنیا کے لوگ دنیا سے چل بسیں۔

یہاں مشیتِ الٰہی نے ان دلائل ووجوہ کی بنا پر۔ جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔ اقتضاء کیا کہ ابلیس کی یہ خواہش پوری ہو جائے۔ لیکن مطلق طور پر نہیں بلکہ مشروط صورت میں جیسا کہ بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: فرمایا، تجھے مہلت دی گئی (قال فانک من المنظرین)۔

لیکن قیامت کے دن اور مخلوق کے مبعوث ہونے اور قبروں سے اٹھنے کے دن تک نہیں بلکہ "ایک معین دن اور زمانے تک کے لیے (الی یوم الوقت المعلوم)۔

اس بارے میں کہ "یوم الوقت المعلوم" کون سا دن ہے؟ مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔

بعض تو اسے اس جہان کا اختتام سمجھتے ہیں، کیونکہ اس دن تمام زندہ موجودات مر جائیں گے اور صرف خدا کی ذات پاک باقی رہ جائے گی۔ جیسا کہ سورۂ قصص کی آیہ ۸۸ میں بیان ہوا ہے۔

کل شیء ھالک الا وجھہ

اور اس طرح سے ابلیس کی خواہش کا ایک حصہ منظور کر لیا گیا۔

بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے لیکن یہ احتمال نہ تو زیر بحث آیات کے ظاہری مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہے کیونکہ ان کا لب ولہجہ بتاتا ہے کہ اس کی تمام خواہش کے ساتھ موافقت نہیں ہوئی اور نہ ہی قرآن کی دوسری آیات کے ساتھ جو اس جہان کے اختتام پر تمام زندوں کی موت کی خبر دیتی ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت ایسے زمانے کی طرف اشارہ ہو جسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔
لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے لہٰذا ایک روایت میں جو تفسیر برہان میں امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہے، آیا ہے کہ ابلیس نفخہ اول اور دوم کے درمیانی عرصے میں مرجائے گا۔[1]

یہ وہ منزل تھی جہاں ابلیس نے اپنے دل میں چھپی ہوئی بات کو ظاہر کر دیا اور عمر جاودانی کا تقاضا کرنے کے لیے اپنے اصلی مقصد کی نشاندہی کر دی اور کہا: تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا (قال فبعزتك لاغوینھم اجمعین)۔

"عزت" کی قسم، قدرت پر بھروسہ اور توانائی کے اظہار کے لیے ہے اور یہ پے در پے تاکیدیں (قسم، نون تاکید ثقیلہ اور اجمعین کا لفظ) اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ اپنے عزم و ارادہ میں انتہائی ثبات و استقامت رکھتا تھا اور رکھتا ہے اور آخری سانس تک وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔

لیکن وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ خدا کے خاص بندوں کا ایک گروہ اس کے اثر و نفوذ سے باہر رہے گا اور اس کے وسوسے میں نہیں آئے گا، لہٰذا مجبوراً انھیں اپنی اوپر والی گفتگو سے مستثنیٰ کرتے ہوئے کہتا ہے: "مگر ان میں سے جو تیرے مخلص بندے ہوں گے (الا عبادك منھم المخلصین)۔

وہی لوگ جو تیری معرفت و بندگی کی راہ میں اخلاص اور صدق و صفا سے قدم بڑھائیں گے، جنھیں تو نے بھی قبول کر لیا ہے، اور انھیں خاص کیا ہے اور انھیں اپنی حفاظت میں لے لیا ہے، صرف یہی گروہ ہے جن تک میں کوئی دسترس نہیں رکھتا ورنہ باقی سب کو اپنے فریب کے جال میں پھنسا لوں گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ابلیس کا یہ اندازہ اور گمان درست نکلا اور ہر کوئی کسی نہ کسی طرح سے اس کے جال میں پھنس گیا۔ اور "مخلصین" کے علاوہ کوئی اس سے نہ بچا۔ جیسا کہ قرآن سورۂ سبا کی آیہ ۲۰ میں کہتا ہے:

ولقد صدق علیھم ابلیس ظنہ فاتبعوہ الا فریقا من المؤمنین

ان کے بارے میں ابلیس کا گمان سچ نکلا اور مومنین کے ایک گروہ کے سوا سبھی نے اس کی پیروی کی۔

چند اہم نکات

۱۔ شیطان کے وجود کا فلسفہ: زیر بحث آیات کے سلسلے میں بہت سے مسائل سامنے آتے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں: شیطان کی خلقت کا مسئلہ، فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے کی دلیل، فرشتوں پر آدم کی برتری کی علت، اور یہ کہ شیطان کس قسم کے لوگوں پر تسلط جماتا ہے اور کبر و غرور اور خود پرستی کا نتیجہ، سیاہ گیلی مٹی اور روح الٰہی سے مراد اور تکامل انواع کے مقابلے میں

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۴۲

آدم کی پیدائش اور اس کی مستقل خلقت کا مسئلہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل۔ ان کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۳۴ کے ذیل میں، گیارھویں جلد میں سورۂ حجر کی آیہ ۲۶ کے ذیل میں اور چھٹی جلد سورۂ اعراف کی آیہ ۱۱ کے ذیل میں مفصل بحث کی ہے۔

جس چیز کی ہم یہاں نئے سرے سے یاد دہانی کروانا ضروری سمجھتے ہیں وہ اس سوال کے بارے میں ہے جو شیطان کی خلقت کے فلسفے کے بارے میں کیا جاتا ہے۔

بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر انسان تکامل وارتقاء اور بندگیٔ خدا کے ذریعے سعادت و نیک بختی کے حصول کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو پھر شیطان کے وجود کی کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ کہ جو تکامل وارتقاء کے برخلاف ایک تباہ کن وجود ہے اور وہ بھی ایک ہوشیار، کینہ پرور، مکار، پُرفریب اور اپنے ارادے کا پکا۔

لیکن اگر ہم تھوڑا سا بھی غور و فکر کریں تو جان لیں گے کہ اس دشمن کا وجود بھی انسانوں کے تکامل وارتقاء کے لیے ایک کمک ہے۔

ہم دور نہ جائیں، ہمیشہ سخت دشمنوں کے مقابلے میں جمنے اور ڈٹے رہنے والی طاقتیں ہی جاندار ہوتی ہیں اور وہی اپنی ارتقائی منزلوں کو طے کرتی ہیں۔

تجربہ کار اور طاقت ور کمانڈر اور میدانِ جنگ کے سپاہی وہی ہوتے ہیں جو بڑی بڑی جنگوں میں سخت ترین دشمنوں کے ساتھ نبرد آزما رہے ہوں۔

تجربہ کار اور طاقت ور سیاست دان وہی ہوتے ہیں جو سخت سیاسی بحرانوں میں طاقتور دشمنوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کیے ہوئے ہوں۔

کشتی کے عظیم ہیرو اور بڑے پہلوان وہی ہوتے ہیں جنھوں نے سخت طاقتور حریفوں کے ساتھ زور آزمائی کی ہو۔

اس بنا پر یہ تعجب کی کون سی بات ہے کہ خدا کے عظیم بندے شیطان کے مقابلے میں مسلسل اور پے در پے جہاد کرتے رہنے سے روز بروز زیادہ قوی ہوتے چلے جائیں۔

موجودہ زمانہ کے ماہرین، مزاحمت کرنے والے جراثیموں کے وجود کے فلسفہ کے بارے میں کہتے ہیں: اگر وہ (جراثیم) نہ ہوتے تو انسان کے بدن کے خلیے سست اور کاہل ہو جاتے اور احتمال ہے کہ انسانوں کے بدن کی نشوونما ۔۔ سنٹی میٹر سے زیادہ نہ ہوتی، سب کے سب بونے آدمیوں کی صورت میں ہوتے، اور اس طرح سے آج کے انسانوں نے مزاحمت کرنے والے جراثیموں کے ساتھ جسمانی مقابلے کی وجہ سے زیادہ طاقت اور نشوونما حاصل کی ہے۔

یہی (ارتقائی صورت) روحِ انسانی کی شیطان اور ہوائے نفس سے مقابلہ کرنے میں ہوتی ہے۔

لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ شیطان کی ذمہ داری ہے کہ وہ بندگانِ خدا کو گمراہ کرے۔ شیطان پہلے دن سے دوسرے موجودات کی طرح پاک و پاکیزہ خلقت رکھتا تھا۔ انحراف، انحطاط، بدبختی اور شیطنت خود اس کے ارادے اور خواہش سے اسے ملی۔ اس بنا پر خدا نے شیطان کو پہلے دن سے شیطان پیدا نہیں کیا۔ اس نے خود چاہا کہ وہ شیطان ہو، لیکن اس کے

باوجود اس کی شیطنت نہ صرف یہ کہ حق طلب بندوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتی بلکہ ان کے لیے ترقی کا زینہ ہے۔
(غور کیجیے گا)

البتہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خدا نے اس کی زندگی کو برقرار رکھنے کی درخواست کو قبول کیوں کیا اور فوراً ہی اسے نابود کیوں نہ کر دیا؟

اس کا جواب وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے اور دوسرے لفظوں میں:

"عالم دنیا آزمائش اور امتحان کا میدان ہے (ایسی آزمائش جو انسانوں کی پرورش اور تکامل کا ذریعہ ہے) اور ہم جانتے ہیں کہ آزمائش سخت ترین دشمنوں، طوفانوں اور بحرانوں سے مقابلہ کیے بغیر ممکن نہیں ہے"

البتہ اگر شیطان نہ بھی ہوتا تو بھی ہوائے نفس اور نفسانی وسوسے انسان کو آزمائش کی کٹھالی میں ڈال لیتے، لیکن شیطان کے ہونے سے آزمائش کا یہ تنور زیادہ گرم ہو گیا، کیونکہ شیطان ایک بیرونی عامل ہے اور ہوائے نفس عامل اندرونی ہے۔

۲۔ آتش غرور سب کچھ جلا دیتی ہے: ان غیر معمولی حساس مسائل میں سے جو امر ابلیس اور اس کے راندۂ درگاہِ خدا ہونے کے واقعے میں توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے، انسان کی تیرگی اور بدبختی میں خود خواہی اور غرور کے عامل کی تاثیر ہے۔ اس طرح سے کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انحراف کا اہم ترین اور خطرناک ترین عامل یہی ہے۔

یہی چیز تھی جو چھ ہزار سال کی عبادت کو ایک ہی لمحہ میں نابود کر گئی، اور یہی چیز تھی جس نے اس موجود کو جو آسمان کے عظیم فرشتوں کا ساتھی تھا بدبختی کے پست ترین گڑھے میں لا پھینکا اور اسے خدا کی ابدی لعنت کا مستحق بنا دیا۔

خود خواہی اور غرور انسان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ حقیقت کے چہرے کو اس کے اصلی روپ میں دیکھے۔

خود خواہی سرچشمۂ حسد ہے، اور حسد کینہ پروری کا سرچشمہ ہے اور کینہ پروری خوں ریزی اور دوسرے جرائم کا سبب بنتی ہے۔ خود خواہی انسان کو خطائیں اور غلطیاں جاری رکھنے پر ابھارتی ہے اور جب پیدا ہو جائے تو بیدار کرنے والے عوامل کو بے کار کر دیتی ہے۔

خود خواہی اور ہٹ دھرمی انسان کے ہاتھ سے توبہ اور تلافی کی مہلت چھین لیتی ہے اور نجات کے دروازے اس کے لیے بند کر دیتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس قبیح اور مذموم صفت کے خطرناک ہونے کے سلسلہ میں جو کچھ بھی کہا جائے بہت کم ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:

فعدو اللہ امام المتعصبین وسلف المستکبرین، الذی وضع اساس العصبیۃ، ونازع اللہ رداء الجبریۃ وادرع لباس التعزز، وخلع قناع التذلل، الا ترون کیف صغرہ اللہ بتکبرہ؟ ووضعہ بترفعہ؛ فجعلہ فی الدنیا

مدحورًا واعدّ له فی الاخرة سعیرًا

یہ (شیطان) دشمن خدا، تعصب کرنے والوں کا پیشوا اور متکبرین کا سلف ہے۔ جس نے تعصب و تکبر اور خود خواہی کی بنیاد رکھی۔ اور خدا کے سامنے اس کے مقام جبروتی کے خلاف نزاع کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے بڑا ہونے کا لباس اپنے بدن پر پہن لیا اور انکسار اور فروتنی کا لباس اتار دیا۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے اسے اس کے تکبر کی وجہ سے کیسا ذلیل کیا؟ اور اس کی بلند پروازی کی بنا پر اسے پست و حقیر بنا دیا؟ دنیا میں اسے راندۂ درگاہ بنا دیا اور آخرت میں جلا ڈالنے والی آگ اس کے لیے تیار کر دی۔

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲، خطبہ قاصعہ)

۸۴۔ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝

۸۵۔ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

۸۶۔ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۝

۸۷۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

۸۸۔ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝

ترجمہ

۸۴۔ فرمایا: حق کی قسم! اور میں حق ہی کہتا ہوں۔

۸۵۔ میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھر دوں گا۔

۸۶۔ (اے پیغمبر!) کہہ دو، میں تم سے کوئی کسی قسم کا اجر طلب نہیں کرتا اور میں متکلفین میں سے نہیں ہوں۔

۸۷۔ یہ (قرآن) تمام عالمین کے لیے تذکر (اور یاددہانی) کا ذریعہ ہے۔

۸۸۔ اور تم اُس کی خبر ایک مدت کے بعد ضرور سُن لو گے۔

تفسیر

ابلیس کے بارے میں آخری بات

یہ آیات جو سورۂ ص کی آخری آیات ہیں، حقیقت میں اس سورہ کے سارے مضامین کا خلاصہ اور ان تمام مختلف بحثوں کا نتیجہ ہیں جو اس سورہ میں بیان ہوئی ہیں۔

پہلے تو ابلیس کے جواب ہیں جس نے یہ دھمکی دی تھی کہ وہ مخلصین کے سوا سب انسانوں کو گمراہ کر کے رکھ دے گا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے: حق کی قسم! اور میں حق ہی کہتا ہوں (قال فالحق والحق اقول)۔[1]

---

[1] اس جملہ کی ترکیب کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ "الحق" مبتدا ہو اور "قسمی" جو اس کی خبر ہے محذوف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی خبر "قولی" ہو "فالحق قولی" یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ایک محذوف مبتدا کی خبر ہو "ھذا ھو الحق" یا "(انا الحق)" ہو۔

کہ میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھردوں گا (لأملئن جهنم منك و ممن تبعك منهم اجمعين)۔

جو کچھ ابتداء سورہ سے یہاں تک بیان ہوا ہے وہ سب حق تھا اور جو کچھ ان عظیم پیغمبروں نے، جن کی زندگی کا ایک گوشہ اس سورہ میں آیا ہے۔ اس کے لیے جنگ و پیکار اور جہاد کیا، وہ حق تھا۔ قیامت اور سرکشوں کے دردناک عذاب اور جنات کی انواع واقسام کی نعمتوں کی جو باتیں اس سورہ میں بیان ہوئی ہیں وہ سب حق تھیں۔ اس سورہ کا اختتام بھی حق ہے اور خدا حق کی قسم کھاتا ہے اور حق بات کرتا ہے کہ جہنم کو شیطان اور اس کے پیروکاروں سے بھردوں گا تاکہ انسانوں کو گمراہ کرنے کے بارے میں ابلیس کی اس بات کا ایک قطعی اور دوٹوک جواب دیا جائے کہ جو اس نے قاطعیت کے طور پر کہی تھی۔ یہ اس لیے ہے تاکہ سب کی ذمہ داری واضح کردی جائے۔

بہرحال یہ دونوں جملے بہت سی تاکیدات پر مشتمل ہیں: دومرتبہ حق ہونے کی تاکید ہے اور قسم کھائی گئی ہے۔ اور "لاملئن" بھی نون تاکید ثقیلہ کے ساتھ ہے اور ان سب پر "اجمعین" کی ایک اور تاکید ہے تاکہ کسی کو معمولی سا بھی شک وشبہ اس بارے میں نہ ہونے پائے کہ شیطان اور اس کے پیروکاروں کے لیے کوئی راہ نجات نہیں ہے اور ان کا اس راہ پر چلتے رہنا انھیں ہلاکت کے گھر تک پہنچا دے گا۔

اس کے بعد اس گفتگو کے آخر میں چار اہم مطالب کی طرف مختصر اور واضح عبارتوں کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا (قل ما اسئلکم علیه من اجر)۔

اس طرح سے بہانہ جوئی کرنے والوں کے بہانوں کو ختم کردیا ہے اور واضح کردیا ہے کہ میں تو صرف تمھاری نجات اور سعادت کا خواہاں ہوں، نہ تو کوئی مادی اجر تم سے چاہتا ہوں اور نہ ہی معنوی، نہ قدردانی، نہ شکرگزاری، نہ مقام ومنزلت اور نہ حکومت، کیونکہ میرا اجر تو خدا کے ذمہ ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات۔ مثلاً سورۂ سبا کی آیہ ۴۷ میں اس کی تصریح ہوئی ہے: ان اجری الا علی الله

یہ بات خود پیغمبر اکرمؐ کی صداقت کی ایک دلیل ہے کیونکہ جھوٹے مدعی مختلف قسم کے لالچ کے تحت دعوے کرتے ہیں اور ان کا لالچ ان کی کئی باتوں سے بہرصورت واضح وآشکار ہوجاتا ہے۔

دوسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: میں متکلفین میں سے نہیں ہوں۔ بلکہ میری باتیں دلیل ومنطق کے ساتھ ہوتی ہیں اور کسی قسم کا تکلف ان میں نہیں ہے۔ میری عبارتیں واضح اور میری باتیں ہر قسم کے ابہام اور پیچیدگی سے خالی ہیں (وما انا من المتكلفين)۔

حقیقت میں پہلا جملہ دعوت کرنے والے کے اوصاف کے بارے میں ہے اور دوسرا جملہ اس کے دعوے کے مطالب کی کیفیت کے متعلق اور واقعاً یہ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کا مصداق ہے۔

تیسرے مرحلے میں اس عظیم دعوت اور آسمانی کتاب کے نزول کا اصلی ہدف بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ قرآن سارے جہان والوں کے لیے صرف نصیحت، یاددہانی اور بیداری کا ذریعہ ہے (ان هو الا ذكر للعالمين)۔

ہاں! اہم بات یہ ہے کہ لوگ غفلت سے باہر نکلیں اور غوروفکر کریں کیونکہ راستہ واضح ہے اور اس کی نشانیاں آشکار ہیں اور انسان کے

لہٰذا ایک ایسی پاک و پاکیزہ فطرت ہے جو اس کی راہنمائی کرتی ہے اور راہِ توحید و تقویٰ کی طرف کھینچتی ہے۔ اہم بات تو بیداری ہے اور پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کی اصلی ذمہ داری یہی ہے۔

یہ تعبیر جس کی نظیر قرآن مجید میں کم نہیں ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انبیاء کی دعوت کے مطالب تمام مراحل میں، خداداد فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور یہ دونوں ایک ساتھ مل کر پیش رفت کرتے ہیں۔

چوتھے اور آخری مرحلے میں مخالفین کو مختصر اور معنی خیز عبارتوں کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، تم اس کی خبر ایک مدت کے بعد سن لو گے (و لتعلمن نبأه بعد حين)۔

ممکن ہے تم ان باتوں کو سنجیدگی سے ساتھ قبول نہ کرو، اور ان کے پاس سے بے اعتنائی کے ساتھ گزر جاؤ، لیکن بہت جلد میری گفتگو کی صداقت واضح ہو جائے گی۔ اس جہان میں بھی اسلام و کفر کی جنگ میں، اجتماعی اور فکری نفوذ کے مقام پر اور خدائی عذاب کے موقع پر اور دوسرے جہان میں بھی خدا کا دردناک عذاب دیکھو گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ اپنے موقع پر اپنی آنکھ سے مشاہدہ کر لو گے۔ مختصر یہ ہے کہ خدائی تازیانہ آمادہ ہے اور بہت جلد مستکبرین اور ظالموں پر برسے گا۔

متکلّف کون ہے؟

زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ اپنے افتخارات میں سے ایک یہ شمار کرتے ہیں کہ میں متکلفین میں سے نہیں ہوں۔

روایات میں بہت زیادہ مباحث "متکلفین" کی نشانیوں اور علامتوں کے بارے میں موجود ہیں۔

ایک حدیث میں جو "جوامع الجامع" میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے، یہ آیا ہے:

للمتكلف ثلاث علامات: ينازع من فوقه، و يتعاطى ما لا ينال، و يقول ما لا يعلم

متکلف کی تین نشانیاں ہیں۔ ہمیشہ اپنے سے اوپر کے لوگوں سے نزاع اور پرخاش رکھتا ہے، ایسے امور کے پیچھے لگا رہتا ہے جن تک کبھی نہیں پہنچ سکتا، اور ایسے مطالب کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جن سے آگاہی نہیں رکھتا۔[1]

یہی مضمون ایک دوسری عبارت کے ساتھ امام صادق علیہ السلام سے لقمان حکیم کے کلمات میں بھی آیا ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ کی علی علیہ السلام سے وصیتوں میں بیان ہوا ہے۔

للمتكلف ثلاث علامات: يتملق اذا حضر، و يغتاب اذا غاب، و يشمت بالمصيبة

متکلف کی تین نشانیاں ہیں:

---

[1] جوامع الجامع، المیزان جلد ۱۷ ص ۲۴۳ کے مطابق۔

۱۔ سامنے چاپلوسی کرتا ہے ۔

۲۔ پیٹھ پیچھے غیبت کرتا ہے ۔

۳۔ اور مصیبت کے وقت شماتت کرنے لگتا ہے [1]

امام صادق علیہ السلام سے ایک اور حدیث میں منقول ہے ۔

المتکلف مخطیء و ان اصاب، و المتکلف لا یستجلب فی عاقبة امرہ الا الھوان، و فی الوقت الا التعب و العناء و الشقاء، والمتکلف ظاھرہ ریاء و باطنہ نفاق، و ھما جناحان بھما یطیر المتکلف، و لیس فی الجملة من اخلاق الصالحین، ولا من شعار المتقین المتکلف فی ای باب، کما قال اللہ تعالٰی لنبیہ قال ما اسئلکم علیہ من اجر و ما انا من المتکلفین

متکلف خطا کار ہے چاہے وہ ظاہراً حقیقت تک پہنچ بھی جائے ۔ متکلف کو آخرالامر سوائے پستی اور خواری کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا ۔ اور آج بھی سوائے رنج و تکلیف اور زحمت و ناراحتی کے اس کا کوئی حصّہ نہیں ہے ۔

متکلف کا ظاہر ریا اور اس کا باطن نفاق ہے اور وہ ہمیشہ ان ہی دونوں پروں کے ساتھ پرواز کرتا ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ تکلّف صالحین کے اخلاق اور متقین کے شعار میں سے نہیں ہے چاہے وہ جس بات میں بھی ہو، جیسا کہ خدا اپنے پیغمبر سے فرماتا ہے : کہہ دے ! میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا اور میں متکلفین میں سے نہیں ہوں [2]

ان سب روایات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ متکلفین وہ لوگ ہیں جو حق و عدالت اور راستی و درستی کے راستے سے قدم باہر رکھتے ہوئے حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں، خیالات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ۔ ایسے امور کی جن کے بارے میں آگاہی نہیں رکھتے، خبر دیتے ہیں اور جن امور کو نہیں جانتے ان میں دخل اندازی کرتے ہیں ۔ ان کا ظاہر و باطن الگ الگ ہے ۔ اور ان کا حضور و غیاب متضاد ہیں وہ خود کو رنج و زحمت میں ڈالتے ہیں اور سر پھڑانے اور بدبختی کے سوا کوئی نتیجہ انھیں نہیں ملتا اور پرہیزگار اور صالح لوگ اس "صفت" سے بالکل پاک اور منزہ ہیں ۔

---

[1] نورالثقلین جلد ۴، ص ۴۷۲

[2] ایضاً

پروردگارا! ہمیں توفیق عنایت فرما کہ ہم تکلف، نفاق، تمرد اور سرکشی کے تمام آثار سے دُور رہیں۔
خداوندا! ہمیں مخلصین کی صف میں قرار دے جن کی تو اپنی حمایت کے سایہ تلے حفاظت فرماتا ہے اور گمراہ کرنے والا شیطان ان سے مایوس ہے۔
بارِ الہا! ہمیں وہ بیداری اور سمجھداری مرحمت فرما کہ ہم اس قرآن عظیم کے مطالب و معانی کو زندہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کی طاقت و قوت کو اکٹھا کریں اور یک دل اور یک زبان ہو کر تیری راہ میں قدم بڑھائیں اور حق و حقیقت کے دشمنوں کا قلع قمع کر کے رکھ دیں۔

آمین یا رب العالمین

سورۂ ص کی تفسیر کا اختتام بروز پیر ۹ شوال ۱۴۰۴ھ



ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۰) کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے میں تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مہتمم / پرنسپل
امامیہ قرأت کالج
اندرون موچی دروازہ۔ لاہور



اشاریے سے پہلے

زیرِ نظر اشاریہ تفسیر نمونہ کے قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے خود مصباح القرآن ٹرسٹ نے مرتب کروایا ہے۔

یاد رہے کہ فارسی کی اصل اشاعتوں میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔اس طرح مصباح القرآن ٹرسٹ کو اس سلسلے میں پہل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آیندہ دیگر جلدوں کی اشاعتوں میں بھی اشاریہ شامل کرکے انہیں مفید تر بنایا جائے۔

اشاریوں کی عام رَوِش سے ہٹ کر زیرِ نظر اشاریہ میں تفسیر میں موجود قرآنی نُکت کے زیادہ دِقّت طلب الفاظ کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔جن کتابوں سے مؤلفِ محترم نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی پیش کر دی گئی ہے۔

عالمِ پیری میں یہ کٹھن اور بزرگانہ کام محترم سیّد شکیل حسین موسوی نے انجام دیا ہے۔خُدا تعالیٰ اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں خدمتِ اسلام اور قرآن کے لیے طولِ عُمر سے نوازے۔

آپ کی آراء اور تنقید اس سلسلے کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے مُفید ثابت ہوسکتی ہے۔

انچارج
شعبۂ تصحیح و ترتیب
مِصباحُ القرآن ٹرسٹ

اشاریہ

تفسیر نمونہ ـــــــــــــ جلد ۱۰

ترتیب و تزئین ------- سیّد شکیل حسین موسوی
------- سیّد محمد حسین زیدی الباھروی

مضامین:

اُصول وعقائد

اسمائے باری تعالیٰ

توحید

عدل

نبوت

معجزہ

جنت

جہنم

شفاعت

احکام

نماز

زکوٰۃ یا انفاق

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

اخلاقِ رذیلہ

اقوامِ سابقہ

حضرت ابراہیمؑ کی قوم

حضرت الیاسؑ کی قوم

حضرت صالحؑ کی قوم (ثمود)

حضرت شعیبؑ کی قوم (اصحاب الایکہ)

سبا

عاد

فرعون وقارون کی قوم

حضرت لُوطؑ کی قوم

حضرت موسیٰؑ وہارونؑ کی قوم

حضرت نوحؑ کی قوم

حضرت یونسؑ کی قوم

شخصیات

حضرت آدم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ابلیس ملعون

حضرت امام حسنؑ (امام دوم)

حضرت امام حسینؑ (امام سوم)

حضرت داؤد علیہ السلام

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

حضرت سلیمان علیہ السلام

شمعون الصفا

حضرت امام علیؑ بن الحسینؑ (امام چہارم)

حضرت اُم سلمہؓ (اُم المومنین)

امیہ بن خلف

حضرت ایوب علیہ السلام

برنابا

بیہقیؒ

پولس

جابرؓ ابنِ عبداللہ انصاری

حضرت امام جعفر صادقؑ (امامِ ششم)

حلیب

حذیفہؓ

حضرت امام حسنؑ (امام دوم)

حضرت امام حسینؑ (امام سوم)

حضرت داؤد علیہ السّلام

حضرت ذوالکفل علیہ السّلام

حضرت سلیمان علیہ السّلام

شمعون الصفا

شیطان

عاص بن وائل

حضرت عائشہؓ (اُم المومنین)

عبداللہ ابنِ عباسؓ

حضرت علیؑ ابنِ ابی طالبؑ

حضرت امام علیؑ بن الحسینؑ (امام چہارم)

حضرت امام علیؑ ابنِ موسیٰ رضاؑ (امام ہشتم)

عمرو ابنِ لحی (بُت پرستی کا بانی)

فرشتے

کفر و کافر

حضرت لُوط علیہ السلام

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام (امام ہفتم)

حضرت موسیٰؑ بن عمران

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ (امام ہفتم)

مومن اور عملِ صالح

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت ہاجرہ

حضرت ہارون علیہ السلام

حضرت یعقوب علیہ السلام

حضرت یونس علیہ السلام

علماء و دانشور

کتبِ آسمانی

تورات

قرآن مجید

کتبِ تفسیر و تاریخ و سیر

لغاتِ قرآن

(ا)

(ف)

(ق)

(ل)

(م)

متفرق موضوعات

آسمان وزمین کا قیام

آگے اور پیچھے دیواروں کا حائل ہونا

آلاتِ شناخت کا بیکار ہوجانا

آیاتِ الٰہی

اچھے اور بُرے اعمال کا تقابل

جن کے اعمالِ قبیح شیطان نے ان کی نظر میں پسندیدہ بنا دیے ہیں، کیا ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو اعمال کی حقیقت کو سمجھتے ہیں؟ ۱۸۹ تا ۱۹۴

استکبار اور سازشیں بدبختی کا سبب بن گئیں

ہدایت ان کے پاس آئی، ڈرانے والا آیا تو راہِ فرار اختیار کی، یہ سب کچھ تکبر کی وجہ سے ہوا۔ ۲۷۷،۲۸۳

اسلام میں قرعہ اندازی کی مشروعیت

قرعہ سے بڑھ کر اور کوئی عادلانہ فیصلہ نہیں۔ (امام جعفر صادقؑ) ۵۶۴،۵۶۵

الیاسؑ مشرکین کے مقابلہ میں

الیاسؑ اللہ کا رسول تھا، قوم کو تقویٰ کی تبلیغ کی، جھٹلایا گیا، وہ سب عدالت میں حاضر ہوں گے، الیاسؑ کا نام باقی رکھا، الیاسؑ پر سلام ہو۔ ۵۴۲ تا ۵۴۶

انطاکیہ کے رسولوں کے واقعات

پولس، برنابا اور شمعون رسولوں کی تبلیغ اور واقعات۔ ۲۳۰ تا ۲۳۴

انطاکیہ والوں کی داستان کے تربیتی اور اصلاحی نکات

تبلیغِ حق کے سلسلہ میں بہت سے نکات بیان ہوئے ہیں۔ ۲۳۴،۲۳۵

انفاق فی سبیل اللہ باعثِ برکت ہے

جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں دے دو گے اللہ اس سے بہتر نعمات عطا فرمائے گا۔ ۱۳۰

انفاق کے مفہوم کی وسعت

ہر نیک کام کسی بھی شکل میں ہو صدقہ ہے ۱۳۴،۱۳۵

انسانی زندگی میں قیامت پر ایمان کا اثر

فاسد و منحرف افراد کی اصلاح، فداکار و مجاہد کی تشویق، حیات بعد از موت کا نظریہ، سزاؤں سے کہیں بہتر ہے۔ ۴۲۵ تا ۴۲۷

ان کے لیے راہِ فرار نہ ہوگی

وہ عذابِ الٰہی سے بھاگ نہ سکیں گے، ان کی خواہشات اور چاہتوں کے درمیان جُدائی ڈال دی جائے گی۔ ۱۵۸ تا ۱۶۴